

جملہ حقوق اضافہ و مکمل کتابت محفوظ ہیں۔

کفار و مشرکین شیعہ غیر متقلدین مغرب زدہ مسلمان اور جہاں
طبقہ کے اسلام پر اعتراضات و شبہات پر عقلی و نقلی جامع دلچسپ

جوابات

اشرف الجواب ^{مسمی بہ} اُردو عکسی مکمل

منتخب خطبات

== تالیف ==

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی مدظلہ

اضافات

حضرت مولانا مفتی محمد ظفر الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند

باجہتمام

وقار علی ابن مختار علی

== ناشر ==

مکتبہ تھانوی دیوبند ضلع سہارنپور

فہرست مضامین حصہ اول

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۱۷	کیا مسلمان کعبہ کی پرستش کرتے ہیں؟	۵	اسلام پر کئے گئے شبہات و اعتراض کے دلائل جوابات عقل و نقل کی روشنی میں
۱۸	کعبہ کی خصوصیت	۶	حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ
۱۹	کعبہ پر تجلیات الہی	۷	کیا اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے؟
۲۰	حجر اسود کو بوسہ دینے کی وجہ	۸	حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ
۲۱	حجر اسود کو بوسہ دینے کا راز	۹	قاضی کا فیصلہ
۲۱	غلامی کیا اسلام میں قابل اعتراض ہے؟	۱۰	قاضی کے فیصلہ پر مسرت
۲۲	مسئلہ غلامی کی اصل	۱۱	یہودی کا قبول اسلام
۲۳	جیل رکھ کر راحت پہنچانا	۱۲	اہل یورپ کا خیال اور اس کی تردید
۲۳	محمود غزنوی کا ایک واقعہ	۱۳	قانون اسلام
۲۴	اسلامی تعزیرات اعتراض اور اس کا جواب	۱۴	ہرمزان کا واقعہ
۲۵	شریعت کی قدر و قیمت	۱۵	ہندوستان کی مثال
۲۶	کیا جنت و دوزخ کوئی چیز نہیں ہے؟	۱۶	مدینہ میں اسلام
۲۷	مسلمان کیا رسول اللہ کو خدا تعالیٰ کے برابر سمجھتے ہیں؟	۱۷	جہنم میں اسلام
۲۸	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشاعت اسلام	۱۸	جہاد کا منشا
۲۹	سے مقصود کیا اپنی تعظیم ہے؟	۱۹	کیا خدا اس پر قادر نہیں کہ کافر کی مغفرت کر دے۔
۳۰	محبت رسول کا حال	۲۰	اللہ تعالیٰ بغیر زبان کے کیسے کلام کرتا ہے
۳۱	محبت کا اثر	۲۱	شریعت میں کفر کی سزا دائمی عذاب
۳۲	صحابہ کا عشق رسول	۲۲	جہنم کیوں ہے؟
۳۳	آنحضرت کا طریقہ کار		

اس کتاب کے جملہ حقوق و عکس کتابت محفوظ ہیں۔

اشرف الجواب

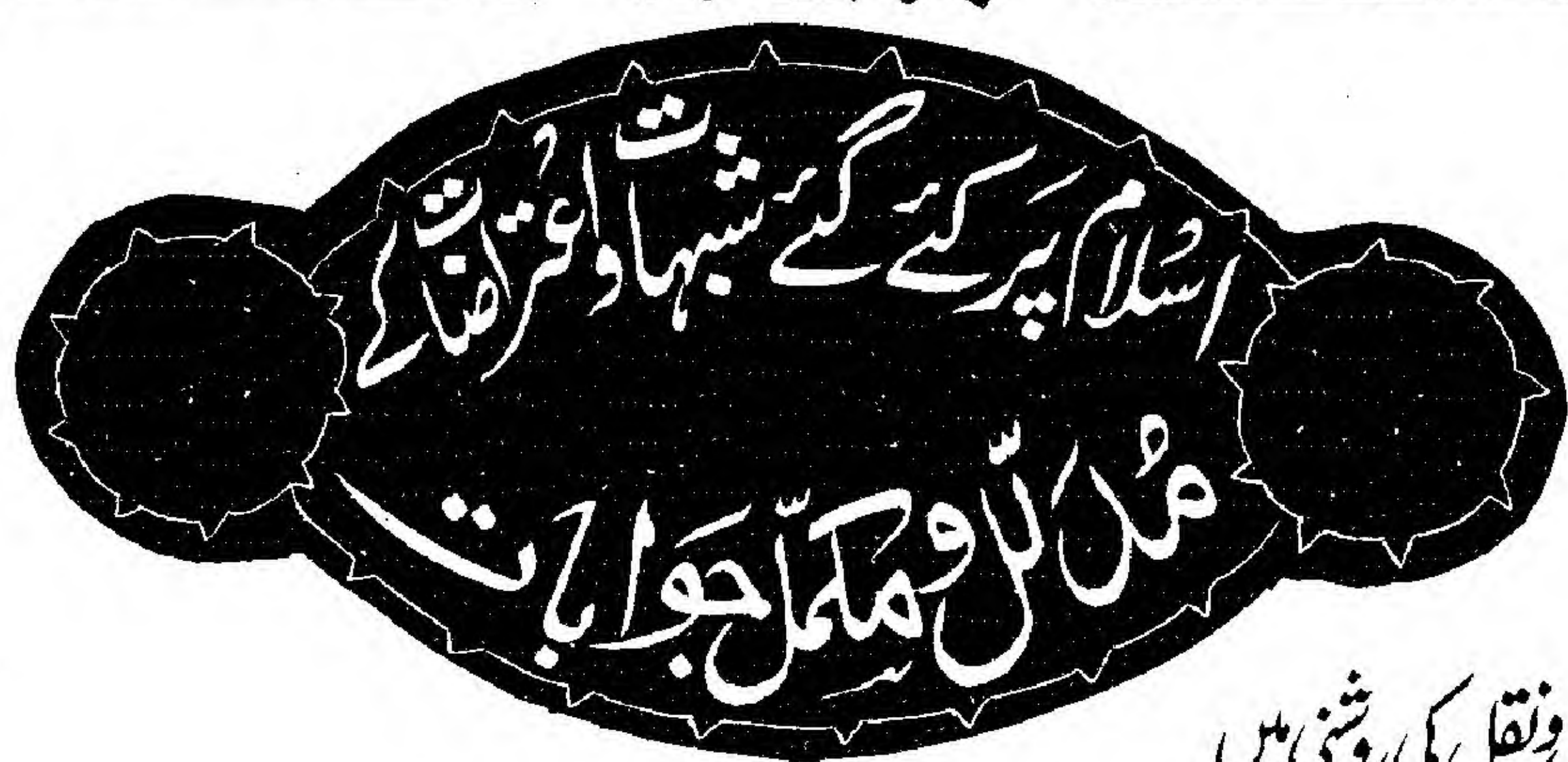
اردو عکسی مکمل

تصنیف	حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ
اضافات	حضرت مولانا مفتی ظفر الدین مفتی دارالعلوم دیوبند
طابع	وقار علی ابن مختار علی
مطبع	تھانوی آفسیٹ پرنٹرز
ناشر	مکتبہ تھانوی دیوبند ضلع سہانپور
کاتب	قمر الدین اعظمی
صفحات	۶۲۲
سن طباعت عکسی ایڈیشن	اپریل ۱۹۹۰ء

== ناشر ==

مکتبہ تھانوی دیوبند یوپی

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۳۳	ایک واقعہ	۴۹	عقلی جواب
۳۸	ایک فلسفی کا قصہ	۵۰	مراحم خسروانہ سے فریب نہیں
۳۹	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عقیدہ	۵۱	کھانا چاہیے۔
۴۰	ترک لذات زہد نہیں	۵۲	گنہگاروں کی مغفرت
۴۱	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر و ضبط	۵۳	ایک شبہ کا ازالہ
۴۲	آپ کے نکاح کرنے کی حکمتیں	۵۴	اللہ کا بے انتہا عفو و کرم
۴۳	امت کو بتانا تھا کہ عورتوں کے ساتھ	۵۵	کفر سے پہلے والے گناہ
۴۴	کیسے رہنا چاہیے؟	۵۶	مسلمانوں کا جانوروں کو ذبح کرنا
۴۵	حکمت سوم	۵۷	عقل و نقل کی روشنی میں۔
۴۶	دل کے میلان پر قابو نہیں ہوتا	۵۸	ایک حکایت
۴۷	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ کی شادی	۵۹	مسلمانوں کی رحم دلی
۴۸	حبشیوں کا کھیل	۶۰	ذبح کرنے پر اعتراض اور اس کا جواب
۴۹	بیوی کی رعایت	۶۱	مردہ کو دفن کرنا بہتر ہے یا جلا دینا
۵۰	وقار کا بھوت	۶۲	حصہ اول ختم شد
۵۱	حکمت چہارم		
۵۲	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج فرمانا		
۵۳	مزاج کی دوسری حکمت		
۵۴	مزاج سے رعب کم ہوتا ہے		
۵۵	مرتد کا درجہ کافر اصلی سے کیوں بڑھا ہوا؟		
۵۶	ارتداد کا انجام		
۵۷	مسلمان کا اقدام علی الکبائر اور اس کی وجہ		
۵۸	ایک مسلمان کا واقعہ		
۵۹	دیانت داری کا دوسرا واقعہ		
۶۰	عقیدہ کا اثر		



عقل و نقل کی روشنی میں

از:- محمد ظہیر الدین مفتی دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند انگریزی دور حکومت کا سب سے پہلا اسلامی مدرسہ ہے، جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تحریک اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے مشورہ اور مقامی علماء کے تعاون سے قائم ہوا، اس نے اپنی بے سرو سامانی کے باوجود برصغیر میں جو تعلیمی اور علمی و دینی انجام دی، وہ ہندوستان کی تاریخ کا نمایاں باب ہے، یہاں سے ہزاروں علماء و صلحا اور اولیاء اللہ پیدا ہوئے، جنہوں نے ملک و ملت کی بیش بہا خدمات انجام دی، اور ان کے فیوض و برکات سے لاکھوں مسلمانوں نے ایمان و یقین کی لذت پائی، اور تعلیمات نبوی کی اشاعت و ترویج میں امتیازی رول ادا کیا، اور آج بھی دارالعلوم دیوبند اپنی اسی پرانی شاہراہ پر گامزن ہے۔ اور کتاب و سنت کی تعلیم میں مشغول ہے۔

ممتاز فرزند ان دارالعلوم دیوبند کے انہی گئے چنے علماء میں حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ذات اقدس بھی ہے، جو بلاشبہ اپنے دور کے امیر قافلہ تھے، اور جنہوں نے ایسے تجدیدی کارنامے انجام دیے، جن سے ملت اسلامیہ کا مستقبل روشن ہو گیا، اور بدعت و خرافات کے بادل چھٹ گئے۔

آپ کی ایک ہزار سے زیادہ تصنیفات و تالیفات اور مواعظ مطبوعہ شکل میں اب بھی موجود ہیں۔ جن کے نور سے مسلمانوں کے دل منور ہیں۔ اور گم گشتہ راہ لوگ، اسلام کی شاہراہ پانے میں کامیاب ہیں حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے انگریزی دور حکومت میں ان تمام شبہات و اعتراضات پر گہری نظر رکھی، جو مخالفین اسلام کی طرف سے پیدا ہوتے رہے، یا پیش کئے جاتے رہے، اور پھر ان تمام کا منقول مدلل و مکمل جواب لکھا اور اپنے مواعظ میں بیان فرمایا، جس کی برکت سے دشمنان اسلام کے سارے الزامات و شبہات اور اعتراضات ختم ہو گئے اور مسلمانوں کا ذہن فکر اسلامی تعلیمات کے سلسلہ میں مطمئن اور پرسکون ہو گیا

اسی سلسلہ کی ایک کڑی اشرف الجواب نامی کتاب ہے، جو اہل علم اور عوام و خواص میں کافی مقبول ہے، مکتبہ تھانوی دیوبند جو اس وقت دیوبند کا سب سے اہم اور مرکزی کتب خانہ ہے، اس کا مالک عزیز کرم وقار علی سلمہ کی خواہش ہوئی کہ یہ کتاب جس طرح اپنے مضامین میں ممتاز ہے، کتابت طباعت میں بھی امتیازی شان سے لوگوں کے سامنے آئے اور اسے آفسٹ سے شائع کیا جائے۔

انھوں نے مجھ سے کہا کہ اس پر میں نظر ثانی چاہتا ہوں، اور ضمنی عنوانات کا اضافہ کر دیا جائے ساتھ ہی ان آیات کا ترجمہ و احادیث نبوی کا ترجمہ کر دیا جائے، جن کا ترجمہ نہیں ہو سکا ہے، اور جہاں جہاں عربی کے سخت الفاظ آجائیں حاشیہ پر ان کا معنی بھی درج کر دیا جائے،

چنانچہ اس کام کو اپنے لئے سعادت سمجھ کر پوری کتاب کا اسی نقطہ نظر سے میں نے مطالعہ کیا، اور جو خدمت سپرد کی گئی تھی اس کی تکمیل کی سعی کی ہے، اب کتاب آپ کے سامنے ہے خود مطالعہ کر کے اندازہ لگائیں، مجھے توقع ہے اس سے اس کی افادیت میں کافی اضافہ ہو جائے گا۔

آخر میں خاکسار اپنی کتاب مشاہیر علماء دیوبند سے حضرت اقدس کی مختصر سوانح نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہے۔

حضرت حکیم الامتہ تھانوی قدس سرہ

وفات ۱۳۲۲ھ

فراغت ۱۳۲۵ھ

ولادت ۱۲۸۵ھ

آپ ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۵ھ یوم چہار شنبہ کو بوقت صبح صادق اپنے وطن تھانہ بھون ضلع مظفرنگر میں پیدا ہوئے، پہلے حفظ قرآن کیا، فارسی مولانا فتح محمد تھانوی سے پڑھی، ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، مشکوٰۃ، مختصر المعانی اور طاحسن وغیرہ سے پڑھنا شروع کیا تھا، ۱۳۰۵ھ میں باضابطہ فراغت حاصل کی، قرأت اور تجوید آپ نے قاری محمد عبداللہ مہاجر کی سے حاصل کی۔

فراغت کے بعد تدریس کیلئے کانپور تشریف لے گئے، پہلے تین چار ماہ مدرسہ فیض عام میں قیام رہا۔ پھر مستقل طور پر مدرسہ جامع العلوم میں منتقل ہو گئے اور عرصہ تک اس مدرسہ میں رہ کر درس و تدریس، افتاء اور دعوت کی خدمات انجام دیتے رہے ۱۳۱۵ھ میں سب کچھ چھوڑ کر کانپور سے تھانہ بھون آ گئے، اب پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ آپ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی سے بیعت تھے۔ اور خلافت بھی سرفراز ہو چکے تھے، چنانچہ ربیع الاول ۱۳۱۵ھ سے بیعت و ارشاد کی خدمت میں مشغول ہو گئے، لاکھوں علماء و صلحا مشائخ اور خواص و عوام آپ کے میں داخل ہوئے، انہیں سے ۴۴ مجاز بیعت ہوئے، ۵۹ مجاز صحبت قرار پائے ایک ہزار سے زیادہ تصانیف اور آپ کے مواعظ شائع ہوئے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

بعد الحمد والصلوة حقیر ناچیز سراپا تقصیر علی محمد لاہوری مظہر مدعا ہے کہ حضرت اقدس سیدنا و مرشدنا حکیم الامت مجدد الملت جامع شریعت و طریقت مولانا و مقتدانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی دامت برکاتہم نے اسلام پر اغیار کے اعتراضات اور خود مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے اور بالخصوص تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اعتراضات کے جوابات اپنی مختلف تقریروں اور تحریروں میں دیے ہیں۔ چنانچہ حصہ اول میں جو جناب کے سامنے موجود ہے کفار کے بیس اہم اعتراضات کے دندان شکن جوابات ہیں ان سب کو مع حوالہ صفحات و اسرار مواعظ و ملفوظات ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اور سہولت کے لئے اور ضرورت کے وقت حوالہ دیکھنے کے لئے ان مواعظ و ملفوظات کی فہرست ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

۱۔ روح البع والنج (۲) ملفوظات، مجادلات معدلت ملحقہ دعوات عبدیت حصہ سوم، ازالة الغفلتہ شعب الایمان، محاسن اسلام، الرفع والوضع، تقلیل الکلام، الحدود والقیود، انصار المحبوب۔

اس کے دوسرے حصہ میں رسومات و بدعات کی تردید اور اشہات کا حل کثیر الوقوع اغلاط کی تردید اور اس کے تیسرے حصہ میں جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ان شکوک و شبہات و اعتراضات کا جواب جو سائنس جدید کی رو سے پیش آتے ہیں۔

کیا اسلام بزورِ مشیر پھیلا ؟ !

جواب :- اگر تلوار کے زور سے لوگ اسلام لاتے تو ان کے قلوب (دلوں) پر تلوار کا اثر کیسے ہو جاتا ہے اور دل پر اثر ہو جانے کی دلیل یہ ہے کہ ان کے عادات نہایت پاکیزہ اور شریعت مطہرہ کی تعلیم کے بالکل مطابق ہو گئے تھے۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زرہ چوری ہو گئی تھی۔ ایک یہودی کے پاس ملی، آپ نے دیکھ کر پہچان لیا اور فرمایا کہ یہ میری زرہ ہے، یہودی کے گواہ لاؤ۔ حضرت علی کی زرہ کا واقعہ

رعایا کو زبان سے آزاد کیا، عمل سے بھی دکھلادیا کہ ایک یہودی رعایا کی یہ جرات ہے کہ وہ صاحب سلطنت خلیفۃ المسلیین سے کہتا ہے کہ گواہ لاؤ! حالانکہ یہودی خود ایک ذلیل قوم تھی، جب سے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سرکشی کی تھی اس وقت سے

برابر ذلت و خواری ہی کی حالت رہے اور اب بھی جہاں ہیں ذلیل و خوار ہی ہیں۔ سچ کہا ہے سہ عزیز سے کہ از در گہش سر تباقت بہر در کہ شد پیچ عزت نیافت جس عزیز نے بھی اس کے آستانے سے منہ موڑا وہ جس دروازہ پر گیا تمام عزتوں سے منہ موڑا پس ایک تو اس کو قومی ذلت اور پھر یہ کہ آپ کی قلم و حکومت کا رہنے والا، مگر اس پر بھی یہ جرات ہے، صاجو یہ ہے حقیقی آزادی نہ وہ جو آج کل اختیار کی گئی ہے کہ دین سے نکل گئے خدا کو چھوڑا، رسول کو چھوڑا، آزادی یہ ہے کہ کسی صاحب حق کی زبان بند نہ کریں، کسی پر ظلم نہ کریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ ایک یہودی کا کچھ فرض آپ کے ذمہ تھا، ایک روز اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بیباکانہ کچھ الفاظ کہے صحابہ کرامؓ نے ان کو دھمکایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ان صاحب الحق مقالہ (حق) والے کو بولنے کا موقع ہوتا ہے تو آزادی یہ ہے کہ حکومت میں رعایا کو اتنا آزاد کر دیں، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ نے اپنے عمل سے اتنا آزاد بنا دیا تھا کہ اس یہودی نے کہا کہ گواہ لاؤ یا ناش کرو، چنانچہ حضرت شریح رضی اللہ عنہ کے یہاں جو اس وقت قاضی تھے۔ اور حضرت عمرؓ کے وقت سے اسی عہدہ جلیلہ پر چلے آ رہے تھے۔ اور جا کر ناش دائر کی، دونوں مذعی اور مدعا علیہ بن کر مسادات کے ساتھ عدالت میں گئے۔ حضرت شریح رضی اللہ عنہ نے موافق قاعدہ شریعت کے پوچھنا شروع کیا۔ یہ نہیں کہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے آنے سے، لچل پڑ جائے، غرض نہایت اطمینان سے اس یہودی سے پوچھا کہ کیا زرہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہے؟ اس نے انکار کیا، اس کے بعد حضرت علیؓ سے کہا کہ گواہ لائیے۔

قاضی کا فیصلہ | اللہ اکبر ذرا آزادی دیکھئے کہ ایک قاضی سلطنت خود امیر المؤمنین سے گواہ طلب کر رہے ہیں اور امیر المؤمنین بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ جن پر احتمال دعویٰ خلاف واقعہ کا ہو ہی نہیں سکتا تھا، مگر یہ محض ضابطہ کی بدولت تھا۔ واللہ جن لوگوں نے تمدن سیکھا اسلام سے سیکھا اور پھر بھی اسلام کے برابر عمل نہ کر سکے غرض حضرت علی رضی اللہ عنہ دو گواہ لائے ایک امام حسن رضی اللہ عنہ (جو آپ کے صاحبزادے تھے) اور ایک اپنا آزاد کردہ غلام جن کا نام قنبر تھا حضرت شریح رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں یہ مسئلہ مختلف فیہ تھا کہ حضرت شریح رضی اللہ عنہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں جائز نہ سمجھے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں جائز تھی اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو

کو پیش کر دیا۔ آج اختلاف پر علماء کو برا بھلا کہا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ اختلاف پہلے ہی سے چلا آ رہا ہے مگر آج کل کی طرح علماء کو برا بھلا کہنا نہ تھا۔ ایک دوسرے کی تکفیر و تفضیل نہ کرتے تھے۔ آج کل سب دشم دگالی گلوچ کی زیادہ تر وجہ علاوہ نفسانیت کے ایک یہ بھی ہے کہ ہر جگہ اصغر کی عملداری ہے اکابر (بڑے) خود آپس میں ملتے نہیں کہ اصل بات کا پتہ چل سکے۔ جس طرح چھوٹے کہہ دیتے ہیں اسی کو صحیح سمجھا جاتا ہے یہ نہیں کرتے کہ راوی بیان کرنے والے کو ڈانٹ دیں۔

غرض حضرت علیؓ کا یہ مذہب تھا کہ بیٹے کی گواہی معتبر ہے اور حضرت شریح رضی اللہ عنہ اس کو مانتے نہیں تھے۔ حضرت شریح رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد پر عمل کیا اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی گواہی نہیں مانی، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ غلام چونکہ آزاد ہو چکا ہے۔ اس کی گواہی تو مقبول ہے، مگر بجائے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے کوئی اور گواہ لائیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اور تو گواہ کوئی نہیں ہے۔ آخر حضرت شریح رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ خارج کر دیا۔ اگر آج کل کے معتقد ہوتے تو حضرت شریح رضی اللہ عنہ سے لڑتے مرنے قاضی کے فیصلہ پر مست | لیکن حضرت شریح رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ ان کی طرح مذہب فروش نہ تھے۔ وہ مذہب کے ہر امر پر جان فدا کرتے تھے۔ اگر حضرت شریح رضی اللہ عنہ سے پوچھا جاتا تو وہ قسم کھا کر کہہ سکتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سچے ہیں لیکن چونکہ ضابطہ شریعت اجازت نہیں دیتا تھا، اس لئے آپ نے اپنی عقیدت پر کاروائی نہیں کی۔

یہودی کا قبول اسلام | آخر باہر آ کر یہودی نے دیکھا کہ ان پر تو ذرا بھی ناگواری کا اثر ظاہر نہ ہوا باوجودیکہ آپ اسد اللہ ہیں (اللہ کے شیر) برسر حکومت ہیں تو کس چیز نے ان کو برہم نہیں کیا، غور کر کے کہا کہ حقیقت میں اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ کا مذہب بالکل سچا ہے یہ اثر اسی کا ہے، لیجئے یہ زرہ آپ ہی کی ہے اور میں مسلمان ہوتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اشهد ان لا الہ الا اللہ و اشهد ان محمدًا عبده و رسولہ۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ میں نے یہ زرہ تجھی کو دی، غرض وہ یہودی مسلمان ہو گیا۔ اور آپ ہی کے ساتھ رہا۔ حتیٰ کہ ایک اسلامی لڑائی میں شہید ہو گیا۔ اب بتلایئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار پر دیکھ کر مسلمان ہو یا اس کو نیام میں دیکھ کر۔ (دعوت ازالۃ الغفلۃ ص ۷)

اہل یورپ کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کے زور سے زیادہ کام لیا گیا ہے اور اس کے لئے دلیل میں وہ واقعات جنگ پیش کرتے ہیں کہ سلاطین نے کس قدر خونریزیاں کی ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ یہ کوئی عاقل نہیں کہہ سکتا کہ جنگ مطلقاً تمدن کے خلاف ہے۔ آج متحد قوتیں بھی ضرورت کے موقع پر جنگ کرتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ بروقت ضرورت لڑائی کرنا تہذیب و تمدن کے اعتبار سے جائز ہے، بس اب میں ظالم سلاطین کی تو طرف داری نہیں کرتا البتہ خلفائے راشدین کی بابت میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ انھوں نے بنارس ضعیف و کمزور بنیاد پر کبھی جنگ نہیں کی، کسی قوی سبب کی بنا پر ہی وہ لڑائی کرتے تھے اور لڑائی کے متعلق اسلامی قانون اگر مخالفین کی نظر سے گذرتا تو کبھی یہ لفظ زبان سے نہ نکالتے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے، قوانین جنگ اسلام نے بہت سے بتلائے ہیں مگر میں اس وقت ایک مختصر قانون بیان کرتا ہوں۔

قانون اسلام اسلام کا مسئلہ ہے اور خلفائے راشدین کا اس پر ہمیشہ عمل درآمد رہا ہے کہ اگر کوئی شخص مقابلے کے وقت تمہارے باپ کو، تمہارے بیٹے کو اور تمہارے بھائی کو، غرض سب متعلقین کو قتل کر ڈالے اور عرصہ تک خونریزی کرتا رہے۔ پھر کسی وقت قابو میں آجائے اور تم اس سے بدلہ لینا چاہو اور وہ زبان سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہے تو حکم ہوتا ہے کہ اس کو فوراً چھوڑ دو۔ اگرچہ تم کو کامل یقین ہو کہ اس نے جان کے خوف سے ہی کہا ہے اور دل سے اسلام نہیں لایا ہے تب بھی فوراً اس سے تلوار اٹھا لو ورنہ اگر تم نے اس کو مارا تو تم جہنم میں جاؤ گے، اگرچہ یہ بھی خطرہ ہو کہ یہ اس وقت جان بچا کر پھر تم کو قتل کرے گا، جو کچھ چاہے ہو اب اس کا قتل کرنا ہرگز جائز نہیں۔ تو جس مذہب نے اتنی بڑی سپرد وصال دوسروں کے ہاتھوں میں دیدی ہے، اب اس کے بارے میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ بزور شمشیر پھیلا ہے یقین جانیے اس قانون پر ہمارے سلف صالحین پوری طرح عمل کرتے تھے۔

ہرمزان کا واقعہ ہرمزان نے مسلمان کو بہت سی ایذایں پہنچائی تھیں آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گرفتار کر کے لایا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر اسلام پیش کیا مگر اس نے نہ مانا۔ آپ نے اس کے قتل کرنے کا حکم دیا، اس نے ایک چال چلی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے آپ کو قتل تو کرتے ہی ہیں تھوڑا پانی منگادیں پانی منگایا۔ جب پانی منگایا تو

لے شائستگی لے اپنے کو مہذب کہنے والا۔

اس نے کہا کہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ پانی نہ پنی سکوں اور جلد مجھ پر تلوار چلا دے۔ آپ نے فرمایا نہیں جب تک تم یہ پانی نہ پی چکو گے تو اس وقت تک قتل نہ کئے جاؤ گے۔ یہ سنا اس نے پانی فوراً زمین پر پھینک دیا، اور کہا کہ اب مجھ کو قتل نہیں کر سکتے، کیونکہ اس پانی کا پینا ممکن نہیں اور اس کے پینے تک مجھ کو امن تھا۔ آپ نے اس کو آزاد کر دیا۔ ہرمزان کو اپنی ذات پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ خوب جانتا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمان پر کہ تم جب تک پانی نہ پی چکو گے قتل نہ کئے جاؤ گے ہرگز قتل نہ کریں گے، یہ واقعہ دیکھ کر ہرمزان فوراً اسلام لے آیا۔ کہ واقعی یہ دین برحق ہے جس میں مخالف کے ساتھ بھی اتنا سلوک کیا جاتا ہے۔

اس واقعہ کو بیان کرنے سے میرا مقصود یہ ہے کہ اسلام کی یہ تعلیم ہے اور اس پر خلفائے راشدین اس طرح پابندی کی ہے کہ انکی نظیر آج تک کوئی دکھا نہیں سکتا۔ ہاں پچھلے بادشاہوں کے ہم ذمہ نہیں ہیں اگر انھوں نے ظلم کیا ہے بھگتیں گے۔ ہمارے اسلاف نے ان قوانین پر پورا عمل کیا۔ اور ان کو ترقی و عروج بھی ایسا نصیب ہوا جو کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا۔ صحابہ کے طرز کا دوسری قوموں پر ایسا اثر تھا کہ بہت لوگ جاسوس بن کر آئے مگر ان حضرات کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے۔

(وغض شعب الایمان ص ۱۱۱)

ہندوستان کی مثال لوگ اسلام کو بدنام کرتے ہیں کہ وہ تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ واللہ بالکل غلط ہے۔ اگر مسلمانوں کو لوگوں کے زور سے مسلمان کیا کرتے تو آج ہندوستان میں جہاں اسلامی حکومت چھ سو برس تک رہی ہے ایک بھی ہندو باقی نہ رہتا۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب اس اعتراض کے متعلق یہ ہے کہ اگر اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے تو یہ بتاؤ کہ وہ شمشیر زن کہاں سے آئے تھے؟ کیونکہ تلوار خود سے تو چل نہیں سکتی تو جن لوگوں نے سب سے پہلے تلوار چلائی ہے یقیناً وہ تلوار سے مسلمان نہیں ہوئے تھے، کیونکہ ان سے پہلے تلوار چلانے والا کوئی تھا ہی نہیں، تو ثابت ہو گیا کہ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا۔

مدینہ میں اسلام تاریخ سے ثابت ہے کہ جہاد مدینہ منورہ میں اگر شروع ہوا اور اہل مدینہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے ہی زیادہ تر مسلمان ہو چکے تھے، آخر ان کو کس تلوار نے مسلمان کیا تھا اور مکہ معظمہ میں جو کئی سو آدمی مسلمان ہوئے اور کفار کے ہاتھوں سے اذیتیں برداشت کرتے رہے وہ کس تلوار سے مسلمان ہوئے تھے۔

جہشہ میں اسلام پھر ہجرت مدینہ منورہ سے پہلے بعض صحابہؓ نے جہشہ کی طرف ہجرت کی ہے اور وہاں کفار قریش کے ساتھ مسلمانوں کا مناظرہ ہوا اور نجاشی شاہ جہشہ نے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی زبان سے قرآن شریف سنا کر بے تحاشہ رونا شروع کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن شریف کی حقانیت کی گواہی دی اور اسلام قبول کیا۔ اس پرسی کی تلوار تلوار چلی تھی۔ اسی طرح صد ہا واقعات تاریخ میں موجود ہیں جن سے ثابت ہے کہ اسلام محض اپنی حقانیت سے پھیلا ہے۔

خصوصاً عرب کی قوم جو جنگ جوی میں شہرہ آفاق ہے وہ کبھی اور کسی طرح تلوار کے خوف سے اسلام کو قبول نہ کر سکتی تھی ان کے نزدیک لڑنا مزاممولی بات تھی مگر دین کا بدلنا سخت عیب ہے وہ ہرگز تلوار کے خوف سے اسلام نہیں لاسکتے تھے۔ اس پر شاید یہ سوال ہو کہ پھر جہاد کس لئے مشروع ہوا تو خوب سمجھ لو کہ جہاد حفاظت اسلام کے لئے مشروع ہوا نہ کہ اشاعت اسلام کے لئے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ لوگ اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے غلطی میں پڑے ہو گئے ہیں جہاد کی مثال آپریشن جیسی ہے کیونکہ مادے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک متعدی اور ایک غیر متعدی جو مادہ غیر متعدی ہوتا ہے اس کو دواؤں کے ذریعہ سے دیا جاتا ہے، کوئی مرہم لگا دیا، یا اس کی ماسح کر دی وہ دب گیا۔ اور متعدی مادہ کے لئے آپریشن کیا جاتا ہے، اس کو چیر کر نکال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح دشمنان اسلام دو طرح کے ہیں بعض تو جن سے صلح کر لینی مناسب ہوتی ہے وہ صلح کر کے مسلمانوں کو ستانا چھوڑ دیتے ہیں اور ان سے تو صلح و مصالحت کر لی جاتی ہے بعض ایسے موذی اور مفسد ہوتے ہیں کہ صلح پر آمادہ نہیں ہوتے یہ مادہ متعدی ہے ان کے واسطے آپریشن کی ضرورت ہے۔ اسی کا نام جہاد ہے پس جہاد سے لوگوں کو مسلمان بنانا مقصود نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی حفاظت مقصود ہے۔

لوگ عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ کو بدنام کرتے ہیں کہ انھوں نے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کیا ہے یہ بالکل غلط ہے۔ عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ پابند شرع تھے۔ بارہ ہزار تین احادیث کے حافظ تھے۔ قرآن شریف لکھ کر ہدیہ کر کے گزارا کرتے تھے۔ اپنے خرچ میں خزانہ کا ایک پیسہ نہ لاتے تھے۔ ان کے سامنے لا اکڑاۃ فی الدین کا حکم موجود تھا۔ وہ اس کے خلاف کیونکر کر سکتے تھے یہ تو پہلے واقعات تھے۔ ان سے قطع نظر کر کے میں پوچھتا ہوں کہ اچھا اس وقت جو لوگ ہندوستان میں اسلام لاتے ہیں وہ کیوں مسلمان ہوتے ہیں،

ان پر کون سی تلوار کا زور ہے یقیناً اس وقت کسی طرح بھی ان پر زور نہیں ہے بلکہ ہر طرح آزادی ہے نہ ہم ان کو کسی طرح کی طمع دلا سکتے ہیں مسلمان کے پاس اتنا مال ہی نہیں جو وہ طمع دلا کر کسی کو مسلمان کریں بلکہ یہ حالت ہے کہ آج کوئی نو مسلم اسلام لایا تو کل کو اس سے بھی دینی کاموں میں چند ماہ مانگتے ہیں اور اگر کوئی اسلام لاتے وقت ہم سے روپیہ کی درخواست کرے تو ہم صاف کہتے ہیں کہ تم اپنی نجات کے واسطے اسلام لاتے ہو تو لاؤ ورنہ ہم کو لالچ کے ساتھ مسلمان کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ جو دولت ہم تم کو دے رہے ہیں اس کے مقابلہ میں اگر تم خود ہم کو نذرانہ دو تو بہت بجا ہے، لیکن باوجود اس آزادی اور اس استغفار کے پھر بھی بہت سے لوگ اسلام لاتے ہیں اور لارہے ہیں۔ اور اسلام لاتے ہی ان کے ایسی حالت ہوتی ہے کہ گویا بچھا ہوا محبوب ان کو مل گیا۔ ایک ہندو اسلام لانے کے بعد خدا کی محبت اور اس کی یاد میں اس قدر روتا تھا کہ جس کا بیان نہیں اور کہتا تھا مجھ کو تو اب معلوم ہوا کہ خدا کس کو کہتے ہیں۔ عرض اس کی عجیب حالت تھی۔ (دعوتِ محسن اسلام ص ۵۷)

کیا خدا اس پر قادر نہیں کہ کافر کی مغفرت کر دے

جواب :- (۱) اسلام وہ چیز ہے کہ اس کے بغیر مغفرت و نجات ممکن نہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ خدا اس پر قادر نہیں کہ کافر کی مغفرت کر دے بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ کافر کی مغفرت چاہیں گے نہیں۔ گو قادر ضرور ہیں۔ ورنہ تعدیب کافر پر خدا کا منظر ہونا لازم آئے گا۔ اور اضطراب منافی وجوب ہے۔ اور بدون ایمان و اسلام کے حق تعالیٰ کا کسی کی مغفرت نہ چاہنا قرآن شریف میں جا بجا مذکور ہے چنانچہ ایک آیت تو وہی ہے ان الله لا یغفر ان یشرک بہ مگر شاید اس پر کوئی شبہ کرے کہ یہاں تو صرف مشرک کا ذکر ہے کفر کا ذکر ہی نہیں۔ اور بعض کافر ایسے بھی ہیں جو مشرک نہیں بلکہ موحد ہیں، مگر اسلام سے آبار کرتے ہیں۔ ان کی مغفرت نہ ہونا اس آیت میں کہاں مذکور ہے تو اس لئے دوسری جگہ مذکور ہے۔

ان الذین کفروا من اهل الکتاب والمشرکین ترجمہ۔ بیشک اہل کتاب اور مشرکوں میں سے جنھوں نے فی نا جہنم خالدین فیہا اولئک ہم شر البریۃ کفر کیا وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہیں گے یہ لوگ نیامیں بدترین ہیں

لہ بیشک اللہ شر مشرک کرنے والوں کو نہیں بخشنے گا۔

اس میں کافر کو اہل کتاب اور مشرکین کا مقسم قرار دیا گیا ہے اور دونوں کے لئے خلود فی جہنم مذکور ہے جس سے کافر کی مغفرت نہ ہونا بھی معلوم ہو گئی اور یہ شبہ نہیں رہا کہ یہاں تو صرف خلود کا ذکر ہے جس کے معنی مکث طویل کے آتے ہیں اور اس کے لئے دوام لازم نہیں۔ جواب یہ ہے کہ دوام (میشگی) خلود کے منافی بھی نہیں۔ پس اگر کوئی قرینہ قائم ہو تو خلود سے دوام کا قصد ہو سکتا ہے۔ اور یہاں خلود بمعنی دوام ہونے پر قرینہ قائم ہے۔ وہ یہ کہ مشرکین کیلئے خلود بمعنی دوام ہی ہو گا۔ اور یہاں کافر مشرک دونوں کا حکم مذکور ہے جب مشرکین کیلئے خلود بمعنی دوام ہے تو کافر کے لئے بھی دوام ہی ہو گا۔ در نہ کلام واحد میں ایک لفظ سے جدا جدا معنی کا قصد لازم آئے گا۔ اور یہ متنبہ ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ بعض آیات میں کافر کے لئے خلود کو دوام سے موصوف بھی کیا گیا ہے۔

چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا قُطِعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِنْ نَارٍ يُثَبِّتُ اللَّهُ كَلِمًا اس ادا ان یخرج منها من غمہ اعیدوا فیہا اور ارشاد فرماتے ہیں وَالَّذِينَ كَفَرُوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ شِمًا قَوْلًا هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَخْفَ اللَّهُ لَهُمْ۔

پس کافر کا بھی ہمیشہ کے لئے معذب ہونا صاف طور سے ثابت ہو گیا جس سے اس کی عدم مغفرت بھی ثابت ہو گئی۔ اور یہاں سے ایک اشکال کے مندرجہ ہونے پر تنبیہ کیے دیتا ہوں وہ یہ کہ خلود کے معنی مکث طویل ہونے سے اس آیت کی تفسیر واضح ہو گئی جو قاتل عمد کے بارے میں وارد ہے۔ مَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فُجِّرَ عَنْهُ خَالِدًا فِيهَا کہ اس سے قاتل عمد کی توبہ کا قبول ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ اس میں خلود بدون قید دوام مذکور ہے اور خلود دوام کو مستلزم نہیں نہ کوئی قرینہ یہاں ارادہ دوام کے مرجع ہے اس لئے مدلول آیت صرف اس قدر ہے کہ قاتل عمد کو زمانہ دراز تک عذاب جہنم ہو گا۔ مگر کسی وقت نجات ہو جائیگی گو مدت دراز ہی کے بعد ہو اور جب وہ مستحق نجات ہے تو اس کی توبہ بھی قبول ہونی چاہیے اس میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اختلاف ہے کہ ان کے نزدیک قاتل عمد کے لئے توبہ نہیں مگر اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک قبول ہے پھر صحابہ کے بعد تابعین و تبع تابعین ائمہ مجتہدین کا اس پر اجماع ہو گیا کہ اس کی توبہ قبول ہو سکتی جب کہ قاعدہ شرعیہ سے ہو اور قاعدہ ہے کہ اجماع متاخر اختلاف مقدم کو رافع ہوتا ہے لہذا اب مسئلہ اجماعی ہے مگر کفار مشرکین کے لئے دوسری بعض آیات میں خلود کے ساتھ دوام بھی مذکور ہے۔ اس لئے وہاں مغفرت کا کوئی احتمال نہیں۔

لے زیادہ دنوں رہنا۔ لے ناممکن۔ دشوار۔

کیونکہ خلود کے معنی بہت دن رہنا ہے اور اب وہ ہے جس کا کبھی انقطاع نہ ہو۔ حاصل یہ ہو کہ کفار و مشرکین جہنم میں ایسی دراز مدت کے لئے داخل ہوں گے جس کا انقطاع نہ ہو گا اور ظاہر ہے کہ کفر کہتے ہیں خلاف اسلام کو اس کے ساتھ شرک بھی ہو یا نہ ہو۔ دونوں کے لئے سزا ابد الابد جہنم ہے جب ترک اسلام کی یہ سزا ہے تو اس سے اسلام کی نوعیت و فضیلت اور اس کی ضرورت کا درجہ معلوم ہو گیا۔ (ایضاً ص ۱۵)

اللہ تعالیٰ بغیر زبان کے کیسے کلام فرماتا ہے

ایک ہندو جو اپنے گرو میں عابد کہلاتا ہے میرے پاس اپنے ایک پندت کیساتھ آیا اور یہ سوال کیا کہ آپ لوگ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا کلام کہتے ہیں، حالانکہ کلام بے زبان کے ہو نہیں سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ کے زبان سے نہیں پھر اس نے کلام کیسے کیا، میں نے جواب دیا کہ ہم کو کلام کے لئے زبان کی ضرورت ہے لیکن خود زبان کو کلام کرنے کیلئے زبان کی ضرورت نہیں وہ خود اپنی ذات سے کلام کرتی ہے۔ اسی طرح ہم کان سے سنتے ہیں لیکن خود کان اپنی ذات سے سنتا ہے اس کو کسی اور آلہ کی ضرورت نہیں، ہم کو دیکھنے کیلئے آنکھ کی ضرورت نہیں وہ اپنی ذات سے دیکھتی ہے تو جب زبان اس پر قادر ہے کہ زبان کلام کرے تو اسی طرح اللہ تعالیٰ کو کلام کے لئے کسی آلہ کی ضرورت نہ ہو تو کیا تعجب ہے صفت کلام خود اس کی ذات میں موجود ہے۔ کلام خود اس کی ذات سے بلا زبان صادر ہوتا ہے۔ وہ ہندو اس جواب سے بہت خوش ہوا اور اپنے ہمراہی سے کہا دیکھو اس کو علم کہتے ہیں۔ پھر حضرت والائے فرمایا کہ اس سے پہلے کبھی میرے ذہن میں یہ جواب نہ تھا۔ الحمد للہ کہ اسی وقت بجانب اللہ یہ جواب میرے ذہن میں آیا۔ (مجادت مدلت لمحہ دعوات عبیدت حصہ سوم)

شریعت میں کفر کی سزا دائمی عذاب جہنم کیوں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارا مقدمہ تو مسلم ہے کہ سزا جنایت (جرم) کے مناسب ہونی چاہیے مگر کیا مناسب کے معنی یہ ہیں کہ جنایت اور سزا دونوں کا زمانہ بھی مناسب ہو۔ اگر یہی بات ہے تو چاہیے کہ جس جگہ دو گھنٹہ تک ڈکیتی پڑی ہو اور ڈاکو گرفتار ہو کر نہیں تو حاکم ڈاکوؤں کو

دو گھنٹے کی سزا دیدی۔ اگر حاکم ایسا کرے تو کیا آپ اس کو انصاف و رمانیں گے اور سزا کو جنایت کے مناسب مانیں گے۔ ہرگز نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ سزا اور جنایت میں مناسبت کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دونوں کا زمانہ مناسب و مساوی (برابر) ہو بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سزائیں شدت بقدر شدت جرم ہوا اب تم خود فیصلہ کرو شریعت نے کفر کی سزائیں جو شدت بیان کی ہے وہ شدت جرم کے مناسب ہے یا نہیں۔ اور یہ جرم شدید و سخت ہے یا نہیں۔ شاید آپ کہیں کہ جرم شدید تو ہے مگر نہ ایسا شدید کہ اس کی سزا ابدالاً بآباد جہنم ہو، میں کہوں گا کہ یہ خیال آپ کو اس لئے پیدا ہوا کہ تم نے صرف فعل کی ظاہری صورت پر نظر کی ہے حالانکہ سزا جزا کا مدار محض اس کی ظاہری صورت پر نہیں ہے، بلکہ نیت کو بھی اس میں بڑا دخل ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اصل مدار نیت ہی پر ہے۔

ایک مثال :- چنانچہ اگر ایک شخص دھوکے سے شراب پی لے تو اس کو گناہ نہیں ہوا۔ گو صورت گناہ موجود ہے کیونکہ نیت نہ تھی۔ اگر ایک شخص شراب پینے کے لئے دوکان پر جائے اور دوکاندار بجائے شراب کے کوئی شربت اس کو دیدے جسے یہ شراب سمجھ کر پیئے تو اس کو گناہ ہوگا۔ کیونکہ اس کی نیت تو اس کی شراب پینے ہی کی تھی۔ اس لئے فقہاء نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے جماعت (صحبت) کرے، مگر وہ اندھیرے میں یہ سمجھتا ہے کہ یہ میری بیوی نہیں بلکہ کوئی اجنبی عورت ہے تو اس کو گناہ ہوگا اسی طرح جماعت میں تصور کسی اجنبیہ کا کرے، یعنی بیوی سے جماعت کرتے ہوئے یہ تصور کرے کہ میں گویا فلاں اجنبیہ سے جماعت کر رہا ہوں، اور اس کی صورت ذہن میں حاضر ہو، اس سے لذت لے تب بھی گناہ ہوگا اور اگر شب زفاف میں عورتوں نے اس کے پاس غلطی سے بجلئے اس کی بیوی کے کسی دوسری عورت کو بھیج دیا جس کے ساتھ یہ شخص یہ سمجھ کر ہم بستر ہوا کہ یہ میری بیوی ہے تو اس کو گناہ نہ ہوگا اور یہ وطی زنا میں شمار نہ ہوگی بلکہ وطی بالنسبہ ہوگی جس سے ثبوت نسب بھی ہو جاتا ہے اور عدت بھی لازم ہوتی ہے۔

جب یہ بات معلوم ہو گئی تو سمجھو کہ ظاہر میں گو کفر کا فریاد تھا ہی ہے۔ مگر اس کی یہ نیت تھی کہ اگر زندہ رہا تو ابدالاً بآباد (ہمیشہ ہمیشہ) اسی حالت میں رہے گا اس لئے اپنی نیت کے موافق اس کو ابدالاً بآباد جہنم کا عذاب ہوگا۔ اور اسی طرح مسلمان کا اسلام کو تنہا ہی ہے مگر اس کی نیت یہ ہے کہ اگر میں ہمیشہ زندہ رہوں گا تو ہمیشہ اسلام پر مستقیم رہوں گا

اس لئے ابدالاً بآباد تک ثواب جنت میں ملے گا۔ (۲) دوسرا ایک دقیق (باریک) جواب یہ ہے کہ کفر سے حقوق الہیہ کی تفویض ہے اور حقوق الہیہ غیر تنہا ہی ہیں تو ان کی تفویض کی سزا بھی غیر تنہا ہی ہونی چاہیے اور اسلام میں حقوق الہیہ کی رعایت ہے اور وہ غیر تنہا ہی ہیں تو ان کی رعایت کا بدلہ بھی غیر تنہا ہی ہونا چاہیے الحمد للہ اب یہ اشکال بالکل مرتفع ہو گیا۔ (محاسن اسلام ص ۲)

کیا مسلمان کعبہ کی پرستش کرتے ہیں؟

جواب یہ ہے کہ ہم کعبہ کی پرستش نہیں کرتے بلکہ عبادت خدا کی کرتے ہیں اور صرف من قبلہ کی طرف کرتے ہیں اور اس کے لئے ہمارے پاس بہت سے دلائل ہیں ایک یہ کہ ہم خود اس کی معبودیت کی نفی کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ کوئی عابد اپنے معبود کی معبودیت کی نفی نہیں کیا کرتا دوسرے یہ کہ نماز پڑھتے ہوئے اگر کسی کے دل میں کعبہ کا خیال بھی نہ آئے، مگر کعبہ کی طرف منہ رہے تو نماز درست ہے چنانچہ بہت لوگ ایسے ہیں کہ مسجد میں اگر نماز شروع کر دیتے ہیں اور کعبہ کا خیال تک ان کو کچھ نہیں آتا پھر بھی ان کی نماز درست ہوتی ہے۔ اگر ہم کعبہ کے عبادت کرتے تو اس کی نیت کرنا شرط ہوتا مگر ایسا نہیں ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اگر کسی وقت کعبہ نہ رہے جب بھی نماز فرض رہے گی، اور اس کی طرف منہ کیا جاوے گا جہاں کعبہ موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان پتھر اور اینٹ کو نہیں پوجتے ورنہ انہدام کعبہ کے بعد نماز موقوف ہو جاتی۔ چوتھے یہ کہ اگر کوئی شخص صفت کعبہ پر نماز پڑھے تو اس کی نماز درست ہے اگر کعبہ مسلمانوں کا معبود ہوتا تو اس کے اوپر چڑھ کر نماز صحیح نہ ہوتی۔ کیونکہ اب اس کے سامنے نہیں ہے۔ دوسرے معبود (خدا) کے اوپر چڑھنا گستاخی ہے، اس حالت میں کسی طرح نماز درست نہ ہونا چاہیے تھی مگر فقہاء نے تصریح کی ہے کعبہ کی چھت پر بھی نماز صحیح ہے تو کیا معبود کے اوپر چڑھا کرتے ہیں۔ ہاں معترضین نے اپنے اوپر قیاس کیا ہوگا کہ وہ گائے اور بیل کو دیوتا اور معبود بھی سمجھتے ہیں پھر ان کے اوپر سواری بھی کرتے ہیں مگر اس کا خلاف عقل ہونا ظاہر ہے۔ (ایضاً)

کعبہ کی طرف منہ کر نیکار کا داوا :- اب آپ کو بتلاتا ہوں کہ استقبال قبلہ کا راز یہ ہے کہ عبادت کی روح دلجمعی اور یکسوئی ہے بدوں دلجمعی اور یکسوئی کے عبادت کی صورت ہی صورت ہوتی ہے روح نہیں پانی خالی اور یہ ایسی بات ہے جسکو تمام اہل ادیان تسلیم کرتے ہیں۔ اب سمجھئے کہ اجتماع خواطر میں اجتماع ظاہر کو بہت بڑا دخل ہے اس لئے نماز میں سکون اعضا کا امر ہے۔ التفات و عبرت سے ممانعت ہے صف کے سیدھا کرنے کا امر ہے کیونکہ صف کے ٹیڑھا کرنے سے قلب پریشان ہوتا ہے، عام قلوب کو اس کا احساس کم ہوگا، کیونکہ ان کو دلجمعی و یکسوئی بہت کم نصیب ہے۔ مگر جن کو نماز میں دلجمعی کی دولت نصیب ہے ان سے پوچھئے کہ صف ٹیڑھی ہونے سے قلب پر کیا اثر ہوتا ہے، صوفیہ قسم کھا کر کہتے ہیں صف غیر متکلم سے قلب کو بیجان و پریشان ہوتی ہے۔ اس دلجمعی کیلئے سجدہ گاہ پر نظر جمانے کی تاکید ہے۔ کیونکہ جگہ جگہ نظر گھمانے سے بھی قلب کو یکسوئی حاصل نہیں ہوتی۔ پس نماز میں اگر ایک خاص جہت مقرر نہ ہوتی تو کوئی کسی طرف منہ کرتا کوئی کسی طرف منہ کرتا اس اختلاف جہات و تبائن ہیئتات سے تفرق قلب ہوتا لہذا ایک سوئی کیلئے ایک خاص جہت مقرر کر دی گئی۔

کعبہ کی خصوصیت رہا یہ کہ کعبہ ہی کی جہت کیوں مقرر ہوئی۔ اور جہت کیوں نہیں ہوئی؟ اس سوال کا کسی کو حق نہیں۔ کیونکہ یہ سوال دوسری جہت کو بھی ہو سکتا ہے۔ کہ یہی کیوں ہوئی۔ دوسری کیوں نہ ہوئی۔ دیکھئے عدالت وقت مقرر کرتی ہے کہ کچھ ہی کا وقت فلاں وقت تک ہے تو آپ یہ سوال تو کر سکتے ہیں کہ وقت کو نیکی کیا ضرورت ہے جس کا جواب یہ دیا جائے گا۔ تاکہ کام کرنے والے سب کے سب متاثر نہ رہیں حاضر ہو سکیں اور رعایا اہل حاجت کو وقت مقرر ہونے سے اطمینان ہو جائے کہ عدالت کا یہ وقت ہے تو اس کے علاوہ اوقات میں وہ اپنے دوسرے کام کر سکیں اگر وقت مقرر نہ ہو تو ہر شخص کو تمام دن عدالت میں ہی رہنا پڑے کہ نہ معلوم کس وقت حاکم آجائے باقی اس سوال کا کسی کو حق نہیں کہ گورنمنٹ نے دس بجے سے چار بجے ہی تک کا وقت کیوں مقرر کیا کوئی اور وقت مقرر کر دیا ہوتا کیونکہ وہ کوئی بھی وقت مقرر کرتی یہ سوال تو کبھی ختم نہ ہو سکتا تھا۔ علی ہذا ہم کو یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ جہت کعبہ ہی کو استقبال کے لئے کیوں مخصوص کیا گیا۔ ہاں ہم نے اس کا راز بتلا دیا کہ خاص جہت کے تعین میں کیا مصلحت ہے۔ یہ جواب تو ضابطہ کا ہے۔ اور طالب

کے لئے یہ جواب ہے کہ حق تعالیٰ کو معلوم ہے کہ ان کی (یعنی حق تعالیٰ کی توجہ کس طرف زیادہ ہے جس طرف ان کی توجہ زیادہ تھی اسی کو جہت مقرر فرمایا ہے۔

کعبہ پر تجلیات الہی رہا یہ کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی توجہ کعبہ کی طرف زیادہ ہے سو جن کے آنسو ہیں وہ جانتے ہیں کہ واقعی کعبہ پر تجلیات الہیہ بہت زیادہ ہیں اور توجہ سے یہی مراد ہے اور وہی تجلیات روح کعبہ اور حقیقت کعبہ ہیں یہی وجہ ہے کہ کعبہ ظاہری کی چھت پر بھی نماز ہو جاتی ہے کیونکہ اس وقت کو صورت کعبہ سامنے نہیں مگر حقیقت کعبہ یعنی تجلی الہیہ تو سامنے ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان اصل تجلی الہی کا استقبال کرتے ہیں کعبہ کی دیواروں کا استقبال نہیں کرتے مگر چونکہ تجلی الہی کا احساس ہر شخص کو نہیں ہوتا اسلئے حق تعالیٰ نے اس خاص بقعہ کی حد مقرر فرمادی جس پر ان کی تجلی دوسرے مکانوں سے زیادہ ہے۔ پس یہ عمارت محض اس تجلی اعظم کی جگہ دریافت کرنے کیلئے ہے ورنہ خود عمارت مقصود بالذات نہیں چنانچہ انہدام عمارت کے بعد نماز کا موقوف نہ ہونا اور کعبہ کی چھت پر نماز کا درست ہونا اسکی دلیل ہے۔ فقہار نے اس راز کو سمجھا ہے اس لئے وہ فرماتے ہیں کہ قبلہ رخ وہ ہے جو کعبہ کی محاذات میں آسمان تک اور اس کے نیچے زمین کے اسفل طبقات تک سے لیکن چونکہ عمارت کعبہ اور اس جگہ کو تجلی الہی سے تلبس ہے اس تلبس کی وجہ سے اس میں بھی برکت آگئی۔

ایضاً ص ۶۶

حجر اسود کو بوسہ دینے کی وجہ

جواب یہ ہے کہ تقبیل حجر عظمت سے نہیں بلکہ محبت سے ہے جیسے بیوی بچوں کا بوسہ لیا کرتے ہیں۔ اگر بوسہ دینا عظمت کی دلیل ہے تو لازم آئے گا کہ ہر شخص اپنی بیوی کی عبادت کرتا ہے اور اس کا لغو ہونا بدیہی ہے معلوم ہوا کہ تقبیل (بوسہ دینا) عبادت و تعظیم کو مستلزم نہیں بلکہ کبھی محبت سے بھی تقبیل ہوا کرتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ تم حجر اسود سے محبت کیوں کرتے ہو اس کا جواب یہ ہے کہ میرے گھر کی بات ہے اس کے متعلق مخالف کو سوال کرنے کا حق نہیں دیکھئے اگر کوئی شخص عدالت میں یہ مقدمہ دائر کر دے کہ فلاں مکان میری ملکیت میں ہے تو اس سے اس پر ثبوت طلب کیا جائے گا۔ لیکن جب وہ ثبوت پیش کر دے گا تو خصم (مخالف) کو اس سوال کا حق نہیں کہ اچھا مکان تو تمہارا ہی ہے مگر یہ بتلا دو کہ اس گھر میں کیا کیا سامان

موجود ہے۔ یا کوئی شخص بیوی کا بوسہ لے تو اس سے یہ سوال تو ہو سکتا ہے کہ تم اس کا بوسہ کیوں لیتے ہو، لیکن جب وہ یہ بتلا دے کہ میں محبت کی وجہ سے بوسہ لیتا ہوں، تو پھر اس سوال کا کسی کو حق نہیں کہ تم کو بیوی سے محبت کیوں ہے۔ اور تم رات دن میں کتنے اس کے بوسے لیتے ہو اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس کی وجہ نہیں بتلا سکتے کہ ہم کو حجر اسود سے محبت کیوں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مخالفین کے اعتراض کا جواب اسی حد تک دینا چاہیے جہاں تک ان کو سوال کا حق ہے اور جو سوال ان کے منصب سے باہر ہو اس کا جواب نہ دینا چاہیے بلکہ صاف کہہ دینا چاہیے کہ تم کو اس سوال کا کوئی حق نہیں۔ مخالفین کا دماغ ہر بات کی حقیقت سمجھنے کے قابل نہیں۔ امور دقیقہ کو ان کے سامنے نہ بیان کرنا چاہیے۔ بعض لوگ اس پر تعجب کرتے ہیں کہ وہ وجہ کو نسی ہے جس کو ہم نہیں سمجھ سکتے ہیں آخر ہم بھی تو انسان ہیں اگر باریک بات ہمارے سامنے بیان کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کو ہم نہیں سمجھ سکیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ایسی بات ہے تو میں ایک ریاضی داں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اقلیدس کی کوئی شکل ایک گھس کھدے کو سمجھا دیں۔ جس نے اقلیدس کے مبادی و اصول موضوعہ کو کبھی نہ سنا ہو یقیناً وہ اقرار کرے گا کہ میں ایسے شخص کو اقلیدس کے اشکال نہیں سمجھا سکتا۔ آخر کیوں کیا وہ انسان نہیں۔ مگر بات وہی ہے کہ بعض امور کے لئے مبادی و مقدمات کا سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کے ذہن میں مبادی و مقدمات حاضر ہوں ہر شخص اس کو نہیں سمجھ سکتا اور یہ بالکل موٹی بات ہے مگر حیرت ہے کہ آجکل کے عقلا کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔

حجر اسود کو بوسہ دینے کا راز میں تبرعاً اس کا راز بھی بتلائے دیتا ہوں۔ تقبیل حجر اسود کے راز کے محض محبت اس کا منشاء ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس حقیقت کو مجمع عام میں ظاہر کر دیا۔ ایک بار آپ طواف کر رہے تھے اس وقت کچھ لوگ دیہات کے موجود تھے۔ جب آپ نے تقبیل حجر کا ارادہ کیا تو حجر کے پاس ذرا ٹھہرے اور فرمایا **انی اعلم انک الحجر** ۳۰

یعنی میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جو نہ کچھ نفع دے سکتا ہے اور نہ ضرر دے سکتا ہے اور اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھتا تو میں بھی تجھے بوسہ نہ دیتا کیا خشک معاملہ کیا ہے۔ حجر کے ساتھ۔ بھلا اگر مسلمان کا یہ معبود ہوتا تو کیا اس سے بھی خطاب کیا جاتا کہ نہ تو

نفع دے سکتا ہے نہ ضرر پہونچا سکتا ہے اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ اس تقبیل کا منشاء محض محبت کی وجہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بوسہ دیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فضلہ بھی کسی جگہ گرا ہو تو ہم کو اس جگہ سے محبت ہوگی۔ چہ جائے کہ وہ جگہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ لگے ہوں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ کا دہن مبارک لگا ہو۔

باخاک آستانش داریم جہہ سائی
بامید آنکہ جاناروزے رشیدہ باشد
رہا یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کیوں بوسہ دیا اس سوال کا کسی کو حق نہیں اور نہ ہم کو اس کو وجہ بتلانا ضروری ہے۔ ہاں اتنی بات یقین ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور عبادت و عظمت کے بوسہ نہیں دیا۔ ورنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بیباکی کیساتھ لا قنصر و تنفح نہ فرماتے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس تھے۔ جب انھوں نے حجر کیساتھ یہ معاملہ کیا تو یقیناً اس تقبیل کا منشاء عبادت ہرگز نہیں اور تبرعاً اس کا جواب بھی بتلائے دیتا ہوں کہ ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حجر کے اندر تجلیات الہیہ کا بہ نسبت دوسرے حصص بیت کے زیادہ ہونا منکشف ہوا ہو پس منشاء اس تقبیل کا تلبس زائد ہے۔ تجلیات الہیہ سے اور جس چیز کو محبوب کے الوار سے تلبس ہو اس کا بوسہ دینا اقتضائے محبت ہے۔
احمد علی الدیاب الخ ص ۳

غلامی کا مسئلہ کیا اسلام میں قابل اعتراض ہے؟

جواب :- معاشرت میں اسلام کا یہ حکم ہے کہ اپنے غلاموں کی ستر خطائیں روز معاف کیا کر داس سے زیادہ خطائیں ہوں تو کچھ نہ راد۔ بھلا غلاموں کے ساتھ یہ برتاؤ کوئی غیر مسلم کر سکتا ہے۔ غلام تو کجا اولاد کے ساتھ بھی کوئی ایسا برتاؤ نہیں کر سکتا مگر افسوس باوجود اس قدر رعایت کے پھر بھی مخالفوں کو اسلام کے مسئلہ غلامی پر اعتراض ہے میں کہتا ہوں کہ اسلام نے تو غلاموں کے ساتھ وہ برتاؤ کیا ہے کہ ان کے باپ بھی ان کے ساتھ ویسا نہیں کر سکتے تھے۔

مسئلہ غلامی کی اصل مسئلہ غلامی کی اصل یہ ہے کہ اس میں مخلوق کی جان بچائی گئی ہے کیونکہ جبکہ دشمن مسلمانوں کے مقابلے میں فوج کشی کرتا ہو اور اس کے ہزاروں لاکھوں آدمی مسلمانوں کے ہاتھوں میں قید ہوں تو اب ہمیں کوئی بتلا دے کہ ان

قیدیوں کو کیا کرنا چاہیے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ان سب کو رہا کر دیا جائے اس کا حاقق ہونا ظاہر ہے کہ دشمن کے ہزاروں لاکھوں کی تعداد کو پھر اپنے مقابلے کیلئے مستعد کر دیا۔ ایک صورت یہ ہے کہ سب کو فوراً قتل کر دیا جائے اگر اسلام میں ایسا کیا جاتا تو مخالفین جتنا شور و غل مسئلہ غلامی پر کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ اس وقت کرتے کہ دیکھئے کہ کیا سخت حکم ہے کہ قیدیوں کو فوراً قتل کر دیا گیا۔ ایک صورت یہ ہے کہ سب کو کسی جیل خانے میں بند کر دیا جاوے اور وہاں رکھ کر انکو روٹی کپڑا دیا جاوے یہ صورت گو کہ آج کل کی بعض متمدن سلطنتوں میں پسندیدہ ہے مگر اس میں چند خرابیاں بھی ہیں ایک یہ کہ اس سے سلطنت پر بڑا بار عظیم پڑتا ہے اور ان سے کمائی کرنا خود غرضی کی صورت ہے۔ پھر جیل خانے کی حفاظت کے لئے ایک خاص فوج مقرر کرنا پڑتی ہے۔ قیدیوں کی ضروریات کے لئے بہت سے آدمی ملازم رکھے جاتے ہیں، یہ سارا عملہ بیکار ہو جاتا ہے۔ سلطنت کے کسی اور کام میں نہیں آسکتا قیدیوں ہی کی حفاظت کا ہو رہتا ہے۔

جیل میں رکھ کر راحت پہونچانا پھر تجربہ شاید ہے کہ جیل خانے میں رکھ کر آپ چاہے قیدیوں کو کتنی ہی راحت پہونچائیں ان کی ان کو کچھ قدر نہیں ہوتی کیونکہ آزادی سلب ہونے کا غیظ ان کو اس قدر ہوتا ہے کہ وہ آپ کی ساری خاطر مدارات کو بیکار سمجھتے ہیں تو سلطنت کا اتنا خرچ بھی ہوا اور سب بے سود کہ اس سے دشمن کی دشمنی میں کمی نہ آئے پھر قید خانے میں ہزاروں لاکھوں قیدی ہوتے ہیں وہ سب کے سب علمی اور تمدنی ترقی سے بالکل محروم رہتے ہیں اور یہ سب سے بڑا ظلم ہے۔ اسلام نے اس کے بجائے یہ حکم دیا کہ جتنے قیدی گرفتار ہوں سب شکر والوں کو تقسیم کر دو، ایک گھر میں ایک غلام کا خرچ معلوم بھی نہ ہوگا۔ اور سلطنت بار عظیم سے بچ جائیگی، پھر چونکہ ہر شخص کو اپنے قیدی سے خدمت لینے کا حق بھی ہے اس لئے وہ اس کو روٹی کپڑا جو کچھ دیگا اس پر گراں نہ ہوگا۔ وہ سمجھے گا کہ میں تنخواہ دیکر نوکر رکھتا۔ جب بھی خرچ ہوتا اب اس سے خدمت لوں گا، اور اس سے معاوضہ میں روٹی کپڑا دوں گا۔ پھر چونکہ غلام کو چلنے پھرنے میں تفریح کرنے کی آزادی ہوتی ہے قید خانے میں بند نہیں ہوتا ہے اس لئے اس کو اپنے آقا پر غیظ نہیں ہوتا جو جیل خانے کے قیدی کو ہوتا ہے۔ اس حالت میں اگر آقا نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو اس کا احسان دل میں گھر کر لیتا ہے اور وہ اس کے گھر کو اپنا گھر اس کے گھر والوں کو اپنا عزیز سمجھنے لگتا ہے۔

یہ سب باتیں ہی نہیں بلکہ واقعات ہیں۔ پھر اس صورت میں غلام علمی اور تمدنی ترقی بھی تو کر سکتا ہے۔ کیوں کہ جب آقا غلام میں اتحاد ہو جاتا ہے تو آقا خود چاہتا ہے کہ میرا غلام مہذب و سائنس ہو، وہ اس کو تعلیم بھی دلاتا ہے، صنعت و حرفت بھی سکھاتا ہے چنانچہ اسلام میں صد ہا علماء زیاد عباد ایسے ہوئے ہیں جو اصل میں موالی تھے۔ غلاموں کے طبقہ نے تمام علوم میں ترقی حاصل کی بلکہ غلاموں کو بعض دفعہ بادشاہت بھی نصیب ہوتی ہے۔

محمود غزنوی کا ایک واقعہ سلطان محمود رحمۃ اللہ علیہ کو مخالفین بہت بدنام کرتے ہیں کہ انھوں نے تلوار سے اسلام پھیلایا ہے۔ مگر تاریخ میں ان کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ اس سے ان کی رحم دلی اور شفقت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ کہ غلاموں کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ تھا۔ ایک بار سلطان محمود نے ہندوستان پر حملہ کیا اور بہت سے ہندو قید ہوئے جن کو اپنے ساتھ غزنی لے گئے ان میں ایک غلام بہت ہونہار و ہوشیار تھا، اس کو آزاد کر کے سلطان نے ہر قسم کے علوم و فنون کی تعلیم دی جب وہ تعلیم سے فارغ ہوا تو اس کو حکومت کے عہدے دیئے گئے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اس کو ایک بڑے ملک کا صوبیدار بنادیا صوبہ دار کی حیثیت اس وقت وہ تھی جو آج کل کے بڑے والی ریاست کی حیثیت ہوتی ہے جس وقت سلطان نے اس کو تخت پر بٹھلایا اور تاج سر پر رکھا تو وہ غلام رونے لگا، سلطان نے فرمایا کہ یہ وقت خوشی کا ہے یا غم کا۔ اس نے عرض کیا جہاں پناہ اس وقت مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آکر پھر اپنی یہ قدر و منزلت دیکھ کر رونا آگیا۔ حضور میں جس وقت ہندوستان میں بچہ تھا آپ کے حملات سکر ہند دکانپتے تھے اور ان کی عورتیں اپنے بچوں کو آپ کا نام لیکر ڈرایا کرتی تھیں جیسا ہوا سے ڈرایا کرتی ہیں۔ میری ماں بھی مجھے اسی طرح آپ کے نام سے ڈرایا کرتی تھیں میں سمجھتا تھا کہ نہ معلوم محمود کیسا ظالم و جابر ہوگا حتیٰ کہ آپ نے خود ہمارے ملک پر حملہ کیا اور اس فوج سے آپ کا مقابلہ ہوا جس میں یہ غلام موجود تھا۔ اس وقت تک میں آپ کے نام سے بھی ڈرتا تھا۔ پھر میں آپ کے ہاتھوں قیدی ہوا۔ تو میری جان ہی نکل گئی کہ بس اب خیر نہیں مگر حضور نے دشمنوں کی روایات کے خلاف میرے ساتھ نیک برتاؤ فرمایا کہ آج میرے تاج سلطنت رکھا جا رہا ہے تو اس وقت میں خیال کر کے رونے لگا کہ کاش آج میری ماں ہوتی تو میں اس سے کہتا کہ دیکھ یہ وہی محمود ہے جس کو ہوا بتلایا کرتی تھی

غلامی کا کرشمہ :- ایسے واقعات اسلام میں بکثرت ہیں اور یہ اسی مسئلہ غلامی کا نتیجہ ہے اگر یہ لوگ قید خانہ میں قید کر دیئے جاتے تو نہ ان کو مسلمانوں سے انس ہوتا نہ مسلمانوں کو ان سے تعلق ہوتا۔ غلام بن کر یہ لوگ مسلمانوں میں ملے جلے رہے۔ علمی ترقی حاصل کرتے رہے آخر کار اپنی حیثیت کے موافق درجات و مناصب پر فائز ہوتے رہے۔ کوئی محدث بنا۔ کوئی فقیہ، کوئی قاری بنا۔ کوئی مفسر، کوئی نحوی بنا، کوئی ادیب، کوئی قاضی ہوا، کوئی حاکم۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلامی کی نہایت رعایت فرمائی کہ آپ کا حکم ہے جو خود کھاؤ۔ جو خود پہنو وہی پہناؤ۔ اور جب وہ کھانا پکاتا کر لائے تو اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاؤ۔ عین وصال کے وقت میں آپ کی آخری وصیت یہ تھی۔ الصلوٰۃ و ما مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ یعنی نماز کا خیال رکھو اور ان غلاموں کا بھی جو تمہارے ہاتھوں کے نیچے ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا رعایت ہو سکتی ہے۔ اور الحمد للہ حضرات صحابہ و تابعین اور اکثر سلاطین اسلام نے غلاموں کے ساتھ یہی برتاؤ کیا، اگر کسی ایک دو نے اس کے خلاف عمل درآمد کیا تو وہ اپنے فعل کا خود دمہ دار ہے اس پر اسلام سے اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ایضاً ص ۵

اسلامی تعزیرات پر اعتراض اور اس کا جواب

آج کل متمدن اقوام نے قصاص باسیف کی جگہ پھانسی تجویز کی ہے یہ بھی سخت موزی ہے کیونکہ اس میں روح نکلنے کے لئے کوئی راستہ نہیں ہوتا اور قتل میں جان نکلنے کا راستہ ہو جاتا ہے پھانسی میں تڑپنے کی وجہ سے زبان باہر نکل آتی ہے۔ اور صورت بگڑ جاتی ہے اور ان سے زیادہ متمدن اقوام نے ایک برقی کرسی تجویز کی ہے جس پر بیٹھے ہی ایک سکڑ میں جان نکل جاتی ہے نہ معلوم اس میں کیسی کشش ہوگی اور روح پر یسا گزرتی ہوگی۔ مگر چونکہ دیکھنے والوں کو اس تکلیف کا احساس نہیں ہوتا اس لئے یوں سمجھتے ہیں کہ اس میں تکلیف نہیں اور قتل میں لاش کے تڑپنے اور سر کٹنے خون پسنے کا منظر سامنے ہوتا ہے اس لئے اس کو وحشی سزا سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے ہاں یوں کہو کہ تم نے اپنی رعایت کر لی تمہارے سامنے بھیانک منظر نہ ہو اور اس سے قیاس کر لیا کہ جب میرے سامنے بھیانک منظر نہیں تو واقع میں بھی کچھ تکلیف نہیں مگر یہ قیاس الغائب علی الشاہ ہے اور یہی اصل ہے تمام منیبات کے انکار کی جو چیز نظر سے غائب ہے وہ ان کے نزدیک معدوم محض ہے۔

انہوں نے عدم مشاہدہ کو عدم ان کی دلیل بنالیا ہے، حالانکہ امریکہ کا مشاہدہ پہلے ایک عرصہ تک نہ ہوا تھا تو کیا وہ اس وقت بھی معدوم اصلی تھا؟ اور اس کا بطلان ظاہر ہے تو اب اس سوال کے کیا معنی کہ جنت دوزخ اگر کوئی چیز ہے تو وہ ہم کو نظر کیوں نہیں آتی تم کو نظر نہ آنے سے یہ کیوں نہ لازم آیا کہ وہ معدوم ہیں اسی طرح تم کو اگر بھانسی یا برقی کرسی کی سزا میں تکلیف کا منظر نظر نہیں آتا تو اس سے یہ کیوں نہ لازم آیا کہ مرنے والے کو بھی تکلیف زیادہ نہیں ہوئی، دلیل عقلی کا مقتضی تو یہ ہے کہ قتل میں مرنے والے کو کم تکلیف ہوتی ہے۔ اور ان مہذب سزاؤں میں زیادہ تکلیف ہوتی ہے کیونکہ موت نام ہے زہوق روح یعنی جان نکلنے کا اور جن طریق میں جان نکلنے کا راستہ پیدا کیا جائے یقیناً اس میں سہولت سے جان نکلے گی۔ اور جن صورتوں میں گھونٹ کر دبا کر جان نکالی جائے گی، ان میں سخت تکلیف سے جان نکلے گی۔ گو دیر کم لگے گی۔

شرعیّت کی قدر و قیمت | یہاں سے شریعت کی قدر ہوتی ہے کہ اس نے مجرم کیساتھ بھی احسان کیا ہے اور اس کی آسانی کی رعایت کی ہے کہ تلوار سے قصاص کا امر کیا ہے، رہا یہ کہ اس سے دیکھنے والوں کو وحشت ہوتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جس غرض کے لئے قصاص مشروع ہوا ہے یہ وحشت اس غرض سے تحصیل میں معین و مددگار ہے یعنی زجر و تنبیہ کہ اس منظر کو دیکھ کر شخص خائف ہو جائے اور جرائم پر اقدام کرنے سے رک جائے اور جو صورتیں اہل تمدن نے تجویز کی ہیں اس سے دوسرے کو زجر و تنبیہ زیادہ نہیں ہوتی کیونکہ وحشت ناک منظر سامنے نہیں آتا البتہ مجرم کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ اور یہ سخت بے رحمی ہے جب ایک شخص کو جان ہی سے مارنا ہے، تو اس کو راحت دیکر مارنا چاہیے۔

حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم عام فرمایا ہے۔ اِذَا قَتَلْتُمْ فَاحْسِنُوا الْقَتْلَ اِذَا بَحْتُمْ فَاحْسِنُوا الذَّبْحَ جس میں قصاص کی بھی تخصیص نہیں بلکہ قتل کفار کو اور ذبح حیوانات کو بھی عام ہے۔ پس شریعت نے ظالموں کی بھی رعایت کی ہے کہ ان کو بے رحمی اور بے دردی سے نہ مارا جائے اور دوسروں کی بھی رعایت کی ہے دوسروں کی رعایت قصاص میں یہ ہے کہ دیکھنے والوں کو ایذا نہ پہنچے لہذا اباب لعنکم تتقون کہ قصاص میں لوگوں کو جرائم سے زجر کامل ہوتا ہے۔ (اقوال المحبوب ص ۷)

کیا جنت دوزخ کوئی چیز نہیں ہے؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جنت دوزخ کوئی چیز نہیں محض تخیف و ترغیب کے لئے یہ نام بیان کئے گئے ہیں۔ نعوذ باللہ، ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قرآن میں جنتی وعیدیں چوری، زنا، ظلم و ستم، کفر و معصیت پر ہیں یہ سب ایسی ہیں جیسے بچوں کو ڈرایا جاتا ہے کہ چپ رہو۔ ہوا آجلے گا ایسے جتنے انعامات جنت وغیرہ بیان کئے گئے ہیں یہ بھی محض پھسلا یا ہے جیسا کہ بچوں کو پھسلا کر دیتے ہیں میں ان لوگوں سے جواب میں کہتا ہوں کہ اول تو یہ بات ادنیٰ حاکم کے کلام میں ہونا بھی سخت عیب ہے چہ جائیکہ احکم الحاکمین کے کلام میں ہو، کیونکہ اس کو تو جھوٹ موٹ، بہانا بولتے ہیں اور خدا جھوٹ سے بالکل بری ہے۔ تعالیٰ اللہ عن ذالک المصنف

لیکن اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ جنت دوزخ محض ترغیب و ترہیب کے لئے ہے اور واقع میں کچھ بھی نہیں تو رغبت و رعبت اسی وقت تک ہو سکتی ہے جب تک کہ مخاطب کو یہ راز معلوم نہ ہو کہ کیونکہ ظاہر ہے بعد اصل حال معلوم ہو جانے کے کہ یہ ترغیب و ترہیب ایک غیر واقعی امر ہے رغبت شوق و رعبت بالکل نہیں رہ سکتی پھر ان لوگوں کا اس امر کے معلوم ہونے کا دعویٰ کرنا کہ جنت دوزخ کوئی چیز نہیں سرِ پا غلط ہے۔ غرض اول تو اس کے خلاف جاننے سے معاذ اللہ کلام اللہ پر نفویت کا دھبہ آتا ہے، جس کو کلام الہی کے لئے ہرگز گوارا نہیں کر سکتا پھر جو مقصود شارع کو ان وعیدوں اور ان کاموں کے بیان کرنے سے ہے کہ لوگوں کو مکلف و مقید بنایا جائے اس صورت میں ہرگز نہیں حاصل ہو سکتا ایسا شخص جس کا ان وعیدوں کے بارے میں ایسا خیال ہے کہ یہ غیر واقعی ہیں یقیناً ارتکاب جرائم میں دیر ہوگا۔ اول تو یہ سب کے سامنے جو چاہے گا کرے گا۔ اگر سامنے کرنے میں کسی کا پاس و لحاظ ہو تو تنہائی میں تو بالکل نہ چوے گا۔ مثلاً فرض کر دو کہ ایک شخص اس خیال کا جنگل میں ہے اور وہاں ایک دوسرے شخص بھی موجود ہے سوائے ان دو شخصوں کے وہاں کوئی موجود نہیں، نہ پولیس چوکی اور پہرہ، اب فرض کر لو کہ اتفاق سے اس دوسرے کی شخص کی موت آگئی اور اس کے پاس ایک لاکھ روپیہ کا نوٹ ہے اور اس کے کاغذات سے اس کا پتہ بھی معلوم کر لیا کہ فلاں خاندان کا اور فلاں شہر کا باشندہ ہے اور بھی اسے خبر ہے کہ اس کا وارث ایک یتیم بچہ ہے یہ سب کچھ ہے مگر اس واقعہ کو کسی کو خبر نہیں کہ یہ شخص کہاں مرا اور اس کے پاس

مرتے وقت کیا سامان تھا نہ کوئی دعویٰ کر سکتا ہے نہ مقدمہ چل سکتا ہے بتلایے ایسی حالت میں یتیم بچہ تک روپیہ پہنچا دینے پر کوئی خوف اس شخص کو بجز خوف خدا عذاب آخرت کے مجبور کر سکتی ہے۔ اور کیا ایسا شخص جو وعید الہی کو محض تخیف سمجھتا ہے اس روپے کو اصل وارث تک پہنچا دے گا۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ اس روپے کی حاجت بھی ہو۔ یہ اسی شخص کا کام ہے جو خدا کے تمام وعدے وعید کو حق سمجھتا ہے اور اس کے دل میں عذاب آخرت کا خوف ہے، اس گندے عقیدے سے جہاں مصالح شرعیہ برباد ہوتی ہیں مصالح تمدنیہ بھی بالکل فوت ہوتے جاتے ہیں، اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ تمدن کے لئے مذہب کی کس قدر ضرورت ہے صرف حکومت سے تمدن ہرگز قائم نہیں ہو سکتا کیوں کہ حکومت کا زور محض ظاہر تک منحصر ہے۔ دل میں شائستہ اخلاق مذہب ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ مجھے سخت حیرت ہے کہ تمدن کے مدعی مذہب کی ضرورت سے کیوں ناواقف ہیں۔ اگر کوئی ضروری چیز ہے تو مذہب اس سے پہلے ضروری ہوگا، مذہب کی ضرورت نہ مان کر کوئی تمدن قائم کرنا چاہے تو ناممکن ہے۔ دعویٰ تمدن کے بعد مذہب سے لاپرواہی کرنا ایسا ہی ہے کہ

یکے برس سرشاخ دین می برید خداوند بستان نگہ کرد و دید

تو یہ لوگ جس تمدن کی شاخ پر بیٹھے ہوئے ہیں اسی کی جڑ کوٹ رہے ہیں۔ پس عجیب بات ہے کہ قول سے تو ضرورت تمدن ثابت کی جاتی ہے اور فعل سے اس کی نفی کی جاتی ہے۔ غرض آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ جنت دوزخ دینی چیزیں ہیں۔

(وعظ شعب الایمان ص ۱۸)

مسلمان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ کے برابر سمجھتے ہیں؟

جواب :- شاید کسی مخالف کو یہ شبہ ہو کہ کیا مسلمان کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدائے تعالیٰ کے برابر ہیں تو ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ عبادت میں مسلمانوں کے نزدیک خدا کا کوئی شریک نہیں حصہ دار بھی اس میں شریک نہیں ہیں۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کرنا نہ ان کی زندگی میں جائز تھا نہ اب آپ کی قبر کو سجدہ جائز ہے مگر اطاعت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہے نہ اس لئے کہ آپ شریک فی الاطاعت ہیں، بلکہ اس لئے کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب خدا کی طرف سے پیغام ہوتا ہے تو آپ کا حکم درحقیقت آپ کا حکم نہیں بلکہ پیغمبر ہونے کی

وجہ سے وہ خدا ہی کا حکم ہے اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کے احکام کی اطاعت خدا کے احکام کی اطاعت ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ ص ۲۲۴۔

اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے بادشاہ وزیر کو حکم دیتا ہے کہ رعایا میں یہ قانون شائع کر دو۔ پس اس وقت وزیر کی زبان سے جو قانون شائع ہو رہا ہے وہ درحقیقت بادشاہ کا حکم ہے اس لئے وزیر کی اطاعت بعینہ بادشاہ کی اطاعت ہے مگر اس سے ہرگز کوئی شخص یہ نہیں سمجھتا کہ وزیر بادشاہ کے برابر ہو گیا۔ اور اگر کوئی شخص ایسا سمجھنے لگے اور آئندہ سے بجائے بادشاہ کے تخت کو بوسہ دینے کے وزیر کی کرسی کو بوسہ دینے لگے تو یقیناً وہ معتبوب ہوگا، اسی طرح اگر آپ کسی مقدمہ میں ایک شخص کو وکیل کر دیں تو جو کچھ وہ کرتا ہے سب آپ کی طرف منسوب ہوتا ہے کہ گویا تم خود کہہ رہے ہو مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وکیل تمہارے برابر ہو گیا کہ تمہاری جائیداد کا مالک ہو جاوے کہ اس میں جو چاہے تصرف کرے ہرگز نہیں پس مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو خدا کی اطاعت اسی معنی کرکتے ہیں جیسے وزیر کی اطاعت بادشاہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اور وکیل کا قول ہو کہ اس سے شرک و مساوات ہرگز لازم نہیں آتی مگر افسوس یہ ہے کہ مخالفین اعتراض کرتے ہوئے مسائل اسلامیہ کی حقیقت کو ذرا نہیں سمجھتے ہیں اور اگر سمجھتے ہیں تو منشا اعتراض کا محض حسد ہے ورنہ مسائل اسلامیہ پر کوئی اعتراض بھی وارد نہیں ہو سکتا۔ (فحاشا اسلام ص ۱۰)

۱۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشاعت اسلام سے

مقصود کیا اپنی تعظیم ہے؟

جواب :- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اشاعت اسلام سے اپنی تعظیم کرانا نہ تھا۔ کیونکہ جو شخص بڑا بننا چاہتا ہے وہ تو خود اس کی کوشش کرتا ہے کہ لوگ میرے سامنے جھکیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت کہ لوگ آپ کو سجدہ کرنا چاہتے تھے اور آپ نے ان کو اس سے منع کیا اور صرف منع ہی نہیں کیا بلکہ اپنا فانی ہونا اس پر ظاہر فرمادیا۔ مگر پھر بھی بعض جہلدار کفر کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض ہے کہ نفوذ باللہ آپ بڑا بننا چاہتے تھے اور دلیل میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے موقع پر ایک صحابی کو اپنا موئے مبارک دیئے تھے کہ مسلمانوں میں ان کو تقسیم کر دو اس پر وہ جاہل لکھتا ہے کہ دیکھئے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بال اس لئے تقسیم کر لئے تاکہ لوگ اس کو تبرک سمجھ کر تعظیم سے رکھیں تو گویا آپ نے بڑا بننا چاہا۔ استغفر اللہ یہ آج کل کی فہم و عقل ہے افسوس اس شخص کو عبادت و محبت کے مستغنی میں بھی فرق معلوم نہیں، واقعی کفار کو محبت و عشق کا چسکا نہیں لگا۔ اسی واسطے وہ ایسے واقعات کی حقیقت نہیں سمجھتے جی تو یہ چاہتا ہے کہ ان لوگوں کو جواب بھی نہ دیا جائے۔ اور یہ کہہ دیا جائے۔

بامدعی بگوئیہ اسرار عشق و مستی بگذار تا بمیر دور رنج خود پرستی

محبت رسول کا حال

مگر میں تبرعاً اس کا جواب دیتا ہوں تاکہ کسی مسلمان کو اس اعتراض سے شبہ ہو تو وہ اس جواب سے تسلی حاصل کر سکے، بات یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بال کن لوگوں میں تقسیم کرائے تھے، آپ نے ان لوگوں میں بال تقسیم کرائے تھے جن کی محبت کی یہ حالت تھی کہ جب آپ وضو کرتے تھے تو وضو کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہ گرنے دیتے تھے۔ بلکہ آپ کا تھوک اور سارا وضو کا پانی اپنے ہاتھوں میں لے لیتے تھے۔ منہ کو ملتے آنکھوں سے لگاتے تھے اور ہر شخص اس کی کوشش کرتا تھا کہ سب سے پہلے آپ کے وضو کا پانی اور آپ کا تھوک میرے ہاتھوں میں آئے۔ چنانچہ اس کی کوشش میں ایک دوسرے پر گر پڑتا تھا اور ان کی محبت کا یہ حال تھا کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگوائے اور اس کا خون ایک صحابی کو دیا کہ اس کو کسی جگہ احتیاط سے دفن کر دو۔ صحابی کی محبت نے گوارا نہ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خون زمین دفن کیا جائے انھوں نے الگ جا کر اسے خود پی لیا۔ اس پر یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ نفوذ باللہ صحابی بہت ہی نحس تھے کہ تھوک ملتے ہوئے اور خون پیتے ہوئے گھن نہ آتی تھی۔ بات یہ ہے کہ ان امور کا تعلق عشق و محبت سے ہے۔ اور اس کی حقیقت عاشق ہی سمجھ سکتا ہے جس کا مذاق یہ ہے۔

غیرت آن چشم برم روئے تو دیدن ندیم گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندیم
صاحبو! اگر آپ کو بھی کسی سے عشق ہوا ہو تو آپ کو معلوم ہوا
محبت کا اثر ہوگا کہ عاشق بعض دفعہ محبوب کی زبان اپنے منہ میں لے کر چومتا ہے اور عشاق لعاب دہن محبوب کی بچیں نر کے دفتر اشعار میں لکھ جاتے ہیں تو کیا یہ نحس ہیں ہرگز نہیں اگر یہ بے حس ہیں تو سمجھئے کہ ساری دنیا بے حس ہے کیونکہ محبت میں ہر شخص یہی کرتا ہے کوئی

عاشق اس سے بچا ہوا نہیں اسی طرح اگر کسی کے محبوب کے بدن میں خون بہنے تو عاشق اس جگہ منہ لگا کر خون چوستے ہیں تاکہ محبوب کے بدن میں خون بہنے لگے تو عاشق اس جگہ منہ لگا کر خون چوستے ہیں تاکہ محبوب کو زخم کی تکلیف کا احساس نہ ہو یا کم ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ خون چوسنا بھی کوئی گھن کی بات نہیں عاشق کو اس سے جو خطر ہوتا ہے اس کے دل سے پوچھنا چاہیے پھر جب ادنیٰ ادنیٰ محبوب کا لعاب دہن اور خون گھن کی چیز نہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تھوک اور پسینہ اور خون کیونکر گھن کی چیز ہو سکتا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ قدرتی طور پر آپ کا تمام بدن خوشبودار تھا آپ کے پسینے میں اس قدر خوشبو تھی کہ عطر کی خوشبو اس کے سامنے بے حقیقت تھی۔ آپ کا لعاب دہن نہایت خوشبودار اور شیریں تھا اور یہی حال آپ کے خون کا تھا تو ایسی چیز سے کون گھن کر سکتا ہے مگر کفار کو ان امور کی کہاں خبر نہ ان کو عشق و محبت کی ہوا لگی ہے نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت سے اطلاع ہے۔

صحابہ کا عشق رسول | بہر حال صحابہؓ آپ کے ایسے عاشق تھے کہ وضو کا پانی زمین پر نہ گرنے دیتے تھے اور اس کو ہاتھوں ہاتھ لینے کے لئے ایک دوسرے پر گرتے پڑتے تھے تو ایسی جماعت سے کیا یہ امید تھی کہ وہ آپ کے بالوں کو زمین میں دفن ہونے دینگے کیونکہ یقیناً بال کا درجہ وضو کے پانی سے زیادہ تھا۔ اس کو محض جسم سے تلبس (ملاپ) ہوا تھا اور یہ تو بدن کا جزو ہے پس اگر آپ اپنے بالوں کو دفن کرتے تو یقیناً صحابہؓ زمین میں سے ان کو نکالنے کی کوشش کرتے۔ پھر اس میں ہر شخص یہ کوشش کرنا کہ میرے ہاتھ میں زیادہ بال آئیں تو ایک دوسرے پر گرتا اور عجب نہیں کہ قتال کی نوبت آجانی اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح قتال سے صحابہؓ کو بچانے کیلئے اپنے بال خود ہی تقسیم کر دیئے۔ اور دفن نہ کر دیئے، بتلایئے اب اس میں کیا اشکال ہے پس معلوم ہو گیا کہ آپ کا اپنے بال تقسیم کرنا اپنی تعظیم و عبادت کے لئے نہ تھا بلکہ صحابہؓ کی محبت پر نظر کرتے ہوئے ان کے نزاع و قتال کے رفع دفع کرنے کے لئے تھا اگر معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ذرہ برابر بھی بڑائی و تکبر کا خیال ہوتا تو آپ عمدہ لباس پہنتے، مکان عمدہ بناتے، نفیس نفیس کھانے کھایا کرتے، آپ کے پاس خزانہ جمع ہوتا، مگر تاریخ شاہد ہے اور احادیث میں صحیح طریقے سے ثنابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس موٹا چھوٹا ہوتا تھا آپ کے مکانات سب کچھ تھے آپ اپنے پاس کچھ بھی نہ رکھتے تھے۔

آنحضرتؐ کا طریقہ کار :- یہ نہیں کہ آپ کے پاس مال آسانہ تھا۔ نہیں۔ بعض جنگ میں اتنا مال آیا کہ اس کا شمار نہیں ہو سکتا تھا بکریوں سے جنگل کے جنگل بھر گئے تھے اور آپ نے وہ سب بکریاں ایک اعرابی کو اس کے سوال پر عطا فرمادیں اور اس قدر تھے کہ آپ نے کسی کو تنو کسی کو درد تو عنایت فرمائے۔ جب بحرین کا جزیہ آیا تو اتنا روپیہ تھا کہ مسجد کے اندر سونے کا ڈھیر لگ گیا۔ مگر آپ نے تھوڑی دیر میں سب کا سب صحابہ کرام کو تقسیم فرمایا اور اپنے واسطے ایک درہم بھی نہ رکھا تو کیا بڑائی چاہنے والا یہ گوارہ کر سکتا ہے کہ خود تو خالی ہاتھ رہے اور مخلوق کو مال مال کر دے۔ پھر آپ کی یہ حالت تھی کہ راستہ میں جب چلتے تھے تو صحابہؓ کو اپنے سے آگے چلنے کا حکم کرتے تھے اور خود پیچھے چلتے، بعض دفعہ کوئی صحابہؓ سواری پر سوار ہوتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ پیدل چلتے، اور وہ اترنا چاہتے اور آپ منع فرماتے اکثر آپ اپنا سودا بازار سے خود لے آیا کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص کسی کام میں آپ سے امداد لینا چاہتا تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر جہاں چاہتا ہے جاتا آپ اس کا کام کر دیتے تھے، گھر میں اگر آپ اپنے گھر کا کام بھی کرتے تھے، کبھی بکری کا دودھ خود نکال لیا کرتے تھے، کبھی جوتا اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیا، کبھی آٹا گوندھ دیا۔ آپ بعض دفعہ زمین پر بیٹھ جاتے، بور یہ پر لیٹ جاتے تھے جس سے آپ کے پہلو پر نشان ہو جاتے، بعض دفعہ کسی یہودی کا آپ پر قرض ہوتا اور وہ تقاضہ کرنے میں سختی کرتا برا بھلا کہتا اور حضرات صحابہ کو یہودی پر غصہ آتا وہ اس کو دھمکانا چاہتے تو آپ صحابہؓ کو منع فرماتے اور یہ ارشاد فرماتے کہ صاحب کو کہنے سننے کا حق ہے۔

اس جاہل معترض سے کوئی پوچھے کیا بڑائی اور عظمت چاہنے والوں کے یہی حالات ہوا کرتے ہیں۔ افسوس کہ اس نے ایک بال تقسیم کرنے کا واقعہ لے لیا، اور ان تمام واقعات سے اندھا ہو گیا۔ سو میری تقریر سے معلوم ہو گیا کہ بال تقسیم کرنے کا واقعہ بھی بڑائی یا عظمت کے واسطے نہ تھا بلکہ اس میں وہی تمدن اور سیاسی مصلحت تھی جو میں نے ابھی ذکر کی۔ دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بال تقسیم فرما کر قیامت تک کے لئے یہ بات بتلا دی کہ میں فانی ہوں اور بشر ہوں کیوں کہ بال متغیر و حادث ہیں کبھی وہ سر کے اوپر ہیں کبھی استرے سے مونڈ کر جدا کئے جاتے ہیں تو جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کو دیکھے گا دچنانچہ بعض جگہ بجز اللہ اب تک آپ کے بال محفوظ ہیں۔ اور لوگ ان کی زیارت کرتے ہیں، تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فانی و بشر ہونے پر استدلال کرے گا اور سمجھ جائے گا کہ آپ انسان تھے خدا نہ تھے

تو اس سے آپ نے مسلمانوں کی توحید کو کامل فرمایا۔ نہ کہ اپنی عظمت و بڑائی چاہی۔ ع
چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ روند، (ایضاً ص ۵)

نجات کیلئے صرف خدا پر ایمان لانا کافی ۱۶ ص ۵۱

جواب :-

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق قطع کرنا مطلق سلب فیوض و کمالات کا سبب ہے اگر
چہ گستاخی بھی نہ کرے یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہو گئی جو شخص توحید کو نجات کے لئے
کافی سمجھتے ہیں۔ تصدیق رسالت کو ضروری نہیں سمجھتے، افسوس مسلمانوں میں بھی بعض لوگ
ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف توحید کی تعلیم کے لئے آئے
تھے، تو جو شخص توحید کا اقرار کرے وہ نجات پائے گا۔ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار
نہ کرے۔ یاد رکھو یہ قول بالکل باطل ہے، نجات بدون تصدیق رسالت کے ہرگز نہیں
ہو سکتی، جس طرح توحید رکن ایمان ہے، اسی طرح تصدیق رسالت بھی رکن ایمان ہے
لوگوں نے اس آیت سے دھوکہ دینا چاہا ہے۔

ان الذین آمنوا ۱۶ ص ۵۲

ترجمہ :- جو لوگ ایمان لائے اور جو لوگ یہودی اور نصرانی ہیں اور
جو صابی ہیں (ان میں سے) جو کوئی بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان
لے آئے اور اچھے کام کرے (قانون شریعت کے موافق) ایسوں کے لئے
ان کے پروردگار کے پاس حق الخدمت بھی ہے، اور وہاں ان پر کسی طرح کا
اندیشہ بھی نہیں۔ اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

اس آیت میں تصدیق رسالت کا ذکر (ظاہراً) نہیں ہے بلکہ سب فرقوں کی نجات
کا مدار صرف ایمان و عمل و ایمان بالآخرت قرار دیا گیا ہے اس سے بعض لوگوں نے اس
غلطی میں ڈالنا چاہا کہ نجات کے لئے تصدیق رسالت محمدیہ کی ضرورت نہیں۔ جواب اس کا
یہ ہے کہ ایمان باللہ و ایمان بالآخرت بغیر تصدیق رسالت محمدیہ کے متحقق ہی نہیں ہو سکتا
پس یہ کہنا غلط ہے کہ یہاں تصدیق رسالت کا ذکر نہیں۔

ایک واقعہ

تفصیل اس سے جواب کی وہ ہے جو میں نے ایک ڈپٹی کلکٹر سے کہلا بھیجی تھی وہ
بندہ خدا بھی اس غلطی میں مبتلا تھے ویسے بڑے نیک پابند صوم و صلوة تھے، مگر
شیطان نے ان کے دل میں یہ دوسو سو ڈال رکھا تھا کہ نجات کے لئے صرف ایمان باللہ کافی ہے
تصدیق رسالت کی ضرورت نہیں۔ واقعی بدون علم دین کے کامل اصلاح نہیں ہوتی۔ عقائد بھی
درست نہیں ہوتے۔ افسوس آج کل لوگوں نے انگریزی پڑھنے کو بھی علم سمجھ لیا ہے۔ پس وہ
ایسا ہی علم ہے جس سے روپیہ پیسہ معلوم ہو جاتا ہے۔ خدا اس سے معلوم نہیں ہو سکتا۔ میں نے
ڈپٹی صاحب کو کہلا کر بھیجا کہ ایمان باللہ کے صرف یہی معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو موجود مان لے کیونکہ وجود کا
انکار مشرکین بھی نہیں کرتے بلکہ ایمان باللہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو صفات کمال سے متصف
اور صفات نقص سے منزہ سمجھتے ہیں اب میں کہتا ہوں کہ صفات کمال میں سے ایک صفت صدق
بھی ہے جس کے ساتھ خدا کو موصوف ماننا توحید کے لئے ضروری ہے۔ اور صفات نقص میں سے
ایک صفت کذب بھی ہے۔ جس سے خدائے تعالیٰ کو منزہ سمجھنا لازم ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اور
دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن
کا کلام الہی ہونا دلائل عقلیہ سے ثابت ہے۔ تو اس خبر کو بھی سمجھنا واجب ہے۔ پس جواب کو
رسول نہیں مانتا وہ خدا تعالیٰ کو کاذب کہا تو پھر اللہ تعالیٰ پر کہاں ایمان لایا، پس ثابت ہو گیا کہ
خدائے تعالیٰ پر ایمان لانا بدون تصدیق رسالت کے ممکن نہیں، میں نے یہ بھی کہلا بھیجا کہ جواب
کے لئے دس سال کی مہلت ہے۔ اس دلیل کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ پھر خدائے انکی
اصلاح کر دی بعد میں مجھ سے ملے بھی تھے اس وقت ان کا شبہ بھی رفع ہو چکا تھا۔ بیچاروں
کا خاتمہ اچھا ہوا۔ بس خوب سمجھ لو کہ بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کے نجات ہرگز نہیں ہو سکتی۔

ایک فلسفی کا قصہ

ایک فلسفی کی بابت ایک شخص نے خواب دیکھا تھا۔ میں اس فلسفی
کا نام بتلانا نہیں چاہتا خواہ مخواہ ایک مسلمان سے خواب کی بنا پر
بدگمانی ہو جائے مگر اس شخص کے خیالات تھے فلسفیانہ مگر ظاہر میں مسلمان کہلاتا تھا۔ خواب یہ تھا
کہ ایک شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زیارت نصیب ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت
کیا کہ حضور فلاں شخص کا کیا حال ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ بدون میرے توروٹ کے جنت میں جانا چاہتا
تھا، مگر میں نے ہاتھ پکڑ کر جہنم میں پھینک دیا کہ دور ہو کجنت۔ جنت میں بغیر میرے تعلق کے
کوئی نہیں جاسکتا۔ غرض آپ امت کے لئے واسطہ فی العروض ہیں تمام کمالات و فیوض میں

بدون آپ کے واسطے کے کوئی شخص بھی کمالات بلکہ ایمان سے بھی موصوف نہیں ہو سکتا۔ اسی کو حضرت شیخ سعدی فرماتے ہیں۔

پندار سعدی کہ راہ صفا
خلاف بیمر کے رہ گزید
تو ان کے واسطے ہے جو بدون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کے اس راستہ کو
قطع کرنا چاہیں اور تعلق والوں کے واسطے انشاء اللہ یہ ہوگا۔
ہے نماز بعصیان کے درگرد
اور یہ ہوگا۔
تو ان رفت جز بر پے مصطفیٰ
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

طوبی لنا معشر الاسلام ان لنا
من الغایت ارکنا غیر منہدم
(وعظ الرفع والوضع ص ۲۹)

تمہارے نبی کو معراج جسمانی ۶۱ ص ۵۶

جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عروج صوری یعنی گروج آسمانی کا انکار کرتے ہیں اور اس معراج کو منانی (ذخواب) یا کشفی بتلاتے ہیں سو یہ بالکل نصوص کے خلاف ہے بلکہ احادیث مشہورہ سے آپ کا آسمان پر تشریف لے جانا ثابت ہے اور بیت المقدس تک تشریف لے جانا نص قرآنی سے ثابت ہے جس کا انکار بلا تاویل کفر ہے، اور بتاویل بدعت، ان منکرین معراج آسمانی کے پاس کچھ دلائل تو عقلی ہیں، کچھ نقلی، عقلی دلائل تو یہ ہیں کہ اس سے افلاک میں خرق و التیام (چھٹنا اور ملنا) لازم آتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفہ کے پاس خرق و التیام پر کوئی دلیل نہیں اور جب وہ دلائل پیش کریں گے تو اس وقت انشاء اللہ ہم ان سب کا لغو اور باطل ہونا ظاہر کر دیں گے۔ چنانچہ متکلمین اس سے فارغ ہو چکے ہیں۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا قصہ احادیث میں آتا ہے کہ آپ اتنی جلدی سیر ملکوت سے فارغ ہو کر واپس آ گئے کہ صبح بھی نہ ہونے پائی تھی یہ محالات سے ہے کہ مکہ سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے ساتواں آسمان تک آپ سیر کرائیں اور یہ سارا قصہ ایک رات کے تھوڑے حصہ میں ہو جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس میں استحالة محال ہونے کی کیا بات ہے۔ وہاں استبعاد ہو سکتا ہے، سو وہ بھی

بطور الزام کے اس طرح مدفوح ہے کہ تمہارے نزدیک زمانہ حرکت فلک الافلاک کا نام ہے چنانچہ رات اور دن کا آنا طلوع وغروب کا ہونا یہ سب حرکت فلک (آسمان) سے مرتبط ہے اگر حرکت فلک موقوف ہو جائے تو جو وقت موجود ہو گا وہی رہے گا۔ اگر رات موجود ہوگی تو رات موجود ہوگی تو رات ہی رہے گی۔ دن موجود ہوگا تو دن ہی رہے گا۔ تو ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے اس رات حرکت فلک کو تھوڑی دیر کے لئے موقوف کر دیا جو اس میں کچھ تعجب نہیں۔ معزز مہمان کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے دنیا میں بھی یہ قاعدہ ہے کہ جب بادشاہ کی سواری نکلتی ہے تو سڑک پر دوسروں کا چلنا بند کر دیا جاتا ہے۔ ہم جب حیدر آباد آ گئے تو ایک دن دیکھا کہ پولیس کے سپاہی لوگوں کو سڑک پر چلنے سے روک رہے ہیں اس وقت سڑک پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ نواب صاحب کی سواری نکلنے والی ہے اسی طرح حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے اگر آسمان اور چاند سورج سب کی حرکت کو اس رات کچھ دیر کے لئے بند کر دیا ہو کہ جو چیز جہاں ہے وہیں رہے پس آفتاب جس جگہ تھا وہیں رہا اور ستارے جہاں تھے وہیں رہے کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلنے نہ پایا۔ اس میں کیا تعجب ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج سے فارغ ہو گئے۔ پھر فلک کو حرکت کی اجازت ہو گئی تو اب ظاہر ہے کہ حرکت فلک جس جگہ سے موقوف ہوئی تھی وہیں سے شروع ہوگی تو آپ کی سیر میں چاہے جتنا ہی وقت صرف ہو ہو مگر دنیا والوں کے اعتبار سے سارا قصہ ایک ہی رات میں ہوا ہو۔ کیونکہ حرکت زمانہ اس وقت موقوف ہو چکی تھی۔ اب اگر کوئی دوام حرکت افلاک کا دعویٰ کرے تو وہ اس کے الزام کو ثابت کرے۔ انشاء اللہ ایک لیل بھی قائم نہ کر سکے گا۔ دوسرا عشقانہ جواب اس اشکال کا مولانا نظامی نے دیا ہے۔

تن او کہ صافی تراز جان ملت اگر آمد و شد بیک دم رواست

یعنی یہ بات سب کو معلوم ہے خیال انسان ذرا سی دیر میں بہت دور پہنچ جاتا ہے چنانچہ آپ اسی وقت عرش کا تصور کیجئے تو ایک منٹ سے بھی کم میں عرش پر خیال پہنچ جائے گا۔ خیال کی حرکت بہت سریع ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خیال روح کی ایک قوت ہے اور روح نہایت لطیف چیز ہے اور مادیات کی طرح کشیف نہیں اس لئے اس کی سیر میں کوئی حاجب مانع نہیں ہوتا۔ مولانا نظامی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک

تو ہمارے خیال سے بھی پاکیزہ تر ہے۔ جب خیال ذرا سی دیر میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے تو آپ کا جسم اظہر زمین سے آسمان تک اور وہاں سے عرش تک ذرا سی دیر میں ہوا آئے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے ایک میل فلاسفہ پیش کیا کرتے ہیں کہ ہوا کے طبقے اور جو خلا ہے اس میں ہوا نہ ہونگی سبکی متنفس زندہ نہیں ہو سکتا تو آپ اس سے اگر گزرتے تو زندہ کیسے رہتے۔ مگر انہوں نے یہ دیکھا کہ بعد تسلیم اس استدلال کے یہ اس وقت ہے جب متنفس (سانس لینے والے) کو اس میں کچھ ٹکٹ (تاجر) بھی ہو چنانچہ آگ کے اندر سے اگر جلدی جلدی ہاتھ کو نکالا جاوے تو آگ کا اثر نہیں ہوتا۔ پس اگر آپ نہایت سرعت کے ساتھ اس خلا سے گزر جائیں تو وہ عدم تنفس میں موثر نہ ہوگا۔ اور دلیل نقل ان منکرین کے پاس حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قول ہے۔ واللہ ما فقد جسد محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی لیلة الاسراء کہ بخدا شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مفقود یعنی غائب نہیں ہوا۔ اس کا جواب لوگوں نے یہ دیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کہاں تھیں۔ نیز اس وقت ان کی عمر بہت ہی کم تھی شاید چار پانچ سال کی ہو۔ اور اگر معراج شہ نبوت میں ہوئی جیسا کہ زہری کا قول ہے تو وہ اسی سال پیدا ہوئی ہونگی (جامع) اس لئے اجل صحابہ کی روایت اس واقعہ میں انکی روایت سے مقدم ہے مگر اس کا حاصل بظاہر یہ ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بے تحقیق ایک روایت فرمادی ہم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ گمان نہیں کر سکتے نہ کسی صاحب ادب کو ایسی جرات ہو سکتی۔ یہ مانا کہ اس وقت وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں موجود نہ تھیں اور کم سن بھی تھیں مگر جوابات وہ فرما رہی ہیں وہ تو عقل و بلوغ کے زمانے میں ان سے صادر ہوئی ہے اور ایسے وقت میں وہ بدون تحقیق کے کوئی بات نہیں فرما سکتیں یقیناً تحقیق کے بعد فرما رہی ہیں ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے واقعہ کی نسبت فرمائی ہوں کیونکہ معراج میں تعدد ہے تو پھر کچھ بھی مضائقہ نہیں۔ میرے ذہن میں اس کا جو جواب آیا ہے وہ بہت لطیف ہے وہ یہ کہ فقدان کے دو معنی ہیں ایک تو چیز کا اپنی جگہ سے گم ہو جانا، ہٹ جانا۔ دوسرے تلاش کرنا۔ چنانچہ دوسرے معنی میں فقدان کا استعمال نص میں بھی آیا ہے۔ قَالُوا ذَا أَبَدُوا عَلَيْهِمْ مَا ذَا فَقَدُوا یعنی برادران یوسف علیہ السلام نے متوجہ ہو کر نذا کرنے والوں سے کہا کہ تم کس چیز کو تلاش کرتے ہو۔ یہاں فقدان کے معنی طلب کے زیادہ ظاہر ہیں پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

کے اس ارشاد کا مطلب صاف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنی دیر تک گھر سے غائب نہیں رہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش کیجاتی۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ ساری رات اپنے گھر سے جدا ہی نہیں ہوئے وہیں رہے تاکہ اس سے منامی معراج یا کشفی پر استدلال کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ گھر سے جدا تو ہوئے مگر زیادہ دیر نہیں لگی جس سے گھر والوں کو پریشانی ہوئی ہو اور تلاش کی نوبت آئی ہو۔ اور اگر فقدان کے وہی معنی لئے جائیں جو متبادر ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم شب معراج میں گم نہیں ہوا تب بھی اس سے معراج کا روحانی یا منامی ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے اس رات جدا نہیں ہوئے۔ کیونکہ فقدان فعل متعدی ہے نہ کی لازم اس کے معنی غیبت و انقصال کے نہیں بلکہ گم کرنے کے ہیں جس کے لئے ایک فاقد اور دوسرے کا مفقود ہونا ضروری ہے پس مطلب یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس رات کسی نے گھر سے غائب اور گم نہیں پایا اور یہ درست ہے کیونکہ آپ گھر والوں کے ساتھ گھر میں سوئے ہوئے تھے اور معراج ایسے وقت ہوئی کہ عادیات لوگوں کے گہری نیند سونے کا وقت تھا۔ پھر جانگے کے وقت سے آپ واپس تشریف لے آئے بلکہ خود اگر گھر والوں کو نماز صبح کے لئے جگایا تو ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے رات کو جاگ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر میں نہ دیکھا ہو اور اتنی بات مقصود ہونے کے لئے ضروری ہے۔ قلت ولعل هذا

غرض اس میں شک نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسمانی ہوئی اور آپ اس جسم سے آسمانوں پر تشریف لے گئے۔ اس کا انکار ہرگز نہیں ہو سکتا اور یقیناً یہ صورت عروج رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑا کمال ہے۔ (دعظ الرفع والوضع ص ۳۳)

تمہارے نبی تبارک لذات

آج عیسائی فخر کرتے ہیں کہ ہمارے نبی تبارک لذات تھے اور مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ تمہارے نبی تبارک نہ تھے قبح شہوت تھے کہ نونا کاج کئے جس کا ناواقف مسلمان ان کے سامنے چھپتے ہیں سوا اگر ترک لذات لازم زہد ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نونا کاج کو ضرور ترک کرتے تاکہ مخالفین کو مسلمانوں پر اعتراض کا موقع نہ ہوتا جس اعتراض کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بے ادب گنوار نے ایک بے ادب عیسائی کے جواب میں بک دیا کہ پہلے تم یہ ثابت کرو کہ عیسیٰ علیہ السلام میں قوت مردانگی بھی تھی

اسی وقت ان کے ترک نکاح پر فخر کرنا۔ مگر یہ بھی سخت بے ادبی ہے۔ عیسیٰ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عقیدہ ہو سکتا۔ کیونکہ حدیث بخاری میں ہر قتل کا قول مذکور ہے جس پر اجل صحابہ نے سکوت کیا جس سے تقریر ہو گئی۔ کذاب الرسل تبعث فی احساب قومنا کہ انبیاء علیہم السلام اعلیٰ حسب میں مبعوث ہوتے ہیں۔ اور حسب کہتے ہیں کمالات ذاتیہ کو جس کو معلوم ہوا کہ انبیاء علیہ السلام تمام کمالات سے علی وجہ الکمال موصوف ہوتے ہیں۔ تاکہ کسی کو انکی اتباع عار نہ ہو اور ظاہر ہے کہ اگر آپ کسی شخص کی نسبت یہ سن لیں کہ وہ عنین ہے تو طبیعت کو اس سے نفرت درو کاوٹ ہو جاتی ہے اور وہ شخص فوراً نگاہوں سے گرجاتا ہے۔ مگر کچھ قاعدہ ہے کہ انسان کے ساتھ اعتقاد جب ہی ہوتا ہے جب کہ اس میں مواد تو سب موجود ہوں۔ پھر اس کے روکنے میں فرشتہ ہو اور اگر خالص ہو تو اعتقاد کم ہو جاتا ہے اس واسطے یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں حضورؐ وارد ہے اس کے معنی مفسرین نے صبراً لکھے ہیں۔ اور عنین کے ساتھ تفسیر کو منکر کہا ہے، دکان فی الشفاء معللاً بان ہذا فقیضہ و عیب ولا تلیق بالانبیاء علیہم السلام، بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو روکنے والے ہیں چنانچہ سیر سے معلوم ہوا کہ یحییٰ علیہ السلام نے اخیر عمر میں نکاح کیا تھا۔ (کذا فی الشفاء) جس سے ان کے عنین ہونے کا شبہ بالکل زائل ہو گیا بلکہ معلوم ہوا کہ ایسے قوی مرد تھے کہ ان کی قوت مردانگی بڑھاپے میں باقی رہی۔ اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانے میں نازل ہو کر نکاح کریں گے حدیث میں آتا ہے۔ ویولد لہما کہ ان کے اولاد بھی ہوگی جس سے ان کے ضعف ہونے کا شبہ ہو ہی نہیں سکتا بلکہ معلوم ہوا کہ ان کی قوت اتنی زیادہ تھی کہ ہزاروں برس فرشتوں میں رہ کر بھی طاقت کم نہ ہوئی۔ بلکہ اس سے تو بظاہر نظر ان کی قوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے مگر نصوص سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام کمالات میں تمام انبیاء علیہم السلام سے اکمل ہیں اس لئے یہ شبہ نہیں ہو سکتا۔ الغرض ترک لذات زہد نہیں الغرض ترک لذات لازمی زہد نہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکاح نہ کرتے بلکہ تقلیل لذات زہدی میں داخل ہے۔ کیونکہ احادیث میں وارد ہے کہ صحابہؓ آپ کے اندر تین مردوں اور بعض روایات میں چالیس مردوں کی قوت کا اندازہ کرتے تھے اور مرد کی قوت چار عورتوں کے لئے کافی ہے۔ اسی لئے شریعت نے چار

تک کرنے کی اجازت دی ہے اس اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اتنی قوت تھی جو ایک سو بیس عورتیں کی اور دوسری روایت کے موافق ایک سو ساٹھ عورتوں کے لئے کافی تھی بلکہ شرح شفاء میں ابو نعیم سے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ چالیس مرد جنت کے مردوں میں سے ہیں اور ان میں ہر مرد کی قوت حسب روایت ترمذی ستر مرد کے برابر ہوگی اور ایک روایت میں سو مردوں کے برابر آیا ہے تو ایک حساب سے آپ میں قریب تین ہزار مرد کے برابر اور ایک حساب سے چار ہزار مرد کے برابر قوت ہوئی۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نو پر صبر کرنا یہ کمال زہد تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر و ضبط اور آپ اس پر بھی قادر تھے کہ بالکل صبر کر لیتے چنانچہ جوانی میں آپ نے پورا صبر کیا کہ پچیس سال کی عمر میں چالیس سال کی بیوہ عورت سے نکاح کیا۔ بھلا کنو امر ایسی عورت سے نکاح کر سکتا ہے جو اس کی ماں بن سکے ہرگز نہیں پس جوانی میں آپ کا چالیس سالہ عورت سے نکاح کرنا اور ساری جوانی اسی کے ساتھ بسر کر دینا اس کی کافی دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تنہا شہوات ہرگز نہ تھے بلکہ آپ اعلیٰ درجہ کے زہد تھے مگر بڑھاپے میں آپ نے نو نکاح کئے تو ضرور آپ کے ان نکاحوں میں کوئی حکمت تھی۔

آپ کے نکاح کر نیکی حکمتیں چنانچہ حکمت اول ایک حکمت تو وہ تھی جو بعض عارفین نے بیان کی ہے کہ منشاء تکوین عالم محبت ہے جیسا کہ کنت کنزاً مخفیاً فاحیبت ان احرف فخلقت الخلق سے معلوم ہوتا ہے گو یہ حدیث ان الفاظ سے محدثین کے نزدیک ثابت نہیں مگر مضمون حدیث صحیح ہے جو حدیث ان اللہ جمیل یحب الجمال۔ اور اللہ تعالیٰ جمیل ہے جمال کو محبوب رکھتا ہے۔ اسے ثابت ہے جس کی تقریر نکتہ و دقیقه کے مضمون ہشتادہم میں اور کلید مشنوی دفتر اول میں قبول کر دند خلیقہ ہدیہ راتحت شعر گنج محض بدر پیری جوش کردیں احقر نے کی ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اس محنت تکوین کا مظہر سب سے زیادہ وقاع ہے کہ اس میں بھی محض بواسطہ وقاع کے سبب ہو جاتا ہے۔ تکوین ولد کا بدون کسی تدبیر خاص کے جیسے تکوین عالم میں محض مجت بواسطہ کلمہ کن کے سبب ہو گیا تکوین عالم کا بدون کسی تدبیر کے پس عارف کو عورت کی تلبیس میں یعنی جماع میں محبت کی تکوین کی تجلی کا مشاہدہ ہوتا ہے اس لئے

وہ نکاح کرتا ہے اور اسی لئے جماع کی اس کو دوسروں سے زیادہ رغبت ہوتی ہے اور حدیث حبیبہ من دنیا کم النساء کا مبنی اسی راز کو بعض عارفین نے فرمایا ہے۔

امت کو بتانا تھا کہ عورتوں کے ساتھ کیسے رہنا چاہیے

حکمت دوم :- دوسری حکمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں میں یہ تھی کہ امت کو عورتوں کے ساتھ برتاؤ کرنا کیا طریقہ معلوم ہو اگر آپ نکاح نہ کرتے اور پھر عورتوں کے حقوق کی تعلیم دیتے تو اس کا زیادہ اثر نہ ہوتا۔ کسی کو شبہ ہو سکتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو خود نکاح کیا نہیں۔ اس لئے بلاتامل عورتوں کے اتنے حقوق بیان فرمادئے نکاح کر لے تو شاید ان حقوق کا ادا کرنا مشکل ہوتا اور اب کسی کو یہ کہنے کا منہ نہیں۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت سے زیادہ نکاح کر کے دکھلا دیئے۔ اور سب کے حقوق ان خوبی سے ادا فرمائے کہ اس کی نظیر کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ حقیقت میں بیبیوں کے حقوق ادا کرنا عقلمند کا کام ہے کیونکہ بیوی سے دو قسم کے تعلق ہوتے ہیں۔ ایک علاقہ حاکمیت و محکومیت کا کہ مرد حاکم ہوتا ہے اور عورت محکوم، دوسرا علاقہ محبت و محبوبیت کا کہ مرد محب اور عورت محبوب ہوتی ہے علاقہ حکومت کے ساتھ علاقہ محبت کی رعایت کرنا بڑا دشوار ہے۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر محبت کے حقوق ادا کرتے ہیں تو حکومت کے حقوق فوت ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ بیبیوں کے عاشق مشہور ہیں وہ اکثر ان کی غلامی ہی کرنے لگتے ہیں ان کی خاک حکومت نہیں ہوتی نہ بیوی پر کچھ رعب ہوتا ہے۔ اور جو لوگ حکومت کے حقوق ادا کرتے ہیں ان سے محبت کے حقوق فوت ہو جاتے ہیں دونوں کو جمع کرنا اور ہر ایک کے پورے حقوق ادا کرنا کہ بی بی پر رعب بھی ہو حکومت بھی ہو اس کے ساتھ اس کا دل بھی شوہر سے کھلا ہوا ہو۔ کہ بے تکلف ہنس بھی لے، بول بھی لے۔ مذاق بھی کر لے اور اس پر ناز بھی کر لے یہ انسان کامل کا کام ہے یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کر سکتے تھے یا وہ شخص کر سکتا ہے جو آپ کا کامل متبع ہو۔ چنانچہ احادیث میں وارد ہے کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو یاد فرمایا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ آپ ان بڑھیا کو کیا یاد فرمایا کرتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اچھی بیوی آپ کو دیدی حدیث میں ہے۔ فغضب حتی قلت والدی بعثک بالحق لا اذ کرھا بعدھذا لا بخیر۔ یعنی آپ کو غصہ آگیا۔ جس سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ڈر گئیں۔ اور بقسم عرض کیا کہ اب سے جب کبھی ان کا ذکر کرونگی بھلائی سے کرونگی یہ حالت رعب کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تھی جن کو سب سے زیادہ ناز

تھا اور دوسری ازواج کی کیا حالت ہوگی۔ تو ناز برداری کے ساتھ رعب کا جمع کرنا سرسری نہیں۔

حکمت سوم

ہوں اسے سب کے ساتھ کس طرح عدل کرنا چاہیے خصوصاً اگر ایک ساتھ محبت زیادہ ہو اور دوسروں سے کم ہو تو اس وقت اپنی طرف سے کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے اس کی ترجیح ظاہر ہو بلکہ امور اختیار میں برابری کا پورا خیال رکھے چنانچہ آپ نے یہ بھی کر کے دکھلا دیا کہ باوجودیکہ آپ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سب سے زیادہ محبت تھی مگر عدل میں بھی کبھی آپ نے فرق نہیں کیا۔ ان میں اور دوسری بیبیوں میں بلکہ ہمیشہ سب میں عدل کی پوری رعایت فرماتے تھے۔ دل کا ایک طرف زیادہ مائل ہونا یا آپ کے اختیار سے باہر تھا۔ اس میں برابری کیسے کرتے

دل کے میلان پر قابو نہیں ہوتا

اسی لئے فرمایا کرتے تھے۔ اللہم ہذا قسمی فی ما املك فلا تلمنی فیما لا املك۔ اے اللہ یہ میری برابری ہے اس چیز میں جس پر مجھے قدرت ہے پس مجھ سے اس بات میں مواخذہ نہ کیا جائے جس پر مجھے قدرت نہیں اس میں میلان قلب ہی کی طرف اشارہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف زیادہ تھا اور یہ بات آپ کی طرف سے نہ تھی بلکہ غیب کی طرف ایسے سامان کئے گئے کہ خواہ مخواہ آپ کے دل کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف میلان ہو چنانچہ نکاح سے پہلے حق تعالیٰ نے خود ایک حریر کے کپڑے میں فرشتے کے ذریعہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تصویر بھیجی کہ یہ آپ کی بی بی ہیں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کھولا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تصویر پر نظر پڑی اور وہاں یعنی عالم آخرت میں تصویر جائز اگر تم وہاں اپنا فوٹو کھینچو آؤ گے تو ہم منع نہیں کریں گے۔ یہ معاملہ حق تعالیٰ نے کسی ورنہ بی بی کے ساتھ نہیں کیا۔ دوسرے وحی میں یہ معاملہ تھا کہ کسی بیوی کے لحاف میں آپ بروچی نہ آئی تھی بجز عائشہ رضی اللہ عنہا کے کہ ان کے لحاف میں بھی آپ ہوتے تو بے تکلف آتی تھی تو یہ باتیں محققین جن کی وجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ ہی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جانب زیادہ مائل فرمادیا پھر اس پر ان کی قدرتی ذہانت و نقاہت اور حسن ستیر سونے پر سہاگا تھا اصل وجوہ آپ کی محبت کے وہی تھے جو پہلے مذکور ہوئے کہ حق تعالیٰ کو بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ سب بیبیوں سے زیادہ محبت تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر کیوں محبت نہ ہوئی۔ مگر بایں ہمہ سوائے محبت قلبی کے ظاہری برتاؤ آپ کا سب کے ساتھ برابر تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ کی شادی پھر آپ نے جس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا ہے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر نو سال کی تھی وہ بالکل بچی تھیں اور بچہ ان کے کوئی بی بی آپ کی کنواری نہ تھیں اس میں حکمت یہ تھی کہ آپ کو امت کو یہ دکھانا تھا کہ جس شخص کی عمر زیادہ ہو اس کو کنواری بچی کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے عموماً عادت یہ ہے کہ ایسی صورت میں مرد کا برتاؤ اپنی عمر کے تقاضے کے موافق ہو اگر تاہم مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو ان کے بچپن کی عمر کا تقاضہ تھا۔ ان کے بچپن کی پوری رعایت فرماتے تھے۔

حبشیوں کا کھیل چنانچہ ایک مرتبہ مسجد کے قریب میں حبشی لڑکے عید کے دن کھیل کود رہے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ حبشیوں کا کھیل دیکھو گی انھوں نے خواہش ظاہر کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پردہ کر کے دیر تک ان کو کھیل دکھلایا اور محض کہنے میں تو کھیل تھا ورنہ ورزش اگر اچھی نیت سے ہو تو عبادت ہے اور چونکہ ان کھیلنے والوں کو دیکھنے میں کوئی فتنہ نہ تھا۔ اس لئے یہ بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ حبشی مردوں کو کیسے دیکھا۔ اور جب تک وہ خود ہی نہ ہٹ گئیں اس وقت تک آپ برابر کھڑے ہو کر ان کو کھیل دکھلاتے رہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بچپن کی وجہ سے گڑبوں (دینام) کی گڑیاں تھیں تصویر نہ تھی کہ کھیل کا بہت شوق تھا اور محلہ کی لڑکیاں بھی ان کے پاس کھیلنے کے لئے آتی تھیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لاتے تو وہ لڑکیاں متفرق ہو جاتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جمع کر کے بچھلاتے کہ آؤ بھاگتی کیوں ہو جس طرح کھیلتی تھیں کھیلتی رہو

بیوی کی رعایت ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مسابقت بھی کی کہ دیکھیں کون آگے نکلتا ہے۔ اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بالکل پھلکی تھیں وہ آگے نکل گئیں کچھ عرصہ کے بعد آپ نے پھر مسابقت کی اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بدن بھاری ہو چلا تھا اس مرتبہ آپ آگے نکل گئے تو آپ نے فرمایا یہ اس کا بدلہ ہے۔ فرماتے کنواری بچی کی دلجوئی اور دلداری اور اس جذبات اور کی رعایت بڑھاپے میں کوئی مرد اس طرح کر سکتا ہے جس طرح حضور نے کی۔ حاشا وکلا۔ بوڑھوں سے یہ بہت دشوار ہے۔ مگر ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بڑھاپے میں

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے وہ برتاؤ کیا جو جوان شوہر کو جوان بی بی کے ساتھ کرنا چاہیے بلکہ کوئی جوان بھی اتنا نہیں کر سکتا تھا جتنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ کیا۔

وقار کا بھوت آج کل جو لوگ وقار وقار پکارتے ہیں یہ وقت از تکر کا پوئلہ ہے ان لوگوں نے تکر کا نام وقار رکھ لیا ہے۔ یاد رکھو وقار کے خلاف وہ کام ہے جس میں

دین پر بات آتی ہو اور جس میں دینی مصلحت پر کوئی اثر نہ پہنچے محض اپنی عری سبکی ہوتی ہے تو ایسا کام عین تواضع ہے۔ آج کل جو لوگ وقار کا پوئلہ لعل میں دباتے ہوئے ہیں وہ بیوی کے ساتھ دوزخ کو خلاف وقار سمجھتے ہیں مگر وہ زبان سنبھالیں اور آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مسابقت کی ہے تو کیا معاذا اللہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو بھی خلاف وقار سمجھتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اور اگر کوئی ایسا کہے تو اس کے ایمان کی خیر نہیں یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل خلاف وقار نہ تھا ہاں تکر کے خلاف ضرور تھا پس آج کل کے مدعیان متکبر نہیں ہیں تو ذرا وہ ہم کو بیوی کے ساتھ دوزخ دکھلائیں مگر ان سے قیامت تک ایسا نہ ہوگا۔ ہاں جو شخص متکبر نہ ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا متبع ہوگا وہ ضرور ایسا کر سکتا ہے اور بحمد اللہ ہم نے بھی اس سنت پر عمل کیا ہے۔

حکمت چہارم ایک حکمت یہ تھی کہ عورتوں کے متعلق جو خاص احکام ہیں ان میں عورت کا واسطہ ہونا زیادہ نافع اور موجب سہولت ہو سکتا ہے دوسری عورتوں کے لئے پھر وہ احکام جن امور کے متعلق ہیں ان میں عادات عورتوں کی مختلف ہوتی ہیں تو یہ

منہایت مصلحت کی بات ہے کہ وہ واسطے متعدد ہوں تاکہ ہر قسم کے احکام سہولت سے ظاہر ہو سکیں اور ظاہر ہے کہ منکوحہ کے برابر کوئی بے تکلف واسطہ نہیں ہو سکتا۔ عرض یہ حکمتیں تھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد نکاحوں میں اور یہ بھی نمونے کے طور پر چند بیان کر دی گئی ہیں ورنہ اور بہت سی حکمتیں ہیں جن کے بیان کو عمر طویل چاہئے ان وجوہ سے آپ نے متعدد نکاح کئے ہیں ورنہ اگر آپ چاہتے تو بالکل صبر کر لیتے اور جس طرح پوری جوانی ایک چالیس سالہ بیوہ کے ساتھ آپ نے گزار دی بڑھاپے کو بھی ایک بیوہ کے ساتھ گزار سکتے تھے مگر آپ نے ان حکمتوں کی وجہ سے جن کا ابھی ذکر ہوا ہے متعدد نکاح کئے جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ترک لذات زہد کے لئے لازم نہیں بلکہ صرف تقلیل لذات کافی ہے ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ترک نکاح ضرور

نہ مانتے۔

(وعظ تعلیل الکلام ص ۳۲)

(۱۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج فرمانا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مزاج فرمانے تھے اس میں بھی حکمت تھی ایک تو تطبیق قلوب اصحاب تھی اور دوستوں کا دل خوش کرنا بھی عبادت ہے میں نے اپنے استاد مولانا فتح محمد صاحب سے سنا ہے کہ ایک دفعہ وہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں دیر تک بیٹھے رہے اور باتیں کرتے رہے جب اٹھنے لگے تو حضرت نے عرض کیا کہ آج میں نے حضرت کا وقت بہت ضائع کیا حضرت کی عبادت میں خلل ڈالا۔ حاجی صاحب نے فرمایا کہ کیا نفلیں پڑھنا ہی عبادت ہے دوستوں سے باتیں کرنا عبادت نہیں؟ یہ تم نے کیا کہا کہ وقت ضائع کیا؟ نہیں بلکہ یہ سارا وقت عبادت ہی میں گذرا۔ اسی طرح حضرت مولانا محمد قاسم صاحب ناٹووی رحمۃ اللہ علیہ صبح کی نماز کے بعد بعض دفعہ مصلیٰ پر بیٹھے رہتے تھے اور اشراق کے وقت تک دوستوں سے باتیں کرتے تھے۔ عامی تو یہ سمجھتا تھا کہ یہ وقت عبادت سے خالی گذرا۔ مگر مولانا اس کو بھی عبادت میں مشغول سمجھتے تھے کیونکہ تطبیق قلوب مومن بھی عبادت ہے۔ پس ایک حکمت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج میں یہ تھی۔

مزاج کی دوسری حکمت دوسری حکمت وہ تھی جو مجھے خواب میں بتلائی گئی۔ میں نے شباب میں خواب دیکھا تھا کہ ملکہ وکٹوریہ ایک ایسی سواری میں سوار ہے جس میں نہ انجن ہے نہ گھوڑا نہ بیل، اس وقت تو میں اس سواری کی حقیقت کو نہیں سمجھا تھا مگر اب موٹر دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ وہ سواری لاری موٹر کی شکل میں تھی۔ اور میں نے دیکھا کہ ملکہ کی سواری تھا نہ بھون کی گلیوں سڑکوں میں پھر رہی ہے پھر توڑی دیر بعد میں نے اپنے کو بھی اس سواری میں سوار دیکھا اس وقت ملکہ نے مجھ سے کہا کہ مجھے حقانیت اسلام میں کوئی شبہ نہیں صرف ایک بات کھٹکتی ہے اگر حل ہو جائے تو پھر اسلام کے حق ہونے میں مجھ کوئی اشکال نہ رہے گا۔ میں نے کہا بیان کیجئے وہ شبہ کیا ہے۔ کہا حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مزاج بھی فرمانے تھے اور مزاج وقار کے خلاف ہے لہٰذا لوں کا خوش کرنا۔

اور نبی کے لئے وقار کا ہونا ضروری ہے یہ اشکال سلاطین ہی کے مذاق کے مناسب ہے کیونکہ وقار خود ای کا سب سے زیادہ اہتمام انہی کو ہوتا ہے، میں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج میں بڑی حکمت تھی وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رعب و جلال اس درجہ عطا فرمایا تھا کہ ہر قل و کسریٰ اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے آپ کے نام سے پھرتے تھے حدیث میں ہے نصرت بالرعب مسيرة شہر، کہ اللہ تعالیٰ نے میری مدد رعب سے بھی کی ہے جو ایک مہینہ کی مسافت تک پہنچا ہوا ہے یعنی اس مخلوق پر بھی آپ کا رعب طاری تھا جو بقدر ایک مہینہ کی مسافت کے آپ سے دور تھے پاس والوں کا تو کیا ذکر۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو بڑی چیز ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلامان غلام کے نام سے بھی سلاطین کا پنتے تھے جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہما و امثالہما، اور یہ معلوم ہے کہ حضور صرف سلطان نہ تھے بلکہ رسول بھی تھے اور رسول کا کام یہ ہے کہ امت کی ظاہری و باطنی اصلاح کرے جس کے لئے افادہ و استفادہ کی ضرورت ہے اور افادہ اور استفادہ کی شرط یہ ہے کہ مستفیدین کا دل مرنے سے کھلا ہوا ہوتا کہ وہ بے تکلف اپنی حالت کو ظاہر کر کے اصلاح کر سکیں اور جس قدر رعب و جلال خدا تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا وہ صحابہ رضاکو استفادہ سے مانع ہوتا ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم گاہ گاہ مصلحت سے مزاج فرمانے تھے کہ صحابہ رضاکے دل کھل جائیں اور وہ ہر وقت ترغوب رہ کر اپنے دل کی باتیں بیان کرنے سے نہ رکیں اور یہ علم نہیں کہ ہر مزاج خلاف وقار ہے۔ خلاف وقار صرف وہ مزاج ہے جس میں کوئی مصلحت و حکمت نہ ہو اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج سے آپ کے وقار و عظمت میں کمی نہ آئی تھی بلکہ اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ صحابہ رضاکے قلوب میں انشراح پیدا ہوتا اور وہ انقباض جاتا رہتا تھا جو غایت رعب کی وجہ سے قلوب میں عادت پیدا ہوتا ہے۔ جس کا اثر یہ تھا کہ قلوب میں آپ کی محبت جاگزیں ہوتی تھی اگر آپ مزاج نہ فرمانے تو صحابہ کے اوپر آپ کا خوف بھی غالب ہوتا محبت غالب نہ ہوتی اور جب سے آپ کی محبت غالب ہوئی۔ تو آپ کے وقار میں کچھ کمی نہ ہوئی بلکہ پہلے سے بھی زیادتی ہوئی کیونکہ پہلے تو وقار و عظمت کا منشا صرف خوف تھا اب محبت و خوف دونوں مل کر کام کرنے لگے۔

مزاج سے رعب کب کم ہوتا ہے اگر کوئی یوں کہے کہ مزاج سے تو خوف زائل ہو جاتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ

یہ وہاں ہوتا ہے جہاں مزاح کرنے والے میں شان رعب کم ہو اور وہ مزاح بکثرت کرے اور اگر شان رعب بہت زیادہ ہو جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت احادیث میں وارد ہے اور مزاح بھی بکثرت نہ ہو تو اس صورت میں مخاطب بے خوف نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مشاہدہ اس کی دلیل ہے اور احادیث سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے قلوب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کس درجہ تھی اور جب کبھی کسی بات میں آپ کو غصہ کیا ہے تو صحابہ کی کیا حالت ہوتی تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے قوی القلب شجاع بھی ہٹھکراتے اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر عاجزانہ التجا کرنے لگتے تھے۔ اس جواب کے بعد ملکہ نے کہا کہ اب میرا طمینان ہو گیا اور اب مجھے حقانیت اسلام میں کوئی شبہ نہیں رہا۔

(الحکود والقیود ص ۹)

(۱۶) مرتد کا درجہ کافر اصلی سے کیوں طہا ہوتا ہے

جواب :- ترک اسلام کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ اول ہی سے اسلام قبول نہ کرے دوسری یہ کہ بعد قبول کے ترک کر دے دونوں صورتوں میں یہی سزا ہے بلکہ دوسری صورت پہلی سے اشد ہے چنانچہ قوانین سلطنت میں باغی کی سزا ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ جو پہلے ہی سے اس سلطنت کی رعایا نہیں ہے بلکہ کسی مخالف سلطنت کی رعایا ہیں ایسے لوگوں پر اگر کبھی غلبہ ہو جائے تو ان کو غلام بنالیتے ہیں یا احسان کر کے رہا کرتے ہیں یا عزت کے ساتھ نظر بند کر دیتے ہیں۔ مگر باغی کے لئے بجز قتل یا عبور دریا سے شور کے کچھ سزا ہی نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رعایا بزرگ باغی ہو جانے میں سلطنت کی زیادہ توہین ہے۔

ارتداد کا انجام اسی طرح اسلام لا کر مرتد ہو جانے میں اسلام کی سخت توہین ہے اور اس کی تعلیم کو دوسرے کی نظریں حقیر کرنا ہے۔ دیکھتے ایک تو وہ شخص ہے جس سے کبھی آپ کی دوستی نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ سے مخالف ہے اس کی مخالفت سے آپ کا اتنا ضرر نہیں ہوتا اور اگر وہ کبھی آپ کی مذمت و ہجو کرے تو لوگوں کی نظروں میں اس کی کچھ وقعت نہیں ہوتی سب کہہ دیتے ہیں میاں اس کو تو ہمیشہ سے اس کے ساتھ عداوت رہی ہے دشمنی

میں ایسی باتیں کرتا ہے۔ اور ایک وہ شخص ہے جو سالہا سال سے آپ کا دوست رہا کبھی وقت مخالف بن گیا اس کی مخالفت سے بہت ضرر ہو جاتا ہے اور وہ جو کچھ برائیاں آپ کی کرتا ہے لوگ اس پر توجہ کرتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے اس کا نشانہ محض عداوت نہیں ہے اگر دشمن ہوتا ہے تو سالہا سال تک دوست کیوں بنتا، معلوم ہوتا ہے کہ اس کو دوستی کے بعد فلاں شخص کے اترے پترے معلوم ہو گئے ہیں اسی لئے مخالف ہو گیا حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص دوستی کے بعد دشمن بنا ہو وہ اترے پترے معلوم کرنے کے بعد دشمن بنا ہو، ممکن ہو کہ اس نے دوستی بھی اس نیت سے کی ہو کہ لوگ دوستی کے زمانے میں مجھے اس کا رازدار سمجھ لیں گے تو مخالفت کی حالت میں جو کچھ کہوں گا اسکو سمجھ کر قبول کر لیں گے یہ شخص رازدار چکا ہے اسکو ضرر کچھ راز کی باتیں معلوم ہوتی ہیں سوائے مخالفت ہو گیا چنانچہ بعض مفسرین اسلام کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ وَقَالَ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَحَاجَّةِ النَّهَارِ وَانْكَفَرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔ پس ہر چند کہ دوست کے دوست کی مخالفت میں یہ احتمال بھی ہے مگر (جامع) عاداتاً لوگ دوستوں کی مخالفت میں عموماً جلدی متاثر ہوتے ہیں (اور اس احتمال پر نظر نہیں کرتے) اس لئے عفو اور شرفاً و قانوناً وہ شخص بہت بڑا مجرم شمار ہوتا ہے جو موافقت کے بعد مخالفت کرے۔ اس لئے شریعت میں مرتد کے لئے دنیاوی سزا بھی سخت ہے اور عذاب آخرت بھی اشد ہے۔

(محاسن اسلام ص ۱۹)

(۱۷) مسلمان کا اقدام علی لکبار اور اس کی وجہ

اس کا جواب یہ ہے کہ اقدام جرم اگر عقیدہ اسلام کا ثمرہ ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جن لوگوں کو اسلام سے جتنا زیادہ تعلق ہے مثلاً علماء اتقیار و صوفیاء ان میں یہ ثمرہ زیادہ ظاہر ہوتا کیونکہ قاعدہ ہے کہ مذہب کے ثمرات کا ظہور ان ہی لوگوں میں زیادہ ہوتا ہے جن کو مذہب سے زیادہ تعلق ہے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں اور کفار بھی اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو اسلام سے تعلق زیادہ ہے وہ جرائم کا ارتکاب کم تو کیا کرتے وہ شبہات سے بھی احتراز کرتے ہیں۔

لے بچنا۔

ایک مسلمان کا واقعہ

چنانچہ ہمارے ایک دوست کا جو کہ بی، اے، ہیں واقعہ ہے کہ وہ ایک بار ریل کا سفر کر رہے تھے، ان کے پاس اسباب پندرہ سیر سے زیادہ تھا۔ اسٹیشن پر پہنچنے کی وقت کی وجہ سے وہ اس کو وزن نہ کرا سکے اس وقت تو جلدی میں سوار ہو گئے لیکن جب منزل مقصود پر اترے تو وہاں کے بابو سے جا کر اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں جلدی میں اسباب کو وزن نہ کرا سکا اب آپ اس کو وزن کر لیں اور جو محصول میرے ذمہ ہو اس کو وصول کر لیجئے بابو نے انکار کیا کہ مجھ کو فرصت نہیں تم ویسے ہی لے جاؤ ہم تم سے محصول نہیں لیتے۔ انھوں نے کہا کہ صاحب آپ کو اس معافی کا کوئی حق نہیں کیونکہ آپ ریلوے کے مالک نہیں ہیں بلکہ ملازم ہیں آپ کو محصول مجھ سے لینا چاہیے مگر اس نے پھر بھی انکار کیا تو یہ اسٹیشن ماسٹر کے پاس گئے اس نے بھی کہا کہ آپ بلا تکلف سامان لے جائیں ہم آپ سے محصول نہیں لیتے۔ انھوں نے اس سے بھی کہا کہ آپ کو معافی کا کوئی حق نہیں ہے اس کے بعد اسٹیشن ماسٹر اور اس بابو میں انگریزی میں گفتگو ہونے لگی وہ یہ سمجھے کہ یہ مسافر انگریزی نہیں سمجھتا ہو گا کیونکہ ان کی صورت ملاؤں کی سی تھی غرض ان دونوں نے اس گفتگو میں یہ رائے قرار دی کہ یہ شراب پیتے ہوئے معلوم ہوتا ہے باوجود ہمارے انکار کے یہ محصول دینے پر اصرار کرتا ہے، انھوں نے جواب دیا کہ صاحب میں نے شراب نہیں پی ہے بلکہ ہمارا مذہبی حکم ہے کہ کسی کا حق اپنے ذمہ نہ رکھو، اس پر وہ دونوں بولے کہ ہم تو اس وقت اسباب وزن نہیں کر سکتے آخر یہ اسباب اٹھا کر بلیٹ فارم سے باہر لائے اور سو جنے لگے کہ یا اللہ تعالیٰ اب میں ریلوے کے اس حق سے کیسے سبکدوشی حاصل کروں آخر اللہ تعالیٰ نے امداد کی اور یہ بات دل میں ڈالی کہ جتنا اسباب زیادہ ہے اس کے محصول کے برابر ایک ٹکٹ اسی ریلوے کے کسی اسٹیشن کا لے کر چاک کر دیا جائے۔ اس طرح ریلوے کا حق اس کو پہنچ جائے گا چنانچہ ایسا ہی کیا۔

دیانت داری کا دوسرا واقعہ

میرے ایک اور دوست کا جو ڈپٹی کلکٹر بھی تھے واقعہ ہے کہ ان کا ایک بچہ ریل کے سفر میں ان کے ہمراہ تھا جس کا قد بہت کم تھا کہ دیکھنے میں دس سال کا معلوم ہوتا تھا مگر اس کی عمر تقریباً ۱۳ سال کی تھی اور ریلوے کے قاعدے سے اس عمر کے بچے کا ٹکٹ پورا لینا ضروری ہے انھوں نے ٹکٹ لینا چاہا تو سائیتوں نے بہت منع کیا کہ اس کو تیرے سال کا کون کہہ سکتا

ہے آپ آدھا ٹکٹ لے لیجئے کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ انھوں نے کہا کہ بندے کچھ نہ کہیں گے تو کیا حق تعالیٰ بھی باز پرس نہ فرمائیں گے؟ کہ تم نے دوسروں کی چیز میں تھوڑی اجرت بدوں اس کی اجازت کے کیوں تصرف کیا۔ غرض انھوں نے پورا ٹکٹ لیا اور ان کے ساتھ ہی ان کو بے وقوف بناتے رہے مگر ع۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ شد

بھلا اس کی نظیر کوئی قوم بھی دکھلا سکتی ہے کہ ایک شخص کو ریل بابو اور اسٹیشن ماسٹر خود کہہ دے کہ تم بلا تکلف اسباب لے جاؤ ہم محصول نہیں لیتے اور وہ پھر بھی اس پر اصرار کرے کہ میں تم کو محصول لینا پڑیگا تم کو معافی کا کوئی حق نہیں اور جب وہ کسی طرح وصول نہیں کرے تو یہ محض خدا کے خوف سے ریلوے کا ٹکٹ مقدار محصول کے برابر خرید کر چاک کر دیتا ہے اور یہ صورت شبہات سے احتراز کرنے کی عام لوگوں کی نظروں میں ہے ورنہ حقیقت میں یہ شبہات کی قسم نہیں بلکہ صریح واجب کا امتثال ہے۔

عقیدہ کا اثر

نہیں اگر اس عقیدہ کا اثر اقدام علی الجرائم ہوتا تو علماء صلحا سب سے زیادہ بیباک اور جرائم پر اقدام کرنے والے ہوتے حالانکہ مسلمانوں میں یہ طبقہ جو اسلام کے حقیقی مرتبہ کو سمجھتا ہے سب سے زیادہ جرائم سے بچنے والا اور شبہات سے احتراز کرنے والا ہے پس معلوم ہوا کہ عقیدہ کا یہ اثر نہیں ہے جو معتضون نے سمجھا ہے بلکہ اس کا اثر جرائم سے رکنا اور گناہوں سے نفرت پیدا ہونا ہے جس کی وجہ میں عنقریب تباہی کا کہ اس عقیدے کا اثر گناہوں سے نفرت پیدا ہونا کس طرح ہے مگر افسوس۔

چشم بد اندیش کہ بر کند باد عیب نماید ہنرش در نظر

ایسا پاکیزہ مسئلہ جو جرائم کی جڑ کاٹنے والا ہے بد اندیش کو اقدام جرائم کا سبب معلوم ہوتا ہے یہ جواب تو مشاہدہ کے متعلق ۔ ۔ ۔ ۔ ہے کہ حسنا و مشاہدہ اس عقیدہ کا اثر جو تم تباہ رہے ہو غلط ثابت ہو رہا ہے۔

عقلی جواب (۲)

اور جواب عقلی اس کا یہ ہے کہ یہ عقیدہ عقلاً اقدام جرائم کا سبب نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ جب کو چاہیں گے باوجود کبائر کے عذاب سے معاف کر دیں گے جس میں یقین نہیں ہے یعنی کسی شخص کو یہ معلوم نہیں کہ میرے متعلق مشیت الہی بصورت عفو ہے یا بصورت عذاب پھر اس صورت میں کوئی

شخص بھی عذاب سے بے فکر نہیں ہو سکتا بلکہ ہر ایک کو یہ اندیشہ لگا ہوا ہے کہ شاید میرے ساتھ قانونی برتاؤ کیا جائے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک عنین (نامرد) شخص شرم و ندامت کی وجہ سے خود کشی پر آمادہ ہو کر سنگھیا استعمال کرے اور وہ اتفاقاً سنگھیا کھا کر ہلاک نہ ہو بلکہ سنگھیا ہضم ہو کر اس کے اندر قوت مردی پیدا کر دے چنانچہ بعض جگہ ایسے واقعات ہوتے ہیں۔ مگر کیا اس اتفاقی واقعہ سے کسی کو سنگھیا کھانے کی جرأت ہو سکتی ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ ہر عاقل سمجھتا ہے کہ زہر کا خاصہ تو ہلاک کرنا تھا مگر اتفاقاً اس شخص میں آپ کی خاصیت کا ظہور نہ ہوا تو اس سے یہ خاصیت نہیں بدل گئی اس لئے مردانگی بڑھانے کے لئے سنگھیا کھانے کی کوئی نہ اجازت دے سکتا ہے اور نہ ہر شخص اس پر جرأت کر سکتا ہے۔

مراحم خسروانہ سے فریب نہیں کھانا چاہیے

مراحم خسروانہ سے کسی قاتل کو رہا بھی کر دیتے ہیں مگر اس علم کی وجہ سے ہر شخص کو قتل کی وجہ سے ہر شخص کو قتل پر جرأت نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ قتل کی اصل سزا تو پھانسی ہی ہے اور عمل بھی اکثر اسی قانون کے مطابق ہوتا ہے اور مراحم خسروانہ کوئی قانون نہیں بلکہ محض حاکم کی مشیت پر ہے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کس کے ساتھ مراحم خسروانہ کا برتاؤ کرے لہذا مراحم خسروانہ کے بھروسہ پر اقدام جرم کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ بعینہ اسی طرح کبار کا بدو عذاب کے معاف ہو جانا بطور مراحم خسروانہ کے ہے پس اس مسئلہ کو اقدام جرم کا سبب کیونکر سمجھ لیا گیا۔ بھلا اگر کوئی شخص جنگل میں پاخانہ کرنے جائے اور اسے تنجے کے لئے ڈھیلا ٹوڑتے ہوئے اس کو زمین میں سے سونے کا گھڑا مل جائے تو کیا اس اتفاقی بات پر بھروسہ کر کے کوئی شخص بھی زراعت و تجارت سے مستغنی ہو کر بیٹھ سکتا ہے کہ مجھ کو بھی اسی طرح پاخانہ کرتے ہوئے سونے کا گھڑا مل جائے گا۔ ہرگز نہیں۔ اسی طرح اتفاقاً کسی ترکب کبار کا بدو عذاب کے بخشد یا جانا اتفاقی ہے اس لئے یہ اقدام جرم کا سبب ہرگز نہیں ہو سکتا مگر پھر بھی جو لوگ جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں وہ اپنی طبیعت کے خبث سے ایسا کرتے ہیں اس عقیدے کا اس میں کیا دخل۔

جواب (۳) پھر یہ جو بعض گنہ گاروں کی مغفرت بدو عذاب کے بھی ہو جاتی ہے اس کی وجہ بھی معلوم ہے کہ یہ مغفرت

کیونکر ہوگی؟ یہ بھی کسی عمل صالح کی وجہ سے ہوگی۔ ابو داؤد کی ایک حدیث شریف ہے ابھی یہ مسئلہ معلوم ہوا ہے وہ حدیث شریف یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی مقدمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹی قسم کھائی اور اس طرح کہا اشهد باللہ الذی لا الہ الاہو ما فعلت ذالک قسم اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔ فقال رسول اللہ بل قد فعلت لکن غفر اللہ لک باخلاص قول لا الہ الاہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو نے یہ کام ضرور کیا اور تیری قسم جھوٹی ہے جس کا بہت بڑا گناہ ہوتا ہے، لیکن حق تعالیٰ نے تجھے اس خلاص کی برکت سے بخش دیا جو لا الہ الاہو کہتے ہوئے تجھ سے صادر ہوا نہ معلوم اس وقت کس دل سے اس نے خدا کا نام لیا ہے جو اس درجہ مقبول ہو گیا دینی اس نے خدا کا نام اس وقت کامل اخلاص سے لیا تھا اس کی برکت سے حلف کا گناہ معاف ہو گیا، اس کا مطلب نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈگری اس کی کر دی۔ بلکہ محض اس گناہ کی مغفرت کا ذکر فرمایا مقصود یہ ہے کیونکہ جب وحی سے اس کا کاذب فی الحلف ہونا معلوم ہو گیا تو اب ڈگری اس کے حق میں کیونکر ہو سکتی تھی۔ تو دیکھئے گناہ کتنا سنگین تھا کہ جھوٹی قسم کھائی اور وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹی قسم کھانا ایسا ہے جیسا خدا کے سامنے۔ اور ظاہر ہے کہ محل و زمان کی عظمت سے بھی فعل میں عظمت پیدا ہو جاتی ہے۔ زنا کرنا گناہ ہے مگر مسجد میں زنا کرنا اور بھی آشد ہے اور اگر کوئی نامعقول کعبہ شریف میں ایسا فعل کرے تو بہت ہی سخت ہے اسی طرح جھوٹی قسم کھانا گناہ ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا گناہ اور بڑھ جاتا ہے کیونکہ آپ نائب خدا ہیں آپ کے سامنے جھوٹی قسم لینی ہے جیسی خدا کے سامنے ہو۔

ایک شبہ کا ازالہ

شاید کوئی یہ کہے کہ ہم تو اس وقت بھی جو کرتے ہیں سب خدا ہی کے سامنے کرتے ہیں اور جس جگہ جو کام بھی ہو گا وہ خدا کے سامنے ہو گا تو چاہیے ہر جگہ وہی گناہ ہو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹی قسم سے ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت تو تم خدا کے سامنے ہو مگر خدا تمہارے سامنے نہیں اور میرا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قسم کھانا ایسا ہے جیسا خدا کو سامنے سمجھ کر قسم کھانا۔ خلاصہ یہ کہ قرب کی دو قسمیں ہیں ایک قرب حسی یہ تو جہاں ہوتا ہے طرین سے ہوتا ہے اور ایک قرب علمی یہ ایک طرف سے بھی ہو سکتا ہے پس اس وقت جو تم خدا کے سامنے ہو یہ قرب علمی ہے کہ خدا تعالیٰ سے تمہارا کوئی حال مخفی نہیں وہ سب کچھ جانتے ہیں مگر اس حالت میں تم کو قرب حاصل نہیں اور نہ

ہر شخص کا مقرب ہونا لازم آئے گا اور قیامت میں جو تم خدا کے سامنے ہوں گے وہ قرب جانیں سے ہوگا کہ تم بھی خدا تعالیٰ کے سامنے ہوں گے۔ اور خدا تعالیٰ بھی تمہارے سامنے ہوں گے۔ اَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ جَبَلٍ أُولِيٍّ میں قرب علمی مراد ہے۔ اسی لئے یہ نہیں فرمایا گیا کہ تم بھی ہم سے قریب ہو بلکہ صرف اپنا قرب بیان فرمایا ہے کیونکہ یہاں تماشہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ تو ہم سے قریب ہیں مگر ہم ان سے دور ہیں۔

یار نزدیک تر زین بہ من است دیں عجب ترکہ من ازوے دورم
تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹی قسم ایسی ہے جیسی قیامت میں خدا کے سامنے جھوٹی قسم کھانا۔ جب کہ تم بھی حق تعالیٰ کو اپنے سامنے سمجھو گے۔ (محاسن اسلام ص ۹)

اللہ کا بے انتہا عفو و کرم | جواب (۴) چوتھا جواب یہ ہے کہ بعض گناہوں کا بدون عقاب کے ہو جانا یہ حق تعالیٰ کا عفو و کرم ہے

اس کو سن کر لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ حق تعالیٰ بڑے ہی رحیم و کریم ہیں جو اپنے بندوں پر بے حد عنایت فرماتے ہیں اور قاعدہ ہے کہ طبائع سلیمہ میں عنایت و کرم سے اطاعت و عبادت کو ترستی ہوتی ہے۔ نہ کہ سرکشی کو، اگر آقا کی عنایت زیادہ ہوں تو اس کی اطاعت کا شوق بڑھتا ہے۔ وہ نوکر بڑا ہی پاچی ہے جو آقا کی بے حد عنایات کے بعد بھی سرکشی ہی کرے۔ طبائع سلیمہ احسان و کرم و عنایات سے بندہ بے درم ہو جاتی ہے اس لئے یہ عقیدہ اقدام علی الجرائم کا سبب ہرگز نہیں بلکہ جرائم و سرکشی کی جڑ کاٹنے والا ہے۔ جن لوگوں کی طبائع سلیمہ ہیں وہ خدا کی ان نعمتوں اور عنایتوں کو دیکھ کر اور زیادہ عبادت کرتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ کہ اسلام سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں ان میں یہ اثر مشاہد ہے اب اگر اس عقیدہ سے کسی میں اقدام جرائم کا وصف پیدا ہو تو کہا جائیگا کہ یہ اس عقیدہ کا اثر نہیں بلکہ اس شخص کی کجی طبع کا اثر ہے جیسا بادشاہ کا کریم ہونا طبائع سلیمہ کے لئے زیادت و فاداری کا سبب ہوتا ہے گو بعض نالائق بادشاہ کے کرم کی وجہ سے جرائم پر بھی دلیر ہو جاتے ہیں مگر کیا اس کا سبب بادشاہ کے کرم کو کہا جائے گا یا ان کی بد طبیعتی کو اس کا فیصلہ عقلاً خود کر سکتے ہیں بعض لوگوں کو یہ آیت لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَتِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا سے دھوکا ہوا ہے اور وہ بے فکر ہو گئے ہیں کیونکہ وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ حق تعالیٰ یقیناً سب گناہوں کو معاف کر دیں گے کیونکہ لمن یشتر کی قید نہیں ہے۔ سوان کو سمجھ لینا چاہیے کہ اول تو یہ آیت عام نہیں ہے بلکہ اس کا شان

نزدول ان لوگوں کے بارے میں ہوا ہے جو کفر سے اسلام کی طرف آنا چاہتے تھے۔ مگر ان کو اسلام سے یہ خیال مانع تھا کہ ہم نے حالت کفر میں بڑے بڑے جرائم کئے ہیں ان کا کیا حشر ہوگا۔ آیا اسلام کے بعد ان پر مواخذہ ہوگا یا نہیں۔ اگر مواخذہ ہوا تو پھر اسلام ہی سے کیا فائدہ۔

کفر سے پہلے الے گناہ | چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا لو اسلمنا دفما یفعل

بن نونیا اللی اسلفنا او کما قالوا کہ اگر ہم اسلام لے آئیں تو ہمارے پہلے گناہوں کے متعلق کیا برتاؤ ہوگا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے بعد پہلے گناہ جو حالت کفر میں کئے گئے ہیں سب معاف ہو جائیں گے پس اس میں جو مغفرت کا دعویٰ جتنی ہے وہ عام نہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اور لوگوں کے گناہ بدون عقاب کے معاف نہ ہوں گے نہیں دوسروں کے بھی معاف ہوں گے جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں لیکن ان کے لئے وہی وعدہ ہے جو دوسری آیت میں مذکور ہے۔ وَیَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ یَّشَاءُ جس میں جتنی وعدہ نہیں کیا بلکہ مشیت کی قید سے مشروط ہے اور اس آیت میں جو بلا قید حتیٰ وعدہ کیا گیا ہے یہ صرف نو مسلموں کے لئے ہے کہ اسلام سے ان کے پہلے گناہ ضرور معاف ہو جائیں گے جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہو رہا ہے اور شان نزول مثل تفسیر کے ہے بہت سے نصوص بظاہر عام ہیں لیکن شان نزول سے ان کی تفسیر کی جاتی ہے۔ (وعظ محاسن اسلام ص ۱)

(۱۸) مسلمانوں کا جانور کو ذبح کرنا عقل و نقل کی روشنی میں

دوسری قوموں کا یہ شبہ کہ یہ لوگ بڑے سنگدل ہوتے ہیں کہ انھیں جانوروں کے گلے پر چھری پھیرتے ہوئے ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ محض ناواقفی یا تعنت سے ناشی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہ شبہ اور یہ اعتراض فقط گائے کی قربانی کے متعلق ہے۔ چوہے۔ بکری، مرغی، کبوتر کے متعلق نہیں معلوم ہوتا ہے دال میں کالا ہے۔ یعنی اس شبہ کا سبب رحم نہیں ہے۔ بلکہ محض حمیت مذہبی ہے اور اگر کوئی ذہین آدمی مذہب سے قطع نظر کر کے سب جانوروں کے

متعلق یہی الزام دے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسے یہ کیا خبر کہ مسلمانوں نرم دل ہوتے ہیں یا سخت دل۔ پس ان کا اعتراض اگر حجت مذہب سے نہیں تو ناواقفیت سے ضرور ہے۔ پس ان کا یہ فیصلہ بہت ہی ظاہر ہے مگر باوجود اس کے ظاہر ہونے کے علماء مناظرین نہ معلوم جواب میں کہاں کہاں ہونے لگتے ہیں۔ لیکن ان پر بھی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ وہاں تحقیق مقصود نہیں ہوتی۔ محض الزام و اسکاٹ مقصود ہوتا ہے۔ باقی جہاں تحقیق منظور ہوتی ہے وہاں حق تعالیٰ کی جانب سے اصل حقیقت کا اقرار ہوتا ہے۔ سو الحمد للہ حق تعالیٰ اس وقت مجھے جواب میں یہ بات سمجھا دی کہ انہیں کیا خبر کہ مسلمانوں میں رحم نہیں۔ اب آپ سب مسلمان کو ٹٹول لیجئے کہ ذبح کے وقت کیا قلب کی کیفیت ہوتی ہے۔ بڑھتا ہے یا نہیں۔ بعض موجودہ بزرگوں کا قصہ سنا ہے کہ ذبح کے وقت آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔ آخر یہ کیا بات ہے۔ رحم اور کسے کہتے ہیں۔ لیکن اس سے بڑا کمال مسلمانوں کا عدل ہے کہ ایک ہی طرف نہیں چلے گئے۔ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّتًا وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا اوسط کی تفسیر عدل ہے کہ اعتدال ہو۔ قوت و عمل دونوں ہیں کہ جزیرہ و بلاہت کے وسط میں حکمت جن و تہور کے وسط میں شجاعت اسی طرح قوت شہونیہ خود و فجور میں تو وسط عفت ہے۔ اور تینوں کے مجموعہ یعنی حکمت و شجاعت و عفت کا نام عدل ہے تو یہ امت عادلہ ہے۔ حق تعالیٰ نے احکام ایسے رکھے ہیں کہ اگر ان کے اندر صفت عدل کم ہو تو ان احکام کے برتنے سے درست ہو جائے نہ افراط ہو کہ چھتری ڈال دو۔ اور نہ تفریط کہ رحم ہی نہ ہو۔ غرض دونوں میں اعتدال رکھو تو ہمارا کمال یہ ہے کہ رحم بھی ہے اور چھری بھی پھیرتے ہیں مگر یہ سمجھ کر ع۔

ع آنکہ جان بخشد رگہ بخشد رواست

اگر کوئی کہے کہ انہوں نے تو مارا نہیں تو اس کا جواب دوسرے مصرعہ میں دیتے ہیں ع

ع نائب است اودست اودست خداست

یہ تو مسلم ہے کہ جان جس کی دی ہوئی ہو۔ وہ لے سکتا ہے ہم اس کے نائب ہیں اس نے ہمیں حکم دیا ہے اس لئے ہم نے چھری پھیری۔ باقی ہم نے جان نہیں نکالی ہم نے تو فقط راستہ کھول دیا ہے جان تو انہیں نے نکالی ہے پھر کیا شبہ رہا اہل اسلام پر کہ بڑے سنگدل ہوتے ہیں۔ آپ بڑے رحم دل ہوتے ہیں کہ خود چوہے نہیں مارتے مسلمانوں کے محلے میں چھوڑ آتے ہیں کہ یہ

لے خاموش کرنا۔ لہ انصاف

ماریں جب تم ہمیں موش کشی میں اپنا نائب بناتے ہو تو اگر اللہ تعالیٰ نے گاؤں کشی میں ہمیں اپنا نائب بنایا تو کیا قباحت ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کی نیابت میں یہ فائدہ بھی ہے کہ مارو اور کھاؤ اور تمہاری نیابت میں تو فقط مار کر پھینک دینا ہی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ سبحان اللہ! یہ رحم دلی ہے کہ ہم سے نہیں مارتے جاتے تو تم تارو۔ نیابت اور کسے کہتے ہیں۔ یہ تو زبان سے بھی کہنے سے بڑھ کر ہے اگر زبان سے کہتے تو ایک مسلمان بھی نہ کر سکتا۔ کیونکہ یہ کس کی غرض تھی کہ وہ اپنا کاروبار چھوڑ کر تمہارے گھروں اور دوکانوں پر چوہے مارنے جاتا۔ مگر ان کے گھرا کر چھوڑ دینے کہ اچھی طرح ان کو ماریں۔

ایک حکایت

یہ رحم تو ویسا ہی ہو گیا کہ کسی ایک کی بے جیا بہو تھی اس سے کسی نے پوچھا کہ تمہارا شوہر کہاں گیا ہے جیا کی وجہ سے منہ سے تو نہ کہہ سکی مگر بتلانا بھی ضرور تھا۔ تو آپ نے کیا کیا کہ لہنگا اٹھا اس کے سامنے موتا اور پچھا ند گئی۔ مطلب یہ کہ ندی پار گیا ہے۔ تو حضرت بعض رحم بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ کسی نے زنا کیا۔ حمل رہ گیا رسوائی ہوئی لوگوں نے کہا۔ کمبخت تو نے عزل کیوں نہ کر لیا درغل انزال سے پہلے علیحدہ ہو جانے کو کہتے ہیں، تو آپ کہتے ہیں کہ سنا تھا کہ عزل کروہ ہے۔ کم بخت منحوس اور زنا کو نسا فرض سنا تھا۔ بعضوں کا تقویٰ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ تو رحم ویسا ہی ہے جیسی اس بہو کی شرم تھی کہ منہ سے بولنے میں تو جیا تھی اور لہنگا کھول کر سامنے بیٹھ جانے میں جیسا نہ تھی اور پھر مسلمانوں پر اعتراض حضرات میں تقسیم کہتا ہوں کہ رحم مسلمانوں کے برابر کسی قوم میں نہیں۔ مگر امتحان کے وقت معلوم ہوتا ہے۔ کسی کا قطعہ ہے جس کے بعض اشعار یہ ہیں ع

دیکر قسم کہے کہ تو میرا ہو پئے * * * * * گری نہ جائے جلد سے پیالہ شراب کا
اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو * * * * * گر کچھ بھی خوت کیجئے روز حساب کا
اور امتحان غیر تو یہ آپ کا غلام * * * * * عامل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاہ کا

دنیا کے واقعات نے کھلم کھلا ثابت کر دیا ہے کہ رحم کے موقعوں پر رحم کرنا یہ خاصہ مسلمانوں ہی کا ہے۔ مسلمانوں کے برابر کوئی قوم رحم دل نہیں۔ میرے پاس ایک برہمن کا خط آیا تھا کہ مسلمانوں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جیو مارتے ہیں۔ مثلاً گاؤں کشی وغیرہ کرتے ہیں مگر وہ جیوگا نہیں مارتے (جیوگا آدمی کے نفس کو کہتے ہیں مگر یہ معترض قوم جیوگا مارتی ہے۔ یعنی آدمیوں پر ظلم کرتی ہے۔ مجھے اس شخص کے قول نقل

کرنے سے فقط یہ مقصود ہے۔

عَ الْحَقِّ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ،

یعنی جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے اب تو کئی شہادتیں ہو گئیں کہ مسلمان بڑے رحم دل ہوتے ہیں۔ بہر حال ان کی رحمدلی ثابت ہو گئی۔ (وعظ روح البیج والنج ص ۱۵)

(۱۹) فوج کرنے پر اعتراض اور اس کا جواب

ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ سے زیادہ رحم کسی مذہب میں بھی نہیں ہے۔ اور ذبح حیوان رحم کے خلاف نہیں۔ بلکہ ان کے حق میں اپنی موت مرنے سے مذبح ہو کر مرنے بہتر ہے۔ کیونکہ خود مرنے میں قتل و ذبح کی موت سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ پھر انسان کو ذبح کر دیا جائے تاکہ آسانی سے مر جائے اس کا جواب یہ ہے کہ حالت یاس سے پہلے ذبح کرنا تو دید و دانستہ قتل کرنا ہے اور حالت یاس پتہ نہیں چل سکتا۔ کیونکہ بعض لوگ ایسے بھی دیکھے گئے ہیں کہ مرنے کے قریب ہو گئے تھے پھر اچھے ہو گئے اور یہ شبہ حیوانات میں کیا جائے کہ ان کی تو یاس کا بھی انتظار نہیں کیا جاتا۔ جواب یہ ہے کہ بہائم اور انسان میں فرق ہے وہ یہ کہ انسان کا تو ابقا مقصود ہے۔ کیونکہ خلق عالم سے وہی مقصود ہے۔ اس لئے ملائکہ کے موجود ہوتے ہوئے اس کو پیدا کیا گیا۔ بلکہ تمام مخلوق کے موجود ہونے کے بعد اس کو پیدا کیا گیا۔ کیونکہ نتیجہ اور مقصود تمام مقدمات کے بعد موجود ہو کر تا ہے اس لئے انسان کے قتل اور ذبح کی اجازت نہیں دی گئی۔ ورنہ بہت لوگ ایسی حالت میں فوج کر دیے جاتیں گے۔ جس کے بعد ان کے تندرست ہونے کی امید تھی۔ اور ذبح کرنے والوں کے نزدیک وہ یاس کی حالت تھی اور جانور کا ابقا مقصود نہیں۔ اس لئے ان کے ذبح کی اجازت اس بنا پر دیدی گئی کہ ذبح ہو جانے میں ان کو راحت ہے۔ اور ذبح ہو جانے کے بعد ان کا گوشت وغیرہ بقائے انسانی میں مفید ہے جس کا ابقا مقصود ہے۔ اس کو اگر ذبح نہ کیا جائے اور یونہی مرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے تو وہ مردہ ہو کر اس کے گوشت وغیرہ میں سمیت کا اثر پھیل جائے گا اور اس کا استعمال انسان کی صحت کے لئے مضر ہوگا تو ابقا انسان کا وسیلہ نہ بنے گا اور نقصان جہاد میں چونکہ افنا بعض افراد

لے باقی رکھنا نہ فنا کرنا۔ چلتا کرنا۔

بفرض ابقا جمیع الناس متیقن ہے اس لئے وہاں قتل انسانی کی اجازت نہیں دی گئی مگر ساتھ ہی اس کی رعایت کی گئی کہ حتی الامکان سہولت کی صورت سے مارا جائے۔ یعنی قصاص میں جو کہ قتل اختیاری ہے تلوار سے اور جہاد میں مثلہ وغیرہ کی ممانعت ہے۔ (افکار المحبوب ص ۵)

(۲۰) مردہ کو دفن کرنا بہتر ہے یا جلا دینا؟

اسلام کی خوبی یہ ہے کہ مردہ کے دفن کا حکم دیا گیا اور جلانے کی ممانعت کر دی کہ دفن میں اگر کرم ہے، اور احراق میں اس اصل سے عدول ہے۔ بعض مدین فلسفہ جلانے کی خوبیاں بیان کرتے ہیں اور دفن کی خرابیاں کہ اس سے مٹی خراب ہوتی ہے اور اس سے جو بخارات اٹھتے ہیں وہ گندے زہریلے اور متعفن ہوتے ہیں اس طرح کے نکتوں سے ثابت کرتے ہیں کہ جلانا اچھا ہے مگر ہم تو اس کے خلاف مشاہدہ کر رہے ہیں کہ کسی مدفون کی قبر پر نہیں بد بو نہیں آتی۔ مگر گھٹ پر تو اس قدر متعفن اور گندی ہوا ہو جاتی ہے کہ ناک نہیں دی جاتی۔ ایسے مہل نکتے تو ہر خیر میں بیان ہو سکتے ہیں مگر سلامتی فطرت حق و باطل کا فیصلہ خود کرتی ہے بلکہ عقل و دفن کو پسند کرتی ہے کہ اس میں بدن کو اس کی اصل میں پہنچا دیا۔ باقی خاک ہونا اصل ہے سو اس کی دلیل یہ ہے کہ ہر عنصر کا اپنی چیز کی طرف میلان ہے۔ اگر کوئی شخص کو سمٹے پر سے اچھلے گردہ اور چلا جاتا تو ہوا یا نار غالب ہوتی۔ اب تو خاک غالب ہے۔ اور آب (پانی) کا غلبہ ہونا بھی ظاہر ہے ورنہ آب میں پہنچ کر عمق کی طرف نہ جاتا بس خاک کا غلبہ متعین ہو گیا۔ اور یہ قاعدہ عقلی ہے کہ کل شیء یرجع الی اصلہ ذہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے) تو خاک میں دفن کرنا بالکل عقل کے موافق ہے اور اس کے ماسوائے فطرۃ سلیمہ اور عقل کے بالکل خلاف ہے۔ باقی احراق (جلانے) کی رسم کیسے نکلی۔ سو ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں پُرانی تاریخ میں اوتار اور دیوتاؤں کی معاشرت کا ذکر ہے یہ وہ جن تھے غالباً۔ ان کے شائع اور تھے اور انسان کے اور تو ان عنصر غالب یعنی نار کا مقتضی عقلی یہ تھا کہ بعد موت ان کے ابدان کو اسی میں ملا دیا جائے چونکہ ان میں آگ غالب تھی۔ اس لئے آگ میں جلا دیے جاتے تھے۔ یہ قصے ان کی کتابوں میں مذکور ہوں گے۔ جہالت اور نادانی سے خدا پچائے یہ ایسے بزرگوں کی سنت سمجھ کر خود بھی یہی کرنے لگے۔ ع۔

لے عزت دینا نہ جلا ڈالنا۔

۴۰ چوں ندیدند حقیقت ۴

۴۱ افسانہ زدند - گویات تاریخ سے ثابت نہیں ہو سکتا ہے یہی مؤید ہیں۔

(وعظار داح الحج والنج ۱۱)

حصہ اول ختم شد

فہرست مضامین حصہ دوم

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۷۷	اہل بدعت کے شبہات کے جوابات	۶۷	روافض کے اعتراضات کے جوابات
۷۸	ایصال ثواب کیلئے تاریخ مخصوص کرنا		بوقت وصال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا
۷۹	نیت کی اصلاح		دوات مانگنا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کہنا کہ
	بدعت کی مثال		کیا ضرورت ہے۔
	حضرت گنگوہی کا واقعہ		الزامی جواب
۸۰	بدعات کی قبادت	۶۸	اس شبہ کا جواب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو
	خیر القرون کے بعد کی چیزیں		خلیفہ کیوں نہیں بنایا۔
	کتاہوں کی تصنیف اور مدارس	۶۹	ایک واقعہ
	خانقاہوں کی تعمیر		شیخین کے احسانات
۸۱	بدعات میں کیا چیز داخل ہیں	۷۰	کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ طالب دنیا تھے
۸۲	اہل حق کو وہابی کہنا محض بہتان ہے	۷۱	گمراہ فرقہ کا غلط دعویٰ
	شیخ عبدالقادر جیلانی کی گیارہویں		ازواج مطہرات بھی اہل بیت میں داخل ہیں
	منانے والوں کی غلطیاں۔	۷۲	اس شبہ کا جواب کہ بعض علوم سینہ بسینہ ہیں
۸۳	عقائد کی خرابیاں	۷۳	سینہ بسینہ علم کا موجد
	حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے متعلق	۷۴	صوفیاء پر الزام
	ایک بے بنیاد حکایت۔		ایک حکایت
۸۴	بعض لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم	۷۵	ایک مشہور قصہ
	کے خدا ہونے کی حدیثیں گھڑ لی ہیں۔		حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان
۸۵	جاہلوں کے خرافات	۷۶	امام ابو یوسفؒ کا واقعہ
۸۶	جانوروں وغیرہ کو محسوس سمجھنا سب و اہمیات ہے۔		

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۸۶	اصطلاح صوفیہ میں کافر سے مراد فانی ہے	۱۱۲	جسہ مبارک کا تذکرہ
۸۷	مزاح حدیث میں	۱۱۳	موتے مبارک سے متعلق حدیث
۸۸	ایک واقعہ	۱۱۳	لباس مبارک
۸۸	حق تعالیٰ کا مزاح	۱۱۴	تبرکات نبوی کیساتھ غلو
۸۹	خطبہ الوداع محض بدعت ہے	۱۱۴	تبرکات کام نہیں آتے
۹۰	عوام کا اہل قبور سے مدد مانگنا شرک سے خالی نہیں۔	۱۱۵	رمضان شریف کیلئے نیک کاموں کا روک رکھنا۔
۹۱	شرک کی ایک مثال	۱۱۵	نیکی میں تاخیر نہیں کرنا چاہیے
۹۱	قبروں سے مدد چاہنا	۱۱۶	عید میلاد النبی کی دلائل اربعہ سے ترویج
۹۲	ایک حکایت	۱۱۶	میلاد کی تردید قرآن میں
۹۲	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت پر جلوس نکالنا۔	۱۱۷	میلاد کی تردید حدیث میں
۹۳	ایک بزرگ کی حکایت	۱۱۸	فضائل یوم ولادت کی صراحت نہیں
۹۴	دنیا داروں کا سامعہ نبی کے ساتھ	۱۱۹	روضہ مبارک کی زیارت
۹۴	یوم ولادت پر خوشی منائی کوئی دلیل نہیں	۱۲۰	چوتھی حدیث سے استدلال
۹۵	عرس کے حقیقی معنی اور بزرگوں کے	۱۲۰	عدم جواز پراجماع سے ثبوت
۹۵	مرتبہ عرسوں کا خلاف شرع ہونا۔	۱۲۱	ایک شبہ کا جواب
۹۶	مرنے پر خوشی	۱۲۱	عید میلاد کا عدم جواز قیاس سے
۹۶	ابن الفارض کا واقعہ	۱۲۱	موجدین کے دلائل اور ان کا جواب
۹۷	بزرگوں کی موت یوم مسرت ہے۔	۱۲۲	پہلا استدلال اور اس کا جواب
۹۷	شادی اور غمی کی رسوم خلاف شرع اور واجب الشکر ہیں۔	۱۲۲	دوسرا استدلال اور اس کا جواب
۹۸	تکبر کی حمایت	۱۲۳	تیسرا استدلال اور اس کا جواب
۹۸	شادی میں انسان کا حال	۱۲۳	چوتھا استدلال اور اس کا جواب
		۱۲۴	پانچواں استدلال اور اس کا جواب
		۱۲۵	عقلی دلائل کا جواب

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۱۲۶	ایک قصہ	۱۲۶	جسہ مبارک کا تذکرہ
۱۲۷	پختہ قبریں بنانا خلاف شرع اور اہل اللہ کے مذاق کے خلاف ہے۔	۱۲۷	موتے مبارک سے متعلق حدیث
۱۲۸	زیارت قبور کا منشاء	۱۲۷	لباس مبارک
۱۲۹	صحابہ کا عمل	۱۲۸	تبرکات نبوی کیساتھ غلو
۱۲۹	کچی قبریں	۱۲۸	تبرکات کام نہیں آتے
۱۳۰	پختہ قبر ممنوع ہے	۱۲۹	رمضان شریف کیلئے نیک کاموں کا روک رکھنا۔
۱۳۰	قبروں سے فیض کا سوال	۱۲۹	نیکی میں تاخیر نہیں کرنا چاہیے
۱۳۱	ربیع الاول کے مخصوص ہینہ میں میلاد کی ممانعت۔	۱۳۰	عید میلاد النبی کی دلائل اربعہ سے ترویج
۱۳۱	صوفیاء اور علماء کے ذوق کافرق	۱۳۱	میلاد کی تردید قرآن میں
۱۳۱	صوفیاء اور علماء کی رائے کافرق ایک مثال سے۔	۱۳۱	میلاد کی تردید حدیث میں
۱۳۲	حب رسول کا درجہ	۱۳۱	فضائل یوم ولادت کی صراحت نہیں
۱۳۲	واقعہ خواجہ باقی باللہ	۱۳۲	روضہ مبارک کی زیارت
۱۳۳	نماز پنجگانہ یا مجرد عصر کے بعد مل کر بلند آواز سے ذکر بدعت ہے۔	۱۳۲	چوتھی حدیث سے استدلال
۱۳۳	علماء کی مثال	۱۳۲	عدم جواز پراجماع سے ثبوت
۱۳۳	مولانا اسماعیل شہید کا حال	۱۳۳	ایک شبہ کا جواب
۱۳۵	شیخ الہند کا واقعہ	۱۳۳	عید میلاد کا عدم جواز قیاس سے
۱۳۵	سجادہ نشینی محل میراث نہیں بلکہ محض رسم ہے۔	۱۳۳	موجدین کے دلائل اور ان کا جواب
۱۳۴	حکیم الامت کا ایک واقعہ	۱۳۴	پہلا استدلال اور اس کا جواب
	گدی نشینی	۱۳۴	دوسرا استدلال اور اس کا جواب
		۱۳۵	تیسرا استدلال اور اس کا جواب
		۱۳۵	چوتھا استدلال اور اس کا جواب
		۱۳۵	پانچواں استدلال اور اس کا جواب
		۱۳۵	عقلی دلائل کا جواب

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۱۳۶	حضرت تھانویؒ کا واقعہ	۱۴۱	ایک مشہور حکایت
۱۳۷	ایک حکایت	۱۴۲	عہد عمر میں تراویح و وتر
۱۳۸	عید گاہ میں بچوں کے لانے کی مانعت	۱۴۳	حضرت امام ابو حنیفہؒ درایت میں
۱۳۹	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں	۱۴۴	سب ائمہ سے بڑھے ہوئے ہیں۔
۱۴۰	ایسا مالغہ کہ جس سے دوسرے انبیاء کی توہین ہونا جائز ہے۔	۱۴۵	عامل بالحدیث کا قصہ
۱۴۱	غلط کتابیں	۱۴۶	عوام کے شبہات کا حل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے صاحبزادے ابراہیمؓ کی وفات پر رونا۔
۱۴۲	انبیاء کی شان میں گستاخی	۱۴۷	ہم عمری کا خیال
۱۴۳	حسن کی دو قسمیں ہیں	۱۴۸	عورت کا کم عمر ہونا مناسب ہے
۱۴۴	نبی کی ایسی تعریف جس سے دوسرے کی تنقیص ہو	۱۴۹	علم دین حاصل کرنے کا سہل اور آسان طریقہ۔
۱۴۵	ہر خوبی کا ظہور ہر وقت لازم نہیں	۱۵۰	قرآن شریف ایک متن ہے فقہ اور حدیث اس کی شرح ہے۔
۱۴۶	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ	۱۵۱	آج کل مستحبات کی پرواہ نہیں کی جاتی
۱۴۷	انداز بیان میں احتیاط	۱۵۲	نہ ہی ان کی تعلیم کا اہتمام ہے۔
۱۴۸	صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی جاں نثاری	۱۵۳	اللہ تعالیٰ سے صرف قانونی تعلق
۱۴۹	حضرت موسیٰ علیہ السلام	۱۵۴	تعلقات میں درجہ کمال
۱۵۰	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ کا معشوق قرار دینا سخت بے ادبی اور گستاخی ہے۔	۱۵۵	مکرم و تعلق پر افسوس نہیں
۱۵۱	مردہ کی روح دنیا میں واپس نہیں آتی	۱۵۶	ہمارا فرض کیا ہے۔
۱۵۲	غیر مقلدین کے اعتراضات کا حل اور اس کا جواب۔	۱۵۷	کسی مصلحت سے ترک مستحبات
۱۵۳	انقطاع اجتہاد پر شبہ کا جواب	۱۵۸	مستحبات بھی ضروری ہیں
۱۵۴	آج کل دین کے حفاظت کیلئے تقلید شخصی ضروری ہے۔	۱۵۹	

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۱۴۲	عوام کے لئے ترجمہ قرآن شریف دیکھنا مضرب ہے۔	۱۴۱	ایک مشہور حکایت
۱۴۳	ایک بڑے میاں کا واقعہ	۱۴۲	عہد عمر میں تراویح و وتر
۱۴۴	قبولیت دعا پر شبہ کا جواب	۱۴۳	حضرت امام ابو حنیفہؒ درایت میں
۱۴۵	دعا کی قبولیت کی شکلیں	۱۴۴	سب ائمہ سے بڑھے ہوئے ہیں۔
۱۴۶	اجابت دعا کا معنی	۱۴۵	عامل بالحدیث کا قصہ
۱۴۷	بغیر عمل کے کوئی دینی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا	۱۴۶	عوام کے شبہات کا حل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے صاحبزادے ابراہیمؓ کی وفات پر رونا۔
۱۴۸	مجاہدہ کو ضروری نہ سمجھنا غلطی ہے	۱۴۷	ہم عمری کا خیال
۱۴۹	انبیاء علیہم السلام پر ترک الیف آنیکی وجہ	۱۴۸	عورت کا کم عمر ہونا مناسب ہے
۱۵۰	فرقہ حشویہ کی تردید	۱۴۹	علم دین حاصل کرنے کا سہل اور آسان طریقہ۔
۱۵۱	جہلاری اس غلطی کا جواب کہ خیرات کی ہوئی چیز بعینہ مردہ کو پہنچتی ہے۔	۱۵۰	قرآن شریف ایک متن ہے فقہ اور حدیث اس کی شرح ہے۔
۱۵۲	خیرات ہونے والی چیزوں کا ثواب پہنچتا ہے۔	۱۵۱	آج کل مستحبات کی پرواہ نہیں کی جاتی
۱۵۳	خیرات کی جانے والی چیزیں مردہ کو نہیں پہنچتی ہیں۔	۱۵۲	نہ ہی ان کی تعلیم کا اہتمام ہے۔
۱۵۴	حوریں اور ان کے ڈوٹے	۱۵۳	اللہ تعالیٰ سے صرف قانونی تعلق
۱۵۵	حوض کوثر کا پانی	۱۵۴	تعلقات میں درجہ کمال
۱۵۶	اس کا جواب کہ مشائخ بعض مرتبہ اہل کو خلیفہ کر دیتے ہیں۔	۱۵۵	مکرم و تعلق پر افسوس نہیں
۱۵۷	اس اعتقاد کی تردید کہ نجات آخرت ہمارے اختیار سے باہر ہے۔	۱۵۶	ہمارا فرض کیا ہے۔
۱۵۸	فعل اختیاری کے دو معنی ہیں	۱۵۷	کسی مصلحت سے ترک مستحبات
۱۵۹	جنت میں جانا اختیاری ہے	۱۵۸	مستحبات بھی ضروری ہیں

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۱۸۹	تقویٰ کا بیان	۲۰۲	چھوٹے بچوں کو روزہ پر مجبور کرنا
۱۹۰	توکل اور اس کی حقیقت		درست نہیں۔
۱۹۱	آخرت کیلئے سعی کرنا	۲۰۳	فرشتہ کو پیغمبر بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا
۱۹۲	اختلاف رویت کی صورت میں روزہ		حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشریت کا اعلیٰ و ارفع نمونہ ہیں۔
۱۹۳	جس کے یہاں جو تاریخ ثابت ہو وہی برکت ہے۔	۲۰۴	احکام میں نبی کریم کے عمل کی موافقت ضروری ہے۔
۱۹۴	عورتوں کے اس عمل کی تردید کہ گھر میں بیسی کچیلی رہتی ہیں اور باہر زیب زینت کے ساتھ۔	۲۰۵	فرشتہ رسول بنا کر کیوں نہیں بھیجے گئے
۱۹۵	مردوں کی کوتاہی کہ عورتوں کے دینی امور اپنے ذمہ نہیں سمجھتے۔	۲۰۶	سید المرسلین کا انتخاب
۱۹۷	زنانہ اسکولوں کا قیام عورتوں کے لئے زہر قاتل ہے۔	۲۰۷	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بعض جدید تعلیم یافتہ کا حال ان سے
	موجودہ زمانہ میں اسکول کا حال	۲۰۸	مسلمان لڑکی کا نکاح نہیں ہو سکتا۔
۱۹۸	لڑکیوں کی تعلیم کا طریقہ خصوصی مسائل		حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا ہونے کی تمنا۔
۱۹۹	لکھنا بھی سکھایا جائے	۲۰۹	لوگوں نے غفور رحیم کے معنی غلط سمجھے
	ماں باپ کا حق پیر سے زیادہ ہے		طوطے کی مثال
	پیروں کا حال		غفور رحیم کا حاصل
	آنجنک کے پیر مریدوں کو غلام سمجھتے ہیں	۲۱۰	خدا کی مخالفت
	حضرت جبریل صوفی کا واقعہ	۲۱۱	خطا معاف کر کے مقرب بنانا
	شریعت کا حسن و جمال	۲۱۲	جاہل واعظوں کے وعظ کی خرابیاں
	عبادت کا اثر	۲۱۳	جاہل واعظ کی خرابیاں
		۲۱۴	ضعف ایمان ضعف طبیعت
			سونا چاندی خریدنے کا مسئلہ
		۲۱۵	طلاق کا مسئلہ

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۲۱۵	مطلق و مقید کا فرق	۲۲۸	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کی وجہ
۲۱۶	عوام کا ہر دینی کام میں دلیل تلاش کرنا بڑی غلطی ہے۔	۲۲۹	دنیا و آخرت میں فرق
	حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت میں جانا رحمت سے ہو گا نہ کہ عمل سے اس پر ایک شبہ کا جواب۔	۲۳۱	درود پڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی احسان غلط ہے۔
۲۱۷	حضرت ابراہیمؑ کا حضرت اسمعیلؑ سے بوقت ذبح رائے دریافت کرنے پر ایک شبہ کا جواب۔	۲۳۲	درود کا فائدہ
۲۱۹	مقتدا بنانے کیلئے عوام کا غلط معیار	۲۳۳	مساجد و مجالس کی آرائش فضول حرکت ہے
۲۲۰	بزرگی کیا ہے	۲۳۴	مجلس اسلامی کی شان
	بی بی تمیزہ کا وضو	۲۳۵	اہل حق کا کلام
۲۲۱	بزرگی کیا ختم نہیں ہوتی ہے		حضرات انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام کی حیات برزخیہ کا اثبات۔
	پیشوا بنانے کا صحیح معیار	۲۳۶	حیات برزخیہ کے مراتب
۲۲۲	بعض لوگ حج کے بعد بد عمل کیوں ہو جاتے ہیں ؟	۲۳۷	شہید کی حیات
۲۲۳	جب بری باتوں سے بچنا نماز کا خاصہ تو پھر اس کے خلاف کیوں ہوتا ہے۔	۲۳۸	انبیاء کی حیات
۲۲۴	ہماری نمازیں		نبی کریم ص کی حیات
	صورت نماز بھی فائدہ سے خالی نہیں	۲۳۹	سلطان مدینہ کا جواب
	اعتراض کا جواب		سرنگ کھودنے والے پکڑے گئے
۲۲۵	معراج میں دیدار باری تعالیٰ	۲۴۰	علم تجوید سے لاپرواہی کرنا ٹھیک نہیں
	دیدار الہی	۲۴۱	تجوید سیکھنا فرض ہے
	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدار الہی معراج میں ہوئی	۲۴۲	علماء کا باہمی اختلاف اور بہار فرض
۲۲۶	اختلاف محل شکایت نہیں	۲۴۳	ضروری سمجھنے کے بعد
		۲۴۴	علماء کی نا اتفاقی
		۲۴۵	اختلاف کی بنیادی وجہ
			فاتحہ مروجہ کا نقصان
			اختلاف محل شکایت نہیں

وافض کے اعتراضات کے جوابات

(۱) بوقت وصال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دوات مانگنا

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ کیا ضرور ہے

یہ اعتراض حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر نہیں بلکہ اس میں تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی کتمان حق کا اعتراض لازم آتا ہے۔ آپ پر تبلیغ احکام فرض تھی۔ اگر کوئی حکم واجب تھا تو آپ نے کیوں نہ ظاہر فرما دیا۔ اگر اس وقت دوات قلم نہیں لے تو دوسرے وقت منگا کر تحریر فرما دیتے۔ کیونکہ آپ کئی روز اس واقعہ کے بعد زندہ رہے ہیں۔ چنانچہ یہ واقعہ پختہ کلبہ اور وفات دو شنبہ کو ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی نیا حکم ارشاد فرمانا نہ تھا بلکہ کسی امر قدیم کی تجدید و تاکید مقصود تھی۔

(ب) چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمجھ گئے اس لئے آپ نے گوارا نہ فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تکلیف فرمائیں۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ طبیب کسی کو زبانی نسخہ بتلا دے۔ پھر براہ شفقت کہے قلم دوات لاؤ لکھ دوں اور بعض یہ دیکھ کر کہ اس وقت ان کو تکلیف ہوگی کہے کہ کیا حاجت ہے اس وقت تکلیف مت دو۔

اور جواب الزامی یہ ہے کہ قصہ حدیبیہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صلح نامہ لکھا تھا۔ ہذا اما قضی علیہ محمد رسول اللہ کفار نے مزاحمت کی کہ ابن عبد اللہ لکھو، کیونکہ اسی میں تو جھگڑا ہے اگر ہم رسالت کو تسلیم کر لیں تو نزاع ہی کس بات سے فیصلہ ہے جو اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۱۴۴	چندہ وصول کرنے کے مفاسد بیوی کے مال میں طیب نفس کی قید	۲۴۶	مولوی کی صحبت میں رہ کر دیکھو بعض لوگ کہتے ہیں کہ روزے صرف تین ہی ہونے چاہئیں اس کی تردید۔
۲۴۵	چندہ و مہرہ کے آداب	۲۴۷	اس شبہ کا جواب کہ تبلیغ عذر سے ساقط ہوتی ہے یا نہیں۔
۲۴۶	ایک انجمن کا واقعہ	۲۴۸	تبلیغ اسلام کا اسلم طریقہ صحابہ رض کی مثال
۲۴۸	حق تعالیٰ بدوں ابتلا و امتحان کے جنت کیوں عطا نہیں فرماتے۔	۲۴۹	مجتہدین کے اختلاف کا راز
۲۴۸	ابتلا و امتحان کی حکمت	۲۵۰	آمین میں اختلاف
۲۴۹	عبارت میں لذت کے باوجود ثواب	۲۵۱	درود ابراہیمی علیہ السلام کے افضل ہونیکا شبہ اور اس کا جواب
۲۴۹	اختلاف رویت قمر کی صورت میں لیلۃ القدر کے متعدد ہونیکا شبہ اور اس کا جواب۔	۲۵۲	ایک اشکال اور اس کا جواب
۲۵۰	محض کتابیں دیکھ کر ہی اپنی اصلاح نہیں ہو سکتی	۲۵۳	اصل بحث ہونے پر شبہ
۲۵۰	حضرت کا اپنا واقعہ	۲۵۴	بعض لوگوں کا بغیر عمل کامل ہو جانے کی تمنا کرنا غلط ہے
۲۵۱	نفع متعدی کا علی الاطلاق نفع لازمی سے افضل ہونا درست نہیں۔	۲۵۵	بزرگوں کے طریقہ اصلاح پر شبہ کا جواب
۲۵۲	اپنی اصلاح مقدم ہے۔	۲۵۶	طاعون سے بھاگنا تدبیر کے خلاف ہے
۲۵۳	اجازت کی قید کی وجہ	۲۵۷	منافقین کے نماز جنازہ میں حضرت عمر رض کی رائے کے افضل ہونے کا شبہ اور اس کا جواب۔
۲۵۴	جسٹیل کا فرعون کے ڈوبنے کے وقت اس کے منہ میں مٹی ٹھونسنا۔	۲۵۸	حضور کی شان تکمیل نماز کا طریقہ
۲۵۵	فرعون کا ایمان لانا	۲۵۹	سجدہ و رکوع میں سوچے جلسہ شہد میں سوچے
۲۵۶	فرعون کی نقش کا محفوظ رہنا	۲۶۰	اخیر نماز میں تصور
۲۵۷	خدا تعالیٰ کی پیشین گوئی کسی امر کے متعلق اس کو لازم نہیں کہ وہ غیر اختیار ہو جائے۔		
۲۵۸	خلافت فاروقیہ کو خلافت صدیقیہ سے کثرت فتوحات کی وجہ سے افضل سمجھنا غلط ہے۔		
۲۵۹	ایک غلط فہمی کا ازالہ		
۲۶۰	کیا چار سو برس کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا		
۲۶۱	نئے مسائل کے جوابات		
۲۶۲	اجتہاد فی الاصول کی بندش		
۲۶۳	اجتہاد فی الفروع باقی ہے		
۲۶۴	علم اعتبار نکات و لطائف کے درجہ میں ہے		

کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا کہ اس کو مٹا دو۔ انھوں نے انکار فرمایا۔ پس ایسی مخالفت تو اس میں بھی ہوئی۔ جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مخالفت کی کبھی پھر فرمایا کہ جواب الزامی مجھے پسند نہیں ہے مگر بطور لطیفہ کے اس وقت بیان کر دیا (مجادلات محدث حصہ اول دعوات عبدیت ص ۲۲)

(۲) اس شبہ جواب کہ حضرت علیؑ کو خلیفہ اول کیوں نہیں بنایا

جواب (۱) ہمارے بعض بھولے بھالے بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے لڑتے ہیں کہ شیخین نے خلافت لے لی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہ دی۔ میں کہتا ہوں کہ شیخین کے لئے دعا کیجئے اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اول ہی سے خلافت دیدی جاتی اور اتنی مدت تک یہ خلیفہ رہتے اور ان حضرات کی مشقت و تعب دین کے لئے اور قلت دنیا کے لئے معلوم ہو چکی۔ تو ان کو کس قدر مرزیتہ کلیف ہوتی جو اٹھائے نہ اٹھتی۔ ان حضرات نے یہ بڑا سلوک کیا کہ اس مصیبت کو خود بانٹ لیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کلیف نہ پہنچنے دی اور جو کچھ ان حضرات میں شکر رکھی ہوئی۔ اول تو بہت واقع غلط مشہور ہیں۔ دوسرے جب اتحاد اور دوستی ہوتی ہے تو شکر رکھی بھی ہو ہی جاتی ہے مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دو خادموں سے جو کہ آپس میں نہایت درجہ اتحاد رکھتے تھے پوچھا تم دونوں میں کبھی لڑائی بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ انھوں نے عرض کیا حضور کبھی بھی ہو جاتی ہے۔ مگر پھر اتحاد ہو جاتا ہے۔ فرمایا کہ تمہارا اتحاد پائیدار ہے۔ ذوق کہتا ہے کہ

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے

ایک عربی حکیم لکھتا ہے "وَيَبْقَى الْوُدُّ مَا بَقِيَ الْعِتَابُ"، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ دوستی جب باقی رہتی ہے کہ دل میں غبار باقی نہ رہے۔ اور اگر عتاب نہ کیا جائے۔ اور بات کو دل میں رکھا جائے تو عمر بھر بھی دل سے کدورت نہ نکلے گی اور اگر دل کی بھر اس نکال لی جائے تو پھر دل صاف ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو کہ سب سے زیادہ محب اور محبوب تھیں، وہ بھی کبھی کبھی ناز کے طور پر روٹھ جاتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں تمہاری خوشی و ناراضی کے وقت کو پہچانتا ہوں جب تم ناراض ہوتی تو قسم میں لاؤ رَبِّ ابْنِ آهِيْمُ کہتی ہے جب تک عتاب رہتا ہے محبت باقی رہتی ہے نہ ہی ابراہیم کے رب کی قسم۔

ہو۔ اور جب خوش ہوتی ہو تو لاؤ رَبِّ مُحَمَّدٍ کہتی ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عرض کرتی تھیں وَهَلْ أَهْجُرُ إِلَّا سَمَكًا کہ حضور اس وقت صرف آپ کا نام نہیں لیتی ورنہ دل میں تو آپ ہی بسے ہوتے ہیں۔ تو اگر آپس میں ان حضرات میں کوئی بات ہوئی ہو تو باہم ایک دوسرے پر ناز ہے۔ ہمارا منہ نہیں کہ ہم اعتراض کریں۔

ایک واقعہ

کانپور میں ایک صاحب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہتے تھے۔ ایک مرتبہ اتفاق سے میں ان سے ملا انھوں نے وہی تذکرہ چھیڑا۔ اور یہ حدیث پڑھی۔ مَنْ سَبَّ أَحَبَّائِي فَقَدْ سَبَّنِي وَمَنْ سَبَّنِي فَقَدْ سَبَّ اللَّهَ۔ اور کہا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں نامناسب الفاظ کہہ دیتے تھے تو وہ اس حدیث کے مصداق ہو گئے۔ میں نے کہا کہ صاحب آپ نے غور نہیں کیا۔ اس حدیث کے معنی نہیں آپ نے سمجھے۔ بلکہ اس کے معنی دوسرے ہیں ان کے سمجھنے کے لئے اول آپ ایک محاورہ سمجھئے کہ اگر کوئی شخص یوں کہے کہ جو شخص میرے بیٹے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے گا میں اس کی آنکھیں نکال دوں گا تو اب بتلایئے کہ یہ وعید کس شخص کے لئے ہے آیا اپنی دوسری اولاد کے لئے بھی کہ اگر وہ آپس میں لڑیں جھگڑیں تو ان کے ساتھ بھی وہی کیا جاوے گا۔ یا غیروں اور اجانب کے لئے ہے۔

ظاہر ہے کہ اجانب کے لئے یہ وعید ہے بس حدیث کا مطلب بھی یہی ہے کہ غیر اصحاب میں سے جو شخص میرے اصحاب کو برا کہے اس کے لئے یہ حکم ہے (فضائل اخصیۃ ص ۳) (ب) میں بقسم کہتا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دل سے پوچھا جائے وہ تو حضرات شیخین کے احسان مند ہوں گے کہ انہوں نے ان کو مصیبت سے بچا لیا کیونکہ حضرات صحابہ کی خلافت شاہان اور دھکی سی بادشاہت نہ تھی کہ رات دن عیش و مستیاں کرتے ہوں وہاں تو ایسی بادشاہت تھی کہ ایک دن گرمی کے سخت دوپہر میں جب کہ لو چل رہی تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ تنہا جنگل کی طرف جا رہے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ امیر المؤمنین ہیں جب ان کے گھر سے قریب ہوئے تو آواز دی کہ امیر المؤمنین اس وقت سخت گرمی۔۔۔ اور لو میں کہاں جا رہے ہیں۔ فرمایا بیت المال کا ایک اونٹ ضائع ہو گیا ہے اس کی تلاش میں جا رہا ہوں

لہ میں صرف آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں

انہوں نے عرض کیا کسی خادم کو نہ بھیج دیا۔ فرمایا کہ قیامت میں تو سوال مجھ سے ہوتا۔ خادم سے سوال نہ ہوتا۔ عرض کیا پھر تھوڑی دیر توقف کر کے تشریف لے جائیے ذرا گرمی کم ہو جائے۔ فرمایا ناچار جہنم آشد حلال جہنم کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے یہ کہہ کر اسی دھوپ اور لوہیں جنگل تشریف لے گئے یہ سلطنت تھی۔ ایک بار آپ منبر پر کھڑے ہوئے خطبہ پڑھ رہے تھے۔ خطبہ میں فرمایا۔ اَللّٰهُمَّ حَوِّاْ وَاَطِيعُواْ ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا۔ لَا تَسْمَعْ وَلَا تَطِيعُ۔ آپ نے پوچھا کیوں۔ اس نے جواب میں کہا کہ آپ نے دو کپڑے پہن کر رکھے ہیں جو مال غنیمت سے تقسیم ہوئے ہیں مگر سب کے حصہ میں تو ایک کپڑا آیا تھا۔ آپ نے دو کپڑے کیسے لئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ بے شک تم سچ کہتے ہو۔ اے عبد اللہ! تم اس کا جواب دو۔ اسی پر حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کھڑے ہوئے اور کہا۔ امیر المؤمنین کے پاس آج کوئی کپڑا نہ تھا۔ جس کو پہن کر بنا زپڑھاتے تو میں نے اپنے حصہ کا کپڑا ان کو عاریتہ دیدیا ہے اس طرح ان کے پاس دو کپڑے ہو گئے۔ جن میں سے ایک کی لنگی بنائی اور ایک کی چادر۔ یہ جواب سن کر سائل رونے لگا۔ اور کہا جبراک اللہ۔ اب آپ خطبہ پڑھیں ہم نہیں گے اور اطاعت کریں گے۔ یہ ان حضرات کی حکومت تھی کہ رعایا کا ہر شخص ان پر روک ٹوک کرنے کو موجود تھا۔ تو ایسی صورت میں خلافت کوئی راحت کی چیز نہ تھی۔

کیا حضرت علیؓ طالب دنیا کے تھے تو کیا حضرت علیؓ اس کے نہ ملنے سے رنجیدہ ہو سکتے تھے کبھی نہیں۔ دوسرے اگر مان بھی لیا جائے کہ خلافت بڑی راحت کی چیز تھی۔ تو اس کی وہ تناکرے جس کے دل میں دنیا کی ہوس اور وقعت ہو تو کیا لغو ذبا اللہ ان لوگوں نے حضرت علیؓ کو دنیا دار اور طالب دنیا سمجھ رکھا ہے جو وہ اس کے نہ ملنے سے رنجیدہ ہوئے ہوں گے، اگر وہ ایسا سمجھیں تو ان کو یہ خیال مبارک ہو۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی نظر میں دنیا کی کچھ بھی وقعت یا ہوس نہ تھی۔ کیونکہ ان کو تعلق مع اللہ کی سلطنت حاصل تھی جس کی خاصیت یہ ہے کہ

سے آں کس ترا شناخت جاں را چہ کند
فرزند و عیال و خانہاں را چہ کند

پھر ان کو خلافت دیر میں ملی تو کیا اور نہ ملتی تو کیا ان کو کبھی بھی اس کا رنج نہ ہو سکتا تھا۔ بلکہ وہ تو اس سے خوش ہوتے پھر جس بات سے ان کو خوشی ہو آپ اس میں رنج کرنے والے کون لے سنا اور مانا۔ نہ نہ سنوں گا اور نہ مانوں گا۔

ہیں یہ وہی مثل ہوتی مدعی سست گواہ چست، اسی دنیا کی بے وقعتی کو حق تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ مال و بنون زینت حیوۃ دنیا ہیں۔ (منظاہر الآمال ص ۱۹)

گمراہ فرقہ کا غلط دعویٰ (ج ۱) ایک فرقہ ضالہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت بلا فصل ایک حدیث سے ثابت کی ہے جس میں حضرت کی نسبت

لَحْمًا لَّحْمِيًّا دَمًا مَلَكًا دَحِيًّا آیا ہے۔ اور استدلال اس طرح کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول ہیں۔ اس لئے ان کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو خلافت کا استحقاق نہیں تھا۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ حدیث ثابت نہیں دوسرے میں کہتا ہوں کہ اگر اس سے عینیت حقیقت مراد ہے تو اس سے حضرت علیؓ کی خلافت ہی کی نفی ہوتی ہے کیونکہ خلیفہ تو غیر ہی ہونا چاہیے کوئی شخص خود اپنا خلیفہ نہیں ہوا کرتا۔ بس بہت سے بہت تم یہ کہہ سکتے ہو کہ حضرت ابو بکرؓ جیسے حضورؐ کے خلیفہ تھے حضرت علیؓ کے بھی خلیفہ تھے تو اس میں ہم تم سے نزاع نہ کریں گے۔

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی گوشت خاک ماہم بر باد رفت۔ باشی
مگر ان کا مدعا تو باطل ہو گیا۔ اور ایک جواب دوسرے علماء نے دیا ہے کہ حضرت علیؓ عین رسولؐ ہیں تو حضرت فاطمہؓ کے ساتھ ان کا نکاح کیسے ہوا۔ یہ تو حضرات حسنینؓ کے حق میں معاذ اللہ سخت گالی ہو گئی۔ اور اگر عینیت حقیقہ مراد نہیں اور یقیناً مراد نہیں بلکہ صرف عینیت عرفیہ مراد ہے۔ جیسا کہ صوفیہ حضورؐ کو اسی معنی کر عین حق کہتے ہیں تو پھر یہ حضرت علیؓ کے ساتھ خاص نہیں۔ اس معنی کو تو ہر صحابی عین رسولؐ تھا۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سبھی کو تعلق تھا کسی کو بھی اجنبیت نہ تھی۔ (ارصاد الحق حصہ دوم ص ۱۲)

(۳) ازواج مطہرات بھی اہل بیت میں داخل ہیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے۔ اللہم اجعل رزق آل محمد رزقاً قویاً۔ کہ آل محمد کا رزق بقدر قوت کیا جائے اور قدر قوت وہ ہے جس میں بقدر کفایت گذر ہو جائے۔ کچھ فاضل ہو۔ اور اس میں شک نہیں کہ ازواج مطہرات بھی آل محمد میں داخل ہیں اس لئے کہ دعا رانکو بھی شامل تھی۔ اور اسی طرح ذریت بھی داخل ہے بلکہ اصل مقتضائے لغت یہ ہے کہ ازواج تو آل محمد میں صالحہ داخل ہوں اور ذریت تبعاً داخل ہوں۔ کیونکہ آل کہتے ہیں اہل بیت کو یعنی

گھر والوں کو اور گھر والوں کے مفہوم میں بیوی سب سے پہلے داخل ہے پس یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ ذریت تو آل میں داخل ہو اور ازواج داخل نہ ہوں۔ بعض لوگوں کو ایک حدیث سے شبہ ہو گیا ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت علیؓ اور فاطمہؓ و حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کو اپنی عبا میں داخل فرما کر فرمایا اللہم ھولاء اھل بیتی کہ اے اللہ میرے اہل بیت ہیں اس سے بعض عقلمندوں نے یہ سمجھا ہے کہ ازواج مطہرات اہل بیت میں داخل نہیں۔ حالانکہ حدیث کا مطلب ہے کہ اے اللہ یہ بھی میرے اہل بیت میں سے ہیں ان کو بھی اِنْتَا بِرُؤْدِ اللہ لَکِنْ تُھَبِّ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اھل البیت و یطہرکم تطہیراً۔ کی فضیلت میں داخل کر لیا جائے یہاں حصر مقصود نہیں کہ بس یہی اہل بیت ہیں اور ازواج مطہرات اہل بیت نہیں ہیں۔ اور یہ جو اس حدیث کے بعض طرق میں ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کو عبا میں داخل فرما کر دعا کی تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے بھی ان کے ساتھ شامل فرما لیجئے تو آپ نے فرمایا کہ تم اپنی جگہ ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کو عبا میں داخل کر نیکی ضرورت نہیں تم تو پہلے ہی سے اہل بیت میں داخل ہو۔ دوسرے حضرت علیؓ حضرت ام سلمہؓ سے اجنبی تھے ان کے ساتھ حضرت ام سلمہؓ کو عبا میں کیونکر داخل کیا جاسکتا تھا یہ تو اشکالات کا جواب تھا۔ اور اصل مدعا کے لئے دلیل اول تولدت ہے کہ آل محمد میں ازواج اولاد داخل ہیں دوسرے قرآن کا محاورہ یہی ہے حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں جبکہ ملائکہ نے ان کو ولد کی بشارت دی اور حضرت سارہؓ کو اس بشارت پر تعجب ہوا۔ ملائکہ کی طرف سے یہ قول نقل فرمایا ہے قَالُوا اَتَعْجِبِينَ مِنْ اَمْرٍ اَللّٰہُ رَحْمَتُہٗ الْوَّاسِعُ وَ یُؤْتِیْ کَا تَدَّ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ اِنَّا حَمِیْدٌ مُّجِیْدٌ۔ ظاہر ہے کہ یہاں اہل بیت میں حضرت سارہؓ علیہا السلام یقیناً داخل ہیں کیونکہ خطاب انھیں سے ہے۔ معلوم ہوا کہ اہل بیت میں ازواج بھی داخل ہیں۔ (النسوان فی رمضان ص ۷)

(۴) اس شبہ کا جواب کہ بعض علوم بسینہ ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ سئل هل خصکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشئ دون الناس قال لا اذہمنا اوتیہ الرجل فی القرآن او ما فی ہذہ الصحیفۃ لہ اہل بیت اللہ تم سے چاہتا ہے کہ گندگی دور فرما دے اور تم خوب اچھی طرح پاک و صاف کر دے۔

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ حضرات اہل بیت (کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ خاص باتیں دوسروں سے الگ بتائی ہیں۔ فرمایا نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو قرآن کا فہم (خاص درجہ میں) عطا فرماویں (تو وہ دوسروں سے زیادہ صاحب علوم ہو جائے گا) یا وہ چند باتیں جو اس صحیفہ میں ہیں۔ اس کو دیکھا گیا تو اس میں دیت و غیرہ کے کچھ احکام تھے جو حضرت علیؓ کے ساتھ مخصوص نہ تھے بلکہ دوسرے صحابہؓ کو بھی اس کا علم تھا مقصود اس سے نفی کرنا تھا تخصیص کی اس سے معلوم ہوا کہ فہم میں تفاوت ہو سکتا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک شخص کو قرآن سے وہ علوم حاصل ہوں گے جو دوسروں کو حاصل نہیں حضرت علیؓ کو چونکہ قرآن سے خاص مناسبت تھی اس لئے ان کو بعض دوسروں سے زیادہ قرآن کے علوم حاصل تھے۔ شاید اس سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کچھ باتیں دوسروں سے الگ بتلائی ہیں یا کسی اڑائی ہو یہ خیال اسی وقت سے لوگوں میں پیدا ہو گیا کہ بعض علوم بسینہ بسینہ ہیں۔ یہ خیال کتاب اور حدیث میں نہیں۔

یہ خیال عبداللہ بن سبا بانی فرقہ سبائیہ نے ایجاد کیا ہے جس سے **سینہ بسینہ علم کا موجد** مقصود اس کا اسلام کا استیصال تھا کیونکہ عبداللہ بن سبا اول یہودی تھا پھر بطور رفاق کے مسلمان ہوا اور حضرت علیؓ کی محبت کا دم بھرنے لگا اور ان کے متعلق مسلمانوں میں غلط اعتقادات پھیلانے لگا کیونکہ وہ لوگ یہ سمجھ چکے تھے کہ تلوار سے اسلام کا خاتمہ نہیں ہو سکتا تو اب انھوں نے یہ تدبیر نکالی کہ احکام اسلام خلط کرنا چاہیے اور اس کا ذریعہ یہ نکالا کہ بعض علوم کو سینہ بسینہ بتلایا مگر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَآلِہٖ لِحَافِظُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے دین کی خود حفاظت۔۔۔ کی ہے کہ احکام میں خلط نہیں ہو سکتا گو فرق ضالہ اسلام میں بہت ہوتے ہیں اور اب بھی ہیں جن کے متعلق حدیث میں ہے کہ میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے اور یہ تہتر تو اصول کے اعتبار سے ہیں ورنہ ہر فرقے کے اندر بہت سے فرقے ہو گئے ہیں۔ بلکہ آج کل تو ہر شخص ایک مستقبل فرقہ ہے کیونکہ ہر شخص دین کے متعلق اپنی الگ رائے قائم کرتا ہے اور اس میں بھی حکمت ہے۔ تاکہ اس تفرق سے پریشانی نہ ہو کیوں کہ اختلاف تو ناگزیر تھا کسی قدر اختلاف تو ضرور ہوتا اس عالم میں بنائے حکمت یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی امر میں اختلاف نہ ہو اب اگر اختلاف کبھی کبھی ہوتا تو طالع حق کو تبہاً احتمال ہو سکتا تھا کہ نہ معلوم ان میں سے لے گراہ فرتے۔

کون حق پر ہے۔ اور جب روزانہ نئے نئے فرقتے نکلتے آتے ہیں تو اس کا اثر طبعاً کم ہو جائے گا اور دیکھنے گا کہ اختلاف کی تو کہیں انتہا ہی نہیں یہ تو روز کی دال روٹی ہو گئی کہاں تک ہر چیز کی تحقیق کیا کرے۔ پس وہ پرانا ہی طریقہ اسلم ہے بہر حال یہ خیال بالکل غلط ہے کہ بعض علوم بسینہ بسینہ ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض علوم فہم عالی سے سمجھ میں آتے ہیں عقل متوسط یا ادنیٰ ان کے لئے کافی نہیں۔ (الارتیاب ص ۴۷)

صوفیاء پر الزام اور بعض لوگ صوفیہ کو بھی اس مضمون کے ساتھ بدنام کرتے ہیں کہ ان کے یہاں بھی کچھ علوم بسینہ بسینہ ہیں مگر یہ بالکل غلط ہے صوفیہ کے یہاں جو چیز بسینہ بسینہ ہے وہ علوم نہیں علوم تو ان کے پاس وہی ہیں جو کتاب سنت میں مذکور ہیں ہاں ایک بات ان کے یہاں بسینہ بسینہ ہے یعنی نسبت اور طریق سے مناسبت اور یہ وہ چیز ہے جو ہر علم میں بسینہ بسینہ ہی ہے حتیٰ کہ بڑھئی اور باورچی کے پیشے میں بھی مناسبت اور مہارت جس کا نام ہے وہ بسینہ بسینہ ہی ہے یعنی یہ بات استاذ کے پاس رہنے سے حاصل ہو سکتی محض کتاب پڑھ لینے یا زبانی طریقہ سے دریافت کر لینے سے حاصل نہیں ہوتی۔ خوان نعمت ایک رسالہ چھپ گیا ہے جس میں ہر قسم کے کھانوں کی ترکیب لکھ دی ہے لیکن کیا اس کو دیکھ کر کوئی شخص باورچی بن سکتا ہے ہرگز نہیں جب تک کسی پکانے والے کو پکاتا ہوا نہ دیکھے اور ایک دو بار کا دیکھنا کافی نہیں۔ بلکہ بار بار کا مشاہدہ شرط ہے۔

ایک حکایت چنانچہ ایک عورت گلگلے پکار ہی تھی خاوند آتے اور کوئی کام بتلایا کہ تم فلاں کام کر لو۔ گلگلے میں پکالوں گا۔ بیوی نے کہا کہ تم یہ کام نہیں کر سکتے اس نے کہا واہ یہ بھی کوئی مشکل کام ہے کہ ڈالا اور نکال لیا۔ اس نے کہا بہت اچھا ابھی معلوم ہو جائیگا چنانچہ شوہر صاحب نے کھڑے کھڑے ہی اوپر سے گلگلے کو گھی میں ڈال دیا جس سے گھی کی چھنٹ گرم گرم اڑ کر ان کے بدن پر گرے اور بدن جل گیا چھالے پڑ گئے بیوی نے کہا میں نہ کہتی تھی کہ تم سے یہ کام نہ ہو گا وہ یہ سمجھے تھے کہ اس میں کیا مشکل بات ہے پس ڈالا اور نکال لیا جیسے گنگوہ کے ایک پیر جی کہا کرتے تھے کہ کھانا کیا مشکل ہے منہ میں رکھا اور نگل لیا اور چلنا کیا مشکل ہے قدم اٹھایا اور رکھ دیا وہ ظالم بہت کھانا کھا جاتا تھا اور دن میں بہت مسافت طے کر لیتا تھا۔ مگر ان دو لفظوں سے کہیں کام چلتا ہے ذرا آپ تو ایسا کر کے دیکھیں حقیقت معلوم ہو جائے گی اسی طرح بخاری کا کام ایک دو بار دیکھنے سے نہیں آ سکتا۔ بندر بھی تو بڑھئی کو دیکھ کر بڑھئی

بنا تھا مگر کیا گت بنی تھی اسی لئے کہتے ہیں ع کار بوزینہ نیست بخاری۔ غرض تصوف میں بسینہ بسینہ ایک چیز ہے یعنی نسبت اور مناسبت اور مہارت اور ایک اور چیز ہے یعنی برکت جو مشائخ سے معلوم ہو گئی بدون مشاہدہ کے اس کا علم نہیں ہو سکتا جیسے نابالغ کو لذت جماع قبل بلوغ کے معلوم نہیں ہو سکتی۔

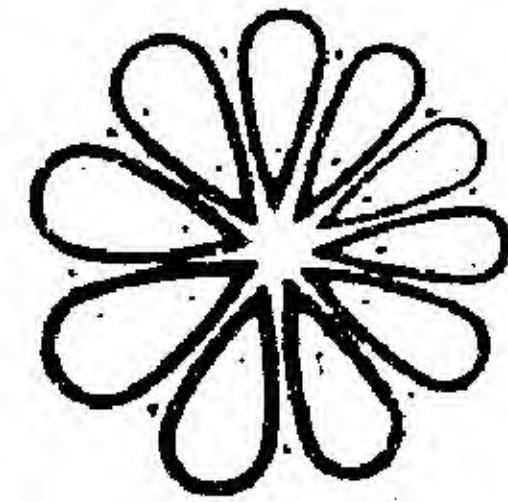
ایک مشہور قصہ ایک قصہ مشہور ہے کہ چند سہیلیوں نے مل کر آپس میں تذکرہ کیا کہ شادی کی لذت کیسی ہوتی ہے ایک لڑکی نے کہا کہ میرا نکاح ۔۔۔ ہو جائے تو میں بتلاؤں گی جب اس کا نکاح ہو گیا تو ساتھیوں نے اس سے پوچھا کہ اب بتلاؤ اس نے جواب دیا کہ سہ

بیایہ یوں ہی جب تمہارا ہو جائے گا تب مزہ معلوم سارا ہو جائے گا غرض امور ذوقیہ کو عبارت میں بیان نہیں کر سکتے وہ مشاہدہ ہی سے معلوم ہو سکتے ہیں اسی طرح برکت بھی مشاہدہ ہی سے معلوم ہوتی ہے اس کے بغیر نہیں معلوم ہو سکتی پس جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو کچھ علوم بسینہ بسینہ عطا ہوئے ہیں۔ وہ احکام میں خلط کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس خیال کی تردید خود فرمادی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے۔
الافہما اوتیہ الرجل فی القرآن کہ ہاں ایک چیز تو بسینہ بسینہ ہے کہ انسان کو قرآن کا خاص فہم عطا ہو جائے اس میں قرآن سے مراد تمام شریعت الہیہ ہے جیسا ایک حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو شخص آئے اور انہوں نے کہا اقص بیننا بکتاب اللہ کہ ہمارے درمیان کتاب اللہ سے فیصلہ کر دیجئے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے لئے رجم کا حکم دیا۔ مرد کے لئے سودرے اور جلا وطنی کا، حالانکہ رجم کا حکم قرآن میں نہیں ہے تو یہاں بھی کتاب اللہ سے مراد شریعت الہیہ ہے کیونکہ تمام احکام شریعتیہ کتاب اللہ ہی کی طرف راجع ہیں۔ کلیتاً یا جزئاً۔ چنانچہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بعض احکام حدیث کو قرآن کا بدلہ فرما کر یہ آیت پیش کی مَا تَنهَوْنَهُمْ فَاَنْتَهُوْا وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا اور یہی فہم ہے جس کا اختلاف بعض اوقات اس درجہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کو حدیث معلوم ہے مگر اس کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس حدیث سے فلاں مسئلہ مستنبط ہوتا ہے۔

امام ابو یوسف کا واقعہ چنانچہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ایک محدث کے ساتھ جو کوفہ کے بہت بڑے محدث ہیں مشہور ہے کہ محدث نے امام

ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ تمہارے استاد امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا خلاف کیوں کیا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کس مسئلہ میں۔ کہا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فتویٰ ہے کہ باندی کی بیع طلاق ہے (یعنی جو باندی کسی کے نکاح میں ہو اگر مالک اس کی بیع کسی دوسرے شخص کے ہاتھ کر دے تو بیع ہوتے ہی باندی پر طلاق ہو جائے گی) اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ باندی کی بیع طلاق نہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ تم ہی نے تو ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع جاریہ کو طلاق نہیں قرار دیا۔ محدث نے کہا کہ میں نے ایک یہ حدیث بیان کی۔ کہا تم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث ہم سے بیان کی ہے جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بریرہ کو خرید کیا اور آزاد کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ کو اختیار دیا کہ خواہ اپنا نکاح شوہر سابق سے برقرار رکھیں یا منسوخ کر دیں۔ تو اگر بیع جاریہ سے ہی طلاق واقع ہو جایا کرتی تو اختیار دینے کے کیا معنی؟ محدث سوچنے لگے اور کہا اے ابو یوسف! کیا یہ مسئلہ اس حدیث میں ہے۔ کہا ہاں۔ محدث نے کہا وَاللّٰہِ اَنْتُمْ الْاَطْبَاءُ وَنَحْنُ الصِّیَالُ بخدا تم طبیب ہو اور ہم عطار ہیں! صاحبو! فقہاء کے بیان کے بعد اب تو ہم بھی سمجھتے ہیں کہ فلاں حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا اور فلاں آیت سے وہ مسئلہ منکر ہوا۔ بیان فقہاء کے اس کا سمجھنا دشوار اور سخت دشوار ہے اسی کا نام اجتہاد ہے اور یہی وہ فہم ہے جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے۔ اَلَا فہمًا اَوْ تَیِّبَ الرَّجُلُ فِی الْقُرْآنِ (ایضاً ص ۷)



اہل بدعت کے شہساز کے جواب

۵۔ بدعت کی ایک پہچان اور اس کی صحیح حقیقت

ایک پہچان بدعت کی بتلائے دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جو بات قرآن و حدیث اور اجماع و قیاس چاروں میں سے کسی ایک سے بھی ثابت نہ ہو اور اس کو دین سمجھ کر کیا جاوے وہ بدعت ہے۔ اس کی پہچان کے بعد دیکھ لیجئے کہ ہمارے بھائیوں کے جو اعمال ہیں مثلاً غُرس کرنا، فاتحہ دلانا، تخصیص اور تعین کو ضروری سمجھ کر ایصالِ ثواب کرنا وغیرہ جتنے اعمال ہیں کسی اصل سے ثابت نہیں ہیں۔ اور ان کو دین سمجھ کر کیا جاتا ہے یا نہیں اور اگرچہ خواص کا عقیدہ ان مسائل میں خراب نہیں، لیکن یہ فقہ حنفیہ کا مسئلہ ہے کہ خواص کے حسن مستحسن امر سے جب کہ وہ مطلوب عند الشرع نہ ہو۔ عوام میں خرابی پھیلے تو خواص کو چاہئے کہ اس امر کو ترک کر دیں۔ ہاں اگر وہ امر مطلوب عند الشرع ہو۔ اور اس میں کچھ منکرات مل گئے ہوں تو منکرات کے مٹانے کی کوشش کریں گے اور اس امر کو نہ چھٹائیں گے مثلاً اگر جنازہ کے ساتھ منکرات بھی ہوں تو مشایعت جنازہ کو ترک کریں گے کیونکہ مشایعت جنازہ کی مطلوب عند الشرع ہے پس ایصالِ ثواب میں دو امر ہیں ایک تعین وقت دوسرا ایصالِ ثواب، اور ان میں تعین وقت مطلوب عند الشرع نہیں اگرچہ مباح ہے۔ اور چونکہ تعین سے عوام میں خرابی پھیلتی ہے اس لئے ہم تعین کو ترک کر دیں گے البتہ اگر ساری امت کا یہ عقیدہ ہو جائے کہ وہ تعین کو ضروری نہ سمجھے تو ہم خواص کو بلکہ سب کو تعین کی اجازت دیدیں گے لیکن حالات موجودہ میں جب کہ اکثر لوگ کا خیال ہے کہ خواص تاریخوں میں ثواب پہنچانے سے زیادہ مقبولیت ہوتی ہے اور یہ خلاف شریعت ہے۔ کیسے اجازت دیدی جائے۔

ایک شخص نے مجھ سے کہا گیارہویں، ایصالِ ثواب کے لئے تاریخ مخصوص کرنا! اسرار ہوں تاریخ تک ہو سکتی ہے پھر نہیں ہو سکتی۔ ایک وعظ میں میں نے ان رسوم کا بیان کیا۔ بعد وعظ کے ایک صاحب کہنے

لگے کہ علماء کو ایسے مضامین نہ بیان کرنے چاہئیں کہ تفریق امت ہوتی ہے میں نے کہا ہمارا بیان کرنا تو آپ کے عمل کرنے پر موقوف ہے جیسے لوگوں کے اعمال اور حالات ہوں گے ویسا ہی ہم بیان کریں گے۔ اگر لوگ ان اعمال کو چھوڑ دیں گے تو ہم بھی اس قسم کے بیان کو چھوڑ دیں گے تو تفریق کا الزام ان اعمال کے ارتکاب کرنے والوں پر ہے نہ کہ ہم پر غرض یہ امور مطلوب عند الشرائع نہیں اور ان سے خرابیاں بہت کچھ پھیل رہی ہے اس لئے ان کو ترک دینا چاہئے ایک تو تخصیص اور تعین قابل ترک ہے۔ دوسرے جو ہیئات ایصال ثواب کی اختراع کر رکھی ہے وہ قابل ترک ہے۔ مجھ سے ایک دیہاتی کہنے لگا کہ اگر ایصال ثواب کے وقت کھانے پر چند سورتیں پڑھ لی جائیں تو ہرج ہی کیا ہے میں نے جواب دیا کہ جس مصلحت سے کھانے پر سورتیں پڑھی جاتی ہیں کبھی روپیہ یا کپڑے پر کیوں نہیں پڑھی جاتی۔

نیت کی اصلاح اور ایک نیت میں اصلاح کرنی ضروری ہے کیونکہ اکثر یہ نیت ہوتی ہے ہم ان کو ثواب پہنچائیں گے تو ان سے ہمارے دنیا کے کام نکلیں گے تو صاحبو قطع نظر مفسد اعتقاد کے اس کی ایسی مثال ہے کہ آپ کسی شخص کے پاس ہدیہ مٹھائی لے جائیں اور پیش کرنے کے بعد اس شخص سے کہیں کہ آپ میرے مقدمہ میں گواہی دیدیں اندازہ کیجئے یہ شخص کس قدر کبیدہ ہوگا اور اس سے اس کو کیسی اذیت ہوگی۔ پس جب اہل دنیا کو اذیت ہوتی ہے تو اہل اللہ کو اس سے زیادہ اذیت ہوگی پھر خصوصاً وفات کے بعد لطافت زیادہ بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہ نفس عنصری لوٹ جاتا ہے۔ اور صرف روح ہی روح رہ جاتی ہے اور اس کا ادراک کامل ہو جاتا ہے پس جس وقت ان کو یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ یہ ہدیہ اس غرض سے پیش کیا گیا ہے کہ قدر ناگواری ہوتی ہوگی اس کے ماسوا کس قدر شرم کی بات ہے کہ اہل اللہ سے دنیا کے لئے تعلق اور محبت ہو۔ صاحبو! ان کے پاس دنیا کہاں ہے ان سے دنیا کی امید رکھنی ایسی بات ہے جیسے کسی سنار سے گھر یا بنانے کی امید رکھنی یا کسی حکیم سے یہ فرمائش کرنی کہ تم چل کر ہمارے گھر کی گھاس کھو دو۔ صاحبو! ہم کو حضرت عوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ سے جو محبت ہے تو اس لئے کہ انہوں نے ہم کو راہ ہدایت دکھلائی۔ اس کے مکافات میں ہم ان کو کچھ ثواب بخش دیں کہ ان کی روح خوش ہو اور اس کے خوش ہونے سے خدا تعالیٰ خوش ہوں۔ اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم لوگ ایصال ثواب سے منع نہیں کرتے بلکہ اس کی اصلاح کرتے ہیں اور جس دن اصلاح عام ہو جائے گی اس دن ہم یہ بھی نہ کہیں گے مگر جب تک اصلاح نہ ہو اس وقت تک ہم ضرور لایحوز

کہتے رہیں گے۔ رہی بدنامی سو بجز اللہ اشاعت دین میں ہم کو اس کی مطلق پرواہ نہیں ہے ہمارا وہ مذہب ہے ۔

ساقیا بر خیز و در وہ جام را
خاک بر سر کن عزم ایام را
گرچہ بدنامیت نزد عاقلان
مانی خواہم جنگ و نام را
(تقویم الزلخ ص ۲۹)

بدعت کی مثال

(ب) بدعت کے بارے میں فرمایا کہ کوئی ظہر کی چار رکعت کے بجائے پانچ رکعت پڑھ لے تو اس کی وہ چار رکعت بھی نہ ہونگی حالانکہ وہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے کوئی برا کام تو کیا ہی نہیں نماز ہی پڑھی ہے بلکہ اور اچھا ہے کہ چار رکعت کے بجائے پانچ پڑھیں پھر نماز کیوں نہ ہوئی بات یہ ہے کہ اس نے خلاف ضابطہ کام کیا۔ اس لئے چار رکعت بھی گئی گزری ہوئیں جیسے لفافہ پر کوئی بجائے ڈاک کے دو پیسہ کے ٹکٹ کے کورٹ فیس کا ٹکٹ آٹھ آنے کا لگا دے تو خط بیرنگ ہو جائے گا وہ کہہ سکتا ہے۔۔۔۔۔ کہ میں نے بجائے دو پیسے کے آٹھ آنے صرف کئے اور پھر بھی بیرنگ ہو گیا لیکن چونکہ اس نے ٹکٹ کا استعمال بے محل اور خلاف ضابطہ کیا اس لئے آٹھ آنے کا ٹکٹ ضائع ہو گیا اسی ٹکٹ کو اپنے موقع پر یعنی عدالت میں لگانا تو کام کا ہوتا اسی طرح ان پانچ رکعتوں کو سمجھ لیجئے مگر ان پانچ رکعتوں کے نہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں کرتا۔ لیکن اور بدعتوں کو ایسا نہیں سمجھتے اس میں شبہ کرتے ہیں کہ صاحب یہ تو نیک کام ہیں ان میں کیا برائی ہے۔

حضرت گنگوہی کا واقعہ ایک شخص نے نقل کیا کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تو لا الہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ کہنے سے روکتے ہیں بعد کو تحقیق ہوا کہ اذان کے آخر میں جو لا الہ الا اللہ موزن کہتا ہے اس کے جواب کے بعد اکثر اوقات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہہ لیتے ہیں حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ اذان کا جواب کلمات اذان ہی میں دینا چاہیے چنانچہ بعد کلمہ آخری لا الہ الا اللہ کے چونکہ موزن محمد رسول اللہ کہتا نہیں ہے۔ اس لئے صرف لا الہ الا اللہ کہہ کر جواب بھی ختم کر دینا چاہیے یہ مقصود تھا حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا اس کو اس صورت میں پیش کیا گیا کہ صاحب وہ تو کلمہ میں محمد رسول اللہ کہنے سے منع کرتے ہیں دعوایا اللہ اذان کا دین ہونا ظاہر ہے اس کے احکام میں ہی طرف سے زیادتی کرنا بھی بدعت ہے۔ اسی طرح ساری ممنوع بدعتیں دین کی یکساں ہیں فرق کوئی وجہ نہیں۔

(مقالات حکمت دعوات عتبد حصہ سوئم)

(ج) بدعت کے قبح کا یہی راز ہے مگر اس میں غور کیا جائے

تو پھر بدعت کے منع میں تعجب نہ ہو۔ روزہ

بدعات کی قباح

میں اس کی مثال دیکھئے اگر کوئی صاحب مطبع گوشت کے قانون کو طبع کرے اور اخیر میں ایک دفعہ کا اضافہ کر دے اور وہ ملک سلطنت کے لئے بھی بیحد مفید ہو تب بھی اس کو جرم سمجھا جائیگا اور یہ شخص مستوجب سزا ہو گا پس جب قانون دنیا میں ایک دفعہ کا اضافہ جرم ہے تو قانون شریعت میں ایک دفعہ کا اضافہ جس کو اصطلاح شریعت میں بدعت کہتے ہیں کیوں جرم نہ ہو گا تو اگر کوئی اس طرح سے گوشت وغیرہ کو ترک کرے گا تو بلاشبہ جرم ہو گا لیکن ان حضرات نے ایسا نہیں کیا بلکہ محض علاج کے طور پر ترک کیا ہے بخلاف اس وقت کے جہلدار کے کہ وہ اس کو دین اور عباد اور ذریعہ قرب سمجھ کر کرتے ہیں (احسان التدبیر ص ۱۲)

(د) پس جاننا چاہیے کہ بعد خیر القرون کے جو چیزیں یاد کی گئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ کہ ان کا سبب

خیر القرون کے بعد کی چیزیں

داعی بھی جدید ہے اور وہ موقوف علیہ کسی مامور بہ کی ہیں کہ بغیر ان کے اس مامور بہ پر عمل نہیں ہو سکتا جیسے کتب دینیہ کی تصنیف اور تدریس۔ مدرسوں اور خانقاہوں کی بنیاد کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان میں سے کوئی شئی نہ تھی اور سبب داعی ان کا جدید ہے اور نیز یہ چیزیں موقوف علیہ ایک مامور بہ کی ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ سب کو معلوم ہے کہ دین کی حفاظت سب کے ذمہ ضروری ہے اس کے بعد سمجھئے کہ زمانہ خیریت نشاۃ میں دین کی حفاظت کے لئے وسائل محدثہ میں سے کسی شئی کی ضرورت نہ تھی تعلق مع اللہ یا بلفظ آخر نسبت سلسلہ سے برکت حضرت نبوت سب مشرف تھے۔۔۔ قوت حافظہ اس قدر قوی تھی کہ جو کچھ سنتے تھے وہ سب نقش کا لچر ہو جاتا تھا انہم ایسی عالی پالی تھی کہ اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ سبق کی طرح ان کے سامنے تقریر کریں۔ ورع و تدین بھی غالب تھا۔

بعد اس زمانہ کے دوسرا زمانہ آیا غفلتیں بڑھ گئیں قوی

کتابوں کی تصنیف اور مدارس خانقاہوں کی تعمیر

مزدور ہو گئے ادھر اہل اہوا اور عقل پرستوں کا غلبہ ہوا تدریس مغلوب ہونے لگا پس علماء امت کو نہ جس کا حکم دیا گیا ہو۔ نہ پرہیزگاری۔

قوی اندیشہ دین کے ضائع ہونے کا ہوا۔ پس ضرورت اس کی واقع ہوئی کہ دین کی بحیثیت اجزاء تدریس کی جائے۔ چنانچہ کتب دینیہ حدیث۔ اصول حدیث فقہ۔ اصول فقہ عقائد میں تصنیف ہوئیں اور ان کی تدریس کے لئے مدارس تعمیر کئے گئے۔ اسی طرح نسبت سلسلہ کے اسباب تقویت و ابقاء کے لئے بوجہ عام رعیت نہ رہنے کے مشارک نے خانقاہیں بنائیں۔ اس لئے کہ بغیر ان چیزوں کے دین کی حفاظت کی کوئی صورت نہ تھی پس یہ چیزیں وہ ہوئیں کہ سبب ان کا جدید ہے کہ وہ سبب خیر القرون میں نہ تھا۔ اور موقوف علیہ حفاظت دین مامور بہ کی ہیں پس یہ اعمال گویا بدعت ہیں لیکن واقعہ میں بدعت نہیں بلکہ حسب قاعدہ مقدمہ الواجب واجب واجب ہیں۔

اور دوسری قسم وہ چیزیں ہیں جن کا سبب قدیم ہے جیسے مجالس میلاد مروجہ اور تیجہ، دسواں چہلم

بدعات میں کیا چیز داخل ہیں

وغیرہا من البدعات کہ اس کا سبب قدیم ہے مثلاً میلاد کے منعقد کرنے کا سبب فرح علی الولادة النبویہ ہے اور یہ سبب حضور کے زمانے میں موجود تھا لیکن حضور نے یا صحابہؓ نے یہ مجالس منعقد نہیں کیں۔ کیا لغو ذلالت صحابہؓ کا فہم یہاں تک نہیں پہنچا۔ اگر سبب اس کا اس وقت نہ ہوتا تو البتہ یہ کہہ سکتے تھے کہ مشارک ان کا موجود نہ تھا لیکن جبکہ باعث اور بنیاد اور مدار موجود تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مجلس میلاد منعقد کی اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پس جس شئی کو باوجود اس بنیاد و مدار کی موجودگی کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایسی شئی کا حکم یہ ہے کہ وہ بدعت صورتاً بھی اور معنی بھی اور حدیث من احدث فی امرنا هذا ما لیس منہ فہو رد (مشکوٰۃ) میں داخل ہو کر واجب الرد ہیں۔ اور پہلی قسم مامند میں داخل ہو کر مقبول ہے یہ قاعدہ کلیہ ہے بدعت اور سنت کے پہچاننے کا اس سے تمام ترجزئیات کا حکم مستنبط ہو سکتا ہے اور ان دو قسموں میں ایک اور فرق عجیب ہے کہ پہلی قسم کے تجویز کرنے والے خواص یعنی علماء ہوتے ہیں اور اس میں عوام تصرف نہیں کرتے اور دوسری قسم کے تجویز کرنے والے عوام کا لائق ہوتے ہیں۔ اور وہی اس میں ہمیشہ تصرفات کیا کرتے ہیں چنانچہ مولود شریف کی مجلس کو ایجاد ایک بادشاہ نے کی ہے کہ اس کا شمار عوام ہی میں ہے۔ اور عوام ہی اب تک اس میں شرکت بھی کرتے ہیں۔ (السرور ص ۲)

لے جس نے ہمارے دینی امور میں کوئی نئی چیز پیدا کی جن کا دین سے تعلق نہیں وہ مردود ہیں۔

(۶) اہل حق کو وہابی کہنا محض بہتان ہے

اہل بدعت کی جماعت ہے جو ہم لوگوں کو وہابی کہتی ہے لیکن ہماری سمجھ میں آج تک یہ بات نہ آئی کہ ہم کو کس مناسبت سے وہابی کہا گیا کیونکہ وہابی وہ لوگ ہیں جو ابن عبد الوہاب کی اولاد میں ہیں یا اس کے مستحق ہیں۔ ابن عبد الوہاب کے حالات مدون ہیں۔ ہر شخص ان کو دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ نہ اتباع کی رو سے ہمارے بزرگوں میں ہیں نہ نسب کی رو سے۔ البتہ آج کل جن لوگوں نے تقلید کو ترک کر دیا ہے ان کو ایک اعتبار سے وہابی کہنا درست ہو سکتا ہے کیونکہ ان کے اکثر خیاں ابن عبد الوہاب سے ملتے جلتے ہیں۔ البتہ ہم لوگوں کو خفی کہنا چاہئے کیونکہ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اصول چار ہیں۔ کتاب اللہ، حدیث رسول، اجماع امت، قیاس مجتہد، سوا ان چار کے اور کوئی اصل نہیں۔ اور مجتہد اگرچہ متعدد ہیں لیکن اجماع امت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ائمہ اربعہ (یعنی امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام مالک بن انس) کے مذہب کے باہر ہونا جائز نہیں۔ نیز یہ بھی ثابت ہے کہ ان چاروں میں جس کا مذہب رائج ہو، اس کا اتباع کرنا چاہئے تو چونکہ ہندوستان میں امام ابو حنیفہ کا مذہب رائج ہے اس لئے ہم اہل حق کا اتباع کرتے ہیں ہم لوگ وہابی کے لقب سے برا نہیں مانتے۔ لیکن اتنا ضرور کہہ دیتے ہیں کہ قیامت میں اس بہتان کی باز پرس ضرور ہوگی۔ (تقویم الزیلع ص ۲۹)

(۷) شیخ عبد القادر جیلانی کی گیارہویں منانے والوں کی غلطیاں

اس روز لوگ حضرت عوث الاعظم سیدنا عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی گیارہویں مناتے ہیں اول تو لاکھ تختہ خند و اقترابی عید اسے اس کا بھی رد ہو گیا کیونکہ مثل یوم المیلاد وغیرہ کے یہ دن بھی متبدل ہو گیا جب غیر متبدل یعنی قبر نبوی کا عید بنانا حرام ہے تو متبدل یعنی بڑے لے میری قبر کو میلہ نہ بنانا

پر صاحب کی گیارہویں کا عید بنانا کیسے جائز ہوگا۔ دوسرے یہ تاریخ حضرت کے وفات کی کسی مورخ نے نہیں لکھی، نہ معلوم عوام نے گیارہویں تاریخ کیسے کشف والہام سے معلوم کر لی۔ بعض لوگ ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عوث الاعظم خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہویں کیا کرتے تھے تو اول تو یہ روایت ثابت نہیں اس کا ثبوت دینا چاہئے دوسرے اگر ہو بھی تو کیا حضرت عوث الاعظم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کرتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہویں چھوڑ کر بڑے پر صاحب کی گیارہویں کرتے ہو یہ تو ان کے خلاف ہے کیونکہ اگر بالفرض وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہویں کیا کرتے تھے تو وہ اس کو وہ ہرگز گوارا نہ کر سکتے تھے کہ میرے بعد بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہویں کی جائے۔ تیسرے اس میں عقیدہ بھی ناسد ہے کہ توگ حضرت عوث الاعظم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر سمجھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا میلاد کرتے ہیں تو بڑے پر کی گیارہویں بلکہ بعض جگہ حضرت عوث الاعظم کا میلاد بھی ہونے لگا گویا بالکل ہی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مساوی ہو گئے۔

اور غضب یہ ہے کہ کرنے والوں کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر گیارہویں عقاید کی خرابیاں نہ کریں گے تو بلا نازل ہوگی بڑے پر صاحب ناخوش ہو جائیں گے اور پھر نہ معلوم کیا سے کیا کر دیں گے۔ گویا نوزدیا اللہ وہ مخلوق کو تکلیف دیتے پھرتے ہیں نیز گیارہویں کرنے کو مال و اولاد کی ترقی کا باعث سمجھتے ہیں۔ اس میں حضرت عوث الاعظم کے ساتھ دنیا کے لئے تعلق رکھنا ہوا، یہ کیسی بے حیائی ہے کہ جس مردار کو وہ چھوڑ کر الگ ہوئے تھے۔ اسی کے لئے ان سے تعلق کیا جائے غرض گیارہویں کے اندر بھی عملی اور اعتقادی بہت سی خرابیاں ہیں اس کو چھوڑنا چاہئے اگر کسی کو حضرت عوث الاعظم کے ساتھ محبت کا دعویٰ ہو تو کچھ قرآن پڑھ کر ان کی روح کو ثواب بخش دیا جائے۔ یا بلا تعین تاریخ غربا کو کھانا کھلا دے۔ (الحجور ص ۳۲)

(۸) حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے متعلق ایک بے بنیاد حکایت

ایک حکایت مشہور کی جاتی ہے کہ آپ کے پاس ایک بڑھیا آئی جس کا لڑکا مر گیا تھا۔

کہ حضرت اس کو زندہ کر دو، آپ نے فرمایا کہ اس کی عمر تو ختم ہو چکی اب زندہ نہیں ہو سکتا۔ وہ رونے اور اصرار کرنے لگی تو آپ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور عرض کیا کہ اس لڑکے کو زندہ کر دیا جائے وہاں سے خطاب ہوا کہ اس کی تقدیر میں اور حیات نہیں، اس لئے اب زندہ نہیں ہو سکتا، تو حضرت غوث اعظم حق تعالیٰ سے کہتے ہیں ذرا ملاحظہ کیجئے۔ یہ حق تعالیٰ سے باتیں ہو رہی ہیں کہ حضرت آپ سے کہنے کی تو اس لئے ضرورت ہوتی کہ اس کی تقدیر میں اور حیات نہیں اور اس کی تقدیر میں کچھ اور زندگی ہوتی تو آپ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی، پھر تو آپ محبوب ہو کر خود ہی زندہ کرتے (نوذ با اللہ منہ) وہاں سے حکم ہوا کہ پھر تقدیر کے خلاف تو نہیں ہو سکتا اس پر غوث اعظم کو جلال آیا، اور آپ نے قوت کشفیہ سے ملک الموت کو ٹھولا کہ وہ کہاں ہیں آخر نظر آئے تو دیکھا کہ ایک بھیلے میں اس دن کے مردوں کی روہیں بھر کر لے جا رہے ہیں ابھی تک ہیڈ کو اڑ رہے ہیں پچھتے تھے کہ غوث اعظم نے ان کو ٹوکا اور کہا کہ بڑھیا کے لڑکے کی روح واپس کر دو۔ تم اس کو نہیں لیجا سکتے، وہ انکار کرنے لگے۔ آپ نے وہ بھیلہ ان کے ہاتھ سے چھین کر کھول دیا جس میں روہیں سب بکھر پھڑکٹیں اور اس دن جتنے مردے مرے تھے سب زندہ ہو گئے، تو غوث اعظم نے حق تعالیٰ سے کہا کہ کیوں اب راضی ہو گئے ایک مردے کے زندہ کرنے پر راضی نہ ہوئے اب بہت جی خوش ہوا ہوگا۔ جب ہم نے سارے مردوں کو زندہ کر دیا تو بہ تو بہ۔ استغفر اللہ۔ کیا خدا تعالیٰ کے ساتھ اس طرح گفتگو کرنے کی کسی کو مجال ہے۔ مگر یہ سب حکایتیں جاہلوں نے گھڑی ہیں اور ان کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نفوذ با اللہ غوث اعظم وہ کام کر سکتے ہیں جو خدا بھی نہیں کر سکتا۔ بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس کفر کا جب جاہلوں نے غوث اعظم کو اس مرتبہ پہنچا دیا۔ تو اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت آثار طبعیہ اور لوازم بشریہ کو ذکر نہ کیا جاتا۔ تو نہ معلوم یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کہاں پہنچاتے۔

(فناء النفوس فی رضا القدوس ص ۵)

(۹) بعض لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا ہونے کی

حدیثیں گھڑی ہیں

بعض لوگوں نے اس مضمون کی احادیث بھی گھڑی ہیں جن سے معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کا خدا ہونا ثابت کیا ہے چنانچہ ایک حدیث یہ گھڑی ہے انا عرب بلا عین اس کے الفاظ ہی بتلا رہے ہیں کہ کسی جاہل نے فرصت میں بیٹھ کر گھڑی ہے۔ بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس چستان کی کیا ضرورت تھی، آپ نے صاف ہی کیوں نہ فرما دیا۔ انا رب ہر پھر کے ساتھ انا عرب بلا عین کہنے کی کیا ضرورت تھی، پھر اس سے مدعا کیونکر حاصل ہوا۔ کیونکہ عرب میں بامشدد نہیں ہے مخفف ہے تو عین نکال کر رب بلا تشدید باقی رہا اور یہ کوئی لغت نہیں ہے۔ رب بال تشدید ثابت نہ ہوا دوسرے آپ عرب کہاں تھے آپ تو عربی تھے پھر انا عرب میں حمل کیونکر صحیح ہوگا۔ حدیث یہ گھڑی تو ایسی جس کے سر نہ پاؤں۔ جس میں ایک ادنیٰ طالب علم بھی غلطیاں نکال سکتا ہے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے فصیح و بلیغ تھے کہ آپ کے کلام میں کسی کی مجال نہیں کہ انگلی بھی دھر سکے اسی لئے محدثین نے فرمایا ہے کہ رکاکت الفاظ بھی حدیث کے موضوع ہونیکی علامت ہے اور یہاں تو رکاکت الفاظ کے ساتھ مضمون بھی یکک ہے کیونکہ اس سے رب ہونا نہیں نکلتا۔ بلکہ رب نکلتا ہے۔ اور رب بلا تشدید ایک مہمل لفظ ہے، ایک حدیث یہ گھڑی ہے۔ انا احمد بلا میم یہ حدیث نہیں ہے بلکہ احمد جام رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے جو ان سے حالت سُکر میں صادر ہوا اور قابل تاویل ہے اور اگر تاویل نہ کی جائے تو قابل رد ہے کیونکہ غلبہ حال کے اقوال افعال قابل اعتبار نہیں ہوتے ایک حدیث یہ گھڑی ہے۔ رَأَيْتُ رَبِّي يَطُوفُ فِي سِكَكِ الْمَلَكِ یہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے کہ انھوں نے آپ کو مدینہ کی گلیوں میں دیکھا تو فرمایا رایت ربی یطوف فی سکت المملکت کہ میں نے خدا کو مدینہ کی گلیوں میں گھومتے ہوئے دیکھا۔ بس پھر تو ہر صوفی خدا ہو گیا۔ جیسے ایک جاہل صوفی کہتا ہے نفوذ با اللہ۔

ع اللہ جسے کہتے ہیں واللہ میں ہی ہوں۔

ان بیوقوفوں نے نقصوت کو ان خرافات سے بدنام کر دیا۔ فحالیض جاہلوں کے خرافات

بھی ان باتوں پر ہستے ہیں۔ ایک نگریز ایک مسلمان سے کہتا تھا کہ ہم پر خدا کے تین کہنے پر اعتراض کرتا ہے تمہارا ٹوپی (صوفی) تو ہر چیز کو خدا کہتا ہے۔ یہ مسئلہ وحدۃ الوجود کا ناس مارا ہے ان جاہلوں نے اس کی حقیقت تو سمجھی نہیں۔ بس یہ سمجھے کہ ہر چیز کو خدا کہنے لگے ان ہی لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بشریت سے نکالنے کی کوشش کی تھی حالانکہ واقعات اس پر یقینی شاہد ہیں کہ آپ بشر تھے چنانچہ اکل و شرب بول و براز سے آپ

مستی دے ہوشی تھے میں نے اپنے رب کو مدینہ کی گلیوں میں پھرتے ہوئے دیکھا

منزہ نہ تھے۔ جنگ اُحد میں کفار کے ہاتھ سے آپ زخمی ہوئے، یہود نے آپ پر سحر کیا۔ اور اس کا اثر ہو گیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام سے آپ نے درخواست کی کہ مجھے اپنی اصلی صورت میں دکھاؤ جب وہ اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوئے۔ تو آپ بے ہوش ہو گئے۔ (دعوتِ تحفیل المرام ص ۱۱)

(۱۰) جانوروں وغیرہ کو منحوس سمجھنا سببِ اہتیا ہے

ایک بار عرض کیا گیا کہ لوگ جو بعض گھوڑوں وغیرہ کو منحوس سمجھتے ہیں۔ اس کی بھی کوئی اصل ہے۔ فرمایا کہ جی نہیں۔ سب و اہتیا ہے اس پر تو میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ کسی حبشی کو راہ میں ایک آئینہ پڑا ہوا ملا اٹھا کر دیکھا تو اپنی ہی صورت نظر پڑی اور اس آئینہ کا تصور سمجھا۔ اسی طرح ہم لوگوں کو اپنے عیوب و دوسری غلطیاں نظر آتے ہیں صیبت تو آتی ہے اپنے معاصی کی نحوست سے اور اسکو منسوب کر دیتے ہیں بے گناہ جانور و ذی حیات کہ فلاں گھوڑا ایسا منحوس آیا۔ یا فلاں جانور فلاں وقت بول دیا اس لئے کام نہ ہوا اس پر عرض کیا گیا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب کوئی شگون بد دل میں کھٹکے تو فلاں دعا پڑھے، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ جب اس میں کچھ ٹر ہو۔ اور اس کے ازالہ کے لئے یہ دعا بتلائی گئی ہو فرمایا کہ یہ محض رفع تردد اور حصول اطمینان کے لئے ہے، اور اس سے کسی اثر کا اثبات لازم نہیں آتا۔ فال نیک لینے کی وجہ اجازت ہے اس کی بابت استفسار کیا گیا۔ فرمایا کہ وہ بھی موثر نہیں بلکہ فال نیک کا حاصل صرف یہ ہے کہ کوئی اچھی چیز پیش آئی اس کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ گمان نیک رکھا کہ انشاء اللہ تعالیٰ میرا کام ہو جاوے گا اور فال بد کو اگر اسی درجہ میں سمجھے تو اس کا حاصل یہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ پر بدگمانی رکھے اور اللہ تعالیٰ پر گمان نیک رکھنا بہت اچھا ہے اور بدگمانی ناجائز ہے۔ اس لئے فال نیک کی اجازت ہوئی اور فال بد کی ممانعت۔ (مجاہد ملت معدلت دعوات عبدیت حصہ سوم ص ۱۱)

(۱۱) اصطلاح صوفیہ میں کافر سے مراد فانی ہے

علامہ ظاہر تو امکان کذب ہی میں آج تک لڑ رہے ہیں اس میں تو وقوع کذب لازم آگیا اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں کذب نہیں کیونکہ کافر با اصطلاح صوفیہ بمعنی فانی ہے۔ خیر فرماتے ہیں کافر عشقم مسلمان مراد رکاز نیست ہر گ من تارگشتہ حاجت زنا نیست

اے فانی عشقم۔ تو اس غیبی آواز کا مطلب یہ ہوا کہ جو چاہے عمل کر تو فانی ہو کر مرے گا، اب یہ کلام ایسا ہو گیا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے لعل اللہ اطلع الی اهل بدر فقال اعملوا ما تشاءتم فقد غفرت لکم اور صوفیہ نے یہ اصطلاح لغت سے لی ہے کیونکہ لغت میں کفر بمعنی ستر (چھپانا) ہے اور فانی بمعنی اپنی ہستی کا ستر ہے صوفیہ کی اصطلاحات کہیں لغت سے ماخوذ ہیں کہیں عرف عام سے۔ کہیں فلسفہ سے، کہیں علم کلام سے۔ کہیں کسی اور فن سے۔ اور یہ خلط مبحث انھوں نے اس لئے کیا ہے تاکہ اس پر پردہ پڑا رہے۔ بل تک نہ پہنچ جائیں

باید عی مگوئید اسرار عشق و مستی بگذارتا بمیر دور رخ خود پرستی
اسی لئے ان علوم و اسرار کو بر سرِ مہر بیان کر نیکی ممانعت ہے یعنی بلا ضرورت بیان نہ کرے اور میں اس وقت ضرورت سے بیان کر رہا ہوں۔ غرض یہ غیبی صدا صوفیہ کی اصطلاح میں کفر عام اصطلاح میں نہ تھی۔ اور یہ عنوان مزاح کے لئے اختیار کیا گیا۔ تاکہ ذرا گھوڑی دیر کو عاشق پریشان ہو جائے۔

مزاح حدیث میں

اور مزاح حدیث سے ثابت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض دفعہ مزاح فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک بڑھیا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کی کہ اے اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں پہنچا دے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لَا تَدْخُلُ الْعَجُوزُ الْجَنَّةَ کہ بوڑھی عورت جنت میں نہ جائے گی۔ وہ رونے لگی تب آپ نے یہ آیت پڑھی اَنَا أَنشَأْنَا هُنَّ أَنثَاءً فَجَعَلْنَا هُنَّ أَبْكَارًا عَرَبًا اتُّرَابًا لِأَصْحَابِ الْيَمِينِ۔ مطلب یہ تھا کہ بوڑھی عورت بڑھیا ہو کر جنت میں نہ جائے گی بلکہ جوان ہو کر جائے گی۔ ایک بار حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے ایک مسئلہ کے متعلق بار بار سوال کیا۔ آپ نے ہر دفعہ جواب دیا پھر اخیر میں فرمایا۔ وَإِنْ رَعِمَ أَنْفَ أَبِي ذَرٍّ کہ ہاں یہی جواب ہے اگرچہ ابوذر کی ناگ رگڑ جائے یہ مزاح ہی تو تھا۔ گو برنگ عتاب تھا مگر عاشق کو ایسا لطف آتا ہے کہ حضرت ابوذر جب اس حدیث کو بیان فرماتے تو اخیر میں یہ بھی کہتے وَإِنْ رَعِمَ أَنْفَ أَبِي ذَرٍّ۔ کیونکہ ان کو اس میں حظ آتا تھا۔

ایک واقعہ

حضرت شیخ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید حج کو گیا۔ تو آپ نے اس کے ہاتھ روضہ اقدس پر سلام بھیجا جب مرید نے شیخ کا سلام پہنچایا تو روضہ قدس

اوازانی۔ اپنے بدعتی پیر کو ہمارا بھی سلام کہہ دینا شیخ کو یہ واقعہ مکشوف ہو گیا مگر جب مرد واپس آیا تو اس سے پوچھا کہ تم نے ہمارا سلام پہنچایا تھا۔ کہا ہاں حضور بنیادیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی آپ کو سلام فرمایا ہے فرمایا انھیں لفظوں سے کہہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے ہیں کہا جب آپ کو وہ الفاظ معلوم ہیں تو مجھے آپ کیوں بے ادب بناتے ہیں۔ فرمایا اس میں بے ادبی کیسی۔ اس وقت تمہاری زبان سے وہ الفاظ ادا نہ ہوں گے، بلکہ تمہاری زبان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک ہوگی۔ تم تو محض سیفہ ہو غرض اس نے وہی الفاظ کہے کہ اپنے بدعتی پیر کو ہمارا بھی سلام کہنا۔ یہ سنت ہے شیخ پر وجد طاری ہو گئی اور یہ شعر پڑھا۔

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ کو گفتی جواب تلخ می زید لب لعل شکر خارا

یہی راز تھا حضرت ابوذر کے بار بار وان رہنم انف ابی ذر کہنے میں ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

اگر ایک بار بگوید بندہ من از عرش بگذر و خندہ من سب پیارا نام ہو میرا یہی

حق تعالیٰ کا مزاج حق تعالیٰ کا مزاج فرمانا بھی حدیث سے ثابت ہے کہ جہنم سے جو مسلمان نکالے جائیں گے ان کا لقب جہنم ہوگا۔ کیونکہ ان کو اسی میں حظ ہوگا۔ جس کی مثال اوپر گذر چکی۔ ان میں ایک شخص جو سب سے اخیر میں نکالا جائے گا حق تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ مانگ کر کیا مانگتا ہے وہ عرض کرے گا کہ میرا منہ جہنم کی طرف سے پھیر دیا جائے حق تعالیٰ فرمائیں گے بس اس کے بعد کچھ نہ مانگے گا وہ کہے گا نہیں اور کچھ نہ مانگوں گا۔ چنانچہ جہنم کی طرف سے اس کا منہ پھیر دیا جائے گا اس وقت اس کو جنت کا ایک درخت نظر آئے گا۔ عرض کرے گا اس درخت کے نیچے مجھے پہنچا دے۔ ارشاد ہوگا کہ تو نے تو ابھی وعدہ کیا تھا کہ کچھ نہ مانگوں گا وہ معذرت کرنے لگے کہ بس یہ درخواست اور پوری کر دیجئے پھر کچھ نہ مانگوں گا غرض اسی طرح رفتہ رفتہ وہ جنت میں پہنچ جائیگا تو یہ بھی مزاج ہی ہے کہ مقصود تو جنت میں پہنچانا تھا مگر اس کو رگڑ کر پہنچایا جائے گا لہذا اب اس حکایت پر کچھ اشکال نہیں کیونکہ مزاج کا ثبوت اس میں بھی ہے۔ دوسرے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کافر سے مراد صدائے عیبی میں کافر باللہ نہ تھا بلکہ کافر باللہ لغت ہے۔ اور یہ استعمال نص میں بھی وارد ہے۔ یعنی یکفر بالطاعت و یؤمن بالبدل فقد استمسک بالعروة الوثقی جس نے

طاعت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا اس نے مضبوط دستے کو تھام لیا۔

۱۲ خطبۃ الوداع محض بدعت ہے

خطبۃ الوداع میں مصالحتیں بیان کرنا من وجہ خدا اور رسول پر اعتراض ہے سو اس کا بیان یہ ہے کہ جب بعض بدعتیں بھی بوجہ مصالح مطلوب ہوتیں تو گویا اس شخص کے نزدیک کتاب و سنت کی تعلیم نا تمام ہوتی کہ بعض مصالح ضروریہ کی تعلیم میں فرو گذاشت ہو گئی کیا کوئی اس کا قائل ہو سکتا ہے، اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بدعت کو ضلالت فرمایا ہے۔ اور بعض بدعت کے حسنہ ہونے سے اگر شبہ ہو تو درحقیقت وہ بدعت ہی نہیں۔ اور اس قسم کا احتمال خطبۃ الوداع میں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر معنی سنت ہوتا تو سلف میں اس کی نظیر ضرور ہوتی پھر بعد عرق ریزی کے اگر کوئی دور کی نظیر نکال بھی لی جاوے، تو دوسرے مانع کا کیا جواب ہوگا کہ عوام کے التزام سے بدعت ہو گیا اور بدعت بھی بدعت ضلالت، جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نار کی دھند فرما رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عین ارشاد حق ہے، تو ایسے امر کا التزام اور اس میں مصالحتیں نکالنا خدا اور رسول پر اعتراض بھی ہے اور خدا اور رسول سے مزاج بھی ہے۔ لیکن ہمارے اس قول سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد خداوندی ہے کوئی یہ نہ سمجھ جاوے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد نہ فرماتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد ضرور فرماتے تھے لیکن آپ کا اجتہاد موقوف رہتا تھا اگر وحی میں اس پر تکرر نہ ہوتی تب تو وہ حجت رہتا تھا کیونکہ سکوت اس کی تقریر دلالت کرتا ہے۔ ورنہ وحی سے اس کی اصلاح ہو جاتی تھی۔ غرض حال میں وہ اجتہاد بھی حکماً وحی ہو جاتا تھا لہذا اب وجہ اجتہاد کے بھی یہ کہنا صحیح ہے کہ

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ ا حلقوم عبد اللہ بود

(اکمال العوام والعیب ص ۱)

۱۳ عوام کا اہل قبور سے دمانگنا شرک سے خالی نہیں

(۱) فرمایا شرک جس کی نسبت وعید ہے۔ اِنَّ اللہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهِ۔ اس کی تعریف

بے بلاشبہ اللہ تعالیٰ شرک کو نیکو بخشا نہیں ہے۔

یہ ہے کہ کسی کو مستحق عبادت سمجھنا اور عبادت کہتے ہیں کسی کے سامنے نہایت تضرع و تذلل سے پیش آنے کو چونکہ حق تعالیٰ قادر مطلق و خالق و رازق ہیں، ان کو غیرت آتی ہے کہ سوا ان کے کسی دوسرے کے سامنے غایت تضرع و تذلل سے پیش آئے مثلاً دو شخص ہوں۔ ایک ان میں بڑے مرتبے کا ہے اور اس مرتبے والے نے کسی سائل کو کچھ دیا۔ اور سائل بجاتے معطلی کے دوسرے کی ایسی ہی تعریف و توصیف کرنے لگے جو اس کے لئے چاہئے تھی تو طبعی بات ہے کہ معطلی کس قدر غضبناک ہوگا۔ اسی طرح حق تعالیٰ کو کبھی عزت آتی ہے۔ جو لوگ مزارات پر اولیاء اللہ سے سوال کرتے ہیں اب دیکھنا چاہیے آیا محض وسیلہ سمجھ کر سوال کرتے ہیں یا کوئی امر اس سے زائد ہے۔ سو مشرکین عرب بھی بتوں کی عبادت وسیلہ قرب الہی سمجھ کر کرتے ہیں چنانچہ مذکور ہے۔ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَرْفَعُ رُتَبَ كُلِّ شَيْءٍ وَيَجْعَلُ لِكُلِّ شَيْءٍ مِّقْدَارًا ۚ لِيُظْهِرَ لِكَلِّ شَيْءٍ مِّزَانًا ۚ (سورہ اعراف ۱۸۰-۱۸۲)۔ سو سمجھنے کی بات یہ ہے کہ وسیلہ میں بھی دو صورتیں ہیں۔ مثال سے فرق معلوم ہوگا۔

شُرک کی ایک مثال | مثلاً ایک کلکٹر ہے اس کے پاس ایک منشی نہایت زیرک عاقل ہے کلکٹر نے اپنا سارا کاروبار حساب و کتاب اسی منشی

کے سپرد کر دیا ہے اور اس کے ذمہ چھوڑ دیا۔ اور ایک دوسرا کلکٹر ہے اس کے پاس بھی منشی ہے مگر کلکٹر زبردست عادل ہے اپنا کاروبار خود دیکھتا رہتا ہے منشی کے ذمہ نہیں چھوڑا اب اگر کوئی شخص اس منشی زیرک کے پاس جو پہلے کلکٹر کے پاس ہے جس کے سپرد سب کام ہیں کوئی درخواست پیش کرے تو کیا سمجھ کر کریگا یہ ظاہر ہے کہ منشی کو کاروبار میں ذخیل سمجھ کر پیش کرے گا اور اسی واسطے اس کی خواہش کرے گا کہ یہ خود سب کام کر دیں گے کیونکہ ان کے کل کام سپرد ہیں۔ کلکٹر تو فارغ بیٹھا ہے گو ضابطہ کے دستخط وہی کرے گا مگر اس منشی کے خلاف کبھی دستخط نہ کرے گا اور اگر دوسرے کلکٹر کے منشی کے یہاں عرضی دی جائیگی تو محض اس خیال سے کہ کلکٹر زبردست ہے۔ رعب والا ہے اس کے سامنے کون جاسکتا ہے اس منشی کے ذریعہ درخواست کرنی چاہیے کیونکہ اس منشی کو تقریباً حاصل ہے۔ یہ وہاں پیش کر دیگا۔ کیونکہ کل کام کلکٹر خود دیکھتا ہے۔ اب دیکھئے ان دونوں صورتوں میں کس قدر فرق ہے۔ عوام اہل مزار سے اکثر پہلی صورت کا برتاؤ کرتے ہیں۔ ان کے افعال اعمال سے یہ ظاہر ہے پھر شرک نہیں تو اور کیا ہے۔ برخلاف محض وسیلہ سمجھنے کے۔ پس شرع شریف میں عبادت غیر اللہ جہاں صادق آئے گا گو بہ نیت تو تسلیم ہی وہی ہوگا۔ غرض تو تسلیم تو

لے ہم انکی پوجا نہیں کرتے مگر صرف اس لئے کہ وہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں گے

جائز مگر تعبد تو تسلیم شرک۔ (مقالات حکمت نمبر ۵، دعوات عبدیت لصلہ اول)

(ب) لوگ قبروں پر جا کر ان سے دنیا کے کاموں میں مدد اور اعانت چاہتے ہیں اور قبروں پر جانے میں بالکل یہی اعتقاد ہوتا ہے کہ وہ ہمارے مدد و معاون ہو جائیں گے۔ سو یہ اور کبھی بے ادبی ہے اس لئے کہ وہ حضرت مقرب

قبروں سے مدد چاہنا

ہیں جب دنیا میں زندہ رہ کر دنیوی تذکروں اور جھگڑوں کو پسند نہیں فرماتے تھے تو اب عالم آخرت میں جا کر کیسے پسند کریں گے جبکہ مورا آخرت میں مستغرق بھی ہوں اور ایسی حالت میں ان سے دنیوی قصوں میں مدد چاہنا دین کے خلاف تو ہے ہی تو وہ عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ جب دنیا ان کے پاس نہیں رہی تو ان سے دنیا مانگنا یا دنیوی کاموں میں مدد، یا اعانت کی خواہش کرنا، کیسے تسلیم کی جاسکتی ہے۔ ہاں ان سے وہ چیزیں مانگو جو ان کے پاس ہوں تو اب بھی صاحب نسبت ان سے فیض حاصل کر سکتا ہے اور روپیہ اور سیٹا تو ان کے پاس ہے بھی نہیں۔ پس وہ تم لوگوں کو کیسے دیں گے۔ کوئی قبر کھول کر دیکھے تو وہاں ایک روپیہ بھی نہ ہوگا تو پھر ایسی چیزیں ان سے مانگنا جو ان کے پاس بھی نہیں کیسی بے عقلی کی بات ہے رہا یہ خیال کہ وہ دعا کر دیں گے تو ایسا کون خیال کرتا ہے کوئی بڑا ہی خوش عقیدہ ہوگا کہ اس خیال سے قبروں پر جاتا ہوگا، ورنہ عام عقیدہ تو یہی ہے کہ وہ خود دیتے ہیں۔

ایک حکایت

چنانچہ کانپور میں ایک بڑھیا ایک شخص کے پاس آئی کہ بڑے پر صاحب کی نیاز دیدو۔ انہوں نے کہا کہ بڑی نیاز تو اللہ میاں کی دیتے دیتا ہوں اور ثواب بڑے پر کو پہنچائے دیتا ہوں، اس نے جواب دیا کہ نہیں اللہ میاں کی نیاز تو میں دلا چکی ہوں۔ اس پر بڑے پر ہی کی نیاز دیدو۔ اس سے صاف ظاہر ہوا کہ عوام بزرگوں کو صاحب اختیار بال استقلال سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ایک مرتبہ جامع مسجد میں ایک بڑھیا آئی اور کہنے لگی کہ ایک پرزہ تغزیہ پر لٹکانے کو لکھ دو ہم نے کہہ دیا کہ یہاں کسی کو ایسا پرزہ لکھنا نہیں آتا۔ ایک اور قصہ مجھے یاد آیا۔ ایک صاحب یہاں تک بیان کرتے تھے کہ میں نے تغزیہ میں ایک تیلاموم کا رکھا دیکھا۔ قصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک عرضی لٹکانی اور اولاد کی درخواست کی ایک شخص نے اس عرضی کے نیچے یہ جواب لکھ دیا کہ تمہاری بیوی بائجھ ہے اسے طلاق دیکر دوسری شادی کر لو اور یہ شعر لکھ دیا ہے

لے وسیلہ کی خاطر عبادت کرنا نہ ڈوبے ہوئے۔

زمین شور سنبل بر نیاید
اور اس کے نیچے لکھ دیا۔ راقم امام حسین رضی اللہ عنہ نے جو اس جواب کو دیکھا تو بہت
بگڑے کہ یہ کس نے میرے ساتھ مذاق کیا۔ کسی نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ اور کسی نے
لکھ دیا ہے ممکن ہے کہ یہ لکھوں نے ہی لکھا ہو۔ کیونکہ اگر وہ اس کے پڑھنے پر تیار رہیں تو لکھنے پر بھی
قادر ہوں گے۔ لہذا ممکن ہے کہ خود حضرت امام ہی لکھ گئے ہوں۔

سوانح کل لوگوں کی یہ محال ہے اور یہ شریعت اور ادب اور عقل
خلاف ادب کام | سب کے خلاف ہو رہا ہے۔ غرضیکہ جب زندوں سے اس قسم کی باتیں
کرنا خلاف ادب ہیں تو مردوں سے تو اور بھی زیادہ خلاف ادب ہونگی ان حضرات کو ایسی باتوں سے
ایسی ہی نفرت ہوتی ہے جیسے کسی مہذب مجلس میں گو موت کے ذکر سے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ان
حضرات کو تو دنیا کے تذکرہ سے بھی نفرت ہوتی ہے۔ حضرت رابعہ کے یہاں چند بزرگوں نے دنیا
کی مذمت کی تو انھوں نے فرمایا کہ تم میرے پاس سے کھڑے ہو جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو دنیا کی محبت
ہے۔ من احب شیئا اکثر ذکرہ۔ (اتباع المنیب ص ۹)

۱۴۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت پر

جلوس نکالنا

آج کل ہمارے چند اخوان زمان نے ایک عظیم الشان مفسدہ کی بنیاد ہندوستان میں ڈالی
ہے یعنی یوم ولادت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یوم عید بنانے کی تجویز کی ہے اور یہ خیال ان کے
ذہن میں دوسری اقوام کے طرز عمل کو دیکھ کر پیدا ہوا ہے لیکن اس قاعدہ مذکورہ کی بنیاد لوگوں
کو سمجھ لینا چاہئے کہ یوم ولادت کی خوشی دنیوی خوشی نہیں ہے۔ یہ مذہبی خوشی ہے پس اس کے
تعیین طریق کے لئے وحی کی اجازت ضروری ہے اور اگر کوئی یہ کہے کہ ہم بطور سال گرہ کے دنیوی
طرز پر کرتے ہیں تو میں کہوں گا کہ ایسا کر نبی الے سخت بے ادبی اور گستاخی جناب نبوی صلی اللہ
علیہ وسلم میں کر رہے ہیں۔ صاحبوا کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جلالت و عظمت پر دنیا اور دنیا
لے زمانہ کے بھائیوں نے

کے بادشاہوں پر جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی نسبت نہیں ہے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ
اس فرحت کے لئے بس ایک دنیوی رذیل سامان اسی طرح کا کرتے ہو۔ جیسا ان سلاطین کے
لئے کیا کرتے ہو۔ ع۔

”چہ نسبت خاک را با عالم پاک“

ایک بزرگ کی حکایت | مجھے اس موقع پر ایک بزرگ کی حکایت یاد آگئی کہ وہ جنگلیں
رہتے تھے ایک کتیا پال رکھی تھی اتفاق سے ایک تیرہ کتیا نے
بچے دیئے تو آپ نے تمام شہر کے معززین کو مدعو کیا لیکن ایک بزرگ شہر میں رہتے تھے ان کو
نہیں بلایا۔ ان بزرگ نے ازراہ بے تکلفی دوستانہ شکایت کی تو ان بزرگ نے جواب میں کہلا
کر بھیجا کہ حضرت میرے یہاں کتیا نے بچے دیئے تھے اس کی خوشی میں سگان دنیا کی دعوت
کر دی۔ سخت گستاخی تھی کہ میں ان دنیا کے کتوں کے ساتھ آپ کو مدعو کرتا۔ جس روز میرے
اولاد ہوگی اور مجھ کو خوشی ہوگی اس دن آپ کو مدعو کروں گا۔ اور کتوں میں سے ایک کو بھی نہ چھوٹا گا۔

دنیا داروں کا معاملہ نبی کے ساتھ | جب اولیاء کے ساتھ دنیا داروں کا سا برتاؤ
بے ادبی ہے تو سید الانبیاء کے ساتھ دنیا داروں

کا سا برتاؤ کیسے بے ادبی نہ ہوگی۔ اب اس کی دلیل سنئے کہ یوم ولادت مذہبی خوشی ہے دنیوی خوشی
نہیں ہے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ دنیا کا اطلاق اس خطہ زمین پر یا زیادہ سے زیادہ چند فرسخ اس
کے متصل ہوا پر ہوتا ہے پس اگر کوئی دنیوی خوشی ہوگی تو اس کا اثر اس خطہ زمین تک محدود رہے گا
اس سے متجاوز نہ ہوگا اور ولادت حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے دن نہ صرف زمین کے موجودات
بلکہ ملائکہ عرش و کرسی اور باشندگان عالم سب کے سب مسرور اور شاد ہوں گے، وجہ یہ بھی کہ حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریف کفر و ضلالت کی ماحی اور توحید حق کی حامی تھی۔ جس کی بدولت
عالم کا قیام ہے کیونکہ قیامت اسی وقت قائم ہوگی جب ایک شخص بھی دنیا میں خدا کا نام لینے والا
نہ رہے گا اور قیامت کے قائم ہونے سے فرشتے بھی کثرتاً ہو جائیں گے، پس آپ کا ظہور جو نہ
سبب تھا تمام عالم کے بقا کا اس لئے تمام عالم میں یہ خوشی ہوئی۔ جب اس کا اثر دنیا سے متجاوز
ہو گیا۔ تو اس خوشی کو دنیاوی خوشی نہیں کہہ سکتے۔ جب معلوم ہوا کہ یہ دنیوی خوشی
نہیں بلکہ مذہبی خوشی ہے تو اس میں ضرور ہر طرح سے وحی کی احتیاج ہوگی۔ یعنی اس کے وجود میں
بھی اور اس کی کیفیت میں بھی۔

یوم ولادت پر خوشی منانے کی کوئی دلیل نہیں | اب مجوزین ہم کو دکھلائیں کہ کس وحی سے یوم ولادت کے یوم عید بنانے کا حکم معلوم ہوتا ہے اور کیا صورت اس کی بتلائی گئی ہے اگر کوئی قل بفضل اللہ سے استدلال کرے تو میں کہوں گا کہ صحابہ کرام جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اور تمام عالم سے زیادہ کلام مجید کو سمجھتے تھے ان کی سمجھ میں یہ مسئلہ کیوں نہیں آیا۔ بالخصوص جب کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کی ہوئی تھی۔ علی ہذا تابعین رحمہم اللہ جنہیں بڑے بڑے مجتہدین ہوئے ہیں ان کی نظر یہاں تک کیوں نہیں پہنچی۔ ہاں جن امور کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت ہے اس کو ضرور کرنا چاہئے۔ مثلاً آپ نے اپنی ولادت کے دن روزہ رکھا اور فرمایا۔ ذالک الیوم الذی ولدت خبیہ اس لئے ہم کو بھی اس دن روزہ رکھنا مستحب ہو سکتا ہے۔ دوسرے پر کے دن نامہ اعمال حق تعالیٰ کے دربرویش ہوتے ہیں پس یہ مجموعہ وجہ ہوگی اس حکم کی۔ اگر منفرد ابھی مانا جاوے تب بھی صحیح ہے لیکن صرف اسی قدر کی اجازت ہوگی جتنا کہ ثابت ہے (اکمل الصوم والعید ص ۲۴)

۱۵۔ عرس کے حقیقی معنی اور بزرگوں کے مروجہ عرسوں کا خلاصہ ہونا

آج کل جو لوگوں نے بزرگوں کے عرس کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ یہ بھی محض لغو اور تجاوز عن الحد ہے۔ اصل حقیقت اس کی یہ تھی کہ عرس کے معنی لغت میں شادی کے ہیں۔ اور حاصل شادی کا یہ ہے کہ محب کا محبوب سے وصل ہو۔ پس چونکہ ان حضرات کی موت ان کے لئے وصل محبوب ہے۔ اس لئے ان کے یوم وصال کو یوم العرس کہا جاتا ہے۔ نیز ایک روایت میں بھی آیا ہے کہ جب کسی مقبول بندہ کی وفات ہوتی ہے اور فرشتے۔۔۔ ان کی قبر میں آکر سوال کرتے ہیں۔ تو سوال و جواب کے بعد کہتے ہیں۔ انکم کثرت العرس من تو وہ دن ان حضرات کے لئے یوم العرس ہوا۔ اسی کو ایک بزرگ خوب کہتے ہیں

لہ دہن کی طرح بے فکر سو جا

خوشا روزے و خرم روزگارے کہ بارے بر خور از وصل یارے
اور گو وصل ان حضرات کو دنیا میں کبھی ہوتا ہے تاہم اس وصل میں اور اس وصل میں فرق ہے کہ یہاں پر حجاب ہے اور وہاں بلا حجاب۔ جیسا مولانا نے فرمایا ہے۔
گفت مشکوٰۃ و برہنہ گو کہ من مے نہ گنجم با صنم در پیرہن
اگر چہ خدا تعالیٰ جسم اور لوازم اور عوارض جسم سے پاک ہے لیکن یہ مثال کے لئے۔ کہا جاتا ہے اور جیسا حضرت عوث فرماتے ہیں

بے حجابانہ در آزد رکا شانہ ما کہ کسے نیست بجز درد تو در خانہ ما
یہ کیفیت تو وہاں کے وصال کی ہے اور دنیا میں بوجہ حجاب اور سیری نہ ہونے کے ان کی یہ حالت ہوتی ہے

دل آرام در بردل آرام جو لب از تشنگی خشک بر طرف جو
نگویم کہ بر آب قادر نیستند کہ بر ساحل نیل مستسقی اند
اور چونکہ ان کو مرکزیہ دولت نصیب ہوتی ہے اس لئے وہ تمنائیں کرتے ہیں اور شدت شوق میں یوں کہتے ہیں کہ

خرم آزد رگزیں منزل ویراں بردم راحت جاں طلسم ز پئے جانان بردم
اور ان حضرات کو چونکہ مرنے کی خوشی ہوتی ہے اس لئے اس میں نہایت مطمئن ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک نقشبندی بزرگ کی حکایت ہے کہ انہوں نے وصیت کی تھی جب میرا جنازہ لے چلو تو ایک شخص ساتھ ساتھ یہ اشعار پڑھتا چلے

مفلسا نیم آمدہ در کوئے تو شیئا للہ از جمال روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما آفریں بردست ویر بازوئے تو
کیوں صاحب کیا بے اطمینانی میں کسی کو ایسی فراکشوں کی سوچ سکتی ہے۔ یہ غایت فخر کا اثر تھا۔ حضرت سلطان نظام الدین اولیاء قدس سرہ کی حکایت مشہور ہے کہ جب آپ کا انتقال ہو گیا اور جنازہ لے چلے ایک مرید نے شدت غم میں درد کے ساتھ یہ اشعار پڑھے

سر و سینا بصحرای روی سخت بے مہری کہ بے مایروی
اے تماشا گاہ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا می روی

لکھا ہے کہ ہاتھ لکھنے کے اندر بلن ہو گیا۔ صا جو ایک ایسا شخص جس کی یہ حالت ہو کہ ع
پابندی دگرے دست بدست دگرے

کیا اس کو وجد ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی بے حد فرحت کا دن ہوتا ہے ایک دوسرے
بزرگ انتقال کے وقت منتظرانہ مشتاقانہ فرماتے ہیں ع

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم جسم بجز ارم سرسرهاں شوم
اور یہ حالت کیوں نہ ہو جب کہ وہ جانتے ہیں کہ اب پردہائے ہیولانی جو کہ مانع دیدار تھے
اٹھتے ہیں اور کوئی گھڑی ہے کہ محبوب حقیقی کا دیدار نصیب ہو گا صرف یہ نہیں کہ ان کو جنت یا حوروں
کی ہوس ہوتی ہے۔

ابن الفارض کا واقعہ حضرت ابن الفارض کا واقعہ لکھا ہے کہ ان کا انتقال ہونے لگا تو جنت
منکشف ہوئی آپ نے اس طرف سے منہ پھیر لیا اور کہا ع

ان کان منزلتی فی الحب عندکم ما قدر ایت فقد ضیعت ایاہی
کہ جان تو آپ کے لئے دے رہا ہوں جنت کو کیا کروں آخر جنت چھپ گئی اور نور التجلی ظاہر ہوئی
اور جان بحق ہوئے ان کی بالکل وہی حالت ہو گئی کہ۔

گر باید ملک الموت کہ جائیم بر د تانہ بنیم رخ تو روح رسیدن مذہم
اکثر لوگ ان حالات کو سزا کہ تعجب کریں گے لیکن تعجب صرف اس وجہ سے ہے کہ خود اس سے محروم
ہیں۔ مگر ایسے لوگوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ ع

”تو مشو منکر کہ حق لبس تادراست“

بزرگوں کی موت یوم مستر ہے عرض بزرگوں کے حالات اور حدیث وغیرہ
سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان بزرگوں

کی وفات کا دن یوم العرس ہے لیکن لوگوں نے اس کے مفہوم و مصداق دونوں کو بالکل خراب
کر دیا ہے مصداق کی خرابیاں تو ظاہر ہیں کہ تمام شرک و بدعت اس عرس کا جزو ہو گئی ہیں۔ باقی
مفہوم کی خرابی یہ کہ اس لفظ کے لغوی معنی لے کر شادی کے لوازم بھی وہاں جمع کر دیئے چنانچہ اکثر
جگہ رسم ہے کہ بزرگوں کی قبر پر بھندی چڑھاتے ہیں۔ لونبت نقارہ رکھتے ہیں اسی طرح مزامیر
وغیرہ سب لنو حرکتیں جمع کر رکھی ہیں غریب مردہ پر تو بس چلتا نہیں قبر کی گت بنائی جاتی ہے تو
حقیقت میں وہ یوم العرس اس اعتبار سے ہے کہ جس کو ذکر کیا گیا کہ وہ ان بزرگوں کی خوشی

کا دن ہے۔ اور یہ کوئی دنیوی خوشی نہیں ہے تو اس میں کوئی طریقہ مقرر کرنے کے لئے ضرورت وحی کی
ہوگی اور وحی ہے نہیں بلکہ اس کے خلاف پر وحی ہے چنانچہ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے
ہیں۔ لا تتخذوا قبوری عیداً کہ میری قبر کو عید نہ بنانا۔ عید میں تین چیزیں ضروری ہیں ایک
اجتماع دوسرے تعیین وقت۔ تیسرے فرحت۔ تو ممانعت کا خلاصہ یہ ہوا کہ میری قبر پر کسی یوم
معین میں سامان فرحت کے ساتھ اجتماع نہ کرنا ہاں اگر خود بخود کسی وقت میں کسی غرض سے اجتماع
ہو جائے تو اور بات ہے۔ دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہاں سے تشریف لے جانا اگرچہ آپ
کے لئے باعث سرور ہے لیکن ہمارے لئے تو باعث حزن ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات
سے جو ہم پر نعمت کامل فرمائی ہے جس کو میں نے نشر الطیب میں لکھا ہے وہ دوسرے اعتبار سے
ہے پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر ایسا اجتماع جائز نہیں تو دوسروں کی قبر پر ایسا اجتماع کیونکر
جائز ہو گا اور عجیب برکت ہے کہ آج تک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر اجتماع کا کوئی خاص
دن معین نہیں ہوا۔ (ایضاً ص ۲۶)

۱۶۔ شادی اور عنی کی رسوم خلاف شرع

اور واجب الترتیب ہیں

(۱) شادی اور عنی کی رسمیں ہیں کیا آج کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ رسمیں شریعت کے
خلاف نہیں ہیں اور اگر واقعی کسی کو معلوم نہیں تو اس کو چاہیے کہ اس قسم کی کتابیں مطالعہ کرے جو
اس کے بیان کرنے کے لئے تصنیف کی گئی ہیں یا جو لوگ اس مجمع میں موجود ہیں وہ اسی وقت
کچھ سن لیں۔ سینے۔ شادی عنی کی رسمیں دو قسم کی ہیں ایک تو وہ ہیں کہ جن کا نتیجہ ہونا نہایت
ہی ظاہر ہے اور شرفاء و ثقافت نے ان کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے اب صرف اسافل اور نساق
الناس اس میں مبتلا ہیں۔ مثلاً ناچ رنگ وغیرہ۔ اور بعض وہ رسمیں ہیں کہ ان کا نتیجہ اتنا ظاہر
نہیں۔ ان میں عوام و خواص قریب قریب سبھی مبتلا ہیں اور ان کو بالکل جائز سمجھا جاتا ہے بلکہ
بسا اوقات اعلیٰ تقویٰ کے طور پر کہا جاتا ہے کہ ہم نے شادی میں کونسی رسم کی ہے نہ ہمارے
ہاں ناچ ہوا اور نہ باجا منگایا گیا۔ پھر ہم نے کیا گناہ کیا۔ سو میں بتلاتا ہوں کہ آپ نے کیا گناہ

کیا ہے لیکن پہلے مجھے یہ بتلادیکھئے کہ گناہ کہتے کس کو ہیں۔ ظاہر ہے جو امر شرعاً ممنوع ہو۔ وہ گناہ کہلاتا ہے خواہ وہ ناپح ہو یا کوئی دوسرا امر ہو کیونکہ ناپح بھی تو اسی واسطے حرام ہوا کہ شریعت نے اس کو حرام اور جرم قرار دیدیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ناپح کے علاوہ دوسری رسوم کو بھی شریعت نے جرم قرار دیا ہے یا نہیں۔ اس پر مفصل گفتگو تو اصلاح الرسوم میں ملے گی۔

تکبر کی حمایت میں مختصر اس وقت بقدر ضرورت بیان کئے دیتا ہوں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ خدائے تعالیٰ نے قرآن شریف میں نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث شریف میں تکبر کی سخت ممانعت فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے **اِنَّ الدُّنْيَا لَاجِبَتْ كُلَّ مَخْتَالٍ** فقوڑ ط حدیث شریف میں ہے **لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مَقْتَالٌ** حَتَّىٰ مِنْ خَرَدَلٍ مِنْ كَبَرٍ۔ دوسری حدیث میں ہے **مَنْ لَبِسَ ثَوْبًا شَهْرًا لَيْسَ لَهُ الْبِسَاءُ** اللہ ثوب الذل یقی القیامۃ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ کسی اکرٹینوالے اور فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتے، اور حدیث اول کا ترجمہ یہ ہے جس کے قلب میں رانی برابر بھی تکبر ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔ دوسری حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ اگر شہرت کے لئے کپڑا پہنے گا تو قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کو ذلت کا لباس پہنائیں گے۔ اس آیت اور حدیث سے معلوم ہوا کہ فخر کے لئے کوئی کام کرنا حرام ہے۔ ایک حدیث شریف میں ارشاد ہے **مَنْ سَمِعَ الدُّنْيَا بِمَنْ سَأَى الدُّنْيَا بِهٖ** اس سے معلوم ہوا کہ دکھلاوے اور شہرت کا کام کرنا حرام ہے۔

اب غور کر کے دیکھئے کہ شادیوں میں جو کام ہم کرتے ہیں اور جن کے لئے ہم نے نہایت خوبصورت الفاظ تراشت رکھے ہیں کہ بھات دیا ہے اور بھائیوں کو کھلایا ہے اور بیٹی کو دیا ہے وغیرہ وغیرہ ان میں نیت ہماری کیا ہوتی ہے۔ صاحبوا محض الفاظ کے خوبصورت ہونے سے کسی چیز کی حقیقت نہیں بدل جاتی۔ سب سے بڑی چیز نیت ہے لہذا نیت کو دیکھنا چاہیئے کیا ہم لوگ یہ تمام رسمیں محض رسم اور نمود کے لئے نہیں کرتے۔ بہنوں کو بڑا بھات دیا جاتا ہے اور اس کو صلہ رحمی کہا جاتا ہے کیوں صاحب آج سے آٹھ دن پہلے بھی تو یہ بہن آپ ہی کی بہن تھیں۔ پھر کیا آپ نے اسکی خبر لی ہے کبھی بہن کے فقر و فاقہ پر آپ کو رحم آیا ہے نیز اگر یہ صلہ رحمی ہے تو تمام برادری کو اس کا معائنہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا کبھی اپنی لڑکی کے لئے یا کپڑا خریدتے وقت یا اس کو کھلاتے پلاتے وقت بھی آپ نے

برادری کو جمع کیا ہے اگر نہیں کیا تو بھات اور چہیز دینے وقت برادری کو کیوں جمع کیا جاتا ہے، معلوم ہوا کہ محض فخر اور نام و نمود کے لئے ایسا کیا جاتا ہے بس یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یہ سب رسوم محض شہرت کے لئے نہیں اور شہرت کے لئے جو کام کیا جاتا ہے وہ بروئے حدیث شریف حرام ہوتا ہے، تو سب رسوم بھی حرام ہوئیں۔

باخصوص ایک رسم تو ایسی گندی ہے کہ وہ تو بہ سے بھی معاف ہونا مشکل ہے **نیوتہ کی رسم** کیونکہ اس کی تو بہ بھی مشکل ہے اور لطف یہ ہے کہ اس کو بظاہر عبادت سمجھا جاتا ہے اور اس پر فخر کیا جاتا ہے اور وہ رسم نیوتہ لینا دینا ہے لوگ اس کو قرض حسنہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھائی بھائی کی مدد کرتا ہے اور مدد کرنا عبادت ہے تو گویا نیوتہ دینا عبادت ہوا۔ حالانکہ نیوتہ دینا اس قدر بری رسم ہے کہ سب رسموں میں گندی ہے اس کو شاید آپ نے آج تک نہ سنا ہو گا۔ مگر اس وقت انشاء اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت بیان کر دوں گا اور وہ کوئی عجیب اور نئی بات نہ ہو گی، بلکہ پرانی بات ہے لیکن آپ نے عدم توجہ کے سبب اس میں غلطی کر رکھی ہے۔ مقدمات سب آپ کے سلم ہیں صرف نتیجے میں گر غلطی ہو رہی ہے جیسے کسی شخص نے تبت کے بجائے کئے تھے ت ب ز ر ت ب ت ز ر ب ت اور رواں پڑھا تھا۔ بطح۔ تو آپ نے بھی بچے تو صحیح کہے ہیں مگر رواں میں غلطی کر رکھی ہے جس کو میں بتلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ یہ سب کو مسلم ہے اور کوئی شخص اس سے منکر نہیں کہ نیوتہ فرض ہے دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ قرض واجب الادا ہوتا ہے۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ قرض خواہ کی موت کے بعد اس کا کل ترکہ اس کے ورثہ کی ملک ہوتا ہے خواہ وہ ترکہ عین ہو یا کسی کے ذمہ دین ہو مثلاً اگر کوئی شخص مرے اور سو روپے اس کے گھر میں موجود ہوں اور سو روپے ادھا میں تو اس کا کل ترکہ دوسروں سے سمجھا جائے گا۔ اور یہ دوسو روپے ملا کر سب ورثہ کو تقسیم کئے جائیں گے۔ ان تینوں مسئلوں کے معلوم ہونے کے بعد دیکھئے۔ نیوتہ میں کیا ہوتا ہے۔ سو نیوتہ میں یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص نے کچیس جگہ دو دو روپے دیئے۔ اور اس طرح پچاس روپے اس کے قرضے میں پھیل گئے اور اس کے بعد یہ شخص مرا۔ اور دو بیٹے اس نے وارث چھوڑے جن میں ایک بالغ اور دوسرا نابالغ، تو موجودہ ترکہ میں سے تو ان دونوں نے نصف نصف لے لیا وہ بھی جب بڑا بھائی بڑا ایماندار ہو۔

لیکن جو نیوتے میں قرض ہے اس کو کوئی بھی تو تقسیم نہیں کرنا۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر چند روز کے بعد اس بالغ لڑکے کی کسی اولاد کی شادی ہونے لگی تو وہ نیوتہ اسی کو لا کر دیں گے اور یہ بتلاتا مل سارا نیوتہ خود ہی خرچ کرے گا اور اپنے کو ہی اس کا مالک

کلید در دوزخ است آن نماز کہ در چشم مردم گذاری دراز
نمونہ کے طور پر میں نے بیان کر دیا ہے دوسری رسموں کو بھی اسی پر قیاس کر لینا چاہیے۔
یہ تو دلائل عقلیہ تھے۔ عقلی بھی سنو! رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ
زہرا رضی اللہ عنہا کی شادی کر کے دکھلادیا ہے کہ شادی اس طرح کرنی چاہیے
علی ہذا اپنے صاحبزادے ابراہیم رضی اللہ عنہ کی عمنی کر کے بتلادیا کہ عمنی یوں ہونی چاہیے پھر جب اس
کے موافق نہ کیا اور ہر امر میں اپنی ٹانگ اڑالی اور اس کا خلاف کراں ہوا تو سہولت اطاعت کہاں
ہوئی۔ پھر بت مطلوبہ کہاں ہوئی۔ اس محبت کا اثر تو یہ ہے کہ طاعت میں سہولت پیدا ہو اور جب
کہ ہم نے بالاس شریعت کے خلاف کیا کہ وضع وہ اختیار کی جو شریعت کے بالکل خلاف ہے۔ معاشرہ وہ پسند
ہوئی جس کو شریعت سے کچھ بھی لگاؤ نہیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ ہم کو کامل محبت خدا اور رسول سے
ہے (آثار المحبت ص ۱۳)

ایصال ثواب کے غلط طریقے (ب) وصول ہونے کے لئے ہی زیادہ تر ان لوگوں
نے اپنی ہوشیاری سے ایصال ثواب کے ایسے
طریقے ایجاد کئے ہیں جن کو سوائے ان کے دوسرے عامی آدمی جان ہی نہیں سکتا کہ اول قل ہو اللہ
ہو۔ پھر تبارک الذی ہو اور پھر یہ ہو اور پھر وہ ہو بعض سورتوں پر بسم اللہ پڑھی جاتی ہے اور بعض پر
نہیں یہ ایسی بات ہے کہ اس کو مولوی بھی نہیں جانتے تو چونکہ یہ طریقہ وہی لوگ جانتے ہیں اس لئے
مجبوراً سب عوام ان کے محتاج ہو کر انھیں کے پاس جاتے ہیں اور اس طرح سے انہیں کو منتا ہے
اور پھر غضب یہ کہ یہ لوگ اس میں اور بھی بڑی بڑی چالاکیاں کرتے ہیں ایک سب انسپکٹر مجھ سے
کہتے تھے کہ میں کسی بھانہ میں تھا کہ میرے پاس ایک شخص یہ پٹ لکھوانے آیا کہ کوئی آدمی میری فاختہ
چرا کر لے گیا میں سخت پریشان ہوا کہ فاختہ چرا نے کیا معنی۔ اس شخص سے پوچھا تو اس نے کہا
موقع پر چلے آخر موقع پر جا کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک نلکی میں پیر جی ایک سال کے لئے فاختہ پڑھ
کر بند کر جاتے ہیں کہ جب ضرورت ہو اس میں سے کھوڑی سی جھاڑ لیتا۔ فی نلکی (د) ان کی مقرر
ہے اتفاق سے کسی شخص کے پاس روپیہ تھا نہیں اور اس کو فاختہ کی ضرورت ہوئی تو اس نے اس
شخص کی نلکی چرائی۔ اس سے بڑھ کر ایک۔

ایک حکایت حکایت حضرت مولانا گنگوہی سنا تے تھے کہ کسی مسجد میں ایک ملا رہتا
تھا سب لوگ اس سے فاختہ وغیرہ دلاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک بڑھیا

کھانا لیکر آئی۔ اتفاق سے ملاجی اس وقت مسجد میں موجود نہ تھے ایک مسافر بیٹھا ہوا تھا وہ یہ سمجھ کر کہ مقصود
تو ثواب ہی ہے چلو مسافر ہی کو دیدو۔ اس کو کھانا دیکر چلی گئی مسجد کے دروازے سے نکلی ہی تھی کہ ملاجی
مل گئے۔ پوچھا کہ بڑھیا کیسے آئی تھیں۔ اس نے سب واقعہ بیان کر دیا آپ نوراً مسجد میں آئے اور
لاکھڑی لے کر تمام مسجد کے فرش کو خوب بیٹنا شروع اور شور مچانا شروع کیا۔ اور بیٹے بیٹے کھوڑی دیر میں
دھم سے مسجد کے فرش پر گر گئے۔ لوگوں نے جو غل شور سنا تو سب آ کر جمع ہو گئے پوچھا کہ ملاجی کیا ہوا۔
کہنے لگے بھائیو میں تو مدت سے یہاں رہتا ہوں۔ سب مردوں سے واقف ہوں۔ انہیں کو ثواب
بخش دیتا تھا۔ یہ نیا آدمی ہے خدا جانے اس نے کس کو ثواب بخش دیا۔ کہ یہاں کے سب مردے
مجھے اگر لپیٹ گئے میں نے ان کو بہت کچھ بھگایا۔ لیکن میں تنہا تھا۔ کہاں تک لڑتا۔ آخر تھک
کر گر گیا۔ اگر دو چار دفعہ ایسا ہوا تو میں مر ہی جاؤں گا۔ اس لئے اور کہیں جاتا ہوں۔ لوگوں نے کہا
ملاجی آپ کہیں نہ جلیے ہم آپ ہی کو ہر چیز دیا کریں گے۔ تو جب بنا ان رسوم کی یہ غرض ہیں تو جب
فاختہ کی عوض ان کو کچھ نہ ملے گا تو الٹ آ لگ پتہ پر فاختہ پڑھنا ان کو خود ہی مشکل معلوم ہوگا۔ اور
اسی طرح بہت جلد اس کا انسداد ہو جائے گا۔ اور یہ بھی ایک علامت ہے ان رسوم کے زائد
علی الدین ہونے کی۔ کیونکہ اصلی چیز منجانب اللہ ہر حالت میں محفوظ رہتی ہے چنانچہ جس زمانے میں
طاعون کی کثرت ہوئی تو تیمہ دسواں وغیرہ سب جھوٹ گئے تھے۔ صرف وہی چیزیں باقی رہ گئی تھیں
جو شرعاً ضروری تھیں۔ بعض لوگوں سے جو میں نے کہا کہ اب وہ رسوم کیوں نہیں ہوتیں تو کہنے لگے کہ
صاحب کس کس کی رسمیں کریں یہاں تو روز تیمہ ہی بہتا ہے میں نے کہا دیکھو اسی سے اندازہ ہو سکتا
ہے کہ یہ امور محض زائد ہیں ورنہ اس کثرت موت میں بھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی مردے کو بغیر کفن
دیئے اور بلا نماز پڑھائے دفن کر دیا ہو۔ اور تیمہ اور دسواں بہت لوگوں کا نہیں ہوا۔ غرض یہ کہ
دین کے کاموں میں بھی عجیب عجیب طریقے ایجاد کئے گئے ہیں جن سے مقصود دین میں کامیابی یعنی بھلا
حق مبرا حل بعید ہے۔ (احسان التذییر ص ۱۹)

بارات کا ایجاد (ج) اصل میں یہ رات وغیرہ ہندوؤں کی ایجاد ہے کہ پہلے زمانے میں
امن نہ تھا دلہن کی حفاظت کے لئے ایک جماعت کی ضرورت تھی اور
اس وجہ سے فی گھر ایک آدمی لیا جاتا تھا کہ اگر اتفاق سے کوئی بات پیش آوے تو ایک گھر میں
ایک ہی بیوہ ہو۔ اور اب تو امن کا زمانہ ہے اب اس جماعت کی کیا ضرورت ہے اور اگر خوف
بھی ہو تو اس قدر پہنا کر کیوں لاؤ۔ اور اگر کہیں گے گا اس میں بھی مصلحت ہے تو اس کا کیا جواب

دو گے کہ بارات والے جاتے تو ہیں جمع ہو کر اور لوٹتے ہیں متفرق ہو کر اور اکثر دلہن اور کھار اکیلے رہ جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حفاظت وغیرہ کچھ مقصود نہیں صرف رسم کو پورا کرنا اور نام آوری مد نظر ہوتی ہے اور شامت یہ کہ اکثر عصر کے وقت بارات چلتی ہے اور لڑکی کے ماں باپ بھی ایسا غضب کرتے ہیں کہ اسی وقت رخصت کر دیتے ہیں شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اب ہماری چیز نہ رہی ورنہ حفاظت کی اب پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کیونکہ زیب و زینت کی حالت میں ہے خدا جانے کیا بات پیش آوے۔

دین چھوڑنے کا انجام | صاحبو! جب انسان دین چھوڑتا ہے تو عقل بھی رخصت ہو جاتی ہے لوگوں کا یہ عام خیال ہے کہ کنواری کی حفاظت کی زیادہ ضرورت ہے بیاہی ہوئی کی نگہبانی کی ضرورت نہیں۔ اور یہ خیال ہندوؤں سے ماخوذ ہے اس کا منشا یہ ہے کہ اگر کنواری سے کوئی بات ہو جائے تو اس میں بدنامی اور رسوائی ہوتی ہے اور بیاہی سے کوئی بات سرزد نہ ہو تو بدنامی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کے تو شوہر ہے اسی کی طرف نسبت کی جائے گی مگر یہ خیال محض جہالت پر مبنی ہے اگر عقل سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کنواری کی حفاظت کی اتنی ضرورت نہیں جتنی بیاہی ہوئی کے لئے ضرورت ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ کنواری کو قدرتی طور پر بھی شرم و حجاب بہت ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ایک طبعی مانع موجود ہے اس کی زیادہ نگہبانی کی ضرورت نہیں اور بیاہی کا حجاب چونکہ کم ہو جاتا ہے اس کی طبیعت کھل جاتی ہے مانع طبعی اس کے ساتھ نہیں رہتا اس کی عفت و عصمت محفوظ رکھنے کے لئے بہت بڑی نگہبانی کی ضرورت ہے نیز کنواری کو علاوہ مانع طبعی کے خوف فحشیت بھی زیادہ ہوتا ہے اور بیاہی ہوئی کو اتنا خوف نہیں ہوتا۔ کنواری میں تو کوئی آڑ نہیں اور اس میں شوہر کی آڑ ہے اس کا فعل اس کی طرف منسوب ہو سکتا ہے۔ اس لئے بیاہی ہوئی کی طبیعت برے کاموں پر کنواری سے زیادہ مائل ہو سکتی ہے اس کی حفاظت کنواری سے زیادہ ہونی چاہیے مگر لوگوں نے اس کا اٹا کر رکھا ہے۔

عفت و عصمت کی حفاظت | وجہ یہ ہے کہ اس کی پردہ آجکل نہیں کی جاتی کہ عصمت و عفت محفوظ رہے صرف اپنی بدنامی اور رسوائی کی پردہ کی جاتی ہے سو چونکہ کنواری میں بوجہ کوئی آڑ نہ ہونے کے بدنامی کا قوی اندیشہ ہے۔ اس کی نگہبانی تو کی جاتی ہے اور بیاہی ہوئی میں ایک آڑ موجود ہے اس لئے بدنامی کا خوف کم ہے۔

اس کی حفاظت کم کی جاتی ہے۔ اسی خیال کی بنا پر رخصت کے وقت ماں باپ کچھ خیال نہیں کرتے کہ یہ وقت مناسب ہے یا نہیں جب چاہیں بارات کے ساتھ کر دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک تو حفاظت کا وقت کنواری تک تھا وہ اب ختم ہو چکا ہے چاہے راستے میں ڈاکو ہی مل جائیں بھلا لڑکے والوں کو تو کیا ضرورت پڑی ہے کہ ان باتوں پر خیال کریں مگر لڑکی والوں کو تو سمجھ کر رخصت کرنا چاہیے۔ یہ خرابیاں ہیں بارات میں جن کی وجہ سے بارات کو منع کیا جاتا ہے اور میں جو پہلے باتوں میں جایا کرتا تھا جب تک میری سمجھ میں خرابیاں نہ آئی تھیں اب میں ان رسوم کو بالکل حرام سمجھتا ہوں۔ اور اگر تمہاری سمجھ میں نہ آویں تو اصلاح رسوم دیکھو ان ہی رسوم کے روکنے کی وجہ سے ایک گاؤں کا آدمی مجھ سے کہنے لگا کہ یوں سنا ہے کہ تمہارے مسئلے کڑے بہت ہیں۔ میں نے کہا مسئلے تو ایسے ہی ہونے چاہئیں جن میں احتیاط ہو تو حقیقت میں میرے مسئلے کڑے نہیں۔ مگر خدا نے میرے قلم سے بعض باتوں کی خرابیاں ظاہر کر دیں جو دوسروں نے ظاہر نہیں کیں۔ اس لئے مجھے لوگ سخت مشہور کرنے لگے۔

دلہن کی حفاظت | غرض اگر دلہن کی حفاظت کے لئے بارات ہی ہوتی ہے تو متفرق ہو کر کیوں لوٹتے ہیں حتیٰ کہ بعض دفعہ دلہن اور کھار اکیلے رہ جاتے ہیں اگر کوئی کہے کہ دولہا تو دلہن کے ساتھ ہوتا ہے تو وہی حضرت کون سے بہادر ہوتے ہیں کیونکہ آجکل رائے یہ ہے کہ شادی جلدی ہونی چاہیے کیونکہ اب عفت و دیانت طبائع میں نہیں رہی جو پہلے تھی اب زیادہ ضبط کی ہمت نہیں ہوتی۔ غرض آجکل دولہا صاحب کو خود حفاظت کی ضرورت ہے اگر کہیں چور یا ڈاکو چلا آوے تو پہلے دولہا صاحب ڈولے میں گھسیں گے بعض دنہ دولہا اور دلہن اور دو چار عزیزوں نے ایک گاؤں میں قیام کیا اور بارات آگے چلی گئی یہ لوگ حفاظت کے لئے تھے۔ لہذا اب بارات کو چھوڑ دینا چاہیے۔

(دعوات عبدیت حصہ ششم وعظ عضل الجاہلیت ص ۵۵)

۱۷۔ شوہر کے مرنے کے بعد شوہر والوں کا عورت کے نکاح میں اپنا حق سمجھنا غلط ہے

بعض مسلمان قوموں میں یہ آفت ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد عورت میں شوہر والے اپنا حق

سمجھتے ہیں یعنی ماں باپ اس کے مالک نہیں رہتے بلکہ دیو رخسہ مالک ہو جاتے ہیں بلکہ وہ عورت خود بھی اپنی مالک نہیں رہتی نہ وہ خود کہیں اپنا نکاح کر سکے نہ ماں باپ کر سکیں۔ بلکہ جہاں جیٹھ وغیرہ چاہیں وہاں ہوگا۔ مثلاً خسر تو چاہے کہ اپنے چھوٹے بیٹے سے نکاح کر دوں اور باپ چاہے کہ غیر جگہ کرے تو باپ کا کچھ زور نہ چلے گا اور تمنایہ ہوتی ہے کہ بہو گھر سے باہر نہ جائے چنانچہ ایک عورت نے اپنی بہو کا نکاح ایک بچے سے کر دیا۔ انیسویں تو یہ ہے کہ عورتوں کی عقل پر تو پردہ پڑا ہی تھا مردوں کی عقل بھی ماری گئی۔ ان کو بھی اس کا کچھ خیال نہیں ہوتا۔ اور اس کو اپنے نزدیک ہلکی بات سمجھتے ہیں اس لئے میں نے اس وقت یہ آیت پڑھی جس میں رشاد ہے کہ ایسا دستور کہ عورتوں کو اس طرح سے اپنی ملک میں سمجھیں ناجائز ہے۔ فرماتے ہیں۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمُ أَنْ تَرْتَوُوا النِّسَاءَ كُرْهًا وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِيَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْنَهُنَّ** **إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبَيَّنَةٍ وَعَاشِرُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِتْنَةً خَيْرًا كَثِيرًا**۔ ترجمہ :- اے ایمان والو تم کو یہ بات حلال نہیں کہ عورتوں کے جبراً مالک ہو جاؤ اور ان کو اس غرض سے مقید مت کرو کہ جو کچھ تم لوگوں نے ان کو دیا ہے، اس میں کا کوئی حصہ وصول کر لو۔ مگر یہ کہ وہ عورتیں کوئی صریح ناشائستہ حرکت کریں اور ان کے ساتھ خوبی کے ساتھ گزران کیا کرو۔ اور اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم ایک شئی کو ناپسند کرو۔ اور اللہ تعالیٰ اس میں بڑی منفعت رکھ دے۔

یہ ہے اس کا ترجمہ، دیکھئے کہ قرآن میں اس رسم کو مٹایا گیا ہے یا نہیں اور اگر ہاکی قید واقعی ہے احترازی نہیں کیونکہ عورتیں اس دراشت سے راضی بھی نہ ہوتی تھیں اگر وہ راضی ہوں تب بھی حرہ کی ملکیت جائز نہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے تو اس کی زبان سے اذن نکاح کہلوا یا تھا تو یہ زبان سے کہلوانا بھی محض نام کرنے کو ہے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ بے پوچھے نکاح کر دیا۔ کیونکہ مسئلہ یہ ہے کہ بیوہ کا نکاح بدون زبان کے کہے۔ جائز نہیں ہوتا۔ طیب خاطر کا اس میں خیال نہیں کیا جاتا۔

اور بعض مرتبہ بے پوچھے ہی نکاح کر دیتے ہیں۔ نالوثہ میں ایک بیوہ کا نکاح ہوا اور دیو بند رخصت ہوئی وہ راضی نہ ہوتی تھی تو اس کو جبراً بات کے ساتھ کر دیا اور کہہ دیا کہ وہاں لے جا کر اس کو راضی کر لینا۔ اور یہاں ایک نکاح عدت میں

ہوا۔ جب میں نے پوچھا کہ کیا یہ وہابیات کیا تو کہنے لگے کہ نکاح کی نیت سے نہیں کیا۔ ذرا بارٹھ لگا دی تاکہ کسی اور جگہ سے نکاح نہ کر سکے۔ مگر اس کم بخت نے بعد عدت کے پھر بھی نکاح نہیں کیا۔ اس پر لوگ شکایت کرتے ہیں کہ وہاں آگئی ہے طاعون آگیا۔ جب لوگ اس طرح حلال کے پردے میں حرام کاری کریں تو طاعون کیوں نہ آئے۔ صابو! ع

ع از زنا افتد و با اندر جہاں

سو بعض لوگ تو زبان سے بھی نہیں کہلواتے اور بعض لوگ زبان سے گو کہلواتے ہیں مگر کبھی بھی اس پر تو ظلم ہوا۔ چونکہ یہ لوگ اپنے آپ کو مالک سمجھ کر کہلواتے ہیں دوسری خرابی اس میں یہ ہوئی کہ ماں باپ کو مالک نہیں سمجھتے حالانکہ خدا اور رسول کے بعد ماں باپ کا حق ہے اٹکا۔ (وعظ ایضاً ص ۵۸)

۱۸۔ مائتوں بھٹانے کی رسم ناجائز ہے

اپنی دلہن کو دیکھئے کہ سال بھر تک منہ پر ہاتھ رہتے ہیں۔ شادی کے زمانے میں تو کبھی وہ اپنے منہ سے پانی تنک بھی مانگ بیٹھے تو چاروں طرف سے غل چ جائے کہ ہے ہے کسی بے حیائی کا زمانہ آگیا۔ بلکہ شادی کے پہلے ہی سے یہ مصیبتیں اس بے چاری پر آ جاتی ہے۔ اول سخت قریطینہ میں رکھی جاتی ہے جس کو آپ کی اصطلاح میں مایوں بیٹھنا کہتے ہیں ایک کو ٹھری میں بند کر دی جاتی ہے جہاں ہوا تنک اس کو نہیں پہنچتی۔ سارے گھر سے بولنا بند ہو جاتا ہے اپنی ضروریات تک میں دوسرے کی محتاج ہو جاتی ہے۔ اپنے آپ پاخانہ پیشاب کو نہیں جاسکتی۔ یہاں تنک بھی غنیمت تھا کہ ان رسموں کی بدولت دنیا کی ہزنین بھگتیں۔ لیکن غضب یہ ہے کہ اس قریطینہ میں نماز تک نہیں پڑھتی۔ کیونکہ اپنے منہ سے پانی مانگ نہیں سکتی۔ اور اوپر والیوں کو اپنی ہی نماز کی پرواہ نہیں۔ اس کی کیا خبریں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ نماز جو کہ مرتے وقت بھی معاف نہیں چنانچہ کتاب میں لکھا ہے کہ ایک شخص کشتی میں سوار ہوا کشتی لوٹ جائے اور یہ شخص ڈوبے لگے اور وقت نماز کا آگیا ہو تو اس شخص کے ذمے واجب ہے کہ اسی غوطہ کرانے کی حالت میں نماز کی نیت باندھ لے پھر چاہے بچے چاہے ڈوبے، لے زنا کی وجہ سے جہاں میں وہاں پھیلی ہے۔

نبردستی نکاح

دیکھئے نماز کی یہ تاکید ہے مگر اس قرینہ میں قضا کی جاتی ہے کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ باوجود ان منکرات کے یہ رسمیں جائز ہو سکتی ہیں۔ حاشا وکلا۔ دین سے قطع نظر عقل کے بھی تو یہ بات خلاف ہے کہ اس کو آدمی سے حیوان بلکہ جاد بنا دیا جائے اس کا کھانا پینا بند کیا جاتا ہے محض اس لئے کہ اگر کم کھانے کی عادت نہ ہوگی تو سسرال میں کھاویگی۔ پھر پاخانہ جاویگی۔ جو قانون جیلا کے خلاف ہے حتیٰ کہ بہت جگہ یہ دیکھا گیا ہے کہ نائے کرتے کرتے لڑکیاں بیمار ہو گئیں لاجول لا قوۃ الا باللہ۔ جب دین کو کوئی چھوڑتا ہے تو عقل بھی سلب ہو جاتی ہے شادی کی تقریبات کو کہاں تک بیان کر دوں۔ جس رسم کو چاہے دیکھ لیجئے وہ دین کے خلاف ہونے کے ساتھ عقل سے بھی خارج ثابت ہوگی (وعظ منازعہ الہوی ص ۶۲ دعوات عبدیت حصہ ہفتم)

۱۹۔ چالیسویں غیرہ کا کھانا محض برادری کی خوشنودی کے لئے کیا جاتا ہے

برادری کا کھانا فقط اسی واسطے ہوتا ہے کہ یہ دیکھتے ہیں کہ فلا نے کیا کیا کھلایا تھا۔ غنی میں دیکھئے کہ زبان سے تو یہ کہا جاتا ہے کہ ثواب کے لئے کھانا کھلاتے ہیں مگر امتحان یہ ہے کہ اگر اس شخص سے خلوت میں یہ کہا جائے کہ قاعدہ یہ ہے کہ جس صرف میں زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس میں روپیہ دینے سے زیادہ ثواب ملتا ہے اور جن کی تم دعوت کرتے ہو یہ کھاتے پیئے یعنی ہیں۔ تم یہ دعوت کا روپیہ فلاں مدرسہ میں فلاں مسجد میں دید و یا فلاں ابرودا غریب آدمی کو چیکے سے دید و اور اس کا ثواب میت کو بخش دے تو اب دیکھئے اس شخص کے دل پر کیا گذرتی ہے یہی کہے گا کہ سبحان اللہ! روپیہ بھی خرچ ہوا اور کسی کو خبر بھی نہ ہوئی تو بتلائیے کہ یہ صاف ریا ہے کہ نہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ سب دکھلا دے کے لئے کیا جاتا ہے۔ جب یہ حال ہے تو ثواب کہاں سے ہوگا۔ اور جب اس کو ثواب نہ ملا تو میت کو کیا بخشے گا۔ کیونکہ ثواب پہنچانے کا خلاصہ یہ ہے کہ تم نے ایک نیک کام کیا۔ اور جو ثواب اس کا تم کو ملا وہ تم نے کسی دوسرے کو بخش دیا۔ اور جب یہاں ہی صفر ہے تو وہاں کیا بخشو گے۔

لے دیکھا دا

ایک حکایت اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ رامپور کے ایک شخص کسی جھوٹے پیر سے مرید ہو گئے کچھ دنوں کے بعد کسی نے ان سے پوچھا۔ کہو پیر صاحب سے کیا فیض پہونچا۔ یہ سچے صاف آدمی کہا۔ جب پانی سفادہ ہی میں نہ ہو تو بدھنے میں کہاں سے آوے تو یہی صورت ہے ثواب ملنے کی۔ پہلے کرنے والے کو ملتا ہے پھر وہ دوسرے کو دیتا ہے تو جب اسی کو نہ ملا تو کسی کو کیا دے گا گویا سارا روپیہ ضائع ہو گیا اور یہ تو سب دعوے ہی دعوے ہیں کہ ثواب کے لئے کھانا کھلاتے ہیں۔ صرف برادری سے شرم کر کیا جاتا ہے۔ اور لوگ اس کا زبان سے اقرار بھی کرتے ہیں۔

ایک گوجر کا واقعہ کیرانہ میں ایک گوجر بیمار تھا۔ اس کا لڑکا حکیم صاحب کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ حکیم جی اس مرتبہ تو کسی طرح میرے باپ کو اچھا ہی کر دو مجھے اس بڑھے کے مرنے کا تو غم نہیں مگر آجکل چاول بہت گراں ہیں برادری کو کھانا کھلانا تو مشکل ہوگا وہ بیمار تو سیدھا تھا۔ اس نے سچی بات کہدی۔ ہم باوضع ہیں زبان سے ظاہر نہیں کرتے مگر دل میں سب کے یہی ہے۔ یہ تو کھلانے والوں کی حالت ہے بانی کھانے والے وہ تو پورے ہی کجبا ہیں کہ ایسے غم میں بجائے ہمدردی کے اور الٹا اس پر بار ڈالتے ہیں

ایک رئیس زادہ کی حکایت اسی باب میں ایک صاحب حکایت بیان کرتے تھے کہ ضلع بلند شہر میں ایک رئیس کا انتقال ہو گیا چالیسویں دن رسم ادا کرنے کو ان کے تمام عزیز و قریب دوست، حباب، ہاتھی گھوڑے لیکر جمع ہوئے رئیس زادے نے سب کی خاطر مدارات کی عمدہ عمدہ کھانے پکوائے۔ جب کھانے کا وقت آیا اور تمام دسترخوان پر جمع ہو گئے اور سب کے آگے کھانے چن دیئے گئے۔ رئیس زادے نے کھڑے ہو کر تقریر کی کہ صاحبو! کھانے سے پہلے میری ایک بات سن لیجئے۔ پھر کھانا شروع کیجئے گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کو گ اس وقت کس لئے جمع ہوئے ہیں چونکہ مجھ پر ایک بڑا حادثہ گذرا ہے کہ میرے والد صاحب کا سایہ میرے سر پر سے اٹھ گیا ہے اس لئے آپ لوگ میرے ساتھ ہمدردی کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں تو کیا ہمدردی اسی کا نام ہے کہ میں تو غم میں مبتلا ہوں اور اس کی وجہ سے نہ کھانے کا رہا نہ پینے کا۔ اور آپ لوگ استیں چڑھا کر عمدہ عمدہ کھانے کھانے بیٹھ گئے۔ تم کو شرم نہیں آتی۔ پس اب کھانا شروع کیجئے۔ مگر اب کون کھاتا۔ تمام شرفاء مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔ اور ایک جگہ جمع ہو کر مشورہ کیا کہ واقعی یہ چالیسویں کی رسم

اٹھا دینے کے قابل ہے۔ چنانچہ سب نے متفق ہو کر اس رائے پر دستخط کر دیئے اور وہ تمام کھانا غریبوں کو تقسیم کر دیا گیا۔

حاصل کلام حقیقت میں اگر غور کرو تو یہ سارے کھانے جو برادری کو کھلائے جاتے ہیں اسی قسم کے ہیں جن سے کھلانے والوں کو بجز تکلیف کے اور کھانیوالوں کو بجز بے حیائی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اب بھی لوگ مولویوں ہی کو بدنام کرتے ہیں کہ یہ ایصالِ ثواب سے منع کرتے ہیں۔ صاحبو! ایصالِ ثواب سے کوئی منع نہیں کرتا۔ البتہ بے ڈھنگے پن سے منع کیا جاتا ہے۔ دیکھو اگر کوئی قبلہ کی طرف پشت کر کے نماز پڑھے تو اس کو منع کریں گے یا نہیں اگر شریعت کے موافق عمل ہو تو پھر دیکھو کون منع کرتا ہے جس کی بڑی شرط یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ ہو یعنی ثواب کی نیت سے کیا جائے (وعظ "الدين الخالص" ص ۴۵)

۲۰۔ تبرکاتِ نبویؐ کی زیادت

(۱) تبرکاتِ نبویؐ میں ایک تو وہی زیادتی کی جا رہی ہے جو اور بدعات میں ہے کہ اس کو لوگوں نے عید بنا رکھا ہے اس باب میں اکثر لوگ یہاں تک بعض طلباء بھی شک میں ہیں۔ یوں سمجھتے ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے جبہ نبویؐ کی زیارت باعثِ برکت ہے اگر کوئی صرف زیارت کی نیت سے جائے تو کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔ مجھ سے ایک طالب علم نے جن کا مکان جلال آباد میں ہے اور جبہ شریف کے مکان کے پاس ان کی دوکان ہے سوال کیا کہ میں دوکان پر بیٹھ کر جبہ کی زیارت کروں گا مگر میں نے اس کی اجازت نہیں دی کیونکہ وہ مجمع بالکل میلوں، عرسوں کی طرح ہوتا ہے۔ تاریخ کی تحسین ہوتی ہے دعوت ہوتی ہے دور سے آدمی آتے ہیں عورتوں کا اجتماع بھی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جو نماز بھی نہیں پڑھتے۔ زیارت کو آتے ہیں حالانکہ زیارت جبہ شریف کی فضیلت قبر شریف کے برابر نہیں ہو سکتی۔ حدیث: لَا تَتَّخِذُوا قُبُورِي عِيدًا (میری قبر پر عید کا سا ہجوم نہ لگاؤ) سے اس کی نفی ہو گئی کیونکہ جبہ شریف کی فضیلت قبر شریف کے برابر نہیں ہو سکتی۔ گو اس میں یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ مثلِ یومِ ولادت وغیرہ کے اس میں بھی تبدل ہو گیا۔ اگرچہ عدم تبدل کا یقین بھی نہیں۔ مگر خبرِ جوبات دل میں نہیں اس کو زبان پر بھی نہ لانا چاہئے مگر ایک دوسری بات مابہ الامتیاز یہاں بھی موجود ہے کہ اس وقت وہ ملبوس جسداہر سے

ماس (چھوڑا) نہیں اور قبر شریف کو شرفِ ماس حاصل ہے اسی لئے جبہ نبویؐ کو کسی نے عرش سے افضل نہیں کہا۔ پس جب قبر کا عید بنانا حرام ہے تو ملبوس شریف کو عید بنانا کس طرح جائز ہوگا۔

موتے مبارک کہیں کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موتے مبارک اس وقت تک موجود ہیں عید بنانا ان کی بھی جائز نہیں کیونکہ اگرچہ بظاہر خیال کر کے موتے مبارک جزو بدن ہے قبر سے افضل معلوم ہوتا ہے مگر قبر میں الضال اور ماس کی ایسی فضیلت موجود ہے جو موتے مبارک کو بالفعل حاصل نہیں۔ اس لئے دونوں خیر مساوی ہوئے۔ موتے مبارک جزو بدن ہیں ماس نہیں اور قبر شریف جزو بدن نہیں ماس (ملا ہوا) ہے تو دونوں برابر ہوئے اور ایک مساوی سے دوسرے مساوی کا حکم معلوم ہو سکتا ہے پس حدیث لَا تَتَّخِذُوا قُبُورِي عِيدًا سے موتے مبارک کو عید بنانا حرام ہو گیا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غایتِ بلاغت ہے کہ آپؐ نے قبر کو ذکر میں اختیار فرمایا۔ جس سے ملبوس اور شعر وغیرہ سب کے احکام خود بخود معلوم ہو گئے علاوہ انیس صحابہ اور سلف صالحین نے عید منانے کو بھی اختیار نہیں کیا۔ حالانکہ ان کے پاس ہم سے زیادہ تبرکاتِ نبویہ موجود تھے اور ان کو ہم سے زیادہ ثواب کے کاموں میں سبقت تھی اگر یہ کوئی خیر ہوتی تو سلف میں اس کی کچھ تو اصل ہوتی اب صرف یہ سوال رہ گیا کہ صحابی عید کی طرح اجتماع نہ تھا تو آخر تبرکات کے ساتھ ان کا برتاؤ کیسا تھا تو اس کے لئے میں نے چند احادیث ایک پرچہ پر لکھ لی ہیں کیونکہ ان کا بلفظ یاد رکھنا دشوار تھا۔

تبرکاتِ نبویؐ کے سلسلہ میں حدیثیں اس وقت ان کو نقل کئے دیتا ہوں۔ عن عثمان بن عبد اللہ بن وہب قال نا سلفی

اهلی الی ام سلمۃ بقدر من ماء وکان اذا اصاب الانسان عین او شیئاً بعث الیہا مخصیۃ لہا فاخرجت من شہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکانت تمسک فی الجبل من فضۃ فخصخصت لہ فشرب منه قال فاطلعت فی الجبل فرأیت شعرات حمراء۔ (رواہ البخاری) عثمان بن عبد اللہ بن وہب سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے گھر والوں نے حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس ایک پیالہ پانی کا دیکر بھیجا اور زنا عہد تھا کہ جب کسی انسان کو نظر وغیرہ کی تکلیف ہو تو حضرت ام سلمہؓ کے پاس پانی کا پیالہ بھیج دیتا۔ ان کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ بال تھے جن کو انہوں نے

چاندی کی تلکی میں رکھ رکھا تھا۔ پانی میں نالوں کو بلا دیا کرتی تھیں اور وہ پانی بیمار کو پلا دیا جاتا تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے جو جھک کر تلکی کو دیکھا تو اس میں چند سرخ بال تھے۔ اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ ایک صحابیہ کے پاس تلکی میں رکھے ہوئے تھے۔ جس کے ساتھ یہ برتاؤ کیا جاتا تھا کہ بیماروں کی شفا کے لئے اس کا غسالہ پلا دیا جاتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خضاب کے بارے میں اختلاف ہوا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال پچنے لگے تھے جس سے دیکھنے والوں کو خضاب کا شبہ ہوتا تھا۔ ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی خضاب نہیں کیا۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کل سفید بال قریب ۲۰ کے تھے یا کچھ زائد۔

جسبہ مبارک کا تذکرہ | عن اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا انہا اخرجت جبۃ طیالیسیۃ کسراۃ لینیۃ دیباج و فرجیہا مکفوفین بالدیباج و قالت ہذہ جبۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کانت عند عائشۃ فلما قبضت قبضتہا۔ وکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یلبس بہا فنحن نغسلہا للمرضی نستشفی بہا۔ (رد الواعظ)

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک جبہ طلیسانی کوڑی نکالا جس کے گریبان اور دونوں چاک پر ریشم کی سجاوٹ لگی ہوئی تھی اور کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا ان کی وفات کے بعد میں نے اسے لے لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پہنا کرتے تھے ہم اس کو پانی میں دھو کر وہ پانی بیماروں کو پلا دیتے ہیں شفا حاصل کرنے کے لئے۔

موئے مبارک سے متعلق حدیث | وعن انس قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتی منی فاتی الحجۃ و ماہا ثم انی منزلۃ بمنی وخر نسکۃ ثم دعا بالحلاق وناول الحائق شقۃ الایمن فحلقۃ ثم دعا بالطلحۃ الانصاری فاعطاہ ایاہ ثم ناول الشق الایسر فقال احلق فحلقۃ فاعطاہ ایاہ فحلقۃ فقال اقسمۃ بین الناس۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع میں عرفات سے منیٰ میں تشریف لائے تو حجرہ عقبہ کے پاس پہنچے اور اس کی رومی کی پچھ مٹی میں جو مکان آپ کے لئے مقرر تھا اس میں تشریف لائے۔ اور قربانی کے جانوروں کو ذبح کیا۔ پھر حلاق (دانی) کو بلایا اور

اس کو سر کا داہنا حصہ اول دیا اس نے داہنے حصے کو مونڈا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کو بلایا اور وہ بال ان کو عطا کئے پھر نائی کو سر کا بایاں حصہ دیا۔ اور فرمایا مونڈو اس نے بائیں حصہ کو بھی مونڈا آپ نے وہ بال بھی ابو طلحہ انصاری کو دیئے اور فرمایا کہ اس کو لوگوں میں تقسیم کرو۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت مقدار میں اپنے موئے مبارک صحابیہ میں تقسیم فرمائے ہیں اور ظاہر ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم شرفاً و عزاً منتشر ہو گئے تھے اور اگر کہیں موئے مبارک پایا جاوے تو جلدی سے اس کا انکار نہ کر دیا جائے بلکہ اگر سند صحیح سے اس کا پتہ معلوم ہو جائے تب تو اس کی تعظیم کی جائے ورنہ اگر یقینی دلیل افتراء و اختراع کی نہ ہو تو سکوت کیا جائے یعنی نہ تصدیق کی جاوے نہ تکذیب۔ مشتبہ امر میں شریعت نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے۔

لباس مبارک | وعن ام عطیۃ فی قصۃ غسل زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و تکفینہا انہا قالت فالتقی حققی نقال اشعرنہا ایاہ فقال الشیخ فی اللہجات و ہذا الحدیث اصل فی البرکۃ بانثار الصالحین ولباسہم۔

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا حضرت زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل و کفن کے واقعہ میں روایت کرتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا تمہ بند ہمارے پاس ڈال دیا کہ اس کو مرحومہ کے بدن سے ہماس کر کے پہناؤ یعنی سب سے نیچے اس کو رکھو تا کہ اس کی برکت بدن سے متصل رہے۔ حضرت شیخ عبدالحق رحمہ اللہ لمعات شرح مشکوٰۃ میں اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث آثار و ملبوسات صالحین سے برکت لینے میں اصل ہے معلوم ہوا کہ تبرکات سے برکت حاصل کر نیکا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ بعد موت کے اس کو کفن میں رکھ دیا جائے مگر اس سے قرآن اور دعاؤں کی کتابوں کا کفن میں رکھنا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ اس میں ان کا احترام باطل ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن کے ساتھ ناپاکی کا اتصال حرام ہے۔ اور بدن میت چند روز کے بعد پھولے پھٹے گا وہ نجاست قرآن کو بھی لگے گی۔ اسی طرح وہ کتابیں جن میں دعائیں اور اللہ رسول کا نام جا بجا ہے قابل احترام ہیں بلکہ الفاظ و حروف مطلقاً قابل احترام ہیں بلکہ سادہ کاغذ بھی بوجہ آلہ علم ہونے کے قابل احترام ہے۔ بعض لوگ فرعون و ہامان کا نام لکھ کر اس پر جوتے مارتے ہیں۔ یہ بالکل لغو و مہمل حرکت ہے اس پر تو بس نہ چلا۔ الفاظ کی ہی بے حرمتی پر بہادری دکھائی مگر ان سب کے ساتھ ان کو عید نہ بنانا چاہیے کیونکہ سمجھتے کی بات ہے کہ ان چیزوں کی قدر کس لئے ہے۔ اسی

تاکہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چیزیں ہیں پھر احکام بھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں ان کی بھی توقد رکھنی چاہئے ان میں بھی تو برکت ہے اس برکت کو بھی تو لینا چاہئے۔ غرض وہ جو سوال کیا گیا تھا کہ سلف صالحین کا تبرکات کے ساتھ کیسا برتاؤ تھا۔ ان روایتوں سے اس کا جواب معلوم ہوگا۔ انہی کے موافق ہم کو بھی عمل کرنا چاہئے اس سے زیادہ تعدی نہ کرنا چاہئے۔

تبرکات نبوی کیساتھ غلو بعض لوگ یہاں تک غلو کرتے ہیں کہ جبہ شریفہ کے لئے نذریں مانتے ہیں فقہاء نے اس کو حرام لکھا ہے۔ کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کے لئے نہیں ہو سکتی عبادت خالق جل وعلی شانہ کے لئے خاص ہے۔ بحرائق میں اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ نذر ماننا مخلوق کے لئے سب کے نزدیک اتفاقاً حرام ہے نہ وہ نذر منعقد ہوگی اور نہ اس کا پورا کرنا ذمہ میں واجب ہوگا۔ اور وہ حرام بلکہ سخت حرام ہے مجاوروں کو اس کا کھانا لینا اور اس میں کسی قسم کا تصرف کرنا جائز نہیں۔ (وعظ المحجور ص ۲۱)

تبرکات کام نہیں آتے (ب) تبرکات کے بھروسہ پر کوئی نہ رہے۔ بدون ایمان کے سب بیکار ہیں چنانچہ دیکھ لو کہ ابن ابی کے پاس کتنے تبرکات جمع ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قمیص مبارک اس کے کفن میں دیا۔ بمغلیہ بات کس کو نصیب ہوتی ہے آجکل کوئی بہت کریم غلام کعبہ کا ٹکڑا رکھ دیکھا۔ مگر غلام کعبہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قمیص سے کیا نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد اطہر عرش و کعبہ سب سے افضل ہے اور اگر غلام کعبہ کو قمیص نبوی کے برابر مان بھی لیا جائے تو یہ دولت کس کو نصیب ہو سکتی ہے کہ حضور کا لعاب مبارک اس کے منہ میں پڑے۔ عبد اللہ بن ابی کے مرنے کے بعد آپ نے اپنا لعاب مبارک بھی اس کے منہ میں ڈال دیا تھا۔ وہ تو آپ کا جزو تھا جس کی برکت لباس سے بھی زیادہ ہے۔ پھر آپ نے اس کے جنازے کی نماز پڑھی گویا اس کے دُعا مغفرت فرمائی۔ بمغلیہ شرف آج کس کو نصیب ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو لے کر اس کے جنازہ کی نماز پڑھیں مگر باوجود ان تمام باتوں کے عبد اللہ بن ابی کو ان تبرکات سے کچھ بھی نفع نہ ہوا کیونکہ وہ ایمان سے محروم تھا جن تعالیٰ صاف فرما دیا۔ انہم کفروا باللہ وبرسولہ وما تواوہم فاسقون۔

(الرفع والوضع ص ۳۲)

۲۱۔ رمضان شریف کے لئے نیک کاموں کا روکے رکھنا؟

بعض لوگ رمضان سے پہلے بعض نیک کاموں کو روکے رکھتے ہیں مثلاً کسی کی زکوٰۃ کا سال شبان میں پورا ہو گیا اب وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتا رمضان کے انتظار میں روکے رکھتا ہے چاہے رمضان میں اس کو توفیق ہی نہ ہو۔ روپیہ چوری ہی ہو جائے یا رمضان کے انتظار میں محتاج کا قلیہ ہی ہو جائے یا درکھو شارع کا اس تعجب سے ہرگز یہ مطلب نہیں کہ رمضان کے انتظار میں نیک کاموں کو روکا جائے بلکہ شارع کا مقصود تاخیر عن رمضان سے روکنا ہے کہ اگر رمضان تک کسی کو توفیق نہ ہوئی ہو تو رمضان میں ہرگز دیر نہ کرے جو کرنا ہو کر ڈالے۔ تقدیم علی رمضان سے روکنا مقصود نہیں۔ وشتان بینہا۔ یعنی ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے مگر کم کہی نے یہ نتیجہ پیدا کیا کہ لوگ رمضان میں خرچ کرنے کے لئے فضائل اور ثواب سن کر اس کے انتظار میں طاعات کو روکنے لگے خوب سمجھ لو کہ تحصیل فی الخیر میں خود بہت بڑا ثواب ہے اور وہ اتنا بڑا ثواب ہے کہ رمضان کے پہلے جو تم خرچ کر دو گے تو گو اس میں کمابہ نسبت رمضان میں خرچ کرنے کے ثواب کم ہو مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کیفاً تقریباً الی اللہ وہ تحصیل بہتر ہے اور اس درجہ میں اس کا ثواب رمضان کے ثواب سے بڑھ جائے گا۔ مجھے کوئی تو اطمینان ہے جو میں شرح صدر کے ساتھ اس مضمون کو بیان کر رہا ہوں۔ بس قسم سے زیادہ اطمینان دلانے کا ذریعہ میرے پاس کوئی نہیں تمہیں کیا خبر ہے کہ شبان میں اگر تم کو عرب کو زکوٰۃ دیدیتے تو اس وقت اس کے دل سے کسی دعا نکل جاتی ہیں جس کے سامنے شہر رمضان میں بھی سج ہیں یہی بات لوگوں کو معلوم نہیں یا درکھو جب زکوٰۃ کا سال پورا ہو جائے اس کے بعد تاخیر کرنے میں فقہاء

نیک میں تاخیر نہیں کرنا چاہیے

کا اختلاف ہے کہ اس تاخیر سے گناہ ہوتا ہے یا نہیں۔ بعض وجوب علی الفور کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک تاخیر سے گناہ ہوتا ہے اور بعض وجوب علی التراخی کے قائل ہیں ان کے نزدیک گناہ نہیں ہوتا۔ بس احتیاط اسی میں ہے کہ وجوب کے بعد دیر نہ کرے تاکہ سب کے نزدیک گناہ سے محفوظ رہے۔ پھر اگر رمضان کے انتظار میں صدقات کا رونا کنا موجب ثواب ہوتا تو شریعت نے کہیں تو یہ کہہ دیا ہوتا کہ رمضان سے اتنے دن پہلے تمام صدقات کو روک دو۔ جب

شرعیات نے کہیں نہیں کہا تو اب ہمارا ایسا کرتا یہ زیادتی فی الدین اور بدعت ہے کہ جس کام کے لئے شرعیات نے ثواب بیان نہیں کیا تم اس میں ثواب سمجھ کر کرتے ہو۔ یہ مقاومت و مقابلہ ہے حکم شرعی کی بے مگر چونکہ اب تک جہل میں مبتلا تھے علم نہیں تھا اس لئے اُمید ہے کہ گنہ گار نہیں ہوتے۔۔۔ ہوں گے ہاں اب جو لوگ ایسا کریں گے وہ گنہ گار ہوں گے، کیونکہ اب مطلع صاف ہو گیا۔ (تقلیل المنام ص ۳)

۲۲۔ عید میلاد النبی کی دلائل وبعہ سے تردید

جاننا چاہئے کہ عید میلاد النبی کے نام سے جو ایک رسم شائع ہوئی ہے اس کے متعلق دو کلام ہیں ایک تو اس کے نام مشروع ہونے کے متعلق دلائل۔ دوسرے مخالفین کے دلائل کا جواب اس کے بعد سمجھتے کہ شریعت کے دلائل چار ہیں۔ کتاب، سنت، اجماع، قیاس۔ انشاء اللہ چاروں سے گفتگو کی جاوے گی۔

میلاد کی تردید قرآن میں

اول کتاب اللہ کو لیجئے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ ام لہم شکر کا شکر عوا لہم من الدین ما کم یا ذن بہ اللہ۔ یعنی کیا ان کے شکر کے لئے ہیں کہ انھوں نے ان کے لئے دین کی وہ بات مقرر کر دی جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔ یہ آیت صاف بتلا رہی ہے کہ دین کی بات بدون اذن الہی یعنی بدون دلیل شرعی کسی کو مقرر کرنا مذموم و مستنکر ہے۔ یہ تو کبریٰ ہے اور صغریٰ یہ ہے کہ عید میلاد النبی دین ہی کی بات سمجھ کر بلا دلیل مقرر کی گئی ہے اور دلیل نہ ہونا جزئیاً تو ظاہر ہے کہ یہ امر شریعت میں نہیں ہے، امر مستحدث ہے۔ اگر احتمال ہے تو اس کا کہہ گے کسی کلیہ میں داخل کرتے ہوں گے بمفصل گفتگو تو ان کلیات کی جسمیں یہ اخل ہو سکتی ہے آگے آوے گی۔ باقی مجملہ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ سبب داعی اس کا قدیم ہے خواہ وہ فرج ہو یا اظہار شوکت اسلام ہو کہ وہ کبھی قدیم ہے بہر حال ان میں سے جو کبھی سبب ہو۔ تو ہم یہ کہتے ہیں کہ جب کہ یہ سبب حضور و صحابہ و خیر القرون کے زمانہ میں موجود تھا اور وہ حضرات قرآن و حدیث کو خوب سمجھنے والے تھے اور ایسا سمجھتے تھے کہ اس کو دیکھ کر اب اجتہاد کو جائز نہیں رکھا گیا۔ پس جب مسلم ہو چکا کہ وہ کتاب سنت کو ہم سے زیادہ سمجھنے والے تھے اور یہ اسباب بھی اس وقت موجود تھے، یعنی اظہار فرج اور شوکت اسلام کی اس لئے برا۔ نہ مکروہ۔ نہ نیکار تھا ہوا۔

وقت بھی ضرورت تھی بلکہ اس وقت سے زیادہ ضرورت تھی مگر ان حضرات نے اس پر عمل نہیں کیا پس معلوم ہوا کہ کسی کلیہ میں اس کا داخل کرنا صحیح نہیں اور یہ امر بالکل مستحدث اور جدید ہے کہ جس کی کچھ اصل نہیں اور بدعت کی حقیقت یہی ہے کہ غیر دین کو دین سمجھ کر کیا جائے اور اس کو یہ لوگ دین سمجھتے ہیں پس یہ بدعت واجب ترک ہیں یہ تو قرآن مجید سے اس کے متعلق کلام تھا۔

اب حدیث لیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ من احدث فی احرا ہذا ما لیس منہ فہو کاذب

میلاد کی تردید حدیث میں

یعنی جو شخص ہمارے اس دین میں وہ شئی نکالے جو اس میں سے نہیں۔ پس وہ واجب الرد ہے۔ جو تقریر آیت کے ذیل میں کی گئی ہے وہی یہاں بھی ہے۔ اور مراد نئی شئی سے وہ ہے جس کا سبب قدیم اور پھر اس وقت معمول بن نہ ہوئی ہو۔ باقی سبب جدید ہو۔ اور نیز وہ موقوف علیہ کسی مامورہ کی ہو۔ وہ مامنہ میں داخل ہو کر واجب ہے۔ اور دوسری حدیث لیجئے۔ مسلم کی روایت ہے۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تختصموا الیلة الجمعة بقیام من بین الیالی ولا تختصموا یوم الجمعة بصیام من بین الایام الا ان یکون فی یوم بصومہ احدکم یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب جمعہ کو اور راتوں میں سے شب بیداری کے ساتھ خاص مت کرو اور یوم جمعہ کو ایام میں سے روزہ کے ساتھ خاص مت کرو مگر یہ کہ اس دن میں کوئی تم میں سے پہلے سے روزہ رکھتا ہو۔ اس حدیث سے یہ قاعدہ کلیہ نکلا کہ جو شخص صوم منقول نہ ہو وہ منہی عنہ ہے یہ دوسری بات ہے کہ جمعہ کے روزہ روزہ رکھنا کیسا ہے ہمارے علماء نے دوسری دلیل مستقل سے جواز کا حکم دیا ہے اور نہی کو عارضی کہا ہے اس وجہ سے کہ روزہ رکھ کر وظائف جمعہ سے ضعیف نہ ہو جائے یہ فرعی گفتگو ہے۔ یہاں تو صرف اس قاعدہ کلیہ کا مستنبط کرنا مقصود ہے سو قاعدہ کی صحت میں مجوزین صوم جمعہ کو بھی کلام نہیں ہے غرض یہ قاعدہ کلیہ کو تخصیص غیر منقول دین کے اندر جائز نہیں صحیح ہے یہ تو کبریٰ ہے اب خاص یوم ولادت کی عید منانے کی تخصیص دیکھتے کہ یہ تخصیص کسی ہے ظاہر ہے کہ منقول نہیں اور نہ تخصیص عادی ہے بلکہ اس کو دین کی بات سمجھتے ہیں چنانچہ اس کے تارک کو ملامت کرتے ہیں اور بدین سمجھتے ہیں۔ اگر تخصیص عادی ہوتی تو ملامت نہ کرتے اور نہ ان کو بدین جانتے جیسے کسی کو عادت ملنے پہنے کی ہو تو اس کے تارک کو ملامت نہیں کرتے۔ بہر حال اس کو دین سمجھتے ہیں۔ پس یہ تخصیص دین میں ہوئی اور غیر منقول لے جس سے روکا گیا ہو۔

ہوتی۔ یعنی ہوا اور کبریٰ اول آچکا ہے نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ تخصیص ناجائز ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو مقیس علیہی یوم جمعہ سے بھی بڑھ کر ہے اس لئے کہ یوم جمعہ کے فضائل تو احادیث میں صراحتاً بھی وارد ہیں اور یوم ولادت کی کوئی فضیلت صراحتاً وارد نہیں۔ گو قواعد سے فی نفسہ یوم ولادت میں برکت اور فضیلت کے بھی مسلمان قائل ہیں ایسا کون ہوگا جو اس دن بلکہ اس ماہ کی برکت کے قائل نہ ہو چنانچہ سیوطی مالک علی تباری اس ماہ کی فضیلت میں فرماتے ہیں کہ

هذا الشهر في الاسلام فضل

ربيع في ربيع في ربيع

اور میں اس پر اضافہ کر کے کہتا ہوں کہ

ظہور فی ظہور فی ظہور

سہ سہ سہ سہ سہ سہ

پس نفس برکت اور فضیلت کا انکار نہیں گفتگو

اس میں ہے کہ جسے جمعہ کے فضائل تصریحاً وارد ہیں ایسے یوم ولادت کے نہیں پس جس کے فضائل مخصوص ہوں اس کی تخصیص کیسے ناجائز نہیں ہوگی بعض لوگوں نے دعویٰ کیا ہے کہ یوم ولادت کی فضیلت بھی حدیث میں آئی ہے۔ چنانچہ آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دو شنبہ کے روز روزہ رکھا کرتے تھے کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ اس دن روزہ کیوں رکھتے ہیں فرمایا ولدت يوم الاثنين یعنی میں پر کے دن پیدا ہوا ہوں۔ تو اس کا جواب انشاء اللہ مخالفین کے دلائل کے ذیل میں آئے گا۔

روضہ مبارک کی زیارت اور تیسری حدیث سنئے۔ نسائی نے روایت کیا ہے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تجعلوا قبی عیداً وصلوا علی فان صلاتکم تبلغنی حیث کنتم۔

ترجمہ :- یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری قبر کو عید مت بناؤ۔ اور مجھ پر درود بھیجو۔ کیونکہ تمہارا درود میرے پاس پہنچے گا جہاں کہیں تم ہو گے۔ اس حدیث میں غیر عید کو عید بنانے کی بات تخصیص ممانعت ہے شاید اس میں کوئی شبہ کرے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر سب جمع ہوتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ عید میں جیسے جمع ہوتے ہیں اسی طرح میری قبر پر مت جمع ہو۔ اور عید میں اس طرح جمع ہوتے ہیں کہ اس کی تاریخ معین ہوتی ہے اور نیز اس میں تداعی یعنی اس کا اہتمام ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو وہاں جمع ہونے کے لئے بلاتا ہے پس اس طرح جمع ہونے کی

مانعت ہے اور اتفاقی اجتماع سے مانعت نہیں ہے چنانچہ روضہ اقدس کی زیارت کے لئے جو جاتے ہیں تو اس میں یہ دونوں امر نہیں ہیں اس کی کوئی خاص تاریخ مقرر نہیں ہے بلکہ آگے پیچھے کیف مالتفق قائل جاتے ہیں اور زیارت کر کے چلا آتے ہیں اور نہ کچھ اہتمام ہے کہ سب کا اجتماع ضروری سمجھا جاتا ہو بہر حال اس حدیث سے صراحتاً ثابت ہوتا ہے کہ قبر شریف پر بطور عید کے جمع ہونا ناجائز ہے پس جس طرح عید مکانی ممنوع عنہ ہے اسی طرح عید زمانی بھی نہی عنہ ہوگی۔ اب رہی بات کہ اس کے بعد صلوا علی فان صلاتکم تبلغنی حیث کنتم۔ بڑھانے سے تو اجتماع کا عدم جواز بھی مفہوم ہوتا ہے جیسا علت فان صلاتکم ظاہراً اس پر دال ہے سو شراح نے مختلف توجہات اس کی کی ہیں میرے ذہن میں سب سے اقرب توجہ اس کی یہ آتی ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ اس نہی لا تجعلوا میں اہل بدعات یہ عذر کر سکتے تھے کہ ہم تو صلوٰۃ یعنی درود شریف پڑھنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر جمع ہوتے ہیں اور صلوٰۃ مامور بہ ہے تو ہمارا اجتماع جائز ہوگا۔ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس شبہ کا جواب دیتے ہیں اور اس احتمال کا استیصال فرماتے ہیں کہ درود شریف یہاں آنے پر موقوف نہیں ہے جہاں کہیں تم ہو گے درود شریف میرے پاس پہنچتا ہے اس لئے یہ عذر غیر موجب ہے اور اس سے ایک بہت بڑی بات مستنبط ہوتی ہے کہ صلوٰۃ جس کے بعض افراد مندوب اور بعض واجب اور بعض فرض ہیں جب اس کے لئے عید کے طرز پر جمع ہونا جائز نہیں تو کسی اور غرض مختص کے لئے جمع ہونا تو کیسے جائز ہوگا لیکن اس سے کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ خود زیارت کے لئے جانا بھی جائز نہیں اس لئے کہ وہاں جو جاتے ہیں تو مقصود اصلی صلوٰۃ نہیں ہے بلکہ زیارت مقصود ہے اور وہ بدون قبر حجاز ممکن نہیں۔

چوتھی حدیث سے استدلال چوتھی حدیث یہ ہے کہ عید کے روز کچھ لڑکیاں کھیل رہی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لائے انہوں نے لڑکیوں کو ڈانٹا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ان لکلی قوم عیداً و هذا عیدنا یعنی اے عمر منع۔۔۔ نہ کرو ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے اور یہ ہماری عید ہے۔ اس حدیث میں علت ان کے کھیلنے کی اباعت کی یہ فرمائی کہ یہ ہماری عید ہے۔ اس میں جواز لعب کو یوم عید ہونے سے معلل فرمایا گیا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ عید کے ساتھ خاص ہے سو اگر ہر شخص کو عید منانا جائز ہو تو ہر روز ایسا لعب جائز ہو جائیگا کہ جس سے روکا گیا ہو۔

اور تخصیص منصوص باطل ہو جاوے گی جس سے مخرج کی ثابت ہوتی۔

اب رہا اجماع سوا اس سے بھی ثابت ہے۔ تقریر اس کی یہ ہے

عدم جواز پر اجماع سے ثبوت

کہ قاعدہ اصولیہ ہے کہ تمام امت کا کسی امر کے ترک پر اتفاق ہو جائیہ اجماع ہوتا ہے اس کے عدم جواز پر۔ چنانچہ فقہاء نے جابجا اس کے قاعدے سے استدلال کیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فعل کو ہمیشہ ترک کرنے سے استدلال کرتے تھے۔ مثلاً فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز پڑھی لیکن اس میں اذان اور بکیر نہیں تھی اسی طرح جس شئی کو تمام امت نے ترک کر دیا ہو وہ واجب ترک ہے اسی بنا پر فقہاء نے صلوٰۃ عیدین میں بلا اذان و بکیر کہا ہے۔ پس اگر یہ قاعدہ مسلم نہ ہوتا تو آج سے ہی عیدین میں اذان اور بکیر کا بھی اضافہ کر دینا چاہیے۔ اور اگر مسلم ہے تو اس قاعدے سے اور کچھ بھی کام لو۔

اس پر ایک شبہ ہو سکتا ہے کہ تمام امت نے عید میلاد النبی کو ترک نہیں کیا اس لئے کہ اسی تو آخر ہم بھی ہیں سو ہم اس کو کرتے ہیں پس اجماع کہاں

ایک شبہ کا جواب

رہا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ اصول فقہ کا قاعدہ مسلم ہے کہ اختلاف متاخر اتفاق مقدم کارافع نہیں ہے یعنی جس امر پر تمام امت کا اتفاق زمان سابق میں متحقق ہو چکا ہو اب اس اتفاق کو بعد کا اختلاف نہ اٹھا دیگا پس جب تک تم لوگوں نے ایجاد نہیں کیا تھا اس وقت تک تو امت کا اس کے ترک پر اتفاق تھا اب وہ اتفاق مرتفع نہیں ہو سکتا۔ اس قاعدہ کی ایک جزئی اور ہے کہ علماء حنفیہ نے نماز جنازہ کا کھڑا حاکم نہیں رکھا اور دلیل یہی لکھی ہے کہ صحابہؓ اور تابعین سے ثابت نہیں۔ غرض یہ قاعدہ مسلم ہے کہ امت کا کسی امر کو ترک کرنا اس کے عدم جواز کی دلیل ہے پس بفضلہ تعالیٰ اجماع امت سے بھی ثابت ہو گیا کہ یہ عید بدعت اور امر مخرج واجب ترک ہے۔

اب رہا قیاس تو قیاس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک نوادہ قیاس جو مجتہد سے منقول ہو، اور ایک وہ جو مجتہد سے

مجتہد کا عدم جواز قیاس سے

منقول نہیں اور یہ قاعدہ کہ غیر مجتہد کا قیاس مجتہد نہیں ہے ان واقعات میں ہے کہ جو مجتہدین کے زمانہ میں پائے گئے ہیں اور جو نئے واقعات پیش آویں ان میں قیاس غیر مجتہد کا معتبر ہے چنانچہ جس قدر نئی تجارتیں اور ایجادات اس زمانے میں ہوتی ہیں سب کا حکم قیاس سے ہی ثابت ہوتا ہے۔ مع ہذا ہم خود قیاس نہیں کرتے اس لئے کہ ہم کو قیاس کرنے کی ضرورت تو جب تھی جب کہ سلف کے کلام میں اس سے تعرض نہ ہوتا۔ اس لئے کہ ان حضرات کا قیاس ہمارے قیاس سے مقدم ہے اور ان کے

کلام میں اس سے تعرض ہے، چنانچہ تبعید الشیطان و صراط مستقیم میں بہت زور و شور سے اس امر پر گفتگو کی ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ کسی زمانہ یا مکان کو عید بنانا ممنوع ہے پس قیاس سے بھی اس عید کا ناجائز ہونا ثابت ہوا تو ہمارے دلائل تھے۔

اب موجدین عید کے دلائل کی تقریر اور ان کا

موجدین کے دلائل اور ان کا جواب

جواب سینے۔ اور انکی طرف نسبت دلائل کی میں نے اس احتمال سے کہ دی ہے کہ شاید ان میں سے کبھی کوئی ان سے استدلال کرنے لگے ورنہ میں نے یہ دلائل ان سے منقول نہیں دیکھے بلکہ وہ تو اگر رسول بھی کو شیش کریں تو ان کو ایک دلیل بھی میسر نہ ہو اسی واسطے جی تو نہیں چاہتا تھا کہ ان کو دلائل دیئے جاویں لیکن صرف اس وجہ سے کہ کسی کو کوئی گنجائش نہ رہے اس لئے میں ان دلائل کو بھی مع جواب قتل کئے دیتا ہوں۔

اول آیت وہ ہے۔ قل بفضل اللہ وجہتہ

پہلا استدلال و اس کا جواب

ذین الک فلیفروا۔ سے استدلال کر سکتے ہیں کہ اس آیت سے فرحت کا محور ہونا ثابت ہوا اور عید بھی اظہار فرحت ہے۔ لہذا جائز ہے۔ جواب ظاہر ہے کہ اس آیت سے فقط فرحت کا محور ہونا نکلا۔ اور گفتگو اس ہیئت خاص میں ہے لہذا اس آیت سے اس کو کوئی مس نہیں اور اگر اس کلیہ میں اس کا داخل کرنا صحیح ہو تو فقہاء کے کتب فقہ میں جن بدعات کو روکا ہے وہ کبھی کسی نہ کسی ایسے ہی کلیہ میں داخل ہو سکتی ہیں چاہیے کہ وہ بھی جائز ہو جاویں حالانکہ کتب فقہ جو مسلم عند الفریقین ہیں ان میں ان کی ممانعت مصرحاً مذکور ہے اور ان اہل لغ کو ہمیشہ یہ دھوکہ ہوتا ہے اور یا تجاہل ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اور اہل حق کے قصیدہ کا موضوع ایک ہی ہے اسی بنا پر اہل حق پر اعتراض کر دیتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی مغالطہ ہے۔ ہم جس بات کو ناجائز کہتے ہیں وہ ہیئت خاصہ ہے اور جو فرحت آیت "فلیفروا" سے ثابت ہوتی ہے وہ فرحت مطلقہ ہے۔ پس یہ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ فرحت کو منع کرتے ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ بلکہ اگر غور سے کام لیا جاوے تو ہم اس فرحت پر زیادہ عمل کرتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ موجدین تو سال بھر میں ایک مرتبہ خوش ہوتے ہیں اور دوسراں میں ان کی فرحت منقطع ہو جاتی ہے اور ہم ہر وقت خوش ہیں (اس لئے کہ اہل نسبت ایمان کی بشاشت اور اس کے ذوق سے ہر وقت محو رہتے ہیں) اور اہل حق میں ہی بہت سے افراد اس دولت سے مشرف ہیں۔ وَذَٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْہِ مَن یَّشَاءُ وَہُوَ الْغَفُورُ الْمَعْرِفُ۔ کما مونی تفسیر (جامع) پس جو فرح کو منقطع کر دیں وہ آیت کے تارک ہیں ہم تو کسی وقت بھی

..... قطع نہیں کرتے پس ہم بفضلہ تعالیٰ آیت پر بھی بروقت عمل کرتے اور دلائل منع بدعات پر بھی عمل کرتے ہیں اہل بدعات کو دونوں امر نصیب نہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ فرح مامور بہ کے تین درجے ہیں۔ افراط، تفریط، اعتدال۔ تفریط تو یہ ہے کہ تحدید بالحد المہملۃ کر دیں کہ فلاں وقت پر یہ فرح ہوگی جیسا محض خشک مزاجوں کے کلام سے ترشح ہو گیا ہے اور افراط یہ ہے کہ فرح کو جلدی رکھیں مگر حد و نہر غیب سے تجاوز کریں۔ جیسا کہ اہل تحدید بالجیم المبعجہ کا طریق متعارف ہو گیا اور اعتدال ادا میں ہے بس نہ ہم محدود ہیں نہ محدود بلکہ قدیم ہیں والحمد للہ علی ذالک۔

دوسرا استدلال و اس کا جواب | دوسرا استدلال موجدین کا۔ اس حدیث سے ہو سکتا ہے کہ جب ابو لہب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی خبر سنی تو خوشی میں اگر ایک باندی کو آزاد کر دیا اور اس پر عقوبت میں تخفیف ہو گئی۔ پس معلوم ہوا کہ ولادت پر فرح جائز ہے اور موجب برکت ہے۔ جواب اس کا بھی ظاہر ہے کہ ہم نفس فرحت کے منکر نہیں ہیں بلکہ اس پر ہر وقت عامل ہیں گفتگو تو اس ہیئت کذائیہ میں ہے۔

تیسرا استدلال کا جواب | تیسرا استدلال اس آیت سے ہو سکتا ہے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ **وَإِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنْزِلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ (المری قولہ) رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِنْكَ**۔ یعنی یاد کرو اس وقت کو جب کہ حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ بن مریم کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرمادیں۔ عیسیٰ کی اس دعا تک اے اللہ ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما کہ وہ ہمارے لئے عید بن جائے ہمارے پہلوں کے لئے اور ہمارے پچھلوں کے لئے اور ایک نشانی قدرت کی ہو آپ کی طرف سے، اس آیت سے معلوم ہوا کہ عطا نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اور ہمارے اصول میں یہ طے ہو چکا ہے کہ اسم سابقہ کے شرائع اگر حق تعالیٰ ہم پر نازل فرما کر ان پر انکار نہ فرمادیں تو وہ ہمارے لئے حجت ہیں، اور یہاں کوئی انکار نہیں پس معلوم ہوا کہ عطا نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ظاہر ہے کہ نعمت عظمیٰ ہے پس آپ کی تاریخ ولادت کو عید بنانا جائز ہوگا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اس امر پر انکار اسی جگہ ہو، جہاں وہ منقول ہے دیکھئے **وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ ط**

میں سجدہ تحت منقول ہے اور سجدہ تحت اور سجدہ عظیمی ہماری شریعت میں منسوخ ہو چکا لیکن یہاں پر اس پر انکار منقول نہیں۔ اس کے لئے دوسرے دلائل ہیں۔ اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جو آیت واحاد ہم نے عید بنانے کی مانعت میں اپنے دلائل میں بیان کی ہیں وہ اس پر انکار کے لئے کافی ہیں۔ یہ جواب تو اس تقدیر پر ہے جب کہ آیت کے معنی یہی ہوں جو مستدل نے بیان کئے ہیں ورنہ اس آیت سے یہ ثابت ہی نہیں ہوتا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا مطلب یہ ہے کہ نزول مائدہ کی تاریخ کو عید بناویں، اس لئے کہ تکون میں ضمیر مائدہ کی طرف راجع ہے پس اس سے یوم نزول مائدہ لینا مجاز ہوگا۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جب تک حقیقی معنی بن سکیں مجاز کی طرف رجوع نہ کیا جاوے گا پس معنی یہ ہیں کہ تکون المائدۃ سرور لنا، یعنی وہ مائدہ ہمارے لئے سرور کا باعث ہو جاوے۔ عید کے معنی متعارف نہیں ہیں بلکہ عید کا اطلاق مطلق سرور پر بھی آتا ہے یہ کیا ضرور ہے کہ جہاں کہیں لفظ عید آوے اس سے عید میلاد النبی ہی مراد ہو جیسے حضرات شیعہ کے نزدیک جہاں کہیں م، ت، ع آئے اس سے متعہ کا جواز ہی نکال لیتے ہیں ان کے نزدیک جہاں گویا شیخ سعدی کے شعر سے

متع زہر گو شہ یا نفتم سے یہی متعہ نکلتا ہے۔ اور آیت، **رَبَّنَا اسْتَمِعْ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ** کے بھی یہی معنی ہیں کہ اے رب ہمارے بعض نے بعض سے متعہ کیا ہے۔ ایسے ہی ان حضرات کے نزدیک جہاں کہیں ع، ی، د، آوے اس سے عید میلاد النبی کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

چوتھا استدلال و اس کا جواب | چوتھا استدلال اس قصہ سے ہو سکتا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ جب آیت **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ** نازل ہوئی تو ایک یہودی نے حضرت عمر سے کہا کہ اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید بنا لیتے۔۔۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہ آیت عید کے دن ہی نازل ہوئی ہے یعنی یوم جمعہ اور یوم عرفہ کو نازل ہوئی ہے اور ترمذی میں ہے کہ حضرت ابن عباس نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے **نَزَلَتْ فِي يَوْمِ جُمُعَةٍ وَعَرَفَةٍ** یہ حدیث کا مضمون ہے تقریر استدلال کی اس آیت سے یہ ہے کہ حضرت عمر بن عباس رضی اللہ عنہما نے عید بنانے پر انکار نہیں فرمایا معلوم ہوا کہ عطا نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اگرچہ یہ استدلال ان کو قیامت تک نہ سوجھتا۔ لیکن ہم نے تبرعاً نقل کیا ہے کہ ان کو اس میں کبھی گناہ نہ ہو سکتی ہے۔ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک جواب تو یہی ہے کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ انکار نہیں کیا۔ تو یہ کیا ضرور ہے کہ انکار یہاں ہی منقول ہو۔ چنانچہ ہمارے فقہار نے تعریف یعنی یوم عرفہ حجاز کے مشابہت سے جمع ہونے پر

انکار فرمایا ہے۔ یہ تو ضروری نہیں ہے کہ اسی مقام پر انکار کریں۔ نیز حضرت ابن عباسؓ نے تخصیص کی
لیس لشیٰ کہا ہے حالانکہ وہ منقول بھی ہے مگر صرف عادت کو عبادت سمجھنے سے انہوں نے یہ انکار
فرمایا تو غیر منقول کو قربت سمجھنا۔ تو ان کے نزدیک زیادہ منکر ہوگا۔ اور حضرت عمرؓ کا انکار اجتماع
علی بنجرۃ احمدیہ پر مشہور ہے۔ پس دونوں حضرات کا انکار ایسے امور پر ثابت ہو گیا۔ گو ہر مقام
پر انکار منقول نہ ہو۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ شخص مسلمان نہ تھا۔ یہودی تھا۔ اس کا خاص طور پر الزامی
جواب دیا کہ ہمارے یہاں تو پہلے سے عید ہے بلکہ اس جواب سے خود معلوم ہوتا ہے کہ عید بنا ناجائز
نہیں۔ یعنی مطلب حضرت عمرؓ کا یہ ہے کہ ہماری شریعت میں جو نہ عید جائز نہیں ہے اس لئے
ایسے عوارض سے ہم کسی دن کو اپنی طرف سے عید نہیں بنا سکتے تھے۔ مگر خدا کے تعالیٰ نے
پہلے ہی سے اس یوم کو عید بنا دیا۔

پانچواں استدلال و اس کا جواب

پانچواں استدلال اس حدیث سے وہ
اگر سکتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے پر کے دن روزہ رکھا۔ کسی نے پوچھ پوچھی تو یہ ارشاد فرمایا۔ ذالک الیوم الذی لک
فیر۔ یعنی میں اس دن میں پیدا ہوا ہوں اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یوم ولادت عبادت
اور قربت کا دن ہے اور فرحت و سرور علی ولادت قربت ہے لہذا یہ جائز ہے۔ اس کے بھی دو
جواب ہیں۔ اول تو یہ کہ تسلیم نہیں کرنے کہ یوم ولادت ہونا علت روزہ رکھنے کی ہے اس لئے کہ
دوسری حدیث میں اس کی علت منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعرات اور پر کو نا افعال
پیش ہوتے ہیں تو میزاجی چاہتا ہے کہ میرے اعمال روزے کی حالت میں پیش ہوں۔ اس سے صاف
معلوم ہوا کہ علت صوم کی غرض اعمال ہے۔ پس جب یہ علت ہوتی تو ولادت کا ذکر فرمانا محض حکمت
ہوگا اور مداح حکم کا علت ہوتی ہے۔ اب آپ لوگ جو دیگر قربات کو قیاس کرتے ہیں تو تم نے حکمت
حکمت کو اصل علت ٹھہرایا۔ حالانکہ حکمت کے ساتھ حکم دائر نہیں ہوتا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم
تسلیم کرنے ہیں کہ علت حکم کی یہی ہے لیکن علت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ علت جو اپنے مورد کے
ساتھ خاص ہو اور ایک وہ جس کا تعین دوسری جگہ بھی ہو۔ اگر یہ علت متعدیہ ہے تو کیا وجہ ہے کہ
اس دن میں تلاوت قرآن اور اطعام طعام وغیرہما کیوں مقبول نہیں اور نیز مثل یوم الاثنین کہ
یوم ولادت ہے تاریخ ولادت میں بھی کہ ۱۲ ربیع الاول ہے روزہ رکھنا چاہیے دوسرے یہ کہ
نعمتیں اور بھی ہیں مثلاً ہجرت، فتح مکہ، معراج وغیرہا، آپ نے ان کی علت سے کیوں کوئی عبادت نہ

فرمائی۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ علت اگر ہے تو عام ہے بلکہ اسی مقام کے ساتھ خاص ہے اور
اصل مدار روزہ رکھنے کا وحی ہے باقی حکمت کے طور پر ولادت کو ذکر فرمایا ورنہ دوسری نعمتوں کے دن
بھی روزہ تعین چاہئے، اور اگر اس پر کہا جاوے کہ تخصیص یوم ولادت کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل ہے
تمام نعمتوں کی۔ پس ولادت اور ہجرت وغیرہ میں یہ فرق ہے۔ اس فرق کی وجہ سے یہ تخصیص کی گئی
ہے تو ہم کہتے ہیں کہ حمل اس کی بھی اصل ہے اس کو اصل ٹھہرانا چاہئے۔ پھر حیرت یہ ہے کہ یوم ولادت
دوشنبہ کے روز تو عید نہ کریں اور تاریخ ولادت یعنی ۱۲ ربیع الاول کو عید مناویں۔ یوم الاثنین میں
تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت بھی کی ہے اور تاریخ ولادت میں تو کچھ بھی منقول نہیں ہے پس اس
دلیل کا مقتضی تو یہ تھا کہ ہر ہر پر کو عید کیا کریں۔ غرض اس حدیث سے بھی مدعا موجدین کا ثابت
نہیں ہوتا۔ یہ تو ان حضرات کے نقلی دلائل تھے۔

عقلی لائق جواب

اب ہم اس باب میں عقلی گفتگو کرتے ہیں اس لئے کہ ان لوگوں میں بعض
عقلی پرست بھی ہیں اور وہ اس عید میں کچھ عقلی مصلحتیں پیش کیا کرتے

جو راجح ہیں ملک و قوم کی طرف۔ اس لئے ہم اس طرز پر بھی اس مسئلہ کو بیان کئے دیتے ہیں خانہ چاہئے
کہ جس قدر عبادت شائع علیہ السلام نے مقرر فرمائی ہیں۔ ان کے اسباب بھی مقرر فرمائے ہیں اور اس
اعتبار سے مامور بہ کی چیز قسمیں نکلتی ہیں۔ اول تو یہ کہ سبب میں تکرار ہو یعنی سبب بار بار پرایا جاتا ہو سبب
کے مکرر ہونے سے سبب بھی مکرر پرایا جاوے گا، مثلاً وقت صلوٰۃ کے لئے سبب ہے پس جب وقت
آوے گا صلوٰۃ بھی واجب ہوگی۔ اسی طرح صیام رمضان کے لئے شہود شہر سبب ہے۔ جب شہود
شہر ہوگا صوم واجب ہوگا اور عید کے لئے نذر اور اضحیہ کے لئے یوم اضحیہ بھی اسی باب سے ہے۔ دوسری
بات یہ ہے کہ سبب بھی ایک اور سبب بھی ایک جیسے بیت اللہ شریف حج کے لئے۔ چونکہ سبب
ایک ہے اس لئے مامور بہ یعنی حج بھی عمر بھر میں ایک ہی فرض ہے۔ یہ دونوں قسمیں تو مدرک بالعقل
ہیں اسی لئے کہ عقل بھی اسی کو مقتضی ہے کہ سبب کے تکرار اور توحد سے سبب تکرار اور توحد ہو تیسری
قسم یہ ہے کہ سبب ایک ہو اور سبب کے اندر تکرار ہو، جیسے حج کے طواف میں رمل کا سبب رارۃ
وقت بھی اب وہ ارارۃ قوت تو ہے نہیں اس لئے کہ قصہ اس کا یہ ہوا تھا کہ جب مدینہ طیبہ سے مسلمان
حج کے لئے مکہ معظمہ آئے تو مشرکین نے کہا تھا ان لوگوں کو شرب کے بخار نے ضعیف اور بودا کر دیا
ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ طواف میں رمل کریں یعنی شلنے ہلاتے

کہ ایک ہونا نہ مکرر ہونا نہ ایک ہونا۔

ہوئے اکڑ کر طواف کرتا کہ ان کو قوت مسلمین کی مشاہد ہو۔ اب وہ سبب تو ہے نہیں لیکن مامور یعنی مل فی الطواف بحال باقی ہے۔ یہ امر غیر مدرک بالعقل ہے اور جو عمل خلاف قیاس ہوتا ہے اس کے لئے نقل اور وحی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ وہ تاریخ گزر گئی یا بار بار آتی ہے ظاہر ہے کہ وہ ختم ہو گئی، کیونکہ اب جو ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ آتی ہے۔ وہ اس خاص یوم ولادت کی مثل ہوتی ہے نہ کہ عین اور یہ ظاہر ہے۔ پس مثل کے لئے وہی حکم ثابت ہونا کسی دلیل نقلی کا محتاج ہوگا بوجہ غیر مدرک بالعقل ہونے کے قیاس اس میں حجت نہیں ہوگا۔ لیکن یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوم الاثنین میں روزہ رکھنے کی وجہ ولادت فیہ سے فرماتی ہے تو اس میں بھی یہ کلام ہو سکتا ہے کہ یوم ولادت تو گزر گیا ہے اب یہ اس کا مثل ہے اس کو حکم صل کا کیوں ہوا۔ جواب یہ ہے کہ یہ صوم تو خود منقول ہے اور آپ نے وحی سے روزہ رکھا ہے اس لئے اس پر قیاس نہیں ہو سکتا۔ اب ہم تبرعاً ان حضرات کو بھی ایک دلیل عقلی لکھ کر اور اس کا جواب دیکر مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ یہ مقابلہ ہے اہل کتاب کا کہ وہ ولادت مسیح علیہ السلام کے دن عید کرتے ہیں ہم مقابلہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت میں عید کرتے ہیں تاکہ اسلامی شوکت ظاہر ہو۔ جواب یہ ہے کہ یہ تو اس وقت کسی رحیم میں صحیح ہو، ہمارے یہاں اظہار شوکت کے لئے کوئی شئی نہ ہو، ہمارے یہاں جمعہ عیدین سب اظہار شہادۃ اسلام کے لئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر ان کا مقابلہ ہی کرنا مقصود ہے تو ان کے یہاں اور دنوں میں بھی عیدین اور میلے ہوتے ہیں تم کو بھی چاہئے کہ ہر ہر دن کے مقابلہ میں تم بھی عید کیا کرو۔ اسی طرح عاشورہ کے دن تعزیر اری بھی کیا کرو، تاکہ اہل تشیع کا مقابلہ ہو۔ چنانچہ معین جاہل محض مقابلہ کے لئے ایسا کرتے بھی ہیں اور جناب اگر یہی مصلحت ہے تو ہندوؤں کے یہاں ہولی یوالی ہوتی ہے ان کے مقابلہ کے لئے ہولی دیوالی کیا کرو۔

ایک قصہ میں ایک قصہ بیان کرتا ہوں اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ اصل اور قاعدہ آپ کا بالکل بے اصل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے کفار نے ایک درخت بنا رکھا تھا اس پر ہتھیار لٹکائے تھے اور اس کا نام ذات انواط رکھا تھا۔ بعض صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اجعل لنا ذات انواط یعنی یا رسول اللہ ہمارے لئے بھی آپ ایک ذات انواط مقرر فرمادیتے یعنی کوئی ایسا درخت ہمارے لئے بھی آپ مقرر فرمادیتے کہ اس پر ہم ہتھیار اور کپڑے وغیرہ لٹکا دیا کریں۔ دیکھئے بظاہر اس میں کچھ جرح معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ کسی رخت پر کپڑے یا ہتھیار لٹکا دینا ایک امر مباح ہے اس میں تشبیہ بھی کچھ نہیں لیکن صورتہ ان

کی مشابہت تھی اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا اور فرمایا سبحان اللہ یہ تو ایسی ہی بات ہوتی جیسے قوم موسیٰ علیہ السلام نے موسیٰ سے کہا تھا۔ اجعل لنا الہاً کمثالہم الہة۔ پس جب اس مشابہت کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناسد فرمایا تو جس صورت میں ان کی پوری شکل بنائی جائے یہ تو بطریق اولیٰ ناجائز ہوگا یہ اس باب میں گفتگو تھی جو اختصار کیساتھ بیان کی گئی ہے عرض عقل سے نقل سے ہر طرح کجماشتہ ثابت ہو گیا کہ یہ عید مخترع ناجائز اور بدعت واجب ترک ہے خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو فرحت کا حکم ہوا ہے اور اس کی تحدید یا تجدید کا حکم نہیں بلکہ فرح دائم اور مستدامی کا حکم ہے اس لئے کسی خاص دن کو اس کے لئے مخصوص نہ کریں اور ہر وقت اسی آیت پر عمل کریں (السورہ ص ۲۹)

۲۳۔ پختہ قبریں بنانا خلاف شرع اور اہل اللہ کے مذاق کے خلاف ہے

حضرات اولیاء اللہ کے مزارات اسی تعظیم کی وجہ سے بڑے عالی شان پختہ بنائے جاتے ہیں یہاں بھی منشا وہی عظمت ہے مگر اس کا ظہور بری طرح ہوا کیونکہ شرعاً تعظیم اولیاء کی یہ صورت حرام ہے اہل اللہ کی تعظیم کچھ اسی میں منحصر نہیں کہ ان کے مزارات پختہ بنائے جائیں وہ تو کچی قبریں بھی ویسے ہی معظّم و محترم ہیں جیسے کچی قبریں بلکہ کچی قبروں پر بوجہ موافقت سنت کہ انوار زیادہ ہوتے ہیں۔ حضرت شیخ بختیار کاکیؒ کی کچی قبر پر ایسی سیت برستی ہے جو سلاطین کی قبروں پر خاک بھی نہیں اور اگر کسی کے آنکھیں ہوں تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ کچی قبر پر جو انوار ہیں وہ پختہ قبر پر کہاں۔ اور اگر کسی کی آنکھیں بند ہوں تو وہ اس دلیل ہی سے سمجھ لے کہ اول تو انوار سنت کے ساتھ مخصوص ہیں در پختہ مزارات تمام تر سلاطین اور امراء اور سلاطین کے بنائے ہوئے ہیں بزرگوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ امراء اور سلاطین کی بنائی ہوئی چیزیں انوار کہاں؟ اور اہل اللہ کو اپنے بدن تک کی تو پرواہ نہیں ہوتی پھر یہ جو چلے قبروں کے پختہ و آراستہ بنانے کے ان میں کہاں سے آجاتے ہیں۔ یقیناً یہ بزرگوں کا کام نہیں بلکہ سلاطین و امراء کے جو چلے ہیں انہیں کو ایسی باتیں سوچھا کرتی ہیں جو سلاطین و امراء میں نہ من گھڑت

سے نا آشنا ہیں ان کو تو دوسری طرح کے فسق و فجور کے چوچلے سوچتے ہیں اور جن کو ذرا دین سے کچھ تعلق اور دینداروں سے کچھ محبت ہے ان کو پختہ مزار بنانے کے اور بدعات کے چوچلے سوچتے ہیں۔ جیسے ایک رئیس حضرت مولانا گنگوہیؒ کے واسطے ایک نہایت قیمتی خوشنما بھڑکدار پوشین لائے تھے کہ حضرت اس کو پہنا کریں۔ مولانا نے اسے ایک اب صاحب کو دیدیا اور فرمایا کہ نواب صاحب اس کو آپ پہن لیجئے آپ کے کپڑوں پر یہ اچھی لگے گی کیونکہ آپ کا اور لباس بھی اس کے موافق قیمتی ہوگا۔ اور میں نے بھڑکے دھوڑے اور اس کو پہن کر کیا اچھا لگوں گا پھر اس کی حفاظت کیڑے سے کون کریگا مجھے اتنی فرصت نہیں فضول اس کو رکھ کر کبھی ضائع کروں۔ غرض اہل اللہ جب اپنے بدن کے واسطے یہ جھگڑے پسند نہیں کرتے تو قبروں کے لئے ان خرائات کو کیسے پسند کریں گے یہ پختہ مزارات اہل اللہ کے مذاق کے بالکل خلاف ہے۔ پھر یہ قبر کے وضع کے بھی خلاف ہے کیونکہ قبروں کی زیارت سے جو مقصود ہے وہ ان پختہ قبروں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

زیارت قبور کا منشا

زیارت قبور سے غرض ہے کہ موت یاد آئے اور دنیا کے زوال و فنا کا نقشہ سامنے آجائے تو یہ بات کچی اور شکستہ قبروں ہی سے حاصل ہو سکتی ہے شکستہ قبر سے دل پراثر ہوتا اور موت یاد آتی ہے۔ ان شاہی قبروں سے موت بھڑکڑا ہی یاد آتی ہے نہ زوال و فنا کے دنیا پیش نظر ہوتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ ایسی قبروں سے بزرگوں کی محبت و عظمت تو دل میں آتی ہے تو میں کہوں گا یہ محبت تعزویں والی جیسی ہے کہ ان کو بدون تعزیر بنائے اور مرثیہ گائے شہداء پر رونا نہیں تا سچی محبت و عظمت کو اس ساز و سامان کی ضرورت نہیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ حضرت صحابہ کرامؓ کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت نہ تھی ان کو تو ایسی محبت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا پانی کبھی زمین پر نہ گزرتا تھا بلکہ صحابہؓ اس کو ہاتھوں میں لے کر اپنے منہ اور آنکھوں پر ملتے تھے۔

صحابہ کا عمل

مگر بایں ہمہ صحابہؓ نے حضورؐ کی قبر پختہ نہیں بنائی بلکہ کچی ہی رکھی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پختہ قبر بنانے سے منع فرمایا ہے پس محبت و عظمت نبویؐ کا تقاضا یہی تھا کہ قبر پختہ نہ بنائی جائے اور ظاہر ہے کہ اولیاء اللہ اپنی زندگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع پر جان و مال سے فدا تھے پس جس بات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی ہے اسی میں اولیاء اللہ کی بھی خوشی ہے اگر یہ کہا جائے کہ پختہ قبر بنانے میں اہل اللہ کے نشان کا بقاء ہے تو اس کے جواب میں اول تو میں یہ کہتا ہوں کہ خدا ان کو باقی رکھنے والا ہے مہتارے باقی رکھنے سے وہ باقی

رکھنے سے وہ باقی نہیں رہ سکتے۔ دیکھو بہت سی پختہ قبر دارے مردے ایسے بھی ہیں جن کے نام سے بھی کوئی آشنا نہیں تو کیا پختہ قبر ہی بنانا بقا کا ذریعہ ہے ہرگز نہیں باقی اصل رکھنے والی چیز اہل اللہ کی دلالت اور ان کے کمالات معرفت و محبت ہیں پس وہ آپ کی بقا کے محتاج نہیں۔ عادت فرماتے ہیں سے ہرگز غیر دائم دلش زندہ شد عشق

اور مولانا نیاز فرماتے ہیں سے

عشق من از پس من فاتح خواہم بانی است
طمع فاتح از خلق نداریم نیاز

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ نشان باقی رکھنے کی یہ بھی صورت ہے کہ قبر کچی رکھو اور کچی قبریں ہر سال اس کی لپ پوت کرتے رہو۔ مٹی ڈلواتے رہو اور ایک عجیب تماشا ہے کہ اہل دنیا کچی قبر اس بزرگ کی بنواتے ہیں کہ جس کو اپنے زعم میں پورا متبع سنت نہیں سمجھتے اور جس کو متبع سنت سمجھتے ہیں اس کی قبر کچی ہی بناتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی قبر کچی ہے اور وہاں عورتیں بھی حاضر نہیں ہوتیں ان کے مجاوروں سے میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہا حضرت متبع شریعت بہت تھے اس لئے ان امور کو جائز نہیں رکھا گیا۔ گویا نود باللہ در کرا دیار اللہ متبع شریعت نہ تھے تو اس فعل سے اپنے بزرگوں پر ایک سخت الزام لگانا ہے کہ یہ متبع شریعت نہ تھے۔ سو اس وجہ سے بھی یہ فعل قابل ترک ہے۔

قبر پختہ بنانا شریعت میں ممنوع ہے اور اس کے ممنوع ہونے کی ایک اور حکمت پختہ میں ممنوع ہے سمجھو وہ یہ کہ کچی قبر بنانے سے جو شریعت نے منع کیا ہے حقیقت میں یہ ہم پر بڑا احسان کیا کیوں کہ اگر ابتداء سے اس وقت تک سب قبریں پختہ ہی ہوتیں تو آدمیوں کو تو رہنے کے لئے جگہ بھی نہ ملتی نہ زراعت کے لئے زمین ملتی کیونکہ مردے اس قدر گزرجے ہیں کہ کوئی حصہ زمین کامرمدوں سے خالی نہیں۔ بتلائے اگر سب کی قبریں پختہ ہوتیں تو ہمارے لئے کہاں ٹھکانا ہوتا۔ پس قبروں کے اوپر دو منزلہ منزلہ مکان بناتے جو ایک پہاڑ سا ہو جاتا۔ اور کچی قبریں تو یہ بات ہے کہ جب نشان مٹ گیا تو اب وہاں دوسری قبر بنا سکتے ہیں اور اگر زمین وقف نہ ہو تو اسپر اتنی مدت کے بعد زراعت بھی کر سکتے ہیں جس میں یہ یقین بھی ہو جلتے کہ مردہ کا جسم خاک خوردہ ہو گیا ہوگا۔ اور یہ بات کہ ہر جگہ فردے ہیں زندوں کی مردم شماری پر نظر کر کے سمجھیں آسکتی ہے کہ جب ایک زمانے میں اتنے آدمی جمع ہیں تو اس چھ سات ہزار سال کی مدت میں کس قدر بے شمار ہوں گے اور ہر شخص کی قبر کے لئے کتنی جگہ ضروری ہوتی ہے تو زمین میں اتنی جگہ کہاں تھی اور اسی حساب پر نظر کر کے اہل سائنس

یہ کہتے ہیں کہ اگر آج سب زندہ ہوتے تو اس زمین پر رہنے کی جگہ نہ ملتی۔ غرض قبروں کے پختہ ہونے سے یہ تنگی ہوتی اور اب تو انہی کے دفن ہونے کی جگہ میں سب بس رہے ہیں ان ہی کے مدفن بلکہ خود ان کے جسد کی مٹی سے مکان بنا رہے ہیں۔ برتن بنا رہے ہیں ٹکڑے ہمارے گھروں کے گھڑے، صراحی، پیالے ہمارے بزرگوں کی مٹی کے بنے ہوئے ہوں تو قبر کا پختہ بنانا ان مفاسد پر عمل ہے علاوہ اس کے موت تو مٹانے ہی کے واسطے ہے اس کے بعد بقا کا سامان کرنا ایک امر فضول ہے۔

قبروں سے فیض کا سوال | اس پر اگر کوئی کہے کہ قبروں سے فیض ہوتا ہے اس لئے قبروں کی بقا کی ضرورت ہے تو میں اس کے وقوع کا انکار نہیں کرتا۔ مگر اول تو وہ فیض مقتدر نہیں کیونکہ قبروں سے جو فیض ہوتا ہے وہ ایسا نہیں جس سے تکمیل ہو سکے یا سلوک طے ہو سکے بلکہ اس کا درجہ صرف اتنا ہے کہ صاحب نسبت کی نسبت کو اس سے کسی قدر قوت ہو جاتی ہے۔ غیر صاحب نسبت کو تو خاک بھی فیض نہیں ہوتا صرف صاحب نسبت کو اتنا فیض ہوتا ہے کہ مقوڑی در کے لئے نسبت کو قوت اور حالت میں زیادت ہو جاتی ہے مگر وہ بھی دیر پا نہیں ہوتی بلکہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے تنور کے پاس بیٹھ کر کچھ دیر کے لئے جسم میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے کہ جہاں تنور سے ہے اور ہوائی اور وہ سب گرمی جاتی رہی اور زندہ مشائخ سے جو فیض ہوتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی مقوی دوا کھا کر قوت و حرارت حاصل ہوتی ہے کہ وہ تمام جسم میں پھیلتا ہو جاتا ہے پس صاحب نسبت کو اول تو قبر سے فیض لینے کی ضرورت نہیں۔ زندہ شیخ اس کے لئے قبروں سے زیادہ نافع ہے اور ضرورت بھی ہو تو صاحب نسبت کے لئے قبر کا پختہ ہونا ضروری نہیں وہ تو آثار سے معلوم کر لے گا کہ یہاں کوئی صاحب کمال مدفون ہے پس یہ ذبح بھی کالعدم ہو گئی۔

۲۴ - رجب الاول کی مخصوص تاریخ میں میلاد کی

ممانعت

رجب الاول کے مہینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے،

کیونکہ یہ مہینہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت و تشریف آوری کا ہے۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد تقاضہ کے ساتھ دل میں پیدا ہوتی اور ایک خاص تحریک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی ہوتی ہے۔ اگر اس کے ساتھ منکرات منظم نہ ہوتے تو اس ماہ میں یہ حالت اور اس حالت میں آپ کا ذکر کرنا علامت محبت ہوتی۔ مگر افسوس ہے کہ منکرات کی وجہ سے اہل فتویٰ کو اس ذکر کی ہیئت مخصوصہ سے روکنے کی ضرورت ہوتی ورنہ یہ مسئلہ فی نفسہ اختلافی ہونے کے لائق نہ تھا مگر اہل فتویٰ کو روکنے کی ضرورت اس لئے ہوتی کہ مسئلہ طے شدہ ہے کہ دفع مضرت جلب نفع۔۔۔ سے مقدم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت حاصل ہے اس لئے اس کی تبلیغ وجوب کے درجے میں نہیں ہے صرف مستحب اور احب المستحبات ہے۔ اور منکرات سے بچنا واجب ہے تو اس حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرنا اسی وقت مستحب ہو سکتا ہے جبکہ منکرات سے خالی ہو۔

اب اس میں صوفیہ کی اور علماء کی رائے مختلف ہے۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ فعل مستحب کو کسی حال میں ترک نہ کیا جائے اور منکرات کی اصلاح کی جائے۔ اور علماء کہتے ہیں کہ بعض احوال میں منکرات کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ خود بھی اس کو ترک نہ کیا جائے۔ اس لئے شیوع منکرات کے وقت وہ اس مستحب ہی کے ترک کا امر کرتے ہیں۔ جس کے ساتھ منکرات کا انضمام ہوا ہے۔ اور اس بارہ میں رائے علماء کی مانجا دے گی کیونکہ صوفیہ تو اہل شوق ہیں۔ ان کو دوسروں کے انتظام کی پرواہ نہیں۔ یعنی جو صوفیہ کہ محض صوفی ہوں عالم محقق نہ ہوں اور علماء منتظم ہوتے ہیں اور منتظم کی رائے غیر منتظم سے مقدم ہوتی ہے۔

صوفیاء اور علماء کی کئی کئی کافری (ایک مثال سے) سمجھے۔ مثلاً موسم و بایں اطباء کا اسپر

اتفاق ہو گیا ہے کہ آج کل امروہ کھانا زیادہ مضر ہے۔ اس کے بعد ایک طبیب نے تو یہ کیا کہ امروہ کھانا نہیں چھوڑا بلکہ قلیل مقدار میں مصالحت کے ساتھ کھاتا رہا۔ اور ایک طبیب وہ ہے جس نے خود بھی امروہ کھانا چھوڑ دیا اس خیال سے کہ میں قلیل مقدار میں یا مصالحت کے ساتھ کھاؤنگا تو مجھے کھانا ہوا دیکھ کر دوسرے بھی کھائیں گے اور وہ ان امور کی رعایت نہ کریں گے جن کی میں رعایت کرتا ہوں بلکہ اندھا دھند کھائیں گے اور ہلاک ہوں گے اس لئے وہ بالکل ہی امروہ کھانا چھوڑ دیتا ہے دوسروں کو بھی علی الاطلاق منع کرتا ہے۔ بلکہ ٹوکے کے ٹوکے پھینک دیتا ہے اور دبا دیتا ہے جس کی اس حالت کو دیکھ کر بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو امروہ سے رغبت نہیں۔ اور جو طبیب امروہ کھا رہا ہے

ان کو امر و نہی سے بہت رغبت ہے۔ مگر جانے والے جانے ہیں کہ رغبت تو اس کو ان کے برابر یا ان سے بھی زیادہ ہے مگر محض دوسروں کی رعایت سے ترک کر رہا ہے بتلائے ان دونوں میں سے کونسا طیب لائق اتباع ہے۔ یقیناً یہ دوسرا طیب زیادہ قابل اقتدار ہے۔ کیونکہ اس کی رائے انتظام پر مبنی ہے سب اسی کی رائے کو ترجیح دیں گے۔ بس یہی حال علماء و صوفیہ کا ہے۔ صوفیہ اپنے غلبہ شوق کا ضبط نہیں کرتے بلکہ مستحب کو برابر کرتے رہتے ہیں اور اس کے ساتھ اصلاح منکرات کا قصد کرتے ہیں اور علماء ربشرطیکہ خشک نہ ہوں، انتظام کی وجہ سے اپنے شوق کو ضبط کر لیتے اور ظاہر میں اس مستحب ہی کو ترک کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ عوام بدون ترک مستحب کے منکرات کو ترک نہیں کر سکتے۔

صاحبو! کیا ہمارے دل میں یہ دیکھ کر گدگدی نہیں اٹھتی کہ ہر طرف مجلس مولد ہو رہی ہے۔ مگر محض انتظام عوام کی وجہ سے ہم اپنے شوق کو دبائے بیٹھ رہتے ہیں۔ (نور اللوہ ص ۵)

اسپر لوگ ہم کو بدنام کرتے ہیں کہ یہ لوگ ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منع کرتے ہیں۔ استغفر اللہ۔ ارے ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم وحبت

رسولؐ تو ہمارے یہاں عین ایمان ہے۔ پھر بھلا عین ایمان سے بھی کوئی مسلمان منع کر سکتا ہے۔ بلکہ دراصل ہمارے علماء ان منکرات سے روکتے ہیں جو اس ذکر کے ساتھ عوام نے منظم کر رکھی ہیں۔ مگر چونکہ ان منکرات کی اصلاح اس ذکر کو باقی رکھ کر نہیں ہو سکتی۔ اور یہ ذکر خاص ایم میں واجب نہیں۔ اس لئے وہ منکرات کی اصلاح کے لئے قیود کے ساتھ ذکر ہی سے منع کرتے ہیں چنانچہ منجملہ ان منکرات

کے ایک قیام بھی ہے جس میں عوام کے اعتقادات حدود شرع سے متجاوز ہیں۔ اس میں بھی بعض لوگ ہمارے علماء کو بدنام کرتے ہیں کہ قیام تو ذکر رسول کی تعظیم کے لئے ہے۔ اور یہ مولوی حضورؐ کی تعظیم سے منع کرتے ہیں۔ اس کا جواب ایک مولوی صاحب نے خوب دیا کہ ہم ذکر رسولؐ کی تعظیم سے نہیں روکتے بلکہ ذکر اللہ کی بے تعظیمی سے روکتے ہیں کیونکہ تم لوگ ذکر اللہ کے وقت قیام نہیں کرتے، پس اگر سارا ذکر مولد قیام ہی سے کرو اور سامعین بھی سارا ذکر کھڑے ہو کر سنیں۔ تو ہم اس قیام سے کبھی منع نہ کریں گے اور مزاحم ہے کہ اس قسم کے اعتراضات مولویوں ہی پر کئے جاتے ہیں صوفیوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا حالانکہ بعض دفعہ وہ مولویوں سے بھی زیادہ وحشت ناک حکم دے ہیں۔

چنانچہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں ایک شخص کی زبان سے مہر کے ساتھ لفظ اللہ نکل گیا۔ چونکہ وہ نقشبندی تھے جن کے یہاں ضبط احوال کی تاکید ہے یہاں تک کہ ذکر بھی خفی بتلاتے ہیں جہری نہیں بتلاتے۔ اس لئے

آپ نے فرمایا کہ نکال دو اس کو۔ ظاہر میں یہ حکم بہت وحشتناک تھا کہ اللہ کے کہنے پر مجلس سے نکال دیا اگر کوئی مولوی ایسا کرتا تو اسی وقت کفر کا فتویٰ دیا جاتا کہ ذکر اللہ سے منع کرتے ہیں۔ مگر صوفیوں پر کوئی اعتراض نہیں کرتا یہاں بڑی جلدی حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں کہ ذکر اللہ پر نہیں نکالا بلکہ عدم ضبط پر نکالا۔ اتنا ضبط بھی نہ ہو سکا اور معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کو قرآن سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس کو ضبط کی طاقت تھی باوجود طاقت ضبط کے پھر ضبط نہیں کیا۔ اور اگر واقعی حد ضبط سے نکل جاتا تو پھر ملامت نہ فرماتے۔ اسی کو شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں

دما دم شراب الم در کشند / دگر تلخ بپسند دم در کشند
تبسم سر در گریباں بر بند / چو طاقت نماند گریباں در بند

اسی طرح مولوی بھی قیام تعظیمی کو منع نہیں کرتے بلکہ قیام بے تعظیمی سے روکتے ہیں، جس میں احکام شریعت کی مخالفت کی جاتی اور شریعت میں ایک جدت تراشی جاتی ہے لیکن وہ غریب دنیا میں بدنام ہیں۔ ان کے اقوال کی حقیقت سمجھنے کی کوئی بھی کوشش نہیں کرتا۔ مگر مولویوں کو شریعت کی حفاظت کے سامنے اپنی بدنامی کی بھی پرواہ نہیں چاہیے کوئی کچھ کہے ان کی بلا سے۔ ایک غازی پوری مولوی اٹا وہ میں مجھ سے کہنے لگے کہ جماعت دیوبند کے مقوی اور تقدس کی تمام دنیا مقصد ہے صرف ایک بات لوگوں کو کھٹکتی ہے کہ آپ حضرات قیام نہیں کرتے اگر آپ قیام کرنے لگیں تو تمام دنیا آپ کی غلام ہو جائے۔ میں نے کہا کہ وہ ہمارے آقا بن جائیں لیکن کبھی بال تو ہم قصداً نہیں کھا سکتے۔ اب چاہے دنیا مقصد ہو یا بے اعتقاد ہو۔ (ایضاً ص ۵۲)

۲۵۔ نماز پنجگانہ یا فجر و عصر کے بعد مل کر بلند آواز سے ذکر کرنا بدعت ہے۔

ہر نماز کے بعد یا فجر و عصر کے بعد سارے نمازی مل کر جہراً لا الہ الا اللہ کہتے ہیں اور اس کا سختی کے ساتھ التزام کرتے ہیں حالانکہ سب کے واسطے بزرگوں نے نہیں کہا تھا بلکہ خاص لوگوں کو بتلایا تھا مگر جاہلوں نے اس کو حکم عام ہی بنالیا اور التزام کر لیا۔ اسی واسطے علماء نے اس کو بدعت کہا۔ اب ان پر آوازے کسے جاتے ہیں کہ لو بھائی ذکر اللہ بھی بدعت ہو گیا۔ ہائے علماء کی بھی مصیبت

ہے۔ ان سے بھی کوئی جماعت خوش نہیں۔ مگر محققین صوفیہ ان سے خوش ہیں وہ ان کی قدر کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ شحرانی رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بڑے محقق صوفی ہیں فرماتے ہیں کہ شریعہ صوفیہ دقیق ہے جو عوام کی فہم سے بالا ہے اس لئے عوام کو بھی لازم ہے کہ علوم میں صوفیہ کا اتباع نہ کریں بلکہ علماء اور جمہور کا اتباع کریں کیونکہ یہ لوگ منتظم ہیں۔

نظام شریعت بلکہ عالم علماء ہی کے اتباع سے قائم رہ سکتا ہے۔ ہمارے ماموں صاحب علماء کی مثال کہتے تھے کہ اگر علماء دنیا میں نہ ہوتے تو ہم تو سب لوگوں کو کافر ہی بنا دیتے۔ کیونکہ ہماری باتیں عوام کی فہم سے خارج ہیں نہ معلوم وہ کیا سمجھتے اور ایمان کو برباد کر دیتے۔ مولویوں کا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے مخلوق کا ایمان نبھال رکھا ہے تو اے وہ صوفی جو مولویوں سے ناخوش ہے اور ان پر آوازے کسا کرتے ہیں تو اس کا احسان مان کہ تو انہی کی بدولت چین سے بیٹھا ہوا اللہ شکر کر رہا اور گوشت عافیت میں بیٹھا ہوا ہے۔ منتظم پولیس کی قدر جب ہی ہوتی ہے جبکہ رات کو راحت سے پر کر سوتے ہو پس یہ علماء منتظم پولیس ہیں کہ مخلوق کے ایمان کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر یہ اپنا کام چھوڑ دیں تو پھر صوفی صاحب کو حجرہ سے نکل کر یہ کام کرنا پڑتا اور سارا تصوف اور حال و قال رکھا رہ جاتا۔ کیونکہ اصلاح خلق کا کام فرض کفایہ ہے۔ اگر مولوی اس کو چھوڑ دیں تو پھر صوفیوں پر ملائنا فرض ہو جائے گا۔ پس تیری گھڑی کی خیر اسی وقت تک ہے جب تک کہ یہ منتظم جماعت دنیا میں موجود ہے تم تو رات کو پرٹ کر آرام کرتے ہو۔ اور آنکھ کھل گئی تو نماز اور ذکر میں مشغول ہو جاتے ہو۔

اور مولویوں کی یہ حالت ہے کہ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ رات کو مولانا اسماعیل شہید کا حال حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مہمانوں کے پردیا کرتے تھے اور کوئی پوچھا کون ہے تو فرما دیتے کہ میں ہوں سید صاحب کا نوکر، یہ سن کر مہمان خاموش ہو جاتے۔ بہت عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ مولانا اسماعیل صاحب پر دبانے آیا کرتے ہیں۔

یہ تو پہلے بزرگوں کا قصہ ہے اور میں نے اپنے اساتذہ مولانا محمود حسن صاحب شیعہ الہند کا واقعہ کہہ دیا کہ حضرت نے اپنے کو کس درجہ مٹا دیا تھا۔ وہ یہ کہ حضرت کے یہاں ایک مہمان آئے جن کے ساتھ ایک کافر بھی تھا، گرمی کی دوپہر میں جب مہمان سو رہے تو مولانا دبے پاؤں تشریف لائے اور اس ہندو کے پاؤں دبانا شروع کئے، راوی کا بیان ہے کہ اس وقت میں اتفاق سے جاگ رہا تھا میں گھبرا کر پہونچا اور عرض کیا کہ حضرت آپ یہ کیا کر رہے ہیں، فرمایا یہ بے چارہ تھا کا ماندہ ہے۔

اس کی تھکن اتا رہا ہوں۔ میں نے کہا حضرت پھر میں دباؤں گا آپ اللہ سہٹ جائیں فرمایا نہیں تم تو خود تھکے ہوئے ہو اور مہمان بھی ہو۔ بس تم پڑے رہو۔ غرض نہ معلوم کتنی دیر تک اس کافر کے پردباے اور وہ بے ہوش پڑا سوتا رہا۔ کیونکہ کافروں کی آنکھ تو مرنے ہی پر کھلے گی جب عذاب کے فرشتے نظر آئیں گے یہ تو بیداری میں بھی سوتے ہی۔۔۔ ہیں۔ اور مولانا پر غلبہ حال تھا کہ منتہی ہو کر ایسا کام کیا۔ بھلا آج کل کسی صوفی نے بھی ایسا کیا ہے ہم نے تو کسی کو بھی نہیں سنا۔ پھر وہ کس منہ سے علماء پر آوازے کستے ہیں۔ (الرجنبۃ المرغوبہ ص ۳)

۲۶۔ سجادہ نشینی محل میراث نہیں بلکہ محض رسم ہے۔

آج کل سجادہ نشینی بھی میراث ہو گئی ہے چاہے گدی پر گدھے ہی بیٹھیں اور تماشہ ہے کہ کبھی تو مشائخ مریدوں کے سر پر خلافت کی پگڑی باندھتے تھے، آج کل مرید مشائخ کو خلافت کی پگڑی دیتے ہیں کہ جہاں پیر کا انتقال ہوا۔ اور مریدوں نے اس کے بیٹے کو گدی پر بیٹھا کہ خلافت کی دستار دیدی بس اب وہ سب کے پیر ہو گئے۔ ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس گدی نشینی کی رسم کو بالکل مٹا دیا۔ چنانچہ حاجی صاحب کی گدی پر کوئی نہیں ہے بلکہ ان کی گدی ایک گنگوہ میں تھی ایک دیوبند میں تھی دہلی مولانا تاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ایک کہیں، ایک کہیں، میں کہتا ہوں کہ اس میں زیادہ شان ہے کہ ایک شخص کی گدیاں جا بجا ہوں۔ یہ کچھ نہیں کہ ایک ہی گدی ہو۔ سو خوب سمجھ لو کہ یہ چیزیں میراث کا محل نہیں۔ مجھ سے میرے قصبہ والوں نے ایک بار جمعہ کی مستقل امامت قبول کرنے کے حکیم الامتہ کا ایک واقعہ لئے۔۔۔۔۔ کہا تھا تو میں نے چند شرطوں کے بعد قبول کیا تھا۔ ایک یہ کہ امامت۔۔۔۔۔ میراث نہ ہوگی دوسرے میں پابند نہ ہوں گا۔ جب چاہوں گا چھوڑ دوں گا۔ اس کے بعد میں نے اعلان کر دیا کہ میں لوگوں کے اصرار سے امامت کرتا ہوں اور صاف کہتا ہوں کہ یہ میراث نہ ہوگا۔ نہ اس میں وراثت چلے گی۔ جس وقت کسی ایک شخص کو بھی میری امامت ناگوار ہو۔ چاہے وہ جولاہا یا قصباتی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ڈاک میں ایک کارڈ پراتنا لکھ کر میرے نام ڈال دے کہ ہم کو تیری امامت ناگوار ہے پس قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک جولاہا بھی منع کر دے گا تو میں اسی روز سے امامت چھوڑ دوں گا یہ انتظام کر کے پھر میں نے امامت کی کیونکہ اب وراثت کا خطرہ نہ رہا تھا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد میں نے خود ہی چھوڑ دی۔

گدی نشینی | غرض آجکل امامت کی طرح گدی نشینی بھی میراث ہو گئی ہے اور بعض لوگ ایسی گدی کی تعظیم کرتے ہیں۔ بس یوں سمجھتے ہیں کہ اسی میں سب کچھ ہے یہ سب رسم پرستی ہے۔ ان لوگوں میں ایک اور رسم دیکھی گئی کہ گدی نشینی کے بعد خانقاہ سے باہر نہیں نکلتے۔ میں بھاگلپور گیا تو ایک سجادہ نشین کے بابت سنا کہ وہ چالیس سال سے خانقاہ سے علیحدہ نہیں ہوئے اور ان کے مرید اس بات کو فخر کے طور پر بیان کرتے تھے۔ میں نے کہا کیا وہ تورات ہیں، مرد تو وہ ہے جو شمشیر برہنہ لئے پھرے، ایک جگہ جم کر بیٹھ جانا مردانہ نہیں، البتہ کوئی معذور ہو یا کوئی ضروری مصلحت مقتضی ہو تو اور بات ہے۔ پھر اس التزام کے بعد اگر سجادہ نشین صاحب کی کبھی سی عدالت میں طلبی ہو گئی تو اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ کسی طرح سجادہ صاحب کو حاضری عدالت سے مستثنیٰ کرایا جائے۔ کیونکہ آجکل کے مشائخ عدالت کی حاضری کو بھی عیب سمجھتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں عیب یا ذلت کی کیا بات ہے۔

حضرت تھانویؒ کا ایک واقعہ | کانپور میں ایک مقدمہ چل رہا تھا۔ کسی طرح طے ہی نہ ہوتا تھا۔ حاکم نے کہا کہ بہتر یہ ہے کہ تم کسی کو حکم بنا کر فیصلہ کرا لو، پھر اس فیصلہ کو عدالت کی طرف سے نافذ کر دیا جائے گا۔ فریقین حکم بنانے پر راضی ہو گئے۔ اس کے بعد عدالت کی طرف سے کئی علماء کا نام لیا گیا مگر کسی پر دونوں فریق کا اتفاق نہ ہوا پھر میرا نام لیا گیا تو دونوں راضی ہو گئے۔ بالآخر میرے نام سن آیا اور مجھے شہادت کے لئے عدالت میں بلایا گیا تو اس وقت بعض دوستوں کا یہ خیال تھا کہ عدالت میں جانا ذلت ہے۔ میں نے کہا اس میں ذلت کی کیا بات ہے بلکہ یہ تو عزت کی بات ہے کہ ہماری شہادت پر ایک مقدمہ کا فیصلہ ہوگا۔ چنانچہ میں گیا اور میرا بیان ہوا۔ اور میری ... شہادت پر اٹھارہ سال کا مقدمہ طے ہو گیا۔ اسی طرح ایک دفعہ میں بریلی گیا تو وہاں کے جنٹ نے مجھ سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا کیونکہ ان کو اہل علم سے ملنے کا شوق تھا۔ اس وقت بھی بعض دوستوں کی یہ رائے تھی کہ جنٹ صاحب مکان پر آئیں، اس میں عزت ہے اور خود جلنے میں ذلت ہے مگر میں نے سوچا کہ اگر وہ یہاں آیا تو ہم کو اس کی تعظیم و استقبال کرنا پڑے گا اور اگر میں جاؤں گا تو وہ میری تعظیم و استقبال کریں گے پھر میں خود گیا اور جنٹ نے نہایت عزت سے تعظیم و استقبال کیا۔ یہ جواب تو دوستوں کے مذاق پر تھا اور نہ اصل بات یہ ہے کہ خدا نے ان کو حکومت دی ہے ہمارے اوپر حاکم بنایا ہے مجھے شرم آتی ہے کہ حاکم کو محکوم بناؤں اور اگر کو اپنے یہاں بلاؤں جب خدا نے ایک شخص کو ہم پر حاکم بنایا ہے تو ادب و تعظیم کا مقتضی یہ ہے کہ ہم اس کے ساتھ وہی معاملہ کریں جو محکوم کو حاکم کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اس لئے جب کوئی حاکم مجھ سے ملنا چاہتا ہے تو میں خود جانا پسند کرتا ہوں۔ مگر آج کل رسم کا غلبہ ہے لوگ

اس کو ذلت سمجھتے ہیں۔

ایک حکایت | اصل مضمون گدی نشینی اور فضائیں میراث ملنے کے متعلق تھا۔ ایک خرابی یہ ہے کہ ہندو ریاست میں ایک مقام پر کوئی قاضی صاحب ایک بننے کے مقروض ہو گئے اس نے نالش کر دی جہاں قاضی صاحب کی زمین فرق ہوئی۔ وہاں خطابت کی آمدنی بھی فرق ہو گئی، کیونکہ عید بقرعید کو قاضی صاحب کی آمدنی ہوتی تھی۔ راوی کہتے تھے کہ انہوں نے ایک سال دیکھا کہ سب لوگ کپڑے بدل کر عید گاہ میں پہنچتے رہے اور امام صاحب کے منتظر ہیں تھوڑی دیر میں دیکھا کہ ایک لالہ صاحب دھوٹی باندھے آ رہے ہیں۔ اس کے آتے ہی لوگوں میں شور ہوا کہ امام صاحب آ گئے ہیں بڑا حیران ہوا کہ یا اللہ یہ کیسا امام ہے۔ کیا بنیاد عید کی نماز پڑھا ہے گا۔ اب وہ بنیا کر سلام کر کے ممبر پر کھڑا ہو گیا اور کہا: اجازت ہے، لوگوں نے کہا جی ہاں اجازت ہے اس کے بعد اس نے کپڑا بچھا دیا اور لوگوں نے روپیہ پیسہ ڈالنا شروع کیا، جب سب دے چکے تو اس نے رقم کو جوڑا۔ اور یہی میں لکھ لیا کہ اس سال عید کو اتنی آمدنی ہوئی۔ پوئلہ باندھ کر گردن پر رکھا اور کہا صاحبو! اجازت ہے لوگوں نے کہا اجازت ہے وہ سلام کر کے اپنے گھر کو چل دیا اور اس کے بعد لوگ بھی اپنے گھر چلے گئے نہ نماز تھی نہ خطبہ۔ انہوں نے پوچھا کہ میاں کیا عید کی نماز نہ ہو گئی تب لوگوں نے تصدیق بیان کیا کہ امام صاحب اس بننے کے مقروض ہیں عیدین کی آمدنی بھی اس نے فرق کرالی ہے اس لئے امام صاحب کئی سال سے نہیں آتے ہم لوگ بدستور آجاتے ہیں اور یہ بنیا آمدنی لے جاتا ہے کئی سال سے نماز نہیں ہوتی۔ یہ نتیجہ ہے امامت اور تقصیر کی مورد وثیت کا کہ ہندو بھی اس کی آمدنی فرق کرانے لگے۔ ایک خرابی اس مورد وثیت میں یہ ہے کہ بزرگوں کے نام کی آمدنی رنڈی بھڑودوں میں صرف ہوتی ہے ہزاروں اوقاف آجکل برباد ہو رہے ہیں کیونکہ بزرگوں کی خانقاہوں کے لئے جو آمدنی وقف تھی اس گدی نشینی کی وجہ سے ان کی اولاد ہی اس کی متولی ہوتی ہے خواہ وہ لائق ہوں یا نالائق۔ پھر تولیت سے گذر کر ملکیت کا دعویٰ ہونے لگا۔ اسی طرح ہزاروں اوقاف برباد ہو گئے۔

(اصلاح ذات البین ص ۴۹)

۲۷ - عید گاہ میں بچوں کے لانے کی ممانعت

عید گاہ میں باوجود کسی مفسدہ کے اس میں جمع ہونا ترک نہ کریں گے بلکہ اس میں جو مفسدہ بچوں کے اجتماع سے ہے اس کی اصلاح کریں گے اور ہم خود کیا اصلاح کریں گے ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام خود اس کی اصلاح فرما گئے ہیں۔ ارشاد ہے جنود المساجد کم صبیہ نکم، کہ اپنی مسجدوں سے اپنے بچوں کو علیحدہ رکھو، لیکن ممکن ہے کہ کوئی صاحب عید گاہ کو مسجد میں داخل نہ کریں اس لئے استدلال مذکور کو کافی نہ سمجھیں تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ مساجد کم میں دو احتمال ہیں یا تو اس کو عام لیا جاوے کہ مطلق مقام صلوٰۃ مراد ہے تب تو عید گاہ کا اس حکم میں داخل ہونا ظاہری ہے۔ اگر اس کو عام نہ لیا جاوے تو گوان الفاظ میں عید گاہ داخل نہ ہوگی لیکن یہ دیکھنا چاہیے کہ آخر علت اس حکم کی کیا ہے سو ظاہر ہے کہ علت اس حکم کی یہی ہے کہ چونکہ بچے پاک صاف نہیں ہوتے ان کی آمد و رفت سے ایسی جگہ ملوث ہونے کا اندیشہ ہے جہاں نماز ہوگی اور اس سے نماز میں خلل پڑیگا اور یہ علت جیسے کہ مسجد میں پائی جاتی ہے عید گاہ میں بھی پائی جاتی ہے لہذا وہاں بھی یہ حکم جاری ہوگا چنانچہ خود عید گاہ کے باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ولتعتزلن الحیض المصلی پس اس مثال سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ وہ کلیہ اس وقت ہے جب کہ وہ امر مطلوب نہ ہو ورنہ مفسدہ کی اصلاح کریں گے اور اس کام کو ترک نہ کریں گے۔ (دعظ اکمال الصوم والعید ص ۷)

۲۸ - حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں ایسا مباہلہ کہ جس سے دیگر انبیاء علیہم السلام کی توہین ہو جائز نہیں

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کی کوکھ میں انگلی چھو دی تھی انہوں نے کہا کہ میں تو بدلہ لوں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً فرمایا کہ بدلہ لے لو اور اپنی کوکھ ان کے سامنے کر دی انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرا بدن تو کھلا تھا اور آپ تو کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً کرتا اٹھا دیا وہ صحابی آپ کے پہلوئے مبارک سے چھٹ گئے اور بوسے دینے لگے اور

عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرا تو یہ مقصود تھا۔ لوگوں نے وفات نامہ میں حضرت عکاسہ کی حکایت گھڑ لی ہے وہ صحیح نہیں۔ صحیح حکایت یہ ہے جو میں نے اس وقت بیان کی ہے۔

ہمارے اطراف میں جتنی کتابیں عورتوں میں رائج ہیں سب گھڑی ہوئی ہیں جیسے غلط کتابیں | سائین نامہ، معجزہ آل نبی، وفات نامہ، نور نامہ، معراج نامہ، علی محمد، البتہ معجزہ ہر نی صحیح ہے۔ اس کے علاوہ جتنی کتابیں قصوں کی ہیں بالخصوص جن کا میں نے نام گنوا دیا ہے سب لغو ہیں اور چھوڑ دینے کے قابل ہیں۔ ایک وہ مسکس ہے جس کا ٹیپ ٹاپ کا مصرعہ یہ ہے۔
” مری یار کیوں دیر اتنی کری “

یہ مسکس بھی نہایت لغو ہے اس کو بھی ہرگز نہ پڑھنا چاہیے اس ظالم نے ابتداء سے انتہا تک خدائے تعالیٰ سے لڑائی کی ہے کہیں انبیاء کے نبوت کے مل جانے پر حسد ہے کہیں سلاطین کی بادشاہت پر رشک ہے اور پھر حسد کے بعد یہ شکایت ہے کہ مجھے کیوں نہیں ملایہ کتابیں ہرگز اپنے پاس یا اپنے گھر میں رکھنے کے قابل نہیں۔ یہ اس قابل ہے کہ اس کو بلاتامل آگ میں رکھ دینا چاہیے معجزہ آل نبی جس میں یہ قصہ لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے کو کسی سائل کو دیدیا اور اس نے بیچ ڈالا۔ بالکل ہی غلط ہے اور لغو ہے، اسی طرح حضرت عکاسہ کی حکایت جو مشہور ہے بالکل غلط ہے۔ (دعظ مضار المعصیت ص ۷)

بعض مصنفین اور دواعظین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت جزئی اس انبیاء کی شان میں گستاخی | طرح بیان کرتے ہیں کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی شان میں صریح گستاخی ہو جاتی ہے۔

۱۔ ارشاد فرمایا کہ یہ جو بعض مصنفین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اور انبیاء پر ثابت کرنے کے لئے یہ کوشش کرتے ہیں کہ ہر ایک فضیلت جزئی میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ثابت کریں خواہ اس کی نسبت کوئی ثبوت نفی سے ہم پہنچ سکے یا نہ خواہ دلائل نفی اس اثبات مدلل کے معارض ہی کیوں نہ ہوں اور خواہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تنقیص ہی ہو جاوے، پر فضیلت جزئی بھی ثابت ہو جائے یہ کوشش پسندیدہ نہیں، کیونکہ فضیلت کلی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت ہے اور کسی جزئی فضیلت کا ثابت ہونا قاذر فضیلت نہیں جیسا کہ کسی صحیح البصر کی آنکھ کا کامل ہونا دلیل اس کی نہیں کہ وہ معقوب علیہ السلام سے افضل ہو۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام کے جس ظاہری کی فضیلت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد وہ

قدرِ حقّی مشہور۔۔۔ (صفحہ سے ثابت ہے اب اس میں فضیلت ثابت کرنے کی کوشش کرنا ایک مبارضہ ہے خود ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور ایہا تم نقیص ہے جمالِ یوسفی علیہ السلام کا جو بے ادبی سے خالی نہیں۔

ہاں یوں کہا جاوے تو سب پہلوؤں کی رعایت ہے کہ حسن کی دو قسمیں ہیں **حسن کی دو قسمیں** ایک وہ جو دفعہ ناظر کو متحیر کر دے مگر اس کے دقائق تامل کرنے سے متناہی ہو جائیں۔ اور اس کا لقب حسن صباحت مناسب ہے اور دوسری قسم وہ ہے جو دفعہ تو متحیر نہ کرے مگر مصداق ہو اس شعر کا کہ

بیزیدک وجہہ حسنا اذا ما زدتہ نظراً۔
اور اس کا لقب حسن ملاحت بہتر ہے، پس قسم اول میں یوسف علیہ السلام کو افضل الخلق کہا جائے، اور قسم ثانی میں ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ (مقالات حکمت ۱۱، دعوات عبدیت حصہ اول)

(ب) آج کل بعض نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ نبوی کی ایسی تفریف جس سے دوسرے کی تنقیص ہو میں کتاب لکھی ہے "سیرۃ النبی" اس کا نام ہے۔ مولوی علی بنمائی کی تصنیف ہے) اور آپ کو جامع اوصاف کمالات قرار دیکر اس کو آڑ بنا لیا ہے دوسرے انبیاء کرام کی توہین کا۔ آپ کے تو کمالات ظاہر کئے ہیں، اور دوسرے انبیاء پر حملہ کیا ہے۔ ان کی تنقیص کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:-

حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں سیاست تھی، حکومت تھی ترجمہ تھا۔ باقی اور انبیاء علیہم السلام میں سے کسی میں سیاست نہ تھی کسی میں ترجمہ نہ تھا کسی میں یہ صفت نہ تھی کسی میں وہ صفت نہ تھی۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو اپنے نزدیک مدح کی اور دوسرے انبیاء کی تنقیص کی، ان لوگوں کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائیوں کے ساتھ یہ معاملہ ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ہم باپ کی تو تعظیم کریں اور اس کو راضی کریں اور اس کے بھائی کی توہین کریں تو ایسی مدح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم۔۔۔۔۔ کب خوش ہو سکتے ہیں، اپنے دعوے کی شہادت پیش کی ہے کہ دیکھو نوح علیہ السلام میں ترجمہ نہیں تھا۔ ترجمہ کا مادہ کم تھا عیسیٰ علیہ السلام میں سیاست کا مادہ کم تھا درویشانہ زندگی تھی۔

میرے سامنے یہ کتاب لائی گئی۔ کاغذ اس کا نہایت عمدہ قیمتی، خط نہایت نفیس پر رونق، ظاہر تو اس کا ایسا اور اندر اس میں یہ خرافات بھری ہیں کہ نوح علیہ السلام میں ترجمہ نہ تھا عیسیٰ علیہ السلام

میں سیاست نہ تھی، کس قدر بے ادبی کی انبیاء علیہم السلام کی شان میں۔

اے صاحبو! یہ کیسے معلوم ہوا کہ ان انبیاء میں یہ مادے نہ تھے کیا مادہ **ہر خوبی کا ہر وقت ظہور لازم نہیں** کے لئے ظہور بھی لازم ہے اگر ایک شخص کی بابت معلوم ہوا کہ بڑا سخی

ہے۔ آپ اس کے پاس گئے اس وقت دیکھا کہ وہ خرچ بھی نہیں کر رہا تھا پس آپ نے حکم لگا دیا کہ یہ چھوٹ ہے کہ وہ بڑا سخی ہے اس کو یہی کہا جاوے گا کہ جس وقت آپ گئے اس وقت ظہور کا موقع نہ ہو گا ظہور خدات کے موقع پر جا کر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ کتنا بڑا سخی ہے، ایسے انبیاء علیہم السلام میں سب کمالات موجود ہوتے ہیں مگر وہ خدا تعالیٰ جس کے ظہور کا حکم فرماتے ہیں۔ اس کا ظہور ہوتا ہے۔

نوح علیہ السلام تو ایسے رحیم تھے کہ نو سو پچاس برس تک قوم کے ہاتھ سے مصائب اٹھاتے رہے مگر بد دعا نہیں کی اس سے زیادہ اور کیا ترحم ہو گا؟ کیا نظیر ہو سکتی ہے اس ترحم کی پھر اس وقت بد دعا فرمائی جبکہ حق تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آگیا۔ اِنَّہٗ لَن یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِکَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ تمہاری قوم میں سے اب کوئی اور ایمان نہیں لائے گا، معلوم ہوا کہ ان میں دونوں مشین تھیں، نو سو پچاس برس تک ترحم کی مشین چلائی۔ اس کے بعد حق تعالیٰ نے حکم دیا کہ دوسری مشین کو بھی چلا دو اب جدھر اللہ تعالیٰ ادھر رہے۔ دیکھو تو نوح علیہ السلام میں ترحم کیسا تھا کہ نو سو پچاس برس تک قوم کی تکالیف پر صبر کیا اور بد دعا نہیں کی۔

ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصنف صاحب کے تحفہ مشق ہیں، **حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ** کہتے ہیں کہ بس وہ توفیق اور صوفی تھے۔ ان میں تمدن اور سیاست

کہاں تھی ان کی تو یہ تعلیم تھی کہ اگر کلہ پڑا پھر مارے تو دوسرا بھی سلنے کر دو۔ مصنف صاحب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ حق ادا کیا ہے، اول تو میں کہتا ہوں کہ مصنف صاحب بدعی ہیں ان کے ذمہ دلیل ہے اور کیا دلیل اس کی کہ ان میں سیاست کا مادہ نہ تھا۔ عدم ظہور سے عدم وجود لازم نہیں آتا۔ دوسری حدیث سے ثابت ہے کہ اخیر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سلطنت کریں گے ان کے سامنے ساری سلطنتیں مٹ جائیں گی سارے عالم کا انتظام ان کی مٹھی میں ہو گا۔ ظاہر ہے کہ جب تک سیاست کا مادہ نہ ہو یہ باتیں ان سے کیسے ہو سکتی ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سیاست کا مادہ نہ تھا۔ حضرت یہ حالت ہو رہی ہے جو جس کے جی میں آتا ہے لکھ مارتا ہے، خوب سمجھ لیجئے کہ انبیاء علیہم السلام میں سارے کمالات ہوتے ہیں مگر جس مادے سے کام لینے کا حکم ہوتا ہے اسی کو کام میں لاتے ہیں۔ (دعطا الجیوة ص ۲۱)

(ج) غضب ہے کہ بعض مصنفین بھی جن پر مقول کا غلبہ ہے اس انداز بیان میں احتیاط

ایک مصنف نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طرح فضیلت بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غار ثور میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جب وہ کفار کے آجانے سے پریشان ہوئے تسلی دی تھی کہ لا تَحْزَنْ لَدُنَّيْهِ مَعْنَا جس میں اول لا تَحْزَنْ فرما کر غم کو ہلکا کر دیا پھر اپنے ساتھ معیت حق کو بیان فرمایا جس میں خدا تعالیٰ کے ذکر کو مقدم فرمایا۔ اور معیت میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی شریک فرمایا کہ صیغہ جمع معنای استعمال فرمایا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کو جب فرعون اور لشکر فرعون کے آجانے سے پریشانی ہوئی اور انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اس پریشانی کو ظاہر کیا تو آپ نے فرمایا۔ کَلَّا لَأَنْ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِيْنِ جس میں سب سے پہلے کَلَّا کا استعمال فرمایا جو دھمکی کے واسطے موضوع ہے عربی میں لفظ کَلَّا کا ایسے ہی موقعوں میں استعمال ہوتا ہے جہاں اردو کا کَلَّا بھی استعمال ہوتا ہے گویا کَلَّے پر طائر مار دیا پھر اپنے ساتھ معیت حق کو بیان فرمایا تو اپنے ذکر کو خدا تعالیٰ کے ذکر سے مقدم فرمایا یعنی لفظ معی کو ر ب سے پہلے ذکر کیا۔ گویا یہ حضرت مصنف میدنا موسیٰ علیہ السلام کو بولنا سکھاتے ہیں کہ حضرت آپ کو خدا کا ذکر اپنے ذکر سے پہلے کرنا چاہیے تھا۔ گویا ان کو آداب کلام بھی بخود با اللہ معلوم نہ تھے پھر یہ بھی وجہ فضیلت کی بیان کی کہ موسیٰ علیہ السلام نے معی بصیغہ مفرد بیان فرمایا جس میں معیت البیہ کو اپنے ساتھ خاص کیا قوم کو اپنے ساتھ اس دولت میں شریک نہ کیا۔ مجھے اس مصنف صاحب پر تعجب ہوتا ہے کہ ان کے قلم سے یہ مضمون نکلا کیونکر، بس میں تو یہ کہوں گا کہ

”سخن شناس نئی دہرا خطا اینجا است“

اول تو ان کو جزئیات میں کلام کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کلیہ منصوبہ کیا کچھ کم ہیں جو جزئیات غیر منصوبہ سے آپ کا افضل ہونا ثابت کیا جائے اگر ان کو ایسا ہی شوق تھا تو یہ غور کرنا چاہیے تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مخاطب کون ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مخاطب کون ہے، کیونکہ بلاغت کا مسئلہ ہے کہ ہر حال و ہر موقع و محل کے لئے ایک ہی طرز کلام نہیں ہوتا بلکہ ہر موقع کے لئے جدا طرز ہوا کرتا ہے

”ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مقامے دارد“

میں بطور احتمال کے کہتا ہوں اور مانع کے لئے بمقابلہ استدلال کے احتمال کافی ہے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخاطب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ جیسے لوگ ہوتے تو وہ بھی دی فرماتے

چہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب وہ لوگ ہوتے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخاطب تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہی فرماتے جو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ آپ کے ساتھ غار ثور میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی جاں نثاری رضی اللہ عنہ تھے جن کی جاں نثاری کی یہ حالت تھی کہ جب حضور غار

ثور پہنچے ہیں تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا چادر یا لنگی پھاڑ کر غار کے تمام سوراخ بند کئے تاکہ کوئی موزی جانور نکل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا نہ دے۔ سارے سوراخ تو بند ہو گئے مگر ایک رہ گیا۔ اس کے لئے کپڑا نہ رہا تھا اس پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنا پیر لگا لیا کہ اگر کچھ نکلا تو میرے ہی پر میں کاٹ لے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچ سکے گا۔ اس حالت میں جو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو کفار کے آجانے سے پریشانی ہوئی ظاہر ہے کہ وہ پریشانی اپنی جان کے خوف سے نہ تھی بلکہ محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال سے پریشانی ہوئی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ دشمن آپ کو دیکھ پائیں اور حضرت کو اذیت پہنچائیں۔ جو شخص اتنا عاشق ہو جس نے سانپ کے بل میں اپنے پیر رکھ دیے جس میں سانپ نے کاٹ بھی لیا تھا اس کو بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے اپنی جان کا خیال ہو سکتا ہے ہرگز نہیں ان کو جو کچھ خطرہ تھا وہ محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اذیت کا تھا اور اس خطرہ کا منشاء بھی محض یہ تھا۔

”عشق است دہزار بدگمانی“

ورنہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ دولت توکل سے پوری طرح مالا مال تھے، ایسے شخص کی تسلی کے لئے وہی کلام مناسب تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمایا کہ اول ان کے غم کو ہلکا کرنے کے لئے ”لا تَحْزَنْ“ فرمایا۔ پھر معیت حق میں ان کو بھی شریک کیا اور چونکہ آپ کو حصر مقصود نہ تھا اس لئے موافق اصل وضع کے ذکر اللہ کو اپنے ذکر سے مقدم فرمایا۔

اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو لوگ تھے وہ نہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے برابر متوکل نہ تھے نہ ایسے جاں نثار تھے کہ ان کو اپنی جان کا خطرہ

بالکل نہ تھا۔ محض موسیٰ علیہ السلام کی اذیت کا خطرہ تھا بلکہ ظاہر یہ ہے کہ ان کو اپنی جان کا خطرہ تھا پھر خطرہ ہی نہیں بلکہ انہوں نے اس کو جزم دیقین کے ساتھ ظاہر کیا۔ قَالَ أَصْحَابُ مُوسَىٰ إِنَّا لَمُدْرِكُوكُفٍ جس میں اَن اور جملہ اسمیہ اور لام تاکید۔ تین موکدات موجود ہیں یعنی بس ہم تو یقیناً پکڑے گئے حالانکہ بار بار دیکھ چکے تھے کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کے مقابلہ میں کس طرح

مرد فرمائی اور اس وقت بھی خدا کے حکم سے اور اس کے وعدہ نصر کو سن کر چلے تھے ان تمام امور کے ہوتے ہوئے اتنی پریشانی کر اپنے پچھلے جانے کا ایسا جزم ہو گیا۔ صاف ان کے غیر متوکل اور غیر کامل الیقین ہونے کی دلیل ہے اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے دھماکا فرمایا کلاً۔ گویا چیت لگا دیا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا جس تاکید سے ان لوگوں نے اپنے پچھلے جانے کو ظاہر کیا تھا۔ اس کا جواب ایسی ہی تاکید سے ہو سکتا تھا جو لفظ کلاً میں ہے پھر چونکہ یہ لوگ بوجہ کامل الیقین نہ ہونے کے معیت حق سے محروم تھے۔

اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے حصر کے لئے مؤخر کو مقدم کیا اور مقدم کو مؤخر کیا کیونکہ قاعدہ ہے تقدیم ماحقق الناحیہ مفید المحصل اور اسی وجہ سے معنی بصیغہ مفرد فرمایا۔ صیغہ جمع استعمال نہیں فرمایا۔ مطلب یہ تھا کہ میرے ہی ساتھ میرا پروردگار رہے تم بوجہ ضعیف الیقین ہونے کے معیت حق سے محروم ہو، اب بتلائے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مقصود کو ادا فرمانا چاہے تو موسیٰ علیہ السلام نے ادا فرمایا کیا اس وقت بھی آپ لا تحزن ان اللہ معنا ہی فرماتے ہیں جو لوگ بلاغت سے کچھ بھی ذوق رکھتے ہیں وہ کبھی اس کے قائل نہ ہوں گے بلکہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ اس مقصود کے ادا کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہی طرز اختیار فرماتے تو موسیٰ علیہ السلام نے اختیار فرمایا صحیح تفصیلی جزئیات میں کلام ایسا ہوتا ہے کہ اس کو ایک ادنیٰ طائب علم بھی احتمال نکال کر باطل کر سکتا ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل میں ہمیشہ اجمالی گفتگو کرنا چاہیے تفصیلی کلام کبھی نہ کرنا چاہیے۔ (وعظ الرف والوعظ ص ۲۱)

۲۹۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ کا معشوق قرار دینا سخت بے ادبی اور گستاخی ہے

بعض لوگ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا معشوق کہتے ہیں، چنانچہ شعراء اشعار غنیہ میں اس مضمون کو باندھتے ہیں جو عشق کا خاصہ ہے عاشق کو مضطرب کر دینا۔ اور حق تعالیٰ اس سے منزہ ہے۔ مگر غضب یہ ہے کہ بعض بیباکوں نے اس اضطراب کو بھی منسوب اللہ تعالیٰ کے لئے مان لیا، چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے

پے تسکین خاطر صورت پیرا بن یوسفؑ محمدؐ کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا قد کا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تو دنیا میں بھیجا اور چونکہ وہ معشوق تھے اور عاشق کو بدن معشوق کے قرار نہیں ہوتا۔ اس لئے تسلی کے واسطے سایہ ان کا وہاں رکھ لیا کہ اسی سے مجھ کو تسلی رہے گی۔ جیسے یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کے کرتے سے تسلی ہو گئی تھی۔ یہ نعت نہیں یہ حد درجہ کی بے ادبی ہے باری عز اسمہ کی جناب میں اور نیز حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بھی ایسے اشعار سنا اور پڑھنا گناہ ہیں، احتراز ضروری ہے بعض دینداروں کو بھی خطبہ ہوتا ہے کہ اشعار غنیہ خواہ ان کا مضمون شریعت پر منطبق ہوتا ہو یا نہ ہونا ہو ذوق شوق سے پڑھتے ہیں۔ بعض اشعار نعت کے ایسے ہیں کہ ان میں دیگر حضرات انبیاء علیہم السلام کی بے ادبی ہوتی ہے۔ الحاصل معشوق کہنا یہ سخت بے ادبی ہے۔ اس لئے کہ عشق خاصہ آدمی کا ہے اس لئے کہ عشق نام ہے نفس کے ایک خاص انفعال کا اور اللہ تعالیٰ انفعال اور ثبات سے پاک ہے۔ ہاں یہ کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول ہیں اگر کوئی عشق کو معنی مجازی میں لے لے تو حق تعالیٰ کی جناب میں ایسا اطلاق اذن شرعی کا محتاج ہے۔ البتہ اگر کسی مغلوب الحال کے کلام میں ہو۔ اس کو معذور سمجھیں گے بدون غلبہ حال کے کسی کو اجازت نہ ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ مقربان الہی کو محبوبان مجازی پر قیاس کرنا صحیح نہیں۔ (دعظ ترجح المفسدہ ۱۵۱، دعوات عبدیت حصہ ششم)

۳۰۔ مردہ کی روح دنیا میں واپس نہیں آتی۔

کسی مردہ کی روح کا جیسا کہ عوام میں مشہور ہے کسی پرانا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ گو بعض آثار سے ایسا شبہ ہوتا ہے کیونکہ قرآن میں ہے، کافر بعد موت کے کہتا ہے۔ رَبِّ اَرْجِعْ عَلَيَّ اَعْمَلُ صَالِحًا فَمَا تُرَكِّتُ کَلَامًا اِنَّهَا کَلِمَاتٌ هُوَ قَائِلُهَا وَمِنْ وَرَائِهِمْ بَرْزَخٌ اِلَى يَوْمٍ يُبْعَثُونَ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت اور قیامت کے مابین وہ ایسی حالت میں رہتے ہیں کہ دنیا میں آئینی تمنا ہوتی ہے لیکن برزخ یعنی حال دنیا میں آنے سے باز رکھتا ہے اور عقلاً بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر تنفس میں مردہ تواسے یہاں آکر بیٹھ پھرنے کی کیا ضرورت ہے اور اگر معذب ہے تو قرنگان عذاب کیونکر چھوڑ سکتے ہیں کہ وہ دوسرے کو لپیٹتا پھرے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے حدیث میں آیا ہے کہ ہر شخص کے ساتھ ایک فرشتہ اور ایک شیطان رہتا ہے ممکن ہے کہ وہی شیطان ہوتا ہے جس کا لوگوں پر اثر

ہوتا ہے اور جس شخص پر مسلط تھا اسی کا نام لے دیتا ہو اور ممکن ہے کہ دوسرا کوئی شیطان ہو، اور شیطان کے متعلق حدیث میں آیا ہے۔ "بجری منی اللہ منی مجری اللہ" اور مکاتل غرض کہ جنورہ اور شیطان کا اثر کہ وہ بھی شریحین میں ہوتا ہے اور مردہ ردوئوں کا اٹھیساکہ مشہور ہے صحیح نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ تصرف کرنے کے لئے ارجح کا یہاں آنا ضروری نہیں دور سے بھی تصرف ہو سکتا ہے، جواب ارشاد فرمایا کہ احتمال تو ہے لیکن جب تک اس کی دلیل قوی نہ ہو اس احتمال کو قبول نہیں کیا جاسکتا، محض امکان کافی نہیں۔ (مجادلات معدلت وادعوات عبدیت حصہ ہفتم)

(غیر مقلدین کے اعتراضات کا حل)

۳۱۔ اور اس کا جواب

کسی کو شبہ قیاس نقی کے بطلان کا نہ ہو کہ ظاہر وہاں بھی اتباع ہے ایسے امر کا جس کی تحقیق یقینی نہیں کیونکہ حکم مجتہد فیہ ظاہر ہے کہ ظن ہوتا ہے، خصوص میں جب کہ دوسری آیت میں بھی اتباع ظن کی مذمت فرمائی گئی ہے۔ "لَا تَتَّبِعُوا الْاَوَّلَ وَالْاٰخِرَ وَلَا تَتَّبِعُوا الْاَوَّلَ وَلَا الْاٰخِرَ وَلَا تَتَّبِعُوا الْاَوَّلَ وَلَا الْاٰخِرَ وَلَا تَتَّبِعُوا الْاَوَّلَ وَلَا الْاٰخِرَ"۔

جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ جب دلائل شرعیہ مستقلہ سے مسئلہ تحقیق کو پہنچ گیا کہ قیاس اور اجتہاد جائز اور واجب العمل ہے تو اس پر مایوسی لازم ہے، علم صادق نہ آوے گا بلکہ وہ مالک ہی علم کا مصداق ہوگا کیونکہ علم کے عموم میں وہ دلائل شرعیہ مستقلہ ثبوت قیاس بالیقین داخل ہیں اگر قیاس کے متعلق اس علم کا تحقق نہ ہوتا تو بے شک اس کا اتباع مایوسی لازم ہے، علم کا اتباع ہوتا اور اب تو وہ اتباع مالک بہ علم کا ہوگا خوب سمجھ لو اور اتباع ظن کی جو مذمت آتی ہے وہاں ظن کے معنی اصطلاح فقہی نہیں بلکہ ظن اصطلاح قرآن میں عام ہے، باطل یقینی اور مخالف دلیل صحیح کو بھی، چنانچہ منکرین مبعوث کے قول میں ان ظن الاظن آیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کو اس کا احتمال بھی نہ تھا۔ چہ جائے کہ احتمال راجح بلکہ وہ اس کو اپنے علم میں صحیح کے خلاف سمجھتے تھے پھر بھی اس کو ظن کہا گیا پس ثابت ہو کہ اصطلاح قرآن میں ظن عام ہے امور باطلہ کو بھی، پس معنی آیت ذم ظن کے یہ ہیں۔ "ان یتبعون الا ما خلف الدلیل القطعی وکل ما خلف الدلیل القطعی لا یعنی من الحق شیئاً بل ہو باطل قطعاً۔ پس اس آیت سے بھی شبہ

لہ وہ نہیں پردی کرتے ہیں مگر گمان کی اور کوئی شک نہیں کہ گمان حق سے بے نیاز نہیں کرتا ہے۔

کی گنجائش نہ رہی۔ (تطہیر الاعضاء ص ۱)

۳۲۔ انقطاع اجتہاد پر شبہ کا جواب

غیر مقلد کہا کرتے ہیں کہ کیا حنفیوں کے پاس انقطاع اجتہاد کی وجہ آگئی ہے حالانکہ قدرتی قاعدہ ہے کہ ہر شئی عموماً اپنی ضرورت کے وقت ہی ہو اگر قیاسی ہے جس فصل میں عموماً بارش کی جانب حاجت ہوتی ہے اسی فصل میں بارش ہونے کا قاعدہ ہے اسی طرح ہوائیں حاجت کے وقت چلا کرتی ہیں جہاں سردی زیادہ پڑتی ہے وہاں کے جانوروں کے اون بہت بڑے ہوتے ہیں اس کے پیشتر نظائریں اسی طرح جب تک تدوین حدیث کی ضرورت تھی بڑے بڑے قوی حافظہ کے لوگ پیدا ہوئے تھے اب دیسے نہیں ہوتے اور تو ادراہل حدیث میں سے بھی کسی کو بخاری اور مسلم تک خود امام بخاری اور مسلم کی طرح مع سند حفظ نہیں اسی طرح جب تک تدوین دین کی ضرورت تھی قوت اجتہاد یہ لوگوں میں بخوبی موجود تھی، اب چونکہ دین مدون ہو چکا ہے، اور اصول و قواعد مہم ہو چکے ہیں اب اجتہاد کی اتنی ضرورت نہیں رہی، ہاں جس قدر اب بھی اجتہاد کی ضرورت پڑتی ہے اتنی قوت اجتہاد یہ بھی باقی ہے (یعنی اصول مجتہدین کے تحت میں جزئیات جدیدہ کا استخراج کر لینا۔ (مجادلات معدلت ص ۲ حصہ ہفتم)

۳۳۔ آج کل دین کی حفاظت کے لئے تقلید شخصی

نہایت ضروری ہے

گوئی نفس یہ بھی جائز ہے کہ مختلف لوگوں کا اتباع ہو مثلاً کسی شیخ سے کوئی شغل پوچھ لیا اور کسی دوسرے سے اور کوئی شغل پوچھ لیا تو اسی طرح متعدد کا اتباع بھی فی نفسہ جائز ہے اور سلف کی یہی حالت تھی کہ کبھی امام حنفیہ سے پوچھ لیا کبھی ازرائی سے اور اسی طرح سلف کی حالت دیکھ کر آج بھی لوگوں کو یہ لاپرواہ ہوتا ہے کہ کوئی نفس تو یہ جائز ہے مگر ایک عارض کی وجہ سے ممنوع ہو گیا اس کے سمجھنے کے لئے اول ایک مقدمہ سن لیتے وہ یہ کہ حالت غالب کا اعتبار ہوتا ہے۔ سو حالت غالب کے اعتبار سے آج میں اور اس وقت میں فرق ہے کہ اس وقت کے لوگوں میں تدوین غالب تھا۔ ان کو مختلف لوگوں سے پوچھ لیا تو

اتفاقاً طور پر ہوتا ہے اور یا اس لئے کہ جس کے قول میں زیادہ احتیاط ہوگی اس پر عمل کریں گے بس اگر تین کی اب بھی وہی حالت ہوتی تو ایک کو خاص کر کے اور اس کی تقلید کرنے کی ضرورت نہ تھی، مگر اب تو وہ حالت ہی نہیں رہی اور کیسے رہتی۔ حدیث میں ہے، ثم یفشو الکذب کہ خیر القرون کے بعد کذب پھیل جائے گا اور لوگوں کی حالت بدل جائے گی سو بقینا خیر القرون سے بعد ہوتا گیا اتنی ہی لوگوں کی حالت ابتر ہوتی گئی اب تو وہ حالت ہو گئی ہے کہ عام طور پر غرض پرستی غالب ہے۔۔۔۔۔ ہے اب مختلف لوگوں سے اس لئے پوچھا جاتا ہے کہ جس میں اپنی غرض نکلتی ہو اس پر عمل کریں گے۔

ہمارے وطن کے قریب ایک قصبہ ہے وہاں ایک مرد کا ایک عورت خود غرضی کا ایک واقعہ ہے۔۔۔۔۔ ہوا پھر بعد میں معلوم ہوا کہ ان دونوں نے ایک عورت کا دودھ پیا تھا۔ ایک شخص میرے پاس دریافت کرنے آئے کہ اب کیا کرنا چاہیے میں نے کہا کہ ان کا نکاح جائز نہیں، ان میں جدائی کر دینی چاہیے۔۔۔۔۔ کہنے لگے اس میں تو بڑی بدنامی ہے اب تو کوئی صورت جواز کی نکال ہی دیجئے، میں نے کہا اول تو تفریق میں بدنامی نہیں بلکہ تفریق نہ کرنے میں ہے کہ لوگ کہیں گے کہ بھائی بہن کو جمع کر رکھا ہے دوسرے اگر ہو تو ہو اگرے جب شریعت کا حکم ہے تو بدنامی کا کچھ خیال نہیں کیا جاسکتا کہنے لگے اس نے تو پی کر اگل بھی دیا تھا میں نے کہا خواہ اگلا ہو یا نہ اگلا ہو، حرمت کے حق میں یکساں ہے جب میرے پاس انہیں صاف جواب ملا تو وہ دہلی پہنچے وہاں ان کو ایک عامل بالحدیث مل گئے۔ مجھے اس وقت ان پر طعن کرنا منظور نہیں ہے بلکہ اس شخص کی غرض پرستی بیان کرنی ہے کہ اپنی غرض حاصل کرنے کے لئے عامل بالحدیث کے پاس گیا کہ شاید یہاں کوئی بات مل جائے۔ اس نے کہا اگر پانچ گھونٹ سے کم پیائے تو حرمت ثابت نہیں ہوگی۔ بس آپ نے ایک استفطار تجویز کیا کہ ایک لڑکے نے ایک عورت کا دودھ گھونٹ پیا تھا۔ حرمت ثابت ہوئی یا نہیں انہوں نے جواب لکھ دیا کہ لا تحرم المصاة ولا المصتان، آپ بہت خوش ہوئے اور ان میاں بیوی کو وہ فتویٰ لاکر دیدیا کہ یہ بھی تو عالم ہی کا فتویٰ ہے اس پر عمل کر لیا جاوے گا تو کون سی خرابی ہے آج کل لوگوں میں ایسی غرض پرستی ہے بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ بندہ خدا تو کیا گن رہا تھا کہ اس نے گھونٹ پیئے تھے اور بالفرض اگر اس کی تعداد معلوم بھی تھی تو اس کی وجہ ان کے فتویٰ کو تو مانا جنھوں نے حلال بتایا اور ان کے فتویٰ کو نہ مانا جنھوں نے حرام بتایا۔ حالانکہ جنھوں نے حلال بتلایا یہ شخص ان کا ہم مذہب بھی نہ تھا۔ ہاں اگر اول ہی سے اس کا وہ ہی مذہب ہوتا تو مضائقہ نہ تھا، مگر اول تو یہ شخص

ان کے مذہب پر تھا۔ جب دیکھا کہ ان کے مذہب سے اپنا کام نکلتا ہے تو اس کا مذہب لے لیا۔ سو اس نے دین پر دنیا کو ترجیح دی اور افسوس ہے کہ بعض اہل علم کو بھی اس میں شبہ ہو گیا کہ اس میں کیا حرج ہے کہ ایک مجتہد فی مسئلہ میں دوسرے امام کے مذہب پر عمل کر لیا جاوے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ فرما دیا ہے کہ لا تلتزموا بالذہن کہ نیت کا اعتبار ہے سو آج کل دوسرے امام کے مذہب پر دین ہونے کی حیثیت سے عمل نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اپنی دنیوی غرض کے حاصل کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔

علامہ شامی نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک فقیہ نے ایک محدث کے ایک حکایت یہاں اس کی لڑکی کے لئے پیام بھیجا۔ اس نے کہا کہ اس شرط پر نکاح کرتا ہوں کہ رفقہ یدین اور اس میں بالچہر کیا کرو، فقیہ نے اس شرط کو منظور کر لیا اور نکاح ہو گیا اس واقعہ کو ایک بزرگ کے پاس ذکر کیا گیا تو انہوں نے اس کو سن کر ہلکا کر لیا اور بھڑکی دیر سوچ کر فرمایا کہ مجھے اس شخص کے ایمان جاتے رہنے کا خوف ہے اس واسطے کہ جس بات کو وہ سنت سمجھ کر کرتا تھا بدون اس کے کہ اس کی رائے کسی دلیل شرعی سے بدلی ہو صرف دنیا کے لئے اس کو چھوڑ دیا۔ لوگوں کی یہ حالت دنیا طلبی کی ہو گئی ہے۔

ایسے وقت میں اگر تقلید شخصی نہ ہو تو یہ ہو گا کہ ہر مذہب میں سے جو صورت اپنے تقلید شخصی کی ضرورت مطلب کی پاویں گے اختیار کریں گے مثلاً اگر وضو کرنے کے بعد اس کے غونچل آیا تو اب امام ابوحنیفہ کے مذہب پر تو وضو ٹوٹ گیا اور امام شافعی کے مذہب پر نہیں ٹوٹا۔ سو یہاں تو یہ شخص شافعی مذہب اختیار کر لے گا اور پھر اس نے بیوی کو بھی ہاتھ لگایا تو اب شافعی کے مذہب پر وضو ٹوٹ گیا اور ابوحنیفہ کے مذہب پر نہیں ٹوٹا تو یہاں حنفیہ کا مذہب لے لے گا حالانکہ اس صورت میں کسی امام کے نزدیک وضو نہیں رہا۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک تو خون نکلنے کی وجہ سے ٹوٹ گیا اور امام شافعی کے نزدیک عورت کے چھونے کی وجہ سے، مگر اس شخص کو ذرا پرواہ نہ ہوگی، ہر امام کی رائے کو وہ اسی میں قبول کر لیا جو اس کے مطلب کے موافق ہے اور جو اس کے مطلب کے خلاف ہے اس کو نہ مانے گا سو دین تو رہے گا نہیں۔ غرض پرستی رہ جاوے گی پس یہ فرق ہے ہم میں اور سلف میں، ان کو تقلید شخصی کی ضرورت نہ تھی کیونکہ ان میں تین غالب تھا اور سہولت اور غرض کے طالب نہ تھے بخلاف ہمارے کہ ہم میں غرض پرستی غالب ہے اور ہم سہولت پسند اور غرض کے بندے ہیں اس لئے ہم کو اس کی ضرورت ہے کہ کسی خاص ایک شخص کی تقلید کریں کہ ہم تقلید شخصی کوئی نفہ

واجب یا فرض نہیں کہتے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ تقلید شخصی میں دین کا انتظام ہوتا ہے اگر ترک تقلید میں بے انتظامی ہوتی ہے ترک تقلید کی حالت میں اگر تمام مذاہب سے احوط کو تلاش کر کے عمل کرے گا تو مصیبت میں رہے گا اور اگر اس کو تلاش کرے گا تو غرض پرستی میں مبتلا ہو جائے گا پس تقلید میں راحت بھی ہے اور نفس کی حفاظت بھی ہے اور جیسے مجتہدین کی تقلید شخصی میں یہ حکمت ہے اسی طرح اس مذہب کے علماء و اخبار میں سے ایک مذہب کے علماء میں بھی آپس میں مسائل کے اندر اختلاف، پس اگر ایک عالم کو متعین نہ کیا جائے گا تو اس کے اندر بھی اندیشہ ہے کہ کہیں غرض پرستی میں نہ پڑ جائے کہ جس عالم کی رائے نفس کے موافق ہوئی اس کو مان بھی لیا اور جس کی رائے نفس کے خلاف ہوئی اس کو نہ مانا۔ (اتباع المینب ۳)

۳۴ - اس اعتراض کا جواب کہ مقلدین حدیث چھوڑ کر اقوال ائمہ پر عمل کرتے ہیں؟

بعض اہل تعصب کو ائمہ کی تقلید میں ایسا جمود ہوتا ہے کہ وہ امام کے قول کے سامنے احادیث صحیحہ غیر معارضہ کو بے دھڑک رد کر دیتے ہیں۔ میرا تو اس سے رد ٹکٹا کھڑا ہوتا ہے چنانچہ ایک ایسے شخص کا قول ہے۔ "قال تال بسیار است" مراد قال ابو حنیفہ در کار است۔ اس جملہ میں احادیث نبویہ کے ساتھ کیسی بے اعتنائی اور گستاخی ہے۔ خدا تعالیٰ ایسے جمود سے بچائے، ان لوگوں کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں اب اس تقلید کو کوئی شرک فی النبوت کہہ دے تو اس کی کیا خطا ہے مگر یہ بھی غلطی ہے کہ ایسے دوچار ہالوؤں کی حالت دیکھ کر سارے مقلدین کو شرک فی النبوت سے مطہون و متہم کیا جائے خدا نہ کرے سب مقلد ایسے کیوں ہوتے۔ میرے دل میں تقلید کی تفسیر یہ ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث و ارشادات پر عمل کرتے ہیں اس تفسیر پر جو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کی ہے کیونکہ وہ ہمارے نزدیک درایت و فقہ میں اعلیٰ پایہ ہیں اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا کیونکہ امام صاحب کا فقیہ الامت ہونا تمام امت کو تسلیم ہے اور ان کے علوم اس پر شاہد عدل ہیں۔ اب بتلائیے اس تفسیر کی بناء پر تقلید میں شرک فی النبوت کیونکر ہو گیا۔ اس لئے کہ جس کے نزدیک تقلید کا یہ درجہ ہوگا اس کے نزدیک اتباع حدیث مقصود بالذات ہوگا اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ محض واسطہ فی التہدیم ہوں گے جو شخص بلا واسطہ عمل بالحدیث کا دعویٰ

کرنا ہے وہ حدیث کا اتباع اپنی فہم کے ذریعہ سے کرتا ہے، اور یقیناً سلف صالحین کی فہم و عقل و رع و تقویٰ و دیانت و انانیت و خشیت و احتیاط جاریے اور آپ سے زیادہ بھی، تو بتلائیے عمل بالحدیث کس کا کامل ہوا۔ آپ کا جو اپنی فہم کے ذریعہ سے حدیث پر عمل کرتے ہیں یا مقلد کا جو سلف کے ذریعہ سے حدیث پر عمل کرتا ہے اس کا فیصلہ اہل انصاف خود کر لیں گے بہر حال تقلید کی جو تفسیر میں نے بیان کی ہے یہ علم عظیم ہے اس کو یاد رکھئے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب | رہا مدعیان عمل بالحدیث کا یہ اعتراض کہ تمہارے سامنے ایک حدیث پیش کی جائے اور تم اس کو نہیں مانتے محض اس وجہ سے کہ تمہارے امام کا قول اس کے خلاف ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کو تقلید حدیث مقصود بالذات نہیں بلکہ تقلید قول امام مقصود ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس مسئلہ میں اختلاف ہوتا ہے اس میں احادیث مختلف ہوتی ہیں، جس حدیث کو تم ہمارے سامنے پیش کرتے ہو۔ ہمارا عمل اس حدیث پر نہیں تو اس مسئلہ میں دوسری حدیث پر ہمارا عمل ہوتا ہے اور تم اس حدیث کو نہیں مانتے جس کو ہم مانتے ہیں پھر تمہارا اد پر کیا الزام ہے تم پر بھی تو الزام ہے۔ رہا تمہارا یہ کہنا کہ ہماری حدیث راجحہ تمہاری مرجوحہ ہے اس کا جواب یہ ہے کہ طریق ترجیح کا مدار ذوق پر ہے۔ تمہارے ذوق میں ایک حدیث راجحہ ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ذوق میں دوسری راجحہ ہے۔ اور ہمارے نزدیک امام کا ذوق تمہارے ذوق سے اہم و دارن جہ ہے۔ پھر تمہارا یہ کہ آپ کو عامل بالحدیث کہنا اور مقلدین کو عامل بالحدیث نہ کہنا محض ہٹ دھرمی ہے۔ اسی کو میں دوسرے عنوان سے کہتا ہوں کہ عمل بالحدیث کے معنی آیا عمل بکل الاحادیث ہے یا عمل ببعض الاحادیث اگر کہو عمل بکل الاحادیث مراد ہے، سو یہ تم بھی نہیں کرتے اور یہ ممکن بھی نہیں۔ کیونکہ آثار مختلفہ و احادیث متعارضہ میں سب احادیث پر عمل نہیں ہو سکتا یقیناً بعض پر عمل ہوگا اور بعض کا ترک ہوگا۔ اور اگر عمل ببعض الاحادیث مراد ہے تو اس معنی کو ہم بھی عامل بالحدیث ہیں۔ پھر تم اپنے ہی کو عامل بالحدیث کہہ رہے ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ مسائل منصوصہ تو بہت کم ہیں زیادہ مسائل اجتہادیہ | مسائل اجتہادیہ میں اور ان میں مدعیان عمل بالحدیث بھی حنفیہ کی کتابوں سے فتوے دیتے اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ یا اگر کسی امام کے قول کو لیتے ہیں تو زیادہ مسائل میں آپ بھی مقلد ہوئے تو یہ کیا بات کہ تقلید کرنا تو حرام انہیں صرف تقلید کا نام لینا ہی ناجائز اور شرک ہے۔ اور اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ وہ تمام مسائل میں احادیث منصوصہ ہی پر

فاعل ہوتا ہے جس کا قرینہ سیاق کلام ہے، کیونکہ اوپر ارشاد ہے قُلْ مَنْ أَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِمُوسَى نُورًا وَهُدًى لِلنَّاسِ يَجْعَلُونَ مِنْهَا طَرِيقًا تَبْدُ وَتَنْهَوْنَ عَنْهَا وَتَحْفُظُونَ كِتَابًا وَعَلَّمْتُمْ مَا لَمْ تَعْلَمُوا أَنْتُمْ وَلَا آبَاءُكُمْ قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ۔ انہوں نے خوب خبر لی مگر انا طری طیب غلطی کرے تو اس سے محمود خاں اور عبد المجید خاں ہے تو بدگمانی جائز نہ ہو جاوے گی ہاں ہوت خاں کو برا کہو تو ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں یہ کیا کہ انا طریوں کے ساتھ محققین کو بھی ایک لکھو دی سے ہانکا جائے محققین کے دلائل سے ہوتے تو ابن تیمیہ کو صوفیہ پر انکار کی ہرگز جرأت نہ ہوتی۔ خلاصہ یہ کہ ذکر کا ایک درجہ یہ ہے کہ اللہ کے نام کو یاد کر دو۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ بواسطہ نام کے ذات کو یاد کر دو۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ نام کا بھی واسطہ نہ رہے۔ محض ذات کے ذکر پر قادر ہو جائے۔ (ذکر اللہ ص ۲۷)

۳۷۔ حنفی کہلانے پر اعتراض کا جواب

مبتوع صرف حق تعالیٰ ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ اور ائمہ مجتہدین کے اتباع کے یہ معنی ہیں کہ حق تعالیٰ کا اتباع ان کے ارشاد کے موافق کیا جاوے تو حنفی کہتے اور مجتہدی کہنے میں جواز اور عدم جواز میں کچھ فرق نہ ہوگا۔ کیونکہ اگر اس نسبت سے اتباع بالاستقلال وبالذات مراد لیا جائے، تب تو یہ نسبت دونوں میں صحیح ہوگی۔ کیونکہ ایسا اتباع تو خدا سے تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور اگر اس نسبت کے یہ معنی ہیں کہ ان کے ارشاد کے موافق حق تعالیٰ کے احکام کا اتباع کیا جاتا ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے دونوں کی نسبت صحیح ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک کی نسبت کو جائز کہا جاوے اور دوسرے کی نسبت کو ناجائز۔ پس معلوم ہو گیا کہ حنفی کہنے میں کوئی قباحت نہیں۔ اس نسبت کو کفر و شرک کہنا غلطی ہے کیونکہ اس نسبت سے یہ مراد نہیں ہے کہ یہ مبتوع مستقل ہیں بلکہ یہی معنی ہیں کہ ان کی تحقیق کے موافق حق تعالیٰ کے احکام کا اتباع کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہ نے جو فروع مستنبط کئے ہیں ہم کو ان کے متعلق اجمالات بات معلوم ہے کہ وہ ہم سے زیادہ صحیح سمجھے۔ اس وجہ سے ہم ان کی تحقیقات کا اتباع کرتے ہیں اور نہ بحیثیت مستقل مبتوع ہونے کے ان کا اتباع نہیں کرتے۔ تو جیسی نسبت ہم حضرت ابو حنیفہ کی طرف کرتے ہیں ایسی نسبت

خدا کے کلام میں بھی دوسرے کی طرف موجود ہے ارشاد ہے۔ وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنْابَ إِلَيْهِ قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ۔ سو یہاں تو سبیل کی نسبت رسول اور ان لوگوں کی طرف کی جو حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ وَيُحْذَرُونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ، میں سبیل کی نسبت اللہ کی طرف ہے تو یہ ایسا کہ

ع عباداتنا شتى وحسنك واحد۔ من بہر انداز قدرت می شناسم بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوشش۔ بات یہ ہے کہ جن کو محبت ہوتی ہے وہ محبوب کو ہر حالت میں پہچان لیتے ہیں۔ اسی طرح جنہوں نے دین کو سمجھا ہے ان کے سامنے وہ قرآن کے لباس میں آوے یا حدیث کے لباس میں وہ یہی شعر پڑھ دیتے ہیں بعض نے حدیث کو اور بعضوں نے فقہ کو صرف عنوان بدلنے سے قرآن سے الگ کر دیا حالانکہ وہ سب اصل میں ایک چیز ہیں اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک مطب لکھنؤ کا کہلاتا ہے اور ایک دہلی کا مگر ہیں دونوں طب یونانی، سو اسی طرح قرآن و حدیث اور فقہ گو فرعیات کے اندر مختلف ہیں مگر ہیں سب دین الہی، اگر فرعیات میں تھوڑا سا اختلاف ہو گیا تو کیا وہ دین الہی نہیں رہا۔ جیسے طب یونانی اصول کا نام ہے تو کیا لکھنؤ کا مطب اور دہلی کا مطب فرعیات کے اندر مختلف ہونے سے طب یونانی نہیں رہا۔

خلاصہ ص ۱۱۱ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جس کو سبیلی فرمایا تھا اس کو یہاں سبیل من مقصد اتباع الہی ہے۔ اناب الی فرما رہے ہیں، پس سبیلی اور سبیل من اناب الی مصداق کے اعتبار سے ایک ہوئے۔ اسی طرح ایک جگہ فرمایا بَشِّرْ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَثِيرًا وَلَا يُغْنِي عَنْهُمُ آثَارُ مَا كَانُوا يَكْفُرُونَ۔ اور دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کیجئے۔ اب اس کے کیا معنی ہیں ظاہر ہے کہ اسی شریعت محمدیہ کا ایک لقب ہے۔ ملت ابراہیم علیہ السلام یہ ہے عنوان کا اختلاف باقی اصل اتباع احکام الہیہ کہ ہے پھر اتباع علماء کے عنوان سے کیوں متوحش ہوتے ہیں۔

باوجودیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مستقل ہیں مگر پھر بھی کہا جاتا ہے کہ واتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ۔ اگر اس کے یہ معنی ہیں کہ جو ان کا طریقہ ہے۔ اس کا اتباع کیجئے تب تو یہ بڑا سخت مضمون ہے کیونکہ یہ تو امتی کا کام ہے کہ دوسروں کے طریقے کا اتباع کرے نہ کہ نبی کا۔ تو بے تکلف توجیہ اس کی تقریر سمجھ میں آجائے گی کہ ملت ابراہیم اس ملت الہیہ کا نام ہے۔ اس کے بہت سے لقب ہیں ان

میں سے ایک لقب ملتِ ابراہیم بھی ہے چونکہ یہ دونوں شریعتیں فروع میں بھی بجز متفق ہیں۔ اس مناسبت سے اس ملت کا نام ملتِ ابراہیم رکھا گیا ہے تو واقع میں ملتِ ابراہیم کا اتباع نہیں ہے بلکہ ملتِ الہیہ کا اتباع ہے، جو کہ ایک مناسبت سے ابراہیم کی طرف منسوب کر دی گئی ہے۔ تو جیسے یہاں پر ملتِ الہیہ کو ملتِ ابراہیم کہہ دیا گیا ہے۔

اسی طرح اگر ایک دین کو مذہبِ شافعی یا مذہبِ ابوحنیفہ یا قولِ قاضی انصاف کی طرف نسبت کہہ دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ اب لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ تو مولوی صاحب کا فتویٰ ہے کوئی خدا اور رسول کا حکم تو نہیں ہے۔ حالانکہ واقع میں وہ مولوی صاحب کا فتویٰ نہیں بلکہ خدا کا مسئلہ ہے۔ مولوی صاحب نے اس کو سمجھ کر بتلادیا ہے۔ اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اَلْقِیاس مظهر لا مثبت، پس اب بعد بنی صلی اللہ علیہ وسلم علماء ہی کا اتباع لازم ہوا۔ کیا خوب کہا ہے

چونکہ شہ خورشید و مارا کر دواغ چارہ بود در مقامش جز چسراغ

یعنی آفتاب چھپ گیا تو اب سوائے چراغ کے اور کیا علاج ہو سکتا ہے تو جب صاحبِ وحی ہماری نظروں سے غائب ہو گئے تو سوائے اتباعِ علماء کے اور کیا چارہ ہے

چونکہ گل رفت گلستاں شد خراب بوسے گل را از کہ جویم از گلاب

یہ شعر بھیج اجزاء تو یہاں منطبق نہیں ہوتا ہے کیونکہ گلستاں شریعتِ احمدیہ دینا ہی ہر ابھرا ہے مگر مطلب یہ ہے کہ اب چونکہ صاحبِ وحی تشریف نہیں رکھتے اس لئے اب دین کو ان لوگوں سے حاصل کرنا چاہیے جن کے اندر صاحبِ وحی کا فیض موجود ہے کیونکہ اس وقت بھی جو کچھ فیوض ہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے تو ہیں جو مجتہدین اور علماء کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوئے ہیں اور ان کے ذریعہ سے ہم تک پہنچے ہیں۔ پس بغیر ان کے اتباع کئے چارہ نہیں اور اصل میں یہ علماء کا اتباع نہیں بلکہ خدا اور رسول کا اتباع ہے جس کا طریقہ ان سے معلوم کر لیا جاتا ہے اور گویہ سبیل من اناب کہلاتا ہے مگر واقع میں سبیل اللہ اور سبیل الرسول ہے۔ علماء چونکہ اسے ہمیں سمجھاتے ہیں اس معنی کو وہ واسطہ ہیں صرف اس مناسبت سے ان کی طرف منسوب کر کے سبیل من اناب کہا گیا۔

(دعظ اتباع المینب ص ۲۴)

۳۸۔ روضہ نبوی ﷺ کی زیارت کے لئے سفر کرنے پر شبہ کا جواب، نیز یہ کہ زیارتِ حقوقِ محبتِ نبوی سے ہے

(۱) فرمایا کہ ایک بار حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ اور ایک متشدد غیر مقلد سے مناظرہ ہوا اور غیر مقلد مدینہ منورہ جانے سے منع کرتا تھا۔ ولاتشد الرجال الاثلثتہ مسلجہ استدلال تھا۔ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا، کیا زیارتِ ابوبکر، طلحہ علم و غیرہ کے لئے سفر جائز نہیں، اس کا اس نے جواب نہیں دیا۔ پھر کہنے لگا اگر جانا جائز بھی ہو تو کوئی فرض و واجب تو ہو ہی گا نہیں کہ خواہ مخواہ جائے۔ حضرت نے فرمایا ہاں شریعتاً تو فرض نہیں لیکن طریقِ عشق میں تو ہے خیال کیجئے۔ سلیمان علیہ السلام بیت المقدس بنائیں اور وہ قبلہ بن جائے حضرت ابراہیم علیہ السلام مسجد بنائیں تو قبلہ قرار پائے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مسجد بنائیں تو کیا اتنی بھی نہ ہو کہ وہاں لوگ زیارت کو جایا کریں چونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عبودیت کی تھی اور شہرتِ ناپسند تھی۔ اس لئے آپ کی مسجد قبلہ نہیں ہوئی اس شخص نے کہا کہ مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تو جانا جائز ہے مگر روضہ اقدس کے قصد سے نہ جانا چاہیے۔ حضرت نے فرمایا مسجدِ نبوی میں فضیلت اتنی کہاں سے ہے۔ وہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے، تو مسجد کے لئے تو جانا جائز ہو اور صاحبِ مسجد جن کی وجہ سے اس میں فضیلت آئی۔ ان کی زیارت کے لئے جانا جائز ہو، عجیب تماشہ ہے وہ لا جواب ہوئے اور اگر کوئی کہے کہ آپ کی زیارت کہاں ہوتی ہے صرف قبر کی ہوتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ ایک حدیث میں آپ نے دونوں کو مسادٰی فرمایا ہے۔ من زارنی بعد جمائی فکانا زارنی فی حیاتی۔ اس کے بعد حضرت نے فرمایا اھدنا الصراط المستقیم پڑھتے وقت معنی کا خیال کر کے پڑھا کرو اور ہدایت کی دعا مانگا کر، وہ کہنے لگا کہ مجھے اس بارے میں دعائے ہدایت کی ضرورت نہیں۔ حضرت نے فرمایا دعا کرنے میں حرج کیا ہے۔ ہم بھی دعا کرتے ہیں کہ اگر حق پر نہ ہوں تو خدا کی ہدایت کرے۔ اس کے بعد قریب ہی مغرب کی نمازیں وہ غیر مقلد کی وجہ سے

لے جس نے میری وفات کے بعد میری زیارت کی تو گویا اس نے میری زندگی میں زیارت کی۔

گرفتار کر لیا گیا۔ پھر اس نے کہا کہ میں تو مدینہ منورہ جاؤں گا۔ اس وقت چھوٹ کر آگیا اور مدینہ منورہ روانہ ہو گیا۔ (مجادلات محدث ص ۲۴ حصہ ایضاً)

ب :- ایک حق آپ کی محبت کا یہ ہے کہ قبر شریف کی زیارت سے مشرف ہوا، نبی کریم کا حق بالخصوص جو حالت حیات میں زیارت سے مشرف نہیں ہوئے وہ روضہ اطہری سے برکات حاصل کر لیں کہ وہ برکات اگرچہ زیارت کی برکات جیسے بالکل نہ ہوں مگر ان کے قریب قریب ضرور ہیں حدیث میں ارشاد موجود ہے من زارنی بعد مماتی فکانما زارنی فی حیاتی اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بھی خود قابل توجہ ہے اگر آپ سے تعلق صرف مبتلہ ہی ہونے کی حیثیت سے ہوتا تو زیارت قبر مسنون نہ ہوتی۔ کیونکہ اس وقت تبلیغ کہاں ہے۔ انیسویں کی بعض لوگ ایسے خشک ہیں کہ وہ زیارت قبر شریف کو فضیلت نہیں مانتے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے ناجائز کے قائل ہیں۔

کا پور کا ایک واقعہ کا پور میں ایک مرتبہ ایک مترجم اربعین حدیث میں بچوں کا امتحان تھا۔ جلسہ امتحان میں ایسے ہی ایک شخص تھے جو کہ زیارت قبر شریف کو ناجائز سمجھتے تھے۔ ایک

بچہ کا امتحان شروع ہوا اس نے اتفاق سے یہ حدیث پڑھی من حج ولم یزرنی فقد جفانی ان صاحب نے اعتراض کیا کہ ”لم یزرنی“ فرمایا ہے تو یہ آپ کی حالت حیات کے ساتھ خاص ہے بعد وفات زیارت ثابت نہیں۔ طاعیہ لم یحج تھا اشکال سمجھا نہیں نہ اس کو کوئی جواب معلوم تھا۔ وہ سادگی سے اُگے پڑھنے لگا خدا کی شان آگے جو حدیث موجود تھی وہ اس اعتراض ہی کا جواب تھی کہ من زارنی بعد مماتی فکانما زارنی فی حیاتی جتنے علماء اس وقت موجود تھے سب نے ان صاحب سے کہا کہ تجھے حضرت آپ کے اعتراض کا جواب من جانب اللہ ہو گیا۔ بس غلوش رہ گئے۔ بعض لوگ زیارت قبر پر ایک شبہ کرتے ہیں کہ اب تو قبر کی بھی زیارت نہیں ہوتی کیونکہ قبر شریف نظر نہیں آتی اس کے گرد پتھر کی دیوار قائم ہے جس کا دروازہ بھی نہیں۔ یہ عجیب لٹو اشکال ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر زیارت قبر کے لئے قبر کا دیکھنا ضروری ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے بھی یہ شرط ہوگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جائے حالانکہ بعض صحابہ نابینا تھے۔ عبداللہ بن ام مکتوم صحابی ہیں یا نہیں، مستورات کے بارے میں کیا کہو گے۔ جس طرح صحابیت کے لئے حکمی زیارت کافی مانی گئی ہے اسی طرح زیارت قبر شریف بھی حکمی زیارت کو کیوں نہ کافی مانا جائے گا۔

مے جس نے حج کیا اور میری زیارت کو نہیں آیا۔ اس نے میرے ساتھ ظلم کیا

یعنی ایسی جگہ پہنچ جانا کہ اگر کوئی حائل نہ ہوتا تو قبر شریف کو دیکھ لیتے یہ بھی حجاز زیارت قبر شریف ہے۔

تیسرا شبہ امام مالک رحمہ اللہ کے قول سے کرتے ہیں کہ امام مالک کا قول ہے بیکہ قولہ ان امام مالک کا جملہ اور اس کا جواب ازت قبوا بنی علیہ السلام۔ یعنی امام مالک فرماتے ہیں کہ یہ بات کہنی مکروہ ہے کہ میں

نے قبر شریف کی زیارت کی توجہ زیارت قبر کا قول تک مکروہ ہے تو فعل زیارت کیسے مکروہ نہ ہوگا جواب یہ ہے کہ امام مالک کا یہ قول اول تو ثابت نہیں اور اگر ثابت بھی ہو تو ان کا یہ مطلب نہیں جو تم کہتے ہو، ورنہ ان کو اس قدر پھر پھار کی کیا ضرورت تھی وہ صاف یہی نہ فرمادیتے کہ بیکہ زیارة القبر النبوی علیہ السلام یہ قول کی تکرار ثابت بیان کرنا اس سے زیارت کی کراہت نکالنا اس تکلف کی ان کو کیا ضرورت تھی بلکہ ان کا مطلب تو یہ ہے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبر شریف میں زندہ ہیں اس لئے زیارت کرنے والے کو یہ نہ کہنا چاہیے کہ میں نے قبر کی زیارت کی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں غرض دنیا میں ایسے خشک مذاق بھی موجود ہیں جن کو زیارت قبر کا خود تو کیا شوق ہوتا۔ اس کو حرام کر کے دوسروں کو بھی روکنا چاہتے ہیں۔ مگر جو زیارت کر چکے ہیں ان سے پوچھو کس قدر برکات حاصل ہوتے ہیں۔ بس اب میں بیان کو ایک واقعہ پر ختم کرتا ہوں جس سے زیارت قبر شریف کے برکات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قبر شریف میں زندہ ہونا معلوم ہوگا۔

سید احمد رفاہی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ جب وہ مزار شریف پر حاضر ہوئے سید رفاہی کا واقعہ عرض کیا السلام عدید یا جدی جواب مسرور ہوا و علیہ السلام یا ولدی اس پر ان کو وجد ہوا اور بے اختیار یہ اشعار زبان پر جاری ہوئے

فی حالت البعد روحی کنت ادسلھا

تقبل الارض عنی وہی نائبتی

فہلنہ دولت الاشباہ قد حضرت

فامد یمینک کی تخطی بہا شفقی

بس فوراً قبر شریف سے ایک منور ہاتھ جس کے رُوبرُو آفتاب بھی ماند تھا باہر نکلا۔ انہوں نے بے ساختہ دوڑ کر اس کا بوسہ لیا اور وہاں ہی گر گئے۔ ایک بزرگ سے جو اس واقعہ میں حاضر تھے کسی نے پوچھا کہ آپ کو اس وقت کچھ رشک ہوا تھا فرمایا ہم تو کیا تھے۔ اس وقت ملائکہ کو رشک تھا۔ (شکر النعمۃ بذکر الرحمة ص ۷۷)

۴۰۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ درایت میں سبائتمہ میں بڑھے ہوئے ہیں۔

ابن خلکان کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے امام ابو حنیفہؒ کی نسبت لکھا ہے کہ امام صاحب کو کل سترہ حدیثیں پہنچی ہیں۔ یہ قول اگرچہ کسی درجہ میں بھی صحیح ماننے کے قابل نہیں کیونکہ امام صاحب کے واسطے جس قدر روایات موطا و آثار محمد و غیرہ میں اس وقت موجود ہیں اگر ان سب کو ہی جمع کر لیا جائے تو وہ اس سے بدرجہا زیادہ نکلیں گی اور یہ ظاہر ہے کہ ان حضرات نے مسندات ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے احاطہ کا قصد نہیں کیا تھا بلکہ تبعاً و ضمناً امام صاحب کی روایات کو بھی دیگر شیوخ کی روایات کے ساتھ ذکر کر دیا۔ تو اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امام صاحب کی روایات کس قدر ہوں گی۔ سترہ کا غلط ہونا تو بالکل بدیہی ہے مگر میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ تم ابن خلکان کے اس قول کی تردید کیوں کرتے ہو۔ اس سے تو ہمارے امام کی منقبت نکلتی ہے، منقصت نہیں نکلتی۔ کیونکہ امام صاحب کا مجتہد ہونا تو سب کو مسلم ہے۔ اس کا تو کسی کو انکار نہیں۔ اور انکار کیونکر ہو سکتا ہے، جب کہ ہر باب میں امام صاحب کے اقوال موجود ہیں، اور ہر مسئلہ میں وہ دخل دیتے ہیں اور مخالفین بھی اکثر مسائل میں امام صاحب کے اختلاف کا ذکر کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ مخالفین کو امام کو محدث نہ تسلیم کریں مگر مجتہد ضرور مانتے ہیں۔ علاوہ ازیں صراحت کے ساتھ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ائمہ و ائین نے ابو حنیفہؒ کے فقیہ مجتہد ہونے کا اقرار کیا ہے اور نہ صرف مجتہد ہونے کا بلکہ تمام فقہاء کا فقہ میں عیال ابو حنیفہؒ ہونا تسلیم کیا ہے، تو ایک مقدمہ تو یہ لیا جائے اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ یہ ملا لیا جائے کہ امام صاحب کو حدیثیں کل سترہ ہی پہنچی تھیں اب دونوں مقدموں کو ملا کر دیکھو کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ وہ نتیجہ یہی ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کی فہم بہت ہی عالی تھی کہ صرف سترہ حدیثوں سے اس قدر مسائل استنباط کئے کہ دوسرے ائمہ باوجود لاکھوں احادیث کے حافظ ہونے کے بھی ان کے برابر مسائل مستنبط نہ کر سکے۔ اس سے زیادہ فہم کی کیا دلیل ہوگی۔ معلوم ہوا کہ بہت ہی بڑے مجتہد تھے تو ہمارے احباب حنفیہ ابن خلکان کے اس قول سے فضول چیں بچیں ہوتے ہیں۔ اسپر وہ میں تو وہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اتنی بڑی مدح کر گئے جس کی کوئی حد نہیں خواہ مخواہ ہم اس قول کی تردید

لوگ یہ کہیں گے کہ اس کو دوا کی ضرورت ہی نہیں اور پسناری بھی صاف کہہ دیجئے کہ مجھے دستخط دکھلانے کی ضرورت نہیں، لیتے ہو لو، نہیں لیتے ہومت لو، اسی طرح محققین سلف طریز یہ ہے کہ وہ مدعی کے لئے مغر زنی نہیں کرتے تھے، بس مسئلہ بتلادیا، اور اگر کسی نے اس میں جھٹیں نکالیں تو صاف کہہ دیا کہ کسی دوسرے سے تحقیق کرو جو سیرتم کو اعتماد ہو، ہمیں بحث کی فرصت نہیں۔ مولانا عبد القیوم مقیم بھوپال رحمۃ اللہ علیہ سے جب کوئی مسئلہ پوچھتا تو کتاب میں دیکھ کر جواب دیا کرتے تھے اور فرما دیا کرتے تھے کہ کتاب میں یوں لکھا ہے اور جو کوئی حدیث پوچھتا تو وہ فرما دیتے کہ بھائی میں تو مسلم نہیں میرے آباؤ اجداد سب مسلمان تھے، اور اسی طرح ان کے آباؤ اجداد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک مسلمان تھے۔ جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کو دیکھ کر عمل کیا۔ اور جو ان کے بعد تھے انہوں نے اپنے بڑوں کو دیکھ کر عمل کیا۔ اسی طرح سلسلہ بسلسلہ ہمارے گھر میں وہی ہوتا آ رہا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل تھا اس لئے مجھے حدیث ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں اس کی ضرورت تو نو مسلموں کو ہے اس جواب کا حاصل وہی قطع نزاع ہے کہ فضول بحث کو یہ حضرات پسند نہ کرتے تھے بھلا اگر عوام کو بتلادیا جائے کہ حدیث میں یہ ہے تو ان کو طریق استنباط کا علم کس طرح ہوگا اس میں پھر وہ فقہاء کے محتاج ہوں گے تو پہلے ہی فقہاء کے بیان میں اعتماد کیوں نہیں کرتے۔

الغرض عمل کے لئے تو تراویح کا اتنا ثبوت کافی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قوالا اس کو سنون فرمایا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم عملاً تراویح کی بیسیں رکعتیں پڑھتے تھے۔ عوام کے لئے اتنا کافی ہے اس سے زیادہ تحقیق علماء کا منصب ہے۔ اس وقت اس سے بحث نہیں۔ اس تراویح کا نام قیام رمضان بھی ہے کیونکہ یہ رمضان کے ساتھ مخصوص ہے اور احادیث میں ان کو قیام رمضان سے تعبیر کرنا اس کی دلیل ہے کہ تراویح تہجد سے الگ کوئی عبادت ہے کیونکہ تہجد رمضان کے ساتھ مخصوص نہیں، اور اس کے علاوہ اس پر اور بھی دلائل قائم ہیں کہ یہ دونوں الگ الگ عبادتیں ہیں۔

(تقلیل المنام بصورت القیام ص ۱)

کے درپے کیوں ہو، مان لینا چاہیے اچھا امام صاحب کو شترہ ہی حدیثیں کل ملی تھیں، مگر کس قدر عالی فہم تھے کہ چند حدیثوں سے لاکھوں جزئیہ اور مسائل سمجھ گئے۔ خیر یہ تو ایک لطیف تھا اس قول کے غلط ہونے کا تو خود محدثین کو بھی اقرار ہے مگر اس میں شک نہیں کہ روایت میں حنفیہ کا پلہ دوسرے کرائے و محدثین کے برابر نہیں، مگر روایت میں یہ اس درجہ بڑھے ہوئے ہیں کہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ حدیث و قرآن کو پڑھا پڑھا یا سب نے، مگر گنا حنفیہ ہی نے ہے۔

ایک عامل بالحدیث کا قصہ ہے کہ وہ مجھ سے اکثر معاملات سے متعلق مسائل پوچھا کرتے تھے میں نے ان سے کہا کہ تم اپنے علماء سے یہ مسائل کیوں نہیں پوچھتے۔ مجھ سے کس لئے پوچھتے ہو تو حالانکہ وہ اپنے مسلک میں بہت ہی پختہ ہیں مگر انصاف کی بات چھپا نہیں کرتی۔ زبان سے بے ساختہ بھی نکلا کہ ہمارے علماء تو آئین دروغ یدین کے سوا کچھ بھی نہیں جانتے۔ یہ مسائل ان کو نہیں آتے آپ ہی سے پوچھ کر تسلی ہوتی ہے عرض معلوم ہو گیا کہ کسی بات کا سننا اور بے گنا اور ہے۔

(الجلال ابتداء ص ۷)



عوام کے شبہات کا حل

۴۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے صاحبزادے

ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات پر رونا

ایک شبہ ظاہری یہ ہوتا ہے کہ ہمارے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ اپنے صاحبزادے کے انتقال پر روتے اور بعض اولیاء اللہ کی حکایت ہے کہ وقت مصیبت کے انہوں نے الحمد للہ کہا، حالانکہ انبیاء علیہم السلام کے مرتبے کو کوئی نہیں پاسکتا جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ حق فرزند یہ ہے کہ ایسے وقت میں اس پر روتے۔ حق خالق یہ ہے کہ امر الہی پر صبر کرے۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو جمع فرمایا، حق فرزند بھی اور حق خالق بھی، اور دونوں کو ادا فرمایا۔ اور بعض اولیاء اللہ مرتبہ میں کم ہیں کہ ایک حق ان سے ادا ہوا اور دوسرا نہ ہوا۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ قیامت میں بعض انبیاء بعض اولیاء پر رشک کریں گے۔ ظاہراً اس پر بھی شبہ ہوتا ہے کہ افضل کو مفضول پر غبطہ کیوں ہوگا بات یہ ہے کہ غبطہ کئی قسم کا ہوتا ہے۔ کبھی تو کمال کے فقدان سے سویہ تو ہوگا نہیں، اور کبھی بسبب ایک خاص قسم کی عافیت کے مثلاً کوئی بڑے عہدہ پر ہو اور پھر ذمہ داریوں کی کثرت سے یہ کہے کہ پانچ روپے والے مجھ سے اچھے کہ آرام سے تو ہیں، اس قدر حساب کا بوجھ تو نہیں۔ حضرت انبیاء علیہم السلام کا رشک کرنا اسی طرح پر ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا بڑا مرتبہ ہے۔ امت کی فکر میں مشغول ہوں گے اور بعض اولیاء اللہ ایسی مشغولی سے آزاد ہوں گے پس اس غبطہ کا یہ محل ہے۔

(مجادلات معدلت ص ۳)

۴۲۔ لڑکا لڑکی کی عمر بوقت شادی برابری ہونی چاہیے

بعض لوگ غضب کرتے ہیں کہ مال کے لالچ میں بوڑھوں سے نکاح کر دیتے ہیں۔ گنگوہ میں ایک لڑکی اپنی ساتھیوں سے کہا کرتی تھی کہ جب میاں گھر میں آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نانا جان آگئے امام صاحب کی روح پر ہزاروں رحمتیں ہوں کہ وہ یہ فرماتے ہیں کہ جب لڑکی بالغ ہو جائے

ہے میں عورتیں ان کے لئے آسان یہ ہے کہ جو عورتیں پڑھی لکھی ہیں وہ اپنے گھر میں بیٹھ کر ہستی زیور وغیرہ پڑھا کریں۔ اور جو پڑھی ہوئی نہیں ہیں وہ اپنے لڑکوں بچوں سے کسی وقت ہستی زیور کے مسائل سن لیا کریں۔ اور یہ بھی نہ ہو تو لڑکیوں کو پڑھوا کر تیار کریں اور ان سے اسی سلسلہ کو جاری کریں یہ مختصر دستور العمل۔ اس سے انشاء اللہ ہر شخص کو علم دین حاصل ہو جائے گا اور محبت بھی بڑھے گی، اور دین کی تکمیل ہوگی۔ (وعظ آثار المحبتہ ص ۱۲)

۴۴۔ قرآن شریف ایک متن ہے، فقہ اور تہذیب اس کی شرح ہے

قرآن ایک متن ہے۔ حدیث وفقہ سب اس کے شروح ہیں اسی کو فقہاء نے کہا ہے القیاس مظهر لامثبت توحید وفقہ قرآن کے مطالب کو ظاہر کر دیا ہے کوئی حکم قرآن کے خلاف بیان نہیں کیا۔ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ ایک صندوق مقفل ہے اور کنجی سے اسے کھول دیا اور بہت سے جواہرات نظر آنے لگے تو یہ جواہرات کنجی سے پیدا تو ہوئے نہیں، بلکہ وہ صندوق میں موجود تھے مگر پوشیدہ تھے، کنجی نے ان کو ظاہر کر دیا توحید وفقہ قرآن کے لئے کنجی ہیں جتنے علوم ہیں سب قرآن ہی سے نکلتے ہیں، اس کی تویہ شان ہے۔

عبادتنا شقی وحسنک واحد
وکل الی ذالک الجمال یشیر
ایک محبوب ہے، جس نے صبح کو دھاتی جوڑا پہنا۔ شام کو دوسرا جوڑا پہنا تو جو عاشق نہیں وہ تو نہیں پہچانے گا۔ مگر عاشق کہے گا کہ
بہر نئے کہ خواہی جامہ ی پوشش
من ہر انداز قدرامی شناسم۔
کہ جو لباس چلے پہن لے، میں تو چال پہچان لیتا ہوں، تو قرآن کا جو عاشق ہے اس کو حدیث وفقہ میں بھی قرآن ہی نظر آتا ہے مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی حضرت مولانا گنگوہی سے فرمایا کرتے تھے کہ حدیث تو آپ کے سامنے آکر حنفی ہو جاتا ہے ان حضرات کو حدیث میں فقہ نظر آتا تھا اور ان اہل نظر کی یہ حالت ہوتی ہے کہ
بسکہ درجاں نگار چشم بیدارم متوی
ہرچہ پیدای شود از دور پندارم متوی

جیسا کہ اہل اللہ کو ہر شئی میں خدا نظر آتا ہے۔ مگر معاذ اللہ یہ معنی نہیں کہ یہ سب خدا ہی ہیں۔ استغفر اللہ بندہ بندہ... ہے، خدا خدا ہے جیسا کہ قرآن قرآن ہے اور حدیث حدیث، مولانا جامی کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ حال میں فرما رہے تھے کہ۔

ع " ہرچہ پیدای شود از دور پندارم متوی "
کسی منکر نے مسخرہ پن سے کہا کہ " مولانا اگر خسر پیدا شود " تو آپ نے کیا مزہ کا جواب دیا کہ " پندارم متوی "۔ (وعظ حق الاطاعت ص ۱۲)

۴۵۔ آج کل مستحبات کی پرواہ نہیں کی جاتی نہ ہی ان کی تعلیم کا اہتمام ہے

آج کل مستحبات کو ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ اور عمل کے درجے میں وہ واجبات و فرائض کے برابر ضروری ہیں بھی نہیں۔ مگر تعلیم ان کی بھی ضروری ہے دو وجہ سے، ایک اس لئے کہ لوگوں کو ان کا مستحب ہونا معلوم ہو جائے گا تو کوئی ان کو ناجائز نہ سمجھے گا۔ یا فرض و واجب نہ..... خیال کرے گا۔ یہ تو اصلاح اعتقاد کے لحاظ سے ضرورت ہے اور اس درجے میں مباحات کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ دوسرے اس لئے کہ ان کی برکات و ثمرات بے شمار ہیں۔ جن پر نہ مطلع ہونا ہی ان سے بے رغبتی کا باعث ہے اگر ان برکات و ثمرات کی اطلاع ہو جائے جو ادنیٰ ادنیٰ مستحبات سے حاصل ہوتے ہیں تو آپ خود کہیں گے کہ افسوس ہم اب تک بڑے خسارے میں تھے جو ایسے قیمتی جواہرات سے بے خبر رہے یہ ضرورت تکمیل عمل کے درجہ میں ہے۔ عرض مستحبات کا ذکر بھی قرآن میں بے ضرورت نہیں بلکہ تعلیم کے درجے میں ہے ان کا ذکر بھی ضروری اور بہت ضروری ہے اگر محبت ہو تو اس کی قدر ہو۔ عاشق کا مذاق یہ ہوتا ہے کہ وہ محبوب کی خوشی کی ذرا سی بات کی تلاش میں رہتا ہے اور جب اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ محبوب فلاں فلاں بات سے خوش ہوتا ہے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ یہ بھی کر لوں اور وہ بھی کر لوں اور کوئی بات اس کے خوش کرنے کی مجھ سے رہ نہ جائے۔ اگر ہم لوگوں کو یہ مذاق عاشقانہ نصیب ہو جائے تو اس وقت ان مستحبات کی قدر معلوم ہو اور ان کے بیان کو خداوند تعالیٰ کی رحمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت سمجھیں گے کہ اللہ اور رسول نے کس تفصیل سے ان باتوں کو بتلادیا

جو اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے والی ہیں اور اگر شریعت میں صرف ضروریات ہی کا بیان ہوتا مستحبات کا ذکر نہ ہوتا تو عشاق کو سخت بے چینی ہوتی ہے۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ عاشق محض ضروریات پر اکتفا نہیں کرتا ان کو تو وہ اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے۔ بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ فرض منصبی کے علاوہ بھی کچھ ایسا کام کر دے جس سے محبوب کو مجھ پر زیادہ توجہ ہو۔ دیکھئے ایک نوکر تو وہ ہے جو محض تنخواہ کے لئے کسی خاص کام پر آپ کا ملازم ہے وہ تو یہ چاہے گا کہ فرض منصبی کو ادا کرتا ہوں اس سے زیادہ کی اس کو خواہش نہ ہوگی اور ایک وہ نوکر ہے جس کو بچپن سے آپ نے پالا پرورش کیا ہے اور اس کو آپ کے ساتھ جان نثاری کا تعلق ہے وہ ہرگز فرض منصبی پر اکتفا نہ کرے گا بلکہ وہ اس کی کوشش کرے گا کہ آقا کے خوش کرنے کا جو بھی کام ہو وہ میرے ہاتھ سے ہو جائے وہ اپنے خاص کام کے علاوہ رات کو آپ کے پر بھی دبائے گا پنکھا بھی بھلے گا اور آپ کے جاگنے سے پہلے تمام ضروریات کے سامان مہیا کرے گا، اور یہ بھی خیال نہ کرے گا کہ یہ کام تو میرے فرض منصبی سے زیادہ ہیں انہیں کیوں کریں۔ نہیں بلکہ اس کی محبت اور جان نثاری مجبور کرے گی کہ جس کام سے بھی آقا خوش ہو وہ ضرور کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ سے صرف قانونی تعلق | صاحبو! ہمارا علاقہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارے خیال فاسد میں محض قانونی رہ گیا ہے اسی لئے ہم واجبات و فرائض کے علاوہ مستحبات کو غیر ضروری سمجھتے ہیں اگر ہم کو حق تعالیٰ کے ساتھ محبت اور جان نثاری کا علاقہ ہوتا۔ تو فرائض و واجبات پر ہم کبھی اکتفا نہ کر سکتے بلکہ مستحبات کی تلاش میں خود بخود درہمتے اور جس بات کے متعلق بھی معلوم ہو جاتا کہ حق تعالیٰ کو یہ پسند ہے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں اس کی طرف شوق سے سبقت کرتے اور جس بات کے متعلق معلوم ہو جاتا کہ یہ حق تعالیٰ کو ناپسند ہے یا کم، عاشق کو اتنا جان لینا کسی کام سے روکنے کے لئے کافی ہے کہ یہ محبوب کو ناپسند ہے وہ یہ بھی نقش نہیں کرتا کہ یہ ایسا ناپسند ہے کہ اس کی سزا میں ضرب دے جس کی جاتی ہے یا ایسا ناپسند ہے کہ محبوب کسی قدر کبیدہ خاطر ہو جاتا، اور رخ پھر لیتا ہے اس کے نزدیک دونوں کام برابر ہیں وہ اس کو بھی ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ محبوب اس سے کچھ کبیدہ خاطر ہو، یا بے رخ ہو جائے۔ اور جس کام میں کبیدگی کے علاوہ سزا سے ضرب و جس بھی ہو تو بھلا کیوں ہی کرنے لگا مگر آج کل ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کسی کام کے نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ یہ گناہ ہے تو سوال ہوتا ہے کہ کیا بڑا گناہ ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ اگر چھوٹا گناہ ہو تو کریں گے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ بہت ضعیف ہو گیا ہے، گو پوری بے تعلقی بھی نہیں ہے کیونکہ یہ سوال

لے ضرب مار بیٹ، جس قید کرنا۔

یہ تعلق کی دلیل ہے۔ میں ان لوگوں کی طرف داری کرتا ہوں کہ ان کو خدا تعالیٰ سے بالکل بے تعلق نہ سمجھا جائے۔ کیونکہ ان کو اتنا تعلق تو ہے کہ وہ حق تعالیٰ کو زیادہ ناراض کرنا پسند نہیں کرتے۔ اگر اتنا بھی تعلق نہ ہوتا تو اس سوال ہی کی کیا ضرورت تھی کہ کیا بڑا گناہ ہے؟ معلوم ہوا کہ بڑے گناہ سے ڈرتے ہیں کیونکہ اس سے خدا تعالیٰ بہت ناراض ہوتے ہیں لیکن زیادہ تعلق نہیں ہے اس لئے مخطوٹ ۱۷۱ ناراض کر دینا گوارا ہے غرض یہی سوال تعلق کی بھی دلیل ہے اور ضعف تعلق کی بھی۔

اس تقریر سے وہ لوگ خوش ہوئے ہوں گے جو گناہ کے متعلق بڑا پھوٹا ہونے کا تعلقات میں کمال | سوال کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق بھی ثابت ہو گیا۔ اور یہ بات ایک درجے میں ہے بھی خوش ہونے کی کیونکہ ص ۷۰۔

ص ۷۰۔ "بلا بودے اگر اینہم نبودے"

مگر وہ یاد رکھیں کہ نفس تعلق پر قناعت نہیں ہو سکتی۔ آخر آپس میں جو ایک دوسرے ہم تعلقات رکھتے ہیں کیا ان میں نفس تعلق پر کوئی شخص قناعت کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ ہر تعلق کا درجہ کمال ہر شخص کو مطلوب ہے۔ دیکھئے بیوی کے ساتھ جو ارتباط ہے حالانکہ وہ ایک نہایت ضعیف تعلق ہے جو صرف دو لفظوں سے جوڑا جاتا ہے اور ایک لفظ سے ٹوٹ جاتا ہے مگر اس میں ہم نے کسی کو نہیں دیکھا۔ جو نفس تعلق پر قناعت کرتا ہو، بلکہ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ بیوی کو میرے ساتھ کامل تعلق ہو اسی لئے محض حقوق ضروریہ پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے خوش کرنے کے لئے وہ کام کئے جاتے ہیں اور وہ زیور اور لباس تیار کئے جاتے ہیں جو اس کا حق نہیں مگر محض اپنے مصالحہ کی وجہ سے ان کاموں کو کیا جاتا ہے تاکہ یہ تعلق بڑھے اور مستحکم ہو، اگر مرد بیوی کے ساتھ یا بیوی مرد کے ساتھ قانونی علاقہ رکھے اور حقوق ضروریہ سے زائد کچھ نہ کرے تو گو نفس تعلق باقی رہ سکتا ہے مگر تعلق کا لطف حاصل نہیں ہوتا۔ اور اس صورت میں ہر وقت قطع تعلق کا اندیشہ رہتا ہے تعلق کو بقا جب ہی ہوتی ہے کہ اس کے استحکام کی تدبیر کی جاوے، چنانچہ مرد کے ذمہ بیوی کا محض کھانا پکڑنا ضروری ہے زیور اور ریشمی لباس ضروری نہیں نہ اس کی دوا دار و لازم ہے، نہ اس کے کنبے والوں کی ضیافت دعوت ضروری ہے مگر محض تعلق بڑھانے کے لئے یہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔ اور اس کی خوش کرنے کو ہر کام میں ملحوظ رکھا جاتا ہے حالانکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ تعلق نہایت ہی ضعیف ہے مگر باوجود اس ضعف کے اسکا منقطع ہونا ہر شخص کو ناگوار ہے اور اگر کبھی منع ہو جاتا ہے تو کتنا رنج ہوتا ہے اور انقطاع سے بچنے ہی کے لئے اس کے استحکام کے اسباب اختیار کئے جاتے ہیں۔ پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ہم کو ایک ضعیف

تعلق میں تو نفس تعلق پر توقعات نہ ہو بلکہ خوف انقطاع سے اس کے استحکام کی فکر ہو۔ اور حق تعالیٰ کے ساتھ نفس تعلق پر اکتفا گوارا نہیں۔ حالانکہ خدا تعالیٰ سے ہمارا ایسا قوی علاقہ ہے کہ اس کے برابر کوئی تعلق نہیں ہو سکتا پھر کیا وجہ ہے کہ اس کے استحکام کی ہم کو فکر نہیں اور محض نفس تعلق کو کافی سمجھ رکھا ہے اور یہاں وہ خیال کیوں نہیں کیا جاتا تعلق کا بقا استحکام پر موقوف ہے۔ نفس تعلق بقا کے لئے کافی نہیں بلکہ اس میں زوال و انقطاع کا خطرہ لگا ہوا ہے تو کیا کوئی اس بات کو گوارا کر سکتا ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ جو اس کا علاقہ ہے وہ منقطع ہو جائے ہرگز نہیں۔ پھر اس کے استحکام کا کیوں خیال نہیں کیا جاتا۔ مولانا فرماتے ہیں سے

ایک صبرت نیست از فرزند و زن صبر چوں داری زرب ذوالمنن -
ایک صبرت نیست از دینے دوں صبر چوں داری ز خیم الماہدون -

مائے ہمیں چھوٹی چھوٹی چیزوں سے صبر نہیں ہو سکتا مگر نہ معلوم خدا تعالیٰ کے کمر و تعلق پر انہیں نہیں | لوگوں کو کیسے صبر آگیا۔ ادنیٰ ادنیٰ چیزوں کے ساتھ ضعف تعلق ہم کو گوارا نہیں اور خدا تعالیٰ کے ساتھ ضعیف تعلق ہونے پر ذرا جی نہیں دکھتا۔ پس گو حق تعالیٰ کے ساتھ نفس تعلق بھی ایک نعمت ہے مگر ضعیف تعلق پر قناعت کر لینا بھی بڑا ظلم ہے۔ بعض لوگ تو بے تعلقی ہی پر راضی ہیں، یہ تو کفار ہیں۔ ان سے اس وقت خطاب نہیں۔ یہ ہم آج کل کے مسلمان ہیں۔ حیرت ہے کہ ہم کو خدا تعالیٰ کے ساتھ ضعیف تعلق رکھنے پر صبر کیسے آتا ہے۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ آج کل ہم کو مستحب کی قدر نہیں اور ان کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے، میں اپنی کہتا ہوں کہ بچپن میں بہت سے نوافل کا پابند رہا۔ مگر مینہ المصلے پڑھتے ہی جب معلوم ہوا کہ یہ تو مستحبات ہیں جن کے نہ کرنے میں کچھ گناہ نہیں اسی وقت سے نوافل کو چھوڑ دیا۔ اس وقت تو متنبہ نہ ہوا کہ میں کیا کر رہا ہوں، مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ حالت بہت بری تھی۔ اس کا تو یہی حاصل ہوا کہ ہم حق تعالیٰ کے ساتھ ضابطہ کا تعلق رکھنا چاہیے ہیں کہ ضروریات کو بجا لائیں۔ تو کیا دنیا میں ہم اپنے مربیوں کے ساتھ بھی یہ برتاؤ کر سکتے ہیں کہ خدمت واجبہ کے سوا کچھ نہ کریں۔ ہرگز نہیں، دیکھئے بعض اوقات کسی طمع کی وجہ سے یا محبت کی وجہ سے ہم اپنے مربیوں کی خدمت غیر واجبہ بھی بہت کرتے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کا اتنا بھی حق نہیں جتنا مربیوں اور بزرگوں کا حق ہوا کرتا ہے ذرا کچھ تو انصاف سے کام لینا چاہیے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی طاعت میں اس قدر اکتفا کرتے ہیں۔ جو فرض و واجب ہے۔ اور طاعت غیر واجبہ کو کسی درجہ میں بھی ضروری نہیں سمجھتے۔

ہمارا فرض کیا ہے | یہ ضرور ہے کہ خدا تعالیٰ کی شان کے لائق ہم سے اس کی اطاعت کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اور ہم جتنا بھی کچھ کریں وہ اس کے حق کے مقابلے میں بہت کم ہے اور یہ بھی ایک سبب ہے مستحبات میں ہماری کوتاہی کا۔ کیونکہ اس سے ہم کو یہ دھوکہ ہو گیا ہے کہ جب حق ادا ہو ہی نہیں سکتا تو پھر کس لئے زیادہ کوشش کریں، مگر یہ سخت غلطی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم اس کی شان کے موافق عمل نہیں کر سکتے مگر اپنے مقتضی حال کے موافق تو کر سکتے ہیں۔ دنیا میں رات دن دیکھا جاتا ہے کہ لوگ سلاطین کے سامنے بدایا و تحائف لے جاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ بادشاہ کی شان کے موافق ہمارا ہدیہ نہیں ہو سکتا مگر اس کا یہ اثر کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہدیہ دنیا موقوف کر دیں بلکہ جتنا اپنے سے بڑا تہا ہے کوشش کر کے عمدہ سے عمدہ ہدیہ پیش ہی کرتے ہیں اسی لئے مثل مشہور ہے کہ ہدیہ یا تو دوسرے کی شان کے موافق ہو یا کم از کم اپنی ہی شان کے موافق ہو۔ پس ہم کو اپنی ہمت اور طاقت کے موافق عمل تو کرنا چاہیے۔ اور میں اطمینان دلاتا ہوں کہ حق تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے اتنا ہی عمل کافی ہے جتنا آپ کر سکتے ہیں آپ اپنی طاقت سے زیادہ نہ کیجئے۔ حق تعالیٰ نے بندہ کو اس کا مکلف نہیں کیا کہ وہ حق تعالیٰ کی شان کے موافق عمل کرے بلکہ اسی قدر کا مکلف کیا ہے کہ وہ اپنی طاقت و ہمت کے موافق عمل کرے تو اب یہ کتنی بڑی غلطی ہے کہ ہم مستحبات کو اس لئے ترک کر دیں کہ حق تعالیٰ کا حق تو ادا ہو ہی نہیں سکتا۔

کسی مصلحت سے ترک مستحبات | یہ اور بات ہے کہ کسی وقت مستحب کو کسی مصلحت شرعی کی وجہ سے ترک کر دیا جائے۔ مثلاً لوگوں کو یہ بتلانے کے لئے کہ بفعل واجب نہیں یا سفر میں رفقا کی رعایت سے نوافل وغیرہ کو چھوڑ دیا جائے۔ تاکہ وہ انتظار سے پریشان نہ ہوں یا کسی وقت تعب کی وجہ سے اپنی راحت کے لئے ترک کر دیا جائے کہ شرعاً اس وقت مستحبات پر ملامت نہیں۔ چنانچہ راحت حاصل کرنے کے لئے تو حدیث میں وارد ہے۔ ان لنفسك علیک حقاً ولعینک علیک حقاً اور کمال مگر بلا وجہ ترک کرنا اس سے حدیث میں پناہ آتی ہے کیونکہ یہ سستی اور کالی ہے جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اللہم انی اعوذ بک من المعجز والمکسل خوب سمجھ لیجئے کہ طلب راحت اور چیرہ ہے اور سستی اور چیرہ ہے دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔ طلب راحت کا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا ہے اور اس کے لئے بعض صحابہ کو ترک

نہ یقیناً تجھ پر ترے نفس کا حق ہے اور تری آنکھوں کا حق ہے۔

مکہ اے اللہ مجھ پر اور کالی سے تری پناہ چاہتا ہوں ۱۲۔

اہلیت نہیں۔ مہلا اگر ایک سائنس کسی کالج کے پروفیسر سے کہے کہ مجھے اقلیدس کے پہلے مقالے کی پانچویں شکل سمجھا دو اور وہ اس کی تقریر کرے اور سائنس نہ سمجھ سکے اور کہے نہ معلوم کیا بکتا ہے۔ تو بتلائے تصور کس کلبہ یقیناً سائنس کی عقل کا تصور ہے۔ مگر جاہلوں کے نزدیک تو وہ پروفیسر ہی تجا ہے جسے ہمارے یہاں ایک دفعہ زمانے میں وعظ ہوا ایک جولاہی بھی وعظ سننے آئی۔ وہ کچھ دیر تو خاموش رہی جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو کہتی ہے جانے کیا کیا بھونکے ہے واقعی اس کے نزدیک تو سارا بھونکنا ہی ہوا۔ فرمائیے اس نے یہ اعتراض اپنے اوپر کیا یا وعظ پر کیا اسی طرح اگر میں ان ملاجی کو علمی قاعدہ سے نہ سمجھا سکا تو تصور کس کلبہ ان کی عقل کی تو یہ حالت تھی کہ ہتھم مسجد نے ان سے یہ کہہ رکھا تھا کہ تاریکی کے وقت پاخانہ میں چراغ رکھ دیا کرو ایک دن آپ چراغ لے کر گئے۔ تو پاخانہ میں کوئی طالب علم تھا۔ آپ اس سے کہتے ہیں۔ میاں مولوی صاحب آنکھیں بند کر لینا میں چراغ رکھوں گا۔ جی ہاں وہ تو آپ کو کپڑا پہنے ہوئے بھی نہ دیکھیں اور آپ اس کو ننگا دیکھ لیں۔ اب ایسے کم عقل کو کوئی کس طرح سمجھائے کہ اگرچہ حکم کا تعلق وجوہ حکم و اید یکم سے ہے یہ منصوب معطوف ہے مجرور پر عطف نہیں ہے۔ جس شخص کو قواعد بخوبی سمجھ بھی نہ ہو وہ اس جواب کو کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ بس ایسے شخص کا جواب یہی ہے کہ تم کو جس طریقہ سے قرآن کا قرآن ہونا معلوم ہوا۔ اسی طریقہ سے اس کے احکام بھی معلوم کرو۔ تم کو خود معانی سمجھنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ تفصیل میں نے اس لئے کی تاکہ آپ ترجمہ قرآن دیکھ کر اپنے کو ماہر نہ سمجھیں جو لوگوں میں بڑا مرض ہے۔ (تو اسی بالحق حصہ اول ص ۹)

(۲۷۱) قبولیت دعا پر شبہ کا جواب

جواب یہ ہے کہ منظوری اور اجابت اور قبول کے دو درجے ہیں ایک^(۱) یہ ہے کہ درخواست لے لی جائے اور اس پر توجہ کی جائے۔ دوسرے^(۲) یہ کہ درخواست کے موافق فیصلہ بھی کر دیا جائے۔

صاحبو! درخواست کا لے لیا جانا بھی ایک قسم کی منظوری اور بڑی کامیابی ہے۔ آپ نے مقدمات میں دیکھا ہو گا کہ جب کسی مقدمہ کی اپیل کی جاتی ہے تو وہاں بھی دو درجے ہیں ایک^(۱) یہ کہ اپیل لے لی جائے اور اس میں غور کیا جائے۔ اور یہ بھی بڑی کامیابی ہے۔ بڑی ناکامی ہے اس شخص کی جس کی اپیل لی ہی نہ جائے۔ اس کے بعد دوسرے^(۲) درجہ کامیابی کا یہ ہے کہ اپیل منظور کر لینے کے بعد درخواست کے موافق فیصلہ کر دیا جائے اور پہلے فیصلہ کو منسوخ کر دیا جائے۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سمجھئے کہ ”اُجیب دَعْوَةَ الدَّاعِ“ منظوری کی قسم اول پر محمول ہے۔ قسم ثانی پر محمول نہیں۔ جس کی دلیل خود نص کے الفاظ ہی ہیں کیونکہ اس کو مرتب فرمایا ہے ”اِنِّی قَرِیْبٌ“ پر اور اس جملہ میں قرب تعلق کو بیان فرمایا ہے اور قرب تعلق کا مقتضایہ یہ ہے کہ درخواست کو لے لیا جائے اس پر توجہ کی جائے خواہ فیصلہ دیر میں ہو یا جلدی ہو، موافق ہو یا نہ ہو، کیونکہ فیصلہ تو قانون کے موافق ہو گا۔ یا سائل کی مصالح پر نظر کر کے اور مقدمہ کی روداد دیکھ کر حاکم کے تعلق اور توجہ کا مقتضی صرف اتنا ہے کہ سائل کی درخواست کو واپس نہ کرے بلکہ اس کی درخواست کو توجہ کے ساتھ سنے۔ اور اس کے فیصلے کے واسطے لے لے پس ”اُجیب“ کے معنی ہوتے ہیں کہ ہم ہر دعا کرنے والے کی درخواست لے لیتے ہیں اس پر توجہ کی جاتی ہے۔ بے توجہی نہیں کی جاتی۔ تو یہ کیا تھوڑی بات ہے۔ صاحبو! دنیا میں تو اتنی ہی بات کے لئے بہت سی تدبیریں اور خوشامدیں کی جاتی ہیں۔ کہ بادشاہ ہماری درخواست کو لے لے اس کے بعد جی کو سمجھا لیتے ہیں کہ اگر فیصلہ قانون کے موافق ہوا تو ہماری مرضی کے موافق ہو گا ورنہ نہیں۔

۱۔ میں دعا کرنے والوں کی دعا قبول کرتا ہوں۔

دعا کی قبولیت کی شکلیں

ایسے ہی یہاں بھی دل کو سمجھانا چاہیے کہ جب درخواست لے لی گئی ہے تو اگر اس کا پورا کرنا ہماری مصلحت کے خلاف نہ ہو تو ضروری پوری ہوگی ورنہ اس کی جگہ کچھ اور مل جائے گا یہ اس واسطے کہا کہ اللہ تعالیٰ دعا کے پورا کرنے میں تو کسی قانون کے پابند نہیں۔ ہاں بندے کی مصالحت پر ضرور نظر فرماتے ہیں کہ اس دعا کا پورا کرنا اس کے لئے مضر نہ ہو۔ سو یہ تو عین کامیابی ہے۔ دیکھو بچہ باپ سے پیسہ مانگتا ہے تو ایک درجہ تو قبول کا یہ ہے کہ باپ اس کی درخواست کو سن کر محبت سے اس کو پیار کرے کہ ہاں ہاں ہم نے تمہاری درخواست سن لی۔ اب کبھی تو وہ اس کو پیسہ دیدیتا ہے اور کبھی اس خیال سے کہ پیسہ لیکر یہ بازار جائے گا اور نہ معلوم کیا خرید کر کھا لیگا۔ جس سے نقصان پہنچے، یا بازار جانے سے عادت خراب ہو جائے تو وہ اس کو بجائے پیسہ دینے کے کوئی چیز خود اپنے ہاتھ سے چار آنے کی خرید کر دیدیتا ہے تو کیا اس کو یوں کہا جاوے گا کہ درخواست پوری نہیں کی۔ ہرگز نہیں کہا جاوے گا۔ بلکہ یوں کہا جاوے گا کہ صورت پوری نہیں کی مگر حقیقتاً درخواست پوری کر لی گئی کیونکہ اس کو پیسہ سے بہتر چیز دیدی گئی۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ حق تعالیٰ حکیم بھی ہیں نادر بھی ہیں، رحیم و مہربان بھی ہیں۔ باپ ماں سے زیادہ بندہ پر مہربان ہیں اس کے بعد بھی جو بھی طلب کے موافق عطا نہیں ہوتا تو دل کو سمجھانا چاہیے کہ ضرور ہماری درخواست کا مجسمہ پورا کرنا حکمت کے موافق نہ تھا اس لئے اللہ تعالیٰ بجائے اس کے ہم کو کچھ اور نعمت عطا فرمائیں گے۔ حکام دنیا تو درخواست منظور کرنے کے بعد فیصلہ کرنے کے وقت صرف اتنا دیکھتے ہیں کہ درخواست کا پورا کرنا قانون کے خلاف تو نہیں اگر تو قانون کے خلاف ہوا تو اس کو رد کر دیتے ہیں اور اس جگہ کچھ اور نہیں دیتے۔ اور اللہ تعالیٰ اس قانون کے ساتھ اس کو کبھی دیکھتے ہیں کہ درخواست کا پورا کرنا بندہ کی مصالحت کے خلاف تو نہیں اور اسی صورت میں درخواست کا پورا کرنا عین کامیابی ہے۔

اجابت دعا کا معنی

پس اجابت جس کا وعدہ ہے اس کے معنی درخواست لے لینا اور درخواست پر توجہ کرنا ہے یہ اجابت یقینی ہے اس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا۔ آگے دوسرا درجہ ہے کہ جو مانگا ہے وہی مل جائے اس کا وعدہ نہیں بلکہ وہ ان شاء سے مقید ہے اگر مشیت ہوگی تو ایسا ہو جائیگا ورنہ نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے بل ایاہ تدعون فیکشف ما تدعون الیہ ان شاء۔ بعض علماء نے اجیب دعوی الداع کو بھی ان شاء سے مقید کیا ہے اور اس کو بعض لوگوں نے حذافت میں شمار کیا ہے۔ مگر

میرے نزدیک یہ صحیح نہیں کیونکہ دوسری آیت میں ہے۔ وَقَالَ رَبِّکُمْ ادْعُونِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ۚ یہاں سابق آیت بتلا رہا ہے کہ دعا پر اجابت ضرور مرتب ہوتی ہے کیونکہ جواب امر کا مرتب امر پر ضروری ہے۔ اس میں "ان شاء" کی قید خلاف ظاہر ہے نیز یہاں بھی انی قریب کے بعد اجیب دعوی الداع کو بیان فرمانا جس میں قرب کو محقق و موکد کیا گیا ہے اس امر کی دلیل ہے کہ اجابت مشیت کے ساتھ مقید نہیں ورنہ قرب کا معلق بالمشیت ہونا لازم آئے گا حالانکہ حق تعالیٰ کا قریب ہونا محقق ہے علماً بھی اور تعلق خصوصیت سے بھی۔ لقولہ استجبتم حتی علی غصنی، و هو المرد بالعلق۔ پس میرے نزدیک اجیب بالمعنی الاول نہیں۔ ہاں بالمعنی الثانی ان شاء سے مقید ہے۔ جب دعا اس طرح سے مقبول ہے پھر دعائیں کوتاہی کیوں بنے اگر کسی کے ذہن میں یہ تحقیق نہ ہو تو وہ دعائیں اس طرح بھی تو دل کو سمجھا سکتا ہے کہ دنیا میں تو نفع موبہم بھی بہت سے کام کر لیتے ہیں گو آخر میں خسارہ بھی ہو جاوے اور خسارہ کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ جسے تجارت وغیرہ میں احتمال ہے۔ اور دعائیں تو خسارہ کا احتمال ہی نہیں پھر اس میں کونا ہی کیوں کی جاتی ہے۔ دعائیں ایک بات اور ہے وہ یہ کہ دعا کرنے سے بندہ کو حق تعالیٰ سے خاص تعلق ہو جاتا ہے۔ جس وقت آدمی دعا کرتا ہے اس وقت غور کر کے ہر شخص دیکھ لے کہ اس کو اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق محسوس ہوگا۔ پس دعا کے بعد اگر مطلوب بعینہ حاصل نہ ہو تو یہ بات اسی وقت حاصل ہو جائیگی کہ دل میں قوت و اطمینان حاصل ہوگا۔ اور یہ برکت اسی کی ہے کہ دعا سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندہ کو خاص تعلق ہو جاتا ہے۔ عشاق کو تو دعا سے ہی مطلوب ہے۔ اور کچھ مطلوب نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں سہ

ازدعا بنود مرد عاشقان

جز سخن گفتن باں شیریں دباں

اسی لئے عشاق کو دعا قبول ہونے یا نہ ہونے پر کبھی التفات نہیں ہوتا کیونکہ عاشق کے لئے یہی بڑی بات ہے کہ محبوب اس کی باتیں سن لے عاشق کے لئے یہی بات بہت کافی ہے اس کے بعد اگر اجابت کی دوسری قسم کا بھی ظہور ہو جائے تو مزید عنایت ہے تو چاہئے کہ حق تعالیٰ سے خاص تعلق پیدا کیا جائے جس کا بہت آسان طریقہ دعا ہے۔ بغیر

نہ تیرے رب نے کہا مجھ سے دعا کرو میں قبول کر دوں گا۔

سہ میری رحمت میرے غضب پر غالب آگئی۔

اس کے خاص تعلق پیدا کیا جائے بلکہ ہوائی تعلق ہوتا ہے کہ اگر سوچا جائے اور غور کیا جائے تو حق تعالیٰ سے بہت دور نظر آتا ہے۔ صاحبو! پھر یہ کتنے انسانوں کی بات ہے کہ ہمارا ایک تو خدا جس سے سابقہ ہے اور آئندہ بھی سابقہ پڑے گا۔ اور ہم اس سے اس قدر دور ہو رہے ہیں وہ تو قریب ہی ہیں۔ بس ہم دور ہو رہے ہیں۔ (الاصابۃ ص ۶)

۴۸۔ عمل کے بغیر کوئی دینی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔

باب عمل میں آج کل دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ ہیں جن کو صرف اعتقاد کی درستی کا خیال ہے وہ عمل کو مہتمم بال نشان ہی نہیں سمجھتے، اس لئے ان کو اصلاح عمل اور تکثیر اعمال کا اہتمام ہی نہیں۔ اگر یہ لوگ یوں کہتے کہ عقیدہ کا درجہ عمل سے زیادہ ہے تو ہم کو ان سے منازعت کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس کا ہم کو کبھی انکار نہیں۔ واقعی یہ درست ہے کہ عمل کا درجہ عقیدہ سے موخر ہے مگر اس سے یہ کیونکر لازم آیا کہ عمل فضول و بیکار ہے۔ کیا جو چیز کسی سے موخر ہو وہ بیکار ہو کرتی ہے کیا آپ کو معلوم نہیں کہ شاخوں کا مرتبہ جڑ سے موخر ہے۔ مگر بایں ہمہ کوئی بھی شاخوں کو بیکار نہیں کہہ سکتا کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ درخت بار آور نہیں ہو سکتا۔ جس کی شاخیں نہ ہوں اگرچہ اس کی جڑ کیسی ہی مضبوط ہو۔ ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ خالی عقیدہ جس میں عمل نہ ہوں بار آور نہ ہوگا۔ مجرد عقائد سے بغیر عمل کے وہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا جو مطلوب شارع ہے گو کبھی بعض کیفیات بغیر اعمال کے حاصل ہو جاتیں۔ مگر کیفیات خود مطلوب نہیں۔ بانی جو ثمرہ شارع کے نزدیک مقصود ہے وہ بغیر اعمال کے حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم کو اخبار شارع سے یہی معلوم ہوا ہے کہ بدون عقیدہ و عمل دونوں کی درستی کے ثمرہ مقصودہ کے حصول کا یقین نہیں ہو سکتا گو یہ ممکن ہے کہ بعض کو صرف اصل کی درستی سے بھی حاصل ہو جائے مگر بوجہ وعدہ نہ ہونے کے اس کا یقین نہیں۔ ان لوگوں نے قرآن کی صرف ایک آیت یاد کر لی ہے۔

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ۔ جس سے یہ سمجھ لیا کہ محض علم

کافی ہے یعنی اصلاح عقیدہ۔ اور یہ نہ دیکھا کہ قرآن میں بہت جگہ یہ بات مصرح ہے کہ عمل کرنے والے اور عمل نہ کرنے والے بھی برابر نہیں ہو سکتے۔ سنئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔ اَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ۔ ایک مقام پر ارشاد ہے اَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ۔ ایک جگہ ارشاد ہے اَفَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ۔ بہر حال ثابت ہو گیا کہ عادت اللہ یہ ہے کہ دین سے جو خاص ثمرہ مطلوب ہے وہ بغیر عمل کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ (المجادلہ ص ۶)

۴۹۔ مجاہدہ کو ضروری سمجھنا غلطی ہے

بعض لوگ اعمال کو تو ضروری سمجھتے ہیں مگر اعمال کے ساتھ کسی اور شئی کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ظاہر میں ان کی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے عقیدہ اور عمل دونوں کو ضروری سمجھنا مگر اس میں بھی ایک نقص ہے وہ یہ کہ تصحیح عقائد کے بعد اصلاح اعمال اور تکمیل اعمال و مواظبت اعمال کے لئے صرف ارادہ کو کافی سمجھا۔ حالانکہ تجربہ اور مشاہدہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اصلاح اعمال کی سہولت کے لئے ایک اور شئی کی بھی ضرورت ہے اگرچہ نفس اصلاح ممکن ہے یعنی وہ امر اصلاح کا موقوف علیہ عقلاً نہیں ہے۔ اور نہ عادتاً۔ اس معنی کہ موقوف علیہ ہے کہ اس کے بغیر کسی طرح بھی عمل نہ ہو سکے، لیکن اس معنی کہ ضرور موقوف علیہ ہے کہ بدون اس کے عمل سہولت نہیں ہو سکتا۔ پس وہ سہولت میں موقوف علیہ ہے گو صدور عمل بغیر اس کے ہو سکتا ہے۔ اس کی مثال ریل کی سی ہے کہ جیسے مسافرت طویلہ بدون ریل کے سہولت طے نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ بدقت طے ہو سکتی ہے۔ ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ اصلاح عقائد کے بعد گو صدور عمل بتکلف بدون اس خاص شئی کے ہو سکتا ہے مگر سہولت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ سہولت اعمال کے لئے اس خاص شئی کی ضرورت ہے مجھے اس وقت اس کا بیان کرنا مقصود ہے اور یہی وہ مسئلہ ہے جس کے معنی معلوم نہ ہونے سے باب عمل میں بہت لوگ غلطی کر رہے ہیں حاصل اس شئی کا یہ ہے کہ صدور اعمال بعد اصلاح عقائد کے گوارادہ سے ہو سکتا ہے لیکن اس

ارادہ کے کچھ موانع مزاحم ہو جاتے ہیں جس سے صدور عمل دشوار ہو جاتا ہے اور اس دشواری سے بعض اوقات عدم صدور عمل کی نوبت آ جاتی ہے تو سہولت کے لئے اس شے کی ضرورت ہوتی۔ اس شے کے حصول کے بعد صدور اعمال بالکل سہل ہو جاتا ہے اور میں اس کو تجربہ سے ثابت کرتا ہوں ابھی آیات سے استدلال نہیں کرتا کیونکہ آیت میں دوسرے معنی بھی تحمل ہیں۔ اس لئے اول میں تجربہ سے اس کا ثبوت دیتا ہوں اور پھر بعد میں تبرعاً آیات سے تائید کروں گا۔ سینے اس شے کا نام ہے مجاہدہ نفس اور مخالفت نفس۔ یہ بات بہت قابل تدریس ہے اس کو معمولی نہ سمجھتے۔ اب تجربہ سے اس کی ضرورت معلوم کیجئے کہ یہ تو سب مسلمان جانتے ہیں کہ نماز فرض ہے اور نماز پڑھنے کو سب لوگوں کا جی بھی چاہتا ہے ترک الصلوٰۃ سے ان کا دل بھی بڑا ہوتا ہے مگر چھٹی بہت لوگ نماز نہیں پڑھتے۔ باوجودیکہ سب کا عقیدہ فرضیت صلوٰۃ کا حاصل ہے۔ اسی طرح بعض ارادہ کر کے پڑھتے بھی ہیں مگر وہ ارادہ بعض عوائق سے مضمل ہو کر موثر نہیں رہتا اور اس وجہ سے نماز پڑھنا نہیں ہوتا اس سے معلوم ہوا کہ صدور دوام اعمال کے لئے صرف اصلاح عقائد یا ارادہ ضعیف کافی نہیں ہے بلکہ کسی اور شے کی ضرورت ہے جس کے بعد صدور دوام و رسوخ اعمال ضروری ہے اور وہ تکمیل اعمال کا موقوف علیہ ہے اور وہ شے مجاہدہ نفس اور مخالفت نفس ہے چنانچہ بے نمازی اس واسطے بے نمازی ہے کہ وہ اپنے نفس کا۔۔۔ متباع کرتا ہے۔ اور اس کو آرام دیتا ہے اگر وہ مجاہدہ نفس کرتا تو بے نمازی نہ ہوتا۔ (المجاہدہ ص ۷)

۵۔ انبیاء علیہم السلام پر کالیف انبی کی وجہ

اہل حق کا تو یہ مذہب ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں گناہوں سے پاک ہیں۔ حشو یہ نے انبیاء کی قد نہیں کی۔ وہ ان کو معصوم نہیں مانتے۔ میں کہتا ہوں کہ حشو یہ کا یہ قول نقل کے خلاف تو ہے ہی عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ دنیا کے حکام بھی جس کے سپرد کوئی عہدہ کرتے ہیں تو انتخاب کر کے اس کو حاکم بناتے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کے یہاں عہدہ نبوت کے لئے انتخاب نہیں یا ان کا انتخاب ایسا غلط ہے کہ ایسے شخص کو نبوت کا عہدہ دیدیا جاتا ہے کہ اوروں کو تو قانون کا پابند بنادیں اور خود قانون کے خلاف کریں۔ عقل کبھی اس کو باور نہ آسان کے طور پر لے چھوڑ دینا کہ رکاؤ میں نہ پابندی شہ ایک فرقہ ہے۔

نہیں کر سکتی بس جواب اشکال کا یہ ہے کہ انبیاء کو جو کچھ پیش آیا وہ مصیبت نہ تھی بلکہ صورت مصیبت تھی محض تاویل ہی نہیں بلکہ اس کی ایک دلیل ہے میں آپ کو ایک معیار بتلاتا ہوں جس سے حقیقت مصیبت اور صورت مصیبت میں فرق معلوم ہو جائے گا وہ یہ کہ جس مصیبت سے انقباض اور پریشانی بڑھے وہ تو گناہوں کی وجہ سے ہے اور جس سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہو تسلیم و رضا زیادہ ہو۔ وہ حقیقت میں مصیبت نہیں گو صورت اس کی ہے۔ اب ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر خود دیکھ لے کہ مصیبت کے وقت اس کی کیا حالت ہوتی ہے اور اسی معیار کو حضرات انبیاء راویا کے مصائب اور اہل دنیا کے مصائب۔

میں موازنہ کرے تو اس کو معلوم ہو گا کہ حضرات انبیاء راویا پر ان واقعات سے یہ اثر ہوتا تھا کہ پہلے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھتا اور رضا و تسلیم میں ترقی ہوتی تھی وہ غایت انقیاد و تقویٰ سے یوں کہتے تھے۔

اے حریفان سلطہ رابستہ یار
غیر تسلیم و رضا کو چارہ
آہوئے نیکم و اوشیر شکار
در کف شیر ز خو خوار ہ
اور یوں کہتے ہیں

دل ندائے یار دل رنجان من
ناخوش تو خوش بود بر جان من

فرقہ و حشو یہ کی حماقت
یہ وحشویہ کی حماقت ہے کہ انھوں نے انبیاء علیہم السلام کو اپنے اوپر قیاس کر لیا اور کہہ دیا کہ وہ بھی ہم جیسے بشر ہیں ان سے بھی گناہ ہو جاتے ہیں ان پر بھی مصائب آتے ہیں اور یہ نہ دیکھا کہ ہمارے مصائب میں کتنا زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس قیاس فاسد ہی نے مخلوق کو تباہ کیا ہے۔ اور یہی تو وہ بات ہے جس کی وجہ سے بہت سے کفار کو ایمان نصیب ہوا۔ کیونکہ انہوں نے انبیاء کا ظاہر دیکھ کر ان کو اپنے جیسا سمجھا۔ مولانا فرماتے ہیں

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد
گفتہ اینک ما بشر ایشان شد
کم کسے ز ابدال حق آگاہ شد
ماؤ ایشان بستہ خوابیم و خور
ایں ندانند ایشان از عی
کاریا کاں را قیاس از خود دیگر
در میان فرقے بود بے منتہا
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر
ایک شخص نے اس پر ایہ میں اضافہ کیا ہے

شیریں باشد کہ آدمی خورد شیریں باشد کہ آدم را خورد -

صاحبو! آغوش میں لینا دو طرح ہے ایک چور کو پکڑ کر بغل میں دبانا۔ گودبانے والا حسین و محبوب ہی ہو مگر چور اس دبانے سے خوش نہ ہوگا کیونکہ وہ عاشق نہیں ہے وہ اس دبانے سے پریشان ہوگا۔ بھاگنا چاہے گا۔ اور ایک آغوش میں لینا یہ ہے کہ محبوب اپنے عاشق کو گریز بغل میں دباتے اور زور سے دباتے۔ اب تم اس کے دل سے پوچھو کہ وہ کیا کہتا ہے کیا وہ اس تکلیف کی وجہ سے آغوش محبوب سے نکلنا چاہے گا۔ ہرگز نہیں، بلکہ یوں کہے گا کہ نہ شود نصیب شمن کہ شود ہلاک تیغت سردوستاں سلامت کہ تو خیر آزمائی اسی طرح حق تعالیٰ دو طرح کے لوگوں کو دباتے ہیں ایک تو ان کو جو چور ہیں اور ایک ان کو جو اللہ تعالیٰ کے عاشق ہیں، چور تو خدا کی بندش سے گھبراتا ہے۔ اور عشاق کی یہ حالت ہے کہ

خوشا وقت شورید گمان غش اگر تلخ بنند و گر مرش

گدایان از بادشاہی نفور بامیدش اندر گدائی صبور

دما دم شراب لم در کشند اگر تلخ سینند دم در کشند

اب تو آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ ایک صورت مصیبت ہے ایک حقیقت مصیبت ہے۔ حقیقت مصیبت تو واقعی گناہوں سے آتی ہے مگر صورت مصیبت رفع درجات اور امتحان محبت کے واسطے بھی آتی ہے۔ (اکبر الاعمال ص ۱۴)

۱۵ جہلا کی اس غلطی کا جواب کہ خیرات کی ہونی چیز بعینہ مردہ کو پہنچتی ہے،

بعض لوگ ہر موسم پر موسم کی چیزیں اپنے عزیزوں کے لئے خیرات کیا کرتے ہیں خاص کر وہ چیزیں جن سے مرنے والوں کو رعنت تھی اُس میں پڑھے لکھے بھی مبتلا ہیں اور وہ بہت دور پہنچنے، انہوں نے اس عمل کے لئے کُن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ سے استدلال کیا کہ انفاق محبوب شرعاً مطلوب ہے، پھر اس میں کیا حرج ہے کہ مرنے

والے کا محبوب مر عجب خیرات کیا جاتے ہیں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے "مَا تَحِبُّونَ" فرمایا ہے "ما تحبون" نہیں فرمایا۔ پس خیرات کرنے والے کو اپنا محبوب خیرات کرنا چاہیے نہ کہ مردہ کا محبوب، اور راز اس میں یہ ہے کہ اصل مدار فضیلت کا اخلاص ہے اور اپنے محبوب کے انفاق میں اخلاص زیادہ ہوتا ہے نہ کہ دوسرے کے محبوب کے انفاق میں، یہ تو ان کے استدلال کا جواب تھا۔

اب میں وہ دلیل بیان کرتا ہوں جس سے یہ معلوم ہوگا کہ جو چیز ہم خیرات کرتے ہیں مردوں کو وہ بعینہ نہیں پہنچتی بلکہ اس کا ثواب پہنچتا ہے۔ سنئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ تَن يَتَالِ اٰدَمٰى لِحُومِهِمْ وَلَا دِمَآئِهِمْ وَلٰكِنْ يٰۤاٰنَاسُ اتَّقُوْا مَنۡكُمۡ۔ اس میں صاف تصریح ہے کہ قربانی کا گوشت و خون خدا کے یہاں نہیں پہنچتا۔ بلکہ تمہارا خلوص و اخلاص پہنچتا ہے۔ اور اسی ہی کام کو ثواب پہنچتا ہے اور وہی ثواب مردوں کو پہنچا دیا جاتا ہے جب کہ ان کی طرف سے قربانی یا اور کوئی خیرات کی جائے اور اس سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ محرم کے شربت میں بھی عوام کے عمل کا مبنی یہی خیال ہے کہ شہدائے کربلا پیاسے شہید ہوئے تھے، اس لئے شریعت پہنچانا چاہیے کہ پیاس نکھے۔ سو اول تو یہی سمجھنا غلط ہے کہ ان کو یہ شربت پہنچتا ہے۔ شربت ہرگز نہیں پہنچتا۔ دوسرے یہ عمل عقیدت کے بھی خلاف ہے۔ کیا آپ کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ حضرات ابھی تک پیاسے ہیں۔ یہ اعتقاد آپ ہی کو مبارک ہو۔ ہمارا تو یہ اعتقاد ہے کہ ان کو شہادت کے وقت ہی انشاء اللہ تعالیٰ شراب طہور کا وہ جام مل چکا ہے جس سے پہلی بھی پیاس جاتی رہی اور آئندہ بھی جاتی رہی۔ اور اس اعتقاد فاسد کا ایک مفسدہ یہ ہے کہ بعض دفعہ محرم کا مہینہ سردیوں میں آتا ہے۔ تو اس وقت بھی شربت ہی پلایا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت لوگ بیمار ہو جاتے ہیں کسی کو نمونیہ ہو جاتا ہے خدا بچائے ایسی پابندی رسم سے اور غور کر کے دیکھا جاتا ہے کہ رسوم کی پابندی ہمیشہ بے سمجھے ہی ہوتی ہے۔ (دار المسعود ص ۵)

جس کا مبنی یہ خیال ہے کہ

خیرات کی جانہ والی چیزیں مردہ کو نہیں پہنچتی ہیں

جو چیز خیرات کی جاتی ہے مردہ کو وہی پہنچتی ہے سو یہ خیال غلط ہے اور مردہ کی محبوب چیز خیرات کرنے کا مبنی یہ حسرت ہے کہ ہمارے آج وہ ہوتا تو وہ بھی کھاتا۔ جب وہ نہیں ہے تو لاؤ خیرات ہی

کر دوتا کہ اس کو پہنچ جائے۔ منشا یہ ہے کہ ہم کو نعمائے جنت کا استحضار نہیں ہے اگر ہم کو بات مستحضر ہوتی کہ وہ تو نعمائے جنت سے محفوظ و مسرور ہو رہا ہے۔ تو یہ حسرت ہرگز نہ ہوتی کیونکہ نعمائے جنت سے دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کو کیا نسبت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمائے جنت میں رمان و نخل وغیرہ کا بیان فرمایا ہے ان کو دنیا کے نخل و رمان پر تیا س نہ کیا جاوے۔ نعمائے آخرت کو نعمائے دنیا سے محض اسمی مشارکت ہے۔ ورنہ حقیقت میں وہ اور چیزیں ہیں برائے نام دونوں میں کچھ مشابہت ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے راجہ محمود آباد نے وانسہ کے کی دعوت میں ایک انار تیار کر لیا تھا جو دوسو روپے میں تیار ہوا تھا اس کی صورت اور نام تو انار کا تھا۔ مگر حقیقت میں وہ اور چیز تھی خود قرآن شریف میں ارشاد ہے۔۔۔۔۔ قَوَارِيرُ مِنْ فِضَّةٍ قَدْ رَهَاقَ تَقْدِيرًا۔ کہ جنت میں چاندی کے شیشے ہوں گے یعنی جن میں آئینہ کی سی شفافی اور صفائی ہوگی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی چیزیں دنیا کی چیزوں سے صرف نام میں مشابہ ہیں ورنہ وہاں کی چاندی آئینہ کی طرح شفاف ہوگی جس میں نگاہ آ رہا ہو جائے گی۔ دنیا کی چاندی میں یہ بات کہاں۔ تو اب تم اس دنیا میں ہو کہ مردے یہاں ہوتے اور مردے اس تمنا میں ہی ہیں کہ تم وہاں ہوتے بخدا جانے یہاں کیا رکھا ہے جس پر لوگ فریفتہ ہیں۔

زر و نقرہ چسیت تا مفتوں شوی چسیت صورت تا چنین مجنوں شوی

حوریں و ان کے دُوپٹے

وہاں کی نعمتوں کو حدیث سے معلوم کرو۔ میں آتا ہے کہ حوروں کے سر پر ایسی نفیس خولیاں اور دھنیاں ہیں کہ اگر ان کا ایک پلہ دنیا میں لٹک جائے تو آسمان کے چاند و سورج ماند پڑ جائیں وہاں کی حوریں ایسی حسین ہیں کہ ستر جوڑوں کے نیچے سے ان کا بدن جھلکتا ہے جنت کی مٹی جواہرات اور مشک کی ہے۔

حوض کوثر کا پانی

حوض کوثر کے پانی کی تعریف یہ ہے۔ من شرب منہ شربة لا یظمأ بعدھا ابداً۔ جس نے اس میں سے ایک دفعہ پانی پی لیا اس کو کبھی پیاس ہی نہ لگے گی اور لطف یہ کہ بدون پیاس کے بھی اس کی رعبت ہوگی اور اس کا لطف حاصل ہوگا۔ دنیا کے پانی میں پیاس کے وقت تو مزہ آتا ہے بدون لے انار لے کھجور۔

پیاس کے مزہ نہیں آتا۔ جنت کے پانی کی یہ شان ہے کہ ایک دفعہ پی کر عمر بھر کے لئے پیاس کی کلفت دفع ہو جاوے گی اور بدون پیاس کے اس کا مزہ حاصل ہوگا۔ بتلاؤ دنیا میں ایسا پانی کہاں ہے جس سے پیاس ہی نہ لگے اور بدون پیاس کے اس سے مزہ آئے۔ اس پر تمام نعمتوں کو تیا س کر لو کہ ان کی رائے جنت کو دنیا کی لذتوں سے محض نام کی مشارکت و مشابہت ہے۔ اب یہ حسرت کرنا کہ ہمارے مُردہ عزیز دنیا میں ہوتے اور یہاں کی نعمتوں سے متلذذ ہوتے مگر حراقت نہیں تو اور کیا ہے۔ ارے ان نعمتوں کو ان کے سامنے رکھو تو شاید ان کو مٹے آنے لگے۔ (ایضاً ص ۱۸۷)

۵۲ اس شبہ کا جواب کے مشائخ بعض مرتبہ نااہل کو خلیفہ کر دیتے ہیں

جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ اجازت کے وقت اہل ہو پھر نااہل ہو گیا۔ اور ایسا ہونا مستبعد نہیں اسی لئے عقائد کی کتابوں میں مذکور ہوا ہے۔ ایک تو یہی کہ السَّعِيدُ حَتَّى يَشْفَقَ لِكُلِّ أَدَمِي كَبْشِي شَفَقِي بھی ہو جاتا ہے اور یہ اہل سنت کے عقائد میں داخل ہے (العبد الربانی ص ۲۵) تو یہ امر موجب اعتراض نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے اجازت کے وقت وہ اہل ہی ہوں بعد میں شفع ہو گئے ہوں اور یہ الواصل لایرد کے خلاف نہیں۔ کیونکہ اس مسئلہ میں واصل فی الواقع مراد ہے نہ فی زعم الشیخ باقی الواصل لایرد کا قاعدہ واقع کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے۔ حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے بخاری کی ایک حدیث میں ہر قل کا قول مذکور ہے۔ وكن الله الايمان ذاخلط بشاشة القلوب۔ کہ ایمان کی حلاوت جب قلب میں پیوستہ ہو جاتی ہے تو ارتداد ممکن نہیں۔ اس قول کو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے بلا تکیہ نقل فرمایا ہے کسی نے اس پر کلام نہیں کیا۔ پس تقریر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مسئلہ ثابت ہو گیا۔ دوسرے جواب اس اعتراض کا اور ہے جو لطیف بات ہے اور اس مقام پر اسی کو ذکر کرنا مقصود ہے وہ یہ کہ مشائخ بعض دفعہ کسی نااہل میں جبار و شرم مادہ دیکھ کر اسے اس امید پر مجاز کر دیتے ہیں کہ وہ دوسروں کی تربیت کرے گا تو اس کی ج اور شرم سے اپنی بھی اصلاح کرتا رہے گا یہاں تک کہ ایک دن کامل ہو جائے گا۔ پھر بعضے اہل شیخ کی اس امید کو غلط کر دیتے ہیں مگر ایسے کم نکلتے ہیں۔ غالب حالت یہی ہے کہ جس میں

حیات و شرم کا مادہ ہوتا ہے وہ دوسرے نئی تربیت کرتے ہوئے اپنی اصلاح بھی ضروری کرتا ہے
(ایضاً ص ۲۱)

۵۳۔ اس عقائد کی تردید کہ نجات آخرت ہمارے اختیار سے باہر ہے !

یہ اعتقاد بالکل غلط ہے اور صراحتہً نصوص کے خلاف ہے گو اس مخالفت نصوص پر
جہل کی وجہ سے ہے میں ان لوگوں پر کفر کا فتویٰ تو نہیں دیتا مگر جہل شدید ضرور کہا جاوے
قرآن میں نصوص بھری ۔۔۔ ہوئی ہیں جن سے نجات آخرت کا داخل اختیار ہونا صاف صاف معلوم
ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں سَابِقُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ
وَالْأَرْضِ حَسْبُ مِمَّن مَّسَابِقَتِ إِلَى الْجَنَّةِ كَامِرٍ هَبْ۔ اگر جنت میں جانا ہمارے اختیار میں نہیں ہے
تو حکم ”سَابِقُوا“ کیوں ہے معلوم ہوا کہ ہمارے اختیار میں ہے کیونکہ حق تعالیٰ اختیاری امور پر
مکلف فرمایا کرتے ہیں، غیر اختیاری امور کا مکلف نہیں فرمایا کرتے، نص میں موجود ہے لَا يُكَلِّفُ
اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا شاید یہ شبہ ہو کہ جنت و دوزخ ہم کو تو نظر نہیں آتی جو اس میں کو
کر پہنچیں یا کو در باہر نکل جائیں یا دور بھاگ جائیں، پھر اس کی طرف سبقت کس طرح کی جا
یاد دوزخ سے کیونکر بچا جاتے۔

تو سمجھ لیجئے کہ کسی فعل کے اختیاری ہونے کے
فعل اختیاری کے دو معنی ہیں

کھانا کھانا اختیاری ہے، پانی پینا اختیاری ہے دوسرے یہ کہ بواسطہ اختیاری ہو۔ یعنی اس
اسباب اختیاری ہوں۔ جیسا کہ خورجہ سے دہلی پہنچ جانا اور کلکتہ یا بمبئی پہنچ جانا اسی معنی
اختیاری ہے۔ کیونکہ یہاں سے بمبئی کو در کون پہنچ سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کو اختیار
کہا جاتا ہے جس کے یہی معنی ہیں کہ اس کے اسباب اختیاری ہیں، یعنی مسافت قطع کرنا۔ اور
غور کر کے دیکھا جائے تو زیادہ افعال اختیاریہ اسی دوسری قسم کے ہیں۔ مثلاً نکاح کر کے بچے
جنوانا۔ زراعت سے غلہ حاصل کرنا۔ تجارت سے نفع حاصل کرنا اختیار ہی ہے تو کیا ایسا

ایسا اختیاری ہے کہ آپ بلا واسطہ جب چاہیں حاصل کر لیں۔ ہرگز نہیں بلکہ اسی معنی کر اختیاری
ہے کہ اسباب اختیار میں ہیں اسباب کو اختیار کرو، امید ہے کہ مسبب حاصل ہو جائے گا۔

پس جنت میں جانا بھی اس معنی کر اختیاری ہے کہ اس
جنت میں جانا اختیاری کے اسباب آپ کے اختیار میں ہیں۔ قرآن و حدیث کو

دیکھو معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ نے دوزخ سے بچنے اور جنت میں جانے کے لئے اسباب و تدابیر بتلائی
ہیں ان کو اختیار کرو، پس خدا تعالیٰ تم کو جنت میں پہنچائیں گے۔ اور دوزخ سے بچا دیں گے
چنانچہ اسی جگہ ارشاد ہے۔ وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ، اس سے معلوم ہوا کہ
کفر موجب دخول نار ہے اور سَادِعُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ
عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ کے بعد ارشاد ہے أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ اس سے معلوم ہوا کہ
تقویٰ موجب دخول جنت ہے۔ پھر تقویٰ کی تفصیل قرآن میں جا بجا مذکور ہے چنانچہ اسی
جگہ ارشاد ہے الَّذِينَ يَنْفِقُونَ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَالْكَافِرِينَ وَالْعَافِينَ
مِنَ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ۔ اس میں انفاق و کفر غیظ و عفو و احسان کا بیان ہے

دوسری جگہ ارشاد ہے لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ
قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ

الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَتَمَّ
الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ۔۔۔ وَالْمُؤْمِنُونَ بَعْدَهُمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ
فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْمُتَّقُونَ۔ اس میں تمام ابواب تقویٰ کو اجمالاً بیان کر دیا گیا ہے جس میں اول محض صورت

بے معنی کو کافی سمجھنے کی ممانعت ہے دل علیہ قول۔ لیس البر ان تولوا وجوهکم الی
آخر۔ جیسا کہ منافقین و یہود نے تحویل قبلہ کی گفتگو کا شغل بنالیا تھا اس کے بعد ایمان بائید
ایمان بالمعاد اور ایمان بالملائکہ اور ایمان بکتاب سماویہ اور ایمان بالانبیاء کا امر ہے۔ یہ تو اعتقاد
کے متعلق ہے پھر جب مال کو انفاق سے زائل کرنے کا امر ہے (یا محبت الہیہ میں مال خرچ کرنے
ازغیب ہے) یہ اصلاح قلب کے متعلق ہے۔ پھر اقامت صلوٰۃ کا امر ہے یہ طاعت بدنیہ

ہے۔ پھر اتنا رزکوۃ کا یہ طاعت مالیہ ہے اور اوپر جو اتنا مال کا ذکر ہوا ہے۔ وہ انفاق قطعاً ہے۔ جس کی حدیث ترمذی میں تصریح ہے ان فی المال لحقاً سوی الزکوۃ شہ تلا الایۃ (اور علی جب اس کا قرینہ بھی ہے۔ کیونکہ اگر اس کا مرجع مال ہے تو حب مال کے ازالہ کیلئے فقط اتنا رزکوۃ کافی نہیں کچھ زائد انفاق کرنا چاہیے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ مرجع ہیں تو حب الہی کا مقتضی بھی یہی ہے کہ فرض کے علاوہ کچھ مال محض محبت کی وجہ سے خرچ کیا جائے) اس کے بعد ایفا رعبہ کا امر ہے جو معاشرت کے متعلق ہے۔ پھر صبر کا امر ہے جو سلوک کے متعلق ہے غرض اس میں تمام شعب تقویٰ کو اجمالاً جمع کر دیا گیا ہے اس لئے اولئک هم المتقون۔ پس کو ختم فرمایا ہے۔ تو اب بتلائے کہ خدا تعالیٰ نے یہ تدبیر بتلائی ہے یا نہیں۔ اور یہ تدبیر اختیار ہی نہیں یا نہیں۔ تو اب جنت میں جانا اختیاری ہوا یا نہیں۔ رہا یہ کہ تدبیر توح حق تعالیٰ نے بتلائی ہیں مگر ان پر عمل کرنا اور ان کا بجالانا تو مشیت پر موقوف ہے بدون مشیت کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ تو بے شک یہ ہمارا عقیدہ ہے مگر اس میں جنت و دوزخ ہی کی کیا تخصیص ہے دنیا کے بھی سب کام مشیت ہی پر موقوف ہیں کھیتی کرنا ملازمت کرنا بھی تو مشیت پر موقوف ہے۔ پھر ان کے لئے کیوں سعی کی جاتی ہے۔ وہاں تو یہ کہا جاتا ہے کہ

رزق ہر چند بیگیاں برسد
لیک منظر است جستن از دریا

اور مرنا بھی تو مشیت پر موقوف ہے۔ پھر سانپ کچھو وغیرہ سے کیوں حفاظت کی جاتی ہے اس کے متعلق یوں کہتے ہیں کہ

اگر چہ کس بے اجل نہ خواہد مرد
تو مرد و رہاں از دہا

یہ کیا کہ سارا توکل امور آخرت ہی میں صرف کیا جاتا ہے اگر بڑا توکل کا دعویٰ ہے تو پہلے

دنیاوی امور میں بھی کیا ہوتا۔ میں توکل کو منع نہیں کرتا بلکہ آپ کی غلطی ظاہر کرتا ہوں کہ جب آپ نے توکل سمجھا ہے وہ توکل نہیں ہے توکل کے معنی نہیں کہ اسباب تدبیر کو قطعاً ترک کر دیا بلکہ طریقہ حقہ یہ ہے کہ تدبیر و تقدیر دونوں کو ملا یا جائے۔ یعنی کام کر کے توکل کرنا چاہیے کہ

گر توکل می کنی دو کار کن
کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

دنیا میں بھی ہم یہی کہتے ہیں کہ کھیتی کر کے مرثہ کے متعلق خدا تعالیٰ پر نظر رکھو۔ خلاصہ یہ ہے کہ عمل میں تو اسباب کو اختیار کرو اور مرثہ میں توکل کرو۔ چنانچہ دنیوی معاملات میں سب کا خیال۔

یہی طرز ہے مگر نہ معلوم یہ تجزیہ کیسا ہے کہ امور اخرویہ میں عمل اور مرثہ دونوں میں توکل سے کام لیتے ہو۔ حالانکہ وہاں بھی یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا جو معاملات دنیا میں اختیار کر رکھا ہے ورنہ دونوں میں فرق بتلانا چاہیے بلکہ اگر غور کیا جائے تو دنیا و آخرت کا فرق اس کو مقتضی ہے کہ مقاصد دنیویہ میں تو ترک تدبیر و تعطیل اسباب کی گنجائش ہے اور مقاصد اخرویہ میں ترک تدبیر و تعطیل اسباب کی مطلقاً گنجائش نہیں کیونکہ توکل معنی ترک اسباب کی حقیقت ہے۔ ترک اسباب منظونہ غیر مامور بہا یعنی جن اسباب پر مسبب کا ترک عادتاً یقینی قطعی نہ ہو اور شرعاً وہ واجب بھی نہ ہوں ان کو ترک کر دیا جائے باقی جن اسباب پر عادتاً مسببات کا ترک یقینی ہے ان کا ترک جائز نہیں اور نہ اس کو توکل کہا جائے گا کہ بھوک کی حالت میں آپ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں کہ اللہ میاں کو منظور ہوگا تو چٹ خود بخود ہو جائے گا۔ اگر یہ شخص بھوکوں مر گیا تو عاصی ہوگا۔ اور اسباب منظونہ کا ترک بھی اس کو جائز ہے جو خود بھی قوی الہمت ہو اور اس کے اہل و عیال بھی یا اس کے اہل و عیال ہی نہ ہوں۔ اور ضعیف الہمت کو یا جس کے عیال ضعیف ہوں اس کو ان کا بھی ترک جائز نہیں۔ اسی طرح اسباب مامور بہا کا ترک توکل نہیں

آخرت کیلئے سعی کرنا

جب توکل کی حقیقت معلوم ہو گئی تو اب سوچئے کہ ثمرات آخرت کے لئے جو اسباب شریعت نے بیان کئے ہیں وہ کیسے ہیں۔ آیا مامور بہا ہیں یا نہیں۔ سو ظاہر ہے کہ مامور بہا ہیں اور نیز آیا ان پر مسبب کا ترتب شرعاً ضروری ہے یا منظون تو نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ اسباب آخرت پر ترتب مسبب لازم ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ ذَاؤْلِکَ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ وَلَا یُظْلَمُ شَیْءٌ لِّهٖ اَوْ اَرشاد ہے۔ فَمَنْ یَعْمَلْ مُشْقَالاً ذَرَّایَةً خَیْرًا یَّرْکَا وَمَنْ یَعْمَلْ مُشْقَالاً ذَرَّایَةً شَرًّا یَّرْکَا، اور بہت سے نصوص ہیں جن میں اعمال آخرت کے متعلق ترتب وعدہ ہے کہ جزا ضرور مرتب ہوگی۔ اور دنیا کے متعلق نہ وعدہ ہے نہ اکثر اسباب میں ترتب ضروری ہے گو ہر چیز کے لئے اسباب موجود ہیں چنانچہ حدیث میں ہے مَا جَعَلَ اللہ دَاءَ لَاجِلٍ لِّدَاءِ اَوَّلَیِّیْہِمْ وَاسْطَیِّہِمْ مَّرْثَیِّہِمْ لَمَّا انْزَلَہُمْ مَرْتَبَہُمْ ہُوَ کَا حَقِّ تَعَالٰی کِی طَرَف سے وعدہ ہے اس لئے کبھی تخلف بھی ہو جاتا ہے کہ کھیتی کرتے ہیں اور پیداوار نہیں ہوتی یا اگر کرتے ہیں اور شفا نہیں ہوتی۔ اور نہ اس پر عادتاً ترتب اثر ضروری ہے اور نہ یہ شرط

ہے کہ بدون دوا کے صحت نہ ہو سکے یا جب دوا کی جائے تو صحت ضرور ہو جائے بخلاف اعمال آخرت کے کہ ان کو اپنے ثمرات کے ساتھ علیت و شرطیت دونوں کا علاقہ ہے گویہ علیت و شرطیت عقلی نہ ہو شرعی ہی ہو، تو لزوم ترتب میں اعمال آخرت کی سب کی وہ حالت ہے جو دنیا میں بعض اسباب قطعیہ یقینیہ کی حالت ہے جن پر عادتاً ترتب اثر ضروری ہے جیسے اکل پینے کا اور شرب پر رسی کا مرتب ہونا بلکہ وعدہ و عدم وعدہ کا تفاوت سے اعمال آخرت ان اسباب سے بھی الصق ہیں۔ پس جیسے ان اسباب کو دنیا میں ترک کرنا جائز نہیں یہی حکم جملہ اسباب آخرت کا ہے کہ ان میں سے کسی کا بھی ترک جائز نہیں۔ کیونکہ وہ سب اسباب قطعیہ یقینیہ ہیں جن پر ترتب اثر کا بعض میں وعدہ بھی ہے۔ پھر حیرت ہے کہ جن اسباب پر ترتب اثر کا وعدہ بھی نہیں وہاں تو چھوٹی سے چھوٹی تدبیر سے بھی دریغ نہیں اور جہاں ترتب اثر کا وعدہ ہے کہ تخلف کا احتمال ہی نہیں وہاں تو کل اختیار کر لیا ہے پس دنیا و آخرت کے فرق پر نظر کی جائے تو اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے کہ دنیا کے بعض اسباب میں توکل جائز ہو اور آخرت کے کسی سبب میں بھی جائز نہ ہو۔ یہ تو اسباب کا حکم تھا۔ رہے مسببات اور ثمرات تو ان میں مطلقاً توکل واجب ہے خواہ نثرۃ دنیا میں یا نثرۃ آخرت میں۔ یعنی ثمرات کو اسباب کا نتیجہ نہ سمجھے خدا تعالیٰ کی عطا سمجھے خوب سمجھ لو۔ (دوائر الغفار ص ۱۸)

۵۴ اختلاف رویت کی صورت ہیں روزہ

کون سی تاریخ کا افضل ہوگا

خوب کہہ لو کہ تمہارا یہی خیال غلط ہے کہ ثواب کے اعتبار سے بھی پندرہ ایک ہی ہوگی گو حساب میں پندرہ ایک ہو۔ مگر حق تعالیٰ کسی خاص مکان یا زمانہ میں ایک فضیلت پیدا کر کے اس کے پابند نہیں ہو جاتے کہ دوسرے مکان میں یا زمانہ میں اس کی فضیلت کو پیدا نہیں کر سکتے ہیں بلکہ وہ ہر جگہ رات اور ہر دن میں اس کی فضیلت کو پیدا کر سکتے ہیں۔ رہا یہ کہ امکان سے وقوع تو لازم نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری نصوص سے اس کا وقوع بھی ثابت ہو رہا ہے کہ حق تعالیٰ ایسا ہی کرتے ہیں کہ جو برکت ایک تاریخ میں تمہارے واسطے ہے وہی برکت دوسری تاریخ میں آسودگی کے سیرابی سے زیادہ چپکنے والا

کے لئے دوسری تاریخ میں پیدا کر دیتے ہیں جس کو وہ اپنی تحقیق کے موافق پندرہ سمجھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کو برکت کا ایک رات سے دوسری رات میں منتقل کر دینا کیا مشکل ہے۔ ان کی شان تو یہ ہے۔ اُولَئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ کہ حق تعالیٰ گناہوں کو حسنہ بنا دیتے اور جرم کو طاعت کر دیتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ حشر میں اللہ تعالیٰ ایک بندہ سے دریافت فرمائیں کہ کیوں تو نے ایسا کیا تھا تو نے فلاں گناہ کیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ اول چھوٹے چھوٹے گناہوں کو گناہیں گے بندہ سب کا اقرار کرے گا اور اپنے دل میں ڈرے گا کہ ابھی سنگیں گناہوں کا تو ذکر ہی نہیں ہوا دیکھئے ان پر کیسی گرفت ہو مگر حق تعالیٰ کہا ترک کے ذکر سے پہلے ہی یہ فرمائیں گے کہ جاؤ ہم نے تم کو ہر گناہ کے عوض ایک نیکی دی۔ اب وہ بندہ خود اپنے گناہ گنوا بیگا کہ الہی میں نے تو اور بھی بڑے بڑے گناہ کئے ہیں ان کا یہاں ذکر ہی نہیں آیا مجھے ان کے عوض بھی نیکیاں دلوائیں یہ تو آخرت میں ہوگا اور دنیا میں یہ بدل اللہ سیئاتہم حسنات کا مصداق یہ ہے کہ ملکات سیئات کو بدل بر ملکات حسنات کر دیتے ہیں بخل و سخاوت سے اور جہل کو علم سے بدل دیتے ہیں، اور حسنات میں یہ صورت ہے کہ پانی کو بون کر دیتے ہیں جیسا کہ قوم فرعون پر عذاب دم مسلط ہوا تھا اور خون کو دودھ بنا دیتے ہیں جیسا کہ عورتوں اور گائے بکری کے پستان میں مشاہد ہے تو اگر وہ ایک تاریخ کی برکت دوسری تاریخ میں بھی رکھ دیں تو کیا بعید ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ

گر بخوابد عین غم شادی شود عین بندہ بے آزادی شود
کیسا داری کہ تبدیلیش کنی گرچہ جوئے خون بود تبدیلیش کنی

واقعی حق تعالیٰ سے زیادہ کیسا بنانے والا کون ہوگا جب تم کیسیا وی تدبیر سے تابنے کو دنا اور رانگ کو چاندی بنا دیتے ہو تو وہ پتھر کو سونا بنا دیں تو کیا بعید ہے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے بلکہ سونا چاندی اور سب ہاتیں زمین ہی سے نکلتی ہیں اللہ تعالیٰ نے اس مٹی ہی سے کیا کیا دیا۔

س کے یہاں جو نتائج ثابت ہوئی کرے رہا یہ کہ ایسا ہوتا بھی ہے یا نہیں اس کے لئے دوسری نصوص موجود ہیں جن سے معلوم ہے کہ ہر بستی اور ہر شہر کے لئے اسی تاریخ میں برکت ہے جو ان کے حساب سے پندرہ تاریخ ہے۔ حدیث میں ہے۔ الصوم یوم قصومون والفضل یوم تفضلون والاضحی

یوم تضحون۔ ترجمہ: روزہ اسی دن کا ہے جس دن تم روزہ رکھو اور عید الفطر کا وہی دن ہے جس دن تم عید الفطر مناؤ اور عید الاضحیٰ اسی تاریخ کو ہے جس دن تم قربانی کرو اس کا مطلب حضرت استاد نے یہ فرمایا کہ جس تاریخ میں تم اپنی تحقیق کے موافق روزہ شروع کر دو یا تحقیق کر کے روزہ ختم کر دو تو خدا کے نزدیک وہی روزہ اور افطار کی تاریخ ہے یعنی جو ثواب اور برکت ماہ رمضان و عید الفطر و عید الاضحیٰ کے دن میں رکھی گئی ہے۔ ہر شہر کے مسلمانوں کو ان ایام میں حاصل ہوگی جو ان کے نزدیک رمضان وغیرہ کی تاریخیں ہیں۔ لہذا تم اپنی تحقیق کے موافق جس دن کو پندرہ شعبان سمجھ کر روزہ رکھو گے وہی معتبر ہے اور اس دن سے پہلی رات تمہارے لئے پندرہویں رات ہے۔ اختلاف تاریخ سے شبہ میں نہ پڑو (الیسر مع الیسر ص ۳)

۵۵ عورتوں کے اس عمل کی زدید کہ گھر میں میلی کھلی رہتی ہیں اور باہر زینت کیسا تھ

جو عورتیں اپنی راحت کے لئے یا اپنا اور اپنے خاوند کا جی خوش کرنے کے لئے قیمتی کپڑا یا زیور پہنتی ہیں ان کو تو گناہ نہیں ہوتا اور جو محض دکھاوے کیلئے پہنتی ہیں وہ گناہ گار ہیں اور اس کی علامت یہ ہے کہ اپنے گھر میں تو ذلیل و خوار بھنگوں کی طرح رہتی ہیں اور جب کہیں تقریب میں نکلیں گی نواب کی بجی بن کر جائیں گی۔ جیسے لکھنؤ کے مزدور دن بھر تو لنگوٹا باندھ کر مزدوری کریں گے اور شام کو کرائے کے کپڑے پہن کر حبیب میں دو پیسہ ڈال کر نکلتے ہیں جن میں سے ایک پیسہ کا توپان کا بیڑا لیں گے اور ایک پیسہ کا پھولوں کا گجر اگلے میں ڈالیں گے جیسے کسی نواب کے بچے ہوں۔ اب عورتیں دیکھ لیں کہ یہ جوڑے بدل بدل کر جاتی ہیں۔ اس میں ان کی نیت کیا ہے۔ اگر اپنی راحت اور دل کی خوشی ہے تو گھر میں اس کٹھاٹھ سے کیوں نہیں رہتیں۔ بعض کہتی ہیں کہ ہم تو اپنے خاوند کی عزت کے لئے عمدہ جوڑا پہن کر نکلتی ہیں اگر اس تاویل کو مان لیا جائے تو پہلی دفعہ جو ایک جوڑا تم نے تقریب کے لئے نکالا تھا خاوند کی عزت کے لئے تمہارے خیال میں وہی کافی تھا۔

اب دیکھو کہ اگر تقریب میں پے درپے دو تین دن جانا ہو جاوے تو تم تینوں دن

اسی ایک جوڑے میں جاؤ گی یا ہر دن نیا جوڑا بدلو گی۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ہر دن نیا جوڑا بدل جاتا ہے آخر کیوں خاوند کی عزت کے لئے ایک ہی کافی تھا۔ مگر نہیں ہر دن نیا جوڑا بدلتی ہیں اس لئے کہ ایک جوڑے میں ہر دن نہیں جاسکتیں اگر اور کچھ نہ بدلیں گی تو دوپٹہ ضرور ہی بدل لیں گی۔ تاکہ ہر دن نیا جوڑا معلوم ہو۔ پھر محفل میں بیٹھ کر ان کو زیور دکھلانے کی حرص ہوتی ہے بعض تو اسی عرض کے لئے ننگے سر رہتی ہیں تاکہ سب کو سر سے پر تک کا زیور نظر آجائے اور جوان میں سے مولوں میں وہ ننگے سر تو نہیں رہتیں مگر کسی نہ کسی بہانے سے وہ ابھی اپنا زیور دکھلا دیتی ہیں کہیں سر کھجاتی ہیں کہیں کان کھجاتی ہیں۔ یہ ریا ہے اور اس عرض سے قیمتی کپڑا پہننا یا زیور حرام ہے۔ ایک مرض عورتوں میں یہ ہے کہ جب یہ کہیں محفل میں جاتی ہیں تو سب کے لباس اور زیور کو سر سے پر تاک لیتی ہیں تاکہ دیکھیں کہ ہم سے تو کوئی زیادہ زیور نہیں رکھتی ہے اور ہم کسی سے گھنے طے کرتے تو نہیں ہیں یہ بھی اس ریا اور تجکر کا شعبہ ہے یہ مرض مردوں میں کم ہے۔ اور اگر دس آدمی ایک جگہ مجتمع ہوں تو مردوں میں سے کسی کو اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ کسی کا لباس کیسا ہے اسے مجلس سے اٹھ کر وہ کسی کے لباس کا حال بیان نہیں کر سکتے۔ اور عورتوں میں سے ہر ایک کو یاد رہتا ہے کہ کس بیوی کے پاس کتنا زیور تھا اور لباس کیسا تھا۔ یاد رکھو اس عرض کے قیمتی لباس پہننا جائز نہیں۔ (غریب لدینا ص ۲۹)

۵۶ مردوں کی کوتاہی کہ عورتوں کے دینی امور اپنے ذمہ نہیں سمجھتے!

وہ اپنے ذمہ کو صرف دنیوی حقوق سمجھتے ہیں دینی حقوق اپنے ذمہ سمجھتے ہی نہیں کہ ہمارے ان کے دین کا بھی کوئی حق ہے مثلاً گھر میں آکر یہ تو پوچھتے ہیں کہ کھانا تیار ہوا یا نہیں۔ مگر یہ ہی نہیں پوچھتے کہ تم نے نماز پڑھی یا نہیں اگر کھانے گھر میں آئے اور معلوم ہوا کہ ابھی تیار نہیں ہے تو خفا ہوتے ہیں یا تیار تو ہو گیا مگر مرضی کے موافق تیار نہیں ہوا تب بھی خفا ہوتے ہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ بیوی نے ابھی تک نماز نہیں پڑھی تو ان کو ذرا بھی ناگواری نہیں ہوتی نہ بیوی خفا ہوتے ہیں۔ بلکہ اگر کسی کی بیوی عمر بھر بھی نماز نہ پڑھے تو بہت سے مردوں کو اس کی بھی

پر وہ نہیں ہوتی اور جو کبھی کسی کو خیال بھی ہوتا ہے تو یہ وہ ہیں جو دیندار کہلاتے ہیں اور وہ بھی لیں ہی چلتی سی بات کہہ دیتے ہیں کہ بی نماز پڑھا کرو۔ نماز کا ترک کرنا بڑا گناہ ہے۔ بس اتنا کہہ کر اپنے نزدیک سبک دوش ہو گئے اور جب کسی نے ان سے کہا کہ تم اپنی بیوی کو نماز کے لئے تنبیہ کیوں نہیں کرتے تو یہ جواب دیتے ہیں کہ کہہ تو دیا تھا اب وہ نہیں پڑھتی تو میں کیا کروں لیکن میں کہتا ہوں کہ انصاف سے بتلائیے کیا آپ نے نماز کے لئے اسی طرح کہا تھا جیسے نمک تیز ہونے پر کہا تھا اور اگر ایک دو دفعہ کے کہنے سے اس نے نمک کی درستی کا اہتمام نہ کیا ہو تو کیا وہاں بھی آپ ایسے ہی خاموش ہو جاتے ہیں جیسے نماز کے لئے ایک دو دفعہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ ہرگز نہیں۔ نمک تیز ہونے پر تو آپ سر توڑنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں اور ایسی بڑی طرح خفگی ظاہر کرتے ہیں کہ بی بی سمجھ جاتی ہے کہ میاں بہت ناراض ہیں اس لئے وہ بہت جلد نمک کی اصلاح کا اہتمام کرتی ہے۔ صاحبو! نماز کے لئے آپ نے اس طرح کبھی نہیں کہا جس سے بی بی سمجھ جائے کہ میاں بہت ناراض ہو گئے ہیں اگر یہاں بھی اسی طرح خفگی ظاہر کرتے تو وہ اس کا بھی ضرور اہتمام کرتی۔ اور اگر ایک دفعہ کے کہنے سے نہ پڑھتی تو دوسرے وقت پھر خفا ہوتے پھر نہ پڑھتی تو تیسرے وقت پھر کہتے اور جب تک وہ نماز نہ پڑھتی برابر کہتے رہتے اور مختلف طریقوں سے اپنی خفگی ظاہر کرتے مثلاً پاس لیٹنا ترک کر دیتے یا اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہ کھاتے جیسا کہ نمک کی تیزی پر اگر ایک بار خفا ہونے سے اثر نہ ہوا تو آپ خاموش نہیں ہو جاتے بلکہ برابر کہتے رہتے ہیں اور وہاں کبھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ اتنی دفعہ تو کہہ دیا ہے اب بھی وہ نہیں ماننی تو میں کیا کروں۔ بس خاموش ہو جاؤں۔ صاحبو! انصاف سے بتلائیے کہ ہم نے کبھی کھانے پینے کے باب میں کبھی اپنے جی کو اسی طرح سمجھایا ہے جیسا نماز کے باب میں سمجھایا جاتا ہے۔ ہرگز نہیں یہ تو سر اس کو تا ہی ہے اگر آپ بی بی کو نمازی بنانا چاہیں تو کچھ دشوار بات نہیں کیونکہ عورت حاکم نہیں بلکہ محکوم ہے۔ چنانچہ اپنی غرض کے لئے ان پر حکومت کی بھی جاتی ہے مگر دین کے لئے اس حکومت سے ذرا کام نہیں لیا جاتا۔

(حقوق البیت ص ۶)

۵۷ زنانه اسکولوں کا قیام عورتوں کیلئے

زہرِ تاتل ہے

بعض آدمی اپنی لڑکیوں کو آزاد بیباک عورتوں سے تعلیم دلاتے ہیں یہ تجربہ ہے کہ ہم صحبت کے اخلاق و جذبات کا آدمی میں ضرور اثر آتا ہے خاص کر جب وہ شخص ہم صحبت ایسا ہو کہ متبور و معظم بھی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ استاد سے زیادہ ان خصوصیات کا کون جامع ہوگا تو اس صورت میں وہ آزادی و بیباکی ان لڑکیوں میں بھی آوے گی اور میری رائے میں سب سے بڑھ کر جو عورت کا حیا اور انقباض طبعی ہے اور یہی مفتاح ہے تمام خیر کی۔ جب یہ نہ رہا تو اس سے پھر نہ کوئی خیر متوقع ہے نہ کوئی شر مستبعد ہے، ہر چند کہ اذا فالتک الحیاء فافعل ما شئت یعنی جب تجھ سے حیا جاتی رہے تو کرجو جی چاہے حکم عام ہے لیکن میرے نزدیک "ما شئت" کا عموم نسائے کے لئے بہ نسبت رجال کے زیادہ ہے اس لئے کہ مردوں میں پھر بھی عقل کسی قدر مانع ہے اور عورتوں میں اس کی بھی کمی ہوتی ہے اس لئے کوئی مانع ہی نہ رہے گا اسی طرح اگر استانی ایسی نہ ہو لیکن ہم سبق اور ہم مکتب لڑکیاں ایسی ہوں تب بھی اس کے قریب مضرتیں واقع ہوں گی۔

اس تقریر سے دو جزئیوں کا حال بھی معلوم ہو گیا ہو گا جن کا اس وقت بے تکلف

موجودہ زمانہ میں اسکول کا حال

شیوع ہے۔ ایک لڑکیوں کا عام زمانہ اسکول بنانا اور مدارس عامہ کی طرح اس میں مختلف طبقات اور مختلف خیالات کی لڑکیوں کا روزانہ جمع ہونا۔ گو معلم مسلمان ہی ہو اور یہ ناڈولیوں ہی میں ہو اور گو یہاں آکر پردہ ہی کے مکان میں رہنا ہو لیکن تاہم واقعات نے دکھلادیا ہے اور تجربہ کرادیا ہے کہ یہاں ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں کہ جن کا ان کے اخلاق پر بڑا اثر پڑتا ہے اور یہ صحبت اکثر عفت سوز ثابت ہوتی ہے۔ اور اگر استانی بھی کوئی آزاد یا مکار مل گئی تو کریلہ اور نیم چڑھائی کی مثال صادق آجاتی ہے۔ اور دوسری جزئی یہ کہ اگر کہیں مشن کی میم سے بھی بروزانہ یا ہفتہ وار نگرانی تعلیم یا صنعت سکھلانے کے بہانے سے اختلاط

لے کنجی

ہونے لگا تب تو نہ آبرو کی خیر ہے نہ ایمان کی۔ مگر افسوس صد افسوس ہے کہ بعض لوگ ان آفات کو مایہ افتخار سمجھ کر خود اپنے گھروں میں بلاتے ہیں۔ میرے نزدیک تو آفات مجسمہ سے بچی تو بچی اور اور تابع ہو کر تو کیا ذکر کسی بڑی بڑی مسلمان عورت کا مقبوع ہو کر بھی عمر بھر میں ایک باہم کلام ہونا بھی خطرناک ہے۔ جن مضر توں کے ذکر کا اوپر وعدہ تھا ان میں سے بعض یہی ہیں۔

لڑکیوں کی تعلیم کا طریقہ | چلا آتا ہے کہ دو دو چار چار لڑکیاں اپنے اپنے تعلقات کے مواقع میں آئیں اور پڑھیں اور حتی الامکان اگر ایسی استثنائی مل جاوے جو تنخواہ نہ لے تو تجربہ سے تعلیم زیادہ بابرکت اور بااثر ثابت ہوئی ہے اور بدرجہ مجبوری اس کا بھی مضار لائق نہیں کہ استثنائی تنخواہ سے ملے۔ اور جہاں کوئی ایسی استثنائی نہ ملے اپنے گھر کے مرد پڑھا دیا کریں۔ تو پڑھانے کا تو یہ طرز ہوا۔ اور نصاب تعلیم ہو کہ اول قرآن مجید حتی الامکان صحیح پڑھایا جائے۔ پھر کتب دینیہ سہل زبان کی جن میں تمام اجزاء دین کی مکمل تعلیم ہو میرے نزدیک اس وقت بہشتی زیور کے دسوں حصے ضرورت کے لئے کافی ہیں اور اگر گھر کا مرد تعلیم دے تو جو مسائل شرمناک ہوں ان کو چھوڑ دے اور اپنی بی بی کے ذریعہ سے سمجھا دے اور اگر یہ نظام بھی نہ ہو سکے تو ان پر نشان کر دے تاکہ ان کو یہ مقامات محفوظ رہیں پھر وہ سیالی ہو کر خود سمجھ لیں گی۔ یا اگر عالم شوہر میسر ہو تو اس سے پوچھ لیں گی یا شوہر کے ذریعہ سے کسی عالم سے تحقیق کرائیں گی (چنانچہ بندہ نے بہشتی زیور کے دستور العمل میں جو ٹائٹل پر مطبوع ہوا ہے اس کا خلاصہ لکھ دیا ہے۔

خصوصی مسائل | مگر بعض لوگ اس کو دیکھتے نہیں اور اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ اگر کوئی مرد پڑھانے لگے تو ایسے مسائل کس طرح پڑھاوے اس لئے ان کا لکھنا ہی کتاب میں مناسب نہ تھا کیسی کچی سمجھ ہے، بہشتی زیور کے اخیر میں مفید رسالوں کا نام بھی لکھ دیا ہے جن کا پڑھنا پڑھانا اور مطالعہ عورتوں کو مفید ہے اگر سب نہ پڑھیں تو ضروری مقدار پڑھ کر باقیوں کو مطالعہ میں ہمیشہ رکھیں اور تعلیم کے ساتھ ان کے عمل کی بھی نگرانی رکھیں اور اس کا بھی انتظام رکھیں کہ ان کو تدریس کا شوق ہوتا کہ عمر بھر علمی شغل رہے تو اس سے علم و عمل کی تجدید و تخریص ہوتی رہتی ہے اور اس کی ترعیب دیں کہ مطالعہ کتب مفیدہ سے کبھی غافل نہ ہوں اور ضروری نصاب کے بعد اگر طبیعت میں

قابلیت دیکھیں تو عربی کی طرف متوجہ کریں تاکہ قرآن و حدیث و فقہ اصلی زبان میں سمجھنے کے قابل ہو جائیں اور قرآن کا خالی ترجمہ جو بعض لڑکیاں پڑھتی ہیں میرے خیال میں سمجھنے میں زیادہ غلطی کرتی ہیں۔ اس لئے اکثر کے لئے مناسب نہیں۔ یہ تو سب پڑھنے کے متعلق بحث بھتی رہا لکھنا تو اگر قرآن سے طبیعت میں بے باکی معلوم نہ ہو

لکھنا بھی سکھایا جائے | تو کچھ مضائقہ نہیں۔ ضروریات خانگی کے لئے اس کی بھی حاجت ہوتی ہے اور اگر اندیشہ خرابی کا ہو تو مفاسد سے بچنا جالب مصالح غیر واجبہ سے اہم ہے۔ ایسی حالت میں لکھنا نہ سکھائیں اور نہ خود لکھنے دیں اور یہی فیصلہ ہے عقلا کے اس اختلاف کا کہ لکھنا عورت کے لئے کیسا ہے۔ (حقوق البیت ص ۲۸)

۵۸ ماں باپ کا حق پیر سے زیادہ ہے

مجھ سے ایک سوال کیا گیا کہ ماں باپ کا حق زیادہ ہے یا پیر کا۔ تو میں نے یہی جواب دیا کہ ماں باپ کا زیادہ حق ہے البتہ لأطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔ یعنی اگر پیر شریعت کے موافق حکم کرے اور ماں باپ اس کے خلاف کہیں تو اس وقت پیر کی اطاعت ہوگی والدین کی نہ ہوگی یعنی پیر ہونے کی وجہ سے۔ سو پیر کی اس لئے وقعت ہے کہ وہ شریعت کے احکام پر چلاتا ہے حق کے اعتبار سے نہیں۔ حق کے اعتبار سے والدین کا مرتبہ خدا کے بعد ہے اور پیر بھی آجکل اپنے کو مالک سمجھتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نواح میں تو موروثی پیر بھی کچھ بہت زیادہ برے نہیں۔

پیر و کا حال | پورب میں ایک پیر تھے وہ عورتوں کے پاس جا کر بٹھیر جاتے تھے خدا ایسے پروں کو غارت کرے اس کے ساتھ وہ بڑے بزرگ اور قطب اعظم مشہور تھے اور کئی لاکھ آدمی ان سے مرید ہیں۔ ہندو بھی ان سے مرید ہیں اسلام اور درویشی میں پہلے عموم و خصوص مطلق کی نسبت بھتی مگر اب اس زمانہ میں من وجہ کی نسبت ہو گئی یعنی پہلے درویشی کے لئے مسلمان ہونا ضروری تھا۔ اب کافر بھی صوفی اور درویش ہو سکتے ہیں۔ یہ ان رہزنوں کی بدولت ہے۔ ان کے نزدیک کافر بھی مرید ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ دجال پر ضرور ایمان لے آویں گے۔ اللہ کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔

کیونکہ وہ تو بڑا صاحب تصرف ہوگا۔ اور چونکہ ان کے نزدیک صوفی کا مسلمان ہونا ضروری نہیں۔ اس لئے دجال کو تو بے تکلف پیشوا بنالیں گے اور جس کا یہ عقیدہ ہے کہ جہاں شریعت نہیں وہاں کچھ نہیں اس کے نزدیک کرامات وغیرہ کی کوئی وقعت نہیں۔ وہ سب سے پہلے اتباع شریعت کو دیکھے گا۔ اور چونکہ دجال کا فر ہوگا اس لئے یہ شخص اس کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔

صاحبو! دجال قریب ہی نکلنے والا ہے اس لئے جلد اپنے عقیدہ کی درستی کر لو! اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے الہام ہوا ہے بلکہ علامات و آثار بتلاتے ہیں کہ دجال کا زمانہ خروج قریب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خود یہ خیال تھا کہ کہیں میرے ہی زمانے میں نہ نکل آوے اس لئے ممکن ہے کہ ہمارے زمانے میں نکل آوے۔ اس لئے اپنے عقائد درست کر لو۔ جس کو خلاف شریعت دیکھو اس کے ہرگز معتقد نہ بنو۔ آگے آپ کو اختیار ہے۔

آجکل کے پیر میروں کو غلام سمجھتے ہیں | غرض آجکل پیر سمجھتے ہیں کہ مرید ہماری سب سے چھڑا دیتے ہیں۔ یاد رکھو اگر پیر کہے رات کو نفلیں پڑھو۔ اور باپ کہے سو رہو تو باپ کی اطاعت مقدم ہے ہاں اگر باپ شریعت کے خلاف کوئی حکم کرے تو اس وقت باپ کی اطاعت جائز نہیں۔ شریعت کا لحاظ مقدم ہے۔ اور ماں باپ کا اتنا حق ہے کہ جرتج ایک درویش تھے بنی اسرائیل میں۔ وہ جنگل میں رہتے تھے۔ پہلی شرائع میں رہنمائی کا حکم تھا۔ ہماری شریعت میں یہ مطلوب نہیں۔ اس کے متعلق آجکل کے اعتبار سے ایک موٹی بات بتلاتا ہوں کہ تنہائی سے جو غرض ہوتی ہے جنگل میں رہنے سے آجکل وہ حاصل نہیں ہوتی کیونکہ ایسے شخص کو لوگ بہت ستاتے ہیں برخلاف اس کے اگر کوئی مسجد کے حجرہ میں رہے اسے کوئی نہیں پوچھتا دوسرے سب کو چھوڑ کر تنہا عبادت کرنا کمزوری کی بات ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے۔

زاہد نہ داشت تاب جمال پری رھاں | کنجے گرفت و ترس خدا را بہانہ ساخت
ہمت کی بات یہ ہے کہ سب میں ملے جلے رہو اور پھر اپنے کام میں لگے رہو۔ حدیث میں ہو۔ المؤمن القوی خیر من المؤمن الضعیف اور اگر جنگل میں کوئی نہ ستا دے تو بہتر ہے تو ہی مضبوط مسلمان کمزور مسلمان سے بہتر ہے

ہے کچھ مضائقہ نہیں مگر حدود شرعیہ سے تعدی کرنا حرام ہے۔ خوب کہا ہے۔
بزدل و ورع کوش و صدق و صفا | لیکن میفرماتے بر مصطفیٰ
خلاف پیمبر کسے رہ گزید۔ | کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید
میں دار سعدی کہ راہ صفا | تو اں یافت جز بر پے مصطفیٰ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کر کے حاصل کرو جو حاصل کرنا ہو۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال پر پوری نظر نہ ہو تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات دیکھو وہ آئینہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نما ہیں۔

حضرت جرتج صوفی کا واقعہ | غرض جرتج ایک عابد تھے۔ وہ ایگر تہ اپنی عبادت گاہ میں نماز نفل پڑھ رہے تھے کہ ان کی ماں نے آکر پکارا۔ یہ سخت پریشان ہوئے کہ جواب دوں یا نہ دوں۔ جواب دوں تو نماز جاتی ہے نہ دوں تو ماں کی خفگی کا اندیشہ۔ آخر انھوں نے جواب نہیں دیا۔ اس نے دو تین آویں دی اور بدو عادی کر چلی گئی کہ اللہم لا تمتحنی توبہ وجو لا المومسات کہ اے اللہ جب تک یہ کسی زانیہ کا منہ نہ دیکھ لے اس کی موت نہ آئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکایت بیان فرما کر ارشاد فرمایا۔ لو کان فقیہاً لاجاب امتاً اگر فقیہ ہوتا تو اپنی ماں کو ضرور جواب دیتا۔ اور یہ قول اس کا قرینہ ہے کہ نماز نفل بھی کیونکہ فرض کو بالاجماع توڑنے کی اجازت نہیں۔ البتہ اگر کسی پر مصیبت آوے مثلاً جلنے لگے یا گرنے لگے تو اس وقت اس کے بچانے کے لئے نماز فرض بھی توڑنا واجب ہے خواہ ماں ہو یا کوئی غیر ہو۔

صاحبو! آپ نے شریعت کی تعلیم دیکھا۔ اللہ اکبر کس قدر رحمت کا قانون ہے آپ نے اس کے حسن و جمال کو دیکھا نہیں اس لئے کچھ قدر نہیں کرتے اس کی تو یہ حالت ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہے نہ گرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

شریعت کا حسن و جمال | شریعت تو ایسی حسین و خوبصورت ہے کہ اس کی جس چیز کو دیکھو دلربا ہے جس ادا کو دیکھو دلکش ہے۔ آپ

ملاحظہ کیا کہ کس قدر ضرورت کے قوانین ہیں کہ جب کسی کو گرفتار مصیبت دیکھو تو نماز فرض بھی توڑ دو اور ایسے موقع پر ہونچو۔ اور نفل میں تو اگر بلا ضرورت بھی ماں باپ پکاریں تو نہایت توڑ دینا چاہیے بشرطیکہ ماں باپ کو اطلاع نہ ہو کہ یہ نماز پڑھ رہا ہے مگر جرتج چونکہ فقہ نہ تھے اس لئے جواب نہ دیا اور ماں کی بد دعا لگ گئی اور یہ واقعہ ہوا کہ قریب ایک آورہ عورت بھی۔ اس کو کسی کا حمل رہ گیا۔ کچھ لوگ جرتج کے دشمن تھے انہوں نے اس سے کہہ دیا کہ تو جرتج کا نام لے دینا کہ اس کا بچہ ہے۔ اس کج بخت نے ایسا ہی کیا لوگ اس کے عبادت خانے پر چڑھ آئے اور اس کو توڑنے لگے اور جرتج کو پیٹنا چاہا۔ اس نے پوچھا کہ اس حرکت کا آخر کچھ سبب بھی ہے یا نہیں۔ کہنے لگے تو ریاکار ہے۔ عبادت خانہ بنا کر زنا کرتا ہے۔ فلاں عورت سے تو نے زنا کیا ہے اس کے بچہ پیدا ہوا ہے۔

یہ عبادت خانے سے اترے۔ آخر اللہ کے مقبول بندے تھے عبادت کا اثر | رحمت خدا کو جوش ہوا اور ان کی ایک کرامت ظاہر ہوئی۔ حضرت جرتج نے اس کے لڑکے سے پوچھا کہ بتلاؤ تو کس کا ہے۔ اس نے کہا میں سناں چرواہے کا ہوں۔ یہ قصہ حدیث میں مذکور ہے۔ اس سے ماں کا کتبنا بڑا حق معلوم ہوا مگر اس پر اجماع ہے کہ اگر پیر پکارے تو نماز نفل کا توڑنا بھی جائز نہیں۔ تو پیر کا حق ماں باپ سے زیادہ نہیں۔ اور یہ اچھے پیر صاحب ہیں کہ دوسرے کے پالے پلائے پر قبضہ نہ کریں۔ کیا پیری مریدی کے یہی معنی ہیں۔ (وعظ عضل الجاہلیہ ص ۵۹)

۵۹ چھوٹے بچہ کو روزہ پر مجبور کرنا درست نہیں

ایک جگہ میں نے دیکھا کہ لڑکیوں نے ایک ذرا سی لڑکی کو روزہ رکھوا دیا اور وہ جب پاخانہ لگی تو ایک ساتھ گئی۔ غرض چاہے بچہ کی جان پر بن جائے مگر روزہ ضرور ہو۔ مگر بعض دفعہ یہ روزہ روضہ میں بھی لے جاتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک رئیس زادہ سے روزہ رکھوایا گیا گرمی کے دن تھے۔ دو پہر تک تو بیچارہ نے بنا دیا۔ مگر عصر کے وقت پیاس سے سخت پریشان ہوا۔ رئیس نے روزہ کشائی کا بہت اہتمام کیا تھا۔ تمام خاندان کی اور دوستوں کی دعوت کی تھی۔ آخر بہلایا کہ تھوڑی دیر اور صبر کرو مگر اس بے چارہ کو تاب کہاں تھی اول تو اس نے لوگوں کی

منتیں خوشامدیں کیں مگر کسی ظالم نے اس کی جان پر رحم نہ کیا۔ اور کسی نے ایک گھونٹ بھی پانی نہ دیا۔ آخر وہ خود اٹھا۔ رئیس نے اتنا سامان کیا تھا کہ مشکوں میں برت بھری گئی تھی وہ مشکے سے پیٹا کہ کچھ تو پانی سے قرب ہو۔ اور پلٹے ہی جان نکل گئی۔ اس کا وبال بے رحم ماں باپ پر ہوا۔

صاحبو! شریعت کا تو یہ حکم ہے کہ اگر جوان کی بھی جان نکلنے لگے تو روزہ توڑ دینا واجب ہے۔ مگر اہل سوم کے نزدیک معصوم بچہ کو بھی اجازت نہیں۔ انسوس! خدا کو ایسے روزہ کی ضرورت نہیں خدا تو تم سے زیادہ تم پر رحمت کرنے والا ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تم سے زیادہ شفقت ہے۔ اَللّٰہُمَّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ توجب مکلف کو یہ حکم ہے کہ ایسے وقت روزہ دے تو چار پانچ برس کا بچہ کس شمار میں ہے اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ شریعت میں اتنی شفقت و سہولت ہے کہ تم بھی اپنے ساتھ اتنی نہیں کر سکتے۔

(عضل الجاہلیہ ص ۵)

۶۰ فرشتہ کو پیغمبر بنا کر کیوں نہ بھیجا گیا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشریت کا اعلیٰ ارفع نمونہ ہیں

(۱) لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوة حسنة (الایۃ)

جس کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ کی ذات مبارک میں ایک اچھا نمونہ دیا ہے۔ نمونہ دینے سے کیا غرض ہوتی ہے۔ یہی کہ اس کے موافق دوسری چیز تیار ہو۔ میں نے ایک بزرگ محقق کا اس کے متعلق ایک لطیف مضمون سنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اور ہماری مثال ایسی ہے جیسے کسی نے درزی کو ایک اچکن سینے کو دی اور نمونہ کے لئے ایک سلی ہوئی اچکن بھی دی کہ اس ناپ اور نمونہ کی اچکن سی لاؤ۔ درزی نے ساری اچکن نمونہ کے موافق تیار کی۔ غرض طول بھی برابر لاتی یکساں۔ غرض کہیں تصور نہیں کیا۔ فرق کیا تو صرف یہ کیا کہ ایک آستین ایک بالشت چھوٹی بنا دی۔ جب وہ اچکن لیکر مالک کے پاس پہنچے گا۔ تو مالک اسے کیا کہے گا۔ وہ اچکن خوش ہو کر لے لے گا یا اس کے سر سے مارے گا

اگر درزی جواب میں یہ کہے کہ جناب ساری اچکن تو ٹھیک ہے صرف ایک آستین میں ذرا سی کمی ہے تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ مالک اس کو پسند کر لے گا۔ ہرگز نہیں۔ اس سارے کپڑے کی قیمت رکھوا لے گا۔

احکام میں نبی کریم کے عمل کی موافقت ضروری ہے | خوب یاد رکھو کہ احکام نازل کئے جو بالکل مکمل قانون ہیں اور ان کا عملی نمونہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنایا۔ سو اگر آپ کے اعمال نمونہ کے موافق ہیں تو صحیح ہیں ورنہ غلط ہیں۔ اگر نماز آپ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے موافق ہے تو نماز ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ اگر ذکر آپ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے موافق ہے تو ذکر ہے ورنہ الٹی معصیت ہے۔ دیکھئے نماز میں بجائے دو کے ایک سجدہ کر لے تو وہ نماز نہ رہی دوبارہ پڑھنا ضروری ہے۔ کوئی قرآن شریف بجا لیت جنابیت پڑھے تو بجائے ثواب کے الٹا گناہ ہوتا ہے۔ اسی قبیل سے یہ بھی ہے کہ اسمائے الہی تو قیسی ہیں اپنی طرف سے کوئی نام رکھنا جائز نہیں۔ اگر آپ روزہ رکھیں تو وہی روزہ صحیح ہوگا۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہو۔ علی ہذا ج وہی صحیح ہوگا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے موافق ہو اگر حج میں کوئی احرام نہ باندھے تو وہ حج نہیں اسی طرح زکوٰۃ وہی صحیح ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے موافق ہو اور کوئی سارا مال خلاف تعلیم خرچ کر دے تو زکوٰۃ سے فارغ نہیں ہو سکتا۔ یہ ارکان اسلام ظاہری ہوئے۔ اسی طرح اعمال باطنی کو سمجھ لیجئے اور معاملات اور طرز معاشرت سب میں یہی حکم ہے۔

فرشتے رسول بنا کر کیوں بھیجے گئے | حق تعالیٰ نے ہمارے پاس کبھی فرشتے کو رسول بنا کر نہیں بھیجا۔ اس میں حکمت یہی ہے کہ اگر فرشتہ آتا تو وہ ہمارے لئے نمونہ نہیں بن سکتا تھا۔ اس کو نہ کھانے کی ضرورت ہوتی نہ پہننے کی نہ ازدواج کی نہ معاشرت کی۔ ان چیزوں کے احکام میں صرف یہ کرتا کہ ہم کو پڑھ کر سنا دیتا یہ کام صرف کتاب کے بھیج دینے سے کبھی نکل سکتا تھا۔ کہ ایک کتاب ہمارے اوپر آتی۔ اس میں سب احکام لکھے ہوتے اس کو ہم آپ پڑھ لیتے اور عمل کر لیتے۔ فرشتے کے اترنے سے اس سے زیادہ کوئی بات نہ پیدا ہوتی جو کتاب سے ہو سکتی تھی۔ حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ ہماری جنس میں سے پیغمبر

بنائے کہ وہ ہماری طرح کھاتے پیتے بھی ہیں۔ ازدواج اور تعلقات بھی رکھتے ہیں تمدن اور معاشرے کے بھی خوگر ہیں اور ان کے ساتھ کتابیں بھی ہیں تاکہ کتاب میں احکام ہوں۔ اور وہ خود بنفس نفیس ان کی تعمیل کر کے دکھلا دیں تاکہ ہم کو سہولت ہو۔ اسی واسطے فرمایا ہے۔ ق مَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا أَنَّهُمْ لِيَاكُلُوا مِنَ الطَّعَامِ وَيَمْشُوا فِي الْأَسْوَاقِ یعنی ہم نے جس قدر رسل سے پہلے پیغمبر بھیجے وہ اور آدمیوں کی طرح کھاتے پیتے والے اور معاشرت رکھنے والے بھیجے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَجَعَلْنَاهُ رَجُلًا۔ یعنی اگر ہم فرشتے کو احکام لیکر بھیجتے۔ تب بھی یہ ہوتا کہ وہ انسان کی صورت میں آتا۔ ورنہ انسان کو اس سے ہدایت نہ ہو سکتی کیونکہ وہ نمونہ نہ بن سکتا۔

سید المرسلین کا انتخاب | حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے کالات فرشتوں سے بھی زیادہ ہیں لیکن حکمت الہی اس کی مقتضی ہوئی کہ آپ نسل انسانی سے پیدا ہوں تاکہ تمام افعال انسانی میں نمونہ بن سکیں۔ دیکھ لیجئے کہ صبیباں انسان کو پیش آتی ہیں سب آپ کو پیش آئیں۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیبیان رکھیں، اپنی اولاد کا نکاح کیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں غنی کی تقریبیں بھی ہوتیں کئی صاحبزادوں نے انتقال کیا جو حالات ہم کو پیش آتے ہیں وہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں نکلے تاکہ ہمارے لئے پورا ایک دستور العمل بن جائے۔ اب آپ دیکھ لیجئے کہ کون سا فعل ہمارا نمونہ کے موافق ہے۔ کوئی تقریب خوشی کی ہوتی ہے تو ہم نہیں دیکھتے اور کوئی تقریب غمی کی ہوتی ہے تب ہم نہیں دیکھتے کہ دستور العمل میں کیسا ہے اس درزی کی مثال کو یاد رکھئے کہ ایک بالشت کپڑا کم کر دینے سے اچکن منہ پر ماری جاتی ہے اور اگر وہ بجائے سینے کے کپڑے کی دھجیاں کر کے مالک کے سامنے جا رکھے تو وہ کس سزا کا مستوجب ہے جبکہ مالک قادر بھی ہو۔ واللہ باللہ ہمارے اعمال کی حالت یہی ہو گئی ہے کہ جو طریقہ ان کا بتلایا گیا تھا وہ تو کوسوں دوران اعمال کو تباہ کر کے اور دھجیاں اڑا کے ہم حق تعالیٰ کے سامنے رکھ دیتے ہیں یہ کچھ مبالغہ آمیز الفاظ نہیں ہیں دیکھ لیجئے کہ جیسے اچکن سینے کے واسطے کپڑے کا اپنی اصل پر رہنا شرط ہے اور دھجیاں کرنے والا اس کو اس اصل سے نکال دیتا ہے کہ جس سے اچکن تو کیسی کپڑے کی کوئی غرض بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح تمام اعمال کے صحیح ہونے کے واسطے ایمان کا ہونا شرط ہے کوئی چاہے کہ ایمان کھو کر کوئی عمل کرے تو وہ ایسے ہی بیکار ہوگا۔ جیسے

کوئی کپڑے کی دھجیاں کر کے اچکن سینا چاہے (وعظ مناظرۃ الہوی ص ۶۳)

(ب) یہ بڑی غلطی ہے کہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اوپر قیاس کر لیتے ہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان

اور آپ کے حالات کو اپنے حالات پر، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے۔ بشر لا کا البشر ولكن کالیاقوت بن الحجر آپ بشر تو ہیں مگر اور انسانوں کے مانند نہیں ہیں بلکہ آپ انسانوں میں ایسے ہیں جیسے پتھروں میں یاقوت ہو اگر تاہے کہ جنس کے اعتبار سے تو وہ بھی پتھر ہی ہے مگر زمین و آسمان کا فرق ہے یاقوت میں اور دوسرے پتھروں میں۔ اب اگر کوئی محض اشتراک جنس کی وجہ سے یاقوت کو اور پتھروں پر قیاس کرنے لگے تو اس سے یوں ہی کہا جائے گا کہ عقل پر پڑیں پتھر۔ لہذا محض انسان سمجھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اوپر قیاس نہ کیا کرو۔ کیا انسان سارے یکساں ہی ہو کرتے ہیں دیکھو ایک آدمی تو حبشی کا لکھنؤ کا ہے آدمی تو وہ بھی ہے اور ایک حسین یوسف ثانی ہے وہ بھی آدمی ہی ہے مگر کیا دونوں برابر ہیں اور کیا ایک کو دوسرے پر قیاس کیا جاسکتا ہے ہرگز نہیں ان دونوں میں اتنا فرق ہے کہ اگر کسی نے آدمیوں میں صرف اس یوسف ثانی کو دیکھا ہو اس کے بعد پھر حبشی کو دیکھے تو وہ ہرگز یقین نہ کرے گا کہ یہ بھی آدمی ہے بلکہ اس کو جن یادوں سمجھے گا کیونکہ اس کے نزدیک تو آدمی اسے کہتے ہیں جو اس حسین کے مشابہ ہو۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے انسان ہیں کہ آپ کو دیکھنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم تم بھی آدمی ہیں وہ تو نہ معلوم ہم کو کیا سمجھے گا کہ یہ گدھے ہیں یا بیل ہیں اب یہاں تین فرقے ہو گئے بعض تو وہ ہوئے جنہوں نے حضور کو بشر ہی نہ سمجھا۔ وہ تو خواص الوہیت کو حضور کے لئے ثابت کرنے لگے اور بعض وہ ہیں جنہوں نے آپ کو بالکل ہی پنا جیسا بشر سمجھا یہ دونوں غلطی پر ہیں اور ایک فرقہ متوسط ہے جو حضور کو بشر تو سمجھتا ہے۔ مگر سب سے اعلیٰ و ارفع سمجھتا ہے۔ اور وہی بات کہتا ہے۔ بشر لا کا البشر بل کالیاقوت بین الحجر۔ واقعی سچی بات ہے۔

گفت اینک ما بشر ایشاں بشر ما و ایشاں بستمہ خواہیم و خور

این ندانند ایشاں از عے در میاں فرقے بود بے منتہا۔

(وعظ ایوار الیتامی ص ۲۵)

نہ بشر ہیں مگر عام بشر کی طرح نہیں بلکہ جیسے پتھروں میں یاقوت ہوتا ہے۔

۱۱ بعض تجدیدیم یافتو کا حال ان سے
مسلمان لڑکی کا نکاح نہیں ہو سکتا۔

افسوس ہے کہ آج کل جن لڑکوں کو بیٹیاں دی جاتی ہیں بعض ان میں سے جدید تعلیم

کے اثر سے ایسے آزاد منش ہوتے ہیں کہ ان کو دین ایمان سے بھی کچھ علاقہ نہیں رہا۔ زبان سے کلمات کفر بک جاتے ہیں اور کچھ پرواہ نہیں ہوتی۔ پھر انہیں میں سے ایک سے مسلمان لڑکی کا نکاح پڑھوایا جاتا ہے اور سب گھروالے خوش ہوتے ہیں کہ ایک سنون طریقہ ادا کیا جاتا ہے اس سنت کی صحبت کے لئے موقوف علیہ ایمان۔ افسوس ہے کہ نوشہ صاحب نہ جانے کتنی دفعہ اس سے خارج ہو چکے ہیں اب وہ مثال صادق آتی ہے یا نہیں کہ کپڑے کے پڑے پڑے کر کے بلکہ جلا کے اچکن سینے کا ارادہ کیا جاتا ہے ہم کو تو اسی کا ردنا تھا کہ اچکن نمونہ کے موافق نہیں سی جاتی۔ ایک آستین بالشت بھر کم کی جاتی ہے یہاں نہ آستین رہی نہ دامن اور خیال یہ ہے کہ اچکن تیار ہے۔ ایک نیک بخت لڑکی ایک انگریزی خواں سے بیاہی گئی جو ایک مجمع میں یہ لفظ کہہ رہے تھے کہ محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) واقعی بہت بڑے ریفارمر تھے اور مجھ کو آپ سے بہت تعلق ہے لیکن رسالت میں ایک مذہبی خیال ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ یہ کلمہ کفر ہے نکاح اس سے ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ مسئلہ اگر لڑکی والوں کو بتلایا جاتا ہے تو اٹھ لڑنے کو سیدھے ہوتے ہیں کہ ہمارے خاندان کی ناک کٹواتے ہیں۔ اب وہ زمانہ ہے کہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ دیکھ لیا جاوے کہ داماد مسلمان ہے یا کافر بجائے اس کے پہلے دیکھا جاتا تھا نیکو کار ہے یا بدکار۔ اس قصہ سے میرے قول کی تصدیق ہوگئی کہ ہمارے اعمال خراب ہی نہیں بلکہ باطل ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ ہم ان کو اچھے سمجھ کر اجر کے امیدوار بیٹھے ہیں۔

وسوف تری اذا انکشف الغیار : افرس تحت رجلك ام حمار

(عبار چھٹ جانے کے بعد ظاہر ہوگا کہ تم گھوڑے پر ہو یا گدھے پر۔)

(وعظ مناظرۃ الہوی ص ۶۵)

۶۲ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا ہونے کی ہمت کیا؟

فرمایا کہ لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوتے تو اچھا ہوتا میں کہتا ہوں کہ ایک اعتبار سے ہم لوگوں کا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ ہونا ہی اچھا ہوا کیونکہ ہم لوگوں کی حالت ٹھیک نہیں ہے خدا کی راہ میں مال دینا مشکل معلوم ہوتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شب و روز امتحان درپیش تھا کبھی زکوٰۃ کا حکم ہوتا تھا کبھی جہاد میں جان دینے کا، عزیز و اقارب کو چھوڑنا پڑتا تھا۔ سوہاری ایسی طبیعت والے اگر احکام نبوی کے بجالانے میں کوتاہی کرتے۔ تعجب نہ تھا کہ انکار نبوت تک نوبت آجاتی۔ جس کا انجام کفر و خسارن دارین تھا۔ دوسرے خدا جانے معاصرت کہیں اپنا رنگ نہ لاتی اور اب توجہ کی کرائی شریعت ہم کو مل گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و کمالات ہم نے سُن لئے حضور کی عظمت بھی قلب میں بلامرأحم موجود ہے اگر خدا نکر وہ خلاف بھی کریں گے تو کسی خطاب جزئی کا تو خلاف نہیں ہے۔ ان لوگوں نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائے عمر سے ہر حالت میں دیکھا۔ آپ ان کے معبودوں کو برا کہتے تھے آپ کی قرابت تھی لوگوں سے تعلقات تھے بہت سے امور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایسے پیش آتے تھے جو لوگوں کے خلاف جمع ہوتے تھے لیکن پھر بھی وہ لوگ اطاعت کرتے تھے کمال ان کا تھا نہ کہ ہم لوگوں کا (مقالات حکمت، دعوات عبدیت حصہ ہفتم)

۶۳ لوگوں نے غفور رحیم کے معنی غلط سمجھے!

خدا غفور رحیم ہے۔ توبہ استغفار کر لیں گے گناہ معاف ہو جائیں گے مگر دنیا کا نفع یعنی مکان بنانا بغیر رشوت کے نہیں ہو سکتا اگر رشوت نہ لی تو منافع حاصل نہ ہوں گے۔ اور اس نقصان کی بظاہر کوئی تلافی نہیں معلوم ہوتی۔ پس جس نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے اس کو گوارا کر کے رشوت لینا چاہیے۔ پھر خدا سے معافی کرائیں گے۔ تو صاحبو! آپ نے

دیکھ لیا کہ نفس بدخواہی کو کس رنگ آمیزی کے ساتھ خیر خواہی کی صورت میں لاتا ہے۔ مگر شیطان کے اس سبق کی وہی مثال ہے جیسا کہ مشہور ہے کہ ایک شخص نے اپنے طوطے کو لفظ دریں چہ شک سکھلا دیا تھا وہ ہر بات کے جواب میں یہی لفظ کہہ دیا کرتا تھا مگر یہ لفظ ایسا ہے کہ اکثر باتوں کا جواب بن بھی جاتا ہے چنانچہ اس شخص نے طوطہ کو یہ لفظ یاد کر دیا اور برسر بازار لاکر دعویٰ کیا کہ میری طوطی فارسی بولتی ہے ایک شخص نے اس کا امتحان لیا کئی باتیں اس سے کیں سب کے جواب میں اس نے دریں چہ شک ہی کہا۔ مگر ان باتوں پر یہ جواب چپاں تھا۔ اس نے خوش ہو کر اس کو خرید لیا۔ اور گھر پر لایا اب اس سے ادھر ادھر کی باتیں کیں اس نے سب کے جواب میں دریں چہ شک ہی کہا چاہے جوڑ لگے یا نہ لگے آخر اس نے جھلا کر کہا کہ انوس میں نے تیرے خریدنے میں بڑی بیوقوفی کی اس نے اس کے جواب میں بھی کہا۔ دریں چہ شک، کہ اس میں کیا شک ہے۔ ایسے ہی ہمارے نفس کو بھی ایک سبق یاد ہے۔ ہر جگہ اس کا استعمال کرتا ہے وہ یہ کہ اللہ بڑا غفور رحیم ہے خواہ وہ کیسا ہی گناہ ہو حق اللہ ہو یا حق العبد۔

دوسرے یہ حق نہیں جانتا کہ غفور رحیم ہونے سے یہ کیسے لازم غفور رحیم کا حاصل آتا ہے کہ گناہ کا ضرر نہ ہو گا۔ اگر غفور رحیم ہونے کے لئے یہ ضروری ہے تو جیسے خدا تعالیٰ آخرت میں غفور رحیم ہیں دنیا میں بھی تو ہیں کیونکہ صفات باری سب قدیم ہیں۔ پھر سنکھیا کھانے سے ضرر کیوں ہوتا ہے اگر غفور رحیم ہونے کے معنی ہیں کہ جو کچھ چاہو کہ کچھ ضرر نہ ہو گا تو سنکھیا کھانے سے بھی کوئی نقصان نہ ہونا چاہیے۔ مگر ضرر یقینی ہوتا ہے اور باوجود ضرر ہونے کے خدا کے غفور رحیم ہونے میں فرق نہیں آتا تو ایسے ہی آخرت میں بھی غفور رحیم ہوں گے اور گناہ کا بھی ضرر نہ ہو گا کیونکہ غفور رحیم ہونے کے لئے ضرر نہ ہونا لازم نہیں خداوند تعالیٰ رحیم اس طرح ہیں کہ تم کو بتلا دیا کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى وَلَا تَقْرَبُوا الزَّيْنَةَ إِنَّهَا كَانَتْ فَاحِشَةً۔ یہ کتنے بڑے رحم کی بات ہے کہ خود بخود ایک قانون مفید تجویز فرما کر سب کو بتلا دیا کہ طریق فلاح و رضا الہی یہ ہے ورنہ کام تو خود ہمارے ذمہ تھا کہ رضائے مولا کا طریقہ معلوم کرتے۔ دوسرے حق تعالیٰ نے حق جہاں اپنی رضا حاصل کرنے کے طریقہ بیان فرمائے ہیں وہاں ایسے امور کی بھی تعلیم دی ہے جن سے امن عام قائم رہے اس کے سوا اور بھی رحیم ہونے کے معنی ہیں جو میں آئندہ بتلاؤں گا۔ اور غفور ہونے کے یہ

بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ بعد سزا کے بخش دیں۔ اگر کہتے کہ کیسی مغفرت ہے کہ سزا بھی ہو اور بخشش بھی ان دونوں میں تو منافات ہے۔ تو صاحبو! آپ نے نہ خدا کی عظمت سمجھی نہ گناہ کی حقیقت معلوم کی تو سمجھو کہ گناہ کہتے ہیں حاکم کی سرکشی کو۔ اور جس قدر حاکم بڑا ہوتا ہے اسی قدر اس کی سرکشی بھی جرم عظیم ہوتی ہے۔ مثلاً ایک سرکشی تو یہ ہے کہ حاکم ضلع کا کہنا نہ ماننا۔ مگر اس سے بڑھ کر وائسرائے کا کہنا نہ ماننا اور بادشاہ کا کہنا نہ ماننا اس سے بہت بڑا جرم ہے۔ ایسے ہی بڑے بھائی کا کہنا نہ ماننا ایک جرم ہے مگر باپ کا کہنا نہ ماننا اس سے بہت بڑا جرم ہے غرض سرکشی کی شدت کا مدار اس شخص کی عظمت پر ہوتا ہے جس کی سرکشی کی گئی۔ ایک مقدمہ تو یہ سمجھ لیجئے۔ دو ستر مقدمہ سب پہلے سے مسلم ہے کہ خدا سے بڑا کوئی حاکم نہیں کیونکہ اور سب کی تو عظمت محدود ہے اور عظمت الہی غیر محدود، خارج از۔۔۔ وہم و قیاس ہے۔ تیسرا مقدمہ یہ بھی سب کے نزدیک بدیہی اور مسلم ہے کہ سزا بقدر گناہ ہوا کرتی ہے۔

بس اب سمجھئے کہ جب خدا سے بڑھ کر کوئی نہیں تو اس کی مخالفت سے بڑھ کر کوئی مخالفت نہیں اور اسی کی مخالفت

کی سزا سے بڑھ کر کسی کی مخالفت کی سزا نہیں ہو سکتی۔ تو جیسا عظمت غیر اللہ محدود ہے اس کی مخالفت کی سزا بھی غیر محدود ہوتی ہے اور چونکہ عظمت الہی نامحدود ہے اس لئے اس کی مخالفت کی سزا بھی غیر محدود ہونی چاہیے پس اس عقلی قاعدہ کا مقتضا تو یہ ہے کہ اگر کسی سے کوئی صغیرہ گناہ بھی ہو جائے تو چونکہ خدا کی نافرمانی ہے اس لئے اس کی سزا بھی ابد الابد جہنم ہونی چاہیے اور اس کے لئے کبھی مغفرت نہ ہونی چاہیے مگر خدا تعالیٰ نے ابد الابد جہنم سوائے مشرکین و کافرین کے کسی کے واسطے مقرر نہیں فرمائی۔ پس اگر حق تعالیٰ کسی گناہ میں دس ہزار لاکھ برس کے بعد بھی چھوڑ دیں تو یہ ان کی مغفرت اور بخشش ہے یا نہیں یقینی ہے اور ضرور ہے اور دنیا کے قصوں میں ہم اس کو رات دن جانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دس سال کی جیل کا مستحق ہو اور حاکم اس کو دو برس کے بعد چھوڑ دے یہ اس کا انعام سمجھا جاتا ہے یا نہیں۔ پس نامحدود عذاب کے بجائے اگر حق تعالیٰ محدود عذاب دے کر دس ہزار یا دس لاکھ برس کے بعد بھی نجات عطا فرمادیں تو یہ بھی یقیناً مغفرت ہوگی۔ اب آپ کی سمجھ میں آگیا کہ عفو ہونے کے لئے سزا نہ دینا ضروری نہیں بلکہ عفو ہونے کے یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ایک محدود زمانہ تک سزا دے کر رہا کر دیا جائے اور عفو ہونی

ایک یہ بھی صورت ہو سکتی ہے کہ گناہ کرتے ہی فوراً سزا نہ دی جائے جس کا ظہور نیا میں ہوتا ہے اور اس کی رحمت بھی کہہ سکتے ہیں اور رحیم کے دو معنی سنئے۔ وہ یہ کہ عرفائے ربان سب کو معلوم ہے کہ جس کی خطا معاف کرتے ہیں اس کے لئے یہی بڑی بات ہوتی ہے کہ جیل سے رہا کر دیا جائے اس کے لئے انعام کا کوئی قاعدہ نہیں نہ کوئی مستحق انعام و اکرام سمجھے تو حق تعالیٰ کو بھی یہ حق حاصل تھا کہ جہنم سے نکال کر چھوڑ دیتے جس حال میں چاہے رہے خواہ مرے یا جسے خواہ راحت میں رہے یا تکلیف میں۔ مگر وہ رحیم بھی ہیں ان کی رحمت کا مقتضا یہ ہے کہ وہ جہنم سے نکال کر وہ جگہ دیتے ہیں جو جنت کے نام سے مشہور ہے جس میں وہ چیزیں ہیں کہ جن کو نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کان نے سنا نہ کسی دل پر ان کا خطرہ گذرا۔ فیہا ما لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔

پھر یہ خطا معاف کر کے اس کو اپنا مقرب خطا معاف کر کے مقرب بنانا | بناتے ہیں کسی سے ہفتہ وار ملاقات ہوا کرے گی کسی سے ماہوار کسی سے سالانہ۔ اور سب سے مقرب وہ شخص ہوگا جس سے دن میں دو مرتبہ صبح و شام ملاقات ہوا کرے گی۔ پھر یہ نہیں کہ آنے والوں کو حکم ہو کہ خود سلام کریں بلکہ حدیث میں ہے کہ سب لوگوں کو ایک باغ میں جمع کیا جائے گا اور حق تعالیٰ ان پر متجلی ہوں گے اور پہلے خود فرمائیں گے السلام علیکم پس اس کی نظیر کوئی پیش کر سکتا ہے کہ خطا دار اور گنہ گار کے ساتھ اس قدر انعام کیا جاتا ہے تو آپ نے دیکھا کہ حق تعالیٰ کیسے کیسے انعامات فرمائیں گے کہ خود اپنے بندوں کو سلام فرمائیں گے پھر نہیں کہ ان کو بلا دیں گے بلکہ خود ان کے پاس تشریف لے جا کر متجلی ہوں گے اس کے وقت وہ حال ہوگا کہ سب زبان حال سے کہتے ہوں گے۔

”امروز شاہ شاہاں مہاں شدت مارا“

تو دیکھئے خدا کی رحمت کے معنی سمجھیں آگئے اب اس تفسیر کے بعد معلوم ہوا ہوگا کہ رحمت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ گناہ کی سزا ہی نہ ہو تو یہ نفس کا بڑا دھوکہ ہے کہ حق تعالیٰ کے عفو رحیم ہونے سے یہ سمجھتا ہے کہ گناہ کی سزا ہی نہ ہوگی اسی کو کہتے ہیں۔ کلمۃ حق اريد بها الباطل۔ اسی لئے میں کہتا تھا کہ نفس خیر خواہی کے پردے میں بدخواہی کرتا ہے۔ (و عظم وحدۃ الحب صہ پانچواں وعظم دعوات عبدیت حصہ ہشتم)

۶۴ جاہل واعظوں کے وعظ کی خرابیاں

غیر عالم کبھی وعظ نہ کہے۔ اس میں چند مفاہد ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں حدیث کی مخالفت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امر ہے کہ ہر کام اس کے اہل کے سپرد کرنا چاہیے اور آپ فرماتے ہیں: "اذا وصل الامر الى غير اهله فانتظر الساعة"۔ یہ کہ جب تمام نااہلوں کے سپرد کئے جانے لگیں تو قیامت کے منتظر رہو۔ گویا نااہل کو کوئی کام سپرد کرنا اتنی سخت بات ہے کہ اس کا ظہور قیامت کے علامت سے ہے اور یہ امر مصرح و ثابت ہے کہ جو فعل اختیاری علامات قیامت سے ہوں وہ معصیت اور مذموم ہیں اور ظاہر ہے کہ غیر عالم وعظ گوئی کا اہل نہیں۔ یہ منصب صرف علماء کاملین کا ہے اس لئے غیر عالم کو اس کی اجازت ہرگز نہ دی جائے۔ دوسری خرابی اس میں یہ ہے کہ بعض دفعہ جاہل کو کسی مسئلہ میں بوجہ ناواقفیت کے ایسی غلطی پیش آتی ہے کہ اسے خبر بھی نہیں ہوتی۔ گو بعضے بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ وہ اپنی علمی حیثیت ہی کے موافق احتیاط کر سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں کر سکتے اور جب پورا علم نہیں تو غلطی کا احتمال رہے گا۔

جاہل واعظ کی خرابیاں

علاوہ ازیں جب یہ شخص وعظ کہے گا تو لوگ عالم سمجھ کر اس سے ہر قسم کے مسائل بھی پوچھیں گے پھر آج کل ایسے نفس کہاں ہیں جو صاف کہیں کہ ہم جاہل ہیں ہم کو مسائل معلوم نہیں۔ ضرور کچھ گھڑمٹھ کر جواب دیں گے اور اکثر وہ غلط ہوگا اور اگر گول مول جواب دیا اور اس طرح غلط جواب سے اپنے کو بچالیا تو ممکن ہے کہ عوام اس سے کسی غلطی میں پڑجائیں۔ بعض جاہل ایسے ہوشیار ہوتے ہیں کہ جو مسئلہ ان کو معلوم نہیں ہوتا۔ اس کا ایسا جواب دیتے ہیں جس سے نہ جواب معلوم ہو اور نہ جہل ظاہر ہو دے۔

گنگوہ میں ایک جاہل فتویٰ دیا کرتا تھا۔ مولانا گنگوہی نے اپنی نو عمری میں اس سے امتحاناً سوال کیا کہ حالت حمل میں بے شوہر عورت سے نکاح کرنا کیسا ہے۔ کہا ایسا ہے جیسے گھیر دینا۔ اس گول مول جواب سے نہ اس کا جہل ظاہر ہوا نہ جواز کا فتویٰ ہوا۔ مگر ایسے جوابات سے عوام کیا سمجھیں گے یقیناً غلطی میں پڑیں گے شاید کوئی جاہل واعظ یہ کہے کہ ہم کتابیں دیکھ کر فتویٰ دیا کریں گے اور آج کل اردو میں بھی مسائل کا ذخیرہ موجود ہے تو

تو میں کہتا ہوں کہ بعض مسائل کا تعلق دو باب سے ہوتا ہے ایک باب میں تو اس میں اطلاق ہوتا ہے اور دوسرے باب میں اس کا مقید ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ قیود و شرائط بعض دفعہ ایسی ہوتی ہیں جن پر جاہل تو جاہل ناقص عالم کی نظر بھی نہیں پہنچتی۔ بعض دفعہ نا تمام علم سے لوگوں کو تنگی میں ڈالے گا۔ (چنانچہ بعض غیر محقق مولوی وعظ میں کہا کرتے ہیں کہ روزی پہونچانے کا خدا کا وعدہ ہے اور مسلمانوں کو بھروسہ نہیں، گھبراتے ہیں۔ یہ ان کا عام مضمون ہے اور اس پر وہ ضعیف ایمان کا حکم لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کوئی مخلوق دعوت کر دے تو اس پر بکا اعتبار ہوتا ہے اور اس وقت کے رزق سے بے فکری ہو جاتی ہے اور حق تعالیٰ کے وعدہ پر بھروسہ نہیں۔ سو یہ غیر محقق خوب سمجھ لیں کہ یہ ضعیف ایمان نہیں بلکہ ضعیف طبیعت ہے

ضعف ایمان ضعیف طبیعت

ضعف ایمان اور بے اور ضعف طبیعت اور۔ اور کوئی مسلمان ایسا نہیں جس کو خدا کے وعدہ پر بھروسہ نہ ہو۔ اور تنویر کے لئے جو مثال بیان کی جاتی ہے وہ محض غلط ہے اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ کا قیاس مخلوق کے وعدہ پر صحیح نہیں۔ کیونکہ جو شخص وعدہ کرتا ہے وہ یہ بتلا دیتا ہے کہ فلاں وقت کی دعوت ہے جس سے پورے طور پر یہ حال معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے کھانے کا اس وقت پورا بند و بست ہو گیا۔ اگر ایسا ہی تفصیلی وعدہ اللہ تعالیٰ کا ہوتا تو مسلمانوں کو مخلوق سے زیادہ اس پر اعتماد ہوتا مگر خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ نہیں ہے کہ دونوں وقت دیں گے۔ یا دیکھ دیں گے ناغہ نہ کر س گے۔ بلکہ مبہم وعدہ ہے کہ روزی دیں گے۔ اس کی کیفیت اور کمیت نہیں بتلائی گئی۔ ممکن ہے کہ تیسرے روز ملے غرض ابہام ہے اور اس شخص کا وعدہ ہے کہ شام کا وقت بتلا دیا ہے تو ضعف ایمان کی وجہ سے یہ تردد نہیں بلکہ اس کی کیفیت اور مقدار معلوم نہ ہونے کی وجہ سے تردد ہے جس کا باعث طبعی ضعف ہے اگر داعی کا بھی ایسا ہی وعدہ ہو تو اس سے زیادہ تردد ہو جائے تو یہ کیا ظلم ہے۔ الزام لگانے والوں نے الزام لگایا ضعف ایمان کا۔

(وعظ شعبان ۱۴۵۸، دعوات عبدیت حصہ ششم)

سونا چاندی خریدنے کا مسئلہ

مثلاً شریعت کا حکم ہے کہ اتحاد جنسین کے ساتھ تفاضل ناجائز ہے۔ مثلاً

چاندی کے بدلے چاندی۔ یا سونے کے بدلے سونا خریداجائے تو مساوات ضروری ہے۔
تفاضل کی بیشی حرام ہے۔ اب جاہل تو اس مسئلہ کو دیکھ کر اسی طرح بیان کر دے گا۔ اور ممکن
ہے کہ ایک وقت چاندی کا بھاؤ روپے کے برابر نہ ہو بلکہ چاندی دس آنہ تو لہ ہو جو ایک روپے
کے مقابلہ میں روپے کے وزن سے زیادہ آئے گی اور ان حضرات کو صرف اتنا ہی مسئلہ
معلوم ہو کہ اتنا جنس کے وقت تفاضل حرام ہے۔ تو یہ حضرات یا تو خود روپے کے برابر ہی
لائیں گے پھر گھر والے ان کو بے وقوف بنائیں گے یا دوسروں کو اس پر مجبور کریں گے۔ اور
دونوں صورت میں شریعت کو بدنام کریں گے کہ یہ اچھا مسئلہ ہے کہ ایک چیز روپے
میں روپے سے زیادہ آسکتی ہے مگر شریعت کہتی ہے کہ نہیں برابر ہی تو لو۔ زائد مدت
تو لو۔ تو یہ خرابی جہل کی وجہ سے ہوئی۔ محقق اگر اس مسئلہ کو بیان کرے گا تو ساتھ ساتھ یہ
بھی کہہ دے گا کہ اگر چاندی ایک روپے کے بدلہ میں اس سے زیادہ آتی ہو تو اس وقت
روپے سے چاندی نہ خریدو بلکہ روپے کو بھنا کر کچھ دونیاں چونیاں اور ان کے ساتھ کچھ
پیسے ملا کر خریدو اب جائز ہے کہ ایک روپے کے بدلے میں تو لہ بھر سے زیادہ چاندی لے
آؤ کیونکہ ریزگاری میں جتنی مقدار چاندی ہوگی اس کے مقابلہ میں تو اس کے برابر چاندی آئیگی
باقی چاندی پیسوں کے مقابلے میں ہو جائے گی۔ اور پیسہ اور چاندی ہیں۔ جنس بدل گئی۔
اس میں کمی بیشی جائز ہے۔ یہ تو مثال تھی تنگی میں ڈالنے نہ ڈالنے کی۔

طلاق کا مسئلہ اب مسئلہ اطلاق و تقید کی مثال سنئے۔ مثلاً باب الکنايات میں
فقہانے لفظ اختیاری کو کنايات طلاق میں بیان کیا ہے۔ اور
اس کا حکم یہ بیان کیا ہے کہ اس سے وقوع طلاق نیت کے بعد ہوتا ہے تو اس سے ظاہر یہ
معلوم ہوتا ہے کہ اختیاری میں بھی صرف نیت سے وقوع طلاق کا ہو جاوے گا۔ لیکن اس
اختیاری سے وقوع طلاق کی ایک شرط اور بھی ہے جو باب التفویض میں مذکور ہے وہ یہ کہ
اختیاری میں نیت کے ساتھ وقوع نہیں ہوتا بلکہ عورت جب اسی مجلس میں طلاق کو اختیار
کرے اس وقت وقوع ہوتا ہے اور اختیار منکوحہ کی شرط فقہانے باب الکنايات میں
نہیں بیان کی بلکہ یہ شرط باب التفویض میں لکھی ہے پس اگر کوئی لفظ اختیاری کو صرف
باب الکنايات میں دیکھ کر حکم بیان کر دے گا وہ ضرور غلطی کرے گا اور نیت زوج کے بعد
فوراً وقوع کا فتویٰ دیدے گا حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اور اس میں بعض علماء تک بھی غلطی

کر چکے ہیں۔ چنانچہ علامہ شامی نے ایک فقیہ کی غلطی نکالی ہے کہ انہوں نے اس
مسئلہ میں غلط فتویٰ دیا ہے۔

نیز بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک مسئلہ ایک کتاب میں مطلق
مطلق و مقید کا فرق ہے دوسری کتاب میں مقید ہے اس لئے مسائل فقہ میں مفتی
کو لازم ہے کہ صرف ایک کتاب کو دیکھ کر فتویٰ نہ دے بلکہ مختلف کتابوں میں دیکھ کر جواب
دے۔ غرض فقہ کا فن بہت دقیق ہے۔ جاہل واعظ ضرور غلطی کرے گا۔ اور اس کے امتحان
کی آسان صورت یہ ہے کہ کسی جاہل کے وعظ میں ایک عالم کو دو چار دفعہ پردہ میں بٹھلاؤ
دو چار دفعہ کی اس لئے ضرورت ہے کہ ایک دفعہ تو غلطی سے محفوظ رہ جانا ممکن ہے۔ مگر
ہمیشہ محفوظ رہ جانا جاہل سے دشوار ہے۔ دو چار دفعہ کے بعد ان عالم صاحب سے پوچھ
لینا کہ اس نے کتنی غلطیاں کی ہیں۔ انشاء اللہ حقیقت معلوم ہو جائیگی۔ اس لئے میں
کہتا ہوں کہ یہ کام نااہل کو نہ دینا چاہیے۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ عالم سے غلطی نہیں ہوتی
عالم بھی بشر ہے اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ مگر وہ خفیف اور قلیل غلطی کرے گا۔ شدید اور
بکثرت غلطی نہ کرے گا یعنی اس کے بیان میں شاذ و نادر کبھی سو بار میں ایک بار غلطی ہوگی اور جاہل
کے وعظ میں کثرت سے غلطیاں ہوں گی پھر عالم دو سر وقت اپنی غلطی پر متنبہ ہو سکتا ہے۔
اور دوسرے بیان میں اس کی اصلاح بھی کر سکتا ہے اور جاہل کو متنبہ بھی نہیں ہوگا کہ میں نے
کیا غلطی کی ہے اس لئے یہ اس سے اشد ہے خوب سمجھ لو۔

صاحب آپ کو تجربہ نہیں اور مجھے تجربہ ہے جس کی بنا پر میں کرتا ہوں کہ نااہل کو
وعظ کی اجازت نہ دینا چاہیے۔ واللہ جہل کی وجہ سے بڑی خرابیاں ہو رہی ہیں۔ کانپور میں
ایک شخص نے ایک ایسے بکرے کی قربانی کی جس کا کوئی عضو عیب سے خالی نہ تھا۔ لوگوں
نے اس سے کہا کہ اس کی قربانی جائز نہیں تو وہ کہتا ہے۔ واہ ہماری بیوی صاحبہ نے
فتویٰ دیا ہے کہ اس کی قربانی جائز ہے۔ پھر اس نے بیوی سے جا کر کہا کہ لوگ تمہارے
فتویٰ میں غلطی نکالتے ہیں اس نے شرح و قایہ کا اردو ترجمہ پڑھا تھا اس میں مسئلہ کا موقع
نکال کر باہر بھیج دیا کہ دیکھو اس میں لکھا ہے کہ تہانی عضو سے کم کٹا ہو تو قربانی جائز ہے۔ اور
اس بکرے کا کوئی عضو تہانی سے زائد نہیں کٹا بلکہ کم ہی ہے۔ گو مجموعہ مل کر بہت زیادہ تھا۔
کچھ ٹھکانا ہے اس نامعقول حرکت کا کہ ایک عورت بھی شرح و قایہ کا ترجمہ پڑھ کر مفتی بن گئی

۶۵ عوام کا ہر دینی کام میں دلیل تلاش کرنا

بڑی غلطی ہے

فرمایا کہ ہر عمل کا مدار اعتماد پر ہوتا ہے۔ مثلاً باورچی نے کھانا سامنے لا کر رکھ دیا۔ اب صرف اس کے اعتماد پر کھانا کھالیا جاتا ہے حالانکہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ کہیں زہر نہ ملا دیا ہو۔ چنانچہ بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے۔ اب دیکھئے یہاں پر زہر ملانے کا احتمال کا خیال نہیں کیا جاتا۔ علی ہذا تاجر لوگ کروڑوں روپے کی تجارت صرف ملازمین کے اعتماد پر کرتے ہیں حالانکہ بعض اوقات ملازم لوگ بہت سامان غبن کر ڈالتے ہیں۔ اسی طرح بادشاہوں کا بھی سارا کام نوکر چاکر ہی کے ذریعہ چلتا ہے اسی طرح دین کا بھی کل کام اعتماد پر ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید کو قرآن مجید ماننا علماء کے اعتماد پر ہے۔ اور اس زمانہ کے علماء کو اپنے سے اگلے علماء پر۔ پھر ان کو صحابہ کرام پر۔ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ پس ثابت ہوا کہ کل کام خواہ ۔۔۔ دین کا ہو یا دنیا کا۔ سب کا دار و مدار اعتماد ہی پر ہے۔ اب عوام کو ہر امر دین میں دلیل تلاش کرنا غلطی ہے۔ (مقالات حکمت ۱ دعوات عبدیت حصہ ششم)

۶۶ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت میں جانا

رحمت سے ہو گا نہ کہ عمل سے اس کی ایک شبہ کا جواب

کوئی یہ سن کر کہ اعمال کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں نہ جائیں گے۔ یہ نہ سمجھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال میں کچھ نقصان تھا۔ بات یہ ہے کہ عمل کی وجہ سے جنت میں جانا یہ اعلیٰ درجہ نہیں ہے بلکہ رحمت کی وجہ سے جانا یہ ہی اعلیٰ درجہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عمرہ تابع سبب کے ہوتا ہے اگر سبب ناقص ہے تو عمرہ بھی ناقص ہوگا۔ اور اگر سبب کامل ہے تو عمرہ بھی کامل ہوگا ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ خدا کی رحمت کا کتنا ہی حصہ لے لیا جاوے وہ غیر محدود ہی ہوگا۔ غیر متناہی کا نصف بھی غیر محدود

ہی ہوگا رحمت حق کا اول تو تجزیہ نہیں ہو سکتا لیکن اگر بالفرض کسی درجہ میں کسی نسبت سے تجزیہ ہو بھی تو وہ غیر متناہی ہوگا کیونکہ اگر اس کو متناہی مانا جاوے تو اس سے مجموعہ کا متناہی ہونا لازم آئے گا کیونکہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ مرکب متناہی سے ہر اتم متناہی ہوتا ہے بہر حال نصف وغیرہ بھی غیر متناہی کا غیر متناہی ہوتا ہے اور پہلے میں مقدمہ عرض کر چکا ہوں کہ سبب مسبب کے تابع ہوتا ہے یعنی سبب ناقص تو عمرہ بھی ناقص۔ اور سبب کامل تو عمرہ بھی کامل۔ سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ جنت میں اگر آپ کے عمل کی وجہ سے ہوگا تو متناہی ہوگا۔ کیونکہ عمل متناہی ہے اور اگر رحمت کی وجہ سے ہوگا تو غیر متناہی ہوگا کیوں کہ رحمت غیر متناہی ہے۔ اس لئے رحمت کی وجہ سے جانا یہی اعلیٰ درجہ ہے۔ غرض آپ کا عمل محدود تو ہوگا مگر نغوذ بالشر ناقص نہیں۔ پس عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جانے سے لازم نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں کوئی نقصان ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ آپ سے بڑھ کر کسی کا بھی عمل نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر اعمال ہر طرح کامل ہیں۔ مگر چونکہ رحمت حق کی وجہ سے جنت میں جانا اعلیٰ درجہ ہے اس لئے آپ کے اعمال کو سبب نہیں بنایا گیا دخول جنت کا۔ بلکہ اعمال تو کسی حال میں بھی دخول جنت کا سبب نہیں ہو سکتے چاہے کیسے ہی کامل ہوں کیونکہ خود اعمال کا کمال بھی تو رحمت حق ہی پر مرتب ہے پس جب اعمال کا کمال بھی اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت کا اثر ہو تو پھر بندہ کا کیا حق ہے کہ اپنے اعمال پر ناز کرے۔ خیال تو فرمائیے۔ پس کسی کو کیا حق ہے کہ اپنے اعمال پر ناز کرے۔ خیال تو فرمائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا بڑا درجہ ہے مگر پھر بھی آپ یوں فرما رہے ہیں کہ میں بھی جنت میں اپنے اعمال سے نہ جاؤں گا۔ تو پھر ہمارا کیا منہ ہے۔

(وعظ اکملہ ص ۱۵)

۶۷۔ حضرت ابراہیم کا حضرت اسماعیل سے

بوقت ذبح را دریا کر کے پر ایک شبہ کا جواب

بعض لوگ یہ سمجھے کہ رائے دریافت کرنے کے لئے ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام سے پوچھا تھا کہ تمہاری کیا رائے ہے تو انہوں نے کہا یا اَبَتِ افْعَلْ مَا تَوْصَرُّ کہ

اے باپ آپ وہی کیجئے جس کا آپ کو حکم ہوا ہے اور یہ سمجھ کر ان کو شبہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کو نفوذ بالشر تردد تھا۔

کارپا کاں راقیاس از خود مگیر گر چہ ماند در نوشتن شیر و شیر
حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو تردد نہ تھا کہ انبیاء میں اس کا احتمال ہی نہیں
بعض اہل ظاہر اس کے قائل ہوئے ہیں کہ گو تردد نہ تھا مگر اس وقت بیٹے میں باپ سے زیادہ
استقلال تھا جیسا کہ ان کے سوال مَاذَا تَرَى میں اور ان کے جواب اَفْعَلُ مَا تَوْحَرُ
میں موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ پھر اس تفاوت کا ایک نکتہ بیان کیا جو عوام کو پسند بھی
آئے گا۔ مگر ابراہیم علیہ السلام کی اس میں صریح تنقیص ہے وہ نکتہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ لو
محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ابراہیم علیہ السلام کے بدن میں تھا۔ اس کی وہ برکت تھی کہ ابراہیم
علیہ السلام کو کس قدر استقلال تھا کہ آگ میں ڈالے گئے اور مضطرب نہ ہوئے جب اسماعیل
علیہ السلام پیدا ہوئے تو وہ نوران میں منتقل ہو گیا۔ اس واسطے وہ اس درجہ میں مستقل المزاج
ہو گئے تھے۔ مگر اس توجیہ سے میرا رنگٹا کھڑا ہوتا ہے کیا توجیہ کی ہے کہ اتنے بڑے پیغمبر کی
جناب میں گستاخی کی بھی پرواہ نہ کی۔ بس ایسی توجیہ رہے دیجئے۔

ز عشق ناتمام با جمال یار مستغنی است

با ب رنگ و خال و خط چہ حاجت رکوزیبار

ناتمام اس معنی کر کہ اس میں تنقیص ہے ابراہیم علیہ السلام کی۔ نور محمدی کے جید اہولنے
کے بعد غیر مستقل ہو جانا محض جزا ہے اور رجم بالغیب ہے۔ غور کرو تو اس میں حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کے لئے بھی گستاخی ہے کیونکہ آپ کا نور ایسا نہیں جس کا اثر زائل ہو جاوے آگ
نور کے اندر جلاتی جاتی ہے تو ایک گھنٹہ تک تنور اس کے اثر سے گرم رہتا ہے تو کیا وہ نور
اتنا بھی نہ ہوگا اس کے منتقل ہونے کے بعد ابداً لا بد تک اس کا اثر رہے یہ تفاوت ہی نہیں
جو ان خرافات کے ماننے کی ضرورت پڑے۔ اصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اسماعیل علیہ السلام
کے صرف پدر شفیق اور مربی شفیق ہی نہ تھے بلکہ وہ شیخ بھی تھے۔ سنو! شیخ ہونے کی حیثیت
سے ان کو ان کے استقلال کا امتحان مقصود تھا۔ اس واسطے فرمایا فَانْظُرْ مَاذَا تَرَى
مگر وہ اس امتحان میں کامیاب ہوئے کہ فرماتے ہیں يَا بَتِّ اَفْعَلُ مَا تَوْحَرُ سَيَجِدُنِي
اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِيْنَ اور کیا ٹھکانا ان کے عرفان کا اتنا بڑا توکل کہ اپنی توت

پر نظر نہیں یہاں بھی کہتے ہیں "انشار اللہ" کہ اگر خدا کو منظور ہو۔ پس یہی تو کمال ہے ایسے
ہی بیٹے کی نسبت کہتے ہیں۔

شبابش آں صدف کہ چنایاں پر و گہر آبا از و محرم و ابناعریہ تر۔
تو یہ بھی اس کی اصل۔ چنانچہ اسماعیل علیہ السلام راضی ہو گئے ابراہیم علیہ السلام نے
چھری ہاتھ میں لیکر ذبح کے لئے لٹایا۔ اسماعیل علیہ السلام کا یہ استقلال کمال میں ابراہیم
سے زیادہ نہیں۔ بڑا کمال تو ابراہیم علیہ السلام کا ہے کیونکہ خود کشی کرتے تو بہتوں کو دیکھا ہوگا
یا کم از کم سنا ہوگا۔ مگر فرزند کشی کون کر سکتا ہے بھلا باپ سے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے
کے گلے پر چھری چلا دے۔ والنناد کالمعدوم اب بتلایے، استقلال کس کا بڑھا ہوا
ہے ایک مختل عبارت فاظفر ماذا تری سے یہ سمجھ لینا کہ ابراہیم علیہ السلام میں استقلال کم تھا
کتی بڑی غلطی ہے اگر نور محمدی کے جدا ہو جانے سے وہ غیر مستقل ہو گئے تھے۔ تو اچھا پھر وہ چھری
چلانے کے وقت مستقل کیونکر ہو گئے۔ حضور کے نور کے برکات تو اس قدر غیر محدود ہیں کہ وہ
مفاہرت بدن ابراہیم علیہ السلام کے بعد ویسا ہی نور بخش تھا۔ جیسا کہ مفارقت ناسوت کے
بعد بھی ناسوت کے لئے نور بخش ہو رہا ہے جن انوار کا آپ مشاہد کر رہے ہیں۔

(روح المعانی والشیخ ص ۱۸)

۶۸۔ مقتدا رہنما کے لئے عوام کا

غلط معیار

وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ سے تو اس جماعت کی اصلاح فرمائی جو اتباع ہی
ضرورت نہیں سمجھتے۔ کیونکہ اس لفظ سے اتباع کی ضرورت بتلائی۔ اور سبیل من اناب
سے علاج ہے اس جماعت کا ہر کس ناکس کے معتقد ہو جانے والے ہیں۔ اور اتباع کا
صحیح معیار کوئی نہیں سمجھتے کیونکہ اس جملہ سے حق تعالیٰ نے اتباع کا صحیح معیار۔۔۔
بلا دیا اور معیار سے مراد ہے معیار صحیح و رنہ یوں تو معیار آجکل بہت ہیں۔ جیسے کشف کہ
مفسر نے اسی کو اتباع کا معیار بنایا اور ہر صاحب کشف کو بزرگ قابل اتباع سمجھا۔

متبوع نہیں ہیں بلکہ ان کے پاس ایک سبیل ہے۔ وہ ہے متبوع یہ ہے اتباع کا معیار۔ کہ جس شخص کا اتباع کرو۔ اس کو دیکھ لو کہ وہ صاحب انابت ہے یا نہیں۔ جو صاحب انابت ہو اس کا اتباع کرو۔ سبحان اللہ کیا عجیب معیار ہے پس اتباع اس معیار کے موافق کرنا چاہیے اور سب معیار چھوڑ دیئے جائیں۔

خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ نے توجہ الی اللہ کو معیار بنایا۔ اور توجہ الی اللہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام کو مانے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ **وَيَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ** کہ توجہ الی اللہ کو ہدایت لازم ہے۔ اور ہدایت یہ ہے کہ افعال درست ہوں۔ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ توجہ الی اللہ کے لئے لازم ہے کہ اس کے افعال درست ہوں۔ پس اب من اناب الی سے مراد وہ شخص ہو جو کہ باعمل ہو۔ اور عمل بدون علم کے ہو نہیں سکتا۔ تو حاصل یہ ہوا کہ اس کا اتباع کرو جو احکام خداوندی کے علم و عمل دونوں کا جامع ہو۔ پس دو چیزیں اصل بھڑیں۔ ایک علم دین اور عمل دین۔ اور اب تک جتنے معیار لوگوں نے مقرر کر رکھے ہیں۔ ان میں نہ عمل ہے نہ علم۔ اور علم و عمل کے ساتھ ایک اور چیز بھی ضروری ہے وہ توجہ الی اللہ ہے۔ پس سب سے اول تو علم ہونا چاہیے اور پھر اس پر مرتب ہونا چاہیے کہ عمل اور توجہ الی اللہ ہو۔ سبحان اللہ کیا جامع کلام ہے کہ ایک اناب کے لفظ میں تینوں امور علم و عمل اور توجہ الی اللہ کی طرف اشارہ فرمادیا۔ پس اب معلوم ہوا کہ کامل اور اتباع کے متبادل وہ ہو گا کہ جس میں یہ تینوں باتیں ہوں۔

(اتباع المنیب ص ۲۱)

۷۔ بعض لوگ حج کے بعد بدعمل کیوں

ہو جاتے ہیں؟

بات یہ ہے کہ حج اسود کسوٹی ہے۔ اس کو چھونے کے بعد انسان کا اصلی رنگ ظاہر ہو جاتا ہے جو حالت پہلے سے مخفی تھی وہ اب کھل جاتی ہے۔ اگر طبیعت میں نیکی تھی تو پہلے سے زیادہ

نہ وہ اس کو اپنی طرف راہ دیکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے ۱۲

نیک ہو جاتا ہے اگر بدی تھی تو وہ بدی اب کھل جاتی ہے۔ بہت لوگ ظاہر میں نیک معلوم ہوتے ہیں مگر کسوٹی پر لگانے سے کھرا کھوٹا معلوم ہو جاتا ہے۔

نقد صوفی نہ ہمہ صافی و بے غش باشد اے بساخرۃ کو مستوجب التث باشد
خوش بود گر بہک تجر بہ آید بر میاں تاسیہ وئی شود ہر کہ درو غش باشد

شاید تم کہو کہ اچھا ہوا تم نے یہ بات ظاہر کر دی۔ اب تو ہم حج ہی کو نہ جائیں گے۔ نہیں صاحب حج کو جاؤ مگر اکسیر بن کر جاؤ اور لو میں تم کو اکسیر بننے کا طریقہ بھی بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ کسی کیسے کرے تعلق پیدا کر لو۔

کیسیا نیست عجیب بندگی پر معناں خاک او گشتم و چندیں درجامت دادند
کیسیا گر سے میری مراد یہ ننگوئی باندھے والے نہیں تھے ہیں بلکہ باطن کے کیسیا گر مراد ہیں جن کو اہل اللہ کہتے ہیں ان کی شان یہ ہوتی ہے۔

آہن کہ بپارس آشنانشد فی الحال بصورت طلبا باشد

پارس ایک پتھر ہوتا ہے اس کی خاصیت یہ ہے کہ جہاں لوہے کو اس سے مس کیا فوراً سونا بن جاتا ہے۔ اہل اللہ کی تو یہ خاصیت مشاہد ہے پارس میں یہ بات ہونیانہ ہوا اہل اللہ کی صحبت سے تو یہ نصوح حاصل ہو جاتی ہے جس سے پہلی تمام گندگیاں دھل جاتی ہیں۔ پس تم کو چاہیے کہ کسی اللہ والے سے تعلق پیدا کر کے حج کو جاؤ۔ اس کی صحبت سے تم کو توبہ خالص عطا ہوگی توبہ کر کے جاؤ گے تو پھر حج کا یہ اثر ہو گا کہ پہلے سے زیادہ تم کو اعمال صالحہ کی توفیق ہوگی۔ میرا مطلب نہیں کہ مرید ہو کر جاؤ۔ اس کی ضرورت نہیں صرف تعلق محبت اور چند روزہ صحبت کی ضرورت ہے۔ (محاسن الاسلام ص ۳)

۸۔ جب بڑی باتوں سے بچانا نماز کا خاصہ ہے

تو پھر اس کے خلاف کیوں ہوتا ہے

اور یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نماز کس شان کی پڑھتے ہیں۔ اے صاحب! آپ کی نماز کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کہے کہ مجھے آدمی کی ضرورت ہے اور آپ اس کے سلسلے ایک

ایک مضافہ گوشت کو لا کر پیش کر دیں اور جب وہ کہے کہ میں اپنا بیج کو لیکر کیا کروں؟ یہ بھی کوئی آدمی ہے؟ آپ اس کے جواب میں یہ کہیں کہ صاحب تم نے آدمی کو کہا تھا میں نے آدمی لا دیا۔ دیکھ لو یہ حیوان ناطق ہے یا نہیں؟ تو بیشک وہ معقولی آدمی تو ہے مگر معقول آدمی نہیں وہ اس قابل نہیں ہے جس سے آدمیوں کے کام لئے جائیں گے۔

بہار نمازیں | بس یہی حال ہماری نماز کا ہے کہ نام کو تو نماز ہے مگر اس کی شان یہ ہے کہ اس کے لئے ہاتھ ہیں نہ پیر ہے نہ منہ ہے نہ سر ہے نہ آنکھیں۔ اگر ہاتھ ہے تو سر کٹا ہوا ہے سر ہے تو آنکھیں اندھی ہیں۔ اہل حقیقت تو ایسی نماز کو کالعدم سمجھتے ہیں جیسے ایک مضافہ گوشت کو کالعدم سمجھا گیا تھا۔ مگر فقہاء نے یہ دیکھ کر کہ نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے۔ اگر نہ ہونے کا حکم لگایا جائے گا لوگ اسے بھی چھوڑ بیٹھیں گے اس پر صحت کا حکم لگا دیا ہے۔ مگر یہ حکم صحت ویسا ہی ہے جیسے آپ نے اس اپنا بیج کو حیوان ناطق ہونے کی وجہ سے آدمی کہا تھا پس ایسے ہی آپ کی نماز اصطلاحی نماز تو ہے مگر حقیقی نماز نہیں ہے۔

صورت نماز بھی فائدہ سے خالی نہیں | لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اس کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دیں۔ نہیں صاحب بالکل بیکار یہ بھی نہیں۔ نہ ہونے سے اس کا ہونا پھر بہتر ہے کیونکہ بعض دفعہ اگر نظر عنایت ہو جائے تو حق تعالیٰ کے یہاں صورت بھی قبول ہو جاتی ہے۔ مولانا نے ایسی نماز کے قبول ہونے کی عجیب مثال دی ہے۔ فرماتے ہیں :-

ایں قبول ذکر تو از رحمت است چوں نماز مستحاضہ رخصت است
یعنی جس طرح عورت مستحاضہ کی نماز شرعاً صحیح مانی گئی ہے حالانکہ نماز کے اندر بھی اس کا خون جاری ہے اور حقیقت کے اعتبار سے وہ ناپاک ہے مگر محض رحمت کی بنا پر اس کو قبول کر لیا جاتا ہے۔ یہی حالت ہماری تمام نمازوں کی ہے کہ گو حقیقت کے لحاظ سے وہ کالعدم ہیں مگر حق تعالیٰ کی نظر عنایت سے کبھی یہ بھی قبول ہو جاتی ہے۔ نیز بعض دفعہ شدہ شدہ یہ نماز حقیقی کی طرف وسیلہ ہو جاتی ہے۔ جیسے بعض طلبہ بد شوق ہوتے ہیں نہ مطالعہ کر کے پڑھتے ہیں نہ پڑھ کر دیکھتے ہیں تو ان کا اس وقت پڑھنا نہ پڑھنے کے مثل ہے مگر

لے گوشت کا لہو نظر آئے وہ عورت جس کو حیض کے علاوہ استحاضہ خون آ رہا ہے

شفیق استناذ اس کو مکتب سے نہیں نکالتا۔ اور یہ کہتا ہے کہ گویا اس وقت شوقین طالب علم کے برابر نہیں مگر شدہ شدہ شوق کی امید ہے چنانچہ اکثر ایسا ہو بھی جاتا ہے کہ جن طالب علموں کو ابتداء میں شوق نہ تھا جب وہ عرصہ تک کام میں لگے رہے تو ایک وقت میں خود بخود ان کو شوق پیدا ہو گیا انہیں سبب پر نظر کر کے حضرات فقہاء نے ایسی نمازوں پر صحت کا حکم لگا دیا۔ اور واقعی فقہاء کا وجود بھی امت کے لئے رحمت ہے پس آپ اپنی نماز کو بیکار تو نہ سمجھیں مگر کامل بھی نہ سمجھیں۔

اعراض کا جواب | اب اعتراض کا جواب ہو گیا کہ نماز کی تاثیر تو حق تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ تنہی عن الفحشاء والمنکر۔ اور ہم اپنے اندر اثر نہیں پاتے تو بات یہ ہے کہ یہ شان کامل نماز کی ہے اور آپ کی نماز کامل نہیں۔ اس لئے اس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ ہم نماز کو بڑی طرح ادا کرتے ہیں جیسے کوئی جو شاندارے کو سفوف بنا کر پھانک لے تو بتلاتے نفع کیونکر ہو۔ دوسرے یہ کہ جیسی ہماری نماز ہے ویسی اس کی نہی عن الفحشاء بھی ہے۔ اگر کامل نماز ہوتی تو وہ ہم کو تمام فحشاء سے روک دیتی۔ اب ناقص ہے تو کسی قدر فحشاء سے روک دیتی ہے۔ اور اس کا انکار نہیں ہو سکتا تجربہ ہے کہ نمازی آدمی عموماً بے نمازیوں سے کم گناہ کرتے ہیں اور ادنیٰ نفع تو یہی ہے کہ نمازی آدمی کے پاس کوئی کافر بہکانے کے واسطے نہیں آتا کفار جس کو نماز دیکھتے ہیں اس کو دین کا پابند اور پختہ سمجھ کر کچھ نہیں کہتے۔ اس سے وہ ناامید ہو جاتے ہیں کہ یہ ہماری بہکانے میں نہیں آ سکتا۔ (ابو اریتمائی صلا)

۷۲۔ معراج میں دیدار باری تعالیٰ

دنیا میں خدا کو دیکھنا محال عادی و شرعی ہے۔ محال عقلی تو نہیں کیونکہ محال عقلی کا وجود کسی جگہ نہیں ہوتا۔ اور حق تعالیٰ کا دیدار آخرت میں ہو گا۔ جیسا کہ لفظوں سے ثابت ہے۔ اور دنیا میں بھی وجہ استحالہ رویت ادھر سے نہیں بلکہ ہماری طرف سے ہے ہم اس کے متحمل نہیں۔ ورنہ حق تعالیٰ میں خفا نہیں وہ تو یہاں بھی ظاہر ہیں اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ حق تعالیٰ کی

نہ وہ بڑی اور ناپسندیدہ باتوں سے روکتی ہے۔

صفت باطن بھی تو ہے چنانچہ نص میں ہے۔ ھُوَ الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ پھر تمہارا یہ کہنا کیونکر صحیح ہے کہ حق تعالیٰ میں خفا نہیں۔ صفت باطن سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ میں خفا ہے اس کا جواب محققین نے یہ دیا ہے کہ حق تعالیٰ جو باطن ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان میں خفا ہے بلکہ غایت ظہور سے بطون ہو گیا رہا یہ کہ غایت ظہور سے بطون کیسے ہو گیا۔ اس سے تو ظہور ہونا چاہیے تھا تو بات یہ ہے کہ ہمارے ادراک کے لئے غیبت و خفا کی بھی ضرورت ہے۔ اگر کسی چیز میں غیبت بالکل نہ ہو اس کا ادراک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ادراک اتفاقات سے ہوتا ہے اور اتفاقات غیبت کی وجہ سے ہوتا ہے جو چیز من کل وجہ حاضر ہو۔ اس کی طرف اتفاقات نہیں ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی روح حالانکہ بہت ظاہر ہے اور انسان سے جتنا قرب روح کو ہے کسی چیز کو بھی نہیں پھر بھی روح کا ادراک نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ رگ رگ میں سرایت کی ہوئی ہے۔ اس میں کوئی درجہ غیبت کا نہیں۔ اس لئے اس کی طرف اتفاقات ہی نہیں ہوتا اور جب اتفاقات نہیں تو ادراک کیسے ہو اسی طرح بلا تشبیہ کیونکہ یہ تشبیہ بھی ناقص ہے حق تعالیٰ میں چونکہ کوئی درجہ غیبت و خفا کا نہیں۔ اس لئے وہ بوجہ غایت ظہور کے باطن ہیں ہم کو دھوپ کا ادراک اس لئے ہے کہ وہ کبھی غائب بھی ہو جاتی ہے اگر غائب نہ ہوئی تو آپ اس کو دیکھتے تو مگر ادراک نہ ہوتا۔ دھوپ کا ادراک ظلمت ہی کی وجہ سے ہے اور ظلمت خفا صور ہی کا نام ہے۔ نیز اگر غیبت نہ ہو تو پھر روشنی سے لذت بھی نہ آتی۔ دن میں جو لذت ہے وہ اسی لئے ہے کہ رات میں دھوپ غائب ہو جاتی ہے۔

از دست ہجر یار شکایت نمی کتم گرنیست غیبی نہ دید لذت حضور۔

غرض چونکہ حق تعالیٰ ہر وقت ظاہر ہیں۔ اسی لئے خفا ہو گیا کیونکہ دیدار الہی ہمارا ادراک ایسا ضعیف ہے جو غائب من وجہ کے ساتھ ہی متعلق ہو سکتا ہے ظاہر من کل وجہ کے ساتھ متعلق نہیں ہو سکتا۔ ہاں آخرت میں یہ ادراک قوی ہو جائے گا۔ تو ظاہر من کل وجہ کے ساتھ بھی متعلق ہو گا۔ وہاں روح کا بھی انکشاف ہو گا اور حق تعالیٰ کا بھی دیدار ہو گا اور معلوم ہو جائے گا کہ حق تعالیٰ تو بے حجاب تھے حجاب ہماری طرف سے تھا ہماری آنکھوں میں اس وقت اس کے دیکھنے کی قوت نہیں جیسے خفا میں

لے پوشیدگی نے توجہ

آفتاب کے دیکھنے کی قوت نہیں کسی نے خوب کہا ہے۔ شد ہفت پردہ بر چشم اس ہفت پردہ چشم بے پردہ و رنما ہے چوں آفتاب دارم یعنی آنکھ کے سات پردے ہی دیدار سے مانع ہو گئے تو یہ آنکھ خود ہی مانع ہو رہی ہے ادھر سے مانع کوئی نہیں۔ اگر آفتاب چمک رہا ہے اور تم آنکھ پر ہاتھ دھر لو تو مانع تمہاری طرف سے ہو گا آفتاب کو مخفی نہ کہا جاوے گا اور وہ جو حدیث میں آخرت میں حجاب کا ذکر آتا ہے لَا يَبْقَىٰ عَلَىٰ وَجْهِهِ الدَّرَادُ الْمَكْبَرُ بَابُ۔ وہ حجاب ادراک کنہ سے مانع ہے دیدار سے مانع نہیں۔ آخرت میں ہماری آنکھوں کی قوت بڑھ جائے گی تو خدا تعالیٰ کو دیکھیں گے تو مگر کنہ کا ادراک نہ ہو گا۔ اور رویت کے لئے ادراک کنہ لازم نہیں۔ ہم یہاں بھی بہت چیزوں کو دیکھتے ہیں مگر کنہ کا ادراک نہیں ہوتا۔ بہر حال دنیا میں رویت الہی محال عادی ہے چنانچہ حدیث مسلم ہے۔ انکم لم تروا ربکم حتیٰ تموتوا۔ دم اپنے رب کو نہیں دیکھ سکو گے یہاں تک کہ تم کو موت آجائے اور نص میں موسیٰ علیہ السلام کی درخواست دیدار کے جواب میں ارشاد ہے۔ لَنْ تَرَانِي۔ یہ جواب قابل دید ہے حق تعالیٰ نے لن ترائی فرمایا ہے لن اری نہیں فرمایا۔ بتلادیا کہ میں تو اب بھی قابل ہوں کہ دیکھا جاؤں۔ میری طرف سے کوئی حجاب نہیں مگر تم میں قوت دیدار نہیں تم مجھے اس وقت تک نہیں دیکھ سکتے۔ محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔ کیونکہ دنیا میں رویت محال عادی ہے ہاں تجلی ہوئی تھی اور حق تعالیٰ نے جبابان اٹھا دیئے تھے مگر موسیٰ علیہ السلام دیکھنے سے پہلے ہی بے ہوش ہو گئے۔

البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت اختلاف ہے کہ معراج میں آپ نے حق تعالیٰ کو دیکھا ہے یا نہیں۔ اس میں اکثر علماء اور صوفیہ اور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدار الہی معراج میں ہوئی ہے۔

نہ اس کے چہرہ پر کبریا کی چادر کے سوا کوئی اور چیز باقی نہیں رہتی ہے۔ نہ تو نہر گزبھے نہ دیکھ سکے گا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اجماع کا قول یہی ہے کہ آپ نے دیکھا ہے مگر اسی کے ساتھ محققین کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ آیات سورہ نجم کی تفسیر اس حدیث سے صحیح نہیں ہے کیونکہ عَلَمًا شَدِيدُ الْقُوَى ذُو مِرَّةٍ یَقِينَا حضرت جبریل علیہ السلام مراد ہیں ان صفات کا عنوان بیان اس کو مقتضی ہے کیونکہ حق تعالیٰ پر شدید القوی کا اطلاق نہیں ہو سکتا ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اب آگے چلئے۔ فاستوی وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَى بھی انہی کی صفت ہو سکتی ہے کامر جبریل علیہ السلام ہی ہیں کیونکہ اُسْتَوَى بِالْأُفُقِ بھی انہی کی صفت ہو سکتی ہے اس کے بعد ثَمَّ دَنَا فَتَدَلَّى فَكَانَتْ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى میں سب ضمیریں جبریل علیہ السلام ہی کی طرف راجح ہیں۔ حق تعالیٰ کی طرف راجح نہیں ورنہ انتشار ضما کر لازم آئے گا یہ روایت جبریل تو دنیا میں ہوئی کھتی آگے فرماتے ہیں۔ وَ لَقَدْ رَأَوْا نَزْلَةً أُخْرَىٰ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَىٰ۔ یہ دوبارہ روایت سدرۃ المنتہیٰ پر ہوئی اور گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو بہت دفعہ دیکھا ہے مگر یہاں اصلی صورت میں دیکھنے کا ذکر ہے وہ دومرتبہ ہوئی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان آیات کی تفسیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خود پوچھی تھی۔ آپ نے فرمایا۔ ہو جبریل۔ یعنی یہ روایت جبریل علیہ السلام کی کھتی، بانی جو علماء معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ روایت کے قائل ہیں وہ دوسرے دلائل سے استدلال کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا قول ہے کہ آپ نے معراج میں حق تعالیٰ کو دیکھا ہے اور ان کی سند صحیح ہے حضرت ابن عباسؓ کا قول تو مسلم میں ہے۔ اور سیوطی نے مستدرک حاکم سے اس باب میں حدیث مرفوعہ نقل کی ہے بس قرآن میں گو اس روایت کا ذکر نہیں مگر جب حضرت صحابی رضی اللہ عنہم اس کا اثبات کرتے ہیں تو یقیناً انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔

ابن علماء نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کی وجہ کو اس قاعدہ سے کہ دنیا میں روایت محال عادی ہے مستثنیٰ

کیا ہے کیونکہ دلیل سے آپ کا دیکھنا ثابت ہو چکا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں استحالہ روایت کی علت رائی کی عدم قابلیت تھی ورنہ مرنی میں تو کوئی مانع ہی نہیں مگر شیخ ابن عربی

نے عجیب تحقیق لکھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اس قاعدہ کو میں استثناء کی ضرورت نہیں بلکہ یہ اپنے عموم پر بحال رہا بانی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت سے اس پر نقص وارد نہیں ہوتا کیونکہ ہم تو معراج میں روایت کے قائل ہیں۔ اور معراج عرش تک ہوئی ہے اور سموات و عرش مکان آخرت ہیں۔ وہ دنیا میں داخل نہیں بلکہ اس سے خارج ہیں تو ممکن ہے کہ اس مکان کی یہ خاصیت ہو کہ جو شخص وہاں پہنچ جاوے خواہ مرنے کے بعد یا مرنے سے پہلے اس میں قوت تحمل رویت پیدا ہو جائے جیسے عیسیٰ علیہ السلام اس وقت آسمان پر موجود ہیں اور وہ وہاں کھانے پینے اور بول و براز سے منزہ ہیں صرف ذکر اللہ سے ان کی حیات ہے کیوں؟ اس لئے کہ وہ اس وقت دنیا میں نہیں ہیں بلکہ مکان آخرت میں ہیں اور مکان کی خاصیت مکان دنیا سے الگ ہے۔ اگر یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ غذا سے فضلات پیدا ہوں تو ممکن ہے وہاں کی یہ خاصیت ہو کہ فضلات پیدا نہ ہوں۔ اگر یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ حرکت سے حرارت بدن تحلیل ہوتی ہے تو ممکن ہے کہ وہاں کی یہ خاصیت نہ ہوں۔ اسی طرح یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ اعراض میں وزن نہ ہو اور وہاں کی یہ خاصیت ہے کہ اعراض میں وزن ہو۔ یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ ایک دن موت ضرور آتی ہے وہاں کی یہ خاصیت ہے کہ جو وہاں پہنچ جائے اسے کبھی موت نہ آئے جیسے کسی شاعر نے کشمیر کی تعریف میں کہا ہے۔

ہر سوختہ جانے کہ یہ کشمیر در آید۔ گر مرغ کباب است کہ بابل پر آید

خیر یہ تو شاعرانہ مبالغہ ہے مگر اتنی بات تو مشاہدہ ہے کہ دنیا میں بھی ہر جگہ یکساں خاصیت نہیں۔ بلکہ بعض جگہ کی کچھ خاصیت ہے بعض شہروں کی کچھ خاصیت

دنیا و آخرت میں فرق

ہے بعض ملکوں میں عمریں کم ہوتی ہیں اور بعض ملکوں میں لمبی لمبی ہوتی ہیں بعض مقامات کے آدمی کمزور ہوتے ہیں اور بعض مقامات کے بہت قوی اور توانا و تندرست ہوتے ہیں بعض ملکوں میں بیماریوں کی کثرت ہے آئے دن طاعون و ہیضہ پھیلا رہا ہے۔ اور بعض ملکوں میں کوئی ان بیماریوں کا نام بھی نہیں جانتا۔ جب ایسا اختلاف خاص دنیا کے مکانات

لے برداشت۔ لے پانچانہ پیشاب

میں بھی مشاہد ہے تو اس میں کیا اشکال ہے کہ مکان آخرت کی خاصیت دنیا سے بالکل الگ ہو ایک کو دوسرے پر قیاس کرنے کی کوجہ ہے اس تحقیق سے سب معادیات سہل ہو جاویں گی۔ اب نہ وزن اعمال میں اشکال ہے نہ رویت خداوندی میں کچھ شبہ ہو سکتا ہے معتزلہ کی عقل ماری گئی جو انہوں نے خواہ مخواہ ان امور کا انکار کیا جس کا منشا تجر قیاس الغائب علی الشاہد کے کچھ نہیں اور قیاس کا فاسد ہونا ظاہر ہے۔

غرض شیخ ابن عربی کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ ایک تو زمان آخرت ہے اور ایک مکان آخرت ہے زمان آخرت تو مرنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور مکان آخرت اسی وقت موجود ہے۔

چنانچہ جنت اور دوزخ کے بارے میں جملہ اہلسنت کا قول ہے کہ وہ اس وقت موجود ہیں۔ تو کیا وہ دنیا میں ہیں۔ اگر دنیا میں ہیں تب تو اس شخص کا قول صحیح ہو جاوے گا جو کہتا ہے کہ ہم نے تمام دنیا کا جغرافیہ پڑھا۔ جنت و دوزخ کا اس میں کہیں پتہ ہی نہیں۔ اس کا جواب اہل حق کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ تم نے دنیا کا جغرافیہ پڑھا ہے اور ایک جغرافیہ آخرت کا ہے تم نے وہ نہیں پڑھا۔ وہ تمہارے کورس میں داخل نہیں ہے اس لئے تم کو جنت و دوزخ کا پتہ نہیں چلا۔ اگر آخرت کا جغرافیہ پڑھتے تب ان کا پتہ چلتا۔ بس اہل حق جنت و دوزخ کو دنیا میں موجود نہیں مانتے بلکہ ان کو مکان آخرت میں موجود مانتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مکان آخرت اس وقت بھی موجود ہے اور جس طرح زمان آخرت میں رویت ممکن ہے اسی طرح مکان آخرت میں بھی ممکن ہے۔ گو دیکھنے والا بھی زمان آخرت میں داخل نہ ہوا ہو۔ پس قاعدہ مذکورہ منتقض نہیں ہوا۔ جس رویت کو آپ کے لئے ثابت کیا جاتا ہے وہ دنیا میں بھی بلکہ مکان آخرت میں بھی۔ اور دنیا میں آپ کے واسطے بھی رویت ممکن نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو قویٰ بشریہ میں سب سے اکمل ہیں مگر پھر بھی بشر ہیں۔

(تحصیل المرام ص ۵)

لہ ٹوٹا۔

۷۳) درود پڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی احسان سمجھنا غلط ہے

اگر کہو کہ ہم درود شریف پڑھتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نفع ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ حضور والا کو اتنا نفع نہیں ہوتا جتنا آپ لوگوں کو ہوتا ہے ہمیں ارشاد ہے حق تعالیٰ کا کہ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيَّ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ اگر آپ اپنے نوکر سے کہیں کہ یہ ہزار روپے ہیں ہم سے کہو کہ ہم اپنے بیٹے کو دے دیں۔ تو اس نوکر کو مقبول بنانے کو اس کی عزت بڑھانے کو یہ صورت تجویز کی ہے نہ کہ بیٹا روپے ملنے میں اس نوکر کا محتاج ہے۔ اگر نوکر نہ بھی کہے تب بھی روپیہ بیٹے کے لئے تجویز کر لیا گیا ہے صرف نوکر کی عزت افزائی کے لئے ایسا کیا ہے یہی حال درود شریف کا ہے کہ حق تعالیٰ کا یہ فرمان کہ رحمت کی دعا کرو۔ رسول کے لئے رحمت بھیجنا تو منظور ہی ہے خواہ ہم درود بھیجیں یا نہ بھیجیں چنانچہ اس کے قبل اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ موجود ہے مگر ہماری قدر بڑھانے کو ہمیں کہہ دیا کہ درود بھیجو کہ تمہارا بھی بھلا ہو جاوے گا کوئی شخص کیا منہ لیکر کہہ سکتا ہے کہ آپ ہمارے محتاج ہیں اور اس کہنے پر آپ رحمت ہوگی یہ شبہ شاید کسی خشک مزاج کو ہوتا اس لئے رفع کر دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو معاملہ حق تعالیٰ کا ہے وہ ہماری درخواست پر موقوف نہیں اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ علماء نے لکھا ہے کہ اور عبادات بعض دفعہ مقبول ہوتی ہیں اور بعض دفعہ مردود، لیکن درود شریف ہمیشہ مقبول ہوتا۔ سو اگر ہمارے عمل کا آپ پر رحمت نازل ہونے میں کوئی اثر ہوتا ہے تو جیسے اور اعمال ہیں یہ بھی ہمارا عمل ایسا ہی ہونا چاہئے تھا کہ کبھی مقبول اور کبھی مردود ہوتا ہے۔ سو ہمیشہ مقبول ہونا دلیل ہے اس کی کہ معلوم ہو کہ ہمارے عمل کا اس میں کوئی اثر نہیں۔ حق تعالیٰ ضرورت رحمت بھیجتے ہی ہیں ہم درود بھیجیں یا نہ بھیجیں۔ اس لئے درود شریف کبھی غیر مقبول نہیں ہوتا۔

بس خدا تعالیٰ کو رحمت بھیجنا ہے ہی۔ ہم کو جو حکم دیا تو صرف ہماری عزت بڑھانے کے لئے نیز ہمارے اعمال ظاہر ہیں کہ

درود کا فائدہ

مقبول ہونے کے قابل ہیں نہیں اور جو عمل مقبول نہ ہو وہ کالعدم ہے۔ پھر ہمارا درد و پرہیز کالعدم ہوا۔ مگر پھر بھی آپ پر رحمت ہوتی ہے کوئی شخص یہ احسان نہ سمجھے کہ میں درد و بھیتا ہوں۔ تب ہی رحمت ہوتی ہے اگر ہم آفتاب کے سامنے ہو گئے تو آفتاب نے ہم کو منور کر دیا آفتاب ہمارا محتاج شعاع میں نہیں۔ پس علماء کے قول سے بھی اس کی تائید ہو گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے نفع کے محتاج نہیں۔ البتہ اس مقام پر ایک اور شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دین کی تعلیم کی ہے اور ہمارے عمل کرنے سے آپ کو بھی ثواب پہنچتا ہے تو اگر ہم عمل نہ کریں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ثواب کیسے ملے گا۔ پھر ہمارے عمل کو اس میں دخل ہوا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس نیت سے تعلیم فرمائی تو آپ ہر حال میں ماحور تو ہو گئے۔ اب ہمارے عمل کرنے کا اثر اتنا رہا کہ عمل کرنے سے آپ کا جی خوش ہوتا ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوتی ہے کہ فلاں امتی نے یہ عمل کیا تو آپ خوش ہوتے ہیں۔ بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سے کوئی نفع نہیں (ذکر الرسول ص ۳)

۷۴۔ مساجد و مجالس کی آرائش فضول حرکت ہے

اس وقت عام طور پر مسجد کو آراستہ کیا جاتا ہے۔ مجالس اسلامیہ کو آرائش و زیبائش سے بالکل بھیرا بنا دیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ غیر قوموں کے مقابلہ میں ہم کو ان سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔

اے حضرات غیر قومیں کہ جن کے سامنے آپ یہ ظاہر کر رہے ہیں آپ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان کے برابر دولت آپ کے پاس کہاں ہے اگر وہ بھی صند باندھ لیں تو یقیناً آپ ان کے مقابلے میں شرمندہ ہوں گے۔ اس لئے آپ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی پیروی کیجئے اور کفار کا یہ نفسانی مقابلہ چھوڑیے بس ایک سچے مسلمان کی یہ شان ہونی چاہیے۔

دل فرمایاں بناتی ہمہ زیور بستند

یہود اپنی زمینیں دکھلائیں۔ نصاریٰ اپنی زمینیں دکھلائیں۔ ہنود اپنی زمینیں دکھلائیں۔

اور ایک مسلمان پھٹا ہوا کرتا پہن کر نکلے گا۔ تو خدا کی قسم سب کی رونقوں کو ماند کر دے گا۔ ارے صاحب! خدا نے وہ حسن آپ کو دیا ہے کہ آپ کو زینت کی حاجت ہی نہیں۔ اے حسین! خدا نے تجھے وہ حسن دیا ہے کہ تیرے حسن کے آگے آفتاب مانتا ہر شرماتے ہیں۔ ارے تو! پوڈر ملے کا ہے کو اپنے قدرتی حسن کو پوشیدہ کرتا ہے۔ تجھے اپنے حسن کی خبر نہیں۔ یہ عارضی حسن تیرے اصلی حسن کو پوشیدہ کئے دیتا ہے۔ متنبی کہتا ہے۔

حسن الحضارة مجلوب بتطرية و فی البدل و حسن غیر مجلوب
یعنی شہر کی عورتوں کا حسن تو بناؤ سنگار سے ہے اور دیہاتی عورتوں کا حسن خدا داد ہے واقعی ایک دیہاتی عورت اگر حسین ہو تو بوجہ اس کے کہ اس کے قویٰ بھی اچھے ہوتے ہیں اور محنت کی عادت کی وجہ سے صحت عمدہ اور جسم توانا ہوتا ہے۔ ایک شہر کی حسین عورت سے جو بیسیوں تکلفات سے اپنے حسن کو بڑھا لیتی ہے بہت اچھی معلوم ہوتی ہے ارے صاحب! مجلس اسلامی کے لئے یہ حسن اور شرف کیا کم ہے کہ وہ اسلام کی طرف حقیقی نسبت سے منسوب ہے تم نے اسلامی مجلس منعقد کی، اس کو شہنشاہِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار بھیرا دیا۔ اور اس کو اتنا بھی آراستہ نہ کر سکے جتنا کہ ولی کا دربار، اور سلاطین یورپ کے دربار یا یورپ کے بڑے بڑے بھتیگر۔ تو تم نے گویا ایک نقل کی اور کوٹے کی طرح ہنس کے مقابلہ میں ذلیل ہو گئے۔

مجالس اسلامی کی شان

ارے صاحب! مجلس اسلامی ایسی ہو کہ دور سے دیکھ کر خبر ہو جاوے کہ یہ مجلس اسلامی ہے یہ کسی ناچ رنگ یا بھتیگر یا سرکس کا اسٹیج نہیں

ہے۔ باہر سے مجلس بالکل سادہ ہو۔ اس کے بعد اندر پہنچیں تو صحابہ رض کا رنگ جھلکتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ بازاری عورتوں کی طرح گلے میں پھولوں کے ہار پڑے ہوئے۔ لباس نہایت پر تکلف اور ایک ایک چیز اور ہر ادارے سے روسا کا سا تکبر نمایاں ہو۔ اور حقیقت کا پتہ نہیں۔ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ زینت وہ شخص کرتا ہے جس کے پاس مال ہے کمال نہیں ہے ورنہ بجائے مال کے اپنے کمال کا اظہار کرتا۔ اور اب۔۔۔۔۔ کمال نہ ہونے سے مال کا اظہار کر رہا ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے

ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے کہ گنجا آدمی اپنے سر کا عیب چھپانے کے لئے خوب صورت ٹوپی کا اہتمام کرتا ہے اور جس کا سر اور بال درست ہوں وہ تو یہ چاہے گا کہ ٹوپی ہی نہ ہو تو بہتر ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ کیسی خوبصورت مانگ اور کتنے اچھے بال ہیں۔ حضرت میں تقسیم کہتا ہوں کہ اگر قلب میں حقیقت ہے تو ظاہری آرائش سے نفرت ہوگی اور اگر حقیقت سے کورے ہیں تو ظاہری شان و شوکت سے اس کی لیب پوت کریں گے مجالس اسلامیہ میں کیسا بناؤ۔ اسلام کی طرح مجالس اسلامیہ میں بھی سادگی ہونی چاہیے۔ غرض انجنوں میں بہت سے واعظین کا جمع کرنا یہ سب اسی افتخار اور منو و انہار کے لئے ہوتا ہے اور اس میں ایک عرض اور بھی ہوتی ہے وہ یہ کہ کوئی کسی واعظ کو پسند کرتا ہے کوئی کسی کو سب کو جمع کر لو۔ تاکہ ہر مذاق کے لوگ جمع ہوں اور جلسہ میں خوب رونق ہو۔ میں کہتا ہوں اگر آپ صحیح عرض کے لئے جلسہ کر رہے ہیں تو آپ کو لوگوں کے مذاق کی کیا ضرورت ہے اگر کوئی روپیہ تقسیم کر رہا۔

تو سائل خود بخود جمع ہو جائیں گے اس اشتہار کی کیا ضرورت ہے جو سائل روپیہ لینے آئے گا اسے سٹھائی بھی ملے گی۔ معلوم ہوتا ہے روپیہ جعلی ہے۔ اگر سودا کھرا ہے تو بغیر قافیہ اور سبج ملائے بک جائے گا ورنہ مقفیٰ اور مسجع عبارت بولنا پڑے گی۔ حضرت اپنا متاع خالص رکھئے۔ دیکھئے خود بخود خریدار آئیں گے اسی طرح حق ایسی چیز نہیں کہ اس کی طرف کشش نہ ہو۔ اہل حق اور ملمع سازوں کے کلام میں بھی فرق کہ ملمع سازوں کی آمد بڑی رنگین ہوتی ہے اور اس میں بڑا زور و شور ہوتا ہے مگر حاصل سوائے قافیہ بندی کے کچھ نہیں ہوتا۔

اہل حق کے کلام میں ابتداء تو بہت دھیمی ہوتی ہے۔ مگر انتہا میں روزا و رتوت اور خاص اثر ہوتا ہے ابتداء ان کی ہلکی بارش کی طرح آہستہ آہستہ ہوتی ہے جو کہ قلب میں آہستہ آہستہ ایسی بارش کی طرح جذب ہو جاتی ہے مگر اس کا انتہائی اثر گلزار اور گل بار ہوتا ہے بقول مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ خاک ثنوتا گل بر وید رنگ برنگ
اور ملمع ساز اپنا رنگ جانے کے لئے ابتداء میں خوب مشغولی کے اشعار پڑھتے ہیں

اور کہیں کہیں اب تو ڈھولک ستار اور ہار مونیہ سے کبھی مجلس و غلط کو گرم کیا جاتا ہے مضامین کے الفاظ بھی دلگذا رہتے ہیں کہ اس وقت تو ذرا سا جوش پیدا ہو جاتا ہے پھر جہاں مجلس بخواست ہوئی اثر بھی تشریف لے گیا اور جو ذرا سا باقی رہ گیا وہ دو چار روز کا مہان ہوتا ہے اور اہل حق کا اثر پائدار ہوتا ہے۔ مگر کلام ان کا رنگین نہیں ہوتا پس ان دونوں میں ایسا فرق ہے جیسا ایک چمکدار گولٹ کے چمچے اور رنگ آلود روپے میں روپیہ کا رنگ اگر نہ بھی کھوڑا وہ نہ بھی سولہ ہی آنے کو چلتا ہے اور گولٹ کے چمچے پر اگر گولٹ بھی چڑھا رہے پھر بھی اسے کوئی نہیں پوچھتا اور اگر وہ بھی اتر جاوے تو پھر وہ کچھ بھی نہیں۔ غرض روپے کو سفیدی و رچک کی حاجت نہیں اور وہ جو گولٹ کا چمچ اپنے سفید ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ درنظر ہر روپے سے بھی زیادہ چمکدار ہے۔ اس کی سفیدی و رچک کھوڑے دنوں کی ہے کہ اس کے بعد دو کوڑی کا بھی نہ ملے گا۔

۱۔ نقد صوفی نہ ہمہ صافی بے غش باشد۔

۲۔ اے بسا خر قہ کہ مستوجب آتش باشد۔

جب یہ کسوٹی آئے گی تو روپیہ تو سامنے آکھڑا ہوگا اور گولٹ کا چمچ منہ چھپاتا پھر جائے گا۔

۳۔ نہ باشد اہل باطن در پے آرائش ظاہر۔

۴۔ نہ نقاش احتیاجے نیست دیوار گلستاں را۔

یہی وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہایت سادہ زندگی تھی۔ آپ میں لعن اور ظاہری وجہ میں کوئی شان و شوکت نہ تھی۔ کیونکہ آپ سچے تھے باوجودیکہ آپ اعلیٰ درجہ کے قادر اور انتہا درجہ کے متین تھے مگر ساتھ ہی اس کے نہایت بے تکلف تھے۔

(اصلاح الیتامی ص ۱۲)

۵۔ حضرات انبیاء علیہم السلام و اولیائے کرام

کی حیات برزخیہ اثبات

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے لئے بہت کچھ شرف حاصل ہے کیونکہ

جسد اطہر اس کے اندر موجود ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی جسد مع تلبس ارفع اس کے اندر تشریف رکھتے ہیں۔ کیونکہ آپ قبر میں زندہ ہیں۔ قریب قریب تمام اہل حق اس پر متفق ہیں۔ صحابہؓ کا بھی یہی اعتقاد ہے حدیث بھی نص ہے۔ ان نبی اللہ حتیٰ فی قبرہ یؤنثیٰ کہ آپ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں اور آپ کو رزق پہنچتا ہے۔ مگر یاد رہے کہ اس حیات سے مراد ناسوتی نہیں ہے وہ دوسری قسم کی حیات ہے جس کو حیات برزخیہ کہتے ہیں۔

حیات برزخیہ کے مراتب

باقی یہ کہ حیات برزخیہ تو سب کو حاصل ہے۔ پھر اس میں نبی کی کیا تخصیص ہے؟ تو اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس کے مختلف مراتب ہیں ایک مرتبہ تو تمام مومنین کو حاصل ہے جس کے ذریعہ سے تعلیم قبر کی ہر مسلمان کو حاصل ہوگی۔ دوسری حیات شہداء کی ہوگی تمام مومنین کی حیات برزخیہ سے اقویٰ ہوگی عام مومنین کی حیات برزخیہ نسبت شہداء کے کمزور ہوتی ہے۔ اگرچہ اس حیات ناسوتیہ سے وہ بدرجہا اعلیٰ ہو۔ پس یہ کوئی نہ سمجھے کہ عام مومنین کی حیات برزخیہ اس حیات دنیویہ سے کمزور ہوگی اور حیات شہید کے اقویٰ ہوگی۔ مگر یہ ہوتا ہے کہ زمین اس کی لاش کو نہیں کھا سکتی اور یہ نہ کھانا ایک اثر ہے حیات کا۔

شہید کی حیات

پس شہید میں اس کا اثر ظاہر ہونا اور عام مومنین میں نہ ہونا یہ دلیل ہے شہید کے حیات کے اقویٰ ہونے کی بہ نسبت عام کی حیات کے بعض لوگوں نے اس کا انکار بھی کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مشاہدہ اس کے خلاف ہوا ہے۔ مگر یہ کوئی انکار کی وجہ نہیں بن سکتی۔ کیونکہ جس طرح اس کے خلاف مشاہدہ ہوا ہے اس کے موافق بھی مشاہدہ ہوا ہے جب دونوں طرح مشاہدے موجود ہیں تو سرے سے اس کا انکار کیونکر کیا جاسکتا ہے۔ بہت سے بہت یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ اور نصوص کا محمل بھی اسی کو کہا جائے گا باقی مطلقاً انکار تو صحیح نہیں ہو سکتا۔ یہ تو جواب تسلیمی ہے اس تقدیر پر جب کہ ہم مان لیں کہ جہاں تم نے اس کے خلاف کیا ہے وہ شہید ہی تھا۔ مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ شہید ہی نہ ہو کیونکہ شہادت صرف اسی کا نام نہیں

مگر میں قتل ہو جائے بلکہ حقیقی شہادت کے لئے کچھ باطنی شرائط بھی ہیں۔ مثلاً نیت کا خالص لوجہ اللہ ہونا۔ جس کی خبر سوائے خدا کے کسی کو نہیں ہو سکتی۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس کو آپ نے اس کے خلاف مشاہدہ کیا ہے وہ شہید حقیقی نہ تھا صرف شہید احکام تھا اور حیات اقویٰ درجہ صرف شہید حقیقی کے ساتھ خاص ہوگا اور اگر مان بھی لیا جاوے کہ وہ حقیقی شہید تھا تو ممکن ہے کہ کسی عارض کی وجہ سے ایسا ہوگا ہو کہ اس کی لاش گل گئی۔ مثلاً اس کے گم کی مٹی تیر ہو۔ ہم نے یہ کب دعویٰ کیا ہے کہ شہید کی حیات ایسی ہوتی ہے کہ اگر جلاؤ بھی اس کی لاش نہ جلے بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ اگر شہید کو موافق عادت کے دفن کر دیا جاوے گا کہ عموماً مردے دفن ہوتے ہیں کہ اس کی قبر میں کوئی خاص عارض دوسروں سے زیادہ مثل شوریٰ زمین وغیرہ کی نہ ہو تو اس کی لاش مثل دوسرے مردوں کے نہیں گلے گی۔

نبیاء کی حیات

تیسرا درجہ جو سب سے قوی ہے وہ انبیاء علیہم السلام کی حیات برزخیہ کا ہے کہ وہ شہید کی حیات سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہے چنانچہ اس کا ایک اثر تو محسوس ہے اور وہ وہی ہے جو شہید کے لئے ہے کہ ان کے جسم مبارک کو زمین نہیں کھا سکتی حدیث میں ہے۔ حوتم اَجساد الانبیاء علی الارض۔ اور دوسرا اثر محسوس تو نہیں مگر منصوص ہے اور حرمت نکاح ازواج انبیاء علیہم السلام ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ازواج مطہرات بعد ان کے وصال کے کسی امتی کو نکاح جائز نہیں نیز انبیاء علیہم السلام کی میراث ورثہ میں نہیں ہوتی۔ نحن معاشر الانبیاء لا نورث ما ترکنا صدقۃ انبیاء علیہم السلام نام تو کہ صدقہ ہوتا ہے یہ باتیں شہید کے لئے شریعت نے مشروع نہیں کیں۔ تو اگرچہ شریعت اس کا کوئی خاص راز نہیں بیان کیا۔ مگر علماء محققین یہی کہتے ہیں اس کا راز قوت حیات انبیاء علیہم السلام ہے کہ حیات مانع ہے ان دونوں امر سے۔ اور گواہ ازواج نبی سے بعد وفات نبی نکاح حرام ہونا تمام انبیاء علیہم السلام کے بارے میں منقول نہیں ہوا۔ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ خصوصیت قرآن میں ذکر کی گئی ہے مگر علماء میراث پر قیاس کر کے اس

لہ اللہ کے نبی اپنی قبر میں بلاشبہ زندہ ہیں رزق پاتے ہیں

انبیاء کے جسموں کو زمین پر اللہ نے حرام کر دیا ہے۔

حکم کو بھی عام جملہ انبیاء علیہم السلام کی ازواج کے لئے سمجھتے ہیں اور میراث کا تقسیم ہونا حدیث سے جملہ انبیاء علیہم السلام کے لئے عام طور پر معلوم ہو چکا ہے تو ان امتیازات سے حیات برزخیہ انبیاء کا شہدار اور عوام مومنین سے اقویٰ ہونا ثابت ہوا بہر حال یہ بات باتفاق امت ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام قبر میں زندہ رہتے ہیں۔

نبی کریم کی حیات

اور خاص ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں تو مخالفین بھی حیات کے معتقد ہیں ان کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کا اقرار ہے چنانچہ ایک واقعہ سے ان کا اقرار معلوم ہوا۔ تاریخ مدینہ میں یہ واقعہ لکھا ہے اور میں نے خود اس تاریخ میں دیکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند صدی بعد یاد نہیں رہا کہ کس بادشاہ کے وقت میں، وہ شخص مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر کو نکالنے کے لئے آئے تھے مسجد نبویؐ کے پاس ایک مکان کریم پرے لیا تھا اور دن بھر نماز و تسبیح میں مشغول رہتے تھے لوگ ان کے معتقد بھی ہو گئے تھے وہ کم نخت رات کے وقت اس مکان سے قبر شریف کی طرف سرنگ کھودتے تھے۔ اور جس قدر سرنگ کھودتے راتوں رات مٹی مدینہ سے باہر پھینک آتے تھے اور جگہ جگہ برابر کر دیتے تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ کسی ہفتہ تک وہ لوگ سرنگ کھودنے میں مشغول رہے جب ادھر ان لوگوں نے یہ کام شروع کیا حق تعالیٰ نے اس زمانہ کے سلطان کو (نام یاد نہیں رہا) بذریعہ خواب کے متنبہ کر دیا۔

سلطان مدینہ کا خواب

خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کے چہرہ مبارک پر حزن و غم کے آثار ہیں اور آپ اس بادشاہ کا نام لے کر فرما رہے ہیں کہ مجھے ان دو شخصوں نے بہت ایذا دے رکھی ہے۔ جلد مجھے ان سے نجات دو۔ خواب میں دونوں شخصوں کی صورت بھی بادشاہ کو دکھلا دی گئی۔ خواب سے بیدار ہو کر بادشاہ نے وزیر سے اس کا تذکرہ کیا وزیر نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں کوئی حادثہ پیش آیا ہے آپ جلد مدینہ تشریف لے جائیں۔ بادشاہ نے فوراً فوج کے ساتھ کے کر بہت تیزی کے ساتھ مدینہ کی طرف سفر کیا۔ اور بہت جلد مدینہ پہنچ گیا۔ اس عرصہ میں وہ لوگ بہت سرنگ کھود چکے تھے اور بالکل جسد اطہر کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ایک دن کی بادشاہ کو اور تاخیر ہوئی

تو وہ لوگ اپنا کام پورا کر لیتے۔ بادشاہ نے مدینہ پہنچ کر تمام لوگوں کی مدینہ سے باہر دعوت کی اور سب کو مدینہ سے ایک خاص دروازے سے باہر نکلنے کا حکم کیا۔ اور خود دروازہ پر کھڑے ہو کر ہر شخص کا چہرہ خوب غور سے دیکھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ مدینہ کے سب مرد و شہر سے باہر نکل آئے مگر ان دو شخصوں کی صورت نظر نہ پڑی جن کو خواب میں دیکھا تھا۔ اس لئے بادشاہ کو حیرت سخت ہوئی۔ اور لوگوں سے کہا کیا سب لوگ باہر گئے۔ لوگوں نے کہا اب کوئی اندر نہیں رہا۔ بادشاہ نے کہا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا ضرور کوئی اندر رہا ہے۔

سرنگ کھودنیوالے پکڑے گئے

لوگوں نے کہا کہ دوزاہد اندر رہ گئے ہیں وہ کسی کی دعوت میں جایا نہیں کرتے اور نہ کسی سے ملتے ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ مجھے ان سے کام ہے چنانچہ جب وہ پکڑ کر لائے گئے تو بعینہ وہ دو صورتیں نظر پڑیں جو خواب میں دکھلاتی گئی تھیں ان کو فوراً قید کر لیا گیا اور پوچھا گیا کہ تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ایذا دی ہے۔ چنانچہ بڑی دیر کے بعد انہوں نے اقرار کیا کہ ہم نے جسد اطہر سرنگ کھودنے کے لئے سرنگ کھودی ہے۔ چنانچہ خود بادشاہ نے وہ سرنگ دیکھی تو معلوم ہوا کہ قدم مبارک تک پہنچ چکی ہے۔ بادشاہ نے قدم مبارک کو بوسہ دے کر سرنگ بند کروادی اور زمین کو پانی کی تہہ تک کھدوا کر قبر مبارک کے چاروں طرف سیسہ پلا دیا تاکہ آئندہ کوئی سرنگ نہ لگا سکے اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ مخالفین کو بھی جسد اطہر کے صحیح سالم ہونے کا ایسا پختہ اعتقاد ہے کہ کسی سو برس بعد بھی اس کے کالنے کی کوشش کی۔ اگر ان کو جسد اطہر کے محفوظ ہونے کا یقین نہ ہوتا تو وہ سرنگ ہوں لگاتے۔ محض وہم و شبہ پر اتنا بڑا خطرہ کا کام کوئی نہیں کرتا وہ لوگ اہل کتاب ہیں وہ بھی خوب سمجھتے ہیں کہ نبی کے جسم کو زمین نہیں کھا سکتی۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی برحق تھے بوجہ عناد کے اقرار نہیں کرتے۔ عرض کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد اطہر موافقین و مخالفین سب کے نزدیک بالاتفاق محفوظ ہے۔

(المجہور ص ۱۱)

(۷۶) علم تجوید سے لاپرواہی کرنا ٹھیک

نہیں

تجوید کی یہاں تک ضرورت ہے کہ بعض دفعہ اس کی مخالفت سے عربیت جاتی رہتی ہے اور جب لفظ عربیت ہی سے نکل گیا تو قرآن ہی نہ رہا۔ جب نماز میں قرآن نہ پڑھا گیا تو نماز کیسے صحیح ہوگی۔ شاید یہ بات آپ کو عجیب معلوم ہوتی ہو کہ تجوید کے نہ ہونے سے عربیت نہیں رہتی مگر میں دلیل سے اس کو ثابت کرتا ہوں سب کو معلوم ہے کہ عربی فارسی اردو جدا جدا زبانیں ہیں اور ہر ایک کے خواص الگ الگ ہیں پس جس طرح کسی لفظ کے فارسی یا اردو ہونے کے لئے تلفظ کی صحت شرط ہے اسی طرح لفظ کے عربی ہونے کے لئے بھی تلفظ کا صحیح ہونا شرط ہے مثلاً آپ ایک کپڑے کو گاڑھا کہتے ہیں اس میں ”ڈ“ کا ہونا اور ہائے محفّی کا ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے بجائے گارا کہے تو آپ اس کو غلط کہیں گے کیونکہ گارا تو مٹی کا ہوا کرتا ہے۔ کپڑے کی کوئی قسم گارا نہیں ہے۔ اسی طرح سمجھئے کہ عربی میں جو لفظ ”ثا“ سے مرکب ہے وہاں ”سین“ یا ”صاد“ پڑھ دیئے سے یا ”حا“ کی ”ھا“ پڑھنے سے تلفظ غلط اور معنی بدل جاویں گے اس سے تو صحت الفاظ کی ضرورت معلوم ہوئی اب صفات کی بابت میں لکھتا ہوں کہ اردو میں ایک لفظ پنکھا ہے جس میں ”نون“ کے خفاء کے ساتھ بولا جاتا ہے اسی طرح رنگ سنگ اور جنگ ہیں جو فارسی الفاظ ہیں نون کو ظاہر کر کے نہیں پڑھا جاتا۔ اب اگر کوئی پنکھے کو باظہار نون پن کھا کہے یا رنگ کو رنگ گ کہتے تو آپ کہیں گے کہ اردو فارسی نہیں رہی محض لفظ ہو گیا لیکن اس کے کہنے سے یا آپ بندھ گئے اس طرح کہ جب اس لفظ میں اظہار نون سے آپ نے اس کا غلط ہونا اور اردو زبان سے نکل جانا مان لیا تو جن لفظوں میں عربی زبان میں اخفاء ہے وہاں بھی ماننا پڑے گا کہ اظہار نون سے وہ لفظ عربی نہیں رہتا تو کیا اب بھی تجوید کی ضرورت میں کسی کو کلام ہو سکتا ہے۔

تجوید سیکھنا فرض ہے

میں تو کہتا ہوں کہ تجوید کا سیکھنا فرض ہے کیونکہ قرآن عربی زبان میں ہے جس کا عربی میں پڑھنا فرض ہے۔ اور عربیت کے موافق صحیح تلفظ بدو

تجوید کے نہیں آ سکتا تو تجوید کا سیکھنا فرض ہوا۔ صاحبو! چاہے آپ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے ادھر متوجہ نہ ہوں مگر تجوید کی فی نفع بہت ضرورت ہے۔ اور افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس طرف اس لئے توجہ نہیں کہ اس میں دنیا کا بظاہر کوئی نفع نہیں اگر آج ملازمت کے لئے یہ قانون ہو جائے کہ جس کا قرآن باقاعدہ صحیح ہوگا اس کو ملازمت دی جائے گی تو آج یہ سارے بی۔ اے۔ ایم اے قاری ہو جائیں ہم لوگ متاع دین کے لئے سب کچھ کر لیتے ہیں۔ اس لئے یہ سارے عذر جو بیان کئے جاتے ہیں محض بہانے ہیں۔ (اسباب الفتنہ ص ۲۶)

۷۷۔ علماء کا باہمی اختلاف اور ہمارا فرض

یہ بہت کٹھن سوال ہے جس نے مسلمانوں کو اس وقت پریشان کر رکھا ہے وہ دیکھتے ہیں کہ علماء میں باہم سخت اختلاف ہے کوئی ایک بات کو حرام کہتا ہے تو دوسرا اس کو جائز کہتا ہے کوئی ایک بات کو سنت کہتا ہے تو دوسرا اسے بدعت بتلاتا ہے اب کس کی مانیں اور کس کی نہ مانیں یا تو سب پر عمل کریں یہ تو غیر ممکن ہے یا ایک کو دوسرے پر ترجیح دیں۔ تو ترجیح کی وجہ کیا۔ لہذا بعض نے تو یہ فیصلہ کیا کہ سب کو چھوڑ دو۔ صاحبو! مجھے اس فیصلہ کی تو شکایت نہیں، مگر رونا اس کا ہے کہ جب یہی صورت اختلاف فنون دنیا کے ماہروں میں پیش آئی تو وہاں آپ نے یہ فیصلہ کیوں نہیں کیا۔ وہاں کسی ایک کو ترجیح دیکر کیوں پکڑا۔ یعنی بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی مریض کے علاج میں اطباء اور ڈاکٹروں کی رائے مختلف ہوتی ہے کوئی کچھ مرض کی تشخیص کرتا ہے۔ کوئی کچھ۔ اور ہر ایک اپنی رائے کو صحیح بتلاتا ہے اور دوسرے کی رائے پر عمل کرنے کو مریض کے لئے مہلک بتلاتا ہے۔ وہاں آپ نے سب حکیموں کو کیوں نہیں چھوڑا اور یہ کیوں نہیں کہا کہ افسوس اطباء میں اتفاق ہی نہیں۔ اب ہم کس کا علاج کریں بس جاؤ مریض کو مرنے دو۔ ہم کسی کا

بھی علاج نہیں کرتے۔ وہاں ایک حکیم کو ترجیح دیکر اس کا علاج کیوں کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا اپنے دکلا کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کیوں نہیں کیا۔ جو علماء کے ساتھ کیا گیا ہے کیا دکلا میں باہم اختلاف نہیں ہوتا ہے اور یقیناً ہوتا ہے پھر وہاں ایک وکیل کو دوسرے پر کیوں ترجیح دی جاتی ہے اور سب کیوں نہیں چھوڑا جاتا۔ اس کا جواب آپ کے پاس کیا ہے۔؟

لیجے میں ہی اس کا جواب بھی دیئے دیتا ہوں۔ جو ضروری سمجھنے کے بعد ایک گہری بات ہے۔ وہ یہ کہ دو قسم کی چیزیں ہوتی ہیں

ایک وہ جن کو ضروری سمجھا جائے دوسرے وہ جن کو ضروری نہ سمجھا جائے۔ جن باتوں کو ضروری سمجھا جاتا ہے ان کو تو کسی اختلاف کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاتا۔ بلکہ وہاں آدمی اپنی عقل سے تدبیر سوچتا ہے اور باوجود اختلاف کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دے لیتا ہے اور جن باتوں کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی ان کو اختلاف وغیرہ کی صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے وہاں تدبیر و تامل سے ایک کو ترجیح دینے کی مشقت گوارا نہیں کی جاتی۔ یہ قاعدہ ہے طبیعت انسانیہ کا۔ اسی کے موافق یہاں عمل کیا گیا ہے کہ انسان میں دو چیزیں ہیں۔ جان اور ایمان جان چونکہ عزیز ہے اس لئے اس کی صحت و حفاظت کے اسباب میں اختلاف ہونے سے سب کو ترک نہیں کیا جاتا بلکہ وہاں یہ قاعدہ نکالا جاتا ہے کہ اہل کمال میں تو اختلاف ہوا ہی کرتا ہے۔ اس سے گھبرانا نہیں چاہیئے ہم اپنی عقل سے اور اپنے خیر خواہوں سے دریافت کریں گے کہ ان سب حکیموں اور ڈاکٹروں میں کون سب سے زیادہ حاذق ہے بس اس کا علاج اختیار کر لیں گے۔ اور ایمان عزیز نہیں اس لئے علماء کے اختلاف میں عقل سے کام لینا اور غور و تامل کی محنت برداشت کرنا گوارا نہیں۔ تو اسے صابو باگر آپ ایمان کو بھی عزیز سمجھتے ہیں تو علماء میں بھی اسی طرح انتخاب کرتے جس طرح حکما میں کیا جاتا ہے۔ مگر افسوس! آپ کو ایمان عزیز نہیں اس لئے صاف سب کو چھوڑ دیا میں یہ نہیں کہتا کہ اس اختلاف میں مولویوں کی خطا نہیں ہے بلکہ ضرور ہے اور آگے میں یہ بھی بتلا دوں گا کہ ان میں سے خطا کس کی ہے مگر آپ کی اتنی شکایت ضرور کروں گا کہ اس اختلاف کی وجہ سے سب کو چھوڑ دینا یہ بے ترتیب اور غلط رائے ہے جو ایمان کو عزیز نہ سمجھنے کی علامت ہے۔ بعض لوگ اس اختلاف کو دیکھ کر علماء کو رائے دیتے ہیں کہ سب مولویوں کو متفق ہو جانا چاہیئے نا اتفاقی بُری چیز ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا نا اتفاقی علی الاطلاق جرم ہے۔ یا اس

کے لئے کوئی قید بھی ہے اگر نا اتفاقی علی الاطلاق جرم ہے اور اس کی وجہ سے ہر فریق مجرم ہو جاتا ہے تو عدالت کو چاہیئے کہ جب اس کے پاس کوئی مدعی دعویٰ پیش کرے تو قبل تحقیق مقدمہ ہی مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو سزا کر دیا کرے کیونکہ دعویٰ اور انکار سے دونوں میں نا اتفاقی کا ہونا ثابت ہو گیا۔ اور نا اتفاقی علی الاطلاق جرم ہے۔ تو مدعی اور مدعا علیہ دونوں مجرم ہوئے۔ اگر عدالت ایسا کرے تو سب سے پہلے آپ ہی مخالف ہوں گے اور دنیا بھر میں شمول غل مچا دیں گے کہ یہ کون سا انصاف ہے؟ کہ تحقیق مقدمہ سے پہلے ہی دونوں کو مجرم بنا دیا گیا۔ اب اگر کوئی آپ سے پوچھے کہ پھر کیا کرنا چاہیئے تھا۔ تو آپ عاقل بن کر یہ رائے دیں گے کہ عدالت کو تحقیق کرنا چاہیئے تھا کہ مدعی اور مدعا علیہ میں جو باہم مخالفت و نا اتفاقی ہے ان میں سے حق پر کون ہے اور ناحق پر کون ہے جو حق پر ہوگا اس کی حمایت کی جاتی اور جو ناحق پر ہوگا اس کو سزا دی جاتی۔ لیجئے آپ ہی کے فیصلے سے ثابت ہو گیا کہ نا اتفاقی علی الاطلاق جرم نہیں بلکہ نا اتفاقی تو جرم ہے جو ناحق ہو۔ اور جو نا اتفاقی حق ہو وہ جرم نہیں اور اگر کسی معاملہ میں دو فریق ہو جائیں تو ہر فریق کو مجرم نہیں کہا جاسکتا بلکہ جس کی مخالفت ناحق ہو وہ مجرم ہے۔ اور جو حق ہو وہ مجرم نہیں۔

پس علماء کی باہم نا اتفاقی اور اختلاف سے آپ کا سب علمسار کی نا اتفاقی کو مجرم بنانا اور ہر فریق سے یہ کہنا کہ دوسرے اتفاق کر لو۔ غلط رائے ہے بلکہ اول آپ کو تحقیق کرنا چاہیئے کہ

حق پر کون ہے پھر جو ناحق پر ہو اسے مجرم بنائے اور اس کو اہل حق کے ساتھ اتفاق کرنے پر مجبور کرنے کے تو یہ معنی ہوں گے کہ وہ حق کو چھوڑ کر ناحق طریق اختیار کر لیں اور اس کو کوئی عاقل تسلیم نہیں کر سکتا۔ تو اتنی شکایت آپ کی رہ گئی۔ کہ آپ قبل از تحقیق ہی سب کو متفق ہو جانے کی رائے دیتے ہیں اور مولویوں کی شکایت ہم کو بھی ہے مگر صرف ان کی جو ناحق پر ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ صاحب دوسرا فریق بھی اتفاق سے مجبور ہے کیوں کہ ان کی سمجھ میں یوں ہی آیا وہ اسی کو حق سمجھتے ہیں جو ان کی سمجھ میں آیا ہے تو جناب ایسا اختلاف رحمت ہے اس اختلاف سے فتنے اور فساد کی لذت نہیں آیا کرتی۔ دیکھئے ائمہ اربعہ میں سمجھ ہی کا تو اختلاف ہے مگر اس کے ساتھ پھر سب متفق ہیں کوئی ایک دوسرے پر ملاحت و طعن نہیں کرتا بلکہ ہر ایک سب کو حق پر سمجھتا ہے اگر ایسا اختلاف ہوتا تو۔

مسلمانوں کو آج پریشانی نہ ہوتی جو آنکھوں سے نظر آرہی ہے بلکہ یہ اختلاف تو رویوں کا ہے۔

میں کہا کرتا ہوں کہ اگر اہل حق کے پاس کافی زور
اختلاف کی بنیادی وجہ ہو۔ اور وہ ان سب فرقوں کی تنخواہیں مقرر کریں

تو سارا اختلاف ایک دن میں مٹ جائے۔
سارا اختلاف پیٹ کی وجہ سے ہے۔ کہ کوئی مولود پر زور دیتا ہے۔ کوئی فاتحہ پڑھ کر، کوئی
تیجے دسویں پر۔ ایک عالم صاحب سے جو بدعات کے بڑے حامی ہیں کسی نے سوال کیا کہ
تم مولود و فاتحہ کو سنت کہتے ہو اور ان پر بہت زور دیتے ہو اور جو ان سے منع کرے
اس کو برا بھلا کہتے ہو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تمہاری مستورات بہشتی زیور پڑھتی ہیں (اللہ کی
شان ہے کہ اس کتاب کو سب مسلمان اپنی مستورات کے لئے بخور کرتے ہیں) خواہ وہ
کسی خیال کے ہوں۔ چنانچہ ان عالم صاحب کی مستورات بھی بہشتی زیور پڑھتی تھیں،
تو انہوں نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ سارا اختلاف تو اس کی خرابی
ہے ورنہ حق وہی ہے جو بہشتی زیور میں لکھا ہے میں نے ایک دفعہ لکھنؤ میں دیکھا کہ
ہر کھانے پر الگ الگ فاتحہ دی جا رہی ہے پھر وہاں بیان کی فرمائش ہوتی تو میں نے
اس بیان میں کہا کہ فاتحہ و درود کے سنت اور بدعت ہونے کا امتحان بہت آسانی
سے اس طرح ہو سکتا ہے کہ جو مولوی صاحب مولود پڑھیں یا فاتحہ دیں ان کو کچھ نہ
دیا جائے ان سے خوب مولود پڑھاؤ اور الگ الگ ہر رکابی پر فاتحہ دلواؤ۔ مگر نذرانہ
کچھ نہ دو نہ ٹٹھائی کا دو ہر حصہ دو پھر دیکھنا وہ خود ہی اس کو فضول اور بدعت کہنے
لگیں گے چنانچہ بعض لوگوں نے اس پر عمل کیا تو اسی روز شام کو آکر فاتحہ خواں صاحب
کہنے لگے کہ واقعی یہ تو ایک فضول ساقصہ معلوم ہوتا ہے کہ الگ الگ فاتحہ ہو ایک
ہی کافی ہے۔ میں نے جی میں کہا کہ اب تو معلوم ہو ہی گا۔ صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ
ان کی آمدنی بند کر دو تو وہ خود ہی کہنے لگیں گے کہ یہ سب فضول قصہ ہے۔ یہ ساری
باتیں روٹیاں کھانے کی ہیں۔ جب ایک سال طاعون کا بہت زور ہوا۔ تو میں دیکھ
رہا تھا کہ چنے پڑھوانا فاتحہ دلانا اور تیجہ دسواں سب موقوف ہے۔ میں دیکھتا رہا جب
طاعون کا زور ختم ہو گیا تو میں نے لوگوں سے کہا کہ کیوں جناب وہ چنے اور فاتحہ

کہاں گئے اور وہ اب وہ تیجے دسویں کیوں نہیں ہوتے۔ کہنے لگے۔ اچی ان باتوں کی کسے
فرصت تھی۔ میں نے کہا چھوڑا۔ کہا نہیں۔ میں نے کہا۔ بس سمجھ لو جو کام حذف ہو گئے وہ
دین کے کام نہ تھے بلکہ فرصت کی باتیں تھیں اور یہ دین کے کام تھے اس لئے کم فرصتی میں بھی
ترک نہ ہوئے۔ بس خاموش ہی تو ہو گئے۔

اسی طرح گاؤں کے ایک صاحب کہنے لگے
فاتحہ مروجہ کا نقصان

کہ فاتحہ میں حرج کیا ہے بلکہ فائدہ ہے کہ اسیں
سورتوں کا ثواب بھی مردہ کو پہنچ جاتا ہے۔ میں نے
کہا یہ فائدہ تو کھانے کے ساتھ مخصوص نہیں روپے پیسے اور کپڑے میں بھی ہو سکتا ہے پھر
کبھی اللہ کے نام کے روپے پیسے اور کپڑے پر فاتحہ پڑھی کبھی نہیں۔ میں نے کہا کیوں
نہیں پڑھی مردہ کو فائدہ ہی ہوتا۔ سورتوں کا ثواب پہنچ جاتا۔ کہنے لگے اچی بس سمجھ میں آ گیا۔
تم سچ کہتے ہو۔ صاحبو! یہ بالکل کھلی ہوئی باتیں ہیں یہ سارے قصے محض آمدنی کے
واسطے نکلے گئے ہیں۔ اگر ان فاتحہ مولود پڑھنے والوں کی آمدنی بند کر دی جائے تو
پھر دیکھئے وہ بھی وہی کہیں گے جو ہم کہتے ہیں اس مجلس میں سنت و بدعت کی تحقیق بیان
نہیں کی بلکہ وہ باتیں بیان کر دی ہیں جو بہت موٹی ہیں جن سے ہر شخص کو آسانی حق کا پتہ
چل سکتا ہے اگرچہ محمد اللہ سنت و اطاعت کی شناخت کے حقیقی اصول بھی
اپنے پاس موجود ہیں۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز۔

و نہ در مجلس رنداں خبر نیست کہ نیست۔

ہاں اگر کوئی طلب ظاہر کرے اور ہمارے پاس آکر رہے تو اس کو وہ اصول
بھی بتلا دیں گے۔

اختلاف محل شکایت نہیں

غرض میں کہہ رہا تھا کہ اختلاف علی الاطلاق
محل شکایت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ پہلے آپ
حق متعین کیجئے اس کے بعد دیکھئے کہ علماء
مختلفین میں سے حق پر کون لوگ ہیں اور ناحق پر کون، اس طرح محقق اور غیر محقق کی پہچان
ہو جائیگی۔ جس کی میں ایک آسان ترکیب بتلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ دو قسم کے لوگ ہیں

بعض تو لکھے پڑھے ہیں خواہ اردو ہی ہیں لکھے پڑھے ہوں اور بعض ان پڑھے ہیں پہلے طبقہ کے لئے تو تحقیق حق کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سب علماء کی کتابیں دیکھیں مگر دونوں کے علماء کی کتابیں خالی الذہن ہو کر انصاف سے دیکھیں۔ پہلے کسی کی طرفداری اور حمایت کا خیال دل میں نہ لائیں کیونکہ اعتقاد کے بعد اس کی ہر بات اچھی معلوم ہوگی اور عیب نظر نہ آئے گا۔ سو تحقیق حق کا یہ طریقہ نہیں بلکہ اس کا طریقہ یہی ہے کہ خالی الذہن ہو کر دونوں کی کتابوں کا مطالعہ انصاف کے ساتھ کیا جائے۔ خدا کے ساتھ معاملہ ہے۔ اس کو پیش نظر رکھ کر دیکھنا چاہیے انشاء اللہ تعالیٰ اگر طلب حق ہے تو بہت جلد آپ کے ذہن میں جو خود بخود حق واضح ہو جائے گا۔ جب ایک کا حق ہونا معلوم ہو جائے تو بس اسی سے تعلق رکھو۔ اور اسی سے دین کی باتیں اور خدا کا راستہ دریافت کرو۔ مگر دوسرے کو بھی برا نہ کہو کیوں کہ کسی کا برا کہنے سے تمہارا کیا بھلا ہو جائے گا بس تم اپنی یہ حالت رکھو۔

ہمیشہ پر زخواہاں منم و خیال ما ہے۔
چرخ منم کہ چشم بدخونہ کر بکسنگا ہے۔

دل آرامیکہ داری دل درد بند و گر چشم از ہمہ عالم فرد بند
اگر کوئی برا بھی ہو تو تم اس کو برا نہ کہو۔ وہ اگر برا ہے۔ تو تم کو کیا۔ اور اگر دوسرا تم کو برا کہے جب بھی تم اسے برا نہ کہو۔ ذوق نے خوب کہا ہے۔
تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوق! ہے برا وہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے
اگر تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے۔ پھر برا کہنے سے کیوں سکے برا ماننا ہے

یہ طریقہ تو پڑھے لکھوں کے واسطے ہے اور جو بے پڑھے ہوں وہ یہ کریں کہ دو مولویوں کے پاس جا کر ایک

مولوں کی صحبت میں رہ کر دیکھے

ایک ہفتہ رہیں اور جو وقت ان کی فرصت کا ہو دریافت کرنے سے معلوم ہو جائے گا اسمیں ان کے پاس بیٹھیں اور ان کی باتیں سنیں اور دیکھیں جو مسائل متفق علیہ ہیں ان کی پابندی کا کس کو زیادہ اہتمام ہے اور نیز یہ کہ کس کے پاس جا کر کیا اثر ہوتا ہے۔ اگر کسی کے پاس جا کر آخرت کی رغبت پیدا ہو عبادت الہی کا شوق بڑھے اور خدا کی نافرمانی سے دل میں نفرت اور خوف پیدا ہو۔ اور اس کے پاس رہنے والوں کی زیادہ تر حالت اچھی ہو تو

بس اس کو اختیار کر لیں۔ اسی سے ہر بات پوچھا کریں اور اس کی صحبت میں گاہے گاہے آیا جایا کریں اور یہ طریقہ پڑھے لکھوں کو بھی بہت مفید ہے۔ محض کتابوں کے مطالعہ سے کسی عالم کی اصلی حالت ایسی نہیں معلوم ہوتی۔ جیسے پاس رہنے سے معلوم ہوتی ہے۔ اسلئے وہ بھی اگر یہ طریقہ اختیار کریں تو زیادہ بہتر ہے۔ (اسباب الفتنہ ص ۵۵)

(۷۸) بعض لوگ کہتے ہیں کہ روزے صرف تین ہی ہونے چاہئیں، اس کی ترشید!

ایک اشتہار میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ روزے صرف تین ہی ہونے چاہئیں۔ یعنی گیارہویں۔ بارہویں۔ تیرہویں۔ اور اس پر دلیل کیا خوب صورت لائے۔ اس کو بھی سنئے۔ آپ نے یوں استدلال کیا کہ روزے کے بارے میں قرآن میں آیت ہے آیامامعدودات۔ یعنی چند روز۔ جس کا اصلی مطلب تو یہ ہے کہ ہماری ہمت بڑھانے کے لئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ روزہ کے تھوڑے ہی دن میں۔ گھر اور نہیں۔ مگر آپ نے اس میں یہ اجتہاد کیا کہ حج کے بارہ میں بھی یہی لفظ آیا ہے۔ آیامامعدودات اور وہاں آیامامعدودات سے ہی گیارہویں، بارہویں۔ تیرہویں۔ تاریخیں مراد ہیں۔ جب وہاں حج میں آیامامعدودات سے یہ مراد ہیں تو یہاں صوم میں بھی وہی مراد ہیں۔ کیونکہ۔ القرآن یفسر بعضہ بعضاً۔ حالانکہ القرآن یفسر بعضہ بعضاً کے قاعدہ سے وہاں کام لیا جاتا ہے جہاں ایک آیت کی تفسیر معلوم معلوم اور دوسرے کی تفسیر معلوم نہ ہو۔ اور یہاں تو دونوں کی تفسیر الگ الگ معلوم ہے مگر اس اندھے نے تو ایک جگہ کی تفسیر لے لی اور دوسری جگہ کی تفسیر نظر انداز کر دی میں کہتا ہوں کہ اگر آیامامعدودات سے بقرینہ دوسری آیت کے گیارہویں، بارہویں، تیرہویں، مراد ہوں تو یہ تاریخیں تو ذی الحجہ کا روزہ رکھنا قرآن سے۔ گیارہویں۔ بارہویں۔ تیرہویں ذی الحجہ کا روزہ رکھنا قرآن سے ثابت ہوگا اور یہ ہیں آیام تشریق۔ ان میں روزہ رکھنا اجماعاً بالکل حرام ہے تو قرآن سے ایسے ایام کا روزہ رکھنا فرض ہوگا جس کا روزہ رکھنا اجماعاً بالکل حرام ہے۔ اچھا اجتہاد کیا۔ اور نیز میں کہتا ہوں کہ اگر ہر جگہ آیامامعدودات سے بھی گیارہویں، بارہویں۔ تیرہویں۔

مراد ہیں تو یہود نے جو کہا ہے لَنْ تَسْنَأَ النَّارُ إِلَّا اِيْتَامًا مَّعْدُودَاتٍ کہ ہم کو دوزخ میں تھوڑے دن رہنا پڑے گا تو کیا وہاں بھی تین ہی دن مراد ہیں۔ ایمان سے کوئی بتلا دے کہ کیا یہود کی یہی مراد تھی کہ فقط گیارہویں۔ بارہویں، تیرہویں کو دوزخ میں رہنا پڑے گا۔ اور وہ بھی ذی کج ہی ہیں۔ اگر یہاں بھی یہی مراد ہے تو یہ ایسا ہو کہ جو کالا وہی میرے باپ کا سالار غرض اسی طرح لوگوں نے فتنے ایجاد کئے ہیں کوئی کہاں تک ان کا انسداد کرے بغیر حکومت کے ہو نہیں سکتا کوئی سلطنت اسلام کی ہوتی وہ ان کو بند کرتی۔ (اجرا الصیام من غیر انصرام حصہ اول ص ۹)

۷۹) اس شبہ کا جواب کہ تبلیغ عذر سے ساقط

ہوتی ہے یا نہیں

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے آپ امر بالمعروف شروع کر دیں جب کام شروع کر کے کہیں گاڑی اٹکے گی اس وقت استفتار کر لینا اچھی سے اعذار کے حکم دریافت کرنے کا آپ کو حق نہیں۔ بلکہ اس وقت اعذار کا حکم دریافت کرنا گویا جان بچانے کی تدبیریں ڈھونڈنا ہے سب مسلمان جانتے ہیں کہ شریعت نے طاقت سے زیادہ کوئی حکم نہیں دیا۔ مگر پھر بھی اس قسم کے عذر کو دوسرے کاموں کی بابت کوئی پیش نہیں کرتا۔ مثلاً وضو بعض دفعہ عذر سے ساقط ہو جاتا ہے اور نماز میں قیام عذر سے ساقط ہو جاتا ہے مگر جس وقت نماز کے لئے کسی کو کہا جاتا ہے۔ وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ پہلے مجھے یہ بتلا دو کہ وضو اور قیام کن کن عذروں سے ساقط ہو جاتا ہے کیونکہ وہاں آپ نماز کے پڑھنے کو ضروری سمجھتے ہیں اور عذر کو عارضی۔ اسی طرح کھانے میں بھی کسی نے طبیب سے نہیں پوچھا کہ حکیم جی کھانے کے شرائط بتلا دو۔ اور یہ بھی سمجھا دو کہ کس وقت چھوڑ دیا جائے کیونکہ یہاں بھی کھانے کو ضروری اور نہ کھانے کو عارضی سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح رمضان میں جو لوگ روزہ رکھتے ہیں وہ کبھی پہلے یہ نہیں پوچھتے کہ مولوی صاحب روزہ کن کن وجوہ سے ساقط ہو جاتا ہے بلکہ کوئی اگر ایسا سوال کرے تو اس کی نسبت عام طور پر یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ شاید روزہ نہ رکھنے کے ارادے ہیں۔ حساب آپ کو چاہیے تھا کہ آپ امر بالمعروف شروع کرتے پھر کسی وقت یا وجاہت آدمی کو خلاف

شرع وضع پر نصیحت کرنے یا کافر کو تبلیغ اسلام کرنے میں گاڑی اٹکتی اس وقت مولوی صاحب سے پوچھتے کہ اس موقع پر کیا کروں یہ کیا کہ آپ نہ حاکم کو امر بالمعروف کریں۔ نہ محکوم کو، نہ مسلم کو نہ کافر کو۔ نہ بیوی کو۔ نہ اولاد کو، اور پہلے ہی سے لگے عذر کا حکم دریافت کرنے۔ شاید آپ یہ کہیں کہ نماز روزہ میں تو عذر کم پیش آتے ہیں اور امر بالمعروف میں تو اکثر پیش آتے رہتے ہیں میں کہتا ہوں کہ یہ خیال غلط ہے۔ اپنے گھر والوں کو امر بالمعروف کرنے میں کون سا عذر نالغ ہے۔ بیوی نے نماز نہ پڑھی تھی اس کو نصیحت کرتے میں کیا خوف تھا کیا وہ آپ کو مار ڈالیگی یا لڑکانا ز نہیں پڑھتا تو وہ آپ کا کیا کرے گا اگر آپ کہیں کہ وہ سنتا نہیں ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ اگر وہ کبھی امتحان میں فیل ہو جائے تو اس وقت اس کو کیوں مارتے ہیں اور کیوں سزا دیتے ہیں۔ اس وقت وہ آپ کی بات کیونکر سننے لگتا ہے۔ پس یہ سب بہانے لغو ہیں۔ اصل بات وہی ہے کہ آپ اس کو ضروری ہی نہیں سمجھتے بھلا اگر آپ کا کوئی دوست آپ کے سامنے زہر کھانے لگے تو کیا آپ اس کو نہیں روکیں گے یقیناً ہاتھ پیر کر زور سے جھٹکا دیکر زہر کو اس کے ہاتھ سے لے لیں گے اگر تنہا قادر نہ ہوں گے تو دوسروں کو امداد کے واسطے بلائیں گے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ دین میں جو افعال مضر ہیں ان کے روکنے میں اس اہتمام سے کام نہیں لیا جاتا۔ معلوم ہوا کہ آپ دین کے ضرر کو ضرر نہیں سمجھتے اور یہ سخت مرض ہے جس کا علاج بالصدق ہے۔ مگر انسو اس قدر غفلت ہے کہ خدا کی پناہ کسی کو بھی اس مرض کے علاج کی طرف توجہ نہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

(تواصی بالحق حصہ اول)

۸۰) تبلیغ اسلام کا اسلم طریقت

ہر ضلع میں ایک مجلس تبلیغ قائم کر دی جاوے جس کا نام وغیرہ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نہ عہدہ داروں کے نام مقرر کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ آجکل انجمن کے قوانین اور عہدہ داروں کی فہرست میں تو رجسٹر سیاہ کئے جاتے ہیں۔ مگر کام نہیں ہوتا۔ ہم کو کام کرنا چاہیے جتنا جس سے ہو سکے بڑے پیمانہ کی بھی فکر نہ کرو چھوٹے ہی پیمانہ پر کام شروع کر دو۔ ہماری حالت یہ ہے کہ یا تو کام کرتے ہیں ٹیپ ٹاپ سے ورنہ کچھ نہیں کرتے

وہی مثل ہے۔ کھاؤں گا تو گھی سے ورنہ جاؤں گا تو جی سے۔ یہ بڑی حماقت اور غلطی ہے یاد رکھو ابتدا ہر کام کی کمزور اور معمولی ہوتی ہے ترقی تدریجاً ہی ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے اس عالم میں اپنے افعال کو بھی تدریجاً ہی ظاہر کیا ہے کہ اول نطفہ قرار پاتا ہے پھر نو ماہ کے بعد پیدا ہوتا ہے پھر رفتہ رفتہ نشوونما ہو کر پندرہ برس میں لڑکا بالغ ہو جاتا ہے حالانکہ حق تعالیٰ قادر ہیں کہ ایک ہی منٹ میں سب کچھ کر دیں۔ جیسا کہ جنت میں ہوگا۔ کہ جس شخص کو وہاں اولاد کی تمنا ہوگی تو بیوی کے پاس جاتے ہی حمل قرار پا کر فوراً بچہ پیدا ہوگا اور اسی وقت باب کے برابر ہو جائے گا خدا تعالیٰ کا اس عالم میں یہ نمونہ ظاہر نہ کرنا اور تدریجاً افعال ظاہر کرنا ہماری تعلیم ہی کے لئے تو ہے کہ تم دنیا میں ابتداء عمل کے ساتھ ہی ترقی و عروج کے طالب نہ بنو۔ بلکہ چھوٹے پیمانے ہی پر کام شروع کر دو۔ اور اس میں لگے رہو۔ رفتہ رفتہ ایک دن عروج و کمال بھی حاصل ہو جائے گا۔ تم سے جتنا کام ہو سکتا ہے اتنا ہی کرنے لگو۔ تم اسی کے مکلف ہو۔ اس سے زیادہ کے مکلف نہیں حق تعالیٰ اسی میں برکت دیں گے انجن کا نام کرنے اور عہدہ داروں کے مقرر کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ نہ اشتہاروں اور اخباروں میں چھاپنے سے کچھ ہوتا ہے۔ فائدہ کام کرنے سے ہوتا ہے چاہے کھوڑا ہی ہو تو دو چار آدمی ہی مل کر تبلیغ شروع کر دو۔ اور اپنی قلت پر نظر نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ذات پاک کے ذریعہ سے اسلام کو عرب سے تمام دنیا میں پہونچایا ہے سو وہ خدا اب بھی موجود ہے تم اسی پر بھروسہ کر کے کام شروع کر دو۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرات صحابہؓ کی مثال قرآن میں یوں بیان فرمائی ہے۔

فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوْقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ

کہ ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بیج زمین میں بویا جائے تو اول وہ اپنی سوئی، کو نکالتا ہے پھر خدا اس کو پانی ہوا میٹھی وغیرہ سے قوت دیتا ہے تو قوی۔۔۔ مضبوط ہو کر تنہا درخت ہو جاتا ہے۔ سو آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک ذرا سا بیج سے کتنا بڑا درخت پھیلتا ہے جو سارے محلہ پر سایہ لگن ہوتا ہے۔ جب جمادات میں ادنیٰ تخم کی یہ حالت ہے تو انسانوں میں ایک دو آدمی اللہ کے بھروسہ پر کام کریں اور ان کے کام کو قوت و ترقی حاصل ہو جائے تو کیا بعید ہے مگر آجکل مشکل یہ ہے کہ

کام تو شروع نہیں ہوتا اور پہلے ہی سے گیدڑی دوڑتی ہے کہ اس تجویز کو اخباروں میں شائع کرا دیں۔ اشتہار چھپوا دیں۔ صاحبو! کیا یہ ریا نہیں۔ اور کیا ریا وغیرہ سے مانعت نہیں اور وہ مانعت کس کے لئے ہے؟ کیا یہ احکام کفار کے واسطے نہیں؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ مسلمانوں ہی کو ریا وغیرہ سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ کفار مخاطب بالفروع نہیں ہیں۔ بعض اس پر یہ کہا کرتے ہیں کہ ہم اخبارات و اشتہارات کے ذریعہ سے اظہار اسلئے کرتے ہیں کہ دوسروں کو بھی اس سے ترغیب ہوگی۔ م۔

میاں بس رہے دو۔ یہ تو تاویل ہی تاویل ہے ذرا دل کو ٹٹول کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ بجز شہرت اور نام کے کچھ مقصود نہیں۔ اگر کسی کی واقعی غرض ترغیب ہی کی ہو۔ جب بھی اس کو چاہئے کہ اس اشاعت کے اشتہار کے متعلق اول کسی عالم محقق بے غرض سے مشورہ لے۔ (تو اسی بالمحق حصہ اول ص ۴)

۸۱) مجتہدین کے اختلاف کا راز۔

سنن میں امتیاز کرنا کہ شارع کے نزدیک مقصود کون ہے۔ اور غیر مقصود کون ہے کام مجتہدین کا ہے ہر شخص کا کام نہیں۔ اور کبھی اجتہاد میں اختلاف بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے نمازیں رفع یدین ثابت ہے اور عدم رفع بھی ثابت ہے اب یہاں مجتہدین کا اختلاف ہوا۔ ایک مجتہد سمجھے، کہ رفع یدین مقصود ہے اور ترک رفع آپؐ نے جو فرمایا تو بیان جواز کے لئے ہے۔ مقصود نہیں۔ اور ایک مجتہد جو عدم رفع کے قائل ہے وہ کہتے ہیں کہ نمازیں کون چاہیے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا۔ کہ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم نمازیں ہاتھ اٹھاتے ہو۔ (یعنی اذان کے وقت) نمازیں سکون اختیار کرو۔ پس مقصود عدم رفع ہے اور رفع بیان جواز کے لئے فرمایا۔ اور جنہوں نے رفع کو مقصود سمجھا ہے تو وہ اس میں یوں کہتے ہیں کہ یہ رفع جس سے منع فرمایا۔ یہ وہ نہیں ہے جو رکوع میں جانے اور اس سے اٹھنے کے وقت چلا جاتا ہے بلکہ یہ وہ رفع ہے جو کہ سلام پھرنے وقت کیا جاتا ہے۔ جیسا بعض حدیثوں میں اس کی تشریح ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم جب نماز کا سلام پھرتے تو ہاتھ اٹھا کر کہتے السلام

علیکم ورحمۃ اللہ یہ مانت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمائی۔ ہم اس بارے میں یوں کہتے ہیں کہ مانا اس رفع سے وہی رفع مراد ہے مگر اس سے ایک بات تو ضرور نکلی کہ اصل مطلوب نماز میں سکون ہے اور رفع اس کے خلاف ہے۔ پس مواقع مختلف فیہا میں بھی رفع مقصود نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ نماز کی حالت اصلی یعنی سکون کے خلاف ہے۔ اور رفع چونکہ سکون کے موافق ہے اس لئے وہ مقصود ہوگا۔ اسی طرح اور جہاں کہیں اختلاف ہو اسے اسی وجہ سے ہوا ہے کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور ایک نے دوسری چیز کو۔

مثلاً۔ آمین کہنا۔ ایک مجتہد کی رائے یہ ہے کہ مقصود آمین پکار کر کہنا۔ اور اخفاء جو ہوا ہے تو وہ بیان جوا کے لئے۔ اور ایک مجتہد کی رائے ہے کہ مقصود اخفاء

ہے کیونکہ یہ دعا رہے اور دعا میں اخفاء مقصود ہے اگر پکار کر بھی کہہ دیا ہے تو وہ اس تا کہ معلوم ہو جائے کہ آپ آمین بھی کہا کرتے ہیں اگر کبھی پکار کر نہ کہتے تو جہنم ہوتی کہ آپ بھی آپ کہا کرتے ہیں جیسے کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حکمت کے لئے سری نماز میں ایک آیت پکار کر پڑھ دی ہے تسلیم کی غرض سے ایک مجتہد کی رائے یہ ہے اور ایک کی وہ رائے ہے یہ اختلاف کا ہے سے ہوا۔ اسی وجہ سے کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور دوسرے نے دوسری چیز کو۔ اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو آپس میں لڑائی جھگڑے ہی کا خاتمہ ہو جائے۔ بس یہ راز ہے اختلاف مجتہدین کا۔ اسی بنا پر تمام افعال میں اختلاف ہوا ہے۔

(احکام المال ص ۳۲)

(۸۲) درود ابراہیمی علیہ السلام کے افضل ہونیکا
شبہ اور اس کا جواب۔

ایک شہور سوال کا حل یہ ہے کہ اللہ ہم صلی محمد و علیٰ آل محمد

کیما صلیت علی ابراہیم و علی آل ابراہیم میں جو صلوة علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صلوة علی ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے تو اس پر بعض لوگوں کو شبہ ہوتا ہے۔ صلوة ابراہیمیہ کے افضل و اکمل ہونیکا صلوة محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اور نشا اس کا وہی ہے کہ عام طور پر لوگوں نے یہی سمجھ رکھا ہے کہ تشبیہ میں شبہ بہ کا مشبہ سے اقویٰ و اکمل ہونا شرط ہے حالانکہ یہ مقدمہ ہی غلط ہے۔ بلکہ صرف اوضح اور اشہر ہونا ضروری ہے افضل و اکمل ہونا ضروری نہیں اور اس کی دلیل خود قرآن میں موجود ہے فرماتے ہیں۔

اللہ نور السموات والأرض مثل نور کیمشکوۃ فیہا مصباح۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کو چراغ کے نور سے تشبیہ دی ہے حالانکہ چراغ کے نور کو نور حق سے کیا نسبت مگر بوجہ وضوح کے تشبیہ دی گئی ہے۔ کیونکہ نور مصباح لوگوں کے ذہن پہلے سے حاضر ہے۔

اس پر اگر یہ سوال ہو کہ لوگوں کے ذہن میں تو نور شمس و قمر بھی حاضر ہے اور ان دونوں کا نور چراغ کے نور سے زیادہ قوی ہے تو ان کے ساتھ تشبیہ کیوں نہیں دی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سورج اور چاند کا نور اگرچہ چراغ کے نور سے اقویٰ ہے مگر سورج میں ایک عیب یہ ہے کہ اس پر نگاہ نہیں جیتی۔ اس کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے تو سامعین کو شبہ ہوتا کہ شاید خدا کا نور بھی ایسا ہی ہوگا اس پر نگاہ نہ جم سکے تو جنت میں بھی دیدار سے مایوسی ہوئی اور مرنے سے اس لئے تشبیہ نہیں دی کہ اس کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ نور القمر استفاد من نور الشمس تو اس کے ساتھ تشبیہ دینے میں اس کا شبہ ہوتا کہ نور حق بھی کسی سے استفاد ہے پھر چراغ میں ایک صفت شمس و قمر سے زیادہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی منور بنا دیتا ہے کہ ایک گھنٹہ میں ایک چراغ سے ایک لاکھ چراغ روشن ہو سکتے ہیں اور اس کے نور میں کچھ کمی نہیں آتی اور شمس و قمر سے دوسروں کو صرف روشنی پہنچتی ہے یہ نہیں ہوتا کہ دوسری شئی نورانی بن کر کسی اور کو بھی منور کر سکے۔ اگر کہا جائے کہ آئینہ آفتاب یا چاند کے

نور شمس آفتاب، قمر چاند، نہ روشنی والا۔

سامنے کیا جائے تو وہ خود بھی نورانی ہو جاتا ہے اور دیوار کو بھی منور کر دیتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ محض واسطی العروض ہوتا ہے۔ واسطی الثبوت نہیں ہوتا۔ اور چراغ واسطی الثبوت ہو جاتا ہے جیسا کہ نور حق واسطی الثبوت ہوتا ہے مگر یہ تشبیہ من کل وجہ نہیں کہ اس سے نفوذ باللہ دوسرا خدا تصنیف کرنے لگے۔ مطلب صرف یہ کہ نور حق دوسروں کو بھی منور کرتا ہے اور منور بھی ہے گو دوسروں کی تنویر اس درجہ کی نہ ہو۔ اور یہ بات چراغ ہی میں ہے شمس و قمر میں نہیں ہے اور یہ سب نکات ہیں مقاصد نہیں ہیں۔ ہر شئی کو اپنی حد پر رکھنا چاہیے۔

(۸۳) اصل حق ہونے پر مشبہ

اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ بارگاہ حق کی تو کہیں انتہا نہیں۔ جیسا کہ مولانا فرماتے ہیں۔

اے برادر بے مہایت درگہبست ہر چہ بروئے میری برو مانیت
ایک اور عارف کہتے ہیں۔

نگر دو قطع ہرگز جادۂ عشق از دید نہا۔

کہ می بالذخود ایں راہ چوں تاک از برید نہا۔

اور جب اس کی انتہا کہیں نہیں۔ پھر وصول کے کیا معنی کیونکہ وصول تو محدود ہے ہو سکتا ہے غیر محدود تک کہاں ہو سکتا ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ وصول کے دو معنی ہیں ایک وصول محدود ہے ایک غیر محدود ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ تعلق مع اللہ کے دو درجے ہیں ایک سیر الی اللہ تو محدود ہے ایک سیر فی اللہ غیر محدود ہے۔ سیر الی اللہ ہے کہ نفس کا علاج شروع کیا یہاں تک کہ امراض سے شفا ہو گئی اور ذکر و شغل سے قلب کی تعمیر شروع کی یہاں تک کہ وہ انوار ذکر سے معمور ہو گیا یعنی تخلیہ و تحلیہ کے قواعد جان گئے۔ موانع مرقفہ کر دیئے۔ معالجہ امراض سے

لہ تخلیہ خالی کرنا تخلیہ آراستہ کرنا

واقف ہو گئے نفس کی اصلاح ہو گئی اخلاق رفیلہ زائل ہو گئے۔ اور اخلاق حمیدہ سے انوار ذکر سے قلب آراستہ ہو گیا۔ اعمال صالحہ کی رعیت طبیعت ثانیہ بن گئی۔ اعمال و عبادات میں سہولت ہو گئی۔ نسبت اور تعلق مع اللہ حاصل ہو گیا۔ تو سیر الی اللہ ختم ہو گئی۔ اس کے بعد سیر فی اللہ شروع ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات و صفات کا حسب استعداد انکشاف ہونے لگا۔ تعلق سابق میں ترقی ہوئی۔ اسرار و حالات کا درود ہونے لگا یہ غیر محدود ہے یہی وہ تعلق ہے جسکی نسبت کہا گیا ہے۔

بحر سیت بحر عشق کہ بیچش کنارہ نیست

آنجا جزا اینکہ جاں بسیارند چارہ نیست

اور اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص سائنس کا امتحان دیتا ہے یہاں تک پاس ہو گیا اور سند مل گئی تو اس وقت سیر الی سائنس ختم ہوئی اس کے بعد سیر فی سائنس ہے کہ تحقیقات میں اضافہ ہونی نہی باتیں منکشف ہوں اس کی کوئی حد نہیں چنانچہ اہل سائنس خود اس پر متفق ہیں کہ تحقیقات سائنس کا سلسلہ غیر محدود ہے۔

جب ایک دنیوی تعلق کا یہ حال ہے تو تعلق مع اللہ کا کیا حال ہوگا۔ دوسری مثال اور لیجئے کہ ایک کرہ جو اپنے مرکز سے الگ ہو گیا ہو اور وہ حرکت ایسی کر کے مرکز پر پہنچ جائے تو اس وقت حرکت الی مرکز ختم ہوئی۔ پھر اس کے بعد اپنے مرکز پر پہنچ کر وہ حرکت وضعیہ کرتا ہے اس کی کوئی حد نہیں۔ اسی طرح یہاں سمجھو۔ پس وہ مشبہ جاتا رہا کہ جب بارگاہ حق غیر متناہی اور غیر محدود ہے تو وصول کے کیا معنی۔ سو میں نے بتلادیا کہ تعلق مع اللہ ایک معنی کے اعتبار سے محدود ہے۔ یعنی سیر الی اللہ کے اعتبار سے اور اکثر اسی حد پر خلافت دے دی جاتی ہے اور سالک کو مجاز بنایا جاتا ہے۔ جیسے علوم ظاہر میں ایک لفظ خاص کے ختم کرنے پر اور پاس کر لینے پر سند دی جاتی ہے یہ محدود ہے پھر آگے عمر کبیر علوم میں ترقی ہوتی رہتی ہے یہ غیر محدود ہے ایک درجہ غیر محدود ہے۔ اسی طرح یہاں تعلق کا محدود ہونا بھی صحیح ہے اور غیر محدود ہونا بھی صحیح ہے۔

(غایتہ النجاح ص ۳۸)

لہ راہ خدا طے کرینوالا۔

(۸۴) بعض لوگوں کا بغیر عمل کامل ہو جانے کی تمتنا کرنا غلط ہے

لوگ خاص دین کے باب میں اس کے درپے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم کو ایسا شیعہ تعلق ہو جائے کہ حقوق خود بخود ادا ہوتے رہیں۔ ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے بس محبت و شوق کا ایسا غلبہ ہو جائے کہ نماز روزہ خود ہی ادا ہوتا رہے۔ سو یہ حالت غیر اختیاری ہے بندہ کے اختیار میں نہیں۔ بلکہ اس کے ذمہ یہ واجب ہے کہ اپنے ارادہ اختیار سے کام لے اور غیر اختیاری امور کے درپے نہ ہو۔ یہ بہت ضروری مسئلہ ہے جیسے حدیث میں الطہور سطر الایمان، وارد ہے اسی طرح میں اس مسئلہ کو نصف السلوک سمجھتا ہوں کہ اختیاری میں کوتاہی نہ کرے اور غیر اختیاری امور کے درپے نہ ہو۔ لوگوں نے آجکل صرف نماز روزہ کا نام دین رکھ لیا ہے۔ حالانکہ یہ عمل دین کا جزو ہے کہ اختیاری امور کے درپے ہو غیر اختیاری کے درپے نہ ہو۔ یاد رکھو کہ یہ امور غیر اختیاری یعنی حالات و کیفیات وغیرہ اگر کبھی حاصل ہوتے ہیں اعمال اختیار یہ ہی میں مشغول ہونے سے حاصل ہوتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ عمل اختیاری سے غیر اختیاری کی نیت بھی نہ کرے کیونکہ حصول میں تعجل و تاخیر اختیار سے باہر ہے کبھی تو نقصان عمل کی وجہ سے تاخیر ہوتی ہے کبھی قلت استعداد و ضعف استعداد کی وجہ سے دیر ہوتی ہے پس ہم اس کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرو۔ خود ان کے درپے نہ ہو۔ بلکہ ان اعمال کے درپے ہو جو تمہارے اختیار میں ہیں۔

تو بندگی چوگدایاں بشر طر مد بکن۔
کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند۔

وہ خود جانتے ہیں کہ تمہارے لئے کیا مناسب ہے کیا نہیں اس لئے اگر حالات

لے پاک و صاف رہنا دھایاں ہے۔ لہ تعجل جلدی کرنا تاخیر دیر کرنا

کیفیات تمہارے لئے مناسب ہوں گے عطا کر دیں گے نہیں مناسب ہوں گے تو نہیں عطا کریں گے۔ دیکھو ماں اپنے بچے کے واسطے جو مصلحت سمجھتی ہے وہی کرتی ہے بچہ کی خواہش پر عمل نہیں کرتی۔ خصوصاً باپ کہ وہ تو بچہ کی ضد سے مغلوب ہی نہیں ہوتا۔ ماں تو کسی وقت معلوم بھی ہو جاتی ہے۔ مگر زیادہ حالت یہی ہے کہ والدین بچہ کے ساتھ اپنی رائے کے موافق معاملہ کرتے ہیں جو مصلحت جانتے ہیں ویسا ہی عمل کرتے ہیں گو بچہ کتنا ہی ضد کرے۔ مولانا فرماتے ہیں

طفل می لرزد زینش اجتمام مادر مشفق ازاں عزم شاد کام
بچہ پکھنے لگانے والے کے نشتر وغیرہ کو دیکھ کر روتا ہے ڈرتا ہے مگر ماں خوشی کے ساتھ اس کے پکھنے لگواتی ہے کیونکہ اس کی نظر انجام صحت پر ہے تو جب باپ ماں بچوں کی رائے پر کام نہیں کرتے پھر حق تعالیٰ بندوں کی رائے پر کیوں کام کریں۔ اور تم سے مشورہ کیوں لیں۔ وہاں شخصیت ہے پارلیمنٹ نہیں ہے غرض اعمال اختیار یہ میں بھی امور غیر اختیار کا قصد نہ کرے۔ جو بات اس کے اختیار میں نہیں اس کی طرف التفات ہی نہ کرے۔ بلکہ اپنے کام میں لگے۔ (رفع الالتباس عن نفع اللباس ص ۵)

(۸۵) بزرگوں کے طریقہ اصلاح پر شبہ کا جواب

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طریقہ سے یعنی طریق اصلاح اختیار کرنے سے معتقد کم ہوتا ہے میں کہتا ہوں اول تو یہ خیال غلط ہے گو ظاہر میں تمہارے پاس آدمی کم آئیں۔ مگر دل میں معتقد زیادہ ہوں گے۔ اور مان لو معتقد کم ہوئے تو کیا فوج بھرتی کر کے کہیں لام پر بھیج دے اگر زیادہ معتقد بھی ہوئے اور کام نہ کئے تو ان کو لے کر کیا کر دے۔ اس سے تو یہ اچھا ہے کہ معتقد تھوڑے ہوں اور کام کے ہوں اس میں تو زیادہ راحت ہے کہ جو خلق زیادہ نہ ہو گا۔ کیونکہ ہجوم سے اوقات میں خلل پڑتا ہے۔

یہ جواب تو بطور ارجاء عنان کے ہے ورنہ میرا اصلی مذاق یہ ہے کہ مجھے تو لوگوں کے

اعتقاد ہی سے وحشت ہوتی ہے۔ مگر جسے ہجوم غلاتی سے محبت ہو جو ہر وقت اپنے گرد جمع چاہتا ہو وہ تو بیشک معتقدین کی قلت سے گھبرائے گا اور وہ طریق اصلاح کو اختیار نہ کرے گا۔ اسی واسطے میں بیعت میں جلدی نہیں کرتا بلکہ بہت سے شرائط کے بعد کرتا ہوں۔ اس میں ہمارے بعض احباب کی رائے یہ ہے کہ اتنی سختی نہ کرنی چاہیے بلکہ جہانتک ہو سکے لوگوں کو اپنے سے وابستہ کرنا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ وابستہ کر کے اصلاح کرو تب تو فائدہ بھی ہے ورنہ وہ تو وابستہ ہو کر طریق سے بیکار اور پابستہ ہو جائے گا۔ کیونکہ جلدی بیعت کر لینے سے وہ سمجھے گا کہ اس طریق میں عمل کے اہتمام کی ضرورت نہیں۔ اب بتلاؤ وہ طریق سے پابستہ ہو گا یا نہیں۔ اور جب اس سے شرطیں کی جائیں گی تو عمل کی ضرورت ابتداء ہی سے اس کے ذہن نشین ہو جائے گی۔ پھر وہ عمل کا اہتمام کرے گا اور بار بار روک ٹوک کرنے سے اس میں ترقی ہوگی۔ اگر وہ روک ٹوک کا تحمل کرتا رہا۔ تو انشا اللہ بہت جلد اصلاح پذیر ہو جائے گا۔ اور بدو اس کے تو فضول بھرتی کرنا ہے۔ غرض اخلاق باطنہ کی حقیقت یہ ہے کہ اعمال باطنہ درست ہوں۔ (الجمعین بین النفعین ص ۲۷)

(۸۶) طاعون سے بھاگنا تدبیر کے خلاف ہے

میں کہتا ہوں کہ بھاگنا دراصل تدبیر ہی نہیں۔ بلکہ سورتدبیر ہے کیونکہ بھاگنا جیسا ضعف قلب سے ناشی ہے اسی طرح وہ ضعف کا منشا رکھتی ہے۔ یعنی بھاگنے والا اس فعل سے ضعف کو اپنے قلب پر غالب کر لیتا ہے۔ طبی قاعدے سے ایسے امراض ضعیف القلب پر سب سے پہلے قبضہ کرتے ہیں۔ تو بھاگنے والے نے تو اسی وقت اپنے اوپر طاعون کو قبضہ دیدیا۔ اگر وہ یہاں نہیں مرا تو دوسری جگہ جا کر مرے گا۔ اب بتلایے بھاگنا تدبیر کس طرح ہے۔

دوسرے میں کہتا ہوں، اگر بھاگنا مفید بھی ہو۔ اور بھاننے والا طاعون سے بچتا بھی ہو تو تب بھی شریعت کو حق ہے کہ اس مفید فعل سے منع کر دے کیونکہ بعض مفید

افعال سے آپ بھی تو منع کرتے ہیں۔ مثلاً لڑائی میں سے بھاگنا تمام عقلا کے نزدیک جرم ہے حالانکہ یقیناً بھاگنے والے کو تو بھاگنا ہی مفید ہے۔ اس کی جان بچتی ہے مگر اس کو آپ کے لیڈر بھی تدبیر نہیں کہتے۔ بلکہ بے تدبیری کہتے ہیں۔ اسی طرح ہم طاعون سے بھاگنے کو بے تدبیری کہتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک دلیل شرعی سے طاعون سے بھاگنا ایسا ہی ہے جیسا جنگ سے بھاگنا اور جہاد سے بھاگنا۔ کیونکہ طاعون کی نسبت حدیث میں وارد ہے۔ والفسار منذ کا الفار من الزحف اور ایک حدیث میں طاعون کی حقیقت میں وخزاعدا نکم الجن وارد ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس وقت جنات کا اور انسانوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ جنات انسانوں کے اندرون جسم میں زخم لگاتے ہیں۔ جس سے طاعون ہوتا ہے۔ اور مقابلہ سے بھاگنا عقلاً بھی بے تدبیری ہے اس لئے شریعت نے فرار کو حرام کر دیا۔ تو اس حقیقت میں اطباء اور ڈاکٹروں کا اختلاف ہے۔ ڈاکٹر جراثیم کو سبب بتلاتے ہیں۔ مگر اس سے مضمون حدیث کی نفی نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ ممکن ہے کہ یہ سب بھی اور وہ بھی۔ مگر اصل سبب و خرج ہو اور ظاہری سبب وہ ہو جو تم کہتے۔ پھر ایک اور بات بھی ہے کہ یہاں سے بھاگ کر جو لوگ دوسری جگہ جاتے ہیں۔ وہ وہاں کے آدمیوں کی نگاہ میں ذلیل ہوتے ہیں۔ اور خصوصاً اگر تم طاعون کی جگہ سے بھاگ کر کسی شہر میں اپنے کسی دوست یا عزیز کے گھر میں پھڑپھڑے ہو۔ اور اتفاقاً تمہارے جانے کے بعد اس کے گھر کوئی بیمار پڑ گیا تو اس وقت اس کی نگاہ میں تمہاری ہیبت ذلت ہوگی جس کو قرآن سے تم خود بھی سمجھ جاؤ گے کیونکہ وہ یہ سمجھے گا کہ میرے گھر میں تو بیماری نہ تھی۔ یہ کبخت میرے گھر بیماری لے آیا اور اگر وہ بیمار مر گیا تو اسکی موت گھر والوں کے خیال میں تمہارے نامہ اعمال میں درج ہوگی پس سچ ہے ۷

عزیزے کہ از در گہش سر تنافت بہر در کہ شدی سچ عزت نیافت
پھر اس طرح یہ لوگ دوسری جگہ بھی طاعون پھیلاتے ہیں نہ بطریق عدوی کے بلکہ اسی قاعدہ سے کہ یہ وہاں جا کر لوگوں کے قلوب میں دہم پھیلاتے ہیں۔ تو دوسری بستی کے لوگ ان بھاگنے والوں سے یوں کہتے ہیں کہ خدا خیر کرے۔ کہیں ہماری بستی میں بھی

لہ لڑائی۔ لہ اس سے بھاگنے والا میدان کارزار سے بھاگنے والے کی طرح ہے۔ نہ جن کا زخم رگاز

طاعون نہ ہو جائے۔ جس سے ان میں بھی قبول طاعون کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیسی رحمت ہے کہ آپ نے بھاگنے سے منع نہ فرمادیا۔
(المجین بین النفعین ص ۴۳)

(۸۷) منافقین کے نماز جنازہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے افضل ہونیکا شبہ اور اس کا جواب!

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی رائے تھی۔ وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیض تھا کیونکہ کفار و منافقین پر غیظ اور ان سے نفرت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ہی کی برکت سے نصیب ہوئی۔ ورنہ آپ کی صحبت سے پہلے تو وہ خود ہی خالی تھے اور قتل رسول کا منصوبہ باندھ کر آئے تھے۔ حضور ص پر ایمان لانے کے بعد حق تعالیٰ نے ان کو کفار و منافقین سے نفرت اور غیظ عطا فرمایا۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ صرف عمر ہی تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم رسول بھی تھے اور عمر بھی تھے۔ بلکہ یوں کہو کہ آپ آدم علیہ السلام بھی تھے۔ نوح علیہ السلام بھی تھے۔ ابراہیم علیہ السلام بھی تھے۔ موسیٰ علیہ السلام بھی تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام بھی تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ ارند تو تنہا داری

حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تمام شائیں جمع تھیں غیظ و غضب

علی الکفار بھی آپ کے اندر تھا اور رحمت و رأفت بھی اعلیٰ

درجہ کی آپ میں تھی مگر آپ میں غلبہ رحمت ہی کو تھا۔ اس لئے

جب کوئی بہانہ بھی رحمت کا ملتا تھا آپ رحمت ہی کا برتاؤ کرتے تھے جب رحمت کا کوئی بہانہ نہ ہوتا اس وقت غضب فرماتے تھے۔ عبد اللہ بن ابی گو منافق تھا مگر کھلم کھلا کافر نہ تھا۔ اور منافقوں کے احکام کفار معلنین کے احکام سے جدا تھے ان کے ساتھ احکام حیات میں وہی تھا

لہ غصہ

ہوتا تھا جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا تھا اور موت کے احکام ہنوز نازل نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے بوجہ غلبت رحمت کے آپ نے احکام حیات پر قیاس کر کے اس کے ساتھ اموات مسلمین جیسا برتاؤ کیا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بوجہ غلبہ غیظ و شدت کے احکام حیات کو ضرورت و مصلحت پر مبنی سمجھ کر احکام اموات میں منافقین کو کفار معلنین پر قیاس کیا اور یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیض تھا اور یہ قیاس بھی آپ سے مخفی نہ تھا۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غلبہ رحمت کی وجہ سے پہلے قیاس کو ترجیح دی کیونکہ جب تک آپ کو موقع ملتا تھا۔ آپ رحمت ہی کے پہلو کو اختیار فرماتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان ہم مسلمانوں کے لئے سبب کچھ موجب تھی ہے کیونکہ یہ دوستاں را کجا کنی محروم تو کہ باد شمنان نظر داری۔ اور یہ

چشم دیوار امت را کہ باشد چوں تو پشتیان
چہ بایک از مویج بحیران را کہ دارد نوح کشتی بان

اب میں اس مقام پر ایک سوال علماء سے ظاہر کرتا ہوں وہ یہ کہ اَسْتَغْفِرُ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرُ لَهُمْ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طرح سمجھی۔ یہ تردید تو شریعہ کے لئے ہے کہ ان کے واسطے استغفار کرنا اور نہ کرنا برابر ہے ان کو دعا سے استغفار سے کوئی نفع نہ ہوگا۔ چنانچہ اہل عربیت پر یہ بات مخفی نہیں۔ اسی طرح اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً میں عدد کا ذکر تحدید کے لئے مقرر ہے۔ اگر شتر دفعہ استغفار کر و گے تو مغفرت نہ ہوگی۔ اس سے زیادہ کرو گے تو ہو جائے گی۔ بلکہ یہاں عدد کا ذکر ایسا ہے جیسا محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ سو دفعہ بھی کہے گا جب بھی نہ مانوں گا۔ ہزار دفعہ کہے گا جب بھی کچھ نہ ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہزار دفعہ سے زیادہ کہا جائے تو مان لیں گے بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ یہ بات ہرگز نہ مانی جائے گی اور عدد کا ذکر صرف بیان کثرت کے لئے ہوتا ہے نہ تحدید کے لئے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خیریت و فاختوت و سازید علی

لہ تم ان کے لئے مغفرت چاہو یا نہ چاہو۔

لہ اگرچہ آپ ان کے لئے شتر مرتبہ مغفرت چاہیں۔

السبعین کیسے فرمایا۔ علماء ظاہر اس کا شافی جواب نہیں دے سکتے۔ اور جو لوگ محض ترجمہ قرآن پڑھ کر اجتہاد کے مدعی ہیں وہ تو کیا ہی جواب دیں گے۔ لیکن اب میں علماء باطن کا جواب عرض کرتا ہوں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ حالت رحمت کے غلبہ کی وجہ سے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معافی کی طرف التفات نہیں فرمایا بلکہ محض نفس لفاظ سے متسک فرمانے لگے اور نفس لفاظ میں تخیل و حصر کی گنجائش ضرور ہے گو محاورہ کے اعتبار سے گنجائش نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ غلبہ حال کا ملین پر کبھی ہو جاتا ہے۔ (المربط ص ۳۹)

۸۸) تکمیل نماز کا طریقہ

تکمیل نماز کے لئے مراقبہ موت و مراقبہ لقار اللہ کا عادی ہونا چاہیے اور میر ذوق یہ کہتا ہے کہ آیت میں یہ مراد ہے کہ عین نماز کے اندر بھی اس مراقبہ میں قلب کو مشغول کیا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ نماز کی ہیئت میں غور کرے کہ میں جو تمام دنیا سے رُخ پھیر کر ہاتھ باندھ کر اس طرح کھڑا ہوں کہ کسی سے بات نہ کر سکتا ہوں نہ کسی کی طرف دیکھ سکتا ہوں نہ کھا پی سکتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوں اور ان سے عرض معروض کر رہا ہوں۔ پھر قیام کی حالت میں سوچے کہ خدا تعالیٰ کے مجھ پر کس قدر احسانات و انعامات ہیں جن کا شکر یہ میرے ذمہ واجب ہے اور سورہ فاتحہ پڑھتے ہوئے یہ سوچے کہ میں اللہ تعالیٰ کے انعامات کا شکر یہ ادا کر رہا ہوں اور اس کی ربوبیت کا اقرار اور اپنی عبدیت کا اعتراف کر رہا ہوں اور اسی ... عبدیت پر قائم رہنے اور اہل عبدیت کے طریقہ پر چلنے کی دعا کر رہا ہوں اور جو لوگ طریقہ عبدیت سے بہک گئے اور لعنت و غضب کے مستحل ہوں گے ہیں ان کے طریقہ سے بیزاری کا اظہار کر رہا ہوں اور جو قانون الہی تکمیل طریقی عبدیت کے لئے نازل ہوا ہے اس پر ہمیشہ کے لئے چلنے کا عہد کر رہا ہوں فاتحہ کے بعد سورت پڑھنے کا یہی مطلب ہے۔

پھر جب رکوع میں جائے تو یہ سوچے کہ میری پیدائش سجدہ و رکوع میں سوچ | اسی میں اور زمین سے ہے جو میرے پاؤں تلے ہے

زمین کی خاک سے جیتا جاگتا۔ سمیع و بصیر انسان پیدا ہو جانا محض خالق جل و علی کی قدرت ہے اور جس کی پیدائش زمین کی خاک اور اس کی بنائات و عجزہ سے ہو اس کو عبدیت اور بندگی کے سوا کچھ زیبا نہیں، بڑائی اور بزرگی صرف خالق جل و علا کو زیبا ہے جو تمام عیوب سے بری ہے۔ اسی لئے نمازیں بار بار اللہ اکبر کہا جاتا ہے کہ اے خدا ہم نے آپ کی عظمت کے سامنے اپنی خیالی عزت کو قربان کر دیا۔ پھر سجدہ میں جاتے ہوئے یہ سوچے کہ مجھے ایک دن زمین کے اندر پیوند ہونا ہے اور اس وقت خدا کے سوا میرا ساتھ دیے والا کوئی نہ ہوگا۔ دنیا سے میرا نام بھی مٹ جائے گا۔ اور نشان بھی، اس کے بعد دوسرے سجدے میں یہ تصور کر لے کہ گویا میں مرجح اور خدا سے مل گیا ہوں اب خدا کے سوا میرے ساتھ کوئی نہیں۔

پھر جلت شہد میں یہ سوچے کہ مرنے کے بعد پھر ایک زندگی ہوگی جہاں اسلام اور اعمال و اقوال و احوال صالحہ ہی کام آئیں گے جو اللہ تعالیٰ کے واسطے کئے گئے ہوں اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جملہ انبیاء و حضرات ملائکہ اور تمام نیک بندوں کی عزت ظاہر ہوگی۔ اور وہ گنہ گاروں کی شفاعت کریں گے لہذا ان پر سلام بھیج کر ان سے تعلق پیدا کرنا چاہیے پھر چونکہ امت محمدیہ کو سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ تعلق ہے اس لئے اخیر رکعت میں آپ پر خصوصیت کے ساتھ درود پڑھنا چاہیے۔ جب یہ تصور جم جائے تو اس کے بعد جلسہ میں یوں تصور کرے کہ گویا مرنے کے بعد یہ میدان قیامت میں حاضر ہوا ہے۔ اور تمام اعمال و افعال و اقوال جو دنیا میں کئے ہیں اس کے سامنے ہیں جن میں سے وہی کام آئے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے واسطے کئے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء و صلحاء و ملائکہ کی جماعت سامنے ہے جو دربار الہی میں حاضر ہیں۔ اور میں ان سب پر درود شریف و سلام بھیج رہا ہوں۔

اور آخر میں اپنے لئے کامیابی و نجات و فلاح کی دعا کر رہا ہوں اور اسی واسطے آیت میں لفظ یظنون اختیار کیا گیا ہے حالانکہ لقار اللہ کا تو اعتقاد حازم فرض ہے محض ظن کا فی نہیں

آخر نماز میں تصور | اور آخر میں اپنے لئے کامیابی و نجات و فلاح کی دعا کر رہا ہوں اور اسی واسطے آیت میں لفظ یظنون اختیار کیا گیا ہے

مگر چونکہ مقصود یہ ہے کہ نماز میں لقا و راجوع الی اللہ کا استحضار کیا جائے اور یہ استحضار درجہ وقوع میں لازم نہیں بلکہ اس کا ظن اور تصور بھی نمازیں کافی ہے کہ گویا میں اس وقت خدا کے سامنے حاضر ہوں اور مریا ہوں یا مرنے والا ہوں اور گویا میں اس وقت عالم آخرت میں حاضر ہوں اسی واسطے لفظ ظن اختیار کیا گیا۔ اس طرح نماز پڑھنے سے خشوع حاصل ہو جائے گا اور تمام خیالات و وساوس قلب سے نکل جائیں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم! ہذا کلہا من سیدی و مرشدی حضرت مولانا ظفر احمد صاحب دام فیوضہم۔

(الحج مثلاً)

(۸۹) چندہ وصول کرنے کے مفاسد۔

لوگوں کو سکرٹری وغیرہ صرف اس لئے بنایا جاتا ہے کہ وہ چندہ خوب وصول کرتے ہیں۔ عزبار کے اوپر ٹیکس کی طرح چندہ مقرر کرتے ہیں اور اپنے دباؤ اور اثر سے جبراً وصول کرتے ہیں اس کام میں ان کی مدح کی جاتی ہے کہ فلاں صاحب دین کے کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں سبحان اللہ یہ بڑا دین کا کام کیا کہ عزبار کے گلے پر چھری رکھ کر چندہ وصول کر لیا۔ ان سے اچھے تو وہ لوگ ہیں جو کھلم کھلا ڈاکو ہیں۔ کیونکہ وہ لوگوں سے مال چھین کر اپنے بال بچوں کو تو کھلاتے ہیں جن کا نان و نفقہ ان کے ذمہ واجب ہے تو گو ان کا یہ ذریعہ معاش تو حرام ہے مگر صرف ایسا ہے جس میں خرچ کرنا ان کے ذمہ واجب تھا۔ تو وہ حرام کا ارتکاب کر کے ایک واجب سے تو سبکدوش ہوئے اور یہ سکرٹری صاحب حرام طریقہ سے چندہ وصول کر کے ایسی جگہ صرف کرتے ہیں جس کی خدمت ان کے ذمہ واجب بھی نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ انجن کی خدمت ان کے ذمہ واجب نہیں اور ڈاکو کی سزا معلوم ہے تو لوگ اس کے واسطے تیار رہیں۔ افسوس آج کل چندہ میں اس کا اصلاً لحاظ نہیں کیا جاتا۔ یہ مال خوشی سے دیا گیا ہے یا جبر سے۔

بیوی کے مال میں طیب نفس کی قید

لکم عن شیء منہ نفساً فکلوہ ہینئلاً مریئاً کہ اگر بیوی اپنے دل کی خوشی سے اپنے

مہر میں سے مرد کو کچھ دیدے تو اس کا کھانا جائز ہے یہاں بھی طیب نفس کی قید ہے حالانکہ میاں بیوی کا تعلق عاشقی معشوقی کا تعلق ہوتا ہے۔ اور ایسے تعلق میں ناگواری بھی بہت ہی کم ہوتی ہے تو پھر عزبار کا روپیہ بد و ن طیب قلب کے کیونکر جائز ہوگا۔ بیوی کے معاملہ میں ایک مقام پر اس سے بڑھ کر ارشاد فرمایا ہے وَأَنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَنْسَوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنَصَفْتُمْ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بَيْنَهُ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَأِنْ تَعْفُوا أَوْ تَعْفُوا فَلِلنَّفْسِ۔ کہ اگر تم نے اپنی بیوی کو دخول سے پہلے طلاق دے دی ہو اور مہر مقرر ہو چکا ہو تو بیوی کے لئے نصف مہر ہے مگر یہ کہ وہ اپنا حق معاف کر دے (تو کچھ نہ رہے گا) یا جس کے ہاتھ میں نکاح کی ڈور ہے (یعنی شوہر) وہ معاف کر دے (تو پورا مہر رہے گا) اور اے مرد تم معاف کر دو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے یعنی مرد کے لئے زیادہ بہتر ہے کہ عورت کی معافی کا منتظر نہ رہے بلکہ خود اپنا حق معاف کر دے۔ تو دیکھئے کہ باوجودیکہ عورت اگر خوشی سے مہر معاف کر دے تو اس کا قبول کرنا جائز ہے اور اس کی اجازت دیدی گئی تھی مگر اس مقام پر دوسرا ادب کھلا دیا گیا ہے کہ غیرت کا مقتضی یہی ہے کہ عورت کی معافی قبول نہ کرے بلکہ تم اس کے ساتھ احسان کرو۔

چندہ و ہدیہ کے آداب

جب بیوی کے ساتھ لین دین کرنے اور اس کا عطیہ قبول کرنے کے لئے یہ آداب ہیں تو بھلا چندہ کے لئے آداب نہ ہوں گے۔ ضرور ہیں اور ان کا لحاظ کرنا واجب ہے۔ شریعت مقدسہ نے تو ہدیہ کے لئے بھی آداب مقرر کئے ہیں چنانچہ ایک ادب یہ ہے مَا تَاك مِنْ غَيْرِ اشْرَافِ نَفْسٍ فَخْذَا، وَمَا لَوْ لَا تَتَّبِعُ فَنَسَدٌ۔ کہ جو چیز ہدیہ وغیرہ بد و ن انتظار کے آجائے لے لو۔ اور جو انتظار سے آئے اپنے نفس کو اس کے پیچھے مت ڈالو۔ (اصل العبادہ ص ۷) مگر چندہ میں تو قصداً یہ تدبیر کی جاتی ہے کہ مجمع میں تحریک کی جائے تاکہ جو شخص ایک روپیہ دینا وہ شرمناک (پانچ) روپیے تو دے گا۔ یاد رکھو یہ صورت بالکل ناجائز ہے مگر لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ میں کہتا ہوں یہ تباہ و مقصود بالذات کیا ہے کام مقصود ہے یا دین؟ اگر صرف کام ہی مقصود ہے تو منافقین درک اسفل میں کیوں ہوں گے۔ کیونکہ وہ بھی توجہ و صدقہ وغیرہ کرتے تھے معلوم ہوا کہ جس کام

میں رضاء حق نہ ہو وہ کام ہی نہیں مسلمان کا اصل مقصود رضاء حق ہے چاہے کام تھوڑا ہو مگر رضاء حق کے موافق ہونا چاہیے۔ مثلاً اگر یتیم خانہ بہت بڑا ہو مگر رضاء حق نہ ہو تو اس کو لے کر کیا کرنا ہے۔

ایک انجن کا واقعہ چنانچہ آجکل جو ایک بہت بڑی انجن ہے میں اس کا نام بیان کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا ایک واقعہ عجیب ہے جس سے حیرت ہو گئی وہ یہ کہ لکھنؤ میں کسی نے بہت جائے داد ایک متوکل عالم تنگ دست کے سامنے پیش کی کہ اس کو قبول فرما کر اپنے تصرف میں لائیے انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اس نے انجن والوں کے سامنے پیش کیا کہ میری طرف سے اس کو انجن کے واسطے وقف کر دو انہوں نے قبول کر لیا۔ لکھنؤ کے غوام نے اس پر عجیب فقرہ کسا کہ میاں وہ بزرگ تو ایسے تھے ان کو گناہوں کے انبار کا تحمل نہ تھا اور انجن میں تو بہت موٹے موٹے ہیں وہ سب مل کر تھوڑا تھوڑا اٹھالیں گے اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو صرف انجن کا چلانا مقصود ہے رضاء حق مقصود نہیں ورنہ حلال و حرام کی ضرور رعایت کرتے۔

حب جاہ اور یہ ساری خرابی حب جاہ کی ہے کہ ان لوگوں کو کام سے مقصود جاہ مطلوب ہے۔ چنانچہ ڈیگ میں ایک نجسمن کے سکرٹری مجھ سے ملے اور انجن سے لوگوں کی بے توجہی کی شکایت کرنے لگے میں نے کہا کہ دوسروں کو کام میں لگانے کی اور ان کی شکایت کی آپ کو کیا ضرورت ہے آپ پہلے خود کام کرنا شروع کر دیں جتنا کبھی آپ سے ہو سکے۔ دوسروں کو آپ تنگ نہ کریں پھر کام میں خود کشش ہوتی ہے لوگوں کو خود بخود توجہ ہو جائے گی۔ جب وہ چلے گئے تو لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تم نے ان کے مرض کو خوب سمجھا۔ واقعی بات یہی ہے کہ یہ خود تو کچھ کام نہیں کرتے اور دوسروں سے چندہ وصول کرنا اور کام لینا جانتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے سیکرٹری بننے کا شوق ہے اور کام کے نام صفر ہے۔ غرض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ آجکل جو لوگ دین کی خدمت کرتے محض جاہ کے لئے کرتے ہیں دین اور رضاء حق مطلوب نہیں۔

(ایضاً ص ۹)

(۹۰) حق تعالیٰ بدون ابتلا و امتحان کے جنت کیوں عطا نہیں فرماتے

اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک حق تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ بدون ابتلا و امتحان کے سب کچھ عطا فرمادیتے مگر وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ انسان کو ابتلا و تکلیف کے بعد ہی دولت قرب عطا فرما دیتے ہیں اور قرب ہی کا نام نجات ہے اور ہلاکت فراق و بعد کا نام ہے۔

شینہ ام کہ سخن خوش کہ بر کنایاں گفت فراق باز نہ آں می کند کہ بتواں گفت
حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر کنا بیتست کہ از روزگار بچاں گفت
چنان ایک مقام پر ارشاد ہے۔ اَحَبُّ النَّاسِ اَنْ يُتْرَكَ اَنْ يُقَوَّ لَوْ اَمَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ۔ رہا یہ کہ اس کی کیا وجہ ہے سو اس کے بارہ میں ہمارے بزرگوں کا مسلک یہ ہے کہ حکم کی تفصیل میں گفتگو نہیں فرماتے۔ ان کا طریقہ یہ ہے۔ ابھو اما ابھو اما ابھو۔ کہ جس چیز کو خدا تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے تم بھی اس کو مبہم ہی رکھو۔

امتحان و ابتلا کی حکمت پس اجمالاً ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ابتلا میں حکمت ضرور ہے گو ہم کو معلوم نہ ہو اور اس باب میں ایک بات جو بے ساختہ دل میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر انسان سے طاعت بدون ابتلا مقصود ہوتی تو اس کے لئے ملائکہ پہلے سے موجود تھے انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ ملائکہ طاعت بدون ابتلا ہی کرتے ہیں ان میں منازعت کا مادہ ہی موجود نہیں اور انسان کے اندر مقاوہ و منازعت احکام کا مادہ رکھا گیا ہے مگر وہ ایک خاص درجہ پر ہے اور وہ بھی تکمیل اجر کے لئے اس میں رکھا گیا ہے کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت منازعت افضل ہے بوجہ مجاہدہ کے

لوگ کیا خیال کرتے ہیں کہ وہ اس کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ امتحان میں مبتلا نہیں کئے جائیں گے؟
نہ مقابلہ نہ لڑائی۔

وہ درجہ خاص کی قید میں نے اس لئے لگائی کہ اگر منازعت خاص درجہ پر نہ ہوتی تو الدین یسر کے خلاف ہوتا۔ اس لئے میں نے یہ قید لگا دی اور یہ منازعت بھی ابتداء ہی میں ہوتی ہے بعد رسوخ کے یہ منازعت بھی باقی نہیں رہتی بلکہ احکام الہیہ امور طبعیہ بن جاتے ہیں حق تعالیٰ نے افعال حسیہ میں بھی یہی قاعدہ رکھا ہے چنانچہ مشی و غیرہ میں ابتداء ہی میں ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے پھر ہر قدم پر ارادہ کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ وہی پہلا ارادہ مستمر قرار دیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو فعل اختیاری کہا جاتا ہے اس پریشہ نہ ہو کہ شاید پھر ثواب کم ہو جاتا ہو گا کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت منازعت افضل ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہی ہے کہ ابتداء سے منازعت کا مقابلہ کرنے کے بعد ثواب منازعت ہی کا ہمیشہ ملتا ہے کیونکہ اس نے تو اپنی طرف سے مقاومت منازعت کے دوام کا قصد کر کے عمل شروع کیا ہے چنانچہ ہر مسلمان جو روزہ نماز کا پابند ہے اس کا ارادہ یہی ہے کہ ہمیشہ نماز پڑھوں گا۔ ہمیشہ روزہ رکھوں گا۔ خواہ نفس کو کتنا ہی گراں ہو اب یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ بعد میں منازعت کو باقی نہیں رکھتے مگر چونکہ بندہ نے ہمیشہ کے لئے اس منازعت کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے اس واسطے اس کو زوال مناز کے بعد بھی بوجہ نیت دوام کے وہی ثواب ملتا ہے جو منازعت کے ساتھ ثواب ملتا ہے۔ تو جیسے مشی کو فعل اختیاری اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں اختیار و ارادہ کی ضرورت ہے گو بعد میں ضرورت نہیں رہتی اسی طرح یہاں بھی گو بعد میں منازعت نہیں رہتی مگر چونکہ ابتدا میں منازعت کی مخالفت کی ضرورت تھی اس لئے انتہا تک اس مخالفت منازعت کو حکماً مستمر قرار دیا جائے گا۔ اور یہاں سے پتہ لگتا ہے حق تعالیٰ کی رحمت کا۔

ورنہ عقل کا مقتضایہ ہے کہ جب منازعت

ختم ہو جاوے اور عبادت میں لذت و حظ پیدا ہو جائے تو اس شخص کو اجر نہ ملے کیونکہ اب طاعت مع التلا نہیں ہے اس وقت عقل کہتی ہے کہ یہ شخص اجر کا مستحق نہیں۔ مگر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تجھے ہمارے بندہ

عبادت میں لذت کے
باوجود ثواب

لہ دین آسان ہے لہ چلنا

سے محبت نہیں ہے ہم اس کو منازعت ہی کا اجرا دیں گے گو اب محنت کچھ نہیں رہی مگر اب ہم اس کو پیش دیں گے لیکن عقل پیش کو جائز نہیں کرتی۔ جیسے معتزلہ نے کہا ہے کہ گناہوں پر سزا دینا ضروری ہے عفو و مغفرت خلاف عقل ہے پس یوں کہئے کہ رسوخ کے بعد بندہ کی وہ حالت ہو جاتی ہے جو بعض پیروں کی وہ حالت سنی گئی ہے کہ جب کوئی مرید ان کی دعوت کو تابہے تو وہ عورت کے بعد نذرانہ بھی لیتے ہیں۔ جس کو دانت گھسائی کہنا چاہیے تو حق تعالیٰ نے یہ کر کے دکھلادیا کہ وہ بندہ کو دانت گھسائی بھی دیتے ہیں کیونکہ انتہا میں طاعت کا بجا لانا کچھ کمال نہیں رہتا بلکہ اس کے ترک میں تکلف ہوتا ہے۔ اخیر میں وہ حالت ہو جاتی ہے جو حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں وارد ہے کان خلقہ القرآن کہ قرآن پر عمل کرنا آپ کی طبیعت تھی آپ کی تو فطرت ہی سے طبیعت تھی۔ مگر کاملین کی بھی اخیر میں اسی کے قریب حالت ہو جاتی ہے اور اس وقت اس کے حق میں وعیدات کی ایسی شان ہو جاتی ہے جیسے مان پچہ کو بعض دفعہ دودھ پلانا چاہتی ہے اور وہ کھیل کے شوق میں بھاگتا ہے تو وہ اس کے چپٹ لگاتی ہے ایسے ہی سنتی کے لئے یہ وعیدات بغرض اظہار شفقت و رحمت ہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ مبتدی کے لئے بھی وعید محض اظہار شفقت و رحمت کے لئے ہے کیونکہ بات یہ ہے کہ انسان کو فطرۃ حق تعالیٰ سے محبت ہے اور مبتدی کو جو احکام میں منازعت ہوتی ہے یہ خلاف محبت نہیں بلکہ اس کا انتشار یہ ہے کہ محبت کی وجہ سے اس کو حق تعالیٰ پر ناز ہے یہ یوں کہتا ہے کہ جب مجھے محبت ہے تو مجھے آرام دینا چاہیے میرے اوپر یہ تکالیف اور قیود کیوں ہیں اور بزبان حال یوں کہتا ہے ۷

ہم نے الفت کی، یوں دیکھیں جانیں کیا چشم غضبناک کو ہم
(سبیل السعید ص ۷)

(۹۱) اختلاف رویت قمر کی صورت میں لیلۃ القدر
کے متعدد ہونے کا شبہ اور اس کا جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کو خبر بھی ہے کہ وہاں رات دن نہیں ہیں اور یہ تو خود سائنس والے

بھی تسلیم کرتے ہیں کہ لیل و نہار کرۃ النسیم سے نیچے ہی نیچے ہیں۔ کرۃ النسیم کے اوپر رات دن نہیں بلکہ یکساں حالت ہے یہ جواب جب میرے دل میں آیا بڑی خوشی ہوئی اور اس سے ایک بات ابھی اور دل میں آئی ہے وہ یہ کہ معراج کے ذکر میں اللہ تعالیٰ نے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر بیان فرمائی ہے۔ سیر سموات کا ذکر نہیں فرمایا۔ جس سے بعض اہل باطن نے سیر سموات کی نفی پر استدلال کیا ہے تو وہاں سیر سموات کا ذکر اس واسطے نہیں کیا کہ وہاں لیل کی قید بھی مذکور ہے پس ضروری ہوا کہ اسی قدر سیر بیان کی جائے جو لیل کے اندر واقع ہوئی اور ظاہر ہے کہ سیر سموات لیل و نہار سے باہر ہوئی ہے سموات میں لیل و نہار کا تحقق ہی نہیں تو اس سے سیر سموات کی نفی پر استدلال محض لغو ہے ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیر سموات رات میں نہیں ہوئی۔ سو یہ مسلم ہے بلکہ ہم تو یوں کہتے ہیں کہ وہ تو نہ دن میں ہوئی نہ رات میں وہ تو ایسے مقام پر ہوئی ہے جہاں رات ہے نہ دن۔ بہر حال وہاں لیل و نہار نہیں ہے اس واسطے لیلۃ القدر کی جوشان و برکات ہیں وہ لیل و نہار کے ساتھ مقید نہیں۔ بلکہ ارادہ حق کے تابع ہیں۔ تو اس کی مثال بارش کی طرح ہے کہ یہاں کے کرۃ النسیم کے نیچے آج بارش ہے اور کلکتہ کے کرۃ النسیم کے نیچے کل بارش ہے اگر شب قدر بھی ایسی ہی ہو کہ آج یہاں ہے اور کلکتہ میں کل ہے تو اس میں اشکال کی کیا بات ہے۔ آخر بارش میں کیا ایسا اختلاف نہیں ہوتا۔ پھر معنوی بارش کے برکات میں ایسا اختلاف ہو تو کیا تعجب ہے اس لئے بے فکر ہو کر آپ اپنی ہی تازکوں کے حساب سے کام کیجئے۔ اللہ تعالیٰ تو سب کی نیتوں اور کام کو دیکھتے ہیں۔ وہ سب کو ان کے حساب کے موافق لیلۃ القدر کی برکات عطا فرمادیں گے۔ (المال العدة ص ۲۵)

(۹۲) محض کتابیں دیکھ کر ہی اپنی اصلاح نہیں ہو سکتی

میں کتابوں کو بیکار نہیں کہتا۔ وہ بیشک کام کی ہیں مگر طبیب کے کام کی ہیں مریض کے کام کی نہیں۔ کتب طب سے کوئی مریض اپنا معالجہ نہیں کر سکتا حالانکہ کتابوں میں سب کچھ موجود ہے اور طبیب ان ہی سے علاج کرتا ہے مگر تم نہیں کر سکتے اگر معمولی مرض کا علاج کر بھی لیا تو شدید امراض کا علاج تو کبھی نہیں کر سکتے چنانچہ بحران کی بحث گو طب کی کتابوں

میں مذکور ہے مگر اس کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا یہ بحث اس قدر لطیف اور دقیق ہے کہ اطباء حال نے یعنی ڈاکٹروں نے تو گھبرا کر اس کا انکار ہی کر دیا کہ بحران کوئی چیز نہیں۔ مگر اطباء قدما نے اس بحث کو بڑی خوبی سے ضبط کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس بحث کا الہام ہوا ہے چنانچہ انہوں نے بحار کے ایام کی تقسیم کی ہے کہ بعض ایام میں طبیعت و مرض میں مقابلہ ہوتا ہے طبیعت ان ایام میں مرض کو دفع کرنا چاہتی ہے اور مرض طبیعت کو دبانا چاہتا ہے۔ اس کیفیت و مقاومت کا نام بحران ہے پھر ان ایام میں بعض دن تو سخت بحران کے ہیں اور بعض دن ہلکے بحران کے ہیں۔ اس لئے مریض کو اور اس کے تیمار داروں کو چاہیے کہ جب کسی کو بحار آوے اس کا دن اور وقت یاد رکھیں تاکہ طبیب سے بیان کر سکیں اور طبیب کو ایام بحران کی رعایت آسان ہو۔ بھلا محض کتاب دیکھ کر ان امور کی رعایت مریض سے کیونکر ہو سکتی ہے ہرگز نہیں ہو سکتی۔

حضرت کا اپنا واقعہ

بلکہ میں تو تجربہ سے کہتا ہوں کہ مریض اپنے معالجہ میں معمولی امراض کے اندر بھی غلطی کھائے گا۔ چنانچہ مجھے پہلے سال برسات کے اخیر میں میں بخار آیا کرتا تھا۔ اب تو بحمد اللہ

بہت سالوں سے نہیں آیا۔ اور ہمیشہ صفر اوی بخار ہوتا تھا۔ میں نے ایک دفعہ خیال کیا کہ مجھے غلبہ صفرار سے بخار ہوتا ہے اور حکیم صاحب ہر سال قریب قریب ایک ہی نسخہ لکھتے ہیں لاؤ اس کو نقل کر لیں۔ جب بخار آیا کرے گا اس کو استعمال کر لیا کرے گا حکیم صاحب کو تکلیف دینے کی ضرورت نہ ہوگی چنانچہ ایک سال ایسا ہی کیا کہ پچھلے سال کا لکھا ہوا نسخہ خود ہی استعمال کر لیا مگر چند روز استعمال کرنے سے بھی خاک نفع ہوا۔ آخر کار حکیم صاحب کو بلایا انہوں نے نسخہ لکھا اس کے پینے سے آرام ہو گیا پھر تحقیق ہوئی کہ اس سال صفرار کے ساتھ بلغم صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں کیوں کہ اب بڑھاپے کا سن شروع ہو گیا۔

اب اگر میں اس نسخہ کی بھی نقل کر لیتا کہ چلو اس میں صفرار اور بلغم دونوں کی رعایت ہے تو یقیناً اس سے بھی اگلے سال نفع نہ ہوتا بلغم ہی بڑھتا۔ (یعنی بلکہ تکلیف و عزم ہی زیادہ ہوتا۔ یہ "بلغم" مرکب ہے مفرد نہیں) کیونکہ اس کا مجھے اندازہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس سال بلغم صفرار سے زیادہ ہے یا مساوی ہے یا کم ہے اس کا اندازہ تو طبیب

ہی کر سکتا ہے جو بنص کی حالت کو پہچانتا ہے اس لئے کتب طب سے معالجہ کرنا طیب ہی کا کام ہے اسی طرح احیاء العلوم و فتوحات مکیہ جو تصوف کی کتابیں ہیں بیکار نہیں بلکہ کارآمد ہیں مگر شیخ کے کام کی ہیں طالب کے کام کی نہیں طالب کو تو اپنے معالجہ کے لئے کسی محقق کا اتباع لازم ہے۔ (الریختہ المرغوبہ ص ۲۱)

(۹۳) نفع متعدی کا علی الاطلاق نفع لازمی سے افضل ہونا درست نہیں

اصل یہی ہے کہ نفع لازمی نفع متعدی سے افضل ہے کیونکہ آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امر ہے کہ جب آپ نفع متعدی سے فارغ ہو جائیں یعنی تبلیغ سے تو نفع لازمی میں مشغول ہوں یعنی توجہ الی اللہ میں یہ سیاق صاف بتلا رہا ہے کہ نفع لازمی متعدی سے افضل ہے کیونکہ متعدی سے فارغ کو طلب کیا گیا ہے نہ کہ لازمی سے پھر اس کے بعد نفع لازمی میں اشتغال کلی کا حکم ہے کہ اس میں توجہ رکھئے۔ اس وقت دوسری طرف التفات نہ ہو جیسا الی ربک کی تقدیم کا مقتضی ہے اور ظاہر ہے کہ اگر نفع متعدی افضل ہوتا تو اس سے فارغ مطلوب نہ ہوتا بلکہ یوں ارشاد ہوتا۔ فاذا فرغت من ذکر ربک فا نصب فی التبلیغ والید فارغب نیز نفع لازمی میں مشغول ہونے کے وقت نفع متعدی سے قطع نظر کا امر ہو جیسا تقدیم معمول کا مدلول ہے کیونکہ مقصود بالذات سے کسی وقت قطع نظر نہیں ہوا کرتی۔ اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ نفع متعدی مقصود بالعرض اور نفع لازمی مقصود بالذات ہے۔ اور گویہ مشہور کے حلال ہے مگر حقیقت یہی ہے اور قول مشہور کا منشا یہ تو یہ ہوا ہے کہ بعض جگہ نفع متعدی نفع لازمی سے اوکد و اقدام ہو گیا۔ مگر اس سے فضیلت بالذات لازم نہیں آتی۔ بلکہ اقدمیت

لہ دوسرے کو نفع پہنچانا۔ لہ خود اپنے لئے نفع حاصل کرنا۔ سہ۔ زیادہ تاکید والا۔
لہ سب سے مقدم (پہلے)

واوکد بیت ایک عارض کی وجہ سے ہوئی ہے کہ وہ نفع متعدی پھر نفع لازمی کی طرف مفعی ہوگا کہ دوسرا شخص بھی رعیت الی اللہ کرے گا۔ اور ذکر و صلوٰۃ میں مشغول ہوگا اور اگر اس پر کوئی یثبہ کرے کہ شاید نفع متعدی اس لئے مشروع ہوا ہے کہ وہ نفع لازمی کے بعد پھر متعدی کی طرف مفعی ہو۔ اس طرح کہ دوسرا شخص بھی اپنی اصلاح کر کے تبلیغ کے قابل ہو گا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو تبلیغ کے قابل بھی وہ نفع لازمی حاصل کرنے کے بعد ہوگا کیونکہ جسکی خود اصلاح نہ ہوئی ہو وہ دوسروں کی اصلاح

نہیں کر سکتا۔ پھر دوسرے کا تبلیغ کے قابل ہونا یقینی نہیں کیونکہ بعض لوگ اصلاح و تکمیل وغیرہ کے اہل نہیں ہوتے اور نفع لازمی کا اہل ہر شخص ہے۔ پس نفع متعدی پر نفع لازمی کا ترتیب یقینی ہے کہ آج ہی سے اس کا ترتیب شروع ہو جاتا ہے نفع متعدی کا ترتیب مہوم ہے کہ نہ معلوم یہ دوسروں کی اصلاح کے قابل ہوگا یا نہیں اور تجربہ یہ ہے کہ دوسروں کی اصلاح کے قابل سو میں سے ایک دو ہوتے ہیں۔

پھر قابل ہو ابھی۔ تو نہ معلوم کب ہوگا اور ہو گیا بھی تو نہ معلوم اس کو اصلاح غیر کی نوبت آئے گی یا نہیں کیونکہ بہت سے سالک نفع متعدی کے قابل ہوتے ہیں مگر ان کو اس کی نوبت ہی نہیں آتی یا کم آتی ہے تو ایسے نفع مہوم کے لئے کسی شئی کا ایسا مشروع ہونا کہ وہ مقصود بالذات ہو جائے۔ از بس بعید ہے ہاں یہ ممکن ہے کہ بالعرض یہ بھی مقصود ہو جائے لیکن مقصود بالذات وہی نفع ہو سکتا ہے جس کا ترتیب یقینی ہو اور اس کا ظہور بھی مہوم نہ ہو اور وہ نفع لازمی ہے جو نفع متعدی پر فوراً ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے دوسرے اگر نفع سے مقصود نفع متعدی ہوگا تو طالب کو اس مقصودیت کی اطلاع کے بعد اس کے قصد کی اجازت بھی ہوگی۔ کیونکہ مقصود کا ارادہ بھی مقصود ہوتا ہے اور مقصود کی نیت مضر تو ہو ہی نہیں سکتی۔ مگر شیوخ محققین سے جو کہ مجتہدین فن ہیں جن کا فتویٰ قواعد فن سے حجت ہے ان سے پوچھئے کہ وہ طالب کو نفع متعدی کی نیت کی اجازت بھی دیتے ہیں یا نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر طالب ذکر و شغل سے مخلوق کو نفع پہنچانے کا قصد کرے گا تو اس کو کبھی فتیحا نہ ہوگا یہ ارادہ راہ زن طریق ہے اپنی اصلاح کے زمانہ میں اس کو صرف اپنی اصلاح کا قصد کرنا چاہئے دوسروں کی اصلاح کا خیال

مانع طریق بلکہ قاطع طریق ہے اس سے اپنی اصلاح کے لئے پڑ جاتے ہیں تو یہ اچھا مقصود بالذات ہوا۔ جس کا قصد کرنا راہ زن طریق ہے۔ اب بتلائیے اس حالت میں نفع متعدی کو افضل اور مقصود بالذات کیسے کہہ سکتے ہیں۔ پھر اپنی اصلاح کو تکمیل کے بعد بھی ہر شخص کو نفع متعدی کی اجازت نہیں۔ بلکہ اس کا اہل صرف وہی ہے جس کو مشائخ نے اجازت دی ہو اگر نفع متعدی اصل ہے اور یہی مقصود بالذات ہے تو تکمیل کے بعد اس کو از خود نفع متعدی میں مشغول ہونے سے کیوں روکا جاتا ہے اور اجازت شیخ کی قید کیوں لگائی جاتی ہے یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ نفع متعدی مقصود بالذات نہیں ورنہ لازم آتا ہے کہ جن لوگوں کو نفع متعدی کی اجازت نہ دی گئی ہو وہ سب کے سب ناقص ہی ہوں حالانکہ مشائخ کے نزدیک یہ بالکل غلط ہے۔ وہ تصریح کرتے ہیں کہ کمال مقصود کا حصول اس امر پر موقوف نہیں۔

اجازت کی قید کی وجہ | اور قید اجازت کا یہ راز ہے کہ امر بالمعروف کے لئے کچھ آداب ہیں جن کے قابل ہر ایک نہیں ہوتا۔ مثلاً بعضوں کو سیاست و تدبیر کا ملکہ نہیں ہوتا جس کے بغیر بالمعروف بجائے مفید ہونے کے موجب فتنہ و فساد ہو جاتا ہے۔ اس لئے بعض لوگوں کو گودہ درجہ کمال کو پہنچنے کے ہوں ارشاد و تلقین و نفع متعدی کی اجازت نہیں دی جاتی مگر اس سے ان کے کمال کی نفی نہیں ہوتی۔ حالانکہ نفع متعدی کا مقصود بالذات ہونا اس صورت میں نفی کمال کو مستلزم ہے جو اجماع محققین کے خلاف ہے دوسرے میں پوچھتا ہوں کہ اگر نفع متعدی مقصود بالذات ہے تو حربی دار الحرب میں اسلام لائے اور نفع متعدی پر قادر نہ ہو تو بتلائیے وہ کیا کرے نفع لازمی کو لازم پکڑے یا نفع متعدی کو۔ اگر نفع متعدی میں مشغول ہونا لازم کیا گیا تو تکلیف مالا یطاق، اور اگر نفع لازمی کا اس کو امر کیا گیا تو ثابت ہوا کہ نفع متعدی مقصود بالذات نہیں کیونکہ مقصود بالذات سے کوئی مسلمان محروم نہیں ہو سکتا یہ سب اس امر کے دلائل ہیں کہ نفع متعدی مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالعرض ہے۔ اور مقصود بالذات مقصود بالعرض سے افضل ہوا کرتا ہے۔

(الرغبة المرغوبہ ص ۷۷)

(۹۴) جبریل کا فرعون کے ڈوبنے کے وقت اس کے منہ میں مٹی ٹھونسنا

اس کا علمائے یہ جواب دیا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام کو معلوم تھا کہ عذاب کھنے کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **كَلِمَةً يَكُ يَنْفَعُهُمْ اَيُّهَا سُنَّ** لَيْسَ رَأْدُ بَأْسًا۔ تو وہ اسلام سے نہ روکتے تھے صورت اسلام سے روکتے تھے جس پر گو رحمت فی الآخرت مرتب نہیں ہوتی مگر رحمت فی الدنیا مستوجہ ہو سکتی ہے جیسے منافقین صورت اسلام کے سبب قتل اور قید ہونے سے محفوظ رہے۔ اسی طرح احتمال تھا کہ وہ بھی غرق و ہلاک سے بچ جاتا۔ پھر اس پر اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اس وقت آیت میں بَأْسًا سے مراد عذاب دینا تو ہے نہیں کیونکہ عذاب دنیا کی رویت قبل انکشاف آخرت قبول ایمان سے مانع نہیں۔ اور ظاہراً یہاں عذاب آخرت کا انکشاف نہ ہوا تھا ورنہ دنیا کی طرف کا احساس بالکل باطل ہو جاتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ستم نہیں بلکہ انکشاف آخرت کے بعد بھی ادھر کا احساس باقی رہنا ممکن ہے۔ چنانچہ بعض محضرتین کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فرشتوں کو بھی دیکھا۔ اور اس کے ساتھ اپنے گھر کی عورتوں کو بھی پہچانا۔ چنانچہ گھر والوں سے کہا کہ فرشتے بیٹھے ہیں تم ان سے پردہ نہ کرو۔ تو ابتداً انکشاف کے ساتھ ادھر کا ہوش رہ سکتا ہے۔

اور فرعون کے واقعہ سے ظاہر بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جس وقت ایمان ظاہر کیا ہے اس وقت اس کو انکشاف آخرت کے ساتھ دنیا کے بھی ہوش تھے چنانچہ اس کا قول **اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ اٰمَنْتُ بِہٖ** بَنُوْا سُرًّا لِّیْلَ تَبْلَا رِبَّہٗ کہ اس وقت اسرائیل کا

لے جب وہ ہمارا عذاب دیکھیں گے تو ان کا ایمان لانان کے لئے نافع نہ ہوگا۔ تھ میں اس ذات پر ایمان لایا جس پر بنو اسرائیل ایمان لائے۔

حق پر ہونا اور ان کا مومن ہونا اس کے خیال میں تھا اور یہ دنیا کا واقعہ ہے تو اس کو ادھر کے ہوش ضرور رکھے لیکن اوپر معلوم ہو چکا کہ یہ انکشاف عذاب آخرت کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے پس اس دلیل سے عذاب آخرت کی نفی نہیں ہو سکتی اور یہ انکشاف مانع ہے قبول ایمان سے۔ پس اشکال رفع ہو گیا۔ اب ایک سوال رہ گیا کہ جب یہ حالت مانع ہے قبول ایمان اور ایمان نام ہے تصدیق کا اور وہ بعد انکشاف آخرت کے مقبول نہ تھی اگرچہ زبان سے تلفظ کیا جاوے تو پھر تلفظ سے روکنے سے کیا فائدہ ہوا۔ اور اگر زبان سے اقرار کرنا کسی درجہ میں مفید بھی مان لیا جاوے تو اقرار کا قصد بھی کافی ہونا چاہیے اگرچہ کسی عذر سے عجز ہو گیا ہو۔ اور یہاں عجز ہو گیا کی طرح کی وجہ سے تو وہ اقرار مفید مستحق ہو گیا۔ پھر کی طرح ٹھونسنے سے کیا فائدہ ہوا۔

فرعون کی لغش کا محفوظ رہنا

سو اس کا جواب وہی ہے جو اوپر گذرا کہ جبریل علیہ السلام نے ظاہری رحمت کو بھی اس کے لئے گوارا نہیں کیا اگرچہ رحمت ظاہری کا ایک گونہ ظہور لغش کو محفوظ رکھنے سے ہو گیا جیسا کہ ارشاد ہے۔ فَلْيَوْمَ مُنْجِيَّتُكَ (الایتن) مگر اس پر بھی ایک سوال ہے کہ اس ظاہری رحمت میں ان کا کیا حرج تھا۔ اس کا جواب وہی ہے جس کو میں ذکر کر رہا ہوں کہ اس فعل کا منشا غلبہ بغض فی اللہ تھا۔ اس میں یہ بھی گوارا نہ ہوا۔ اور بغض حق ہے ایسا بغض بدو ن غلبہ عشق حق کے ہو نہیں سکتا۔ (العید والوعید ص ۷۸)

(۹۵) خدا تعالیٰ کی پیشین گوئی کسی مر کے متعلق

اس کو لازم نہیں کہ وہ غیر اختیاری ہو جائے

میرے پاس اس کی دلیل موجود ہے جو چند مقدمات پر مبنی ہے۔ ایک مقدمہ

۱۔ پس میں نے تجھے آج تیرے بدن کے ساتھ جنت دی۔

تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ فعل عبث سے پاک ہیں اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ محقق طبیب بعد مایوسی کے دوا نہیں دیا کرتا اور اگر دیتا ہے بھی تو مریض کو مجبور نہیں کرتا بلکہ بعض توصات کہہ دیتے ہیں کہ مریض بچے گا نہیں اس کو دوامت دوا اور اگر کوئی محقق اس حالت میں بھی جبرا دوا دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو علم غیب نہیں۔ وہ اپنے قواعد طبیبہ سے اس مرض کو لاعلان سمجھتا ہے۔ مگر سمجھنا ظنی ہے قطعی نہیں وہ قدرت خدا پر نظر کر کے امیدوار ہے عقل در اسباب میدار دنظر عشق می گوید مسبب را نگر

مگر حق تعالیٰ تو علم غیب ہے اگر ختم اللہ علی قلوبہم سے ان لوگوں کے لاعلان ہونے اور علاج کے غیر اختیاری ہونے پر دلالت ہوتی۔ تو یہ دلالت قطعی ہوتی کیونکہ عالم الغیب کا کلام ہے اور نفی اختیار کے ہوتے ہوئے یہ محال ہے کہ دوا پر جبر کیا جاوے کیونکہ لَا يَكْفِيكَ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا دُسْعَهَا کے خلاف ہے۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان لوگوں کو دوا پر مجبور کیا ہے يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ فِي خُطَابِ عام ہے اور یہ آیت مکی ہے پھر لفظ يَا أَيُّهَا النَّاسُ خود عموم کو بتلا رہا ہے جس میں تمام کفار کو توحید و ایمان اختیار کرنے کے متعلق خطاب ہے جن میں وہ لوگ بھی تھے جن کے بارہ میں ختم اللہ علی قلوبہم فرمایا گیا ہے پھر اس پر اجماع ہے کہ ابو جہل و ابولہب وغیرہ ایمان کے مکلف نہ ہوں اور اس حکم سے مستثنیٰ ہوں تو پھر ان کو عذاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ یہ کہہ سکیں گے کہ حضور ہم کو جو ترک ایمان اور کفر کی وجہ سے جو ہم کو عذاب ہو رہا ہے تو اخیر زمانہ میں ہم تو حکم ایمان سے مستثنیٰ ہو گئے تھے آپ نے ختم اللہ علی قلوبہم نازل فرمادیا تھا حالانکہ ان کا معذب ہونا منصوص ہے کیونکہ ختم اللہ علی قلوبہم کے ساتھ ہی ولہم عذاب عظیم بھی وارد ہے پس یہ ماننا پڑے گا کہ جن کے بارہ میں ختم اللہ علی قلوبہم فرمایا گیا ہے ایمان کے مکلف وہ بھی تھے اس لئے مستثنیٰ نہ تھے۔ اب میرا دعویٰ ثابت ہو گیا کہ جن لوگوں کے متعلق ختم اللہ علی قلوبہم نازل ہوا ہے ان کا مرض روحانی لاعلان نہ تھا۔ اگر روحانی مطلب میں کوئی مایوس العلاج ہوتا تو یہ لوگ ہوتے مگر وہ بھی مایوس علاج نہیں تو ثابت ہو گیا کہ مرض روحانی کسی کا بھی لاعلان نہیں رہا یہ سوال کہ پھر پیشین گوئی کی کیا ضرورت تھی۔ جواب یہ ہے کہ ایک راز تھا جو حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلادیا۔ مگر اس کا بھی مطلب یہ ہے۔ لایومن ابوجہل ونحوہ مع بقاء اختیار کا۔ کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے مگر یہ ایمان نہ لانا

ان کے اختیار سے ہوگا یہ مطلب نہیں کہ ان کو ایمان پر قدرت و اختیار ہی باقی نہیں رہا۔ خوب سمجھ لو اس سے زیادہ کلام کرنا۔ فعل فی القدر ہے جس کی اجازت نہیں۔ غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ نصوص میں کسی امر کی پیشین گوئی وارد ہونے سے اس کا خارج از اختیار ہونا لازم نہیں آتا۔ اور جب وہ اختیار ۔۔۔ سے خارج نہیں تو اس کی تدابیر کرنا فضول نہیں ورنہ اگر پیشین گوئی مانع تدبیر ہو تو چلیے کہ آج سے قرآن کے حفظ کو ترک کر دیا جائے کیونکہ قرآن میں پیشین گوئی ہے۔ انا منحن نزولنا الذکر وانا للہ لخاصون جس میں حفاظت قرآن کا وعدہ ہے تو پھر خود بالشر قرآن کا پڑھنا بھی چھوڑ دو لکھنا بھی چھوڑ دو چھاپنا بھی چھوڑ دو۔ اور جو لکھے ہوئے رکھے ہیں ان کو دفن کر دو اور کہہ دو کہ بس قرآن کا حافظ اللہ ہی کا ہی ہے ایک ہی حافظ بہت ہے اور وہ حافظ بھی کیسا جو محافظ بھی ہے جسے طریقے حفاظت کے ہیں وہ سب خود ہی کر لیں گے کیونکہ انا لہ لفاظون میں سب طریقے آگئے۔ مگر مسلمانوں نے آج تک ایسا نہیں کیا حالانکہ یہاں بھی تو پیشین گوئی ہو چکی ہے پھر اس کی کیا وجہ کہ یہاں تو آپ نے یہ تجویز کیا کہ قرآن کو حفظ بھی کیا اور لکھا بھی اور چھاپا بھی اور ان سب باتوں کو اپنے اوپر فرض بھی سمجھا۔ اور نا اتفاقی کے متعلق پیشین گوئی ہو چکی ہے تو اب علاج کی کیا ضرورت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب حفاظت قرآن کا وعدہ ہو چکا ہے تو پھر آپ کی حفاظت کی کیا ضرورت ہے۔ آپ پر بھی وہی اعتراض پڑتا ہے جو آپ اس مسئلہ میں ہمارے اوپر کر رہے ہیں۔ اس کا جواب دیجئے۔ آخر دونوں باتوں میں ماہ الفرق کیا ہے۔ فرق کا مبنی بتلائے۔ اگر آپ نہیں بتلاتے تو لیجئے میں بتلاتا ہوں آپ اس اعتراض کے جواب میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ”انا لہ لفاظون“ کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر زمانے میں ایسے لوگ پیدا کرتے رہیں گے جو اس کی حفاظت میں سہمی کرتے رہیں گے اور ہم حفاظت کے طریقے ان کے قلوب میں ڈال دیں گے کہ وہ اس کو یاد بھی کریں گے لکھیں گے کبھی پڑھیں گے پڑھائیں گے بھی جیسا کہ حفاظت قرآن کی پیشین گوئی کے بعد اپنی آپ کی حفاظت کو بھی اس میں دخل ہے۔ اسی طرح نا اتفاقی کی پیشین گوئی کے بعد بھی آپ کی بد پرہیزی کو اس میں دخل ہے اور پیشین گوئی کے بھی یہ معنی ہیں کہ چونکہ یہ لوگ باختیار خود بد پرہیزی کریں گے اس لئے نا اتفاقی رہے گی۔ پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ خدا اور رسول کا کسی چیز کے متعلق پیشین گوئی کرنا اس کو مستلزم نہیں کہ وہ دائرہ تکلیف سے باہر ہو جاوے اور اس کی تدبیر نہ کی جاوے اور اس کا راز وہی ہے۔ جو

میں نے شروع میں کہا تھا کہ پیشین گوئی کبھی مرض کے لاعلاج ہونے سے کی جاتی ہے اور کبھی مریض کے بد پرہیز ہونے کی وجہ سے اور امراض روحانیہ میں لاعلاج کوئی مرض نہیں یہاں جو پیشین گوئی ہوئی ہے مریض کے بد پرہیز ہونے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ (الانداد ص ۱۰)

(۹۶) خلافت فاروقیہ کو خلافت صدیقیہ سے کثرت فتوحات کی وجہ سے افضل سمجھنا غلط ہے

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں جدید فتوحات کچھ زیادہ نہ ہوئی تھیں بلکہ ان کی خلافت کا زیادہ زمانہ خود مسلمانوں کو سنبھالنے میں صرف ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بعض قبائل مرتد ہو گئے تھے کچھ لوگوں نے زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کر دیا تھا۔ تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا زمانہ خلافت اس فتنہ ارتداد کے فرو کرنے اور مسلمانوں کی حالت سنبھالنے میں صرف ہوا۔ مخالفین کے ملک فتح کرنے کی زیادہ نوبت نہ آئی اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں شاید کوئی دن بھی جدید فتوحات سے خالی نہیں رہا۔ روزانہ یہی خبریں آتی تھیں کہ آج فلاں شہر فتح ہو گیا۔ اور کل فلاں شہر پر حملہ ہے، یہاں تک کہ دس سال کے عرصہ میں حکومت اسلامیہ شرقاً و غرباً پھیل گئی اس لئے بعض کم فہم خلافت عمریہ کو خلافت صدیقیہ سے افضل شمار کرتے ہیں مگر عقلمند خوب جانتے ہیں کہ مکان کی خوبصورتی میں زیادہ کمال اس شخص کا ہے جس نے کہ اول نقشہ تیار کیا تھا اور بنیادیں قائم کی تھیں کیونکہ اس کو بہت دماغ سوزی سے کام کرنا پڑا ہے۔ مکان کا خوبصورت نقشہ بنانا اور بنیاد کا مستحکم کرنا یہ بڑا کام ہے دیواریں قائم کر نیوالے کا اتنا بڑا کمال نہیں کیونکہ وہ تو اینٹ پرائنٹ رکھنا چلا گیا اس کو کونسی دماغ سوزی کرنی پڑی ظاہر میں لوگ دوسرے معمار کی تعریف کرتے ہیں کیونکہ مکان کو اس نے مکمل کیا۔ مگر حقیقت شناس سمجھتا ہے کہ اس مکان کی خوبصورتی بڑا کمال نہیں بڑا کمال نقشہ بنانیوے

اور بنیاد قائم کرینوالے کا ہے۔ اسی طرح جو امر ارشاد شناس ہیں وہ جانتے ہیں کہ خلافتِ صدیقیہ سے خلافتِ عمریہ کو کوئی بھی نسبت نہیں۔ کیونکہ حضرت صدیق اکبر کو حکومتِ اسلامیہ اور خلافت کی بنیاد قائم کرنے میں جو تعب برداشت کرنا پڑا ہے اس کا عشرِ عشر بھی حضرت عمرؓ کو نہیں پیش آیا۔ یہ کام اسی عالی حوصلہ خلیفہ کا تھا کہ ایسے فتنے کے زمانہ میں جب کہ خود اپنی ہی جماعت قبضہ سے باہر ہونا چاہتی تھی تمام فتنوں کا مقابلہ کر کے اور ان کو ایک دم نیست و نابود کر کے ڈھائی سال کے عرصہ میں خلافتِ اسلامیہ کے کھونٹے گاڑ دیئے اور نظامِ حکومت کو ایسے مستحکم اصول پر قائم کر دیا کہ بعد کے خلیفہ کو کوئی پریشانی ہی نہ پیش آسکے۔ حضرت عمرؓ کی خلافت میں وہ اصول جاری ہو گئے اور نظامِ صدیقی شائع ہو گیا۔ تو بڑا کمال حضرت صدیقؓ کا ہے۔ اور جس قدر فتوحات حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوئی ہیں ان سب کا ثواب حضرت صدیقؓ کے صحیفہ اعمال میں داخل ہو گا اہل تمدن و سیاست اس کو خوب سمجھتے ہیں کہ قانون جاری کرنے سے زیادہ مشکل قانون بنانا ہے۔ قانون بنانے والے کو جس مشقت کا سامنا ہوتا ہے جاری کرنے والے کو اس کا دسواں حصہ بھی پیش نہیں آتا۔ (الجلاء لا ابتلاء ص ۹)

(۹۷) کیا چار سو برس کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا؟

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ چار سو برس کے بعد کسی کو اجتہاد کے قابل دماغ نہیں ملا کیونکہ اس پر کوئی دلیل قائم نہیں، علاوہ ازیں یہ مطلقاً صحیح بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہر زمانہ میں ہزاروں ایسی جزئیات نئی نئی پیش آتی ہیں جن کا کوئی حکم ائمہ مجتہدین سے منقول نہیں اور علماء خود اجتہاد کر کے ان کا جواب بتلاتے ہیں پس اگر اجتہاد کا باب بالکل بند ہو گیا ہے اور کسی کا دماغ اجتہاد کے قابل نہیں ہو سکتا تو کیا ایسے نئے نئے مسائل کا جواب شریعت سے نہیں ملے گا۔ یا ان مسائل کے جواب کے لئے کوئی نیا بنی آسمان سے اترے گا۔ اگر یہی بات ہے تو خدا خیر کرے کہیں ق، د، ن والے نہ سن لیں۔ کہیں یہ بات ان کے کانوں میں پڑ گئی تو سچ موعود کے دلائل نبوت کی دسترس میں ایک اور دلیل کا اضافہ کر لیں گے پھر اس آیت کے کیا معنی ہوں گے اَلْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی تکمیل ہو چکی۔ کہ دروازہ اجتہاد اگر بالکل بند کر دیا جائے تو پھر شریعت کی تکمیل کس طرح مانی جائے گی

کیونکہ ظاہر ہے کہ بہت سے مسائل ایسے ہیں کہ ان کا جواب کتب فقہ میں مذکور نہیں نہ ائمہ مجتہدین سے کہیں منقول۔

پچھلے دنوں میں ایک سوال آیا تھا کہ ہوائی جہاز نئے مسائل کے جوابات میں نماز ہو سکتی ہے یا نہیں اب بتائیے کہ اگر اجتہاد بعد چار سو برس کے بالکل جائز نہیں تو اس مسئلہ کا شریعت میں کوئی بھی جواب نہیں پہلے زمانہ میں نہ ہوائی جہاز تھا نہ فقہاء اس کو جانتے تھے۔ نہ کوئی حکم لکھا۔ اب ہم لوگ خود اجتہاد کرتے ہیں۔ اور ایسے ایسے نئے مسائل کا جواب دیتے ہیں تو فقہاء رحمہم اللہ کے اس قول کا یہ مطلب نہیں کہ چار سو برس کے بعد اجتہاد بالکل بند ہو گیا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اجتہاد فی الاصول کا دروازہ بند ہو گیا اور اجتہاد فی الفروع اب بھی باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گا اگر اجتہاد فی الفروع بھی نہ ہو سکے تو شریعت کے نامکمل ہونے کا شبہ ہو گا جو کہ بالکل غلط ہے شریعت میں کسی قسم کی کمی نہیں قیامت تک جس قدر صورتیں پیش آتی رہیں گی سب کا جواب علماء ہر زمانہ کی شریعت سے نکالتے رہیں گے کیونکہ یہ جزئیات اگر کتب فقہ میں نہیں تو اصول و قواعد سب سے پہلے مجتہدین بیان کر چکے ہیں جن سے قیامت تک کے واقعات کا حکم معلوم ہو سکتا ہے۔

البتہ قرآن و حدیث سے اصول مستنبط کرنا یہ اب اجتہاد فی الاصول کی بندش نہیں ہو سکتا یہ خاص اجتہاد فی الاصول بعد چار سو برس کے ختم ہو گیا کیونکہ اول تو جس قدر اصول و قواعد شریعت کے تھے وہ سب ائمہ مجتہدین بیان کر چکے انہوں نے کوئی قاعدہ چھوڑ نہیں دیا۔ دوسرے ان کے بعد اگر کسی نے اصول مستنبط بھی کئے تو وہ مستحکم نہیں۔ کہیں نہ کہیں ضرور ٹوٹتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد فی الاصول کے لئے اب دماغ قابل ہی نہیں رہے یہ حضرات مجتہدین ہی کا خاص حصہ تھا کہ انہوں نے نصوص سے اس خوبی سے اصول مستنبط کئے جو کہیں نہیں ٹوٹ سکتے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ ہدایہ کے اصول مسلم نہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہدایہ غیر معتبر کتاب ہے اس میں اصول غلط نقل کر دیئے گئے ہیں۔ بلکہ شاہ صاحب کی مراد یہ ہے کہ صاحب ہدایہ نے بعض اصول خود شریعت سے مستنبط کئے ہیں جن میں وہ ناقل نہیں ہیں سو وہ معتبر

نہیں باقی جزئیات اس کی سب معتبر ہیں۔ تو اب دیکھ لیجئے کہ صاحب ہدایہ باوجودیکہ بہت ہی بڑے شخص ہیں ان کی علمی شان ہدایہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ واقعی اس کتاب میں بھی انہوں نے کمال کر دیا ہر مسئلہ کی دو دلیلیں بیان کرتے ہیں ایک عقلی۔ ایک نقلی۔ کیا ٹھکانا ہے وسعت نظر کا کہ جزئیات تک کو حدیث سے ثابت کرتے ہیں پھر حدیثیں گو بلا سند بیان کرتے ہیں مگر تفتیش کرنے سے کہیں نہ کہیں ضرور ملتی ہیں چاہے سند بڑا زمین ہوں یا مسند عبدالرزاق میں۔ یہ سہتی میں ہوں یا مصنف ابن ابی شیبہ میں۔ کہیں ضرور ملیں گی ایک دو اگر نہ ملیں تو ممکن ہے مگر جس شخص کی نظر اس قدر وسیع ہو تو ایک دو حدیث جو ہم کو نہ ملی ہو اس سے یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی اصل ہی نہیں۔ یہ تو وسعت نظر کا حال ہے فہم کا تو کیا ٹھکانا ہے مخالفین کے دلائل کو بیان کرنا ان کا جواب دینا پھر اپنے مذہب کی دلیل بیان کرنا یہ ان کا خاص حصہ ہے مگر بایں ہمہ جو اصول کو خود حدیث و قرآن سے نکالتے ہیں ان کی بابت شاہ ولی اللہ صاحب نے فیصلہ فرمادیا کہ وہ معتبر اور مسلم نہیں ہیں کہیں نہ کہیں ضرور ٹوٹے ہیں تو آجکل جن لوگوں کی وسعت نظر و فہم کو صاحب ہدایہ سے کچھ بھی مناسبت نہیں وہ کیا حدیث و قرآن سے اصول مستنبط کریں گے۔

اجتہاد فی الفروع باقی ہے

سیاست خوب جانتے ہیں کہ قانون بنانا قانون جاری کرنے سے بہت زیادہ دشوار ہے ہم لوگ سوائے اس کے کہ ان حضرات کے استنباط کردہ اصول کو حوادث القادری میں جاری کر دیں اور کیا کر سکتے ہیں۔ کمال انہیں حضرات کا تھا کہ انہوں نے حدیث و قرآن میں غور کر کے ایسے اصول و قواعد سمجھے جو قیامت تک کے جزئیات کے لئے کافی ہیں کوئی مسئلہ ایسا پیش نہیں آسکتا جس کا حکم جواز و عدم جواز ان اصول سے نہ نکلتا ہو بلکہ ان حضرات نے صرف اصول و قواعد ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ جزئیات بھی اس قدر نکال کر بیان کر گئے ہیں کہ بہت ہی کم کوئی مسئلہ ہوتا ہے جس کو وہ صراحت یا دلالت بیان نہ کر گئے ہوں اور اگر کوئی شاذ و نادر ایسا مسئلہ معلوم ہوتا ہے جو فقہاء نے نہیں بیان کیا تو کبھی توفیق کی نظر کی کوتاہی ہوتی ہے کہ اس کو سب مواقع پر عبور نہیں ہوتا۔ یا فہم کی کمی ہوتی ہے کہ وہ مسئلہ عبارت سے نکل سکتا ہے مگر مفتی صاحب

کی سمجھ میں نہیں آیا اور اگر بالفرض جزیئہ انہوں نے نہیں بیان کیا تو اصول سے تو وہ ضروری مستنبط ہوتا ہو گا پس آجکل کسی کا منہ نہیں کہ اپنے کو ائمہ مجتہدین کے برابر کر سکے۔
(الجلال لا تبار صفا)

(۹۸) علم الاعتبار نکات و لطائف کے درمیں ہے

اور علوم جو بزرگوں نے قرآن سے نکالے ہیں ان کو یہ کہیں گے کہ منطبق علی القرآن ہیں مدلول قرآن نہیں ہیں یوں کہیں گے ثابت القرآن ہیں ہاں منطبق موافق کہیں گے۔ اور مدلول اور منطبق میں بڑا فرق ہے ایک مثال سے آپ کو اس کا فرق ظاہر ہو گا فرض کر دو کہ ایک شخص کے پاس حجام آیا اور اس نے کہا کہ خط بنوایے لیجئے اس نے جواب دیا کہ بڑھنے دو اتفاق سے جس وقت اس نے یہ جواب دیا تھا لڑکے والوں کی طرف سے دُوم بھی انکی لڑکی کی شادی کا خط لیکر آیا۔ وہ بھی اتفاق سے اس جواب سے اپنا مطلب نکال لے تو یہ جواب ”بڑھنے دو“ دونوں سوالوں کا ہو سکتا ہے اول اس سوال کا اس طور پر کہ خط بڑھنے دو جب بڑھ جائے گا بنوائیں گے دوسرے سوال کا اس طور پر کہ لڑکی ابھی چھوٹی ہے اس کو بڑھنے دو۔ پہلے معنی کو تو مدلول کہیں گے اور دوسرے کے مدعا پر اس کو صرف منطبق کہیں گے۔ قصد تو یہ تھا کہ نالی کو جواب دیں لیکن یہ کلام کی لطافت ہے کہ وہ دُوم کا بھی جواب ہو گیا بس اس کو نکتہ اور لطیف کہہ سکتے ہیں یہاں سے ایک بات اور کام کی سمجھ میں آئی وہ یہ کہ صوفیہ کرام نے آیات کے متعلق کچھ بصورت تفسیر کے کہا ہے مثلاً اِذْ هَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اَمْنًا طَغٰی کے متعلق لکھا ہے۔ اِذْ هَبْ اِلٰیہَا الرِّيحَ اِلٰی النَّفْسِ اَنْطَغٰی واذمجا بقرۃ النفس تو ان تاویلوں کو دیکھ کر دو جماعتیں ہو گئی ہیں ایک تو جو صوفیہ کی محبت سے خالی ہیں اور یحتمل المنصوص علی ظواہر ہا کے پورے پابند ہیں انہوں نے تو ان تاویلات کا بالکل انکار کر دیا کہ کہاں فرعون کہاں نفس۔ کہاں ہوسی کہاں روح۔ یہ تو ایسا ہے کہ زمین بول کر آسمان مراد لیلیں اور صوفیہ کو اس بنا پر صناد و محرف کہہ کر ان کے منکر ہو گئے کہ ان کو تو یہ ضرر ہوا کہ حضرات اہل اللہ کے برکات سے محروم ہوئے۔ دوسرے وہ تھے جو ان حضرات کی محبت میں عرق ہیں وہ یہ کہنے لگے

کہ قرآن کا مدلول اور تفسیر یہی ہے علامہ ظاہر یہ نہیں سمجھے اس میں تو سارا قصہ باطن کا ہے پھر اس بات میں غالبین کا یہاں تک غلبہ ہوا کہ بعض جگہ تو انہوں نے قرآن مجید کی گت ہی بنادی ہے۔ دائرہ یہ لوگ بالکل ہی برباد ہوئے خدا کی قسم ہے کہ قرآن کا یہ مدلول ہرگز نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روزہ نماز سب اٹھ گیا اس لئے کہ تمام نصوص کے مدلولات کو بلکہ تمام شریعت کو ان لوگوں نے بدل دیا۔ لیکن اس وقت کلام ہے صوفیہ محققین کی تاویلات و اشارات میں۔ سو اس میں بعضے تو ان کے ہی منکر ہو گئے اور بعض مفسرین کے منکر ہو گئے۔

ہمارا طریقہ کار

اب رہ گئے ہم بیچ میں کہ ہم قرآن کو کلام اللہ اور صوفیہ کو اہل اللہ جانتے ہیں۔ تو دونوں کی اعانت و حفاظت کے لئے ضرورت ہوئی کہ ان تاویلات کو ایسے معانی پر محمول کیا جاوے کہ کلام اللہ کی بھی تحریف نہ ہو اور اہل اللہ کا کلام بھی خلاف قواعد شریعہ نہ ہو۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ صوفیہ کرام نے جو آیات کے معنی بیان کئے ہیں یہی واقعی تفسیر نہیں ہے اور نہ وہ حضرات مدلول ظاہری کے منکر ہیں ان کی یہ مراد ہرگز نہیں کہ قرآن میں فرعون سے نفیس اور موسیٰ سے روح اور بقرہ سے نفیس مراد ہے جو کچھ وہ فرما رہے ہیں یہ علم اعتبار رکھنا ہے اور علم اعتبار یہ ہے کہ دوسرے کے حال پر اپنے حال کو بھی قیاس کر داس کی ایسی مثال ہے جیسے زید نے ایک کام عمر کی دیکھا دیکھی کیا اور اس میں اس کو ناکامی ہوئی۔ تو اس موقع پر کہتے ہیں کہ کو اچلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ تو اس کلام میں کو سے مراد زید اور ہنس سے مراد عمر و یقیناً نہیں ہے۔ کو سے مراد ہنس ہے اور ہنس سے ہنس ہی مراد ہے۔ اور حاصل اس کا یہ ہے کہ دو موقعے ایک حالت کے اندر متطابق ہیں۔ ایک موقع پر جو نظر پڑی تو دوسرا موقع اس کو دیکھ کر یاد آ گیا اور ایک کو دوسرے کے ساتھ تشبیہ دیدی۔ مثلاً یہاں زید و عمر و اور ان کے قصے کو کو سے اور ہنس سے تشبیہ دیدی پس اذہب ایہا الروح الخ سے مراد یہ ہے کہ قاری صاحب تو قرآن پڑھے۔ اور یہاں پہونچے تو اس قصے سے یہ سبق لو کہ تمہارے اندر بھی ایک چیز فرعون کے مشابہ اور ایک چیز موسیٰ کے مشابہ ہے قصے کو قصے ہی کے طور پر پڑھو بلکہ قرآن شریف کے ہر موقع سے اپنی حالت پر مطابق کرتے جاؤ اور اس سے نصیحت اور عبرت حاصل کرتے جاؤ یہ مطلب ہے صوفیہ کرام کا۔ پس دونوں فرقے غلطی پر ہیں جو ان تاویلات کا بالکل انکار کرتے ہیں وہ بھی غلطی پر ہیں اور جو ان کو تفسیر اور مدلول قرآنی قرار دیتے ہیں وہ تو بالکل

ہی گئے گذرے ہیں یہ تاویلات اور لطائف اور نکات کے درجے میں ہیں۔ تفسیر نہیں ہیں اور ان کو علوم قرآنیہ نہیں کہہ سکتے علوم قرآنیہ وہی ہیں جن پر عبارت النص یا اشارۃ النص یا اقتضار النص یا دلالتہ النص سے استدلال ہو سکے ورنہ نکات و لطائف کا درجہ ہے۔

(الانفاق منہ)

(۹۹) تبلیغ کو سیاسی اغراض کی وجہ سے ترک کرنا جائز نہیں

اب دیکھنا چاہئے کہ اس باب میں ہماری کیا حالت ہے اور ہم کو اس طرف توجہ ہے یا نہیں۔ تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو ادھر بالکل توجہ نہیں۔ اعتقاداً تو اس کو مامور بہ سمجھتے ہیں بلکہ اگر اس میں غور بھی کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس درجہ کا یہ مامور بہ ہے اس درجہ سے بہت کم سمجھا جاتا ہے اس کو درجہ و جواب میں سمجھنے والے تو بہت ہی کم ہوں گے۔ کوئی مستحب سمجھتا ہے کوئی مستحسن۔ اور غضب یہ کہ مستحسن سمجھنے میں بھی قید لگاتے ہیں کہ مستحسن بھی جب ہے کہ کسی مصلحت سیاسیہ و غیرہ کے خلاف نہ ہو۔ ورنہ وہ بھی نہ وارد۔ اول تو یہی غضب تھا کہ بعض نے واجب کو مستحب سمجھا۔ پھر یہ دوسرا غضب ہے کہ اس میں یہ قید لگادی کہ مصلحت کے خلاف نہ ہو۔ وہ کیوں؟ محض اپنے اغراض کے سبب۔ کیونکہ دینی کاموں میں بھی لوگ اول اغراض کی طرف دیکھتے ہیں کہ مسئلہ ان اغراض کے موافق ہے یا مخالف پھر وہ غرض جہاں فوت ہونے لگی کہہ دیا کہ اس وقت یہ کام مصلحت کے خلاف ہے لہذا مستحب بھی نہیں رہا۔ اب اس کو اصلاً مامور بہ نہیں سمجھتے بلکہ عجیب نہیں کہ ایک دن کسی مصلحت کی وجہ سے مامور بہ کو منہی عنہ بتلائے لگیں انسوس مسلمانوں سے یہ نہیں ہوتا کہ اغراض کو احکام کے تابع بنائیں کہ اصل تو یہی ہے وہ سرانجام پائے پھر اغراض خواہ حاصل ہوں یا نہ ہوں۔ مگر انسوس یہ نہیں کرتے۔

بلکہ بعض نے تو اغراض نفسانی کو پورا کرنے کے لئے کہ دعوت الی الاسلام کا نام منتہ اور فساد رکھا ہے اور یہی وجہ ہے بے رحمی

لوگوں کا حال

کی کہ اس میں انہیں غرض کی وجہ سے بے حد تساہل کرتے ہیں حتیٰ کہ اپنی آنکھ سے بھی دیکھیں کہ کسی نے نماز میں تبدیل ارکان نہیں کی۔ اور ایسے بہت نکلیں گے تو ہماری یہ بہت نہیں ہوتی کہ اس سے اتنا کہیں کہ صَلِّ فَاَنْتَ لَمْ تَصَلِّ۔ اور اس کی وجہ صرف اتباع ہوا ہے اس لئے باوجود علم کے محض دقیق تاویل سے گھڑ لیتے ہیں مگر خدا کے ساتھ یہ حیلہ و تزویر چل نہیں سکتا۔ بل الانسان على نفسه بصيرة ولو القى معاذيره۔ اگر انصاف سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اصل میں دنیا کو قبلہ و کعبہ بنا رکھا ہے امر بالمعروف نہ کرنے کی وجہ فقط اتنی ہے کہ اس سے دنیاوی اغراض فوت ہوتے ہیں دوستی نہیں رہے گی میل ملاپ نہ رہے گا ہنسی خوشی جاتی رہے گی اگر ہم نے کسی کو ٹوکا تو وہ ناخوش ہو جائے گا پھر ناخوش ہو کے آزار کے درپے ہو جائے گا پھر آزار سے ہم کو تکلیف ہوگی۔ اور یہ آزار و تکلیف بھی سب وہی ہے۔ ایسے مواقع کے متعلق ذرا علماء سے تو دریافت کر لو کہ صاحب امر بالمعروف میں اگر ایسی ایسی باتیں پیش آئیں تو ایسی حالت میں ہم معذور ہیں یا نہیں۔ ان سے پوچھو تو کون کون سی چیزیں مسقط وجوب امر ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اس کا کوئی طریقہ ہی نہیں۔ اس کے لئے امر بالمعروف کے آداب

کوئی شرط و ضابطہ ہی نہیں ہے۔ برابر ہے اور ضرور ہے مگر شرائط و ضوابط و آداب و اعذار علماء سے دریافت کرو۔ خود مفتی بن کر کیوں فتویٰ لگائیا کہ ہم تو معذور ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ شرائط آداب کا طالب حقیقی بھی وہی ہوگا جس نے پکا ارادہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کر لیا ہو۔ اس کو البتہ حق ہے شرائط و ضوابط پوچھنے کا۔ وہ اگر آداب و اعذار معلوم کرے تو اس کو سب کچھ بتلادیا جاوے گا باقی حالت موجود ہیں جبکہ اس کی طرف توجہ اور التفات ہی نہیں اس حالت میں آپ کو اعذار و شرائط پوچھنے کا اور سمجھنے کا بھی کچھ حق نہیں جو شخص کام کا ارادہ بھی نہ کرے اس کو نہ شرائط و ضوابط بتلائیے جائیں گے اور نہ اس کو آداب و اعذار پوچھنے کا حق ہے وجہ یہ ہے کہ وہ تو شرائط و اعذار اس لئے تلاش کرے گا تا کہ امر بالمعروف کرنا نہ پڑے بلکہ کسی طرح اس سے مخلصی اور رہائی مل جائے جب اعذار معلوم ہو جائیں گے تو کوئی نہ کوئی بات تراش لے گا کہ مجھ میں یہ عذر موجود ہیں یہ شرطیں مجھ میں نہیں پائی جاتیں ہم کیسے امر بالمعروف کریں اس لئے علماء کو چاہیے کہ قبل از شروع عمل کسی کو اعذار و شرائط

بتلایا ہی نہ کریں جیسے کوئی شخص نماز کا ارادہ ہی نہ رکھتا ہو اور علماء سے پوچھتا ہے کہ نماز کے شرائط و اعذار نہ بتانا چاہیے ورنہ وہ تو مسقط مملوۃ کو ہر حالت میں تلاش کرے گا۔ ہر وقت اسی دھن میں رہے گا کہ کوئی بات ایسی ہو جس سے نماز پڑھنے سے چھٹی مل جائے۔ البتہ جس کا ارادہ ہو پڑھنے کا وہ پوچھے تو اس کو بیشک بتلادیا جاوے لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ محض مخلصی کا متلاشی ہے تو مفتی کو چاہیے کہ ایسے شخص کو ہرگز جواب نہ دے بلکہ میرے نزدیک ایسوں کو اعذار و مواقع کی اطلاع کرنا جائز بھی نہ ہوگا۔

(آداب التبلیغ ص ۷)

(۱۰۰) حضرت منصور رحمۃ اللہ علیہ کے اناحق کہنے کا راز۔

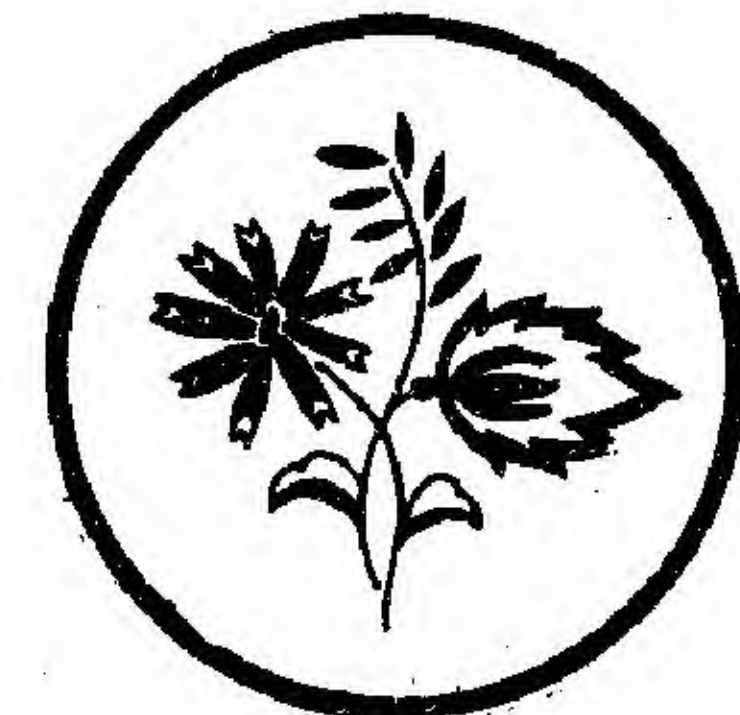
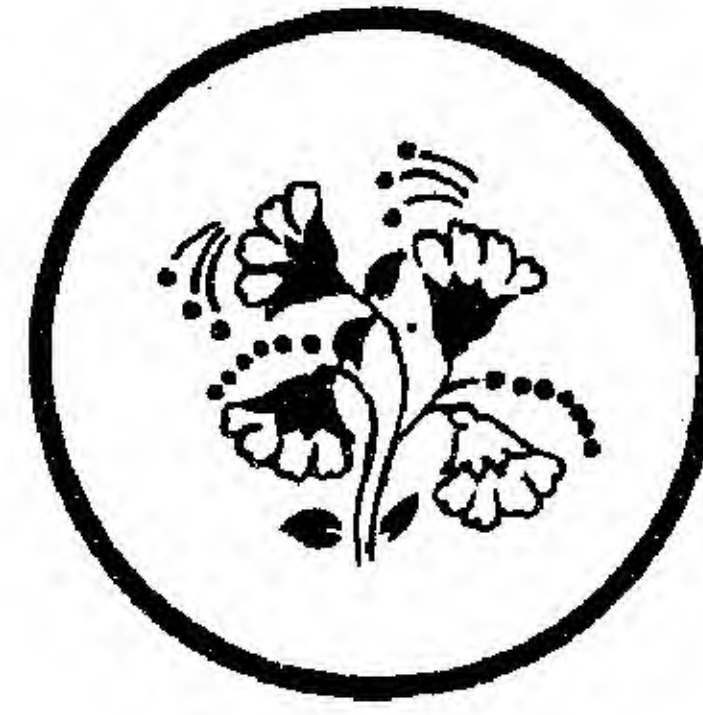
وہ اناحق خود نہ کہہ رہے تھے بلکہ اس وقت ان کی وہ حالت تھی جیسے شجرہ موسیٰ سے آواز آئی تھی۔ اِنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ گواہ شجرہ ہی سے نکل رہی تھی چنانچہ خود رض میں تصریح ہے تُوْدِیْ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبَارَکَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یَّامُوسٰی۔ تو کیا شجرہ خود کہہ رہا تھا۔ اِنَا اللّٰهُ، ہرگز نہیں ورنہ شجرہ کا رب ہونا لازم آئے گا اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ آواز شجرہ میں سے نہیں نکلی تھی بعینہ صوت حق تھی کیونکہ حق تعالیٰ صوت سے پاک ہیں اور یقیناً موسیٰ علیہ السلام کو صوت ہی سموع ہوئی تھی جو سمت خاص اور مکان خاص کے ساتھ مقید تھی۔ تو اس کو حق تعالیٰ نے وادیِ امین اور بقعہ مبارکہ اور من الشجرہ کے ساتھ مقید کیا ہے ورنہ کلام حق بعینہ ہوتا تو ان قیود سے مقید نہ ہوتا۔ پس ماننا پڑے گا کہ وہ آواز تو شجرہ ہی کی تھی اور اسی میں سے نکلی تھی مگر وہ حق تعالیٰ کی طرف سے متکلم تھا خود متکلم نہ تھا۔ جیسے قرآن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے فَاِذَا خَرْنَا کَافًا تَمِعْ قُرْاٰنًا کہ جب ہم قرآن پڑھا کریں تو آپ قرأت کا اتباع کیجئے۔ یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی صورت کو سنتے تھے۔ اور خدا کے تعالیٰ صوت سے منزہ ہیں پھر اس قرآن کا کیا مطلب ہے یہی کہا جاتا ہے کہ یہاں قرأت جبریل کو قرأت حق کہا گیا ہے کیونکہ وہ حکم حق قرأت کرتے تھے ایسے ہی

یہاں بھی قول شجرہ کو قول حق کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے جو کچھ کہا تھا حکم حق کہا تھا پس یونہی منصور کے انا الحق کو خدا تعالیٰ کا قول کہنا چاہیے کیونکہ غلبہ حال میں کلام حق ان کی زبان سے نکلا تھا وہ بھی متکلم بحکم حق تھے خود متکلم نہ تھے۔

ایک بزرگ کا واقعہ چنانچہ ایک بزرگ کے واقعہ سے اس کی تائید ہوتی ہے وہ یہ کہ ایک بزرگ نے حق تعالیٰ سے سوال کیا کہ منصور نے بھی اپنے خدا کو خدا کہا تھا اور فرعون نے بھی۔ وہ تو مقبول ہو گئے اور یہ مردود ہو گیا۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ جواب ارشاد ہوا کہ منصور نے اپنے کو مٹا کر انا الحق کہا تھا اور فرعون نے ہم کو مٹا کر انا ربکم الاعلیٰ کہا تھا اس کا یہی مطلب ہے کہ منصور نے جو کچھ کہا تھا خود نہ کہا تھا کیونکہ وہ خود ہی کو مٹا چکے تھے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ۴

گفت فرعون نے انا الحق گشت پست
گفت منصور انا الحق گشت مست
لعنت اللہ آں انا را درفت
رحمتہ اللہ ایں انا را در و نسا۔

(المودة الرحمانية ص ۳)



دستار علی ابن مختار علی۔

مالک مکتبہ تہانوی دیوبند سہارنپور۔

فہرست مضامین حصہ سوم

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۲۹۳	کافر کو عذاب الٰہی ہونے پر شبہ کا جواب	۲۹۳	آسمان کے وجود پر دلیل
۲۹۳	احکام شریعت کی علتیں دریافت کرنا	۲۹۳	فلاسفہ کے دلائل مخدوش
۲۹۳	اس بات کا ثبوت ہے کہ قلب میں غفلت حق نہیں۔	۲۹۳	شریعت سے سائنس متصادم نہیں
۲۹۵	احکام شریعت کو مصالح دنیوی کی بنا	۲۹۳	جدید تعلیم یافتہ کا اسباب علم کو مؤثر حقیقی سمجھنا صحیح نہیں۔
۲۹۵	قرار دینا خطرناک مسلک ہے۔	۲۹۵	ایک مثال
۲۹۵	وضو کا انکار	۲۹۵	مؤثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہے
۲۹۶	قربانی پر اعتراض	۲۹۶	پاگل کا دعویٰ
۲۹۶	قانون عقل پر حاکم ہے	۲۹۶	خدا کا منکر بھی پاگل ہے
۲۹۶	قربانی کا مقصد	۲۹۶	مسلمانوں کی حالت
۲۹۷	کعبہ کا بعض بزرگوں کے استقبال کیلئے جانے کی تحقیق، اور اس پر شبہات کا جواب۔	۲۹۷	کثرت رائے کلبۂ حق ہونے کی دلیل نہیں
۲۹۹	جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اس غلطی کا جواب	۲۹۹	کثرت رائے کی کوئی حقیقت نہیں
۳۰۰	کہ اسلام میں سلطنت جمہوری کی تعلیم ہے	۲۹۹	صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عزیمت
۳۱۰	خدا کے یہاں پریس کہاں ہے	۳۰۰	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جواب دیا
۳۱۰	قانون کی پابندی	۳۰۰	مکہ معظمہ میں ہزاروں جانوروں کا ذبح ہو جانا کیا خلاف عقل ہے؟
۳۱۱	پارلیمنٹ کی حیثیت	۳۰۱	قربانی کی حقیقت
۳۱۲	ایک زمانہ میں دونوں	۳۰۱	جماعت علماء کو نکما سمجھنا صحیح نہیں
۳۱۲	قصہ سامری	۳۰۲	مضویٰ اللہ علیہ کے پیچھے سے دیکھنے پر شبہ کا جواب

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۳۱۳	تابع اور متبوع	۳۲۹	علماء ہند
۳۱۳	شخصی حکومت	۳۳۰	ایک واقعہ
۳۱۴	سرسید اور مولانا جیسین میں مکالمہ	۳۳۰	ایک رئیس کا قصہ
۳۱۴	کثرت رائے پر	۳۳۱	انسانی کوشش
۳۱۵	شخصی سلطنت	۳۳۱	ہر بات کی دلیل قرآن شریف سے طلب
۳۱۵	حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ	۳۳۲	کرنا غلطی ہے۔
۳۱۶	مشورہ کا درجہ	۳۳۲	ایک عام غلطی
۳۱۶	مشورہ پر عمل ضروری نہیں	۳۳۲	ایک مثال
۳۱۷	امن عامہ کامل طور پر ردین پر قائم ہونے سے	۳۳۳	شریعت کے دلائل
۳۱۷	ہی حاصل ہو سکتا ہے۔	۳۳۳	حدیث رسول ﷺ
۳۱۸	عقائد	۳۳۳	اجماع امت
۳۱۹	مذہبی طاقت کی مثال	۳۳۴	قیاس
۳۱۹	خوف خدا کا اثر	۳۳۴	صحیح دلیل
۳۲۰	اعمال کا دخل	۳۳۴	آزادی کے معنی
۳۲۰	خدا کی خدائی پر اعتقاد کا نتیجہ	۳۳۵	اس اعتراض کا جواب کہ علماء کو لیکچر دینا
۳۲۰	اعمال دین کے اثرات	۳۳۵	نہیں آتا۔
۳۲۲	عقائد و اعمال کی خاصیت	۳۳۶	سادگی
۳۲۳	دین میں تنگی اور دشواری نہیں ہے	۳۳۶	سادگی کے ساتھ صفائی
۳۲۳	ایک حکایت	۳۳۷	اردو زبان کی خصوصیت
۳۲۴	دشواریوں کی قسمیں	۳۳۷	اصل اردو
۳۲۵	ایک مثال	۳۳۸	ہم تہذیب میں دوسری قوموں کے محتاج نہیں ہیں
۳۲۷	ایک اشکال اور اس کا حل	۳۳۸	حضور صلی اللہ علیہ وسلم امریکہ تشریف نہیں لے گئے تو پھر حضور ﷺ کی بعثت عام کیسے ہوئی؟
۳۲۸	بندگی سے قوت آتی ہے	۳۳۹	
۳۲۸	چاندی کا مسئلہ		

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۳۲۸	انسان محتاج محض ہے	۳۲۹	جب انسان کی تقدیر میں یہ لکھ دیا گیا
۳۲۹	محتاجی کی وجہ	۳۲۹	کہ وہ فلاں گناہ کرے گا تو پھر انسان مجرم کیوں؟
۳۲۹	اللہ تعالیٰ محتاج نہیں	۳۳۰	اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے سلطنت
۳۲۹	شاہزادہ ایران کا واقعہ	۳۳۱	چھین کر کفار کو کس لئے دیدی۔
۳۵۰	اس حکایت کا خلاصہ	۳۳۱	اس اعتراض کا جواب کہ سود کے بند
۳۵۰	پردہ مروجہ پر اعتراض کا جواب	۳۳۲	کر دینے سے ہماری قوم پر تباہی
۳۵۱	عورت کا پردہ	۳۳۲	آگئی۔
۳۵۱	پردہ تعلیم کیلئے مضر نہیں	۳۳۲	ترقی خوش معاہدگی میں ہے
۳۵۲	پردہ کی وجہ	۳۳۳	بد معاہدگی کا انجام
۳۵۲	پردہ کی اہمیت	۳۳۳	کیا تمام علوم قرآن شریف میں ہیں
۳۵۳	خود سرور کائنات کا عمل	۳۳۳	ہر تحقیق کی جستجو قرآن میں
۳۵۳	حضرت یوسف علیہ السلام کا قول	۳۳۴	درست نہیں۔
۳۵۳	نفس کی پاکی کا دعویٰ	۳۳۴	اس شبہ کا جواب کہ زکوٰۃ دینے
۳۵۴	ازواج مطہرات کا پردہ	۳۳۴	سے مال کم ہوتا ہے بڑھتا کہاں ہے۔
۳۵۴	علماء ترقی سے مانع نہیں ہیں	۳۳۵	اس شبہ کا جواب کہ دیندار لوگ
۳۵۵	ترقی محمود مطلوب ہے	۳۳۵	مصائب میں زیادہ مبتلا رہتے
۳۵۶	علماء پر غلط الزام	۳۳۵	ہیں۔
۳۵۷	ریل کا ایک واقعہ	۳۳۵	اہل اللہ کا حال
۳۵۷	علماء بتانے والے ہیں	۳۳۶	ناول بینی کی مضرتیں
۳۵۸	انسان کا مقصد	۳۳۶	ناول زیادہ نقصان دہ ہے
۳۵۸	عزت و مال مطلوب ہیں	۳۳۷	اس شبہ کا جواب کہ قرآن مجید میں
۳۵۹	حکایت وزیر بھوپال	۳۳۸	تکرار مضامین کیوں ہے
۳۵۹	دین سے بے رغبتی	۳۳۸	تکرار مضامین کی وجہ
۳۶۰	اس تکیہ کلام اور مشہور اعتراض کا		
	جواب کہ فلاں بات خلاف عقل ہے		

آسمان کے وجود پر دلیل

اہل سائنس کا دعویٰ ہے کہ آسمان کا وجود نہیں، ستارے سب فضا میں گھوم رہے ہیں، تو دیکھو یہ مسئلہ طنی ہے یا یقینی، تو سائنس کی رو سے علم قطعی طور سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ آج تک جتنی دلیلیں نفی آسمان پر قائم کی گئیں ان سب کا خلاصہ عدم العلم ہے جو کہ عدم وجود کو مستلزم نہیں اور وجود آسمان دلیل قطعی سے ثابت ہے کیونکہ وجود آسمان فی نفسہ ممکن ہے یعنی آسمان کا وجود عدم دونوں عقلاً برابر ہیں اور عین عقلی مقدمہ ہے کہ جس ممکن کے وجود کی خبر کوئی تجربہ جو قطعاً صادق ہو، دیتا ہو تو اس ممکن کا وجود ثابت قطعی ہوتا ہے۔ اور اس کے وجود کی خبر ایک مخبر صادق یعنی قرآن شریف نے دی ہے۔ پس ان تینوں مقدموں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی کہ آسمان موجود ہے۔ اور آسمان کے ممکن الوجود ہونے کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ جب یہ عقلاً ممکن ہے یعنی نہ واجب ہے اور نہ ممتنع، پس نہ ضروری الوجود ہوا نہ ضروری عدم تو عقل اس کے وجود یا عدم کی بابت کوئی فیصلہ کر ہی نہیں سکتی۔ زیادہ سے زیادہ اگر کہا جاسکتا ہے تو صرف اس قدر کہ ہم کو از روئے عقل وجود کا پتہ نہیں چلا اور معلوم ہے کہ عدم ثبوت اور ثبوت عدم میں زمین اور آسمان کا فرق ہے امریکہ کا وجود جس وقت تک ہم لوگوں کو ثابت نہ تھا اس وقت تک بھی ہم یوں نہیں کہہ سکتے تھے کہ امریکہ موجود نہیں ہے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا تھا کہ ہم کو وجود امریکہ کا علم نہیں ہے۔ پس اہل سائنس یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو آسمان کے وجود کا پتہ نہیں چلتا اور یہ ہم کو مضر نہیں کیونکہ ہم تقریر سابق سے آن کو وجود آسمان تسلیم کر دیں گے۔ البتہ اس کے ضروری الوجود نہ ہونے پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اہل یونان نے وجود آسمان پر عقلی دلائل قائم کئے ہیں۔

لے نہ ہونا آسمان کے نہ ہونے سے علم کا نہ ہونا کلمہ خبر دینے والا

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۳۶۰	اس رائے کا جواب کہ مولوی سب	۳۶۰	اسلئے قابل قبول نہیں۔
۳۶۱	باہم متفق ہو جائیں تو سارا باہمی نزاع	۳۶۱	انسان کی پیدائش
۳۶۲	دور ہو جائے۔	۳۶۲	خلاف عادت اور خلاف عقل میں فرق
۳۶۲	اختلاف کی وجہ	۳۶۲	خلاف عادت اور خلاف عقل میں فرق
۳۶۳	دو عورت میں مساوات اور اس	۳۶۳	لوگوں کا موجودہ ذوق
۳۶۴	کا فیصلہ۔	۳۶۴	دینی امور کی دلیل
۳۶۴	مرد و عورت کی خلقت میں فرق	۳۶۴	پل صراط پر چلنا
۳۶۸	تعلیم یافتوں کا حال	۳۶۴	کسی واقعہ کا ثبوت نظیر پر
۳۶۸	انتظام کا تقاضا	۳۶۵	موقوف نہیں۔
۳۶۹	عورتوں کو حاکم بنانا	۳۶۵	پل صراط کیا ہے
۳۶۹	اس شبہ کا جواب کہ غیر مسلم اگر مہذب	۳۶۶	دنیا میں اختلاف حالات
۳۸۰	ہوں تو ناجی کیوں نہیں۔	۳۶۶	ایک حدیث کی تشریح
۳۸۱	غیر مسلم کے ناجی نہ ہونے کی وجہ	۳۶۸	شریعت پر عمل
۳۸۱	حصہ سوم ختم شد	۳۶۹	عقل کی مثال
۳۶۹		۳۶۹	قانون سلطنت کیوں مانتے ہیں
۳۷۰		۳۷۰	کہیں عقل کو چھوڑنا بھی چاہیے
۳۷۱		۳۷۱	رسول ماننے کا ماحصل
۳۷۱		۳۷۱	عقل کو چھوڑنا پڑتا ہے
۳۷۲		۳۷۲	محض عقل کافی نہیں ہے
۳۷۲		۳۷۲	افراط عقل کا نتیجہ
۳۷۳		۳۷۳	قوت شہوانیہ
۳۷۳		۳۷۳	قوت غضبیہ
۳۷۳		۳۷۳	اخلاق پسندیدہ
۳۷۴		۳۷۴	شریعت کی نزاکت

فلاسفہ کے دلائل مخدوش | اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفہ یونان کے دلائل قریب قریب سب مخدوش ہیں

جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں، واقعیت یہی ہے کہ عقل سے نہ آسمان کا وجود ثابت ہوتا ہے نہ عدم، رہی یہ بات کہ علی العموم اس نیلگوں رنگ کو جو جانب فوق میں نظر آتا ہے آسمان سمجھا جاتا ہے۔ اور آج یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ یہ نیلگوں رنگ آسمان نہیں ہے۔

اس کے جواب میں میں کہتا ہوں کہ اول تو جن دلائل سے یہ ثابت ہوا ہے۔ وہ خود ابھی مخدوش ہیں اور بنا بر الفاسد علی الفاسد ہے۔ دوسرے اگر ثابت ہو بھی جائے کہ یہ رنگ آسمان نہیں ہے تب بھی اس سے عدم وجود آسمان نہیں ثابت ہوتا۔ ممکن ہے کہ آسمان اس سے آگے ہو۔

شریعت سے سائنس متصادم نہیں | پس یہ کہنا کہ آسمان کا وجود جو کہ شریعت سے ثابت

ہے دلائل سائنس سے متصادم ہے سخت غلطی ہے کیونکہ سائنس اس میں بالکل ساکت ہے اور قرآن شریف ناطق، اور تصادم و تعارض ناطقین میں ہوتا ہے۔ ساکت و ناطق میں نہیں ہو سکتا۔ اور جب تعارض نہیں ہے تو سہار کی تفسیر کو اکب یا مافوقنا وغیرہ کرنے کی ضرورت نہیں اور یہ تفسیر یقیناً تحریف ہوگی۔ اور ایسے محرفین کی بابت یہ کہنا صحیح ہے کہ انھوں نے وحی کو معیار نہیں بنایا کیونکہ باوجود وحی کو ماننے کے اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی۔

رتقویم الزیغ ص ۱۱

(۲) جدید تعلیم یافتہ کا اسباب علم کو مؤثر حقیقی سمجھنا صحیح نہیں

جواب:۔ فرمایا، نئے خیال کے لوگ اسباب علم پر ایسے جمع ہیں کہ مسبب الاسباب کو چھوڑ ہی دیا۔ اسباب طبعیہ کے آثار کو لازم سمجھ کر تصرفات حق تعالیٰ کے منکر ہو گئے اور غلطی ان کی یہ ہوئی کہ کسی اثر کے دوام سے اس کا ضروری ہونا اعتقاد کر لیا مثلاً آگ کا اثر ہے جلانا۔ اس کے دوام سے یہ سمجھنا کہ یہ اس کا ذاتی اثر ہے انفکاک تصور نہیں اور سخت غلطی ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے قصہ ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق آیت قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا۔ میں تاویلات بعیدہ کیس یہ سمجھ کر کہ آگ کیونکر ٹھنڈی ہو سکتی ہے۔

ایک مثال

اس غلطی کی ایسی مثال ہے کہ ریل دواؤں کی اصطلاح میں گاڑی روکنے کے لئے سُرُخ جھنڈی ہوتی ہے ایک نادان بار بار اس کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگے کہ خود اس جھنڈی میں یہ اثر ہے کہ اس سے گاڑی رُک جاتی ہے کیونکہ جب دیکھا تو ایسا ہی نظر آیا۔ اور جو لوگ حقیقت جانتے ہیں وہ کہیں گے کہ روکنے والا اصل میں ڈرائیور ہے باقی یہ جھنڈی محض علامت ہے اس میں کوئی اثر ذاتی نہیں۔ ایسے ہی بغیر حکم حق ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ زبان سے جو الفاظ نکلے ہیں ہر حرف پر حکم جدید ہوتا ہے تو زبان حرکت کرتی ہے تمام عالم میں ایسا ہی تصرف جاری ہے۔ افسوس منکرین نے دوام سے ضروری ہونا اعتقاد کر لیا اور تصرف حق کے منکر ہو گئے۔

(ملفوظ نمبر ۲۵ دعوات عبدیت حصہ ۲)

موثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہے

بعض لوگ ایسے گھڑنے والے ہیں جو مشیت حق ہی کے معتقد نہیں۔ بلکہ اسباب پر ہی ہر چیز

کا مدار رکھتے ہیں حالانکہ حق تعالیٰ نے تعطیل اسباب فی بعض الاوقات کو جائزاً ظاہر فرمایا ہے۔ اور اگر اسباب کی حقیقت پر غور کیا جائے تو عقلاً بھی خدا تعالیٰ کی مشیت کو موثر ماننا ضروری ہے۔ کیونکہ میں کہتا ہوں کہ جس حادثہ کے لئے آپ نے ایک دوسری شئی کو سبب مانا ہو وہ سبب بھی تو ایک حادثہ ہے اس کے لئے کون سبب ہوا۔ اگر اس کے لئے آپ نے تیسری چیز کو سبب بنایا ہم اس میں بھی کلام کریں گے تو اس سلسلہ ممکنات کو لامحالہ واجب پر منتہی کیا جائے گا ورنہ تسلسل لازم آئے گا اور لامتناہی کے ابطال پر متکلیف دلائل قائم کر چکے ہیں۔ اور یہ حکما کی حماقت ہے کہ وہ اجزاء عالم کو حادثات بالمشخص اور قدیم بالذات کہتے ہیں کہ ہر فرد تو حادثہ ہے مگر نوع قدیم ہے حالانکہ وہ خود اس کے بھی قائل ہیں کہ نوع کا وجود بدون شخص کے نہیں ہو سکتا۔ پھر جب ہر شخص حادثہ ہے تو نوع قدیم کا تحقق کیسے ہوگا۔ غرض دلائل عقلیہ سے بھی اور تقلید سے بھی مشیت حق کا موثر اصلی ہونا ہر طرح ثابت ہے۔ اور جو شخص ہر بات میں تسلیم ہی کا سبق پڑھے اس کا علاج متکلیف نے احراق بالنار بتلایا ہے۔ نیز فطرۃ حق تعالیٰ کی ہستی اور قدرت ماننے کی چیز ہے۔ اور ماننے کی چیز کو نہ مانتا محکم ہے اور محکم کا تو کوئی بھی جواب نہیں۔

پاگل کا دعویٰ

جیسے ایک مجنون پاخانہ کھارہا تھا کسی نے ملامت کی۔ تو کہا اس میں حرج ہی کیا ہے یہ وہی تو ہے جو تھوڑی دیر پہلے ہم نے داخل کیا تھا اب

وہ ہمارے اندر سے نکل کر برا کیوں ہو گیا۔ ذرا عقلاً کسی عقلی دلیل سے اس کا جواب دیں مگر عرف اور طبیعت سے کام نہ لیں محض عقلی دلیل سے اس کے دعوے کو باطل کریں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اس کے ابطال پر وہ کوئی دلیل قائم نہ کر سکیں گے۔ مگر کیا اس سے کوئی یہ کہے گا کہ اس مجنون کی بات صحیح ہے؟ ہرگز نہیں، سب یوں ہی کہیں گے کہ وہ نالائق پاگل ہے جو نہ ماننے کی چیز کو بھی نہیں مانتا جو اجماعاً ماننے کی چیز ہے۔

خدا کا منکر بھی پاگل ہے

اسی طرح ہم منکر صانع کو پاگل سمجھتے ہیں کیونکہ وہ بھی ایسی ماننے کی چیز کو نہیں مانتا جس کے

لے خدا کا انکار کرنے والا۔

ماننے پر اجماع عقلا و اتفاق مذاہب ہے اور ضرورت فطرت اس پر مزید، یہ تو کامل درجے کی دہریت ہے کہ خدا ہی کو نہ مانے اور ایک قسم کی دہریت یہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ کو تو مانے اور اس کی قدرت و مشیت کو کامل نہ مانے بلکہ یہ پہلی قسم سے بھی بدتر ہے کیونکہ یہ شخص خدا کا قائل ہے اور محض برائے نام قائل ہے۔ جیسے کوئی یوں کہے کہ فلاں بادشاہ تو ہے مگر پیشن یافتہ ہے کہ اسے اختیارات کچھ نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ خدا تعالیٰ کو ایسا قادر مانتے ہیں جیسے گھڑی کا کوکنے والا کہ کوک بھر دیئے کے بعد گھڑی کے چلنے میں اس کے اختیار کو کچھ دخل نہیں بلکہ اب وہ خود بخود چلتی رہے گی چاہے کوک دینے والا زندہ ہو یا نہ ہو جب تک کوک بھری ہوئی ہے اس وقت تک گھڑی کو اس کی کچھ ضرورت نہیں۔ ایسے ہی یہ لوگ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا کام اتنا ہے کہ اسباب کو پیدا کر دیا اب اسباب سے مسبات اور علل سے معلولات کا وجود خود بخود ہوتا رہے گا۔ نعوذ باللہ اس تاثر و تاثیر میں حق تعالیٰ کا کچھ بھی اختیار نہیں وہ اسباب سے مسبب کو مختلف نہیں کر سکتے۔ بس ان لوگوں کا خدا کو مانتا ایسا ہے جیسے بعض لوگ۔ من تشبہ بقوم فهو منهم۔ سے بچنے کیلئے کوٹ پتلون اور بوٹ سوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی پہنتے ہیں کہ ساری ہیئت کو کفار کی سی ہے صرف ٹوپی سے آپ مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے ہی یہ لوگ حق تعالیٰ کے لئے قدرت و اختیار تو ایسا ضعیف مانتے ہیں جیسا کہ دہری منکر صانع مانتا ہے کیونکہ جیسا اختیار یہ مان رہے ہیں وہ بھی ماننے کے مثل ہے مگر الزام دہریت سے بچنے کیلئے برائے نام یوں کہتے ہیں کہ خدا موجود ہے۔ اور بعض لوگ خدا تعالیٰ کو بھی مانتے ہیں اور انکی قدرت و اختیار کو کامل بھی مانتے ہیں جیسے عامہ مسلمین۔

مسلمانوں کی حالت

مگر سچ یہ ہے کہ یہ بھی محض زبان ہی سے خدا تعالیٰ کی قدرت کو کامل کہتے ہیں دل سے یہ بھی کامل نہیں مانتے چنانچہ

مصاب و حوادث میں ہم اپنے قلب میں وہی ضعف پاتے ہیں جو قائل دہریت کے قلب میں ہوتا ہے ہم نے مانا کہ طبیعت کا بھی ایک اقتضار ہوتا ہے مگر پھر بھی طبیعت کے اقتضائیں اعتقاد کی وجہ سے کچھ تو فرق ہونا چاہئے۔ جیسے گرم پانی جو بہت گرم ہو جس کی حرارت ناگوار ہو اس میں ٹھنڈا پانی مل جانے سے کچھ تو فرق ضرور ہوتا ہے اب حرارت ناگوار نہیں ہوتی اسی طرح اعتقاد قدرت الہیہ کی برودت سے طبعی خلجان میں کچھ تو کمی ہونا چاہئے۔ ہاں اگر کوئی یہ کہے کہ فرق تو ہے مگر چونکہ ہمارا اقرار ضعیف ہے اس لئے اس فرق کا ظہور نہیں ہوا جیسے گرم پانی کے ایک ٹکے میں لوٹا بھر ٹھنڈا پانی ملا جائے تو پہلے سے گرمی میں کمی تو ضرور ہوگی مگر اس کا احساس بھی نہ ہوگا۔ میں تو کہتا ہوں کہ

جوشے اپنے اثر سے خالی ہو وہ معتبر نہیں جس چیز پر غایت مرتب نہ ہو وہ غیر معتبر ہے۔ اسلئے یہ اعتقاد جس کا اثر کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتا معتبر نہیں دنیا میں تو اس سے کچھ نفع نہیں ہوگا گو آخرت میں کسی مدت کے بعد کام آجائے۔
(خیر الحیات و خیر المات ص ۵)

(۳) کثرت رائے کلیۃً حق ہونی کی دلیل نہیں

جواب (۱) :- آج کل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرت رائے ہو وہ بات حق ہوتی ہے! یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر یہ بھی معلوم ہے کہ رائے سے کس کی رائے مراد ہے۔ کیا ان عوام کا لانعام کی؟ اگر انھیں کی رائے مراد ہے تو کیا وجہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا۔ ساری قوم ایک طرف رہی اور ہود علیہ السلام ایک طرف۔ آخر انھوں نے توحید کو چھوڑ کر کیوں بت پرستی اختیار نہ کی، کیوں تقریق قوم کا الزام نہ لیا۔ اسی لئے کہ وہ قوم جاہل تھی اس کی رائے جاہلانہ تھی۔ آج کل علماء پر یہی الزام لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے قوم میں پھوٹ ڈالی یہ اتفاق نہیں ہونے دیتے۔ (فضائل العلم و الخشیہ ص ۳)

جواب (۲) :- (غزوہ اہد میں) ان پچاس آدمیوں میں جو پہاڑ کی گھاٹی پر متعین کر دیے گئے تھے اختلاف ہوا۔ بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہوگئی ہے اب ہم کو گھاٹی پر رہنے کی ضرورت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس غرض کیلئے ہم کو یہاں متعین کیا تھا وہ غرض حاصل ہو چکی اسلئے حکم قرار بھی ختم ہو گیا۔ اب یہاں سے ہٹنے میں حضور کے مقصود کی مخالفت نہ ہوگی اور ہم نے اب تک جنگ میں کچھ حصہ نہیں لیا تو کچھ ہم کو بھی کرنا چاہئے ہمارے بھائی کفار کا ثقیل کر رہے ہیں ہم کو مال غنیمت جمع کر لینا چاہئے۔ بعض نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا حضور نے صاف فرما دیا تھا کہ بدو میری اجازت کے یہاں سے نہ ہٹنا۔ اسلئے ہم کو بدو آپ کی اجازت کے ہرگز نہ ہٹنا چاہئے۔

مگر پہلی رائے والوں نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔ یہ ان سے اجتہاد و غلطی ہوئی اور گھاٹی پر صرف دس آدمی اور ایک انصران کے رہ گئے۔

(اس واقعہ میں کثرت رائے غلطی پر تھی اور قلب رائے صواب پر تھی)

جو لوگ کثرت رائے کو علامت حق سمجھتے ہیں وہ اس سے سبق حاصل کریں۔ (ذم النبیان ص ۱۲)

صرف کثرت رائے کی کوئی حقیقت نہیں

کے دھال کے بعد کچھ قبائل مرتد ہو گئے تھے جن میں بعض تو مسیلہ کذاب وغیرہ مدعیان نبوت کے ساتھ ہو گئے تھے۔ اور بعض لوگ کسی کے ساتھ تو نہیں ہوئے بلکہ ظاہر میں اپنے کو مسلمان کہتے رہے۔ توحید و رسالت کے مقرر ہے۔ کعبہ کو قبلہ مانتے رہے۔ نماز کی فرضیت کے قائل رہے۔ مگر زکوٰۃ کی فرضیت سے منکر ہو گئے اور یہ کہا کہ فرضیت زکوٰۃ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے مخصوص تھی، اب فرض نہیں اور علت یہ بتلائی کہ حضور کے زمانے میں مسلمانوں پر فقر زیادہ تھا۔ اسلئے اس وقت زکوٰۃ کی ضرورت تھی۔ اب وہ حالت نہیں رہی اسلئے فرضیت بھی باقی نہیں رہی۔ جیسے آج کل بھی بہت سے لوگ اس قسم کی تاویلین کیا کرتے ہیں۔

یہ پہلی جماعت کے بارہ میں سب صحابہ کی بالاتفاق یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ جہاد کیا جائے مگر دوسری جماعت کے حق میں سب کی رائے نرم تھی۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بھی یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ نرمی کی جائے اور جو کھلے کافر ہیں صرف ان سے لڑائی کی جائے۔ ان لوگوں پر جہاد نہ کیا جائے۔

صدیق اکبر کی عزیمت

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رائے اس دوسری جماعت کے متعلق بھی وہی تھی جو اور مرتدین کے متعلق تھی وہ ان لوگوں کو کافر کہتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس کے ساتھ قتال کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ یہ لوگ تو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتے ہیں۔ ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں ان پر کیونکر جہاد ہو سکتا ہے۔ اور ان کو کفار کی طرح کیسے قتل کیا جاسکتا ہے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ سب کچھ سہی مگر یہ لوگ نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں کہ نماز تو فرض مانتے ہیں اور زکوٰۃ کو فرض نہیں مانتے حالانکہ شریعت نے دونوں کو فرض کیا ہے تو یہ لوگ فرض قطعی کے منکر ہیں اور ان لوگوں نے دین کو بدل دیا ہے اور حضور کا ارشاد ہے من بدل دینہ فاقتلوا، اس لئے میں ان کے ساتھ قتال کروں گا۔

حضرت عمرؓ کو جواب دیا

صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اجبار فی الجاہلیۃ غوار فی الاسلام، واللہ یومنعوف عقلاً وفی روایۃ عن اقا کنا یودونہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا قاتلہم علیہ۔

ترجمہ :- اے عمر! یہ کیا کہ تم جاہلیت میں تو زبردست تھے اور اسلام میں اتنے بودے ہو گئے۔ بخدا اگر یہ لوگ ایک رسی کو یا بکری کے بچہ کو بھی روکیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے تو میں اس پر بھی ان سے قتال کروں گا۔

اور یہ بھی فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی **لَنْ يَكْفُرَ بِلِلّٰهِ مَعَنَا** تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس وقت میں بھی تھا۔ تو خدا تعالیٰ میرے ساتھ بھی ہیں اگر میں تنہا بھی جہاد کو نکل کھڑا ہوں گا تو خدا تعالیٰ میرے ساتھ ہیں انشاء اللہ میں تمام دنیا پر غالب آؤں گا۔ کیا انتہا ہے اس قوت قلب کی۔

چنانچہ پھر سب صحابہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے پر متفق ہو گئے۔ اس واقعہ سے بھی ان لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہئے جو کثرت رائے کو علامت حق سمجھتے ہوئے ہیں۔
(رزم النبیان ص ۳)

(۴) مکہ معظمہ میں ہزاروں جانوروں کا ذبح ہو جانا کیا خلاف عقل ہے؟

جواب اس کا یہ ہے کہ جناب من ہے تو فحش بات لیکن تفہیم کے لئے عرض ہے کہ اگر تمہاری عقل میں کسی شے کا نہ آنا خلاف عقل ہونے کی دلیل ہے تو ہمارا آپ کا پیدا ہونا جس طریقہ سے ہے وہ بھی عقل کے خلاف ہے اور اس کا امتحان یہ ہے کہ ایک بچہ ایسا تجویز کیا جائے کہ وہ تہہ خانے میں پرورش کیا جائے اور اس کے سامنے کبھی اس کا تذکرہ نہ کیا جائے کہ آدمی

کس طرح پیدا ہوتا ہے حتیٰ کہ جب بیس برس کا ہو جائے تو اس سے دفعۃً کہا جائے کہ آدمی اس طور سے پیدا ہوتا ہے تو ہرگز اس کی عقل میں نہ آئے گا اور ہم چونکہ رات دن دیکھتے ہیں کہ اس طرح سے انسان پیدا ہوتا ہے اس لئے ہم کو خلاف عقل نہیں معلوم ہوتا۔ تو جناب ہم تو جب سے پیدا ہوئے ہیں ہمارے تمام حالات ہی خلاف عقل ہیں۔ ہماری عقل تو بس کھانے کمانے کی ہے۔ ایسے ہی جیسے کسی بھوکے سے پوچھا تھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں کہا چار روٹیاں ایسے ہی ہماری عقل صرف اس قدر ہے کہ کھالو اور پی لو، اور باتیں بناو۔ جب اتنی عقل ہے تو اسرار شریعت کہاں تک سمجھ میں آئیں۔

ایسے ہی نفس اضمحیہ بلا تقسیم لحم کے بھی حکمت ہے۔ اگر ہماری عقل میں نہ آئے تو قابل انکار کیسے ہوگی۔ اور اس لئے ہمارے ذمہ ضروری نہیں ہے کہ اس حکمت دراز کو بیان کریں لیکن تبرعاً بتائے دیتے ہیں۔

وہ یہ ہے کہ اصل میں یہ سنت ابراہیمی کا اتباع ہے۔ اور شے محبوب کا انفاق مقصود ہے اور وہ صرف جانور ذبح کر دینے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ گوشت خواہ رکھیں یا تقسیم کریں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اصل عمل تو یہ تھا کہ بیٹے کو ذبح کریں لیکن اول تو سب کے بیٹا ہوتا نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ حکم ہوتا تو بہت کم ایسے نکلتے جو یہ عمل کرتے۔ یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ جانور کو قائم مقام ذبح ولد کے کر دیا۔ اس لئے یہ کہنا کہ قربانی میں مال ضائع کرنا ہے جیسے بچکل نو تعلیم یافتہ اصحاب کا خیال ہے سراسر غلط ہے اور قربانی کا مقصود اطہار محبت ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور وہ اس میں حاصل ہے پھر مال کہاں ضائع ہوا۔ (ترغیب الاضیہ ص ۱۱)

(۵) جماعت علماء کو نکما سمجھنا صحیح نہیں

برسبیل عظم بیان فرمایا کہ آج کل لوگوں نے علماء کی جماعت کو کم ہمت بیکار و نیکی پلٹن اور کیا کیا خطاب دے رکھے ہیں۔ حالانکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ عربی پڑھنے سے دماغ میں ایک خاص انجلاء ہو جاتا ہے۔ فرض کیجئے اگر دو شخص یکساں دماغ کے انگریزی پڑھیں اور ایک ان میں عربی بھی پڑھا ہوا ہو صرف انگریزی پڑھے ہوئے سے تقریر و تحریر و فہم میں

مقابلہ ضرور زیادہ ہوگا۔ چنانچہ ایک عربی پڑھے ہوئے تھے ان کے فیصلے نہایت مدلل اور پرزور ہوتے تھے ہم لوگ عربی پڑھے ہوئے اگر دنیا کمانے پر آئیں تو آپ لوگوں سے ابھی کمادکھائیں تو فہم کے متعلق تو یہ گفتگو تھی۔ رہی کم ہمتی، اس کا شبہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ لوگ بہت روپے نہیں کمانے کی قلیل پرتفاعت کرتے ہیں تو اس کا جواب ایک سے سمجھ لیجئے۔

اگر کوئی شخص آپ کے یہاں لوکر ہو اور صرف پانچ روپے ماہوار پاتا ہو اور کوئی دوسرا شخص اس کو بیس روپے دینے لگے لیکن وہ یہ کہدے کہ مجھ کو تو یہ پانچ روپے ہی اچھے ہیں آپ نے آقا کو نہ چھوڑوں گا تو سچ کہئے کیا آپ اس کو کم ہمت اور بیکار کا خطاب دیں گے؟ نہیں بلکہ آپ اسکو کہیں گے کہ بڑا عالی ہمت اور وفادار شخص ہے کہ بیس روپیہ پر ملازمت ماردی اور اپنے آقا کو نہ چھوڑا۔ اور اس کے پانچ ہی روپیوں پر قناعت کی۔ پھر تعجب ہے کہ ان لوگوں کو جو علم دین کی خدمت میں رہتے ہیں کیونکہ کم ہمت اور بیکاروں کی پلٹن وغیرہ کے خطاب ملتے ہیں حالانکہ جیسا اوپر کہا گیا اگر یہ مولوی لوگ دنیا کمانے پر آجائیں تو آپ لوگوں سے ابھی کمادکھائیں لیکن پھر باوجود قدرت کے دنیاوی منافع کو چھوڑ کر دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور رکھے سوکھے ٹکڑوں میں خوش ہیں تو انکو کیوں عالی ہمت اور وفادار اپنے آقا یعنی خداوند کریم کا نہیں کہا جاتا۔ آپ لوگ خدمت علماء اور اہل دین کی کرتے ہیں۔ یہ نہ سمجھتے کہ ہمارا احسان ہے۔ آپ تو محض خزانچی ہیں اور خزانچی جو بڑے بڑے عمدہ داروں اور اہل کاروں کی تنخواہیں تقسیم کرتے ہیں یہ ان کا کوئی احسان نہیں ہے بلکہ خزانہ سرکاری ہے۔ خزانچی تو ایک چھوٹی سی تنخواہ کا ملازم ہے اس کے سپرد ہی یہ خدمت ہے اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیجتا ہے اور گردن دبا کر آپ کے ذریعہ سے ان بزرگوں کو اپنا عطیہ پہنچاتا ہے آپ کا کوئی احسان نہیں۔ (ملفوظ نمبر ۱۴۔ دعوات عبدیت حصہ سوم)

(۶) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سے دیکھنے

پر شبہ کا جواب

فرمایا۔ آئینہ میں صورت جب تک نظر آتی ہے جب تک کہ آنکھ کسی دیکھنے والے کی کھلی ہوئی ہو۔ کیونکہ نظر آنے کی حقیقت یہ ہے کہ شعاع آنکھ سے نکل کر آئینہ پر پڑ کر پھر رانی کی

طرف لوٹتی ہے اسلئے صورت نظر پڑتی ہے جب نگاہ نہ کی تو شعاع نہ نکلی۔ تو پھر نظر آنے کا کوئی سبب نہیں۔ غرض آئینہ میں جو نظر آتا ہے وہ کوئی مبائن چیز نہیں بلکہ اس چہرہ پر نگاہ لوٹ کر پڑتی ہے جب مرئی سے اپنی شعاعوں کا تعلق علت ہے رویت کی، پس اگر کسی شخص کو یہ قوت حاصل ہو کہ سیدھی شعاعوں کو مقوس کر سکے تو اس کو پیچھے سے بھی مثل سامنے کے نظر آئے گا۔ چنانچہ صوفیہ کے بعض اشغال میں سر نظر آنے لگتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے سے بھی دیکھتے تھے۔ اور اس کی وجہ میں بعض علماء کہتے ہیں کہ آپ کے سر میں پیچھے کی جانب دوسرا رخ تھے ان سے نظر آتا تھا تو اس کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ ممکن ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے شعاعوں کے مقوس بنانے کی قوت مرحمت فرمائی تھی۔ جب آپ قصد فرماتے آگے دیکھ لیتے اور پیچھے کا قصد کرتے تو پیچھے نظر فرما لیتے ہر شخص میں یہ قوت نہیں اسلئے نظر نہیں آتا۔ اور اس توجیہ کو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ نقل فرماتے ہیں۔ (ملفوظ نمبر ۷۵ ایضاً)

(۷) کافر کو عذاب الہی ہونے پر شبہ کا جواب

جواب (۱)۔ بر سبیل وعظ فرمایا کہ کافر کو جو ابدی عذاب ہے اس میں کوئی ظلم نہیں کیونکہ کافر اللہ کے ہر ہر صفت کے حقوق ضائع کرتا ہے اور اس کی صفات لامتناہی ہیں اور خود ہر صفت کے حقوق بھی غیر متناہی ہیں تو چاہے توبہ تھا کہ ہر صفت کے انکار پر لامتناہی سزا ہوتی اور پھر ہر صفت کے حقوق پر اسی طرح غیر متناہی سزا ہوتی پھر زیادتی کہاں ہوئی۔ بلکہ ایک معنی کر کے کہی ہے۔ بغاوت کی سزا قید دائمی ہی ہوتی ہے جس کا دوام حکام ظاہری کے اختیاریں ہے یعنی تاحیات وہ اپنے باغیوں کے لئے مقرر کرتے ہیں۔ اور جس قسم کا دوام احکام الحاکمین کے اختیار میں ہے یعنی اصلی، وہ اپنے باغیوں کے واسطے تجویز فرمائیں گے اس میں ظلم اور زیادتی کچھ بھی نہیں بلکہ عین عدل ہے۔ (مجادلات مودلت نمبر ۲ حصہ ایضاً)

جواب (۲)۔ سزا مناسب جنایت ہونی چاہئے اور یہاں جنایت متناہی ہے کیونکہ عمر کافر کی متناہی ہے تو سزا بھی متناہی ہونی چاہئے اس کا جواب حصہ اول میں گذر چکا۔

(۸) احکام شریعت کی علتیں دریافت کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ قلب میں عظمت حق نہیں

صاحبو! دین کو لوگوں نے تختہ مشق بنا لیا ہے کہ لوگ اپنی رایوں کا احکام میں دخل دیتے ہیں اور ان کی علتیں گھڑتے ہیں اور علماء سے بھی اس طرح سوال کرتے ہیں کہ امر اس طرح کیوں ہے سود لینا کیوں حرام ہے، فلاں بات کس لئے منع ہے۔ پھر فرمایا کہ میں نے ایک موقع پر اس کے متعلق یہ بیان کیا تھا کہ یہ بات تو مسلم ہے کہ اگر کسی مکان میں ماہرین علوم جدیدہ بیٹھے ہوں اور انجینیر صاحب آن کریں کہیں کہ فوراً اٹھو، یہ مکان گرا چاہتا ہے تو کچھ بھی تامل ٹھہنے میں نہ کریں گے اور علت نہ پوچھی جائے گی اس وجہ سے کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ ایسے فن سے واقف ہیں جو ہم نہیں جانتے اس لئے انکے حکم کی قدر کی جاتی ہے اور اس لئے ان کے کہنے کے موافق عمل کرنے میں تامل نہیں کرتے، نہ علت تلاش کرتے ہیں نہ اس سے علت پوچھتے ہیں بلکہ حکم کی تعمیل کے واسطے تیار ہو جاتے ہیں۔ یا سول سرجن صاحب آکر اگر کوئی دوا بتائیں تو اس میں کچھ بھی چون و چرا نہیں کرتے۔ جانتے ہیں کہ یہ اس فن کا ماہر ہے۔ سمجھنے کی بات ہے کہ جس فن سے یہ لوگ واقف نہیں اس میں لم اور کیف سے کس لئے دخل دیتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کی عظمت مانع ہوتی ہے اس کے احکام کی علت ڈھونڈنے سے۔ اس کی نظیر ایسی سمجھ لیجئے کہ ایک تو کوئی دوست برابر کے مرتبہ کا حکم کرے تو اس کی علت پوچھتے ہیں کہ تم نے یہ حکم کس لئے دیا۔ اور ایک حاکم کی طرف سے کوئی حکم صادر ہو تو ہرگز علت نہیں پوچھتے۔ وجہ یہ ہے کہ دوست کی عظمت اتنی طلب میں نہیں۔ ایک معمولی چیز ہے۔ اور احکام کی عظمت ہے اس لئے حجت نہیں کرتے۔ سو جب خدا تعالیٰ کے احکام کی علل دریافت کی جاتی ہے اس سے تو شبہہ بڑھتا ہے کہ ان کے دل میں حق تعالیٰ کی عظمت نہیں ہے۔ غرض محکوم ہونے کی حیثیت سے علل دریافت کرنا عقلاً بیہودہ امر ہے۔ ہاں طالب علمی کی حیثیت سے بغرض تحقیق فن مضائقہ نہیں۔ مگر وہ منصب صرف طالب علموں کا ہے۔ چنانچہ طلبہ اور شاگرد اساتذہ سے بڑی بڑی جھٹیں کرتے ہیں۔ سنو! اس کیلئے تعلیم فن کی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس اگر ترتیب وار پڑھو۔ پھر اپنے وقت جو امر سمجھنے کا ہے وہ سمجھ لیں اور خود آجائے گا۔ دریافت کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔

خیال تو کیجئے، کلکٹر کا منادی آکر جب حکم سے اطلاع کرتا ہے تو کوئی علت نہیں پوچھتا، افسوس ہے علماء کو بھنگی سے بھی زیادہ ذلیل سمجھنے لگے ہیں۔ علماء درحقیقت منادی کرنے والے اور ناقص احکام ہیں خود موجد احکام نہیں اس لئے ان سے علتیں پوچھنا حماقت نہیں تو کیا ہے۔ پھر جب اپنے ایک فن سیکھا نہیں اور آپ اس سے محض ناقت ہیں تو آپ کو سمجھانا بھی تو ایسا ہی ہوگا جیسے ایک سائیس کو اقلیدس کی اشکال سمجھانے لگیں۔ تودہ کیا سمجھے گا؟ اس کی تدبیر تو یہی ہے کہ پہلے اسکو اقلیدس کے مبادی سمجھا دو۔ جو اشکال کی موقوف علیہ ہیں پھر اشکال سمجھاؤ تو خوب سمجھے گا۔ علماء آجکل اپنے کی وجہ سے لوگوں کی رائے پر چلنے لگے ہیں جس سے عوام کی جرأت بڑھ گئی ہے۔ ایسا نہیں چاہئے۔ علماء کیا نوکر ہیں کہ بے فائدہ دماغ خالی کریں۔

(مجادلات معدلت نمبہ حصہ سوم دعوات عبدیت)

(۱۹) احکام شریعت کو مصالح دنیوی کی بنا قرار دینا خطرناک مسلک ہے۔

اس طرز تقریر میں زہر بھرا ہوا ہے جو اس کو جان لے گا وہ سمجھ جائے گا۔ یہ لوگ ایسے اسرار بیان کر کے اسلام کے ساتھ دوستی نہیں کرتے بلکہ دشمنی کرتے ہیں اور یہ حائے اسلام نہیں بلکہ اسلام کے نادان دوست ہیں۔ ص

”دوستی بے خرد چوں دشمنی ست“

اب میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ اس تقریر میں زہر کیا ہے۔ اس میں مضمون کا حاصل یہ ہے کہ بس اصل چیز تو اتفاق ہے اور جماعت پنجگانہ اور جمعہ وعیدین دج اسی اتفاق کے پیدا کرنے کے واسطے ذرائع و وسائل ہیں۔ تو عجب نہیں کہ بعض لوگوں پر اس کا یہ اثر ہو کہ وہ ان احکام کو مقصود بالذات نہ سمجھیں اور اگر کبھی کسی دوسرے طریق سے اتفاق ممکن ہو تو وہ سب آسانی سے جماعت اور نماز دونوں کے چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان کے خیال میں تو یہ سب احکام حصول اتفاق کیلئے مقرر ہوئے ہیں۔ اور انکو کلب جانے اور تھیر میں مل کر شریک ہونے سے بھی یہ بات حاصل ہو سکتی جہاں راحت ہے آرام کرسی اور گدے تکیوں پر جگہ ملتی ہے تو وہ خواہ مخواہ

مسجد میں کیوں آنے لگے اور وضو اور نماز کی مشقت کیوں برداشت کرنے لگے۔

وضو کا انکار چنانچہ اس وقت ان تقریروں کا یہ ضرر نمایاں ہو رہا ہے اخباروں میں ایک شخص کا قول شائع ہوا تھا کہ وضو کی ضرورت ابتدائے اسلام میں تھی آج کل نہیں ہے کیونکہ اس وقت بددی لوگ پاک صاف نہ رہتے تھے۔ جنگل کے کاروبار سے غبار آلودہ آتے تھے اسلئے ان کو وضو کا حکم کیا گیا۔ اور ہم لوگ آج کل ہم لوگ صفائی کا بہت اہتمام رکھتے ہیں ہر وقت موزے اور دستائے چڑھائے رہتے ہیں جن کی وجہ سے ہاتھ بیکر گرد سے محفوظ رہتے ہیں ہم کو وضو کی ضرورت نہیں۔

یہ نتیجہ ہے ایسے اسرائیلیان کرنے کا کہ اب ہر شخص اس قسم کی مصلحتوں ہی کو مقصود سمجھنے لگا اور اس شخص سے کچھ بھی تعجب نہیں کہ وہ نماز کو بھی چھوڑ دے اور یہ کہے کہ نماز کی ضرورت ابتدائے اسلام میں اسلئے تھی کہ اس زمانے کے لوگ جاہلیت کی وجہ سے بڑے متکبر و سرکش ہوتے تھے اور ان کو مہذب بنانے کے لئے یہ افعال تواضع و خشوع کے تعلیم فرمائے گئے تھے۔ اور ہم لوگ تعلیم یافتہ ہیں ہمارے اندر تعلیم سے تہذیب پیدا ہو گئی ہے ہم کو نماز کی کیا ضرورت ہے۔

قربانی پر اعتراض اسی طرح قربانی کے متعلق ایک شخص نے جو کہ مسلمان ہیں انگلستان سے مجھ کو لکھا تھا کہ قربانی شریعت کو مقصود نہیں اور یہ بالکل خلاف عقل ہے کہ ایک دن میں اتنے جانوروں کو ذبح کیا جاوے جن کا گوشت آدمیوں سے کھایا بھی نہ جائے۔ چنانچہ اس لئے منی میں قربانی کرتے ہی جانوروں کو کھیتوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ غضب یہ ہے کہ آج کل خدا پر بھی عقل کی حکومت ہونے لگی۔ صد افسوس ہے۔

۱۔ ان حضرات نے منی میں کھیتوں کے اندر جانوروں کے دبائے کی جویہ وجر بتلائی کہ اتنا گوشت آدمیوں سے کھایا نہیں جاتا یہ بالکل غلط ہے کیونکہ موسم حج پر جتنے آدمی جمع ہوتے ہیں سب کے سب مالدار نہیں ہوتے اور نہ سب قربانی کرتے ہیں بلکہ حجاج میں زیادہ تر غرباء ہوتے ہیں۔ ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ اگر منی کے قربانی کا سارا گوشت حجاج میں اور بدویوں میں تقسیم کر دیا جائے تو وہ ہرگز سب کو کافی نہ ہوگا بلکہ بہت لوگ پھر بھی محروم رہ جائیں بلکہ منی میں قربانی کے جانوروں کو محض ڈاکٹروں کی رائے سے دیا جاتا ہے۔

بس اس خلاف عقل حرکت کے جواب وہ ڈاکٹر ہیں جن کی رائے سے ایسا کیا جاتا ہے۔

قانون عقل حاکم ہے

میں کہتا ہوں کہ ایک بچہ اگر کسی مجرم کو سزا دے اور مجرم یہ کہے کہ یہ سزا تو عقل کے خلاف ہے تو کیا وہ اس بات کی سماعت کرے گا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ صاف یہ کہے گا کہ قانون پر تمہاری عقل کی حکومت نہیں بلکہ قانون عقل پر حاکم ہے۔ اور اس کے اس جواب کو سب عقلاء تسلیم کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ قانون الہی کو آج کل کے مسلمان اپنی عقل پر حاکم نہیں مانتے بلکہ اس کو اپنی عقل کے تابع کرنا چاہتے ہیں اور یہ جواب علی سبیل التسلل ہے۔ ورنہ قانون الہی تو بالکل عقل کے مطابق ہے بشرطیکہ عقل سلیم ہو۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ہر شخص کی عقل میں اس کی حکمتیں آجایا کریں۔ آخر پارلیمنٹ کے عقلاء جو قوانین تجویز کرتے ہیں کیا ہر عامی کی عقل اس کے مصالحت تک پہنچ جاتی ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ اس کے مصالحت و حکم کو خاص خاص حکام ہی سمجھتے ہیں۔ پھر قانون الہی کی حکمتوں اور مصالحت کو ہر شخص اپنی عقل سے کیوں معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اور یہاں یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ قانون الہی عقل کے مطابق ضرور ہے مگر ہماری عقلیں اس کے مصالحت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ خاص خاص لوگ ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں اور بالفرض اگر کسی قانون کی حکمت خاص لوگوں کی عقل میں بھی نہ آئے تو قانون کے بدلنے کا کسی کو اختیار نہیں کیونکہ قانون پر عقل حاکم نہیں بلکہ اس کی ماتحت اور اس کی تابع ہے۔

قربانی کا مقصد

غرض ان حضرات نے مجھے لکھا کہ قربانی خود شریعت کو مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود غرباء کی امداد ہے اور ابتدائے اسلام میں لوگوں کے پاس نقد کم تھا۔ موسیٰ زیادہ تھے۔ اسلئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ جانور ذبح کر کے غرباء کو گوشت دید۔ اور اس زمانہ میں نقد بھی بہت موجود ہے۔ غلہ بھی موجود ہے۔ پس آج کل بجائے قربانی کرنے کے نقد دینے سے غرباء کی امداد کرنا چاہئے۔ تو اس شخص نے قربانی کی حکمت امداد غرباء سمجھ کر جب یہ دیکھا کہ یہ حکمت دوسرے طریقہ سے بھی بآسانی حاصل ہو سکتی ہے۔ قربانی چھوڑنے کا ارادہ کر لیا حالانکہ یہ حکمت مقصود ہی نہیں بلکہ مقصود تو تعمیل حکم ہے۔ اگر یہ حکمت مقصود ہوتی تو اسکی کیا وجہ کہ غرباء کو زندہ جانور دینے سے واجب ادا نہیں ہوتا۔ اگر اس زمانے میں نقد اور غلہ کم تھا اور موسیٰ زیادہ تھے۔ اسلئے جانوروں کے ذریعہ غرباء کی امداد کا طریقہ مقرر ہوا تھا۔ تو اس کے معنی کہ جانور کو ذبح کر کے غرباء کو گوشت ہی دیا جائے تو واجب ادا ہو اور زندہ جانور کسی غریب کو دیدیں تو واجب ادا نہ ہو۔

پھر کیا پہلے مسلمانوں پر نقد کی وسعت کبھی نہ ہوئی تھی؟ بالکل غلط ہے۔ تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہو کہ صحابہ نے جس وقت کسریٰ و قیصر کے خزانے فتح کئے ہیں تو مسلمانوں کے پاس ہتھ سونا اور چاندی اس قدر تھا کہ آج کل تو اس کا عشر عشر بھی نہ ہوگا۔ پھر اس وقت صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ بات کیوں نہ سوجھی جو اس شخص کو انگلستان میں بیٹھ کر سوجھی اور صحابہ نے بجائے قربانی کے نقد امداد کو کیوں نہ اختیار کیا۔

دوسرے اگر یہ حکمت قربانی سے مقصود بالذات ہوتی تو اس کا مقصد یہ تھا کہ قربانی کے گوشت میں سے کسی حصہ کا تصدق ضرور واجب ہوتا حالانکہ شریعت میں یہ بھی حکم نہیں بلکہ اگر کوئی شخص سارا گوشت خود ہی کھالے اور غریبوں کو حبیہ برابر بھی نہ دے تو قربانی میں کچھ قصور نہیں آتا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امداد غریبہ قربانی سے مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود کچھ اور ہے۔ مگر آپ نے دیکھ لیا کہ اس قسم کے اسرار بیان کرنے کا نتیجہ کہاں تک پہنچا ہے کہ ہر شخص اپنی مختصر حکمتوں پر احکام سمجھنے لگا۔ (سبیل النجاح ص ۱۵)

(۱۰) کعبہ بعض بزرگوں کے استقبال کیلئے جانیکی تحقیق، اور اس پر شبہات کا جواب

بعض بزرگوں کی نسبت یہ شہور ہے کہ وہ مکہ معظمہ پہنچے تو جا کر دیکھا کہ کعبہ نہیں ہے سخت حیرت ہوئی اور باری تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے معلوم ہو جائے کہ اس وقت کعبہ کہاں ہے چنانچہ ارشاد ہوا کہ ہم منکشف کئے دیتے ہیں۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک بزرگ آرہے ہیں۔ کعبہ ان کے استقبال کو گیا ہوا تھا۔

اور یہ حکایت تین فرقوں کو مضر ہوئی ایک تو ان کو جنہیں دین سے کچھ بھی تعلق اور واسطہ نہیں۔ ایسے لوگوں نے تو اس کی تکذیب کی۔ اور کہنے والوں پر ہنسنا اور وہم پرست کہنا شروع کیا۔ دوسرے ان دینداروں کو جو کہ محض ظاہر پرست ہیں۔ ایسے لوگوں نے ان کو صوفیہ کے دھوکے کھکڑا دیا۔ تیسرے ان لوگوں کو جو فلسفی دماغ کے ہیں اور تاریخ ان کا نصب العین ہے۔ انھوں نے

اس کو خلاف عقل بتلایا۔ اور یہ اعتراض اس پر کیا کہ اگر ایسا ہوتا تو تاریخوں میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا۔ سو ہم نے کسی تاریخ میں نہیں دیکھا۔ حالانکہ ان تینوں کی حالت یہ ہے۔ مع
"چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند"

تو سمجھو کہ ایک کعبہ کی صورت ہے اور ایک کعبہ کی روح ہے۔ روح کعبہ ایک خاص تجلی ہے کہ کعبہ ظاہری اس کا منظر ہے۔ پس جن بزرگوں نے یہ دیکھا کہ کعبہ اپنی جگہ نہیں ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ روح کعبہ زائرین کی طرف متوجہ نہیں ہے بلکہ ان بزرگ کی طرف متوجہ ہے۔ غرض بعض بزرگ ایسے بھی ہوئے ہیں کہ جن کی طرف کعبہ نے خود توجہ کی۔ لیکن حج کیلئے انکو بھی خود کعبہ ہی میں آنا پڑا۔ (اصلاح النفس ص ۱۲)

(۱۱) جدیدیم یافتہ طبقہ کی اس غلطی کا جواب کہ اسلام میں سلطنت جمہوری کی تعلیم ہے

نظام عالم تابعیت و متبوعیت کو چاہتا ہے اس لئے متبوع کو تابع کی مساوات گوارا نہیں اسی وجہ سے سلطنت کی ضرورت ہے تاکہ ایک تابع ہو ایک متبوع ہو۔ سب کے سب آزادانہ ہوں بلکہ متبوع کے سامنے تابع کی آزادی سلب ہو جائے۔ یہ حقیقت ہے سلطنت کی۔ اگر سلطنت نہ ہو تو ہر شخص آزاد ہوگا اور آزادی مطلق انتظام کے لئے ہرگز کافی نہیں۔ اور نہ کسی نے آج تک اسکو گوارا کیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سلطنت کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ آج کل ایک فرقہ نکلا ہے جو سلطنت کا مخالف ہے مگر میں نہیں سمجھتا کہ بدوں سلطنت کے انتظام نزاعات کا فیصلہ کیونکر ہوگا۔ اگر کہو کہ کثرت رائے سے فیصلہ ہوگا تو میں کہتا ہوں کہ جن کثیرین کی رائے پر فیصلہ ہوگا وہی سلطنت کے مصداق ہو گئے۔ کیونکہ ان کے سامنے دوسروں کی آزادی سلب ہو گئی۔ اور یہی حقیقت ہے سلطنت کی کہ بعض کی آزادی بعض کی رائے کے سامنے سلب ہو جائے۔ کثرت رائے پر فیصلہ ہونے کے بعد بھی آزادی مطلق کہاں رہی۔ اس فیصلہ کی پابندی سے بھی تو آزادی سلب ہوگی۔ تو یہ لوگ جس چیز کو مٹاتے ہیں اخیر میں اس کو ثابت کرتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے بھی آزادی مطلق کو گوارا نہیں کیا بلکہ

ایک کو تابع ایک کو متبوع بنایا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اپنے احکام نبی کے واسطے سے بھیجے ہیں اور تمام مخلوق پر نبی کا اتباع فرض کیا ہے تاکہ مخلوق کو کسی ایک کا تابع کیا جائے۔ ورنہ بہت سہل تھا کہ انبیاء علیہم السلام کو نہ بھیجتے بلکہ آسمان سے چھپے ہوئے کاغذ ہر ایک کے پاس آکر گرتے اور ہر شخص اس کو پڑھ کر کام کرتا نہ نبی کا اتباع ضروری ہوتا، نہ خلیفہ کا نہ علماء کا نہ مجتہدین کا۔

خدا کے یہاں پریس کہاں ہے | شاید کوئی کہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں پریس کہاں ہے۔ میں

کہتا ہوں کہ جب ہم نے پریس ایجاد کر لئے ہیں تو خدا تعالیٰ کو پریس بنالینا کیا مشکل ہے۔ بلکہ تم جو کچھ ایجاد کرتے ہو عقل سے ایجاد کرتے ہو، اور عقل خدا کی دی ہوئی ہے تو یہ ایجاد بھی حقیقت میں خدا تعالیٰ کی ایجاد ہے۔ تمہارا تو محض نام ہی نام ہے۔ اس لئے یہ شبہ محض لغو ہے۔

دوسرے میں دعویٰ کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ کے یہاں اس وقت بھی پریس موجود ہیں۔ کیونکہ کاتبین اعمال کا لکھا ہوا قیامت تک نہ مٹے گا۔ ایسی سیاہی اور ایسا کاغذ تو کسی پریس کو نصیب نہیں جو قیامت تک باقی رہے تو پھر کاتبین اعمال آپ کے کاموں کو ایسی سیاہی سے روزانہ لکھتے ہیں وہی اگر احکام کو لکھ کر ہر شخص کے پاس طوالت دیا کریں تو کیا مشکل ہے۔ مگر حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ احکام کو نبی پر نازل کیا اور مخلوق کو نبی کا تابع کیا تاکہ آزادی سلب ہو جائے۔

قانون کی پابندی | جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں اور حریت و مساوات کے مدعی ہیں وہ بھی آزادی کا ہونا گوارا نہیں کرتے کیونکہ

جمہوری سلطنت کے بعد بھی وہ کوئی قانون ہوگا جس کی پابندی عام رعایا پر لازم ہوگی تو اس قانون کے سامنے سب کی آزادی سلب ہو جائے گی ہم تو آزادی کا دعویٰ جب مانیں جب کسی شخص کو بھی قانون کا پابند نہ کیا جائے بلکہ جس کے جوجی میں آئے کرنے دیا جائے کسی سے کچھ عزت نہ کیجاوے کیونکہ تم تو آزادی کے حامی ہو۔ تو آزادی تو اسی کا نام ہے کہ کوئی کسی بات کا پابند نہ ہو۔

پھر تو لوگوں کو قانون کا پابند کیوں بناتے ہو اور ان کی آزادی کو قانون کا تابع کیوں بناتے ہو۔ کم از کم یہی کہ وہ قانون بنانے میں ساری رعایا کی رائے لے لیا کرو۔ قانون سازی کے لئے پارلیمنٹ کی مختصر جماعت کو کیوں خاص کر رکھا ہے۔ اور تمام رعایا کو چند آدمیوں کی رائے کا

تابع کیوں بنا رکھا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں وہ بھی شخصیت ہی کے حامی ہیں مگر شخص کبھی حقیقی ہوتا ہے کبھی حکمی۔ فلسفہ کا مسئلہ یہ ہے کہ مجموعہ بھی شخص واحد ہے مگر وہ واحد حکمی ہے حقیقی نہیں۔ تو یہ لوگ جس پارلیمنٹ کے فیصلوں کا اتباع کرتے ہیں اس میں گو بظاہر بہت سے آدمی ہوتے ہیں مگر مجموعہ مل کر پھر شخص واحد ہے کیونکہ جو قانون پاس ہوتا ہے وہ سب کی رائے سے مل کر پاس ہوتا ہے۔

پارلیمنٹ میں بھی ہر شخص آزاد نہیں کہ جو رائے دیدے وہی پاس ہو جایا کرے۔ اگر ایسا بھی ہوتا جب بھی کسی تدر آزادی کا دعویٰ صحیح ہوتا مگر وہاں تو پارلیمنٹ کے بھی ہر شخص کی انفرادی رائے معتبر نہیں بلکہ اجتماعی رائے معتبر ہے اور اجتماعی رائے پھر شخصی رائے ہے کیونکہ مجموعہ مل کر واحد حکمی ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہم شخص واحد حقیقی کے حامی ہیں اور ہم شخص واحد حکمی کے حامی ہو۔ جمہوریت کے حامی تو ہم بھی نہ رہے۔ جمہوریت اور آزادی کامل تو جب ہوتی جب ہر شخص اپنے فعل میں آزاد ہوتا کوئی کسی کا تابع نہ ہوتا۔ نہ ایک بادشاہ کا، نہ پارلیمنٹ کے دس ممبروں کا۔ اور یہ کیا آزادی ہے کہ تم نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو پارلیمنٹ کے دس ممبروں کی رائے کا تابع بنادیا۔ ہم تو ایک ہی کا غلام بناتے تھے لہذا دس کا غلام بنادیا۔ تمہیں فیصلہ کر لو کہ ایک کا غلام ہونا اچھا ہے یا دس بیس کا غلام ہونا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایک کی حکومت ہو اس سے بہتر ہے جس پر دس بیس کی حکومت ہو۔ یہ حاصل ہے جمہوری سلطنت کا کہ رعایا کی غلامی سے تو اس کو بھی انکار نہیں مگر وہ یہ کہتی ہے کہ تم دس بیس کی غلامی کرو۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ صرف ایک کی غلامی کرو۔

شریعت میں یہ خاص بات ہے کہ اس کے دعاوی کہیں نہیں ٹوٹتے۔ شریعت نے آزادی کا ایسے زور سے دعویٰ ہی نہیں کیا جو اس پر تقض وارد ہو اور جو لوگ آزادی کا دم بھرتے ہیں کسی وقت ان کو اپنے دعویٰ سے ہٹنا پڑتا ہے۔ آخر کیوں ہٹتے ہو؟ اگر کوئی شخص پارلیمنٹ کے فیصلہ کو نہ مانے تو اس کو مجبور کیوں کرتے ہو۔ اسے پارلیمنٹ کا غلام کیوں بناتے ہو۔ آزاد کیوں نہیں رہتے دیتے مگر کیونکہ آزاد رہنے دیں۔ نظام عالم بدوں اس کے قائم نہیں ہو سکتا کہ مخلوق میں بعض تابع ہوں بعض متبوع ہوں آزادی مطلق سے فساد برپا ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں اگر ان کو اپنے دعویٰ آزادی سے ہٹنا پڑتا ہے۔ اور شریعت کو کبھی اپنے دعویٰ سے ہٹنا نہیں پڑتا۔ کیونکہ وہ تو پہلے ہی

تابعیت و مقبوعیت کی حامی ہے وہ تو آزادی کا سبق سکھاتی ہی نہیں اول ہی دن سے نبی کے اتباع کا حکم دی ہے جس سے تمام مخلوق کو ایک کا تابع کر دیا۔ بلکہ اگر کسی وقت خدا تعالیٰ نے ایک زمانے میں دو نبی بھی ایک قوم کی طرف ارسال کئے ہیں تو ان میں بھی ایک تابع تھے۔ دوسرے مقبوع تھے۔

ایک زمانے میں دو نبی

چنانچہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام ایک زمانے میں دو نبی تھے جو نبی اسرائیل و قوم قبط ار کی طرف مبعوث ہوئے تھے مگر ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام مقبوع تھے، حضرت ہارون علیہ السلام تابع تھے، دونوں برابر درجہ میں تھے اور یہ تابعیت محض ضابطہ کی تابعیت نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام پر پوری حکومت رکھتے تھے وہ ان کی مخالفت نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ایک واقعہ ایسا پیدا کر دیا جس سے اس حقیقت کا ظہور ہو گیا۔

جب موسیٰ علیہ السلام تورات لینے کے لئے کوہ طور پر تشریف لے گئے تو ہارون علیہ السلام اپنا خلیفہ بنا کر چھوڑ گئے تھے کہ میرے پیچھے بنی اسرائیل کا خیال رکھنا اور انکی اصلاح کرتے رہنا۔

قصہ سامری

یہاں پیچھے یہ قصہ ہوا کہ سامری نے ایک سونے کا بچھڑا بنایا اور اس میں قدم جبرئیل علیہ السلام کی مٹی ڈال دی جس سے اس میں حیات پیدا ہو گئی۔ فَقَالُوا هَذَا إِلَهُكُمُ وَإِلَهُ مُوسَىٰ فَنَسِيَ، جاہل لوگ کہنے لگے کہ ہمارا اور موسیٰ علیہ السلام کا خدا تو یہ ہے وہ بھول کر نہ معلوم کہاں چلے گئے۔ بس بیوقوف لگے اس کی عبادت کرنے۔ موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے اس واقعہ کی اطلاع دی وہ غصہ میں بھرے ہوئے تشریف لائے۔ اور قوم کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا۔ اسی وقت انھوں نے ہارون علیہ السلام سے فرمایا کہ جب تک بخت گمراہ ہو گئے تھے تو تم یہاں کیوں رہے میرے پاس باقی ماندہ جماعت لو لے کر کیوں نہ چلے آئے اور غصہ میں ان کا سرا در ڈاڑھی پکڑ کر کھینچنے لگے قَالَ يَا ابْنُ أُمِّ لَآئِلَافٍ خُذْ بِذِيحَيْثِي وَلَا يَرَأْسِي هَارُونَ علیہ السلام نے کہے بھائی میری ڈاڑھی اور سر نہ پکڑو۔ میری بات سنو مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اگر میں انکو چھوڑ کر چل دوں گا تو آپ یہ نہ کہیں کہ تو نے وہاں رہ کر انکو سمجھایا کیوں نہیں انکی اصلاح کیوں نہ کی اسلئے میں یہیں رہ کر ان کو سمجھاتا رہا حالانکہ ہارون علیہ السلام عمر میں موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے مگر نبوت میں ان کے تابع تھے اسلئے موسیٰ نے بے تکلف اپنی مقبوعیت اور ان کی تابعیت کے مقتضی پر عمل کیا اور وہ برتاؤ جو حاکم محکوم کے ساتھ کرتا ہے۔ آج ایک سب انسپکٹر باد جو یکے

انسپکٹر کا تابع اور ماتحت ہوتا ہے۔ مگر انسپکٹر اپنے ماتحت کے ساتھ ایسا کر کے تو دیکھیں۔ معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کی تابعیت محض ضابطہ کی نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی، جس کا اس واقعہ سے ظہور ہو گیا۔ اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ دونوں رسولوں میں ایک تابع ہیں ایک مقبوع ہیں اور دونوں یکساں مرتبے میں نہیں ہیں۔

تابع اور مقبوع

اس واقعہ سے بعض لوگوں کو تعجب ہوتا ہو گا کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس فعل میں کیا حکمت تھی۔ لیکن ایک حکمت تو میرے قلب پر اسی وقت آگئی کہ حق تعالیٰ کو مقبوعیت اور تابعیت کا ظاہر کرنا تھا اسلئے موسیٰ علیہ السلام کو غصہ سے ایسا بیتاب کر دیا جس سے انھوں نے اپنی حکومت و مقبوعیت کے مقتضی پر بے تکلف عمل کیا اور نہ معلوم کتنی حکمتیں ہوں گی۔

شخصی حکومت

غرض اسلام میں جمہوری سلطنت کوئی چیز نہیں۔ اسلام میں محض شخصی حکومت کی تعلیم ہے اور جن مفاسد کی وجہ سے جمہوری سلطنت قائم کی گئی ہے وہ سلطنت شخصی میں پوشیدہ ہی ہیں اور جمہوری میں متیقن ہیں شخصی سلطنت میں یہ خرابیاں بیان کی جاتی ہیں کہ اس میں ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ حالانکہ ممکن ہے کہ کسی وقت اس کی رائے غلط ہو۔ اس لئے ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام نہ چھوڑنا چاہئے بلکہ ایک جماعت کی رائے سے کام ہونا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ جس طرح شخصی سلطنت کے بادشاہ کی رائے میں کبھی غلطی کا احتمال ہے اسی طرح جماعت کی رائے میں بھی غلطی کا احتمال ہے کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ ایک شخص کی رائے ہمیشہ غلط ہو کرے۔ اور دس کی رائے ہمیشہ صحیح ہو کرے بلکہ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں ہزاروں آدمیوں کا ذہن نہیں پہنچتا۔ ایجادات عالم میں رات دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کیونکہ جتنی ایجادات ہیں وہ اکثر ایک شخص کی عقل کا نتیجہ ہیں کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ سمجھا۔ ایک نے تاریکی کو ایجاد کیا۔ ایک نے ریل کو ایجاد کیا۔ تو موجود اکثر ایک شخص ہوتا ہے اور اس کا ذہن وہاں پہنچتا ہے۔ جہاں صد ہا ہزار ہا مخلوق کا ذہن نہیں پہنچتا۔ علوم میں بھی یہ امر مشاہدہ ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کسی مضمون کو اس طرح صحیح حل کرتا ہے کہ تمام شراح و محققین اس کے سامنے غلط ہو جاتی ہیں۔ تو جماعت کی رائے کا غلط ہونا بھی محتمل ہے۔ اب بتلائیے اگر کسی وقت بادشاہ کی رائے صحیح ہوئی اور پارلیمنٹ کی رائے غلط ہوتی تو عمل کس پر ہو گا۔ جمہوری سلطنت میں کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے تو بادشاہ اپنی رائے پر

عمل نہیں کر سکتا بلکہ یہ کثرت رائے سے مغلوب ہو کر غلط رائے کی موافقت پر مجبور ہوتا ہے اور شخصی سلطنت میں بادشاہ اپنی رائے پر ہر وقت عمل کر سکتا ہے۔ اور جمہوری میں اگر کثرت رائے غلطی پر ہوئی تو صحیح رائے پر عمل کرنے کی کوئی صورت نہیں سب مجبور ہیں غلط رائے کی موافقت پر۔ اور یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔ اس لئے یہ قاعدہ ہی غلط ہے کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے۔ بلکہ قاعدہ یہ ہونا چاہئے کہ صحیح رائے پر عمل کیا جاوے خواہ وہ ایک ہی شخص کی رائے ہو

مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی
سرسید اور مولانا محمد حسین میں مکالمہ
نے سید احمد خان سے کہا تھا کہ آپ لوگ جو کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ حماقت کی رائے پر فیصلہ کرتے ہو کیونکہ قانون فطرت یہ ہے کہ دنیا میں عقلا کم ہیں اور بیوقوف زیادہ۔ تو اس قاعدہ کی بنا پر کثرت رائے کا فیصلہ بیوقوفی کا فیصلہ ہوگا۔ سید احمد خاں نے جواب دیا کہ دنیا میں جو عقلا کی قلت اور بیوقوفوں کی کثرت ہے یہ اس صورت میں ہے جب کہ بہت سے آدمیوں کو کیف مالتفق جمع کر لیا جاوے تو ان میں واقعی بیوقوف زیادہ ہوں گے لیکن جن لوگوں کی کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں وہ کیف مالتفق جمع نہیں کئے جاتے بلکہ انتخاب کر کے خاص خاص آدمیوں کی کمیٹی بنائی جاتی ہے جس میں سب عقلا ہی ہوتے ہیں تو ان میں جس طرف کثرت ہوگی وہ بیوقوفوں کی کثرت نہ ہوگی بلکہ عقلا کی کثرت ہوگی مولانا نے جواب دیا کہ بہت اچھا۔ لیکن عقلا میں بھی قانون فطرت یہ ہے کہ کامل عقل تھوڑے ہیں اور ناقص العقل زیادہ۔ چنانچہ تجربہ کر لیا جائے کہ ہزار عقلوں میں کامل العقل ایک دو ہی ہوتے ہیں تو عقلا میں بھی کثرت انھیں لوگوں کی ہے جو ناقص العقل ہیں۔ پس کثرت رائے پر فیصلہ اگر حماقت کا فیصلہ نہیں تو کم عقلی کا فیصلہ تو ضرور ہی ہوگا۔ سید احمد خاں کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ بالکل خاموش ہی ہو گئے

کثرت رائے
غرض صحیح رائے پر عمل کرنا بدون شخصی حکومت کے ممکن نہیں جمہوری میں تو کثرت رائے کا اتباع لازم ہے خواہ وہ غلط ہو یا صحیح ہو بلکہ مولانا محمد حسین صاحب کے موافق کثرت رائے اکثر غلط ہی ہوگی تو گویا جمہوری میں اکثر غلط رائے پر عمل ہوتا ہے اور اور ظاہر ہے کہ جب تک صحیح رائے پر عمل نہ ہوگا اس وقت تک انتظام درست نہیں ہو سکتا۔ پس ثابت ہو گیا کہ انتظام بدون شخصی حکومت کے نہیں ہو سکتا۔ دوسرے جو لوگ کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھتے ہیں۔ وہ بادشاہ کو تنہا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیتے۔ وہ پہلے ہی سے اس کو تسلیم

کرتے ہیں۔ کہ ہمارا بادشاہ ایسا ضعیف الرائے ہے کہ اس کی تنہا رائے قابل اعتبار نہیں اور وہ نااہل ہے۔ تو واقعی جو لوگ اپنے بادشاہ کو ایسا سمجھتے ہیں ہم ان سے گفتگو نہیں کرتے آنکو جمہوریت مبارک ہو۔ ایسا نااہل بادشاہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو شخصی سلطنت کا بادشاہ بنالیا جائے۔ اسلام میں جو شخصی سلطنت کی تعلیم ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ اہل حل و عقد اور اہل جماعت عقلا بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو اتنا صاحب رائے ہو کہ اگر کبھی اس کی رائے سارے عالم کے بھی خلا ہو تو یہ احتمال ہو سکے کہ شاید اسی کی رائے صحیح ہو۔ اور جس کی رائے میں اتنی زرینیت نہ ہو اسکو ہرگز بادشاہ نہ بناؤ۔ اب بتلاؤ کہ جس کی رائے اتنی زرین ہو کہ سارے عالم کے مقابلہ میں بھی اس کی رائے کے صائب ہونے کا احتمال ہو وہ حکومت شخصی کے قابل ہے یا نہیں؟ یقیناً قابل ہے بشرطیکہ اہل حل و عقد انتخاب میں خیانت نہ کریں۔

شخصی سلطنت
بس ہم شخصی سلطنت کے اس لئے حامی ہیں کہ ہم بادشاہ کو زرین العقل صائب الرائے سمجھتے ہیں اور تم کثرت رائے کے اس لئے حامی ہو کہ تم اپنے بادشاہ کو ضعیف الرائے اور نااہل سمجھتے ہو۔ تو ایسے شخص کو بادشاہ بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے جس کے لئے فہم ضمیمہ کی ضرورت ہو بلکہ پہلے ہی سے بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو فہم ضمیمہ کا محتاج نہ ہو۔ مستقل الرائے ہو۔ اور اگر تم بھی اپنے بادشاہ کو مستقل الرائے صائب العقل زریں سمجھتے ہو تو پھر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھنا اور کامل کو ناقصین کی رائے کا تابع بنانا ظلم ہے جس کا حماقت ہونا بدیہی ہے۔

بعض لوگوں کو یہ حماقت سوچتی ہے کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھونکنا چاہتے ہیں اور اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ وَشَاوَرَهُمْ فِي الْأَمْرِ مَكْرِيہ بالکل غلط ہے۔ ان لوگوں نے مشورہ کی دفات ہی کو دفع کر دیا اور اسلام میں مشورہ کا جو درجہ ہے اس کو بالکل نہیں سمجھا۔

حضرت بریرہؓ کا واقعہ
اسلام میں مشورہ کا درجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ اے بریرہ تم اپنے شوہر سے رجوع کرلو۔ قصہ یہ ہوا کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا پہلے باندی تھیں اور

اور اسی حالت میں ان کا نکاح ایک شخص سے جن کا نام مغیث تھا ان کے آقا نے کر دیا تھا۔ جب وہ آزاد ہوئیں تو قانون اسلام کے مطابق ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ جو نکاح حالت غلامی میں ہوا تھا اگر چاہیں اس کو باقی رکھیں اگر چاہیں فسخ کر دیں۔ اصطلاح شریعت میں اس کو اختیار حق کہتے ہیں اس اختیار کی بنا پر حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے نکاح سابق کو فسخ کر دیا لیکن ان کے شوہر کو ان سے محبت تھی۔ وہ صدمہ فراق میں مدینہ کی گلی کوچوں میں روتے پھرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر رحم آیا اور حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے آپ نے فرمایا کہ اے بریرہ کیا اچھا ہو اگر تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو۔ تو وہ دریافت فرماتی ہیں کہ یا رسول اللہ یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ کی ایک فرد ہے۔ اگر حکم ہے تو بسر و چشم منظور ہے گو مجھ کو تکلیف ہی ہو آپ نے فرمایا حکم نہیں صرف مشورہ ہے۔ تو حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے صاف عرض کر دیا کہ اگر مشورہ ہے تو میں اس کو قبول نہیں کرتی۔

مشورہ کا درجہ لیجئے اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ کا کہ اگر نبی اور خلیفہ تو بدرجہ اولیٰ رعایا کے کسی آدمی کو کوئی مشورہ دیں تو اس کو حق ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرے اور یہ محض ضابطہ کا حق نہیں بلکہ واقعی حق ہے چنانچہ جب حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے حضور کے مشورہ پر عمل نہ کیا تو حضور نے ان سے ذرا بھی ناراض نہیں ہوئے نہ حضرت بریرہ کو کچھ گناہ ہوا نہ ان پر کچھ عقاب آیا۔ سو جب امت یا رعایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے اسلام میں مجبور نہیں تو نبی یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیونکر مجبور ہو جائے گا کہ رعایا جو مشورہ دے اسی کے موافق عمل کرے اس کی خلاف کبھی نہ کرے پس شاور ہم فی الامر سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ کر لیا کریں یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کیا کریں اور اگر کثرت رائے بادشاہ کے خلاف ہو جائے تو وہ کثیرین کے مشورہ پر عمل کرنے کیلئے مجبور ہے۔ اور جب تک یہ بات ثابت نہ ہو اس وقت تک شاور ہم فی الامر جمہوریت ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی۔ جب اسلام میں ایک معمولی آدمی بھی بادشاہ کے مشورہ پر مجبور نہیں ہوتا تو تم بادشاہ کو رعایا کے مشورہ پر کیوں کر مجبور کرتے ہو۔ آخر اس کی کوئی دلیل بھی ہے یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اور ہمارے پاس حدیث بریرہ رضی اللہ عنہا سے دلیل موجود ہے کہ کسی کے مشورہ پر عمل کو نا ضروری نہیں خواہ نبی ہی کا مشورہ کیوں نہ ہو۔

مشورہ پر عمل ضروری نہیں اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اگر حکام رعایا سے مشورہ لیں تو وہ ان کے مشورے پر عمل کرنے کیلئے مجبور ہرگز نہیں ہیں بلکہ عمل خود اپنی رائے پر کریں خواہ وہ دنیا بھر کے مشورہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

چنانچہ اس آیت میں آگے ارشاد ہے فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ کے مشورے کے بعد جب آپ ارادہ کسی بات کا کریں تو خدا پر بھروسہ کر کے اس پر عمل کریں یہاں إِذَا عَزَمْتَ صیغہ واحد ہے۔ معلوم ہوا کہ عزم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مستقل تھے۔ اسی طرح آپ کا نائب یعنی سلطان بھی عزم میں مستقل ہے۔ اگر عزم کا مدار کثرت رائے پر ہوتا تو إِذَا عَزَمْتَ نہ فرماتے بلکہ اس کی بجائے اِذَا عَزَمَ اکثرکم فتوکلوا علی اللہ فرماتے۔ پس جس آیت سے یہ لوگ جمہوریت پر استدلال کرتے ہیں اس کا اخیر جزو خود ان کے دعویٰ کی تردید کر رہا ہے مگر انکی حالت ہے حفظت شیئاً وغایت عنک اشیاء کہ ایک جزو کو دیکھتے ہیں اور دوسرے جزو سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ دوسرے اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ رعایا کو تو یہ حق نہیں دیا گیا۔ کہ از خود استحقاقاً حکام کو مشورہ دیا کر دیا ہے وہ مشورہ لیں یا نہ لیں اہل مشورہ انکو مشورہ سننے پر مجبور کر سکیں چنانچہ شریعت میں اشیاء المحکام دھو حکم علیہم کہیں نہیں کہا گیا۔ جب رعایا کو از خود مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجہ لازم نہیں تو پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی۔ کیونکہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو از خود رائے دینے کا حق ہوتا ہے چاہے بادشاہ ان سے رائے لے یا نہ لے۔ یہاں تک کہ اگر بادشاہ پارلیمنٹ سے بغیر رائے لئے کوئی حکم نافذ کر دے تو اس پر چاروں طرف سے دے دے ہوتی ہے کہ ہم سے بدوں مشورہ لئے یہ حکم کیوں جاری کیا گیا۔ بھلا رعایا کو یہ حکم میں اسلام میں کہاں دیا گیا ہے ذرا کوئی صاحب ثابت تو کریں۔ پس یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ اسلام میں جمہوریت کی تسلیم ہے۔ (تقلیل الاختلاط مع الانام ص ۱۸)

(۱۲) امن عامہ کامل طور پر دین پر قائم ہونے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے

مولوی اسی کو رد کرتے ہیں کہ آپ کے گھر میں آگ لگی ہے۔ لیکن آپ کو خبر نہیں، صاحبو! غضب ہے کہ غیر قوم میں تو اسلام کی تعریف کرتی چلی آرہی ہیں اور ہم اسلام کو چھوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ مؤرخ چونکہ ہم لوگوں نے دین کا ست نکال لیا ہے اس لئے میں بتلاتا ہوں کہ دین واقع میں چند چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے اور وہ پانچ چیزیں ہیں عقائد، عبادات، معاملات، آداب، معاشرت اخلاق باطنی، یعنی یہ کہ تکبر نہ ہو، ریاء نہ ہو، تواضع ہو، اخلاص ہو۔

قناعت ہو، شکر ہو، صبر ہو، وعلیٰ ہذا۔ پس ان پانچ چیزوں کا نام دین ہے اس وقت کسی نے کسی کو کسی نے کسی کو چھوڑ رکھا ہے۔ کسی نے اعمال کو چھوڑا، کسی نے معاملات کو، کسی نے معاشرت کو، اسی طرح اپنی معاشرت کو چھوڑ کر غیروں کی معاشرت کو اختیار کر لیا ہے۔ اور بعض نے اخلاق باطنی کو چھوڑ دیا ہے۔ بلکہ ان اخیر کے دو جزوں کو تو قریب قریب سب ہی نے چھوڑ دیا ہے اس تفصیل کے بعد حاصل آیت شریف کا یہ ہوا کہ دین کو یعنی ان پانچ چیزوں کو اصلاح فی الارض میں اور ان پانچوں کے اخلاق کو انسانی الارض میں دخل ہے۔ بس اب کو دیکھ دیجئے۔ مشاہدہ کہ اصلاح فی الارض میں جدا جدا ہر ایک کا کیا دخل ہے۔ سنو! بعض کا دخل تو بین ہے۔ مثلاً اخلاق کے ان اثر امن عام میں ہیں ہے اور دوسری غور سے معاملات کا اثر بھی امن عام میں ظاہر ہوتا ہے کیونکہ احکام معاملہ کا اصل حقیقت یہ ہے کہ کسی کا حق ضائع نہ کیا جائے۔ پس معاملات کو بھی اتفاق میں بڑا اثر ہے بشرطیکہ وہ شریعت کے موافق ہوں۔ کیونکہ آپ کی رائے ان مصالح کی رعایت نہیں کر سکتی جیسی کہ شریعت نے کی ہے۔ جیسے پھل فروخت کرنا کہ آپ نے قبل از وقت پھل فروخت کئے تو اس صورت کو شریعت نے حرام کیا ہے۔ کیونکہ پھل آنے سے پہلے فروخت کرنے میں معدوم کی بیع ہے اور بیع معدوم میں کسی نہ کسی کا ضرر ضرور ہوتا ہے۔ اور شریعت کے موافق کرنے میں کسی کا ضرر نہیں۔ تو امن قائم ہوگا۔ تو ان دونوں کا اثر تو دنیا کے انتظام میں صاف معلوم ہوتا ہے باقی اور تین چیزوں کا امن عام میں دخل ہونا سو یہ کم ظاہر ہے اس لئے اس کو بھی ثابت کرنا ضروری ہے کہ یہ تین چیزیں بھی امن عام میں دخل ہیں۔

عقائد سوا اول یعنی عقائد کو تو یوں سمجھو کہ توحید اور رسالت اور معاد، ام العقائد ہیں اور ان سب کو امن عام میں دخل مان لیا ہے اس کی تسلیم سے یہ دعویٰ بھی ثابت ہو جائیگا ایک مثال بطور نمونہ کے عرض کرتا ہوں کہ مثلاً اخلاق میں جھوٹ نہ بولنا، سچ بولنا، ہمدردی کرنا، خود غرضی نہ کرنا داخل ہے اور یہ اصول تمدن میں سے بہت بڑی چیزیں ہیں جن پر تمام دنیا کا مدار ہے لیکن واقعات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ اخلاق دو شخصوں میں پائے جائیں جنہیں ایک تو توحید و رسالت کا قائل ہے۔ اور دوسرا قائل نہ ہو تو یقیناً دونوں میں بہت بڑا فرق ہوگا۔ یعنی منکر توحید میں تو یہ اخلاق محدود العمر ہوں گے، اس طرح سے کہ جب تک ان اخلاق پر عمل کرنے میں اس کے دنیاوی منافع فوت نہ ہوں یا اس کے خلاف عمل کرنے سے دوسروں کو خبر ہو کر رسوائی کا اندیشہ ہو اس وقت تو ان اخلاق پر عمل کیا جائے گا اور اگر کوئی ایسا موقع آپڑے گا کہ ان اخلاق

عمل کرنے سے دنیوی ضرر ہوتا ہو اور ان کے خلاف کرنے میں کسی کو خبر بھی نہ ہو جس میں اندیشہ بدنامی نہ ہو تو اس منکر توحید و رسالت کو کبھی ان اخلاق کے ترک کی پروا نہ ہوگی۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ جب کبھی بے دین سلطنتوں میں آپس میں معاہدہ ہوتا ہے تو اس کی پابندی اسی وقت تک کیجاتی ہے جب تک اپنے منافع حاصل ہوتے ہیں یا خلاف کرنے میں اپنا ضرر ہوتا ہے اور اگر خلاف کرنے میں اپنا ضرر نہ ہوتا ہو تو عہد شکنی میں ذرا بھی پس و پیش نہیں ہوتا۔

ندہی طاقت کی مثال یا فرض کر دو کہ دو شخص ہم سفر ہوں جن میں ایک کے پاس ایک لاکھ روپے کے نوٹ ہوں اور دوسرا ایسا ہو کہ اس پر فاقے گذرتے ہوں اور اتفاق سے وہ متمول انتقال کر جائے۔ اور دوسرا فقیر سفر کو ان نوٹوں کے لئے لینے کا موقع ملے اور عاقل بھی آتا پڑا ہو کہ بلا تکلف انکو فروخت کر سکے اور اس مرحوم کے ورثہ میں بھی صرف ایک نابالغ بچہ ہو اور ان نوٹوں کی کسی اور کو خبر بھی نہ ہو کہ اس شخص کے پاس یہ ذخیرہ ہے اس صورت میں اخلاق اور نفس میں کشاکش ہوگی۔ اخلاق کا فتویٰ تو یہ ہوگا کہ یہ روپیہ اس وارث کو دینا چاہئے اور نفس کا فتویٰ یہ ہوگا کہ جب اس روپے کے رکھ لینے میں کوئی بدنامی نہیں۔ کسی قسم کا اندیشہ نہیں تو پھر اس کو کیوں نہ رکھ لیا جاوے۔ اس کشاکشی میں میں نہیں سمجھتا کہ نری اخلاقی قوت انسان کو اس عظیم پہلے سے بچالے بس جس شخص کو نری اخلاقی تعلیم ہوئی ہے وہ ہرگز اس خیانت سے نہیں بچ سکتا، البتہ جو اخلاقی تعلیم کے ساتھ خدا اور قیامت کا بھی قائل ہے وہ اس سے بچ سکتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں یہاں بچ گیا اور مجھے دنیا میں خمیازہ بھگتنا پڑا تو قیامت میں تو ضرور ہی بھگتنا پڑے گا۔

خوف خدا کا اثر اسی طرح ایک اور جزئی یاد آگئی کہ میرے پاس اکثر ایسے ٹکٹ آجاتے ہیں کہ ڈاک خانے کی ہر سے بالکل بچے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر میں ان کو استعمال کر لوں تو کوئی بھی باز پرس نہیں کر سکتا کیونکہ میرے پاس ڈاک خانے والے ہوتے ہیں نہ کوئی دوسرا دیکھنے والا ہوتا ہے لیکن محض خدا کے خوف سے اکثر میں سب سے اول ان ہی کو چاک کر کے پھینک دیتا ہوں۔ اس کے بعد خط پڑھتا ہوں علیٰ ہذا اگر روز مرہ کے واقعات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دوسروں کے حقوق کی پوری حفاظت جب ہی ہو سکتی ہے جب دل میں خدا کا خوف ہو۔ یہ مثال نمونہ کے طور پر بیان کی ورنہ غور سے معلوم ہوگا کہ تمام مسائل تمدن میں اس کی ضرورت ہے کہ مبداء اور معاد کا معتقد ہو۔ اس کی تفصیل کے لئے رسالہ مآل التہذیب

دیکھنے کے قابل ہے اس میں دکھلایا ہے کہ اس خیر تہذیب کا مال دنیا ہی میں ہونے والا ہے۔ انھوں نے ایک مفسدہ کو دکھایا ہے۔ اور ختم پر ہر جگہ یہ کہہ دیتے ہیں فویل یومئذ للمعدن۔ غرض امن عام اور تمدن اس وقت باقی رہ سکتا ہے جب اخلاق درست ہوں اور اخلاق کی کامل درستی جب ہی ہو سکتی ہے کہ عقائد درست ہوں۔

اعمال کا دخل

اب اعمال کا دخل لیجئے۔ یہ بھی انشاء اللہ اخلاق کی ضرورت تسلیم کر لینے سے ثابت ہو جائے گا۔ نسب کو معلوم ہے کہ اخلاق میں بڑی چیز تواضع ہے۔ اس کے نہ ہونے سے تمام عالم میں فساد پھیلتا ہے کیونکہ فساد کا مبنی ہے نا اتفاقی اور نا اتفاقی تکبر سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ اگر تکبر نہ ہو اور آپ مجھ کو بڑا مانیں اور میں آپ کو بڑا مانوں تو نا اتفاقی کی کوئی وجہ نہیں۔ تواضع کے لئے تواضع کے پیدا کرنے اور تکبر کے مٹانے کی ضرورت ہے۔ اور اس تواضع کی عادت نماز سے خوب ہوتی ہے۔ نفس کا یہ خاصہ ہے کہ اگر کہیں اس کو ذلت سکھائی جائے تو اس میں فرعونیت پیدا ہوتی اور نماز میں تو اول سے اللہ اکبر کی تعلیم ہے۔ تو جو شخص پانچ دقت زبان سے اور دل سے اللہ اکبر کہے گا اور جو ارح سے رکوع اور سجدہ کرے گا۔ زمین پر پیشانی رکھے گا وہ کیونکر اپنے کو بڑا سمجھے گا۔

خدا کی خدائی پر اعتقاد کا نتیجہ

اگر کہو اس سے تو یہ ہوگا کہ اپنے کو خدا سے بڑا سمجھے گا لیکن دوسروں سے تو بڑا سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ جواب یہ ہے کہ یہ نا تجربہ کاری کا اعتراف ہے۔ دیکھو اگر تحصیلدار اپنے جوش حکومت میں تحصیلداری کر رہا ہو اور اچانک لفٹنٹ گورنر آجائے تو خود اس کے ذہن میں بھی وجداناً سب اختیارات مسلوب ہونے لگتے ہیں اس وقت اگر کوئی حضور بھی کہہ دیتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے گولی مار دی تو جس کے دل میں خدا کی عظمت ہوگی وہ اپنے کو جیونٹی سے بھی مطلوب و ناتواں سمجھے گا کیونکہ بڑوں کے سامنے ہوتے ہوئے پھوٹوں پر بھی حکومت نہیں رہتی۔ تو اللہ اکبر کی وہ تعلیم ہے کہ اس سے تکبر کی بالکل جرئت جاتی ہے اور پھر اس سے نا اتفاقی کا جاتا رہنا لازمی ہے۔

اعمال دین کے اثرات

علیٰ ایذا قوت بہیمہ سے سینکڑوں فساد لڑائی جھگڑے دنیا میں ہوتے ہیں اور روزہ سے قوت بہیمہ ٹوٹی ہے

اسی طرح زکوٰۃ لینے والے کے علاوہ دوسروں کو بھی زکوٰۃ دینے والے کے ساتھ محبت ہوتی ہے۔

دیکھو حاتم طائی بوجہ سخاوت کے سب کو محبت ہے اور اتفاق کا مبنی یہی محبت ہے تو دیکھو زکوٰۃ کو اتفاق میں کتنا بڑا دخل ہے۔

علیٰ ہندج پر غور کیجئے کہ اس میں ساری دنیا کے آدمی ایک شغل میں، ایک زمانہ میں ایک مکان میں جمع ہوتے ہیں اور تمام سامان تکبر سے خالی ہو کر ایک عظیم الشان دربار میں حاضر ہوتے ہیں جس کو اتفاق و اتحاد میں بہت دخل ہے جیسا اور پر مذکور ہوا۔ اور اسی اتفاق فی الخیال کا اثر ہے کہ دو سرگرمیوں میں جن کو جمع حجاج سے کچھ بھی نسبت نہیں ہوتی بہت سی واردات ہو جاتی ہیں اور وہاں بہت کم حادثے پیش آتے ہیں۔

البتہ اگر لوگ شاید بدوؤں کے شاکی ہوں گے۔ سو اصل میں ان کا مقصد سلب قتل نہیں ہے بلکہ وہ ایک درجہ میں حجاج کی بے پروائی کا انتقام لیتے ہیں ان کی حالت بالکل یہاں کے گاریبانوں کی سی ہے کہ اگر گھاس دانہ زیادہ دے دیا تو خوش ہیں ورنہ پھر دیکھئے کیسے پر پھیلاتے ہیں۔ ویسے ہی اگر بدوؤں کی مدارات کیجائے ان کو انعام کے طور پر کچھ زیادہ دیدیا جائے تو وہ بہت آرام پہونچاتے ہیں۔

اور یہ جو سننے میں آتا ہے بدو پتھر مار کر مالا چھین لیتے ہیں۔ تو اول تو بہت کم ایسا ہوتا ہے اور اگر ہوتا بھی ہے تو ایسے بدوؤں کے ہاتھ سے جو اس مجمع کے نہیں بلکہ وادیوں میں دیہات کے لوگ پھیلے رہتے ہیں۔ وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب کہ خود اپنی حفاظت نہ کرے کہیں قافلے سے آگے چھپے رہ جائے۔

غرض حجاج کو اتفاق دامن میں بہت بڑا دخل ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اعمال از سر تاپا تواضع سے پُر ہیں۔

اب رہی معاشرت۔ سو تامل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جتنے طریقے ناجائز ہیں وہ سب کے سب وہی ہیں جن سے تکبر پیکٹل ہے۔ مثلاً ناجائز دفع سے شریعت نے منع کیا۔ سو جتنی ناجائز اوضاع ہیں ان سب میں تکبر ہے۔ جو لوگ خلاف شریعت وضع رکھتے ہیں وہ غور کریں کہ

لے احمد شہ کس سلطان کے حسن انتظام کی وجہ سے آجکل بدوؤں کی یہ تمام شکایتیں رفع ہو گئی ہیں۔ ۱۲ علی محمد

اس وقت ان کے دل کی کیا حالت ہے اور اس حالت کو یاد رکھیں اور پھر ایک ہفتہ شریعت کے موافق وضع لباس اختیار کر کے اس کا اثر دیکھیں تو ان کو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوگا۔ یہ تو سمجھ میں آنے والی تقریر ہے۔

ایک دوسری تقریر اور ہے جو ان تینوں میں مشترک ہے وہ یہ کہ ہر چیز میں ایک خاصیت ہوتی ہے۔ پس اس طرح اعمال میں بھی ایک خاصیت ہے اور عقائد میں بھی اور معاشرہ میں بھی اور وہ یہ کہ ان سب سے قلب میں ایک سوز پیدا ہوتا ہے اور اس سوز سے اس کی وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ۔ اب میں ایک اور بات کہتا ہوں جو تمام اجزاء دین کو عام ہے وہ یہ کہ دین کی یہ غرض ہی نہیں کہ دنیاوی نفع ہو بلکہ مقصود اس سے رضائے حق ہے اور جب خدا تعالیٰ راضی ہوں گے تو وہ خود ہی اس کی تمام مصالح دنیویہ کی رعایت فرمائیں گے۔ من یتق الله يجعل له مخرجاً ویرزقہ من حیث لا یحتسب۔

پس دین کی درستی کو اس طرح دنیا کی درستی میں دخل ہو مگر دین کے کام اس نیت سے بھی نہ کرنا کہ خدا راضی ہو گا تو دنیا کے کام بنیں گے بلکہ صرف اس لئے کہ

دلاری کہ داری دل درو بند :۔ وگر چشم از ہمہ عالم فرد بند
اور جو مصلحتیں سلمنے آئیں بھی تو یہ پڑھ دو کہ

مصلحت دیدن آست کہ یاں ہمکار :۔ بگزارند خم طرہ یارے گیرند
زند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار :۔ کار ملک است آنکہ تدبیر تجل با پیش
ہمیں مصلحتوں سے کیا لینا مگر حاصل ضرور ہونگی۔ دفا دار نوکر وہ ہے کہ آقا کی رضامندی کو اپنی مصلحت پر مقدم رکھے۔ اور کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہ کرے ورنہ اس کو غرض اور خود کام کہا جائے گا۔ پھر آقا اپنے کرم سے خود ہی اس کی مصلحتوں کی رعایت فرمائے گا۔ اور اگر دیکھا جائے تو راحت بھی اسی میں ہے کہ کسی کے حکم کے تابع رہے چاہے مصلحت سمجھ میں نہ آئے یا نہ آئے اور اگر ہر کام میں مصلحت سوچا رہے تو کام کچھ نہ کر سکے گا۔

میں نے تین تقریریں کیں۔ ہر تقریر سے یہ ثابت ہو گیا کہ دین کو، طاعت کو امن عام میں بہت دخل ہے اور یہ تین تقریریں اس لئے کہیں کہ مذاق مختلف ہیں۔ یہ تو اعد دینیہ کی

خوبی ہے کہ ان سے ہر مذاق کے پسند پر دین کا حسن ثابت ہو گیا تو دین گویا اس شعر کا مصداق ہی ہے

بہار عالم حسن دل و جاں تازہ می دارد

برنگ اصحاب صورت را بہار باب معنی را

غرض جس پہلو سے چاہو پرکھو، الحمد للہ یہ بات ثابت ہو گئی کہ امن کی صورت ہے تو احکام خداوندی کی پابندی سے ہے۔ (ضرورۃ العلماء ص ۲)

۱۳۔ دین میں تنگی اور دشواری نہیں ہے

اس کے دو درجے ہیں ایک تو یہ کہ قانون کی پابندی کرنا پڑتی ہے اور یہ دشواری ہے۔ اور ایک یہ کہ خود قانون ہی سخت ہے۔ تو اسلام میں کون سی دشواری ہے آیا یہ کہ خود قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے تو تسلیم ہے کیونکہ اس میں ضرور دشواری ہوتی ہے خواہ کتنا ہی سہل قانون ہو۔ مثلاً جو لوگ کہ عدالت میں نوکر ہیں اور ان کا وقت دس بجے سے ہے تو کیا کبھی یہ پابندی دشوار نہیں ہوتی۔ ضرور ہوتی ہے اور اس وقت کہتے ہیں کہ نوکری بڑی ذلت کی چیز ہے مگر اتنی ہی بات پر اس کو کبھی نہ چھوڑ دیا۔ تو جب قانون کی پابندی ہوگی اس میں دشواری ضرور ہوگی تو اگر اسلام میں یہ دشواری ہے تو تسلیم ہے بلکہ اس کو تو خود ہی ثابت کرتے ہیں لا تبغوا الہویٰ اور اس سر صاف انہا لکبیرۃ الا علی الخاشعین۔

غرض یہ دشواری تو تسلیم ہے مگر اس میں اسلام کی کیا تخصیص ہے تو سبھی کام میں بلکہ کھانے میں بھی ہے۔ کوئی ابا ہجوں سے پوچھے خاص کر واجد علی شاہ کے اہادیوں سے کہ کھانا کتنا مشکل کام ہے۔

مشہور ہے کہ واجد علی شاہ کے یہاں دو اہادی تھے ان میں باری ایک حکایت اس طرح تھی کہ ایک لیٹا ہوا آرام کرے دو سرائیٹھا ہوا اس کی حفاظت کرے اسی طرح ایک لیٹا ہوا تھا ایک بیٹھا ہوا، ایک سوارا دھر سے گذرا۔ لیٹے ہوئے نے پکارا کہ میاں سوار ذرا یہ میر جو میرے سینہ پر رکھا ہے میرے منہ میں ڈال دو۔ اس کو آرام طلبی سے سخت

حیرت ہوئی۔ اور اس سے زیادہ حیرت یہ ہوئی کہ اس کا رفیق جو پاس بیٹھا ہے اس سے اتنا کام نہیں ہوتا۔ اس لئے اس بیٹھے ہوئے سے کہا کہ بھائی تو ہی اس کے منہ میں ڈال دے۔ وہ بہت بگڑا اور کہنے لگا کہ جناب میری آپ کی لڑائی ہو جائے گی۔ آپ کو کیا خبر یہ میرے ساتھ کیسا ہے۔ کل میں لیٹا تھا یہ بیٹھا تھا مجھ کو جو جمائی آئی اس سے منہ کھل گیا۔ ایک کتا اگر منہ میں موٹنے لگا، یہ بیٹھا ہوا کھٹا رہا اور اس سے اتنا نہ ہوا کہ کتے کو ہٹا دے، میں ضرور اس کے منہ میں بیرد دگا۔ یہ سوار حیرت میں غرق ہو گیا اور لا حول پڑھتا ہوا چل دیا۔

تو حضرت اگر کوئی احمادیوں سے پوچھے تو ان کو کھانا بھی مشکل ہے۔ ہمارے عزیز و بھائی ہیں ایک چھوٹے ایک بڑے۔ بڑے صاحب ہاتھ پاؤں پیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں اور چھوٹے سے کہتے ہیں کہ میرے منہ میں لقمے دے کر مجھ کو کھانا کھلا۔

دشوازیوں کی قسمیں تو ایسی نظریں بھی موجود ہیں اور رہیں گی تو اس طرح تو کھانے میں بھی دشواری ہے اور اس میں شرعی اور قانونی پابندیاں بھی ہیں مثلاً یہ کہ دوسرے کی چیز نہ کھاؤ اور ڈکیتی نہ ڈالو مگر اس کو کسی نے کہا کہ بڑا سخت قانون ہے۔ وجہ یہ کہ آپ کو ڈکیتی ڈالنا ہی نہیں ہے۔ اس لئے آپ کو اس کی ممانعت کا قانون سخت معلوم نہیں ہوتا۔ اور رشوت لینا مقصود ہے اس لئے اس کی ممانعت سخت معلوم ہوتی ہے لیکن جو ڈکیتی ہمیشہ ہیں ان سے کوئی پوچھے اس ممانعت کے قانون کو کتنا سخت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ایک عجمائے ہندوؤں کی ایسی بھی ہے کہ ان کی رائے یہ ہے کہ کوئی سلطنت نہ ہو حالانکہ ضرورت سلطنت کا قانون امر فطری ہے مگر یہ ان کو گراں ہے۔ تو ایسے لوگ تو انسانیت ہی سے خارج ہیں۔ تو محض پابندی سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا پھر اسلام ہی پر کون اعتراض ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ پابندی کی ضرورت کو تسلیم اور یہ سختی نہیں مگر خود قانون ہی بڑا سخت ہے تو واقعی یہ دشواری ہے مگر دین میں ایسی دشواری ہی نہیں کہ قانون سخت ہو۔

اب یہ شبہ ہو گا کہ یہ تو مشاہدہ کے خلاف ہے تو حقیقت میں اس میں تلبیس ہوئی ہے قانون کی سختی تو وہ ہے کہ اگر اس کو سب بھی مان لیں تب بھی دشواری پیش آوے۔ مثلاً یہ قانون ہو جائے کہ اگر چھٹا تک بھر سے زیادہ کوئی کھا دے تو پھانسی ہوگی۔ یہ ایسی سخت بات ہے کہ اگر سب عمل کرنے کا ارادہ کریں تب بھی کیفت ہو۔

اور ایک دشواری اس طرح کی ہے کہ قانون تو نرم ہے۔ اور علامت اس کی یہ ہے کہ اگر

سب اس پر عمل کرنے لگیں تو کسی کو بھی دشواری پیش نہ آوے لیکن اس میں ایک خاص عارض سے سختی پیش آجائے، وہ عارض یہ ہے کہ زیادہ آدمی اس پر عمل نہیں کرتے پس جب تھوڑے آدمی عمل کریں گے تو ان کو دوسروں کی وجہ سے ضرورت تنگی ہوگی کیونکہ تعلق معاملات کا ان ہی دوسروں سے ہے۔ تو اس کو قانون کی سختی نہ کہیں گے بلکہ اس سختی کا منشا ان باغیوں کی بغاوت ہے

ایک مثال مثلاً کوئی ایسی جگہ پہونچے کہ وہاں کے لوگ باغی ہوں اور یہ شخص وہاں پہونچ کر کوئی چیز خریدے اور دام دیدے پھر اس سے کہا جائے کہ قانون سلطنت یہ ہے کہ پورے دام لے کر پوری چیز دے دو مگر ہم اس قانون کو نہیں مانتے اسلئے تم کو آدمی چیز ملے گی۔ تو ایمان سے کہئے کہ یہ دشواری قانون کی ہے یا ان بد معاشوں کی بد معاشی۔ قانون کا منشا تو یہ ہے کہ سیر بھر کی سیر بھر دو مگر ان بد معاش لوگوں نے بد معاشی کی اور سیر بھر کی آدمی سیر دی۔ تو اس دشواری سے اگر کوئی گورنمنٹ کو برا کہنے لگے تو وہ احمق ہے یا نہیں۔ تو جو دشواری اس وقت پیش آرہی ہے وہ دشواری یہ ہے جس کو اسلام پر تھوپا جاتا ہے۔ کوئی شخص اسلام کا کوئی ایسا قانون بتلائے کہ سب مسلمانوں کے مان لینے اور عمل کرنے کے بعد بھی اس میں دشواری پیش آوے۔ اگر پچاس قباحتیں بھی آجادیں جب بھی شریعت کا کوئی ایک قانون بھی ایسا نہیں بتلا سکتے۔ صرف موجودہ دشواری کی وجہ یہ ہے کہ نافرمانوں سے سابقہ پڑ رہا ہے۔

مثلاً قرص کی ضرورت ہوئی اب جس کے پاس جاتے ہیں وہ کہتا ہے کہ سود لاؤ۔ تو سود کی حرمت کا الزام شریعت پر دینا اور اپنے کئے کا اسلام پر تھوپنا ایسا ہے کہ

حملہ بر خودی کنی اے سادہ مرد : ہچوں آن شیرے کہ بر خود حملہ کرد
مثنوی میں شیر کی ایک لمبی چوڑی حکایت لکھی ہے کہ ایک شیر کو ایک خرگوش نے دھوکا دیا اور کہا کہ میں تمہارے راتب کیلئے ایک موٹا خرگوش لاتا تھا راستہ میں ایک دوسرا شیر ملا اور مجھ سے چھین لیا شیر کو غصہ آیا کہ بتلا وہ کہاں ہے اس نے ایک کنویں پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ واقعی اس میں شیر کا عکس نظر آیا پس شیر اس کنویں میں جا کودا۔ اندر پہونچ کر معلوم ہوا کہ میں نے اپنے ہی اوپر حملہ کیا تھا مولانا اس کو فرماتے ہیں

حملہ بر خودی کنی اے سادہ مرد : ہچوں آن شیرے کہ بر خود حملہ کرد
اسی طرح ہم کو بھی اپنی دشواری کی صورت شریعت میں نظر آتی ہے مگر حقیقت میں یہ اپنے اوپر اعتراض ہے۔

اس پر ایک حکایت اور یاد آئی کہ ایک حبشی نے آئینہ دیکھا۔ اس میں اپنی صورت نظر پڑی آئینہ کو بڑے زور سے پتھر پر کھینچ مارا کہ ایسا ہی بد شکل تھا تب ہی تو کوئی تجھ کو راستہ میں پھینک گیا۔

ایک اور احمق کی حکایت ہے کہ اس کا بچہ روٹی کھا رہا تھا لوٹے میں ایک ٹکڑا گر پڑا اچھانکنے سے اپنی صورت نظر آئی سمجھا کہ اس میں کوئی بچہ ہے باپ سے کہا۔ ابا اس نے یہ میرا ٹکڑا لے لیا۔ آپ چھیننے اٹھے جھانک کر دیکھا تو اپنی شکل نظر پڑی۔ بولے کہ لعنت ہو خدا کی بد بھائی بچہ کا ٹکڑا اچھین لیا۔ تفت ہے تیری اوقات پر۔ سو وہ تفت کس کو کہہ رہے تھے۔

اسی طرح ہم لوگوں نے آئینہ شریعت میں اپنی شکل کو دیکھا۔ اور وہ تنگی اپنی صفت تھی اس کو شریعت کی تنگی سمجھا۔ حضرت یہ ہے حقیقت سخی کی۔ اور میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک طبیب علاج کر رہا ہے اور بہت شفیق بھی ہے مگر نہ ایسا آزاد کہ خاک پتھر سب کی اجازت دیدے۔ ظاہر ہے کہ جب غذائیں کھائی جاویں گی تو کسی چیز کی تو ضرور ہی مانع ہوگی اتفاق سے ایک دیہاتی پہونچا۔ کہ صاحب کھاؤں کیا۔ جواب دیا کہ بکری کا گوشت پالک، وہ بولایا تو ملتا نہیں۔ کہا مونگ کی دال۔ کہا یہ بھی نہیں ملتا۔ کہا فیرینی۔ کہنے لگا یہ بھی نہیں۔ پھر خود پوچھا بینگن کھاؤں۔ کہا ہرگز نہیں کھانا۔ کہ یلا کو پوچھا اس کو بھی منع کر دیا۔ آلو سے بھی روک دیا۔ تو دیہاتی نے کہا کہ صاحب ہمارے یہاں تو یہی چیزیں ملتی ہیں۔ طبیب نے کہا کہ فتویٰ طب کا یہی ہے۔ دیہاتی نے باہر آ کر کہا کہ صاحب یہ تو بڑے سخت ہیں کہ یہ بھی نہ کھاؤ وہ بھی نہ کھاؤ۔

تو کیا طبیب پر یہ الزام صحیح ہے یا یہ کہا جاوے گا کہ وسعت تو یہ ہے کہ متعدد چیزوں سب کی اجازت دے دی لیکن وہ مقام ایسا کورہ ہے کہ بجز مضر چیزوں کے وہاں کچھ ملتا ہی نہیں تو یہ طب کی تنگی تو نہیں اس شخص کے گھاؤں والوں کی معاشرت کی تنگی ہے۔ اسی طرح حاجت ضروریہ پر نظر کر کے دیکھئے کہ معاش کی ضروری سبیلوں کو جو کہ قریب الوقوع ہیں اگر پچیس آپ نکالیں گے تو بیس کو شریعت بجز کہے گی اور پانچ کو لایحوز لیکن آپ کے ملک والے ہمیشہ ان ہی پانچ کو استعمال کریں اور بیس کو متروک کر دیں تو تنگی معاشرت کی ہوئی یا قانون شریعت کی۔ پس یہ الزام تو محمد ﷺ بوجہ احسن داخل رفع ہو گیا۔ اور اگر اس کی تصدیق میں شبہ ہو تو علم دین پر رہے اس سے معلوم ہو گا کہ

شریعت نے ابواب معاش میں کس قدر توسیع کی ہے۔

اب صرف ایک فریاد رہ گئی ہے اس میں جی چاہتا ہے مسلمانوں کی ہمدردی کرنے کو۔ وہ یہ ہے کہ یہ تو سمجھ

ایک اشکال اور اس کا حل

میں آگیا کہ شریعت میں تو دشواری نہیں مگر حالت موجود ہیں اس عارض کے سبب کہ ہم کو سابقہ ایسوں سے پڑا ہے جو شریعت پر عمل نہیں کرتے۔ عارضی دشواری تو ہوگی۔ تو ہم پر تو دشواری کا اثر آخر پہونچ گیا البتہ اعتقاد درست ہو گیا کہ شریعت میں دشواری نہیں مگر عمل کس طرح سے کریں کیا لین دین چھوڑ دیں۔ کیونکہ لوگ ریاں اکثر ناجائز معاملات اکثر ناجائز تجارت اکثر ناجائز تو یہ ایک فریاد قابل استماع ہے تو اس کے متعلق بھی سن لیجئے۔

اس میں قدرے تفصیل ہے وہ یہ کہ آپ نے جو چند معاملات کو دیکھ کر اس عارضی دشواری کے اعتبار سے عام حکم کر دیا کہ سب ہی دشوار ہے۔ غیر مسلم ہے۔ سمجھئے کہ ایسے اعمال دو قسم کے ہیں ایک وہ کہ ان کی اصلاح کرنے سے معاش کی گاڑی کچھ اٹکتی ہے اور ایک وہ کہ ان کی اصلاح سے معاش کا کچھ بھی نقصان نہیں مثلاً وضع شریعت کے موافق بنائے نماز روزہ کرے۔ تکبر نہ کرے باجا گا جا چھوڑ دے تو بتلائیے اس میں معاش کا کیا نقصان ہے؟ تو آج ہی سے اصلاح کرتے لیجئے پس زیادہ اعمال تو آپ کے آج ہی سے درست ہو جائیں گے کیونکہ پچاس عمل میں چالیس ایسے نکلیں گے کہ محض گناہ بے لذت ہیں کہ خواہ مخواہ اپنے ان کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔ آگے دس ہی رہ جاویں گے اس میں اگر آپ کی اصلاح نہ بھی ہوئی تو چونکہ غالب درجہ اعمال صالحہ کا موجود ہو چکا ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ سے امید ہے کہ بقیہ اعمال کو جو کہ مغلوب و قلیل ہیں درست فرمادیں گے۔

جیسے ایک شعلہ جوالہ کے دیکھنے میں پورا دائرہ شعلہ نظر آتا ہے حالانکہ اس میں بہت چھوٹی قوس نورانی ہے اور بڑی قوس ظلمانی مگر جب نور و ظلمت جمع ہوتے ہیں تو نور ہی غالب آتا ہے اور اس درستی میں گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی خاصیت ہی یہی ہے جیسے مقناطیس کہ بالخاصہ جاذب حدید ہے پس اگر ہم یہ کہیں کہ اعمال صالحہ میں بھی خاصیت یہی ہے کہ بقیہ اعمال کو درست کر دیتا ہے تو اس کا دعویٰ ہو سکتا ہے مگر میں اس کا راز بھی بتلاتا ہوں کہ اعمال صالحہ میں ایک اثر ہے کہ اس سے قلب میں قوت ہوتی ہے اور صحابہ کی ترقی کا راز یہی ہے ہم نے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ بیماری میں اٹھا نہیں

جاننا مگر نماز کے وقت بلا تکلف کھڑے ہو کر نماز ادا کر لیتے ہیں۔ خوب کہا ہے۔
ہر چند کہ پیر خستہ دلبس نا توں شدم ہر گز نظر بروئے تو کردم جواں شدم
ان کی خدمت میں جب جی چاہے جا کر دیکھ لیجئے
بندگی سے قوت آتی ہے غرض طاعت سے قوت ہوتی ہے اور اصلاح نہ کرنے
کا صرف یہی سبب تھا کہ ہمت نہیں ہوتی تھی مگر جب قوت ہوگی تو تمام موانع مضمحل ہو جائیں گے
اور اگر کوئی اس در سے کہ کبھی اصلاح ہو جائے یہ تدبیر بھی نہ کرے تو دوسری بات ہے جیسے کسی نے
یسن کر کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہو جاتا ہے کہا تھا کہ ہم چاند ہی نہ دیکھیں۔ غرض اس طرح
قوت پیدا ہو جاتی ہے اور ضعف جاتا رہتا ہے۔

یہ ہے وہ راز اور اگر بالفرض اصلاح بھی ہوئی تو ایک اور بات تو ضرور پیدا ہو جاوے گی
کہ اس معصیت کی مذمت آپ کے قلب میں جمی چلی جاوے گی اور اس سے نفرت پیدا ہو جائے گی
اور یہ مذمت و نفرت آپ کی اصلاح کر دے گی اور آخری بات یہ ہے کہ اگر اس طرح بھی اصلاح
نہ ہوئی تو جرائم تو گھٹ گئے اگر ایک شخص پر چار جرم قائم ہوئے اور وکیل نے کہا کہ تین تو مل سکتے
ہیں مگر ایک نہیں مل سکتا۔ تو کیا کوئی یہ کہے گا۔

کہ جوں آب از سر گذشت چہ یک نیزہ، چہ یک دست

ہرگز نہیں بلکہ تخفیف ہی کو غنیمت سمجھیں گے۔ تو اس طرح آپ بھی پچاس جرائم میں سے
صرف دس ہی کے مجرم رہ گئے۔

اب وہ حصہ رہ گیا جس میں تغیر کرنے سے معاش کا حرج ہے تو ادا تو چونکہ آپ کو شریعت
کے احکام نہیں معلوم ہیں اس وجہ سے بہت سے افعال ناجائز صادر ہو جاتے ہیں اگر آپ
احکام کی تحقیق کیجئے گا تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تھوڑے تغیر سے وہ جائز ہو جاوے گا۔

چاندی کا مسئلہ مثلاً اگر آپ نے چاندی خریدی تو اس میں مسئلہ یہ ہے کہ چاندی
کا مقابلہ اگر چاندی سے ہو تو زیادتی کمی حرام ہے۔ اگر اب کہنے کہ
صاحب اچھا مسئلہ سا کہ نرخ کے حساب سے تو سو روپیہ کی چاندی ایک سو بیس بھرتی کر لیا
سو روپے کی سو ہی روپے بھر ملی۔ اچھا عمل کیا کہ بیس روپے کا خسارہ ہوا۔ اب ساری عمر کیلئے
مولویوں کو خیر باد کہیں گے۔

تو سنئے بات یہ ہے کہ اگر مولوی صاحب سے یوں پوچھتے کہ مولوی صاحب جب چاندی

میں زیادتی حرام ہے تو اب اگر اس پر اس خاص صورت میں عمل کریں تو بڑا نقصان ہوگا کیا کوئی
جائز شکل بھی معاملہ کی ہے تو مولوی صاحب یوں کہتے کہ ان روپیوں میں ایک گنی بھی ملا تو
ایک سو بیس بھر چاندی جو آدگے گی تو پچاس روپے بھر تو پچاس روپے کی آوے گی اور باقی کی
اس گنی میں شریعت محسوب کرے گی۔ تم کو نیت کرنے کی بھی ضرورت نہیں شریعت خود فیصلہ
کر چکی ہے۔ تو اب بتلائیے کیا نقصان ہوا اب مشکل تو یہ ہے کہ غلام سے پوچھتے بھی نہیں۔

صاحبو! پوچھتے رہو، اور میں یہ تو نہیں کہتا کہ سب کو مولوی صاحب جائز ہی کہیں گے۔
کیونکہ شریعت ان کے گھر کی تو ہے نہیں کہ وہ اپنے اختیار سے جسے چاہیں جائز کر دیں جیسا کہ ایک
مطوف سے ایک بڑھیا نے صفامروہ کی سعی میں تھک کر کہا تھا کہ مولوی صاحب اب تو معاف کر دو۔

اسی طرح بعضے لوگ یوں چاہتے ہیں کہ غلام ہند مثل بعض غلام مصر کے کرنے
لگیں ان بعض غلام نے ایسا کر رکھا ہے کہ جو دنیا میں ہو رہا ہے سب جائز

ہے۔ تو یہاں کے لوگ بھی یہی کرنا چاہتے ہیں غلام سے جیسے ایک رئیس نے ایک نوکر سے یہ
کام لیا تھا کہ جو ہماری زبان سے نکلے تم اس کی تصدیق کر کے توجیبہ کر دیا کرو۔ چنانچہ ایک بار اس رئیس
کے منہ سے کہ ہم شکار کو گئے ایک ہرن پر گولی چلائی وہ اس کے سم کو توڑ کر مانتھے کو چھوڑ کر نکل گئی۔
سب اہل مجلس ہنسنے لگے کہ سم اور مانتھے کا کیا جوڑ۔ نوکر بولا سچ ہے حضور، وہ اس وقت سم سے
پیشانی کھجلا رہا تھا۔

تو حضور غلام سے تو ایسی تو کمری ہوتی نہیں۔ نہ ہم اتنے ذہین ہیں اور نہ خدا کرے کہ ہوں۔
تو حاصل یہ کہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ سب کو جائز کہیں۔ مگر پوچھ کر دیکھو تو بہت سے اشکالات کا
جواب مل جاوے گا۔ تو بہت بڑا حصہ اس غرضی دشواری کا اس طرح ختم ہو جاوے گا۔

ہاں بعض امور پھر بھی ایسے رہ جاویں گے کہ وہ بالکل ناجائز ہوں گے مگر اس میں بھی
دو درجے ہیں ایک تو وہ کہ اس کو چھوڑ کر دوسرے کام میں لگ سکتے ہیں پس اسکو تو چھوڑ دیا جاوے۔
کیونکہ اس کا چھوڑنا مضر حوائج ضروریہ نہیں۔ اور ایک وہ درجہ ہے کہ اس کو چھوڑ نہیں سکتے کیونکہ دوسرے
کام اس کے حوائج ضروریہ کو کافی نہیں۔ تو بادل کا رہ اس کو کرتے رہو اور گویہ جائز تو نہ ہوں گے
مگر اس کے متعلق ایک دستور العمل ایسا بتلاتا ہوں کہ اس سے ایسے جرائم خفیف ہو جاویں گے۔
اور یہ کہ اس میں دو برتاؤ کرنا چاہئیں ایک تو یہ کہ ہر روز تو یہ کیا کرے۔ اب تو یہ غضب ہے کہ لوگ
توبہ کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کیا اس پر پچھٹائیے اور دعا کیجئے کہ

اے اللہ مجھے معاف فرمائیے مواخذہ نہ کیجئے۔

تو یہ کیوں نہیں کرتے کیا ایسا کرنے سے نوکری سے موقوف ہو جاو گے۔ ہرگز نہیں بلکہ بلکہ تم نوکر ہی رہو گے۔ دوسرے یہ دعا کیا کرو کہ اے اللہ کوئی دوسری سبیل نہ نکلی تو یہ شخص شرمندہ گنہگاروں کی فہرست میں تو لکھا جاوے گا جرمی گنہگاروں کی فہرست میں نہیں لکھا جاوے گا۔ اور یہ توسیع آپ میری ہی زبان سے سنیں گے اور توسیع میں راز شرعی یہ ہے کہ اگر چھوڑنے پر مجبور کیا جاوے تو شاید اس کو چھوڑ کر اس سے بھی زیادہ کسی گناہ شدید میں مبتلا ہو جاوے مثلاً یہی کہ چلو آریہ نہیں تو یہ توسیع «اے بلا دفع بلا ہائے بزرگ» کا مصداق ہے اور میں کفر سے بچا رہا ہوں کیونکہ جب آدمی نادار ہوتا ہے تو خدا جانے کیا کیا اسکو سوجھتا ہے۔

ایک واقعہ

ہمارے حضرت حاجی صاحب جب تھانہ بھون میں رہتے تھے ایک پٹھان حضرت کی خدمت میں دعا کرانے آیا کرتے تھے کہ مجھ پر ایک شخص نے جائداد کے معاملہ میں بڑا ظلم کر رکھا ہے۔ حضرت دعا فرمادیتے۔ ایک بار آکر کہنے لگے کہ اب تو اس نے حد ہی کر دی اور جائداد غضب ہی کرنے کو ہے۔ حضرت نے فرمایا بھائی صبر کرو۔ اس نے کہا بہت اچھا دفعۃً حافظ محمد ضامن صاحب حجرہ میں سے نکل آئے اور اس پٹھان سے فرمایا۔ ہرگز مدت صبر کرنا جاؤ نالش کرو اور ہم دعا کریں گے۔ اور حضرت نے فرمایا آپ تو صابر شاکر تھے سب چھوڑ کر بیٹھ رہے اس میں تو اتنی قوت نہیں یہ اگر اسباب معاش کو چھوڑ دے گا تو جب حاجت ستائے گی یہ جھوٹی گواہی دے گا۔ چوری کرے گا تو ایسوں کو صبر نہیں کرایا کرتے۔

تو یہ ہے اصل راز اس توسیع کا۔ تو آپ کسی سے اتنی گنجائش نہ بنیں گے مگر یہ اسلئے ظاہر کر دیا گیا کہ کفر سے بچا ہے۔ لیکن خدا کے لئے اس کو آپ تمام معاشی میں آڑ نہ بنالیں کہ یہ جڑ تو بہت اچھا ہاتھ آیا۔

بات یہ ہے کہ اول تو یہ بہت تھوڑا حصہ ہے سب معاشی میں اس کا توڑ یہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے اس میں یہ بھی قید لگی ہوئی ہے کہ اس سے نکلنے کی ہر وقت فکر کرتے رہو جیسے کوئی پاخانہ میں بیٹھا ہوا ہو اور تقاضا نکلنے کا رہتا ہے۔

ایک نیک قصہ

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک رئیس صاحب ریل میں بیٹھے ہوئے تھے اور کہیں جگہ نہ تھی مگر انھوں نے کئی آدمیوں کی جگہ گھیر رکھی تھی اور کوئی کچھ کہتا تو دھمکاتے۔ آخر ضرورت سے پانچانہ میں گئے تو چھٹی لگ گئی اور ان کے کھولنے

سے نہ کھلی بڑے پریشان ہوئے لوگوں سے التجا کی۔ سب نے انکار کر دیا۔ آخر بڑی سماجت کے بعد لوگوں نے دوسروں کو تنگ نہ کرنے کی قسم کھلائی یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ پانچانہ میں ہے اس میں قسم کھلانا جائز نہیں ہے تو جس طرح وہ پانچانہ سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اسی طرح حرام نوکری میں ایسے ہی رہو کیا کوئی پانچانہ میں جا کر فخر کرتا ہے۔ بلکہ قید سمجھتے ہیں مگر مجبوری میں کیا کریں۔ بس اس کی یہ حالت ہوگی۔

چونکہ برنخت بہ بند و بستہ باش۔ چوں کشاید چابک و جرستہ باش
تو نکلنے کی فکر کرو۔ کوشش تو کرو، گو کچھ امید نہ بھی ہو اسی کو
انسانی کوشش | فرماتے ہیں۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید۔ خیرہ یوسف دارمی باید دوید
یوسف علیہ السلام کا قصہ ہوا کہ جب زلیخانے دروازہ بند اور مقفل کر لیا اور آپ نکلنے کیلئے دوڑے ہیں۔ عجیب توکل اور ہمت تھی کہ باوجود قفل لگے رہنے کے دوڑے اور آخر قفل ٹوٹ کر سب دروازے کھل گئے۔ اس کو فرماتے ہیں۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید۔ خیرہ یوسف دارمی باید دوید
اور اگر نہ بھی کھلے گا تو حق تعالیٰ یہ تو دیکھیں گے کہ یہ تو دوڑا ٹکڑ بھی لگ گئی اتنے پر بھی فضل ہو جاوے گا۔

اب بتلائیے اس میں کون سی چیز مشکل ہے میں تو نوکری نہیں چھڑاتا۔ مگر نفور رہیں۔ سو یہ کیا مشکل ہے اب تو یہ بھی نہیں بلکہ معصیت پر ناز ہے۔ بیباکی ہے۔ سو یہ فخر کیسا۔ اور تکبر کیسا۔ اور اہل دین کو ذلیل کیوں کہا جاتا ہے۔ سواہل اسباب علمائے کے ساتھ بڑا اختلاف معاش کے باب میں تھا مگر اس سے زیادہ معاش کے متعلق کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔

تو اب کوئی نامرتبہ اختلاف کا رہ گیا نرا قانون تو دشوار ہے نہیں اور قانون سخت نہیں۔ صرف بات یہ تھی کہ لوگوں کی طرف سے دشواری ہو جاتی ہے۔ تو اس میں بہت بڑی فہرست اصلاح کی تو معاش میں نخل ہی نہیں اور جو نخل ہے اس کا بڑا حصہ تدبیر سے جائز ہو سکتا ہے اور جو تدبیر سے بھی جائز نہ ہو سکے وہ اولاً بہت مختصر ثانیاً اس میں اس طرح رہنے کی اجازت کہ اس سے نکلنے کی کوشش اور کئے پر پھٹنا اور توبہ کرتے رہنا تو اب وہ کون سا جزو ہے جس پر یہ اشکال ہے کہ شریعت کی پابندی بہت سخت ہے۔ تو بحمد اللہ بے غبار یہ ثابت ہو گیا کہ وما جعل اللہ علیکم

فی الدین من حرج، (در طلبہ) (لفی الحرج ص ۱۸)

۱۴) ہر بات کی دلیل قرآن شریف سے طلب کرنا غلطی ہے

دلائل شرعیہ چار ہیں۔ کتاب، سنت، اجماع، قیاس۔ جو امران دلائل چہارگانہ میں سے کسی ایک سے بھی ثابت ہو وہ دین میں معتبر ہوگا ورنہ رد ہے۔ پس یہ بھی غلطی ہوگی کہ ان چاروں سے حجاز کیا جاوے۔

ایک عام غلطی | آج کل ایک عام غلطی یہ بھی ہو رہی ہے کہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مسئلے کو قرآن شریف سے ثابت کریں، حالانکہ دلائل شریعت کے چار ہیں اگر ان میں سے ایک سے بھی کوئی مسئلہ ثابت ہو جائے گا تو وہ شرعاً ثابت ہو جائے گا۔ چنانچہ ڈاڑھی رکھنے کی نسبت بعض کہتے ہیں کہ قرآن شریف سے دلیل لاؤ کہ ڈاڑھی رکھنا فرض ہے۔ اور یہ دلائل کا مطالبہ کرنے والے ایسے حضرات ہیں کہ جن کو خود تحقیق و استدلال ہی سے اصلاً مس نہیں ان کو تو چاہئے تھا کہ محض تقلید کرتے۔ علماء کی۔ قاعدہ عقلی ہے کہ جس فن کا جو جاننے والا ہوتا ہے وہی اس میں دخل دے سکتا ہے اور نہ جاننے والا اگر دخل دے تو اس کو سب ہنستے ہیں۔ یہ قاعدہ ہر جگہ تو جاری کرتے ہیں لیکن دین کے اندر ہر شخص مجتہد ہونے کا مدعی ہے اور ہر کس و ناکس اس میں دخل دینے کے لئے تیار ہے۔ فن ذراعت کو مثلاً میں نہیں جانتا۔ تو اگر میں گیسوں بونے کا طریقہ بیان کروں تو جاننے والے یہ کہیں گے کہ تم کیا جانو۔ اور تمام عقلاء کے نزدیک جواب کا فی سمجھا جائے گا مگر حیرت ہے کہ دین کے بارے میں اگر علماء بعینہ یہی جواب دیتے ہیں تو ناکافی شمار ہوتا ہے۔

ایک مثال | یاد رکھو فن کے جاننے والوں کے سامنے تمہارے مطالبے دلائل کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کے پاس گھڑی ہے اور وہ بڑی معتبر ہے۔ تار گھر سے ملی ہوئی ہے اور ایک شخص آفتاب کی طرف رخ کئے ہوئے کھڑا ہے۔ گھڑی والا کہتا ہے کہ گھڑی کے اعتبار سے آفتاب چھپ گیا اور اس میں ہرگز غلطی کا احتمال نہیں۔ دوسرا شخص کو دیکھنے والا کہتا ہے کہ آفتاب

میرے سامنے ہے چھپا نہیں اور گھڑی والا اس سے دلیل طلب کرتا ہے اور وہ ہنستا ہے کہ یہ تو کھلی بات ہے۔ آفتاب نظر کے سامنے ہے تم اس طرف منہ کر کے دیکھو۔ آفتاب موجود ہے۔ دلیل کی حاجت نہیں ہے۔

پس جن لوگوں نے دین کے باب میں اپنی عمریں کھپا دی ہیں ان کا قول معتبر ہوگا یا ایک لڑکے کا جو آج ہی بالغ ہوا ہے۔ لیکن دین کا بالغ نہیں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔
خلق اطفال اند جز مست خدا : نیست بالغ جزرہ سیدہ از ہوا
بہر حال حسیا بالغ ہو یا نہ ہو، روحاً بالغ نہیں ہے۔ بلکہ حسیاً بھی ہم کو تو ایسے لوگ بالغ نہیں معلوم ہوتے اس لئے کہ ظاہری علامت بلوغ کی ڈاڑھی تھی اور وہی صفا چٹ ہے۔ معلوم بھی نہیں ہوتی کہ نکلی ہے یا نہیں۔

شریعت کے دلائل | بہر حال ایسے لوگ جن کی یہ حالت ہے کہ علوم دین کی ان کو ہوا تک نہیں لگی وہ دلائل کا مطالبہ کرتے ہیں کہ قرآن شریف سے دلیل لاؤ۔ میں کہتا ہوں کہ اس سوال کے اندر ایک دعویٰ مضمر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ اس کے مدعی ہیں کہ شریعت میں قرآن شریف کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہم اس دعویٰ پر ادل ان سے دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں ہم کو یہ سمجھا دو کہ شریعت میں قرآن شریف ہی دلیل ہے اور کوئی دلیل نہیں۔ خود قرآن شریف سے ثابت ہے کہ علاوہ قرآن شریف کے اور بھی دلائل ہیں۔ فرماتے ہیں۔ دَمَا اتَّكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔ (جو رسول خدا تم کو دیں اسے لے لو اور جس سے روکیں ان سے رک جاؤ)

حدیث رسول | اس سے صاف معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اگرچہ وہ قرآن نہ ہو مثل قرآن شریف کے حجت ہے اور کیوں نہ ہو دما ینطق عن الہوی آپ کی شان ہے۔

اجماع امت | گفتہ او گفتہ اللہ بود : گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود
اور فرماتے ہیں دَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُوْعِنِينَ تُولِہِ مَا تَوَكَّلِہِ جَہَنَّمُ۔ اس آیت شریف سے اجماع امت کا حجت ہونا معلوم ہوا۔

اور فرماتے ہیں دَلْوَرُ دَوْلَا إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولَى الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلَّهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ

قیاس

اور فرماتے ہیں خَا عَتَبَرُوا يَا أُولَى الْأَبْصَارِ، یہ آیتیں بتلا رہی ہیں کہ قیاس بھی حجت ہے۔ پس اگر آپ قرآن شریف کو حجت مطلقہ مانتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کے بعض عادی مسموع اور حجت اور بعض نامسموع۔ غرض یہ سخت غلطی ہے۔ دیکھئے عدالت میں دعویٰ کی سماعت کے لئے شہادت مطلقہ کی ضرورت ہے۔ مدعی اگر دو با دجاہت آدمیوں کو پیش کر دے تو مدعا علیہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں جج صاحب اور فلاں مولوی صاحب گواہی دیں گے تو مانوں گا اور اگر وہ ایسا کہے تو حاکم ہرگز نہ سنے گا۔ اور یہ کہے گا کہ تم ان گواہوں جرح کر دو۔ تو اس کی طرف التفات ہوگا لیکن اگر یہ مجروح نہیں تو تمہاری یہ تخصیص کہ فلاں فلاں اشخاص گواہی دیں ایک لغو بات ہوگی۔

اسی طرح مسئلہ عقلیہ ہے کہ دعویٰ کے اثبات کے لئے مطلق دلیل صحیح کی ضرورت ہے مستدل جس دلیل کو چاہے اختیار کرے مخاطب کو یہ اختیار ہے کہ اس میں جرح کرے۔ اس کا جواب بذمہ مدعی ہوگا لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم نے یہ دلیل کیوں اختیار نہ کی۔ اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ کسی مسئلہ شرعیہ کے اثبات کیلئے مطلق دلیل صحیح کی ضرورت ہے جوادلہ اربعہ میں سے ہو کسی خاص دلیل کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا البتہ اس کا لحاظ ضروری ہے کہ قطعی دعویٰ کیلئے قطعی دلیل اور ظنی دعویٰ کے لئے ظنی دلیل ہونا چاہئے جس کی تفصیل اپنے مقام پر مذکور ہے۔

غرض ایک تو غلطی یہ ہے اور دوسرے اس کے مقابل یہ ہے کہ ان چاروں سے گذر کر نئے ظن کو ہی حجت سمجھا جائے کہ نرا گمان بھی کسی مسئلہ کا مثبت نہیں ہے بلکہ دلیل صحیح ادلہ اربعہ میں سے ہونا ضروری ہے۔ (حشقہ ششم دعوات عبدیت وعظ الغار المجاۃ ص ۱۲)

آزادی کے معنی

(۱۵)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ آپ رات کے وقت گشت لگا رہے تھے کہ ایک گھر سے گانے کی آواز آئی۔ آپ نے دروازہ کھلوانا چاہا مگر وہ لوگ اس قدر منہمک تھے کہ آپ کی آواز بھی نہ سن سکے آخر آپ مکان کی پشت پر سے اندر تشریف لے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

کی صورت دیکھ کر وہ سب لوگ سہم گئے لیکن چونکہ جانتے تھے کہ حضرت عمرؓ کو ہرگز غصہ نہ آئے گا اسلئے ایک شخص نے جرأت کر کے عرض کیا کہ اے امیر المومنین ہم لوگوں نے صرف ایک ہی گناہ کیا لیکن آپ نے تین گناہ کئے۔ ایک تو یہ کہ آپ بغیر اجازت ہمارے گھر میں چلے آئے حالانکہ قرآن شریف میں صاف حکم ہے۔ لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ مَبْرُورَةٍ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا وَتَسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا۔ دوسرا یہ کہ آپ نے تجسس کیا اور قرآن شریف میں تجسس کی ممانعت ہے۔ لَا تَجَسَّسُوا۔ تیسرے یہ کہ آپ مکان کی پشت پر سے تشریف لائے حالانکہ قرآن شریف میں ارشاد ہے لَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اپنے گناہ سے توبہ کرتا ہوں تم بھی اپنے گناہ سے توبہ کر لو۔

آزادی کا دم بھرنے والوں کو اس حکایت سے عبرت حاصل کرنی چاہئے کہ آزادی ان حضرات میں تھی یا آج کے مدعیان آزادی میں یہاں کی طرح نہ نماز کے نہ روزے کے کھالیا اور ہوا پرستی میں عمر گزاری۔ صاحبوا! اللہ یہ آزادی نہیں۔ یہ نفس کی شرارت اور اتباع ہوا اور مطلق العنانی ہے۔ یہ آزادی سانڈ کی سی آزادی ہے کہ جس کھیت میں چاہا نہ مار دیا جھڑ چاہا چل دیا جو چاہا کر لیا۔ تو کیا کوئی آزاد صاحب سانڈ صاحب کو پسند کرتے ہیں۔ اگر اس کا جواب نفی ہے تو آج سے آپ بھی ہماری طرف سے ہی لقب لیجئے، اور اگر لا میں جواب ہے تو پھر ذرا ہربانی کر کے اپنے اور سانڈ میں کچھ فرق بتائیے۔ (دنیان النفس ص ۱۸)

اس اعتراض کا جواب کے علماء کو لیکن دینا نہیں آتا

اہل حق اور جدید طرز کے لوگوں کی تقریر میں جو فرق میں دیکھا وہ یہ ہے کہ جدید طرز کی تقریریں پہلی نظر میں نہایت دقیق اور مؤثر ہوتی ہیں اور حق انھیں میں منحصر معلوم ہوتا ہے لیکن جب ان میں غور کیا جائے تو انکی حقیقت کھلتی جاتی ہے اور ان کا پھر اور کمزور اور خلاف واقع ہونا اور

لے گھروں میں داخل نہ ہو۔ جو تمہارا گھر نہیں۔ یہاں تک کہ اجازت حاصل کر لو اور گھر والوں کو سلام کر لو۔ کسی کے پیچھے ٹوہ میں نہ پڑو۔ یہ نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں اس کی پشت کی طرف سے آؤ۔ خواہشات نفس ہم ہاں لے نہیں۔

پر تلخیص ہونا معلوم ہوتا جاتا ہے اور اہل حق کی تقریریں نظراول میں بے رنگ اور پھلکی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جتنا ان میں غور کیا جائے تو انکی قوت اور مطابقت واقع ہونا معلوم ہو جاتا ہے اور قلب پر نہایت گہرا اثران کا ہوتا ہے کہ اس کے سامنے تمام تلخیصات قلب سے دھل جاتی ہیں۔ یہاں سے اس اعتراض کا جواب بھی نکل آیا جو آج کل کے علما پر منجملہ دوسرے اعتراضات کے وہ بھی کیا جاتا ہے کہ انکو لیکچر دینا نہیں آتا وہ جواب یہ ہے کہ جب ہمارے پاس قرآن شریف اور حدیث شریف ہے اور اس کی تعلیمات کا سرمایہ موجود ہے تو ہم کو کسی ظاہری آب و تاب کی کیا ضرورت ہے، خوب کہا ہے

ز عشق تا تمام ما جمال یار مستغنی ست
باب و رنگ خال و خطا چہ حاجت روتے زیارا

لیکن لکچروں کا طرز سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور ہم تو صاف کہتے ہیں کہ سادگی جو شخص لکچر کے طرز کو اختیار کرتا ہے وہ اول ہمارے دل میں ناپسندیدگی کا بیج بوتا ہے ہم کو تو وہی طرز پسند ہے جس کی طرف حدیث شریف میں اشارہ ہے مخن امۃ امیتۃ امۃ کے معنی سادگی کے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اہل مرضی یہ ہے کہ آپ کی امت نہایت سادہ رہے۔ اسی لئے آپ نے لفظ مخن فرما کر ساری امت کو شامل فرمایا۔ یہی روح ہے اتباع نبویؐ کی، کہ ہر بات میں بالکل سادگی ہو امیتۃ ام کی طرف منسوب ہے مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگی ایسی رہے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد بچہ کی زندگی ہوتی ہے کہ اس کو کوئی حرکت بھی تصنع اور بناو کی نہیں ہوتی بلکہ ہر حرکت میں بے ساختگی ہوتی ہے۔ اور بچوں کی یہی صفت ہے جس کی وجہ سے ہر شخص کو ان سے محبت ہوتی ہے ورنہ طبعاً بچوں سے جو کہ نجاست کی پوٹ ہوتے ہیں بہت نفرت ہونی چاہئے تھی اور یہی بے ساختگی ہے کہ جن بوڑھوں میں یہ پانی جاتی ہے آج ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے حسین ان پر جان فدا کرتے ہیں۔ تو اصلی مفہوم امیتۃ کا یہی بے ساختگی ہے اور نہ لکھنا پڑھنا جو امیت کا مشہور مفہوم ہے یہ بھی اس کا ایک شعبہ ہے۔

تو بیان میں بھی بناوٹ اور تکلف بالکل نہ ہونا چاہئے اور تلخیص اور تلخیص سے بالکل پاک ہونا چاہئے۔ البتہ بیان

میں سادگی کے ساتھ صفائی ہونی ضروری ہے۔ لیکن اب یہ طرز بالکل چھوٹا جاتا ہے ہم اہل علم کو دیکھتے ہیں کہ ان میں ایک تو رواج زبان کا طرز آ جاتا ہے۔ حالانکہ قطع نظر شریعت کے یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ہماری مادری زبان اردو ہے اور اس میں کچھ خصوصیات ہیں جیسا کہ ہر زبان کے لئے کچھ خصوصیات ہوا کرتی ہیں۔ اب اس طرز جدید کو اختیار کر کے انگریزی کی خصوصیات کو زبان اردو میں لے لیا گیا ہے اور وہ روز بروز زیادتی کے ساتھ آتی جاتی ہیں حالانکہ انگریزی کی خصوصیات اس میں بالکل نہیں کھپتی۔

ان کی بدولت زبان بالکل بھدی اور خراب ہوتی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں میں اس وقت ایک بڑی جماعت اپنے کو اردو کا حامی کہتی ہے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ لوگ اردو کے حامی نہیں کیونکہ ہر زبان میں ایک مادہ ہوتا ہے اور ہیئت۔ اور زبان ان دونوں کے مجموعے کا نام ہوتا ہے نہ کہ صرف مادہ کا۔ تو جب زبان اردو کی ہیئت باقی نہ رہے گی تو وہ زبان اردو کیونکر رہے گی پس اگر ہم اردو کے حامی ہیں تو ہم کو چاہئے کہ ہم اس کی خصوصیات کو باقی رکھیں۔ اور ہماری گفتگو ایسی ہو کہ اگر کوئی اجنبی سنے تو یہ سمجھے کہ ہم ایک حرف بھی انگریزی کا نہیں جانتے اور نہ انگریزی طرز سے ہم کو مناسبت ہے اور اس سے بھی بڑا تعجب یہ ہے کہ اس وقت عربی طلبہ کی تقریروں میں کثرت سے انگریزی الفاظ آنے لگے ہیں حالانکہ ان کی تقریر میں اگر دوسری زبان کے الفاظ آتے تو عربی کے الفاظ آتے۔ کیونکہ اول تو یہ لوگ عربی زبان کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ دوسرے عربی ہماری مذہبی زبان ہے اور اس اعتبار سے ان کی اصلی زبان وہی ہے اور اردو زبان تو بہت تھوڑے دنوں سے ہماری زبان ہوئی ہے ورنہ ہماری اصلی زبان اور پدری زبان عربی ہی ہے کیونکہ ہمارے آباء و اجداد عرب ہی سے آئے ہیں اور ہندوستان میں بودو باش اختیار کر لی ہے۔

غرض جب ہماری اصلی زبان عربی ہے تو اگر ہم کو اردو میں آمیزش ہی کرنا تھا تو اس بنا پر زیادہ سے زیادہ ہم یہ کرتے کہ اردو زبان کو عربی کے تابع کر دیتے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ ہم نے انگریزی کے تابع کیا کہ جس کی بدولت اردو زبان قریب قریب اردو ہونے ہی سے نکل گئی۔ اصل زبان اردو وہ ہے جیسے چار درویش یا اردو معنی غالب کی۔ اگر اس میں آمیزش ہو تو عربی کی آمیزش ہونا چاہئے۔ کہ عربی کی آمیزش لطف کو

دوبلا کر دیتی ہے۔ دیکھو فارسی کی عبارت میں اگر کہیں ایک جملہ عربی کا آجاتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے گلفشانی ہو گئی ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہماری زبان میں جو انگریزی کے غلط سے ایک جدت پیدا ہو گئی ہے وہ ضرور قابل ترک ہے اور اس جدید طرز میں علاوہ نقص مذکور کے ایک بڑا عیب یہ بھی ہے کہ تلبیس زیادہ ہو سکتی ہے اور پرانے طرز میں یہ بات نہیں ہے۔ اور ایک شرعی پہلو اس میں یہ بھی ہے کہ اس کو اختیار کرنا ایک فاسق قوم کے مشابہ ہے اور یہ مشابہت خود حرام ہے حدیث میں ہے۔ من تشبه بقوم فهو منهم کیونکہ تشبہ عام ہے لباس اور طرز سب چیزوں کو اور گوئیں کہ اس پر کوئی شخص مولویوں کو متعصب کہے لیکن ہم کو اس کی اصلاح پر دانا نہیں کیونکہ ہم ایک موقع پر ان کے مسلم دلائل سے اس کا برا ہونا ثابت کر چکے ہیں۔ باقی حدیث تو اپنے ماننے والوں کے لئے پڑھی ہے اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ حدیث آپ پر بھی حجت ہے کیونکہ مسلمان تو آپ بھی ہیں۔

غرض اس وقت تقریرات میں تمام خرابیاں پیدا کی گئی ہیں جن سے بسبب قواعد شرعیہ کے چھوڑ دینے کے ان تقریروں کا وجود کا عدم سمجھا جائے گا۔ پس ثابت ہو گیا کہ جس طرح بیان کا وجود حسی موقوف ہے خلق انسان پر اسی طرح اس کا وجود شرعی موقوف ہے تعلیم قرآن پر اور یہی حاصل ہے ان آیات کا اور چونکہ تقاریر میں آج کل یہ نقص عام طور سے پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے یہ جی بھی چاہتا تھا کہ طریقہ بیان کے متعلق ایسی آیت اختیار کی جائے کہ قرآن شریف ہی سے اس کی خرابیوں کا ناجائز ہونا بھی ثابت ہو جاوے۔ سو بحمد اللہ یہ آیت الرحمن۔ علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان ہ کہ اس میں تعلیم بیان کی شرط شرعی بھی مذکور ہے کہ قرآن شریف سکھلایا۔ کیونکہ غایت اس کی عمل ہے اور بیان اگر حدود شرعی کا لحاظ رہا تو قرآن پر عمل نہ ہوا کیونکہ عمل بالقرآن کے فوت ہونے کے معنی یہی شریعت کا فوت ہونا ہے (تعلیم البیان ص ۷)

لے جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی تو وہ اسی میں کا ہو گیا۔

(۱۷) ہم لوگ تہذیب میں دوسری قوموں کے

محتاج نہیں ہیں

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ہم تہذیب میں دوسری قوموں کے محتاج ہیں اور تشریعت اسلام کو تہذیب سے معزاً سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک ایک چشم کی نسبت مشہور ہے کہ وہ دہلی میں گیا سیر کیلئے چاندنی چوک میں نکلا۔ اتفاق سے آپ کی گردن بھی نہڑ سکتی تھی اسلئے جاتے وقت صرف ایک طرف کی دوکانیں نظر آئیں۔ دوسرے جانب کی نظر نہ آئیں۔ جب وہاں سے واپس ہونے لگا تو دوسری جانب کی دوکانیں نظر آئیں۔ انکو دیکھ کر آپ فرماتے ہیں کہ دلی کے لوگ بھی کیا ستم کے لوگ ہیں۔ ابھی یہ دوکانیں داہنی جانب تھیں ابھی ہمارے لٹنے سے پہلے ان کو بائیں جانب اٹھا کر رکھ دیا۔

تو ہمارے بھائیوں نے بھی شریعت کو صرف ایک طرف سے دیکھا اسلئے وہ محتاج سمجھتے ہیں ورنہ شریعت اسلام میں وہ تہذیب ہے کہ دنیا میں کسی قوم کے اندر بھی اتنی تہذیب نہیں ہے چند روز اگر ہمارے پاس رہو اور پھر دیکھو کہ وہ شریعت جس کو آج خوشخوار بتلایا جا رہا ہے۔ وہ کیسی دلفریب ہے۔ جب اس کی حقیقت سے واقف ہو گئے تو اس پر عاشق ہو جاؤ گے اور یہ کہو گے کہ

زفرن تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم

کہ شہ دامن دل میکشد کہ جای نجاست

کہ سر سے پیر تک جہاں نظر کر ددل کھنچا چلا جاتا ہے۔ (معارف المعیشت ص ۱۱)

(۱۸) حضور صلی اللہ علیہ وسلم امریکہ تشریف نہیں لینگے

تو پھر حضور کی بعثت عا کیسے ہوئی؟

ایک صاحب نے ایک مرتبہ یہ سوال کیا کہ یہ تو میرا اعتقاد ہے کہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

بعثت عام ہے۔ لیکن یہ خلیفان ہوتا ہے کہ امریکہ میں نہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں بھیجا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ضرور کہیں ایسا منقول ہوتا حالانکہ منقول نہیں۔ نیز امریکہ کا حال بہت بعد میں معلوم ہوا ہے کہ ایک جہاز غلط رستے پر ہو گیا تھا اور وہ وہاں پہنچ گیا۔ اور اس کو معلوم ہوا کہ یہاں بھی کچھ لوگ رہتے ہیں۔

جب وہاں آپ کی دعوت نہیں پہنچی تو نبوت عام کیسے ہوئی جواب میں فرمایا کہ بعثت عامہ کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ بعثت کے عام ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جب کبھی جس کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر پہنچی اور وہ آپ پر ایمان نہ لائے اور احکام قبول نہ کرے تو وہ کافر ہے اور یہ معنی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضور کی بعثت کی خبر ساری دنیا کو ہو گئی تھی۔

اس تقریر کے بعد اب کوئی شبہ نہیں ہے۔ پس امریکہ میں جس وقت خبر پہنچی اسی وقت سے وہاں کے لوگ مکلف ہوں گے (مجاہد ملت معدلت و دعوات عبدیت حصہ پنجم ملفوظ ۲۱)

(۱۹) جب انسان کی تقدیر میں یہ لکھ دیا گیا کہ وہ

فلاں گناہ کرے گا تو پھر انسان مجرم کیوں؟

فرمایا کہ یہ مجبوری عمل کے بعد معلوم ہوتی ہے یعنی جب گناہ کر چکا اس وقت خبر ہوئی کہ یہ گناہ میری قسمت میں لکھا ہوا تھا۔ اس کے قبل جب گناہ کیا ہے تو اس کی خبر نہ تھی۔ اور اگر کہا جائے کہ گو اس کو علم تقدیر کا نہ تھا مگر واقع میں تو علم الہی اس کے متعلق تھا اور اس کا خلاف محال ہے تو اس طرح واقع میں مجبور ہوا۔

اب جواب یہ ہے کہ علم الہی اس طرح تھا کہ یہ شخص اپنے اختیار سے ایسا کرے گا تو اختیار منقہ ہوا۔ یا اور مؤکد ہو گیا۔ پھر سوال کیا گیا کہ اگرچہ انسان کا مجبور ہو نا لازم نہیں آتا لیکن خداے تعالیٰ رحیم ہیں اسلئے اگر اپنی رحمت سے ہوائے نفسانی کو پیدا ہی نہ کرتے۔ تو انسان کے لئے بہتر ہوتا۔ اس پر فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی متعدد صفات ہیں، ازاں جملہ ایک صفت حکیم ہونا

بھی ہے اور ہر صفت کا ایک خاص ظہور ہے پس جس طرح ہوائے نفسانی وغیرہ کا پیدا نہ ہونا مقتضایہ رحمت ہے اسی طرح ان کا پیدا ہونا مقتضایہ حکمت ہے۔

رہا سوال کہ وہ کیا حکمت ہے؟ اس کا اصل جواب یہ ہے کہ ہم کو اس حکمت کی اطلاع نہیں ہے۔ اور فرمایا کہ یہ جواب کم فہموں کے نزدیک زبردستی کا جواب معلوم ہوتا ہے لیکن اصل جواب یہی ہے۔ البتہ اس جواب کی حقیقت سمجھنے کے لئے اس کے قبل چند مقدمات سمجھنے کی ضرورت ہے جب تک کہ وہ سمجھ میں نہ آئیں اس وقت تک اس کی حقیقت سمجھنی مشکل ہے اور اس وقت تک یہ زبردستی کا جواب نظر آتا ہے۔

پھر فرمایا کہ جب انسان کے ہر عمل میں اختیار کا سلسلہ امور غیر اختیار یہ تک پہنچتا ہے جس سے اہل سائنس بھی انکار نہیں کرتے اور بنا پر تقدیر یہی امر ہے جیسا اوپر بیان ہوا تو اہل طبعاً کو تو تقدیر کا ضرور ہی قائل ہونا چاہئے کیونکہ وہ لوگ اس مسئلہ انتہاء الاختیار والی غیر الاختیار کو اس حد تک مانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے افعال اختیاری کو بھی اس قاعدہ کا پابند کرتے ہیں۔ چنانچہ تخلیق اختیاری کو موقوف مانتے ہیں۔ وجود مادہ قدیمہ پر جس کو اختیار خداوندی سے خارج کہتے ہیں۔ گو اہل حق اس کے قائل نہیں پس اس تسلیم کردہ مسئلہ کی بنا پر ان طبعیین کو تو ہم سے زیادہ قائل تقدیر ہونا چاہئے۔

(مجاہد ملت معدلت، دعوات عبدیت حصہ دوم ملفوظ ۲۲)

(۲۰) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے سلطنت چھین کر کفار کو کس لئے دیدی

فرمایا کہ جو چیز نہایت صاف شفاف ہو اس پر دھبہ ہونا نہایت ناگوار ہوتا ہے اور جو چیز خود میلی ہو اس پر ناگوار نہیں ہوتا جیسے ٹوپی چھینٹ لگ جانے سے اتار کر پھینک دیتے ہیں اور جوتے میں لگ جانے سے کوئی ناگواری نہیں ہوتی۔ ایسے ہی مسلمان دعویٰ محبت کرتے ہیں۔ ان سے ذرا سی بے احتیاطی ناگوار ہوتی ہے بخلاف اعداء کے کہ وہ جب کچھ بھی لئے دشمن

اصول پر عمل کر لیں تو اللہ میاں ان کو دیدیتے ہیں اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کے دشمن ہی ہیں۔
(مجاذلات معدلت حصہ سوم دعوات عبیدیت محفوظ ۲)

(۲۱) اس اعتراض کا جواب کہ سود کے بند کر دینے سے ہماری قوم پر تباہی آگئی

عقل اور وقت اس میں مختلف ہیں کہ تباہی قوم کا کیا سبب ہے میرے نزدیک تو اصل سبب تباہی کا بد معاملگی ہے۔ بعض قوم کے ریفارمر کہتے ہیں کہ سود کے بند کرنے سے تباہی آئی۔ جو قومیں سود لیتی ہیں وہ خوب ترقی کرتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں میں بھی بہت سے سود لیتے ہیں۔ لیکن ان کے کچھ بھی کام نہیں آتا۔ کیوں کہ مال سے مقصود تمتع دنیوی ہے۔ اور سود خواہ جمع کرتے کرتے مرجاتے ہیں اور بسا اوقات جن کے لئے جمع کرتے ہیں ان کو بھی نہیں ملتا ہے اور قرض کر دیا اگر تمتع بھی ہوئے تو روحانی ضرر سے تو خالی رہتے ہی نہیں یعنی سخت دل ہو جاتے ہیں۔ کسی پر انکو رحم نہیں آتا کسی کی مصیبت سے ان کا دل نہیں دکھتا اور اپنے زشتہ دار سے بھی سود نہیں چھوڑتے۔ جیسے بیرسٹروں کا حال ہے کہ وہ اپنوں کو بھی نہیں چھوڑتے سمجھتے ہیں کہ اگر ان سے نہ لیا تو نرخ بکڑ جائے گا۔ اور اکثر سود خواروں کو ترقی دینی بھی نہیں ہوتی۔ اکثر سود خواروں کا مال ضائع ہوتے ہی دیکھا ہے۔ اور قرض کر دیا اگر ترقی بھی ہوئی تو جب دین برباد ہوا تو اس ترقی کو لیکر کیا کریں گے۔

مباد اول آں فرد مایہ شاد کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد
یہ تو دینی غلطی تھی کہ سود کو ترقی کا سبب قرار دیا۔
دوسرے ایک دنیاوی غلطی بھی ہے وہ یہ ہے

ترقی خوش معاملگی میں ہے

کہ ترقی کا سبب وہ شئی ہو سکتی ہے جس سے عام لوگ منتفع ہوں۔ اس لئے کہ ترقی یافتہ وہی قوم ہوگی جس کے سب افراد کو ترقی ہو اور عام طور سے ان میں غنی پیدا ہوں اور سود ایسی شے ہے کہ ساری قوم میں شائع نہیں ہو سکتا۔ اول تو سب کے پاس مال نہیں۔ دوسرے آخر لے گا کون۔ اس لئے لا محالہ بعض لیں گے اور بعض نہیں۔ تو جو لیں گے وہ تو ترقی کریں گے اور جو نہیں

لیں گے وہ ترقی نہیں کریں گے بلکہ جو دیں گے وہ تباہ ہوں گے پس یہ طریقہ ترقی کا نہیں ہو سکتا ترقی کا صریح طریقہ خوش معاملگی اور اعتبار ہے۔ مسلمانوں میں خدا کے فضل سے افلاس نہیں۔ مسلمانوں میں تاجر، اہل ملک، رئیس سب طرح کی مخلوق ہے مگر بات کیا ہے کہ دوسری قوموں کو سود دیتے ہیں۔ اس وجہ سے تباہی آتی ہے۔ تو ایسی صورت ہونی چاہئے کہ سود نہ دینا پڑے اور وہ طریقہ صرف خوش معاملگی ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مسلمانوں کو روپے کی ضرورت ہوتی ہے اور اپنے نبھائیوں سے بلا سودی ملتا نہیں اس لئے غیر قوم سے سودی قرض لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور تباہ ہوتے ہیں۔ اور بے سود قرض نہ ملنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ دوسرے مسلمانوں کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ ابھی میں عرض کر چکا کہ مسلمانوں میں بہت مالدار ہیں۔ لیکن وہ بوجہ خوف بد معاملگی کے قرض نہیں دیتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ خود چاہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی امداد کریں اور انکو قرض دیں مگر ڈرتے ہیں کہ دیکر کیا لیں گے اگر خوش معاملگی مسلمانوں میں شائع ہو جائے تو خود آپس ہی میں ایک دوسرے کی حاجت پوری ہوتی رہے اور سود دینے کی ضرورت نہ پڑے تو جو تباہی کا سبب ہے رفع ہو جائے۔

پس ثابت ہوا کہ بد معاملگی تنزل کا سبب ہے۔ ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ کسی کا روپیہ لیکر دینا نہیں چاہتے۔ حتیٰ کہ اگر کسی غریب کے چار پیسے ہوں گے تو وہ بھی مال کر دیں گے اور اس کو لازمہ ریاست سمجھتے ہیں کہ ہم سے تقاضہ کرنے کی مجال نہ ہوئی۔ اسی طرح قرض خواہ کو نہ دیں گے اور بہانہ کر دیں گے کہ بھائی ابھی خرچ نہیں آیا۔ اور اسی حالت میں اگر بچہ کی ختہ در پیش ہو جائے یا کوئی شادی کرنا ہو تو بہتیرا روپیہ اگل دیں گے غرض بد معاملگی کا مرض عام ہے۔

(تقظیم الشعار ص ۱۱)

(۲۲) کیا تمام علما قرآن شریف میں ہیں

بعض لوگ کہتے ہیں کہ تمام علوم حتیٰ کہ طبیعیات، سائنس وغیرہ سب قرآن شریف میں ہیں۔ چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ ڈاکٹروں نے تحقیق کر لیا کہ مادہ منویہ میں کیرے ہوتے ہیں۔ سو قرآن مجید میں بھی یہ مسئلہ مذکور ہے اس لئے کہ فرمایا ہے خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ،

اور علق کے معنی چونک کے ہیں۔ حالانکہ یہاں علق کے یہ معنی نہیں ہیں بلکہ خون بستہ کے ہیں
وزبردستی ان تحقیق کو قرآن شریف کا مدلول بتاتے ہیں۔

ایک اور سائنسداں کہتے تھے کہ جیسے حیوانات میں نرمادہ ہیں اسی طرح نباتات
میں بھی ہیں اور قرآن شریف میں اس کا بھی ذکر ہے خلق الانداج کلھا اس عقلمند نے
انداج کا ترجمہ میاں بیوی سے کیا حالانکہ زوج کے یہاں یہ معنی نہیں ہے بلکہ بمعنی اصفاف ہے۔
صاحبو! یہ طریقہ جو اختیار کیا گیا ہے یہ سخت مضر ہے ع
دوستی بے خرد چوں دشمنی ست

اس میں بڑی دشمنی ہے اسلام کے ساتھ
اس لئے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سائنس

کے مسائل متفق نہیں ہوئے اور اس کو اہل سائنس بھی مانتے ہیں کہ ہم کو اب تک اس دریا کا قطرہ
بھی حاصل نہیں ہوا پس جب کہ مسائل متفق نہیں ہوئے تو اگر آج آپ نے کسی جدید تحقیق کو قرآن
شریف کا مدلول بنایا مثلاً یہی کہ تخم درخت میں نرمادہ ہوتے ہیں اور سو برس بعد یہ تحقیق غلط ثابت
ہوگئی اور دوسری تحقیق نئی ہوئی تو اس میں تکذیب کلام الہی کی بھی لازم آئے گی پس یہ لوگ یصدون
عن سبیل اللہ کے مصداق بن رہے ہیں غرض یہ کوشش کرنا کہ سب چیز قرآن شریف سے ثابت
ہو سکتی ہیں حماقت ہے۔ بلکہ قرآن شریف کا کمال یہ ہے کہ جس فن کی وہ کتاب ہے وہ فن اس میں ہو
اور دیگر خرافات سے خالی ہو۔ قرآن شریف ایک طب روحانی ہے اور اس فن میں وہ لکھا ہے اور
موٹی بات ہے کہ جب مسائل دینیہ فرعیہ بھی سب کے سب قرآن شریف میں نہیں ہیں۔ تو فنون
و تجربے کے مسائل تو اس میں کل کیسے ہوں گے۔ (اطاعت الاحکام ص ۱۱)

(۲۳) اس شبہ کا جواب کہ زکوٰۃ دینے سے مال کم

ہوتا ہے بڑھتا کہاں ہے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو گن کر روپے رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دینے کے بعد پھر گنتے
ہیں تو کم ہو جاتے ہیں۔ بڑھنا تو درکنار برابر بھی نہیں رہتے۔ بات یہ ہے کہ بڑھنے کی حقیقت

اور غرض پر اگر نظر ہوتی تو یہ شبہ نہ ہوتا مال کے بڑھنے سے غرض یہ ہے کہ وہ بڑھتا ہوا مال ہے
کام آئے۔ چنانچہ اگر کسی کے پاس کروڑوں روپیہ ہو۔ اور اس کے کام نہ آئے بلکہ فضولیات میں
ضائع ہو جائے۔ اور ایک شخص کے پاس دس روپے ہوں لیکن دس کے دس اس کے کام آئے
یہ شخص اس سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ سو ہم کھلی آنکھوں مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ شخص ہیں اور
ان کی برابر آمدنی ہے مگر فرق اتنا ہے کہ ایک زکوٰۃ دیتا ہے اور تمام حقوق واجبات ادا کرتا ہے۔
سو اس کی چین و آرام سے زندگی گذرتی ہے۔ اور دوسرا شخص جو حقوق ادا نہیں کرتا وہ ہمیشہ
پریشانی میں رہتا ہے۔ آج چوری ہوگئی کل کوئی مقدمہ قائم ہو گیا۔ خود بیمار ہو گئے، بچے بیمار
ہو گئے۔ عطار کے یہاں روپیہ جارہا ہے۔ طبیب کی فیس میں روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔ بخلاف
پہلے شخص کے کہ جس قدر آمدنی ہے وہ سب اس کے کام آ رہی ہے جو مال بڑھنے سے غرض ہے
وہ اس کا حاصل ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ جس قدر لیتے ہیں اس سے زیادہ دیتے ہیں اور پھر جو لیتے ہیں وہ
بھی ہمارے ہی لئے ہیں۔ (ذکر الموت ص ۹۸)

(۲۴) اس شبہ کا جواب کہ دیندار لوگ مصائب میں

زیادہ مبتلا رہتے ہیں

آپ کہیں کہ ہم تو کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں کہ فرمانبرداروں کے زیادہ کام اٹکتے ہیں
کوئی تنگدست ہے کوئی بیمار ہے، غرض فرمانبرداروں پر زیادہ مصائب آتے ہیں۔
جواب یہ ہے کہ کامیابی کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک اس کی حقیقت و روح
ہوتی ہے مال اور صحت اور جاہ یہ کامیابی کی صورت ہے اور حقیقت اور روح اس کی
راحت و جمعیت قلب ہے مال و جاہ اور صحت سب مقصود اطمینان اور راحت ہے۔ اگر
سب کچھ ہو لیکن قلب پریشان ہو تو اس کو اہل دنیا بھی کامیابی شمار نہیں کرتے۔ چنانچہ اگر
ایک شخص کے یہاں مال و دولت و حشمت و شوکت سب کچھ ہو اور اس کو پھانسی کا حکم ہو جا
اور اس کے مقابل میں ایک شخص فرض کیا جاوے کہ جس کے پاس ایک پیسہ نہیں ہے اور

مزدوری کر کے اطمینان کے ساتھ اپنا پیٹ پالتا ہے۔ اس سے اگر یہ کہا جاوے کہ فلا شخص کی تمام دولت تم کو ملے گی اگر بجائے اس کے تم بھانسی پر چڑھ جاؤ اور یہ اقرار کر لو کہ قاتل میں ہوں، وہ ہرگز منظور نہ کرے گا۔ اور کہے گا کہ میں دولت کو لے کر کیا چوٹے میں ڈالوں گا جب میری جان ہی نہ ہوگی تو ایسی دولت کو کیا کروں گا اور اس دولت مند سے اگر پوچھا جائے کہ تم کو خلاص ہو جائے مگر اس شرط سے کہ اس کا فقر و فاقہ تم کو ملے گا تو وہ خوشی سے راضی ہو جائے گا۔ معلوم ہوا کہ کامیابی کی حقیقت مال و جاہ و صحت نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کی اطمینان اور راحت قلب ہے۔

اہل اللہ کا حال

پس ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ اگر اہل اللہ پر فقر و فاقہ خواہ کسی قدر ہوں ان کا قلب پریشان نہیں ہوتا اور نافرمان کو کتنی ہی عیش و عشرت ہو لیکن اس کا قلب ہمیشہ پریشان ہے۔ خاص کر مسلمان کو تو نافرمانی میں آرام ملتا ہی نہیں کیونکہ اس کو دباؤ زبانی کا بھی کھٹکا لگا ہے۔ تو اس کا گناہ اور بھی بے لذت ہے۔ اب آپ کی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ فرمانبرداری سے روح کو عیش میسر ہوتی ہے ظاہری ناداری اور تنگ دستی اس کو پریشان نہیں کرتی ہے۔ کیا اگرچہ مفلس ہو لیکن وہ ہر وقت خوش ہے کہ جب چاہوں گا سونا بنا لوں گا۔ اس واسطے بڑے بڑے والیان ملک اور حکام وقت اس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔

پس صاحبو! جب کہ وہ کیمیا جوتا نہ ہے کو سونا بنا دیتی ہے یہ اثر رکھتی ہے تو حقیقی کیمیا یعنی حق تعالیٰ کی محبت اور اطاعت میں کیا یہ اثر نہ ہو گا۔ پس یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ شریعت پر عمل کرنے سے کامیابی نہیں ہوتی اور یہ ثابت ہو گیا کہ حقیقی کامیابی اتباع شریعت میں ہی منحصر ہے۔ (شرط الایمان ص ۲۲)

ناول بینی کی مفر تیں

(۲۵)

اس میں اس قدر مشغولی ہوتی ہے کہ سوائے اس کے قلب میں کچھ نہیں ہوتا اگر کوئی کہے

کہ غفلت تو کچھ ہی میں کام کرنے اور ردی ٹکھانے پکانے سب میں ہوتی ہے تو چاہئے کہ سب چھوڑ دیں۔

بات یہ ہے کہ کام دو قسم کے ہیں، ایک ضروری اور ایک غیر ضروری ضروری اشغال کا یوں تجربہ ہوا ہے کہ مفر نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کو ضروری سمجھ کر آدمی اس میں پھنستا ہے اور اور جب اس کو ضروری سمجھا تو اصلی کام دوسری شے کو سمجھے گا تو دل اسی اصلی کام کی طرف رہے گا کہ اس کام سے فارغ ہو کر اپنا اصلی کام کریں گے۔ اور جو تھوڑی غفلت اس میں ہو جاتی ہے اس کیلئے استغفار کا حکم فرمایا ہے کہ استغفار سے وہ دھل دھلا جاوے گی۔ اور غیر ضروری کی نسبت یہ تو خیال ہے نہیں کہ یہ ضروری ہے اس لئے اس کو ہی مقصود سمجھے گا اور وہ مفر ہے اور مورث غفلت ہے، اور یہ غفلت بڑھتے بڑھتے مفسدی الی الکبائر بلکہ الی الکفر ہو جاتی ہے۔

ناول دیکھنا نقصان دہ ہے

بالخصوص ناول سے ایک بڑی سخت مرض پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اس کے دیکھنے سے بد معاشی کے طریقے خوب یاد ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ناول کے شدیدانی پرانے قصوں پر اعتراض کرتے ہیں اور تاریکی اور خلاف تہذیب سمجھتے ہیں لیکن اس تاریکی اور اس روشنی میں اس قدر فرق ہے کہ اس تاریکی میں وقت تو ضائع ہو جاتا ہے لیکن اخلاق پر برا اثر نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ وہ قصے مریحاً کذب اور عادت مستحیل ہیں مثلاً گل بکا دلی کا قصہ۔ بکا دلی کی تصویر اور جنوں کی عمل داری وغیرہ من الحرافات، ان قصوں سے کوئی ترکیب بد معاشی کی نہیں سیکھ سکتا۔ کیونکہ اس میں وصال بکا دلی کا طریقہ ایک جن کا مہربان ہو کر پہونچا دینا ہے تو اس کو کوئی کس طرح حاصل کریگا۔ بخلاف ناولوں کے کہ اس میں لکھا ہے کہ ماما کے ہاتھ رقعہ بھیج دیا جس کو ہر شخص کر سکتا ہے۔ ناول کا طرز چونکہ ایسا دکھلایا جاتا ہے جیسے واقعات ہوتے ہیں اس لئے اس کا ایک اثر خبیث پڑتا ہے کہ اکثر آدمی اس کے دیکھنے سے عشق نسا یا اطفال میں مبتلا ہوتا ہے اور قلب سوزش کی سی کیفیت ہو جاتی ہے اور یہ سخت مضر ہوتا ہے۔ (الصوم ص ۹۴)

(۲۶) اس شبہ کا جواب قرآن مجید میں تکرار مضامین کیوں ہے

اللہ تعالیٰ نے تمام احکام کو صاف صاف بیان فرمادیا۔ اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ مکرر کر بیان فرمایا کہ کوئی اشتباہ ہی نہیں رہا، ہم نے کیا کیا کہ اس کی قدر تو کی نہیں برعکس اس کے اس میں شبہات نکالنے لگے، کہ حق تعالیٰ نے اس مضمون کو مکرر کیوں بیان فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے اس تکرار کی حکمت یہی ارشاد فرمائی ہے چنانچہ فرماتے ہیں وَلَقَدْ صَدَقْنَا الْقُرْآنَ لِلنَّاسِ لِيَذْكُرُوا یعنی ہم نے لوگوں کے لئے طرح طرح سے اس لئے بیان کیا ہے تاکہ نصیحت قبول کریں۔

اس کی قدر اس کو ہوگی جو باپ کی شفقت کو پیش نظر رکھے دیکھو باپ بیٹے کو کس طرح سے سمجھاتا ہے صرف ایک مرتبہ کے سمجھانے پر اکتفا نہیں کرتا اور نہ ایک مرتبہ سمجھانے کے بعد مواخذہ کرتا ہے بلکہ ایک مرتبہ سمجھاتا ہے دوسری تیسری چوتھی مرتبہ بار بار سمجھاتا ہے جب تک کہ بیٹے کی اصلاح نہ ہو اسکو چین نہیں آتا۔ جب بالکل لاچار ہو جاتا ہے مجبوری زبرد تو فیق سے کام لیتا ہے پھر اس میں بھی ایلام اور ایذا مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی درستی اور تہذیب مد نظر ہوتی ہے حق تعالیٰ کو تو باپ سے بدرجہا زیادہ شفقت ہے اور اس کو باپ سے زیادہ اس کے مصالح کی رعایت ہے۔ اسی وجہ سے ایک ہی مضمون کو مختلف عنوانوں نوع بنوع کے طرز سے بیان فرمایا ہے۔ اور پھر باپ کے احسان اور حق تعالیٰ کے احسانات میں فرق عظیم یہ ہے کہ باپ کو بیٹے کے حال پر جو عنایت ہے اس کا منشا تو غرض ہے، کہ باپ کو یہ امید ہوتی ہے کہ بیٹا میرے کام آدے گا۔ یا یہ کہ اس سے میرا نام چلے گا۔ اور کچھ نہیں یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد کے ساتھ ایسا علاقہ پیدا کر دیا ہے کہ اس سے وہ اس کی تربیت و صلاح کی طرف مضطرب ہوتا ہے اور اسی سے اس کو راحت ہوتی ہے۔

بہر حال کوئی نہ کوئی غرض ضرور ہوتی ہے اور حق تعالیٰ کو انسان کی کوئی احتیاج نہیں ہے غنی بالذات ہے اور نہ ہماری طرح کسی شئی سے وہ متاثر ہوتے ہیں، ہم تو محبت سے یا کسی دوسری غرض سے مجبور بھی ہو جاتے ہیں

اور وہاں چونکہ غنی ذاتی ہے اس لئے کسی شئی کی احتیاج نہیں اور ماسوا اس کے سب محتاج ہیں بلکہ انسان احتیاج میں تمام مخلوقات سے اول نمبر ہے۔ اس لئے کہ اگر عالم میں انسان نہ رہے تو کسی شئی میں کوئی خلل نہ آوے سب اپنے حال پر رہیں اور اگر عالم میں سے ایک شئی بھی نہ رہے تو انسان کی بقا دشواری ہو جائے۔ مثلاً پانی نہ رہے یا آگ نہ رہے تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا اور اگر انسان ایک بھی نہ رہے تو ان چیزوں میں سے کسی کا کچھ بھی نقصان نہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ انسان ہر شئی کا محتاج ہے۔

اور یہ بات کہ باوجود اشرف المخلوقات ہونے کے یہ اتنا محتاج کیوں ہوا۔ سو محتاجی کی وجہ را از اس میں یہ ہے کہ اس کو اپنی اشرفیت پر نظر کر کے عجب ہو جائے اس لئے اتنی حاجتیں اس کے پیچھے لگا دی گئی ہیں کہ جب ناز و درخیز ہو تو فوراً اس طرف بھی نظر کرے کہ میں کیا ناز کروں میں تو ایک ایک جزو عالم کا محتاج ہوں۔ اس کے سوا اور بھی حکمتیں ہوں گی۔

اللہ تعالیٰ محتاج نہیں | بہر حال انسان سب چیزوں کا محتاج ہے اور کوئی شئی انسان کی محتاج نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو انسان کی کیا احتیاج ہوئی۔ جن چیزوں کا انسان خود محتاج ہے اللہ تعالیٰ کو ان کی بھی احتیاج نہیں بلکہ یہ امر عقلاً و نقلاً ثابت ہے کہ ہر شئی اپنے وجود اور بقا میں حق تعالیٰ کی محتاج ہے۔ پس حق تعالیٰ کے اس استغناء اور انسان کے احوج ترین مخلوقات ہونے کا افتخار تو یہ تھا کہ انسان کی بات بھی نہ پوچھتے اور احکام کا مخاطب نہ بناتے لیکن اس سے یہ لازم نہ آتا کہ حقوق بھی نہ ہوتے، حقوق تو ضرور ہی ہوتے ہیں۔ پس جب حقوق ہوتے اور ان کے ادا کا طریقہ بتلایا نہ جاتا تو سخت مصیبت ہوتی جو آقا اشاروں اور رموز پر خادموں کو چلائے ہیں خادموں کو سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے اور ایک دہی کوئی ایسا نکل آتا ہے جو اتنا مزاج شناس ہو کہ اشارہ کو سمجھے۔

شاہزادہ ایران کا واقعہ | علی حزیں شاہزادہ ایران کو اتفاق سے ایک خادم رمضان نام ایسا مل گیا تھا کہ اشاروں کو سمجھتا تھا۔ ایک مرتبہ علی حزیں نے شاہ دہلی سے درخواست کی کہ ہم کو ایک سلیقہ دار خادم کی ضرورت ہے بادشاہ نے ایک بڑے ہوشیار شخص کو بھیج دیا۔

علی حزیں باغ میں بیٹھے تھے اور نیا خدمت گار باغ کے دروازے پر تھا۔ ایک شخص آیا اور اس نے ایک رقعہ دیا۔ اس خادم نے وہ رقعہ پھونچا دیا اس میں درخواست تھی کہ لیوٹننٹ

فرمائیے۔ علیٰ خیز نے چہرہ پر بل ڈال کر وہ رقعہ واپس دیدیا۔ یہ خادم سخت پریشان ہوا کہ زبان کو تو بند کر لیا اور چہرہ سے ناگواری کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کس بات پر بگڑے ہیں۔ اتفاق سے وہاں رمضان بھی آنکلا اس سے خدمت گار نے سارا قصہ بیان کیا۔ رمضان نے کہا چہرہ پر بل ڈال کر رقعہ دیے کا مطلب یہ ہے کہ لیموں دیدو، لیموں ترش ہوتا ہے انھوں نے چہرہ ترش کر کے بتلادیا وہ خادم یہ سنکر بھاگا۔ اور سوچا کہ میں یہاں لہوں گا تو سخت مصیبت میں رہوں گا۔ یہ حکایت صحیح ہے یا غلط ہے بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ بھی اشاروں سے کام لیتے تو حق تھا لیکن مصیبت

اس حکایت کا خلاصہ

ہوتی۔ اور ان اشاروں کو سمجھنے والا کون تھا سو ایسا نہیں کیا بلکہ ایک مضمون کو خوب کھول کر دود مرتبہ تین تین مرتبہ بیان فرمایا اور بیان بھی اس طور سے نہیں فرمایا کہ کوئی پرچہ بھیج دے کہ اس کے پڑھنے اور سمجھنے یا عمل کرنے میں دقت ہوئی بلکہ ایک عجیب اور نفرت کے موافق طریقہ اختیار فرمایا۔ وہ یہ ہے کہ ایسی ذات مقدس کو بھیجا جن کی شان یہ ہے لقد جاءکم رسول من انفسکم یعنی تمہارے پاس ایک رسول آئے ہیں تمہاری جنس سے پس حضور کا ہماری جنس سے ہونا ایک نعمت تو ہے اسلئے کہ اگر کسی فرشتہ یا جن کو بھیج دیتے تو سب ہیبت ہی کے مارے مرجاتے اور آپس میں کچھ مناسبت نہ ہوتی۔

آج کل لوگ اس فکر میں ہیں کہ پیغمبر کو عبدیت اور بشریت کے مرتبہ سے گذار کر الٰہ تک پہنچادیں، گویا اس صفت کو مٹانا چاہتے ہیں کہ جو ہمارے اور ذات حق میں واسطہ اضافت ہوئی ہے حالانکہ عین رحمت الٰہی اور عین کمال نبوی بھی ہے کہ بشر ہو کر قرب کے ایسے درجہ پر پہنچے یہ تو کمال تھا اور رحمت اسلئے ہے کہ بشریت کی مناسبت سے بے راہوں کو راہ پر لادیں (الشکر ص ۱۵)

۲۷) پردہ مروجہ پر اعتراض کا جواب

جواب (۱) حق تعالیٰ نے بنوں کو زینت حیوۃ الدنیا بتلایا ہے نبات کو بیان نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ نبات کو خود تم نے بھی بے حقیقت سمجھ رکھا ہے کیونکہ لوگوں کو لڑکوں

زیادہ خوشی ہوتی ہے اور لڑکیوں کو تو عموماً دباں سمجھتے ہیں۔ تو تمہارے نزدیک وہ کیا خاک زینت دنیا ہونگی۔ دوسرا نکتہ نبات کے ذکر نہ کرنے میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ بتلادیا کہ نبات زینت دنیا بھی نہیں ہیں بلکہ محض زینت خانہ ہیں۔ اگر وہ بھی زینت دنیا ہوتیں تو حق تعالیٰ ان کو بھی یہاں ذکر فرماتے پس صرف بنوں کو زینت دنیا فرمایا اور نبات کو ذکر نہ فرمایا اس کی دلیل یہ ہے کہ لڑکیاں دنیا کی زینت نہیں ہیں کیونکہ عرفاً زینت دنیا وہ سمجھی جاتی ہیں جو منظر عام پر زینت بخش ہو اور وہ ایسی زینت نہیں ہیں کہ تم ان کو ساتھ لئے پھر دو اور سب دیکھیں کہ انکی اتنی لڑکیاں ہیں اور ایسی آراستہ و پیراستہ ہیں بلکہ وہ محض گھر کی زینت ہیں یہاں سے پردہ کی دلیل کی طرف اشارہ نکل آیا۔

عورت کا پردہ

دوسرے نکتہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ عورتوں کا پردہ کرایا جائے کیونکہ اردو میں عورت کو عورت کہتے جس کے معنی لغت میں چھپانے کی چیز کے ہیں تو اس کے ساتھ یہ کہنا کہ عورت کو پردہ نہ کراؤ ایسا ہے جیسا یوں کہا جائے کہ کھانے کی چیز کو نہ کھاؤ پہننے کی چیز کو نہ پہنو اور اس کا لغو ہونا ظاہر ہے کہ عورتوں کا پردہ نہ کراؤ انکو عورت کہنا خود اس کی دلیل ہے کہ وہ پردہ میں رہنے کی چیز ہیں۔

ایک ترقی یافتہ کہتے تھے کہ عورتیں پردہ کی وجہ سے ترقی علم سے رکی ہوئی ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں سی واسطے تو ان چھوٹی قوموں کی عورتیں جو پردہ نہیں کرتیں بہت تعلیم یافتہ ہو گئی ہیں۔ یہ جواب سن کر وہ خاموش ہی تو رہ گئے۔

پروردہ تعلیم کیلئے مضر نہیں

اصل بات یہ ہے کہ تعلیم یافتہ ہونے میں پردہ یا بے پردگی کو کوئی دخل نہیں بلکہ اس میں بڑا دخل تو جہ کو ہے۔ اگر کسی قوم کی عورتوں کی تعلیم پر توجہ ہو تو وہ پردہ میں بھی تعلیم دے سکتے ہیں ورنہ بے پردگی میں بھی کچھ نہیں ہو سکتا، بلکہ غور کیا جائے تو پردہ میں تعلیم زیادہ ہو سکتی ہے، کیونکہ تعلیم کے لئے یکسوئی اور اجتماع خیال کی ضرورت ہے اور وہ گوشہ تنہائی میں زیادہ حاصل ہوتی ہے۔ اس واسطے مرد بھی مطالعہ کے لئے گوشہ تنہائی تلاش کیا کرتے ہیں۔ جیسا کہ طلباء کو اسکا اچھی طرح اندازہ ہے۔

پردہ کی وجہ پس عورتوں کا پردہ میں رہنا تو علوم کے لئے معین ہے نہ کہ مانع نہ معلوم لوگوں کی عقلیں کیا ہوئیں جو پردہ کو تسلیم کا متانی سمجھتے ہیں ہاں علوم تجارت کے لئے

سیر و سیاحت کی البتہ ضرورت ہے مگر عورتیں ناقص العقل اور کم حوصلہ ہیں ان کے لئے سیر و سیاحت سے تجربے میں حقیقی یعنی اخلاقی ترقی نہ ہوگی۔ بلکہ آزادی اور شرارت بڑھے گی اس لئے شریعت نے عورتوں کے ہاتھ میں طلاق نہیں دی۔ کیونکہ یہ ایسی کم حوصلہ ہیں کہ ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتی ہیں۔ مرد تو برسوں میں کسی بہت بڑی بات پر طلاق کا قصد کرتا ہے۔ وہ بھی ہزاروں میں سے ایک ورنہ زیادہ تو ایسے ہی مرد ہیں جو عورت کی بد تمیزیوں پر صبر کرتے ہیں۔ اور اگر عورتوں کے ہاتھ میں طلاق ہوتی تو یہ ہر مہینہ شوہر کو طلاق دے کر نئی شادیاں کیا کرتیں۔

پس عورتوں کے لئے یہی سیر و سیاحت کافی ہے کہ اپنے گھر میں چل پھریا کریں۔ جن تجربوں کی انکو ضرورت ہے وہ گھر میں رہ کر ہی انکو حاصل ہو سکتے ہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ نظر حقیقت میں سے دیکھئے تو مردوں کو بھی اس کی ضرورت نہیں۔ اگر سیر و تماشا چاہتے ہو تو وہ بھی آپ کے اندر موجود ہے دل کی آنکھوں سے دیکھ لو۔ تم کو اپنے ہی اندر ایسا تماشا نظر آئے گا کہ دنیا کے پھول پھلواڑیوں سے استغناء ہو جائے گا۔

ستم است گر پے کشد کہ بیر سر سمن درآ
توز غنچہ کم ند میدہ در دل کشا بچمن درآ
چوں کوئے دوست ہست بھرا چہ حاجت ست
خلوت گزیدہ را بہما شا چہ حاجت ست

(مظاہر الآمال ص ۱۷)

پردہ کی اہمیت جو ان مردوں کو تو یہ حکم فرمایا تُلُّ لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَافُضُوْنَ اَبْصَارَهُمْ وَ يَحْفَظُوْا اَنْفُسَهُنَّ وَ جِهَهُمْ یعنی آپ مومنین سے کہد تبجے کہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، اور عورتوں کے لئے یہ بھی حکم فرمایا اور اس پر اضا فرمایا وَلَا يَبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ یعنی بناؤ سنگار کا موقع ظاہر نہ کریں۔ اور ظاہر ہے کہ بناؤ سنگار کا موقع وہ ہے کہ اکثر کھلا رہتا ہے جب اس کا اظہار بھی اجانب کے سامنے جائز نہیں تو باقی تمام بدن کا تو کیسے جائز ہو گا۔

اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ الَّتِي لَا يَرْجُونَ نِكَاحًا فَلَيْسَ

لہ غیروں

عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَجِّجَاتٍ بِزِينَةٍ یعنی جو عورتیں بوڑھی ہوں وہ اگر اپنے زائد کپڑے اتار کر رکھ دیں۔ جیسے اوپر تلے کپڑے ہوں اور اوپر کا کپڑا اتار دیں بشرطیکہ بدن ظاہر نہ ہو تو کچھ حرج نہیں، لیکن اس حالت میں بھی اپنے مواقع زینت کو ظاہر نہ کریں مثلاً گردن کان کان میں زیور پہنا جاتا ہے۔ اور آگے ارشاد ہے اَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خِيَرَتَهُنَّ یعنی یہ زائد کپڑے اتار کر رکھنے سے بچیں تو ان کیلئے زیادہ بہتر ہے۔

پس جب بوڑھیوں تک کیلئے یہ حکم ہے تو اے لڑکیو! اور اے جوان عورتو! تم کو کہاں اجازت ہوگی کہ دور دور کے رشتہ داروں کے سامنے بے محابا آ جاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تو کوئی نہ ہوا نہ ہو گا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سے عورتوں کو پردہ کرتے تھے۔

اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آجکل جو بعضے تو تعلیم یافتہ کہتے ہیں کہ پردہ ضروری نہیں ہے اور ایسا پردہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں محض غلط ہے۔ بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے قرآن و حدیث کو دیکھا ہی نہیں بس دیکھا کیا ہے کوئی اخبار دیکھ لیا اگر کچھ غلطی پڑھی ہے تو مصری اخبار دیکھ لیا سو سمجھ لو کہ یہ پردہ جو آج کل مروج ہے یہ قرآن سے بھی ثابت ہے اور حدیث سے بھی ثابت ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پردہ کے پیچھے سے خط دیا۔

خود سرور کائنات کا عمل اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سامنے عورتوں کو نہ آنے دیتے تھے اور قرآن اور پر گزرا ہے! پھر جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود سے پردہ کرادیں، تو کون سا پیر ہے اور کون سا رشتہ دار ہے جس سے بے حجابی جائز ہوگی خواہ کوئی خالو ہو یا پھوپھا، دادا لگتا ہو یا چچا اگر وہ محرم نہ ہو اجنبی ہے پڑا ظلم و ستم ہے کہ عورتوں کو اس کی کچھ پردہ نہیں ہے۔

ہم نے مانا کہ تمہارا دل پاک ہے لیکن تم کو دوسرے کی کیا خبر، اگر کہو کہ دوسرا بھی پاک ہے تو توبہ توبہ خدا اور رسول کو تم نے ظالم قرار دیا کہ باوجودیکہ یہ پاک تھا پھر بھی اس سے پردہ کا حکم دیا۔ اگر یہ پاک صاف ہوتے تو حق تعالیٰ ضرور ان کا نام لکھ دیتے کہ فلاں شخص پاک ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا قول یاد رکھو اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے کہ کون پاک ہے اور کون نہیں ہے انبیاء سے زیادہ تو کوئی نہیں ہو سکتا۔ یوسف علیہ السلام باوجود نبی ہونے کے فرماتے ہیں وَمَا أُبْرِيْ نَفْسِيْ اِنْ اَلنَّفْسِ

لَا مَارَکَ بِالسُّوءِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبِّي یعنی میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا ہوں، نفس تو بری بات کا حکم کرنے والا ہی ہے، مگر جس پر میرا رب رحمت فرمائے کہ وہ مستثنیٰ ہے۔

اب بتلانیے کہ کس کا منہ ہے جو کہے کہ میرا نفس پاک ہے۔ مجھ کو نفس کی پاکی کا دعویٰ

برا دوسرے نہیں آتا اور اگر ایسا اتفاق ہوتا ہے تو وہ عارضی حالت ہے چنانچہ بعض بزرگوں کو اس میں دھوکا بھی ہوا ہے کہ انھوں نے جب دیکھا کہ انکو دوسرے نہیں آتا تو یوں سمجھے کہ ہمارا نفس مرکی ہو گیا ہے اسلئے انھوں نے غیر محرم کے اختلاط میں کوئی پاک نہیں کیا اور پھر کسی فتنہ میں مبتلا ہو گئے خواہ وہ فتنہ قلبی ہی کا ہو۔ اور یہ کارگذاری شیطان کی ہے کہ اس ترکیب سے کہاں سے کہاں تک لایا۔ اسی واسطے حق تعالیٰ نے اول یہ تدبیر بتلانی کہ نگاہ نیچی رکھو اگر بھر دشت تم کو کسی غیر کے سامنے آنا پڑے تو نگاہ نیچی اور کپڑوں میں لپٹ کر آؤ۔ یہ نگاہ بظاہر ہے بہت خفیف لیکن اصل تمام پھول پھیل کی یہی ہے جیسے زکام ہے کہ بظاہر بہت ہلکی بیماری ہے لیکن سیکڑوں بیماریوں کا منشا ہو جاتا ہے اسی طرح نظر بھی ہے کہ اگر یہ بگڑ گئی تو پھر آئندہ امن اٹھ گیا اسی واسطے اول اسی کو روکا ہے۔

دیکھو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیوں سے تو زیادہ کوئی عورت

ازواج مطہرات کا پردہ

نہیں ہو سکتی ہیں تم کو قصہ سناتا ہوں جس سے تم کو اندازہ

ہوگا کہ پردہ کس درجہ ضروری ہے۔

حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ ایک نابینا صحابی ہیں اور ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے ازواج مطہرات میں سے غالباً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیٹھی تھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پردہ میں ہو جاؤ۔ انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ تو نابینا ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں افعیبتما وان انتما لستما تبصران۔ یعنی کیا تم بھی اندھی ہو اسکو دیکھتی نہیں ہو۔

دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیاں امہات المؤمنین دوسری طرف نابینا صحابی، بھلا یہاں کون سے دوسرے کا احتمال ہو سکتا ہے، مگر پھر بھی کس درجہ اہتمام کرایا۔ (العصۃ ص ۶)

علماء ترقی سے مانع نہیں ہیں

(۲۸)

جواب (۱)۔ لوگ علماء کو ترقی سے مانع کہتے ہیں۔ آج میں اس الزام کو دفع کرنا

چاہتا ہوں اور اس وقت میں ترقی کی ضرورت ہی پر بیان کروں گا اس پر جنہیں چونکے کہ یہ ملا آدمی اور ترقی کا بیان۔ میں نے کہا کہ آپ تو ترقی کو صرف عقلی ضروری ہی کہتے اور میں اسے شرعی فرض کہتا ہوں۔ اس پر اور بھی حسیہ ہوئی۔ میں نے کہا حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَیْکُمْ دِجَّةٌ اَوْ مُوَلِّیْہَا فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرَاتِ یعنی ہر قوم کے لئے ایک جہت قبلہ مقرر ہے جس کی طرف وہ منہ کرتی ہے۔ پس ایک دوسرے پر سبقت کرو۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہم کو استباق کا حکم دیا جس کے معنی ایک دوسرے پر سبقت کرنے کے ہیں۔

تو اب جو لوگ علماء کو ترقی سے مانع کہتے ہیں وہ ان پر کتنا بڑا افتراء کرتے ہیں۔ بھلا جس چیز کا قرآن میں امر ہے علماء کی مجال ہے کہ اس سے منع کر سکیں۔ پس ترقی کا ضروری ہونا تو متفق علیہ ہے البتہ اس کے طریقہ میں اختلاف ہے۔ جنہیں کہتے ہیں کہ جس طرح ہم کہیں اسی طرح ترقی کرو اور علماء کہتے ہیں کہ جس طرح قرآن کہے۔ اسی طرح ترقی کرو۔ سو قرآن میں فاستبقوا کے ساتھ الخیرات کی بھی قید ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ نیک کاموں میں ترقی کرو۔

اب اس اختلاف کا فیصلہ بہت جلد ہو سکتا ہے۔ آپ یہ ثابت کر دیں کہ جس ترقی کے آپ خواہاں ہیں وہ ترقی فی الخیر ہے تو میں اس کا ذمہ لیتا ہوں کہ علماء آپ کو اس ترقی سے منع نہ کریں گے اور اگر ترقی فی الشر ہے تو اس کا مطلوب نہ ہونا بلکہ مذموم ہونا تمام عقلاء کے نزدیک مسلم ہے ورنہ پھر ایک ڈاکو کو بھی یہ کہنے کا حق ہے کہ مجھے ڈاکہ سے کیوں منع کیا جاتا ہے۔ میں تو ترقی کا طالب ہوں، بتلانیے اسے کیا جواب دیں گے؟

ترقی محمود مطلوب ہے | ظاہر ہے کہ اس سے یہی کہا جائے گا کہ تیری یہ ترقی محمود نہیں بلکہ ترقی مذموم ہے جو کہ برے طریقے سے حاصل کی جاتی ہے معلوم ہوا کہ ترقی مطلقاً مطلوب نہیں بلکہ وہی مطلوب ہے جو محمود ہو نہ مذموم نہ ہو۔ پس اب یا تو آپ ثابت کر دیں کہ جس ترقی کے آپ طالب ہیں وہ محمود ہے، مذموم نہیں، یا ہم ثابت کر دیں کہ ترقی محمود وہی ہے جس کی ہم تعلیم دے رہے ہیں۔ اور یہ ترقی مذموم ہے جس کی تعلیم آپ دے رہے ہیں۔

اس تقریر سے بہت جلد سمجھ گئے اور اقرار کر لیا کہ واقعی علماء کو ترقی سے اختلاف نہیں بلکہ اس کے طریقہ تحصیل سے اختلاف ہے، کیونکہ ان طریقہ نے خلاف شرع ہونے کی

وجہ سے اس ترقی کو ترقی فی الشرک مصداق بنا دیا ہے۔

غرض دوسری قوموں کی ترقی دیکھ کر مسلمانوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے اور وہ انکی ہر حالت کو ترقی میں دخیل سمجھ کر اختیار کرتے جاتے ہیں۔ کبھی ان کی صورت و وضع کو اختیار کرتے ہیں کہ شاید اس کو ترقی میں دخل ہو، کبھی عورتوں کے پردہ کو اٹھانا چاہتے ہیں کہ یہی ترقی سے مانع ہے۔ اگر عورتیں آزاد ہوں گی تو علوم صنعت و حرفت سیکھ کر خود بھی ترقی کریں گی اور اولاد کو بھی ترقی یافتہ بنائیں گی۔

ایک صاحب نے میرے سامنے یہی دلیل بیان کی تھی۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں میں صرف شرفاء کی عورتیں پردہ نشین ہیں جن کی تعداد ہندوستان میں بہت کم ہے زیادہ تعداد تو چھوٹی قوموں کی ہے اور ان میں پردہ کا ہمیشہ سے رواج نہیں ہے۔ اگر بے پردگی کو ترقی میں کچھ دخل ہے تو ان قوموں نے کیوں نہ کر لی۔ پس اس کا جواب کچھ نہ تھا، وہ میرے منہ کو تکنے لگے۔ (العبۃ بذبح البقرۃ ص ۴۵)

علماء پر غلط الزام جواب (۲)۔ یہ سب کہتے ہیں کہ عزت و ترقی حاصل کرنا چاہئے اور اس کے ساتھ ہی علماء پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ علماء ترقی کے مانع ہیں، میں کہتا ہوں کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ عزت حاصل کرنا چاہئے اور علماء اس کے مانع نہیں ہیں۔ اور علماء کیسے مانع ہوتے جس شئی کو قرآن و حدیث ثابت کرتے ہیں اس کو کون سامولوی مٹانے والا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **وَاللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ** یعنی اللہ ہی کے لئے عزت اور اس کے رسول کے لئے اور مومنین کے لئے، بھلا جس شخص کا اس آیت پر ایمان ہو گا وہ کیسے اس کی نفی کرے گا۔ پھر علماء پر الزام کیسا؟ بات یہ ہے کہ ان کی بات پوری طرح سنے تو ہیں نہیں بے سوچے سمجھے ہانک دیا کہ علماء ترقی سے روکتے ہیں۔

صباحو! علماء ترقی سے مانع نہیں ہیں علماء جو طالبان ترقی پر اعتراض کرتے ہیں۔ وہ نفس ترقی کی طلب پر نہیں بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ آپ لوگ اس کو غیر طریق سے حاصل کریں ہیں طریق یہ نہیں ہے اگر کوئی پشاور جانا چاہے اور ٹکٹ لے لے کلکتہ کا اور اس کو کوئی اسکی غلطی پر آگاہ کرے تو وہ پشاور جانے کا اور ریل میں سوار ہونے کا مخالفت نہیں بلکہ طریق کے اندر مخالفت کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ رستہ یہ نہیں ہے۔ پشاور کو دوسری گاڑی جاوے گی۔ اس کا

ٹکٹ لے لو وہ تم کو پشاور پہنچا دے گی۔

ریل کا ایک واقعہ میرے ایک ہموطن اسٹیشن سہارنپور سے میرٹھ جانے والے کھنؤ جانے والی گاڑی میں غلطی سے سوار ہو گئے۔ اتفاق سے میں بھی کھنؤ جا رہا تھا۔ عین روانگی کے وقت تو ان سے کوئی بات ہوئی نہیں اس لئے کہ خیال ہوا کہ یہ تو گاڑی میں موجود ہیں ہی۔ ان سے باطمینان بات کر دیں گا۔ جو لوگ مجھ کو پہنچانے کے لئے آئے تھے ان سے باتیں کرتا رہا۔ جب ریل چھوٹ گئی تو انکی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کہاں جاتیں گے۔ کہنے لگے کہ میرٹھ، میں نے کہا کہ ممکن ہے کہ آپ میرٹھ جائیں مگر یہ گاڑی میرٹھ نہ جائے گی یہ تو روڑ کی ہوتی ہوئی سیدھی کھنؤ پہنچے گی۔ یہ سن کر تو بہت چکر لائے اور سردی کا موسم تھا۔ ان جنٹلمینوں کو یہ بھی مرض ہے کہ کپڑا ساتھ نہیں لیتے اور رضائی اور ردئی دارا نہ رکھا پہننے کو خلاف تہذیب سمجھتے ہیں۔ بیک بینی و دد گوش ہی سفر کرتے ہیں ایسے ہی وہ بھی تھے، خیر وہ روڑ کی اترے پھر دہلی سے اخیر شب میں میرٹھ پہنچے۔ پس دیکھئے میں ان کے ریل میں سوار ہونے کا اور میرٹھ جانے کا مخالفت نہیں تھا بلکہ گفتگو یہ بھی کہ آپ نے طریق میں غلطی کی۔

پس علماء کو اگر کہیں طالبان ترقی پر اعتراض کرتے ہوئے سنا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ترقی کے مخالف ہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ جس طریق سے آپ ترقی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں یہ طریق اس کا نہیں ہے۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ راے اعزابی : کیس راہ کہ تو میردی بہ ترکستان ست

علماء بتانے والے ہیں طریق اس کا وہ ہے جو مولوی بتاتے ہیں، خدا اور رسول نے جو بتایا ہے وہ طریق ہے۔ مولوی بیچارے تو سرکاری

حکم کے منادی کرنے والے ہیں۔ منادی کرنے والے سے اگر کوئی معارضہ اور مناظرہ کرے تو وہ یہی کہے گا کہ میں تو منادی کرنے والا ہوں مجھ سے گھنپ نہ کر دو۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے چیرا سی سمن لایا اور اس سے مباحثہ کرنے لگے تو ایسے شخص پر دجرم قائم ہوں گے ایک تو تعمیل نہ کرنے کا، دوسرے سرکاری آدمی سے مقابلہ کرنے کا۔ پس یاد رکھو کہ یہ علماء سرکاری آدمی ہیں ان سے منازعت کرنا جرم ہے۔

غرض طریق ترقی کا وہ نہیں جو آپ لوگوں نے اختیار کیا ہے ترقی اور عزت حاصل

کرنے کی ضرورت تو مسلم ہے لیکن طریق یہ نہیں ہے۔

اب میں اس کو بیان کرتا ہوں مگر اس کی تحقیق کے لئے اول یہ سمجھنے کی عزت حاصل کرنے کی غرض کیا ہے اور وہ کیوں ضروری ہے۔ سو لوگ تو ترقی اور عزت کے طالب ہیں کہ اس کی غرض محض بڑا بننا ہے۔ مگر میں اس کی اصل وجہ بیان کرتا ہوں کہ اس کی کس لئے ضرورت ہے۔

انسان کا مقصد

اصل یہ ہے کہ عقلی طور پر انسان کو دو چیزوں کی ضرورت ہے منافع کو حاصل کرنا اور مضمرات سے بچنا۔ آدمی جو کچھ کرتا ہے اس کی غایت صرف یہی ہوتی ہے کہ یا تو نفع کی تحصیل ہو یا مضمرات کا دفع۔ مثلاً کھانا کھانا ہے تاکہ بھوک کے ضرر سے بچے اور قوت کی منفعت حاصل ہو۔ دوا کرتا ہے تاکہ مرض دور ہو اور صحت حاصل ہو۔ غرض جو کچھ کرتا ہے یا تو جلب منفعت کیلئے یا دفع مضرت کیلئے، اور دوسرا قاعدہ عقلی یہ سمجھو کہ ضروری چیزوں کے طریقے بھی ضروری ہوتے ہیں۔ پس جلب منفعت اور دفع مضرت جس طریقے سے حاصل ہو وہ بھی ضروری ٹھہرا۔ سو طریقہ اس کا یہ ہے مال و جاہ کا حاصل ہونا۔ مال تو اصل میں منافع کی تحصیل کے واسطے ہے اور جاہ اصل میں دفع مضرت کے واسطے ہے، گو کبھی کبھی جاہ سے خطرہ میں بھی پڑنے کا احتمال ہے، لیکن وہ بحیثیت جاہ ہونے کے خطرہ کا سبب نہیں ہوتی اس لئے کہ جاہ فی حد ذاتہ خطرات سے بچانے والی ہے بلکہ سبب وقوع فی الخطرہ کا قلت جاہ ہوتی ہے۔ مثلاً بھینٹے لوگوں کے کچھ دشمن ہو گئے اور آزار پہونچایا تو یہ ایذا جاہ کے سبب سے نہیں ہوتی بجاہ کے محدود ہونے کی وجہ سے ہے اگر غلبہ پورا ہوتا تو اس کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکتا اسی واسطے حق تعالیٰ کا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ غلبہ اور عزت غیر محدود اور کامل درجہ میں ہے۔ لیکن تاہم جاہ ہی ایسی شئی ہے جو بہت سے مصائب اور خطرات سے آدمی کو بچاتی ہے۔ مثلاً اب ہم اطمینان سے بیٹھے ہیں، کوئی ہم کو ذلیل نہیں کر سکتا۔ بیگار میں نہیں پکڑ سکتا۔ تو اس کا سبب کیا ہے۔ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عزت عطا فرمائی ہے۔ بخلاف ان لوگوں کے جن کو عزت حاصل نہیں ہے۔ پولیس نے حکم دیدیا کہ دس چاروں کو بیگار میں پکڑ لاؤ، بیچارے چار دنا چار آتے ہیں۔ پس جاہ اور عزت کی غرض مضرت سے بچنا ہے۔

عزت و مال مطلوب ہیں

اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ عزت اور مال دونوں مطلوب اور ممدوح ہیں ہر دو بعمہ اور مذموم نہیں ہیں اور جو مال و جاہ کی مذمت کرتے ہیں ان کا عنوان تبیری مختصر ہوتا ہے۔ مقصود و مذمت کرتا جب

مال اور حب جاہ کا ہے اور حب بھی وہ جو حق تعالیٰ کی محبت سے بڑھی ہوئی ہو کہ ان کی ہوس میں اللہ تعالیٰ کے حکم بھی پس پشت ڈال دے چنانچہ ارشاد ہے قُلْ اِنْ كَانِ اٰبَاؤُكُمْ وَاَبْنَاؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَنْتُمْ دَاخِلُكُمْ وَاَعْيُنُكُمْ وَاَمْوَالٌ اَقْتَرَقْتُمْوهَا وَتَجَارِیْ تَحْتُونَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنَ تَرْضَوْنَهَا اَحَبُّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلٍ وَجِهَارٍ دِیْ سَبَبِ لَهَا فَتَرْتَضَوْنَ حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرٍ اَحَبُّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ سے صاف سمجھا جاتا ہے کہ مذموم اور نہی عنہ نہ مال ہے نہ جاہ اور نہ حب مال اور حب جاہ، بلکہ مال اور جاہ کی حب مضرت ہے۔ جو اللہ کی یاد سے غافل کر دے اور اس کے مقابلہ میں دین کی بھی پروا نہ رہے عزت اور آبرو کی ایسی حفاظت کرے کہ دین رہے یا جائے۔ مگر بات نہ جائے۔

جیسے ایک شخص ریل میں سوار تھے انھوں نے نماز پڑھی اور کہتے تھے کہ میں نے نماز اس لئے نہ پڑھی کہ ہندوؤں کا مجمع تھا اگر ان کے سامنے نماز پڑھتا تو وہ یوں کہتے کہ کیا اٹھک بیٹھک کرتا ہے اور اس سے اسلام کی اہانت ہوتی۔ استغفر اللہ یہ اس شخص کا گمان فاسد تھا اگر وہ نماز پڑھتا تو زیادہ عزت ہوتی

حکایت وزیر بھوپال

ایک وزیر اعظم ریاست بھوپال کی حکایت ہے کہ کسی بڑے حاکم کا لکچر ہو رہا تھا نماز کا وقت آ گیا۔ بڑے بڑے امراء و وزراء شریک تھے ان میں نمازی بے نمازی سب قسم کے تھے سب یہ سمجھے کہ یہاں سے اٹھنا بڑی سبکی کی بات ہے اس لئے سب ساکت بیٹھے رہے۔ وزیر صاحب کھڑے ہو کر کہا کہ حضور نماز کا وقت آ گیا ہے ہم نماز پڑھیں گے۔ حاکم نے بہت خوشی سے کہا کہ ضرور پڑھ لیجئے وزیر صاحب کھڑے ہوئے اور لوگ بھی نماز کیلئے کھڑے ہو گئے دربار ہی میں بڑی شان و شوکت سے نماز باجماعت ہوئی۔

دین سے بے رغبتی

دیکھئے عزت یہ ہے، آج کل یہ حالت ہے کہ گودین جاتا رہے مگر ہماری آبرو و عزت مزعومہ میں فرق نہ آنے پائے۔ ہماری آمدنی میں فرق نہ آنے پادے، چنانچہ مختلف تدبیروں سے خواہ وہ جائز ہوں یا ناجائز۔ کوئی مال بٹھا رہا ہے، کوئی جائیداد کی فکر میں ہے، عورتیں زیور کے بڑھانے کی فکر میں، اسی طرح جاہ کو مختلف تدبیروں سے حاصل کرتے ہیں۔ اور اس کو ریاست سمجھتے ہیں۔ آج کل ریاست کا حاصل کیا ہے کہ اپنے دباؤ اور زور سے غریبوں پر ظلم کرنا کسی کی گھاس چھین لی کسی کی زمین دہالی وغیرہ غرض

عزت کے مقابلہ میں جب دین کی پروانہ کی لوکیا عزت ہے۔ ہاں یہ بھیڑیئے کی عزت ہے، اگر ابھی بھیڑیا آجاوے تو سب کھڑے ہو جاویں خواہ وہ یہ سمجھے کہ میری تعظیم کو کھڑے ہوئے حالانکہ لوگ اپنی حفاظت کے لئے کھڑے ہوں (علی محمد) واللہ ان امرار اور ظالموں کو ایسی ہی عزت ہے کہ لوگ اپنے بچاؤ کی وجہ سے ان سے ڈرتے ہیں۔ ورنہ ویسے تو کوسے اور گالیاں ہی دیتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اسکو غارت کرے۔

عزت ہے اللہ والوں کی کہ ان کے لئے جان تک فدا کرنے کے واسطے لوگ حاضر ہیں پس حقیقی عزت یہ ہے کہ دلوں پر قبضہ کرے اور دلوں پر سکے جائے۔ سو ایسی عزت اللہ والوں کی ہے۔ (العزۃ ص ۱۲)

(۲۸) اس تکیہ کلام اور مشہور اعتراض کا جواب کہ فلاں بات خلاف عقل ہے اسلئے قابل قبول نہیں

ہمارے بھائیوں نے ایک سبق پڑھ لیا ہے کہ جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئے کہہ دیا کہ یہ خلاف عقل ہے اس لئے قابل قبول نہیں اور لگے نصوص میں تحریف و تاویل کرنے چنانچہ ان کے نزدیک صراط پر چلنا بھی خلاف عقل ہے۔ اور ساری معادیات اور معجزات خلاف عقل ہیں، تو اس طرح انھوں نے عقائد میں بھی اختصار و انتخاب کرنا شروع کیا اب ایمان کے معنی وہ نہ رہے جو پہلے تھے یعنی تصدیق بما جاء به النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ معنی یہ ہو گئے کہ تصدیق بما اذفق عقل مما جاء به النبی صلی اللہ علیہ وسلم، یعنی ان کے نزدیک ایمان کہتے ہیں اس چیز کے ماننے کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ باتوں میں سے ان کی عقل کے مطابق ہو۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں دو مقدمہ ہیں ایک تو یہ کہ جو بات شریعت میں عقل کے خلاف ہے تمہاری عقل کے یا سب عقلاء کی عقل کے۔ دوسری شق تو مسلم نہیں کیونکہ علماء راہین جن کی عقل کے سامنے اہل دنیا کی عقل کچھ حقیقت نہیں رکھتی وہ انکو خلاف عقل نہیں کہتے اور مرزماں میں ان مسائل کو ایسی صورت پر تسلیم کرتے آئے ہیں جس صورت سے شریعت میں تعلیم دی گئی ہے۔

چنانچہ حضرات صحابہ و تابعین و علماء و صلحا رامت سب ان کا اعتقاد ظاہر کے مطابق رکھتے آئے ہیں۔ اگر یہ کہو کہ تمہاری عقل کے خلاف ہے تو اس صورت میں صغریٰ تو مسلم مگر کبریٰ مسلم نہیں کہ جو تمہاری عقل کے خلاف ہو وہ غلط اور ناقابل قبول ہے کیونکہ تو انین سلطنت میں بہت سی باتیں تمہاری عقل میں نہیں آتی مگر تم قانون دانوں کی عقل پر اعتماد کر کے ان کو تسلیم کرتے ہو۔ اس کو بھی جانے دو۔ میں تمہیں سے پوچھتا ہوں کہ ماں کے پیٹ سے تم جس طرح پیدا ہوئے ہو کیا تمہاری عقل میں آتا ہے۔ واللہ ہم کو اس پر حمت اسلئے نہیں ہوتی کہ رات دن اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے اگر اس کا مشاہدہ نہ ہوتا، اور صرف بیان سے یہ طریقہ معلوم ہوتا تو ہرگز عقل میں نہ آتا۔

انسان کی پیدائش اس کا امتحان اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم ایک نوزائیدہ بچے کی اس طرح نگرانی کرو کہ وہ یہ بات سننے یا دیکھنے نہ پائے کہ بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ اس کو فلسفہ اور سائنس اور طب سب کچھ پڑھائیں مگر یہ نہ پڑھائیں جس میں طریق تولدات کا ذکر ہو پھر جب وہ بی، اے، اور ایم، اے اور ایل، ایل، بی ہو جائے اس وقت اس سے کہو کہ خبر بھی ہے تو کیونکر پیدا ہوا تھا اور اس سے بیان کرو کہ اول تیرا باپ تیری ماں کے پاس گیا تھا جس سے مٹی کے کچھ قطرے تیری ماں کے پیٹ کے اندر جو رحم ہے اس میں گرے تھے پھر رحم کے اندر اس کی پردریش ہوئی کہ خون بنا اور خون سے علقہ پھر مضغہ پھر گوشت میں ہڈیاں بنیں پھر جسم کامل تیار ہو گیا تو اس میں روح پڑی جس کی پردریش عرصہ تک خونِ رحم سے ہوتی رہی پھر نو ماہ کے بعد تو ترنگاہ مادر سے نکلا اور اب وہی خونِ رحم دودھ کی شکل میں ماں کے پستان میں آ گیا جس سے دوبرس تک پردریش پاتا رہا۔ (الآخرہ) تو میں سچ کہتا ہوں کہ واللہ العظیم وہ نہایت سختی سے آپ کی مخالفت کرے گا اور کہیگا ایک قطرہ سے ایسے حسین جسم کا بنا پھر اس کا ترنگاہ سے جو نہایت تنگ راستہ ہے نکل آنا عقل کے بالکل خلاف ہے۔

اب بتلائیے کہ اگر یہ قاعدہ مان لیا جائے کہ جو بات جس کی عقل میں نہ آئے وہ غلط ہو اگرے تو پھر آپکا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا بھی غلط ہے بات یہ ہے کہ آپ خلاف عادت کو خلاف عقل کہتے ہیں جیسے نوزائیدہ بچہ جس کی ایسی نگرانی کی گئی ہو جس کا اوپر ذکر ہوا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کو خلاف عقل کہے گا۔ کیونکہ اس نے یہ بات کہی دیکھی یا سنی نہ تھی اور آپ اس کو خلاف عقل اس لئے نہیں کہتے کہ آپ کو اس کی عادت ہو گئی، ورنہ آپ بھی وہی کہتے جو وہ کہتا ہے اور ظاہر ہے کہ

خلاف عقل کا وقوع نہیں ہو سکتا۔

تو معلوم ہوا کہ آپ خلاف عقل ایسی باتوں کو بھی کہتے ہیں جن کا وقوع مشاہدہ ہو سکتا

خلاف عادت اور خلاف عقل میں فرق

تو وہ خلاف عقل نہ رہیں معلوم ہوا کہ آپ دراصل خلاف عادت کو خلاف عقل کہہ رہے ہیں اور کسی بات کے صحیح ہونے کے لئے خلاف عادت ہونا مضر نہیں اور نہ یہ غلط ہونے کی دلیل ہے۔ ورنہ پھر اس کے لڑکے کے قول کو بھی مان لینا چاہئے جو ماں کے پیٹ سے انسان کے پیدا ہونے کو غلط کہتا تھا۔

اور نیز بہت سی باتوں کو جنہیں آپ چار دن پہلے مستبعد اور محال سمجھتے تھے اور آج ان کا مشاہدہ ہو رہا ہے غلط کہنا چاہئے جیسے ریل کا ایک گھنٹہ میں ۶۰ میل طے کر لینا اور ۵ منٹ میں لندن سے تار کے ذریعہ سے خبر آ جانا وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ دنیا میں بہت سے امور عادت کے خلاف ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے مرغی کا ایک بچہ دیکھا ہے جس کے چار پیر تھے۔ اور آجکل دہلی میں دو لڑکیاں جڑی ہوئی ٹائش میں آئی تھیں جن کے تمام اعضاء جدا جدا تھے مگر کمر جڑی ہوئی تھی اور پیشاب گاہ الگ الگ تھی مگر پیشاب نکلتا ایک کے رستے سے تھا۔

تو بتلاتے کیا خلاف عادت کیلئے بھی کوئی ضابطہ ہو سکتا ہے جس کے اوپر بنا کر بعض امور کو مانا جائے اور کسی کے متعلق یہ کہا جاوے چونکہ یہ خلاف عادت ہے اسلئے ہم نہیں مانتے۔ صاحبو! آپ کا عدم سے وجود میں آنا ہی خلاف عادت ہے۔ کیونکہ عادت کا مقصد یہ ہے کہ ہر شئی اپنی حالت پر رہے جو معدوم ہے معدوم رہے اور جو موجود ہے وہ کبھی فنا نہ ہو۔ مگر رات دن اس کے خلاف مشاہدہ ہو رہا ہے، ہزار ہا معدوم وجود میں آتے اور لاکھوں موجود معدوم ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کسی بات کا خلاف عادت ہونا اس کے غلط ہونے کو مستلزم نہیں۔

اب دوسرا مقدمہ یہ سمجھ لیجئے کہ آپ خلاف عادت کو خلاف عقل کہتے ہیں اور ان دونوں

خلاف عادت اور خلاف عقل میں فرق

میں فرق نہیں کرتے حالانکہ یہ بڑی سخت غلطی ہے۔ سنئے میں اس کا فرق بتلاتا ہوں۔ خلاف عادت تو وہ ہے جو عقلاً ممکن ہو مگر مشاہدہ نہ ہونے کی وجہ سے دشوار مستبعد معلوم ہوتا ہے اور خلاف عقل وہ ہے جو عقلاً ناممکن ہے یعنی عقل کے استحصال پر دلیل قائم کر سکے اور استحصال کہتے ہیں

اجتماع نقیضین کو، تو خلاف عقل وہ ہے جس کے ماننے نقیضین کا ایک محل میں ایک آن میں ایک جہت سے مجتمع ہونا لازم آجائے۔ اب جو لوگ معادیات کو اور صراط کو و وزن اعمال وغیرہ کو خلاف عقل سمجھتے ہیں وہ مہربانی کر کے ان کے استحصال پر دلیل قائم کریں اور بتلائیں کہ ان کے ماننے سے اجتماع نقیضین کیوں لازم آتا ہے۔ یقیناً وہ ہرگز کوئی دلیل عقلی ان کے استحصال پر قائم نہیں کر سکے۔ بہت سے یہ کہیں گے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیوں نکر ہو جائے گا۔ اس کی نظیر دکھاؤ۔ بس آج کل تمام شبہات کا حاصل یہ ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی اسلئے یہ محال ہے اور جو دعویٰ امکان کا کرتا ہے وہ اس کی نظیر دکھائے۔ عجب اندھیر ہے کہ نظیر پر ثبوت شئی کو موقوف بتلایا جاتا ہے اور جس چیز کی نظیر نہ ملے اس کو خلاف عقل اور محال کہا جاتا ہے۔ لوگوں کو ثبوت کی حقیقت ہی معلوم نہیں۔ نظیر پر ثبوت کو موقوف سمجھتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ جو صنائع اور عجائبات اس زمانہ میں ایجاد یا مشاہدہ ہوئے ہیں کیا اس زمانہ سے پہلے کسی کے پاس ان کی نظیر تھی اور اگر نہ تھی تو کیا اس وقت یہ خلاف عقل اور محال تھیں۔ اگر محال تھیں تو پھر آج ان کا وقوع کیوں نکر ہوا۔ معلوم ہوا کہ کسی شئی کا امکان نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں تو خوب سمجھئے کہ کسی دعویٰ کا ثبوت نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں بلکہ نظیر تو محض توضیح اور تنویر کے لئے ہوا کرتی ہے مدعی ثبوت کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ہرگز لازم نہیں خصوصاً ایسے مدعی کے ذمہ جو کسی امر کا ثبوت یہ کہہ کر کرتا ہو کہ یہ امر خلاف عادت بطور معجزہ کے واقع ہوا قیامت میں خلاف عادت یوں ہوگا اس ذمہ تو کسی قاعدہ سے بھی نظیر کا پیش کرنا لازم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ تو اپنے دعویٰ میں تصریح کر رہا ہے کہ مدعا بے نظیری کی صفت کے ساتھ متصف ہے اگر نظیر کا پیش کرنا مدعی کے ذمہ کسی درجہ میں لازم بھی ہو سکتا ہے تو صرف اس مدعی کے ذمہ ہو سکتا ہے جو اپنے دعویٰ کو موافق عادت بتلائے اور جو خرق عادت کا مدعی ہو اس سے نظیر کا مطالبہ کرنا عجیب ہے۔

اب میں آپ کو ثبوت کی حقیقت بتلاتا ہوں جس کے ملنے کی وجہ سے لوگوں کا مذاق ایسا بگڑ گیا ہے کہ آج علماء سے

لوگوں کا موجودہ ذوق

معراج کی نظیر کا سوال ہوتا ہے۔ شق القمر کی نظیر کا مطالبہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ عقلی مسئلہ ہے کہ کسی خبر کا صحیح ہونا یا کسی امر کا واقع ہونا نظیر پر ہرگز موقوف نہیں چنانچہ جن کو عقلیات سے کچھ بھی مس ہے وہ اس کو جانتے ہیں مدعی اگر نظیر بیان کر دے تو یہ اس کا تبرع ہے بلکہ ثبوت خبر کے لئے دو چیز زندگی ضرورت ہے ایک خبر بہ کا ممکن ہونا دوسرے خبر کا صادق ہونا۔ پس ہمارے ذمہ تمام معجزات اور

معادیات کے متعلق دو باتوں کا ثابت کرنا ہے ایک یہ کہ وہ فی نفسہ ممکن ہوں، دوسرے خبر صادق نے اس کے وقوع کی خبر دی ہو۔ ان دو باتوں کے ثابت کرنے کے بعد کسی کو انکار کا حق نہ ہوگا۔

دینی امور کی دلیل اب ہم حجاج وغیرہ اور صراط و وزن اعمال وغیرہ کے ثبوت پر دلیل قائم کرتے ہیں کہ یہ معجزات اور معادیات فی نفسہ ممکن ہیں۔ یہ تو دلیل

کا پہلا مقدمہ ہے اگر کسی کو اس مقدمہ میں کلام ہو تو اس پر لازم ہے کہ ان کے امتناع پر دلیل قائم کرے اور ہم کو امکان پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ امکان کی کوئی علت نہیں ہوتی بلکہ امتناع پر دلیل نہ ہونا یہی امکان کی دلیل ہے اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ امتناع کہتے ہیں اجتماع نقیضین کو کہ محل واحد میں آن واحد میں جہت واحدہ سے ہو تو جس کو ان امور کے امکان میں کلام ہو وہ ثابت کرے کہ ان میں اجتماع نقیضین کس طرح لازم آتا ہے۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس امر ممکن کے وقوع کی خبر کوئی خبر صادق دے وہ ثابت ہے اور ان معجزات و معادیات کے وقوع کی خبر خبر صادق نے دی ہے۔ پس یہ امور واقع و ثابت ہیں۔

ان مقدمات میں اگر کوئی کلام کرے تو اس کا جواب ہمارے ذمہ ہے۔ بلقیٰ نظیر کا پیش کرنا ہمارا ذمہ نہیں تھا اگر کوئی کہے کہ پل صراط پر چلنا عقل کے خلاف ہے سمجھ میں نہیں آتا تو میں کہوں گا کہ بتلا کیوں سمجھ میں نہیں آتا اس میں کیا استحالہ ہے کہ ایک باریک

چیز پر پیر آجائے۔ جب یہ محال نہیں اور خبر صادق اس کے وقوع کی خبر دے رہا ہے تو پھر انکار کی کیا وجہ، اگر کوئی انکار کرے تو اس کو یہ حق تو ہے کہ امکان کو رد کرے اور امتناع کو ثابت کرے یا دوسرے مقدمہ میں کلام کرے کہ یہ خبر صادق کی خبر نہیں۔ تو ہم دلیل امتناع سننے کیلئے تیار ہیں اور کلام اللہ کو کلام اللہ ثابت کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے اور جب یہ دونوں باتیں ثابت ہو جائیں پھر ہم نظیر پیش کرنے کے ذمہ دار نہیں اور اگر نظیر ہم کو معلوم بھی ہو تب بھی نہ بتلائیں گے کیونکہ یہ ہمارے ذمہ نہیں کہ ہم اپنی سب معلومات آپ کو بتلا دیں۔ ہاں اگر تم یہ ثابت کر دو کہ مستدل کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ضروری ہے تو جب ثابت کر دو گے اس وقت دیکھا جائے گا۔ بدو ان اس کے ہم زائد کے ساتھ جواب نہ دیں گے۔ یہ عوام کو زیادہ تر جواب دینے والوں ہی نے خراب کیا ہے کہ وہ ہر بات میں تبرعاً نظیریں بیان کرنے لگے عوام سمجھے کہ یہ بھی عجیب کے ذمہ ہے تو میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں کہ مستدل کے ذمہ یہ ہرگز نہیں اور جو دعویٰ لزوم کا کرے وہ دلیل قائم کرے یہ ہے دلیل مطرد جو تمام معجزات و معادیات میں برابر چل سکتی ہے، اور جو دیلیں آجکل بیان کی جاتی ہیں جن میں زیادہ

ترنظیر سے جواب دیا جاتا ہے وہ مطرد نہیں ہیں۔

کسی واقعہ کا ثبوت نظیر پر موقوف نہیں اب میں عقلا یہ بات ثابت کرتا ہوں کہ کسی واقعہ کا ثبوت نظیر پر موقوف

نہیں۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ نظیر بھی ایک واقعہ ہے میں پوچھتا ہوں کہ اس کیلئے بھی نظیر کی ضرورت ہے یا نہیں۔ و علیٰ ہذا۔ اگر ہر نظیر کے لئے نظیر کی ضرورت رہی تو تسلسل مستحیل لازم آئے گا اور نظیر سے ایک دعویٰ بھی ثابت نہ ہو سکے گا اور اگر جا کر ٹھیرو گے کہ اس نظیر کیلئے کسی نظیر کی ضرورت نہیں تو معلوم ہوا کہ کسی واقعہ کا ثبوت بدون نظیر کے بھی ہو گیا تو پہلے ہی کیلئے نظیر کی کیوں ضرورت ہے۔ اور جس طرح تم نے اخیر میں ایک واقعہ کو بلا نظیر مان لیا تو پہلے ہی کو بلا نظیر کیوں نہیں مان لیتے۔ غرض کسی دلیل سے مستدل کے ذمے نظیر کا بیان کرنا نہیں ہے ہاں اگر بیان کر دے تو یہ اس کی شفقت ہے اور اس کا موقع اس وقت ہے جب کہ سائل دلیل کے مقدمات پر کلام کرنے سے عاجز ہو جائے اور تسلیم کر لے کہ واقعی دلیل سے یہ دعویٰ ثابت ہو گیا اور مجھے اب انکار کا کوئی حق نہیں۔ اس وقت اگر مجیب تقریب فہم کے لئے کوئی نظیر دیدے تو اس کا احسان ہے اور اگر وہ نظیر پر ثبوت دعویٰ کو موقوف بتلاتا ہے تو مستدل نظیر ہرگز نہ بتلائے بلکہ اس تو قف علی النظر کی دلیل مانگے۔

پل صراط کیا ہے چنانچہ اس وقت میں ثبوت پل صراط پر دلیل قائم کر کے اس کی ایک نظیر

تبرعاً بتلاتا ہوں۔ اول پل صراط کی حقیقت سمجھئے مگر یہ کہے دیتا ہوں کہ یہ مضمون ظنی ہے اس طور پر پل صراط کو سمجھنا واجب نہیں۔ اصل تو یہی ہے کہ آدمی مجملاً پختہ عقیدہ رکھے باقی بعض طبائع ضعیف ہوتی ہیں۔ ان کے لئے میں یہ مضمون بیان کرتا ہوں اگر وہ اس طرح بھی پل صراط کو سمجھ لیں تو حرج کچھ نہیں مگر لازم بھی نہیں، لازم تو وہی اجمالاً مان لینا ہے۔ اس تنبیہ کے بعد کہتا ہوں کہ اول اس کی حقیقت سمجھو جس کے لئے اول یہ مقدمہ سنو کہ اس عالم کے سوا ایک عالم اور بھی ہے مسلمان تو اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ اور مخالفین اگر انکار کریں تو ہمارے پاس ان کے جواب کے لئے وہی دلیل مطرد ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ دوسرے عالم کا ہونا ممکن ہے کسی کو امکان پر کلام ہو تو دلیل امتناع قائم کرے اور جس ممکن کی خبر خبر صادق نے دی ہو وہ ثابت ہے۔ پس دوسرا عالم ثابت ہے اور خبر کے صادق ہونے کو ہم دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں۔

دنیا میں اختلاف حالات

دوسرا مقدمہ سنئے کہ عالم کے اختلاف سے بعض احکام اور حالات بدل جاتے ہیں، اس کی بھی دلیل تو وہی ہے جو مذکور ہوئی اور تقریب فہم کے لئے ایک نظیر بھی بتلاتا ہوں جیسے اقلیم کے بدلنے سے بھی دنیا ہی میں حالات بدل جاتے ہیں مثلاً یہاں اس وقت رات ہے اور ایک اقلیم میں اس وقت دن ہے یہاں آجکل گرمی ہے اور کسی اقلیم میں اس وقت سردی ہے و علی ہذا جو بیس گھنٹے کا دن رات ہے اور بعض اقلیم میں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہے، اور یہیں سے معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن میں آج ہے کہ عالم آخرت کا ایک دن ہزار برس کے برابر ہے اور اس پر بعض لوگ ہنستے ہیں تو یہ انکی حماقت ہے اس میں استبعاد کیا ہے جب عالم دنیا ہی میں اقلیم کے بدلنے سے یہ بات مشاہدہ ہے کہ بعض جگہ چھ ماہ کا دن ہوتا ہے تو اختلاف عالم کے بعد عالم آخرت میں اگر ہزار برس کے برابر ایک دن ہو تو کیا تعجب ہے۔

تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ اختلاف کی کوئی حد نہیں ہے نہ یہ منضبط ہو سکتا ہے۔ یہ مقدمہ بدتر ہی ہے محتاج دلیل نہیں۔ اور جو شخص کسی حد پر انتہا اختلاف کا دعویٰ کرے اور اس سے آگے اختلاف ہونے کو ممتنع کہے وہ اس پر دلیل قائم کرے۔

چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ جو چیز یہاں عرض ہو اس عالم میں جا کر جو ہر ہو جائے اس کا ممکن ہونا بھی ظاہر ہے یہ تو مسلم ہے کہ ایک آن اور ایک محل میں شے واحد عرض و جو ہر نہیں ہو سکتی مگر یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شے یہاں عرض ہو اور دوسری جگہ جو ہر ہو جائے اس کے امتناع پر کوئی دلیل قائم نہیں۔ اگر کسی کے پاس دلیل ہو پیش کرے اور استیناس کے طور پر اس کو یوں سمجھے کہ اس زمانہ میں بعض آلات کے درجہ سے حرارت و برودت وغیرہ کا وزن ہوتا ہے حالانکہ پہلے حکام ان کو مقولہ کیفیت سے سمجھتے تھے جس کے لئے وزن اور مقدار نہیں ہو سکتی مگر اس زمانہ میں ان کے لئے وزن ہونا ثابت ہو گیا۔ اس لئے میں تو کہا کرتا ہوں کہ جتنی یہ نئی نئی ایجادات ہیں سب معادیات کے سمجھنے کیلئے معین و مدد ہیں چنانچہ گراموفون ہاتھ پیر کے بولنے پر بڑی دلیل ہے کیونکہ گراموفون میں تو روح بھی نہیں اور کلام کرتا ہے تو اعضاء انسانی کے بولنے میں کیا تعجب جن میں حیات کا تلبس ہے۔

ایک حدیث کی تشریح

اسی طرح ایک حدیث میں ہے جو نسائی میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ کسوف کے موقع پر فرمایا کہ میں نے مسجد کی دیوار کے قریب جنت و دوزخ کو دیکھا۔ بعض لوگ اس پر ہنستے تھے کہ جنت و دوزخ تو آسمان

وزمین سے بڑی بتلائی جاتی ہے حضور نے انکو دیوار پر کیونکر دیکھ لیا اور اصلی حالت پر کیسے دیکھ لیا۔ مگر خدا تعالیٰ نے فوٹو اور خوردبین کو ایجاد کر کے اس استبعاد کو دور کر لیا۔ فوٹو میں بڑی سے بڑی شے کو چھوٹا کر کے دکھایا جاسکتا ہے اور خوردبین سے چھوٹی سے چھوٹی چیز پہاڑ بنا کر دکھائی جاسکتی ہے تو خدا تعالیٰ کو یہ قدرت نہیں کہ اس نے جنت و دوزخ کا فوٹو مسجد کی دیوار پر اتار دیا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شعاع میں خوردبین کی قوت رکھ دی ہو جس سے فوٹو کی چھوٹی چیزیں آپ کی اصلی حالت پر نظر آگئی ہوں اور حدیث میں یہی لفظ وارد ہے اثلث لی الجنة والنار، فرمایا کہ جنت و دوزخ زمین میں اتر آئی تھیں بلکہ آپ نے یہ فرمایا کہ وہ میرے لئے مثل ہو گئیں۔ اسی لئے جب کوئی نئی ایجاد ہوتی ہے تو میں خوش ہوتا ہوں۔ کیونکہ ان سے شرعیات کا استبعاد دور ہوتا جاتا ہے چنانچہ ایک عجیب بات اس زمانہ میں یہ ہے کہ آجکل حرارت و برودت کا بھی وزن ہونے لگا ہے کہ اس مکان میں کس قدر وزن کی حرارت موجود ہے اور کس درجہ کی برودت ہے اور بخار میں تھرما میٹر سے مریض کی حرارت کا وزن کیا جاتا ہے۔ اب اگر کسی گنوار سے کہے کہ گرمی بھی تلتی ہے تو اسکو کتنا تعجب ہوگا۔

تو جب دنیا ہی میں بعض اعراض کا وزن ہونے لگا جس کی حقیقت ہے بلکہ وزن کے انخفاقیں اور ارتقاع سے مقدار کا معلوم ہو جانا جو کہ سرسری نظر میں خواص جو ہر سے ہے تو اگر دوسرے عالم میں جا کر وہ جو ہر ہی بن جاوے تو کیا تعجب ہے۔ اور لیجئے اگر ایک برتن ٹھنڈا پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا اور اسی میں گرم پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا۔ آخر کی بیشی کیوں ہے پانی کی مقدار دونوں حالتوں میں یکساں تھی۔ معلوم ہوا کہ برودت و حرارت کا بھی وزن ہے۔ اب خواہ اس کو یوں تعبیر کر لیجئے کہ وزن پانی ہی کا ہے مگر بشرط برودت و حرارت کے آخر ان کو وزن میں دخل تو ہوا۔ تو اس عالم میں اگر یہ ہی دخل درجہ موزونیت میں اس طرح ہو جائے کہ یہ عرض جو ہر بن جاوے تو کیا تعجب ہے۔ اور سنئے! اطباء کہتے ہیں کہ جس شخص میں صفراء کا غلبہ زیادہ ہو وہ خواب میں آگ بہت دیکھتا ہے۔ دیکھئے جو چیز یہاں عرض تھی یعنی حرارت صفراء وہ عالم خیال میں آگ بن گئی جو کہ جو ہر ہے پس اس عالم میں عرض کا جو ہر بن جانا کچھ بعید نہیں۔

اب بل صراط کی حقیقت سمجھئے کہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ مسلمان کا مذاق تو یہ ہونا چاہئے۔

حدیث مطرب دے گو دراز دہر کم تر جو : کہ کس نہ کو نہ کشاید بہ حکمت این معمار

اور میں کہہ چکا ہوں کہ میرے ذمہ اس کا بیان کرنا لازم نہیں، میرے ذمہ تو وہی تھا جو میں بیان کر چکا ہوں مگر اس میں خط نہ آیا تھا، اس لئے تبرعاً بیان کرتا ہوں کہ خیر جس طرح بھی کام چلے اچھا ہے۔

تو سنئے! پل صراط کی حقیقت شریعت ہے دیکھا قال اصحاب الکشف من العرفاء، پس دنیا میں پل صراط کی نظیر شریعت موجود ہے اتنا فرق

شریعت پر عمل

ہے کہ یہاں یہ عرض ہے اور وہاں جا کر جو ہر بن جائے گی، باقی ان تمام صفات میں یہ اس کی نظیر ہے جیسے وہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے جس پر چلنا دشوار ہے۔ اسی طرح طریق شریعت بہت باریک اور نازک ہے جس پر استقامت کے ساتھ چل لینا ہر ایک کا کام نہیں کیونکہ شریعت مقدسہ مرکب ہے علم و عمل سے تو اس پر چلنے کیلئے دو قوتوں کی ضرورت ہے ایک قوت علمیہ کی، دوسری قوت عملیہ کی۔ قوت علمیہ کا تعلق عقل سے ہے اور قوت عملیہ کا ارادہ سے۔ پھر عمل بعض مفید ہیں اور بعض مضر تو اس میں کہیں تو جلب منفعت کی ضرورت ہے اور کہیں دفع مضر کی اور جو ارادہ جلب منفعت سے متعلق ہو اس کو قوت شہویہ کہتے ہیں اور جو دفع مضر کے متعلق ہو اس کو قوت غضبیہ کہتے ہیں تو شریعت پر چلنے کیلئے تین قوتوں کی ضرورت ہوئی۔ قوت عقلیہ، قوت شہویہ، قوت غضبیہ۔

یہی اصول اخلاق کہلاتے ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے تین درجے ہیں۔ افراط، تقریط اور توسط۔ اور شریعت نام ہے توسط کا۔ شریعت میں افراط عقل سے کام نہیں چلتا نہ تقریط سے کام چلتا ہے بلکہ توسط کی ضرورت ہے جس کا نام حکمت ہے اور قوت عقلیہ کا نام جزیرہ ہے یہ نہایت مضر ہے۔ جب عقل بہت بڑھ جاتی ہے تو ہر چیز میں احتمالات عقلیہ پیدا ہونے لگتے ہیں جس سے آدمی وہمی ہو جاتا ہے جیسے اہل فلسفہ میں ایک فرقہ لاادریہ مشہور ہے کہ وہ کسی حقیقت کا وجود تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک چیز کو دو سے دیکھ کر آدمی سمجھتے ہیں اور وہ گدھا نکلتا ہے۔ بہت لوگ ایک شخص کو حسین سمجھتے ہیں اور بہت سے اس کو بد صورت سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ ایک چیز کو میٹھا بتلاتے ہیں اور بخار والا اس کو کڑوی بتلاتا ہے اسی طرح مسائل عقلیہ میں کوئی ایک دلیل کو صحیح کہتا ہے کوئی غلط۔ تو جب ہمارے حواس ظاہرہ اور باطنہ میں اتنا اختلاف ہے اور کبھی ان سے غلطی بھی ہو جاتی ہے، تو یہ کیا اطمینان ہے کہ جس کو ہم نے آدمی سمجھا ہے وہ آدمی ہی ہے گدھا نہیں اور جس کو ہم زمین سمجھتے ہیں وہ زمین ہی ہے آسمان نہیں۔ ممکن ہے ہماری نظرتے غلطی کی ہو۔

بس ان کا یہ حال ہو گیا کہ ہر بات میں ان کو شک ہے اور شک میں بھی شک ہے

فہو شاک و شاک فی اتما شاک۔

عقل کی مثال

تو حضرت یہ عقل جب بڑھتی ہے تو اتنا پریشان کرتی ہے کہ زندگی تباہ کر دیتی ہے اور یہی وجہ ہے بہت سے عقلا کے تباہ ہونے کی، کہ انھوں نے عقل سے وہ کام لیا جو اس کی حد سے آگے تھا اور ہر چیز کا اپنی حد سے آگے نکل جانا مضر ہے۔ میں لو عقل کے متعلق ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ یہ ایسی ہے جیسے گھوڑا پہاڑ پر چڑھنے والے کے لئے۔ اب تین قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جو گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑ تک پہنچے اور پھر پہاڑ پر بھی اس پر سوار ہو کر چڑھنے لگے یہ غلطی پر ہیں۔ ضرور کسی سیدی اور چڑھائی پر سوار اور گھوڑا دونوں گریں گے، اور ایک وہ ہیں جو یہ سمجھ کر کہ گھوڑا پہاڑ پر تو کام دیتا ہی نہیں تو اس سے صاف سڑک پر بھی کام لینے کی کیا ضرورت ہے وہ گھڑی سے پیدل چل پڑے، نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ تک پہنچ کر تھک گئے یہ بھی نہ چڑھ سکے تو ان دونوں کی رائے غلط تھی۔ پہلی جماعت نے گھوڑے کو ایسا باکار سمجھا کہ آخر تک اسی سے راستہ طے کرنا چاہا اور دوسرے نے ایسا بیکار سمجھا کہ پہاڑ تک بھی اس سے کام نہ لیا۔ صحیح بات یہ ہے کہ گھوڑا پہاڑ تک تو کارآمد ہے اور پہاڑ پر چڑھنے کے لئے بے کار ہے اس کے لئے کسی اور سواری کی ضرورت ہے۔ یہی عقل کا حال ہے کہ عقل سے بالکل کام نہ لینا بھی حماقت ہے اور آخر تک کام لینا بھی غلطی ہے۔

پس عقل سے اتنا کام تو لو کہ تو حید و رسالت کو سمجھو اور کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم کر لو۔ اس سے آگے فردع میں عقل سے کام نہ لینا چاہئے، بلکہ اب خدا اور رسول کے احکام کے آگے گردن جھکا دینی چاہئے، بلکہ اب خدا اور رسول کے احکام کے آگے گردن جھکا دینی چاہئے چاہے انکی حکمت عقل میں آوے یا نہ آوے۔

قانون سلطنت کیوں بنتے ہیں

دیکھئے قانون سلطنت کے منوانے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ پہلے یہ سمجھا دیا جاوے کہ جارج پنجم بادشاہ ہے۔ اس کے بعد تمام احکام کے متعلق یہ کہہ دیا جاوے کہ یہ بادشاہ کے احکام ہیں اسلئے ماننا پڑیں گے تو یہ صورت آسان ہے اور تمام عقلا ایسا ہی کرتے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص جارج پنجم کو بادشاہ مان کر پھر بھی ہر قانون میں الجھنے لگے کہ میں اس دفعہ کو نہیں مانتا۔ تو بتلائیے اس شخص کا کیا حال ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ہر جگہ ذلیل ہوگا اور عقلا کہیں گے کہ جب مادشاہ کا بادشاہ ہونا مسلم اور اس قانون کا قانون سلطنت

ہونا معلوم تو پھر انکار کی کیا وجہ۔ ضرور ماننا پڑے گا چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے، معلوم ہوا کہ صاحب سلطنت کے پہچاننے کیلئے تو عقل سے کام لینے کی اجازت ہے اس کے بعد عقل سے کام لینے کی اجازت نہیں پھر کیا وجہ کہ آپ دین کے معاملہ میں آخر تک عقل سے کام لینا چاہتے ہیں، یہ سخت غلطی ہے جس سے بجز ذلت کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جب خدا کا خدا ہونا مسلم۔ رسول کا رسول ہونا مسلم، کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم، پھر ہر حکم میں الجھنے کا آپ کو کیا حق ہے، اور ہر شخص آپ کو یہ قوت بنائے گا اور تمام عقلا کی نظر دین میں آپ ذلیل ہوں گے سچ یہ ہے۔

عزیزے کہ از در گمش سر تباخت بہر در کہ شد بیج عزت نیافت

کہیں عقل کو چھوڑنا بھی چاہئے غرض عقل سے اس وقت تک کام لوجہ تک وہ کام دے سکے جہاں اس کا کام نہیں وہاں اس کو چھوڑ دو اور حکم کا اتباع کر دو تو عقل کی بھی ایک حد ہوئی اور کیوں نہ ہو وہ بھی تو ایک قوت ہے جیسے آنکھ کی ایک قوت ہے اور اس کی ایک حد ہے اس سے آگے دور بین لگانے کی ضرورت ہے ایسے ہی شریعت کے معاملہ میں اصول تک تو عقل کام دیتی ہے اور فروع میں یہ تنہا بے کار ہے بلکہ دور بین وحی سے کام لینا ضروری ہے ایسے ہی کان کی ایک قوت ہے جس کیلئے ایک حد ہے کہ اس سے آگے ٹیلیفون سے مدد لینے کی ضرورت ہے، پیرد کی ایک قوت ہے جس سے آگے سواری سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔

تو جب ہر قوت محدود ہے تو عقل کیسے محدود نہ ہوگی؟ ضرور ہوگی اس کے آگے وحی سے کام لو ورنہ یاد رکھو کہ عمر بھر رستہ نہ ملے گا کیونکہ سمعیات میں عقل کام نہیں۔ وہاں تو اتباع رسول کی ضرورت ہے۔

خلاف بیمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمسئل نخواہد رسید

صاحبو! دنیا میں بھی تو آپ بہت جگہ عقل کو چھوڑ کر کسی نہ کسی کا اتباع کرتے ہیں۔ دیکھئے جب آپ بیمار ہوتے ہیں تو عقل سے اتنا کام تو لیتے ہیں کہ اطباء موجود ہیں سے کون زیادہ حاذق و تجربہ کار ہے اور جب ایک طبیب کا حاذق ہونا معلوم ہو گیا تو پھر آپ اس کے پاس جاتے ہیں اور وہ نبض دیکھ کر نسخہ تجویز کرتا ہے پھر آپ اس سے یہ نہیں پوچھتے کہ اس نسخہ میں فلاں دوا کیوں لکھی اور فلاں کیوں نہیں لکھی اور اس دوا کا وزن چار ماشہ کیوں لکھا چھ ماشہ کیوں نہ لکھا۔ ہم نے

کسی کو طبیب سے ان باتوں میں الجھتا ہوا نہیں دیکھا۔ اور اگر کوئی اس سے الجھنے لگے تو عقلا اس کو یہ قوت بناتے ہیں اور طبیب بھی صاف کہہ دیتا ہے کہ اگر تم میرے پاس مجھ کو طبیب سمجھ کر آئے ہو تو جو نسخہ میں تجویز کروں ان میں تم کو چون دچرا کا کوئی حق نہیں اور اگر چون دچرا کرتے ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم مجھ کو طبیب نہیں سمجھتے پھر میرے پاس کیوں آئے تھے اور اس کے اس جواب کو تمام عقلا صریح کہتے ہیں۔ پھر حیرت ہے کہ رسول کو رسول تسلیم کرنے اور کلام اللہ کو کلام اللہ مان لینے کے بعد عقل کو ان کے تابع نہ کیا جائے اور بات بات میں الجھا جاوے کہ یہ تو خلافت عقل ہے ہم اسے کیوں نکرمان لیں۔

رسولانے کا حاصل صاجو! اگر تم نے رسول کو رسول مان لیا ہے تو ہر بات کو بلا چون و چرا مان لینا پڑے گا اور یہ کہنے کا حق نہ ہوگا کہ ہماری عقل میں یہ بات نہیں آئی، ورنہ اسکے یہ معنی ہیں کہ تم نے اب تک رسول کو رسول ہی نہیں سمجھا اور کلام اللہ کو کلام اللہ ہی نہیں مانا۔ افسوس دنیا کے کاموں میں تو عقل کی ایک حد ہو اور طبیب کو طبیب مان لینے کے بعد اس کی تجویز میں عقل کو دخل نہ دیا جاوے اور امور آخرت میں اس کی کوئی بھی حد نہ ہو۔

عقل کو چھوڑنا پڑتا ہے صاجو! جب دنیا کے کام بدون اس کے نہیں چل سکتے کہ عقل کو ایک حد پر چھوڑ دیا جائے اور بلا چون و چرا دوسرے کا اتباع کیا جائے تو آخرت کا کام بدون اس کے کیونکر چلے گا، کیونکہ دنیا کی چیزیں تو دیکھی ہوئی بھی ہیں، ان میں کسی قدر عقل چل بھی سکتی ہے پھر بھی انکو چھوڑ کر کالین دماہرین کی تقلید کیجاتی ہے اور آخرت سے تو ہم سب اندھے ہیں، وہاں بدون تقلید وحی کے کیسے کام چلے گا۔ اور اگر اس میں عقل سے کام لیا گیا تو وہی مثال ہوگی جیسے ایک اندھے نے کہا تھا کہ یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ شان دردد اس کا یہ ہے کہ ایک لڑکا اپنے اندھے حافظ کیلئے گھر سے کھیر کی دعوت کرنے آیا۔ پوچھا کہ کھیر کیسی ہوتی ہے کہا سفید ہوتی ہے۔ حافظ جی نے سیاہ و سفید میں کیوں فرق کیا تھا ان کے نزدیک تو نہ کوئی چیز سفید تھی نہ سیاہ کیونکہ آنکھیں ہی نہ تھیں تو آپ پوچھتے ہیں سفید کیسا ہوتا ہے۔ اس نے کہا جیسے بگلا۔ حافظ جی نے پوچھا کہ بگلا کیسا ہوتا ہے۔ لڑکے نے ہاتھ کو دھو، کی طرح موڑ کر کہا کہ ایسا ہوتا ہے حافظ جی نے جو اپنا ہاتھ پھیر کر اس شکل سے تصور کیا تو کہنے لگے بھائی یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ میرے گلے سے کیونکر اترے گی۔

تو دیکھئے جو چیز آنکھ سے نہ دیکھی ہو اس میں عقل سے کام لینے کا نتیجہ ہوا کہ معمولی سی کھیر کا کیا سے کیا بن گیا جس میں چبائے اور ننگلنے کی بھی شقت نہ تھی اب وہ گلے میں پھنسنے لگی۔

محض عقل کافی نہیں

تو واقعی اندھے کو کوئی کیونکر سمجھائے کہ سفید رنگ کیسا ہوتا ہے اگر حافظہ ساری عمر بھی اسی سبق میں ہیں تب بھی نہیں سمجھ سکتے بس اس کا طریقہ تو یہ ہے کہ کسی خیر خواہ سوانکھی کی تقلید کر لی جائے۔

اسی طرح اگر تم کسی ولایتی کو جس نے کبھی آم نہ کھایا ہو آم کا مزہ سمجھانا چاہو تو کیا وہ سمجھ جائیگا ہرگز نہیں۔ تم کہو گے کہ آم میٹھا ہوتا ہے وہ بیسکا کہ ہم تو روز گڑ کھاتے ہیں بس آم ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ صاحب! اس کو سمجھانے کا طریقہ یہ ہے کہ آم لا کر اسے کھلا دو۔ اور اگر یہ نہیں تو پھر اس کو تقلیداً مان لینا چاہئے اور اپنی عقل سے اس کی نظیریں نہ مکانا چاہئیں۔ اسی طرح امور آخرت کو اگر پوری طرح سمجھنے کا شوق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ موت کے منتظر ہو۔ سڑکے بعد صراط اور وزن اعمال وغیرہ کی سب حقیقت سامنے آجائے گی اور اگر دنیا ہی میں سمجھنا چاہتے ہو تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ قرآن اور رسول نے جو کھدیا ہے اس کی تقلید کرو اور ان کی نظیریں دریافت کرنے کے درپے نہ ہو۔ مثالوں سے تم آخرت کی حقیقت ایسی ہی سمجھو گے جیسے حافظ نے کبیر کو ٹیڑھا بتلایا تھا۔

بس خوب سمجھ لو کہ عقل کی ایک حد ہے جس سے بڑھ جانا مضر ہے اطباء نے بھی تو اس کو مضر لکھا ہے اور امراض میں شمار کیا ہے۔ کیونکہ افراط عقل کا نتیجہ ادھام و شکوک میں مبتلا ہے جس سے قلب و دماغ دونوں ضعیف ہو جاتے ہیں۔ فارابی کی حکایت ہے کہ ایک شخص حلوہ بیچتا پھرتا تھا اس سے پوچھا، کیف تبیع الحلوۃ، تو حلوہ کس طرح بیچتا ہے، اس نے جواب دیا کذا ابدانہ کہ ایک دانگ میں اتنا دیتا ہوں، تو آپ کہتے ہیں اسئل من الذکیفۃ و نجیبی عن الکمیۃ میں تو کیفیت سے سوال کرتا ہوں اور تو کمیت سے جواب دیتا ہے۔ آپ حلوئی سے الجھ گئے۔ اس کو عقل کا ہیضہ کہتے ہیں ہر وقت اسی کے چکر میں رہے۔

افراط عقل کا نتیجہ

چنانچہ افراط عقل کا یہ نتیجہ تھا کہ فلاسفہ نے انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ کیا اور جب عاجز ہو گئے تو ان کی نبوت کا تو اقرار کیا مگر کہنے لگے کہ جاہلوں کے واسطے نبی ہیں ہم کو نبی کی ضرورت نہیں مگر ہذا بنا نفوسنا بنا لحکمة ہم نے تو اپنے کو حکمت سے بہذب بنا لیا ہے۔ حق تعالیٰ ایسے لوگوں کے حق میں فرماتے ہیں فوجوا بآعادہم من العلم یہ لوگ اپنے علم پر نازاں ہو گئے اور یہ نہ سمجھے کہ علوم نبوت عقل سے باہر ہیں چنانچہ الہیات میں فلاسفہ نے تحقیقات بیان کی ہیں ان میں اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں کہ آج مسلمانوں کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی ان پر ہنستا ہے یہ تو افراط فی العقل ہے اور ایک ہے تفریط کا درجہ یعنی عقل

کی کمی۔ اس کو حماقت کہتے ہیں۔ شریعت میں یہ دونوں درجے بیکار اور مذموم ہیں بلکہ مطلوب تو وسط ہے جس کو حکمت کہتے ہیں۔

قوت شہوانیہ

دوسری قوت شہویہ ہے اس میں بھی تین درجے ہیں۔ ایک افراط جس کا نام فحور ہے۔ شریعت میں یہ بھی مطلوب نہیں کیونکہ اس کا انجام فسق ہے۔ اور ایک تفریط ہے کہ آدمی نامرد بن جائے کہ ضروری انتفاعات سے بھی محروم ہو یہ بھی مطلوب نہیں، کیونکہ اس سے ہمت اور حوصلہ پست ہو جاتا ہے اور اولوالعزمی اور اخلاق عالیہ مفقود ہو جاتے ہیں جو بڑا نقص ہے۔ اور ایک ہے تو وسط جس کا نام عفت ہے یہ مطلوب ہے۔

قوت غضبیہ

تیسری چیز قوت غضبیہ ہے اس میں بھی تین درجے ہیں ایک افراط جس کو تہور کہتے ہیں کہ موقع بے موقع کچھ نہ دیکھے اندھا دھند جوش دکھلانے لگے۔ جیسا آج کل ہورہا ہے کہ جس طرف چلتے ہیں جوش میں اندھے بن کر چلتے، یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اس جوش سے نفع ہو گا یا نقصان۔ یہ بھی شریعت میں مطلوب نہیں۔ اور ایک ہے تفریط جس کو جبن اور بزدلی کہتے ہیں کہ موقع اور ضرورت کے وقت بھی ہمت سے کام نہ لیا جاوے، جیسے بعض لوگ ایسے ڈرپوک ہوتے ہیں کہ حکام کے سامنے ادب اور تہذیب سے بھی اپنی حاجات ظاہر نہیں کر سکتے۔ یہ بھی مطلوب نہیں۔ اور ایک درجہ تو وسط کا ہے جس کا نام شجاعت ہے۔ یہ مطلوب۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت اور موقع پر جوش ظاہر کیا جائے جہاں نفع کا ظن غالب ہو۔ اور بے موقع جوش سے کام نہ لیا جائے جہاں نفع کی کچھ امید نہیں محض نقصان ہی نقصان ہے۔

اخلاق پسندیدہ

غرض اخلاق پسندیدہ کے اصول تین ہیں۔ حکمت، عفت، شجاعت اور ان کے مجموعہ کا نام عدل ہے اور یہی شریعت کا حاصل ہے اور قرآن میں فرمایا ہے وکذلک جعلناکم امتاً وسطاً اس سے بھی عدل مراد ہے مطلب یہ ہے کہ ہم نے ایک ایسی شریعت دے کر جو کہ ہر اپا عدل ہے، امت وسط یعنی امت عادلہ بنایا۔

ایک مقدمہ در سن لیجئے کہ وسط دو قسم کا ہوتا ہے ایک وسط حقیقی ایک وسط عرفی۔ وسط حقیقی وہ خط ہے جو بیچوں بیچ ہو وہ قابل تقسیم نہیں ہوتا۔ اور ایک وسط عرفی ہے جیسے کہا کرتے ہیں کہ یہ ستون مکان کا وسط ہے تو وہ وسط حقیقی نہیں کیونکہ وہ تو منقسم ہے اس کے اندر بھی ایک جزو دائیں اور ایک بائیں اور ایک بیچ میں نکل سکتا ہے۔ پھر وہ وسط حقیقی کہاں ہوا حقیقی وسط تو وہ ہے جس میں دایاں بائیں کچھ نہ نکل سکے سو ایسا وسط ہمیشہ غیر منقسم ہوگا۔

پس سمجھ لو کہ شریعت اس وسط کا نام ہے جس میں افراط و تفریط کا ذرا بھی نام نہ ہو بلکہ عین توسط ہو۔ یہی وسط حقیقی روح شریعت ہے۔ اور یہی کمال ہے۔ اور اوپر معلوم ہو چکا کہ وسط حقیقی ہمیشہ غیر منقسم ہوتا ہے تو شریعت کی روح بھی غیر منقسم ہے۔ چنانچہ جس اصول اخلاق کو میں نے بیان کیا ہے ان میں افراط و تفریط کو چھوڑ کر جو ایک وسط ننگے کا جس کو نہ افراط کی طرف میلان ہوگا، نہ تفریط کی طرف وہ ہمیشہ غیر منقسم ہوگا اور ایسے وسط پر رہنا ضرور دشوار ہے۔

شریعت کی نزاکت

پس شریعت ان دونوں جانبوں پر نظر کر کے اپنی دشواری کی وجہ سے تلوار سے تیز اور بوجہ غیر منقسم ہونے کے بال سے باریک ہوگی کیونکہ بال بھی منقسم ہے اور وسط حقیقی غیر منقسم ہے پس قیامت میں روح شریعت یعنی وسط حقیقی جو ہر بن کر بل صراط کی شکل میں ظاہر ہوگا جس پر سے مسلمانوں کو چلایا جاوے گا پس جو شخص دنیا میں شریعت پر تیزی و سہولت کے ساتھ چلا ہوگا وہ وہاں بھی تیزی کے ساتھ چلے گا کیونکہ وہ بھی تو شریعت ہوگی جس پر دنیا میں چل چکا ہے اور جو یہاں نہیں چلایا کم چلا ہے وہ بل صراط پر بھی نہ چل سکے گا یا سستی کے ساتھ چلے گا۔

لیجئے میں نے آپ کو بل صراط کی سیر بھی دکھلا دی۔ اب تو کوئی اشکال نہیں رہا۔ اسی طرح ہمارے پاس تمام شریعات کیلئے عقلی نظام موجود ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ بل صراط ہی کی خصوصیت ہے لیکن ہم ان تحقیقات کو مقصود نہیں سمجھتے، ہمارا اہل مذہب تو یہ ہے کہ

ما قصہ سکندر و دارا خواندہ ایم : از ما بجز حکایت ہر دو فایہ رس
باقی میں نے نمونہ کے طور پر یہ تحقیق اس لئے بیان کر دی تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے پاس ہر مسئلہ میں ایسی ہی تحقیقات موجود ہیں اور سمجھ میں آجائے کہ علم شریعت کے سامنے علوم فلسفہ کی کچھ بھی حقیقت نہیں جس سے نمونہ کے طور پر اس وقت میں نے کچھ بیان کر دیا ہے تاکہ آپ علماء اسلام کو تحقیقات سے خالی نہ سمجھیں، بجز اللہ ہمارے پاس ان تحقیقات کا ذخیرہ بھی بہت زیادہ ہے۔ لیکن

مصلحت نیست کہ از پردہ بردوں افتد راز

ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(تفصیل الدین ص ۳۵ تا ۵۲)

(۳۰) اس رائے کا جواب کہ مولوی سب باہم متفق ہو جائیں تو سارا باہمی نزاع دور ہو جائے

واقعی یہ ایک قیمتی رائے ہے مگر اس میں ایک دھوکا ان صاحبوں کو ہو رہا ہے جس کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں مگر اول اس کی ایک نظیر پیش کرتا ہوں کیونکہ آج کل بدوں اس کے لوگ کچھ نہیں سمجھتے۔

اس وقت یہ بات سب کو مسلم ہے کہ ہل یورپ آج کل سب سے زیادہ متمدن ہیں، بالخصوص انگریز دنیاوی امور میں ان کی عقل و فہم سب سے زیادہ حجت سمجھی جاتی ہے۔ ان کا ایک قانون ہے کہ جب کوئی عدالت میں جا کر نانش کرے تو حاکم کو اس کی تنقیح کرنی چاہئے شہادت اور ثبوت طلب کرے اور دکلا و طرفین میں گفتگو ہو اور آخر تک حاکم سب کی گفتگو سنتا رہے پھر اپنی رائے کے موافق کسی ایک کو ترجیح دیکر ڈگری دیتا ہے اور اس درمیان میں ظاہر ہے کہ ہر ایک ایک دلیل اپنے موکل کو غالب کرنے کی کوشش کرتا ہے اور طرفین میں اچھی طرح مباحثہ قائم ہوتا ہے۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ کوئی تسلیم یافتہ اس طریقہ تنقیح میں اس حاکم کو ظالم کہے گا؟ ہرگز نہیں بلکہ ہر ایک شخص اس کو عدل کے موافق سمجھتا ہے، پس اگر نا اتفاقی بری چیز ہے تو ان دکلا و طرفین کو کیوں نہیں ملا مت کیجاتی اور سب سے زیادہ اس حاکم کو ملا مت کرنی چاہئے جس نے اپنی کچھری میں نزاع اور بحث قائم ہونے دی اور اسی پر اپنے فیصلہ کی بنیاد ڈالی۔ مگر جب اس مناظرے کو قابل ملا مت نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کو عین عدل کہا جاتا ہے تو اس سے یہ بات معلوم ہوگی کہ مناظرے اور نا اتفاقی مطلقاً بری نہیں بلکہ طریقہ یہ ہے کہ ادل معاملہ کی تنقیح کیجاتی اور قبل تنقیح کے دونوں میں سے کسی کو ملا مت نہیں کیجا سکتی اور تنقیح کے بعد جو حق معلوم ہو اس کا ساتھ دو اور جو ناحق ہو اس کو ملا مت کر دیا گیا کہ دونوں کو ملا مت کیجاتی ہے اور دونوں کو اس اختلاف چھوڑنے اور اتفاق کر لینے کی ترغیب دی جاتی ہے ہر معاملہ میں ایسا اتفاق ممکن نہیں ہوا کرتا۔ اگر حاکم بھی ایسا ہی کرے کہ دونوں فریق کو ملا مت کرنے لگے تو کیسے ہو مگر دنیاوی معاملات میں یہ تو تسلیم یافتہ بھی اس قاعدہ پر عمل نہیں کرتے اور ہمیشہ ایک فریق کا جو حق پر معلوم ہو ساتھ دیا کرتے ہیں پھر دین کے بارہ میں یہ قاعدہ کیوں نہیں برتا جاتا اس سے ایک راز معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے دلوں میں دین کی وقعت و عظمت

کوئی چیز نہیں اسلئے اس کی کچھ فکر بھی نہیں۔

میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر حاکم کے برابر بھی ان کے نزدیک مذہب کی ضرورت ہوتی تو یہ ہمیشہ صاحب حق کی مدد کرتے یہ کیا کہ زید کو بھی ملا

اختلاف کی وجہ

عمر کو بھی ملامت، اس کو اتفاق کی ترغیب اس کو بھی۔ آخر کس بات میں دونوں متفق ہوں کس بات کو قبول کریں۔ اگر کوئی ایسی بات ہو جس میں اتفاق ہو سکے تو خیر۔ جب اعتقاد کا اختلاف ہے، ایک فریق حضرت علی رضی اللہ وجہہ کو نبی سمجھتا ہے دوسرا فریق ایسا نہیں سمجھتا۔ ایک فریق ابو حنیفہ کو فقیہ سمجھتا ہے دوسرا ان کو مخالف خدا اور رسول جانتا ہے۔ تو اب بتلاؤ کہ اتفاق کی کیا صورت ہے۔ دونوں کے عقائد میں تضاد ہے اب سو اس کے کہ فریق اپنا عقیدہ بدلے اس کے سو کوئی صورت اتفاق کی نہیں اپنے اپنے عقیدے قائم رہ کر اتفاق ہرگز متصور نہیں، البتہ اگر مذہب عقیدہ کوئی ضروری چیز نہ ہو تو پھر واقعی ہو سکتا ہے مگر اس کو بجز ان نو تعلیم یافتہ حضرات کے کوئی عاقل بھی تسلیم نہیں کر سکتا اور زبان سے تو یہ بھی تسلیم نہیں کر سکتے اگرچہ دلوں میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔

دوسرا اس طریقہ پر دنیاوی امور میں بھی عمل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک شخص نے مجلس میں ایک بات نکالی تو اس میں بھی دو چار اختلاف کرنے والے ہو جائیں گے اب اگر دونوں فریق کو ملامت کی جائے اور اتفاق کی ترغیب بجائے تو سواقیامیں آجائیں گی مگر اتفاق ناممکن ہوگا۔

پس آپ کا طریقہ تو ایسا ناممکن ہے کہ نہ دین میں کارآمد اور نہ دنیا میں۔ اب میں بتلاتا ہوں کہ اتفاق کیونکر ہو، پہلے آپ خود تحقیق کیجئے کہ صورت معاملہ کیا ہے پھر جو حق بجانب ہو اس کا ساتھ دیجئے اور دوسرے کو ملامت کیجئے اور پہلے کا تابع بنائیے یہ جو دونوں کو ملامت کیجاتی ہے سخت غلطی ہے۔ اس زمانہ کے نوجوانوں کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ وہ اتفاق کو محمود اور اختلاف کو مذموم سمجھ کر علماء کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ آپس میں اتفاق کر لو۔ پس ان کی اتنی بات تو قابل تسلیم ہے کہ نزاع و اختلاف واقعی بری چیز ہے اس کے زائل کرنے کا جو طریقہ بتلایا جاتا ہے کہ دونوں کی ملامت کر کے اتفاق کی دونوں کو ترغیب دیجائی ہے یہ بالکل سراسر عقل کے اور فطرت کے خلاف ہے، کیونکہ اس کے تو یہ معنی ہوئے۔ کہ صاحب باطل کچھ صاحب حق کا اتباع کرے اور صاحب حق کچھ صاحب باطل کا اتباع کرے کہ پہلے ایک فریق جو خالص حق پر تھا تو اب وہ بھی باطل کا پیرو ہو جائے، اس کو فطرت انسانہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتی۔

عجب بات ہے کہ یہ لوگ خلافت فطرت کی تعلیم کو ہمیشہ ناقابل اشاعت سمجھتے ہیں اور سب سے

زیادہ مدعی فطرت ہیں مگر دین میں نہ معلوم وہ فطرت کیا ہو جاتی ہے جو خلافت فطرت کی تعلیم دیتے ہیں۔ (روحدۃ الحب ص ۷۲)

(۳۱) دو عورت میں مساوات اور اس کا فیصلہ

آج کل کے نوجوانوں کا یہ دعویٰ مساوات محض زبان سے ہی ہے عمل میں وہ بھی برابری نہیں کر سکتے۔ ایک متمدن قوم کو دیکھ لیا کہ وہ عورتوں کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں تو خود بھی اس کا اتباع کرنے لگے مگر یہ نہ دیکھا کہ وہ لوگ کسی مذہب کے پابند نہیں ایسے لوگوں کی تقلید پابند مذہب قوم کیسے کر سکتی ہے پھر اس کے اس طرز و انداز کے نتائج پر نظر کی کہ اس مساوات کا اثر ان کے حق میں مفید ہوا یا مضر غرض بالکل کورنہ تقلید کر کے مساوات ناسار کے قائل ہونے لگے۔

جب خدا ہی نے عورت کو تشریفاً و تنکوناً محکوم بنایا ہے تو اس کو برابر کون کر سکتا ہے، کیونکہ خدا کا عورتوں کو محکوم بنانا جیسا کہ آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے دلیل عقلی سے بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس بات پر سارا عالم متفق ہے کہ عورتیں مرد سے کم ہیں بہت سی باتوں میں اس کا کسی کو انکار نہیں، اور جس بات پر ساری دنیا کا اجماع ہو وہ عینی تقاضا اور فطری قانون ہوتا ہے، عقلی دلیل کے علاوہ حسی دلیل بھی اس بات پر قائم ہے کہ عورتیں مرد سے کم ہیں۔

مرد و عورت کی خلقت میں فرق

چنانچہ مشاہدہ ہے کہ خدا نے عورت و مرد کی خلقت میں کتنا فرق رکھا ہے۔ مرد جسمانی قوت میں عورت سے زیادہ ہوتا ہے۔ عقل مرد کی زیادہ ہوتی ہے۔ آواز مرد کی بلند ہوتی ہے۔ مرد عورت سے رائے میں زیادہ پختہ ہوتا ہے اور عورت کو دیکھا جائے تو اس کی ہر چیز مرد سے کم نظر آتی ہے، ظاہری اعضاء کی بناوٹ میں بھی اور عقل و رائے میں بھی،

قرآن میں حق تعالیٰ کفار کی خرابی عقیدہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ام اتخذہما یخلق بنات و اصفکم بالبنین یعنی کیا خدا تعالیٰ نے اپنے لئے مخلوقات میں سے لڑکیاں تجویز کی ہیں اور تم کو لڑکوں کے ساتھ منتخب کیا ہے۔

پھر فرماتے ہیں اومن ینشؤ فی الحلیۃ و ھو فی الخصام غیر مبین کہ خدا تعالیٰ کے لئے تجویز بھی کیں تو لڑکیاں جو ابتدا سے زوردار گھنے میں پرورش پاتی ہیں۔

اور دوسرے کہ قوتِ بیانیہ میں نہایت ضعیف ہیں۔ یہ دو باتیں عورتوں میں نقص کی ایسی ہیں کہ آنکھوں سے دیکھ لو، واقعی لڑکیوں میں ابتداً ہی سے ہی سے زیور کا شوق ہوتا ہے اور یہ دلیل ہے، ان کی محدودیتِ نظر کی چنانچہ خود مردوں ہی میں دیکھ لو جس کو زینت کا شوق ہوگا، اس کے خیالات پست اور محدود ہوں گے اور جو سادہ ہوگا اس کے خیالات عالی ہوں گے اور اس کا راز یہ ہے کہ لباس وغیرہ ضرورت کی چیزیں ہیں اصل مقصود نہیں۔ اب سمجھ لیجئے کہ ضرورت کی چیزوں سے کتنا تعلق ہونا چاہئے سو ظاہر ہے کہ ہر عاقل ضرورت کی چیزوں سے بھر ضرورت تعلق رکھے گا اور زیادہ کوشش اصل مقصود میں کرے گا وہ شخص نہایت پست خیال ہے جو غیر مقصود چیزوں کی دھن میں لگا رہتا ہو۔ پس لڑکیوں کو زیور اور زینت سے زنجبت ہونا ان کے پستی خیالات کی دلیل ہے مرد اکثر سادہ ہوتے ہیں ہاں جن مردوں پر زمانہ پن غالب ہو یہاں انکا ذکر نہیں۔

تعلیم یافتہ عورتوں کا حال

تعلیم یافتہ قوموں کو بھی دیکھ لیجئے، تجربہ کار لوگوں کا بیان ہے کہ انکی عورتیں باوجود تعلیم حاصل کر لینے کے پھر مردوں سے بہت کم ہیں۔ ایک شخص کہتے تھے کہ اگر ان میں کسی عورت کو کچھ بیان کی ضرورت پڑ جاتی ہے تو وہ چند جملے کہہ کر بیٹھ جاتی ہیں، مردوں کی طرح اس کی گفتگو میں کبھی وسعت نہیں ہوتی۔ تو یورپ کی عورتیں بھی نیت علمی میں مردوں کے برابر ہرگز نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ دستکاری میں یا کسی خاص سیلف میں برابر یا زیادہ ہوں۔

غرض جس کو قدرت نے محکوم بنایا ہو اس کو مساوی کون کر سکتا ہے۔ اور یہ محکومیت عورتوں کے لئے خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے اور یہ اس لئے کہا گیا تاکہ عورتیں اس تقریر کو سن کر دل گیر نہ ہوں) نعمت اس لئے ہے کہ اگر دنیا میں سب برابر درجے کے ہوتے تو انتظام قائم نہ رہ سکتا تو یہ ضروری بات تھی کہ ایک گھٹا ہوا ہو اور دوسرا بڑھا ہوا ہو۔ اگر سارے حاکم ہی ہوتے تو کاشتکاری کون کرنا عمارت کون بناتا، آٹا کون پیستا۔

انتظام کا تقاضا

غرض دنیا کا انتظام اس کو چاہتا ہے کہ سب ایک درجے کے نہ ہوں بلکہ ایک بادشاہ ہو، ایک وزیر، کوئی حاکم، کوئی رعیت، کوئی تاجر، کوئی مزدور، یہ فرق مراتب ضروری تھا ہاں اس فرق مراتب کی یہ بھی ایک صورت تھی کہ عورتیں پڑھی ہوئی ہوتیں وہ گھٹے ہوئے۔ مگر چونکہ ان کی عقل درائے ضعیف ہے اسلئے تمدن خراب ہو جاتا وہ خود اپنی بھی حفاظت نہیں کر سکتیں دوسروں پر حاکم بن کر ان کی نگہبانی تو کیا کرتیں، یہ قوت کیلئے

یہی مصلحت ہے کہ کسی کے تابع ہو کر رہے اگر کسی یہ قوت کو حاکم بنا دیا جائے تو دیکھو انجام کیا ہوگا خود بھی ہلاک ہوگا دوسروں کو بھی تباہ کرے گا۔ اگر چھوٹے بچے کو ماں باپ کا تابع نہ کیا جائے تو وہ یقیناً ہلاک ہوگا۔ کیونکہ اس کو اپنے نفع اور ضرر کی کچھ خبر نہیں۔

تو یہ قوت کیلئے کسی کا ماتحت ہونا بھی مصلحت ہے تاکہ دوسرا اس کو روک لوٹ کر سکے اور یہی راز ہے اس حدیث کا جو حضور سے مروی ہے کہ وہ قوم کبھی فلاح نہ پائے گی جس کی حاکم عورت ہو کسریٰ شاہ فارس کی بیٹی جب بادشاہ ہوئی تھی اس پر آپ نے یہ ارشاد فرمایا تھا۔

عورتوں کو حاکم بنانا

یہ ہیں سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ آج کل ہماری خرابی و خستگی کا باعث ایک یہ امر بھی ہے کہ ہم نے عورتوں کو اپنے گھر کا حاکم بنا دیا ہے اگرچہ یہ چھوٹی سی حکومت ہے مگر اس کا نتیجہ بھی خراب ہی ہے مثلاً شادی بیاہ کی ساری رسمیں عورتوں ہی کی خواہش سے پوری کی جاتی ہیں جس کا انجام ظاہر ہے کہ کیا ہوتا ہے کس قدر خاندان ان رسوم شادی میں تباہ ہو گئے یہ سارا فساد عورتوں کے حاکم بنائے کا ہے، عورتوں کی دلجوئی کرنا ضروری ہے مگر انکے تابع بننا برا ہے۔ اس وقت سارا مال و اولاد عورتوں کے قبضہ میں ہم نے کر دیا ہے پھر دیکھ لیجئے روپیہ کیسے بجا موضع میں صرف ہوتا ہے اور بچوں کی صحت خراب اور اخلاق تباہ ہو رہے ہیں، عورتیں بچوں کو جو چاہیں کھلا دیتی ہیں جس سے انکی زندگی بیماری میں کسپی ہیں محبت و پیار حد سے زیادہ کرتی ہیں جس سے لڑکے شوخ ہو جاتے ہیں۔

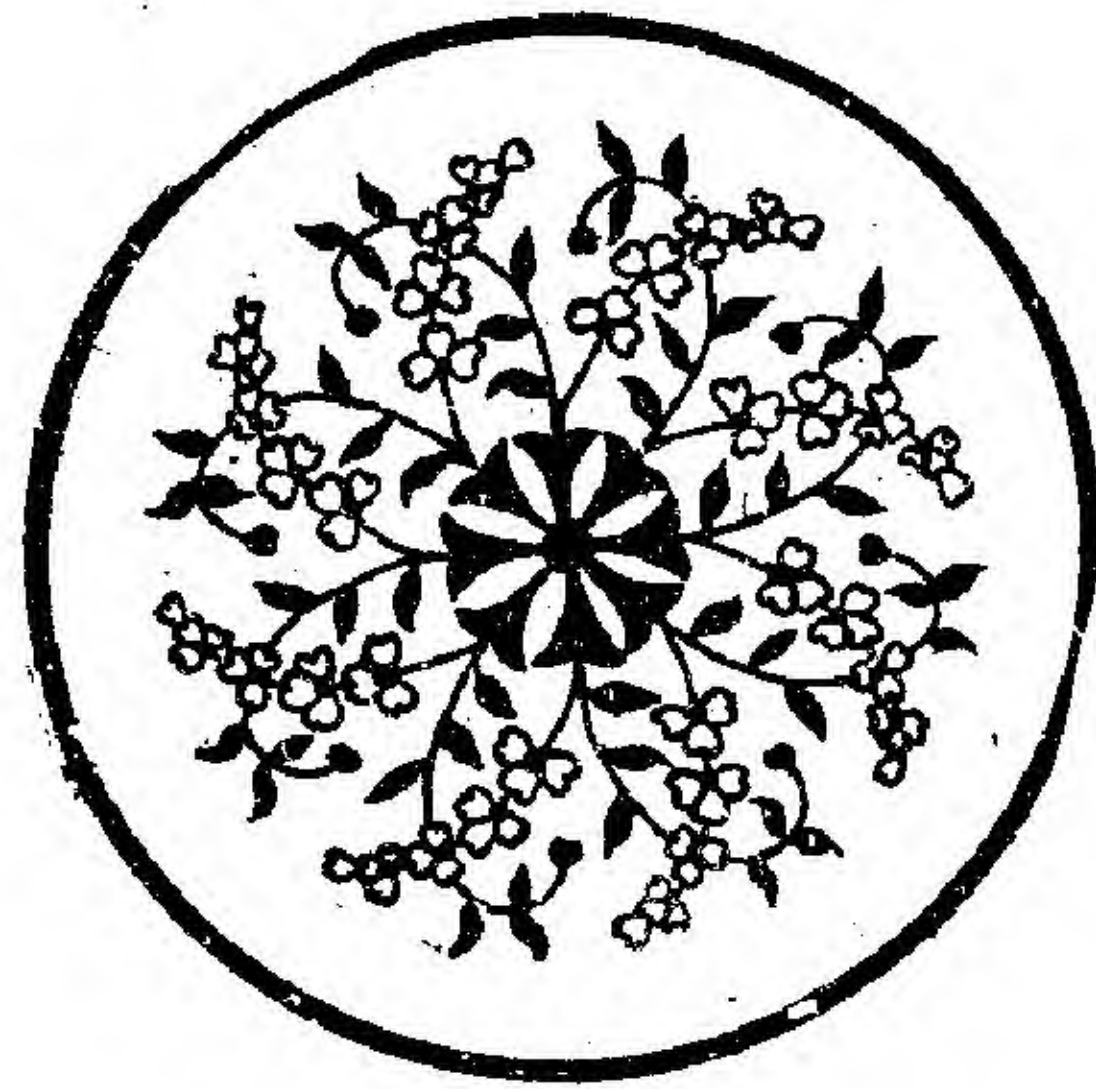
تو اپنے مال و اولاد کو اپنے قبضہ میں رکھتا چاہئے عورتوں کو حاکم کر دینا سخت باعفیہ تنزل ہے جس کو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے فرما گئے ہیں۔

اس حدیث پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ بعض متمدن قوموں میں عورتیں حاکم ہوتی ہیں اور بعض جگہ اب بھی ہیں اور پھر ان کو ترقی ہے اول تو مال و مادیات کی ترقی فلاح نہیں، فلاح قومی کی اصل ترقی اخلاقی و علمی و روحانی ہے تو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ جن قوموں میں عورت بادشاہ ہے انکو یہ ترقی نصیب ہوئی۔ دوسرے اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ان کی ترقی حقیقی ترقی ہے تو ہم کہیں گے کہ یہ اس کا اثر ہے کہ ان میں عورتیں خود مختار حاکم نہیں محض ضابطہ کی حاکم ہیں۔ اصل بادشاہ پارلیمنٹ ہے تو ایسی حکومت کوئی حکومت نہیں نام کی بادشاہت ہے اس سے مضمون حدیث پر غبار بالکی نہیں آ سکتا، میں نے اس حدیث کو اس وقت اسی نے پڑھ دیا کہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ اس وقت جو ہم نے گھر کا حاکم عورتوں کو بنا رکھا ہے اسکو بھی ہماری پستی اور تنزل میں خلل ہے اور آج کل ہم پر یہ ایسی تباہی آرہی ہے کہ بجا

غیر مسلم کے ناجی نہ ہونے کی وجہ | مگر یہاں پر بعض شبہ کیا کرتے ہیں کہ جب کسی غیر مسلم میں اخلاق و اعمال شائستہ ہوں تو کیا وجہ ہے کہ وہ ناجی نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ گورنمنٹ پر بھی اعتراض کیا ہوتا کہ کیا وجہ ہے کہ جب ایک باغی مہذب ہے بقیہ جرائم قانونی سے بھی محفوظ ہے پھر کیوں اس کو سزا ہوئی ہے اس کے سزا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ باغی ہے تو اس کے سارے کمالات بیچ در بیچ ہیں پس اسلامی قانون بھی ایسا ہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جتنے شبہ اسلام پر ہیں اپنے معاملات میں غور کریں تو سب کا جواب نکل آئے گا۔ مگر غور کون کرے۔ دین تو آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ افسوس کیسی آفت ہے کیسا طوفان بے تمیزی برپا ہے اور پھر اپنے کو مسلمان کہتے ہیں۔ (الوقت صفحہ ۱۲۹)

تتمتہ بالآخر



مکتبہ الفتاویٰ دیوبند

ضلع سہارنپور۔ دیوبند

متبوع بننے کے عورتوں کے بالکل تابع ہو گئے اور غضب یہ ہے کہ عذر کے موقع میں کہا جاتا ہے کہ صاحب کیا کریں عورتیں نہیں مانتیں سو یہ کہنا کتنی کم ہمتی کی بات ہے اگرچہ یہ بھی ایک بہانہ ہے جس بات کو ان کا خود جی چاہتا ہے اس میں عورتوں کے کہنے سے مجبور ہو جاتے ہیں ورنہ جس بات کو انکا جی نہ چاہے مثلاً بعض لوگ اپنی عورتوں کو باپ کے گھر نہیں جانے دیتے اس میں عورتیں لاکھ تقاضہ کریں کبھی نہیں مانتے پس دل تو یہ عذر بالکل غلط ہے اور اگر سچ ہے تو اور بھی برا ہے کہ مرد ہو کر بیوی کے غلام بن گئے۔

غرض عورت کیلئے یہی مصلحت ہے کہ مرد کے تابع ہو کر رہے اور شریعت نے بھی عورتوں کو محکوم ہی بنایا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ الرَّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ یعنی مردوں کو عورتوں کا نگران بنایا گیا ہے۔ (شعب الایمان صفحہ ۱)

(۳۲) اس شبہ کا جواب کہ غیر مسلم اگر مہذب ہو تو ناجی کیوں نہیں

ایک شخص ہے کہ وہ گورنمنٹ کے شاہانہ اقتدار کو مانتا ہے، مگر ہمیشہ قانون کے خلاف عمل کرتا ہے چوری بھی کرتا ہے جوا بھی کھیلتا ہے اور بد تہذیب بھی ہے تو ایسے شخص کے قلب میں چونکہ گورنمنٹ کا اقتدار ہے اس لئے اسے بغاوت کی سزا نہ ہوگی اور ہمیشہ کے لئے مردود نظر نہ ہوگا بلکہ صرف اختتام سزائے معین تک، اور اسکے بعد پھر وہ گورنمنٹ کی محبوب رعایا میں داخل ہو جائیگا۔ برخلاف اس شخص کے جو کہ نہایت مہذب و متین ہو اور افعال قبیحہ خلاف قانون سے بھی بچتا ہو مگر گورنمنٹ کے اقتدار شاہانہ کو تسلیم نہیں کرتا ہو تو اس کو بغاوت کی یہ سزا ہوگی کہ عبور دریائے شور کر دیا جائے گا یا پھانسی دے دیا جائے گا اور ہمیشہ کیلئے معتبور رہے گا۔

اے صاحبو! سمجھ لیجئے کہ اسی طرح اسلامی قانون بھی ہے کہ جس کے عقائد اچھے نہیں وہ باغی ہے اگرچہ نماز روزہ کرے اور کیسا ہی شائستہ ہو ہمیشہ کے لئے مردود بارگاہ ایزدی ہوگا اگر توبہ نہ کرے برخلاف اس شخص کے کہ جو نماز روزہ کچھ نہیں کرتا اور ہر قسم کے معاصی میں مبتلا رہتا ہے مگر عقائد اچھے ہوں تو اس کو وہی میعاد سزا خلاف قانون عمل کرنے کی ہوگی اگر توبہ نہ کرے لیکن باغیوں میں شمار نہ ہوگا۔ اور اختتام سزائے بعد پھر وہی حق تعالیٰ کی محبوب رعایا یعنی جنتیوں میں داخل ہو جائے گا۔

فہرست مضامین حصہ چہارم

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۳۸۸	ڈارون کے اس کہنے کی تردید کہ اصل انسان بند رہے۔	۲۰۳	بیدار ہو جانا
۳۸۸	یہ مشاہدہ نہیں ہے	۲۰۳	قرآن بعد حفظ ہوتا ہے
۳۸۸	زمین کی حرکت کا مسئلہ	۲۰۲	تلاوت قرآن کی برکت
۳۸۹	آفتاب کا طلوع و غروب ہونا	۲۰۵	عارفین کا حال
۳۸۹	آدمی علم دین پڑھ کر کم عقل نہیں ہوتا	۲۰۵	قوت و اعضاء انسانی کا اقرار
۳۹۰	قرآن پڑھنے سے فائدہ ہے اگرچہ معنی نہ سمجھتا ہو۔	۲۰۴	ایک واقعہ
۳۹۱	ایک شبہ کا جواب	۲۰۴	بے معنی سمجھے قرآن کا فائدہ
۳۹۲	عام مسلمان بہتر ہیں	۲۰۴	ایک دوسرا عالم بھی ہے
۳۹۳	قرآن کا سمجھنا	۲۰۸	تلاوت قرآن پر توجہ
۳۹۴	قرآن کا معجزہ	۲۰۸	اللہ تعالیٰ کی محبت
۳۹۸	قرآن کی یاد کرنے کو بیکار کہنے والے	۲۰۹	ایک واقعہ
۳۹۹	اللہ کا نور مرٹ نہیں سکتا	۲۱۰	قرآن میں معجزہ
۴۰۰	قرآن کی حفاظت	۲۱۱	حضرت موسیٰ کا واقعہ
۴۰۰	اسباب محبت	۴۱۲	کلام اللہ پڑھنا
۴۰۰	الفاظ قرآن کی حفاظت کا اہتمام	۴۱۳	الفاظ بھی مقصود ہیں
۴۰۱	قرآن کی رسم خط کی حفاظت	۴۱۳	دریا کی سیر
۴۰۲	خلیفۃ اللہ کا خطاب	۴۱۳	الفاظ قرآن
۴۰۳	ارشاد خداوندی	۴۱۵	سیر کیساتھ صورت پر نظر
		۴۱۶	صورت کی اہمیت
		۴۱۶	حروف مقطعات کی نکات

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۲۳۳	ایک مثال	۲۱۷	قرآن سے معنی کیساتھ الفاظ بھی مقصود ہیں
۲۳۳	انبیاء کرام پر مصائب	۲۱۸	فرشتوں سے سوال کہ میرے بندے کیا کر رہے ہیں۔
۲۳۴	طاغوتوں سے بھاگنے والا	۲۱۹	لوح محفوظ کی وسعت پر شبہ کا جواب
۲۳۷	خوشی بوقت موت	۲۱۹	مر جانے کے بعد عذاب قبر روح پر ہوتا ہے یا جسم پر۔
۲۳۷	بعد موت کا حال	۲۱۹	بارہ بروج کا ثبوت قرآن مجید سے دینا صحیح نہیں۔
۲۳۸	بددینی کا اثر	۲۲۰	آیات کی تفسیر قواعد ہیئت پر ہے۔
۲۳۹	مالداری کا مشاہدہ	۲۲۱	قرآن وحدیث کا جو مطلب علماء بیان کرتے ہیں وہی درست ہے
۲۴۰	صورت وحقیقت	۲۲۲	مجتہدین کی شان
۲۴۰	مصیبت کی قسمیں	۲۲۳	علماء کی پیروی
۲۴۱	بچہ کے ختنہ کی مثال	۲۲۴	طاغوتوں میں اعمال کی خرابی
۲۴۱	حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں کوتاہی۔	۲۲۴	ایک حکایت
۲۴۲	احکام شرعیہ کی حکمت	۲۲۸	مصیبت اگر گناہ ہونے کی وجہ آتی ہے تو کفار پر آنی چاہیے
۲۴۴	ترقی مطلوبہ کی شریعت نے تعلیم نہیں فرمائی	۲۲۹	انبیاء پر مصائب
۲۴۷	محدثین پر اعتراض کا جواب	۲۳۰	درجات کی بلندی
۲۴۷	محتاج اصلاح دوسروں کی اصلاح کیا کریں گے۔	۲۳۱	خوشحالی و بدحالی
۲۴۸	آج کل کے جلسے	۲۳۱	ایک واقعہ
۲۴۹	علماء کا استیصال اسلام کا استیصال ہے	۲۳۲	عقل کا تبادلہ دولت سے
۲۵۰	حجرہ نشینوں کا جواب	۲۳۲	امام غزالی کا قول
۲۵۱	لیڈران قوم کے طریقے شریعت کی نظر میں	۲۳۳	مصیبت کیوں آتی ہے
۲۵۳	غیر قوموں کی ترقی کا راز کیا ہے		
۲۵۴	مسلمانوں کی حالت		
۲۵۵	مجلس کے آداب		

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۴۵۶	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور	۴۵۶	بے پردگی
۴۵۷	کفار کا قول	۴۵۷	آج کل کے مسلمانوں کا حال
۴۵۸	نظافت کا قول	۴۵۸	جدید تعلیم یافتہ کا غلط استدلال
۴۵۹	ہندو مسلم اتحاد کی خرابی	۴۵۹	ہر اتفاق نہ محمود ہے اور نہ ہر
۴۵۹	غیروں کی تعریف	۴۵۹	اختلاف مذہب
۴۶۱	قومیت کی حفاظت	۴۶۱	حق کا ساتھ دینا چاہیے
۴۶۲	غیر مسلموں کی حمایت	۴۶۲	افتراق کی مثال
۴۶۲	قتال کی اجازت	۴۶۲	حقیقت شریعت اعتدال کا نام ہے
۴۶۳	اخلاق کا رسوخ	۴۶۳	شریعت سے ناگواری کی وجہ
۴۶۳	انصار مدینہ	۴۶۳	قانون میں حکمت
۴۶۴	واقعہ ہجرت سے امتحان	۴۶۴	ایک مثال
۴۶۵	مسائل سے اجتناب	۴۶۵	غیر ملکی ایک حکایت
۴۶۵	ایک فتویٰ	۴۶۵	شریعت کا اتباع
۴۶۶	اسلام میں قناعت	۴۶۶	اتباع شریعت
۴۶۶	تبلیغ دین کی ممانعت	۴۶۶	آفتاب کی مثال
۴۶۷	مقصود بالذات رضا حق ہے نہ	۴۶۷	اتباع شریعت کا فائدہ
۴۶۷	کہ سلطنت	۴۶۷	راستہ طے کرنے والوں کی ضرورت
۴۶۷	علماء لیڈروں کے ساتھ	۴۶۷	عذاب قبر پر اعتراض کا جواب
۴۶۸	رضاء حق	۴۶۸	اسلام درحقیقت اللہ کا راستہ ہے
۴۶۸	تشبہ بالکفار مذہبی کاموں میں	۴۶۸	حق تعالیٰ کی امداد
۴۶۹	حرام ہے	۴۶۹	بعض عامی کی مغفرت بدون عذاب کے
۴۶۹	مشتبہ صورت	۴۶۹	بھی ہوگی
۴۶۹	اسلام کی تعلیم	۴۶۹	مرتد بغاوت میں کافر اصلی سے بڑھا

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۵۱۶	عربی گھوڑے	۴۹۵	ہوا ہے
۵۱۶	اہل عرب کا حال	۴۹۵	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غنائے قلب
۵۱۷	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج	۴۹۵	کا حال
۵۱۷	فرمانے کی حکمت	۴۹۵	جنت میں شہداء کی ارواح کا سہنر
۵۱۸	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ	۴۹۷	پرندوں میں ہونا
۵۱۹	حضرت گنگوہیؒ کا دبدبہ	۴۹۷	اہل دنیا کے آخرت کا نفع دنیا کے
۵۲۰	اس شبہ کا جواب کہ تقدیر کس طرح	۴۹۷	نفع سے بڑھا ہوا ہے
۵۲۰	بدل سکتی ہے	۴۹۹	دنیا کی وجہ سے آخرت چھوڑنا
۵۲۱	فلسفہ اور تعلیم انبیاء علیہم السلام	۴۹۹	آخرت کا نفع یقینی ہے
۵۲۱	میں فرق	۴۹۹	حسن یوسف علیہ السلام و جمال محمد
۵۲۲	علم معقول	۵۰۰	صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیق
۵۲۳	تعلیم انبیاء	۵۰۰	علماء کرام میں غیر خدا سے طبعی خوف
۵۲۳	نو تعلیم یافتہ کو ظاہری اصلاح کے	۵۰۲	کی وجہ
۵۲۳	ساتھ باطن کی صفائی بھی ضروری ہے	۵۰۲	جسٹینوں کا انگریزی کو علم میں شمار
۵۲۴	دین کے اجزاء	۵۰۳	کرنا غلطی ہے
۵۲۴	باطن کی اصلاح	۵۰۳	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا سے
۵۲۵	تاویل کی خرابی	۵۰۴	طلب کرنا محبت الہی کا نتیجہ ہے
۵۲۵	باطنی بیماری کا علاج	۵۰۴	انبیاء علیہم السلام پر نزع کی کیفیت
۵۲۸	ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح	۵۱۰	کیوں ہوتی ہے
۵۲۹	ضروری ہے	۵۱۲	تفاضل تفصیلی بین الانبیاء ممنوع ہے
۵۳۰	دین سے بے رغبتی	۵۱۳	حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اعتراض
۵۳۱	دین کی اہمیت	۵۱۳	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال
۵۳۲	امراء کا حال	۵۱۵	بیان کرنے میں اعتدال

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۵۳۲	ایک لطیفہ	۵۵۴	بے تکلفی
۵۳۵	بے غیرتی کی انتہا	۵۵۴	ایک واقعہ
۵۳۵	ایک صاحب کا حال	۵۵۶	علماء پر ایک اعتراض کا جواب
۵۳۶	بعض لیڈروں کی حالت	۵۵۸	ایک بھٹیاری کا قصہ
۵۳۷	نماز پر اعتراض	۵۵۸	اس اعتراض کا جواب کہ شریعت
۵۳۸	ایک بڑھیا اور شاہی باز	۵۵۹	قید محض ہے -
۵۴۰	ظاہر و باطن	۵۵۹	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج
۵۴۰	عمل کی ضرورت	۵۶۱	جسمانی پر شبہات کا جواب -
۵۴۱	طبیعت بے شعور کو فاعل ماننا سراسر حماقت ہے -	۵۶۳	معراج کا واقعہ
۵۴۱	صرف عقل پر اعتماد کا انجام	۵۶۳	تبلیغ کیلئے چندہ جمع کرنے کا کام علماء
۵۴۲	خدا کے منکر	۵۶۳	کے سپرد نہیں کرنا چاہیے -
۵۴۵	سائنس دانوں کا حال	۵۶۶	نسب نامے نہ تو محض بے کار ہیں،
۵۴۶	ایک صاحب علم کا قصہ	۵۶۷	اور نہ ہی مدار فخر ہیں -
۵۴۷	موحد کا حال	۵۶۷	نماز کی برکتیں اور اس کے نہ پڑھنے
۵۴۹	مولوی لوگوں کو کافر بتاتے ہیں	۵۶۸	پر ترہیب -
۵۴۹	عقل ہماری اتنی خیر خواہ نہیں ہے جتنی	۵۷۰	نماز میں مساوات
۵۵۰	شریعت خیر خواہ ہے -	۵۷۱	جماعت کی اہمیت
۵۵۱	کفار کا مال دبا لینا حلال نہیں ہے	۵۷۲	اتحاد و اتفاق میں حدود کی رعایت
۵۵۱	تقدیر پر اعتقاد رکھنے سے دنیا میں راحت رہتی ہے اور انکار سے پریشانی بڑھتی ہے -	۵۷۳	اصلاح کا طریقہ
۵۵۲	ایک بزرگ کی حکایت	۵۷۴	اتحاد کیلئے حدود
		۵۷۴	اصلاح کا حاصل
		۵۷۵	دین پر ڈاکہ
		۵۷۶	اتحاد غلط طور پر

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۵۹۸	کفار سے اتحاد	۵۷۷	بے تکلفی
۶۰۰	ترقی متعارف کا رد	۵۷۷	ایک واقعہ
۶۰۰	آج کل کی ترقی کا حال	۵۷۸	علماء پر ایک اعتراض کا جواب
۶۰۱	توجہ الی اللہ کے معنی	۵۷۹	ایک بھٹیاری کا قصہ
۶۰۲	پردہ کا عقلی ثبوت	۵۷۹	اس اعتراض کا جواب کہ شریعت
۶۰۲	کیا وجہ ہے کہ اعمال آخرت میں رغبت نہیں ہوتی -	۵۸۲	قید محض ہے -
۶۰۴	عالم مثال اور عذاب و ثواب قبر کا اثبات -	۵۸۲	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج
۶۱۱	اس اعتراض کا جواب کہ عالم آخرت محض خیال ہی ہے -	۵۸۴	جسمانی پر شبہات کا جواب -
۶۱۳	حقیقت پلی صراط	۵۸۴	معراج کا واقعہ
۶۱۵	عقل کے معنی اور تشریح	۵۸۷	تبلیغ کیلئے چندہ جمع کرنے کا کام علماء
	حصہ چہارم ختم شد	۵۸۷	کے سپرد نہیں کرنا چاہیے -
		۵۹۰	نسب نامے نہ تو محض بے کار ہیں،
		۵۹۱	اور نہ ہی مدار فخر ہیں -
		۵۹۲	نماز کی برکتیں اور اس کے نہ پڑھنے
		۵۹۳	پر ترہیب -
		۵۹۴	نماز میں مساوات
		۵۹۵	جماعت کی اہمیت
		۵۹۶	اتحاد و اتفاق میں حدود کی رعایت
		۵۹۷	اصلاح کا طریقہ
		۵۹۸	اتحاد کیلئے حدود
		۵۹۹	اصلاح کا حاصل
		۶۰۰	دین پر ڈاکہ
		۶۰۱	اتحاد غلط طور پر

ڈارون کے اس کہنے کی تردید کہ اصل انسان بند رہے

کتنے افسوس کی بات ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں کہ انسان کی اصل انسان ہے اور ڈارون جو ایک ملحد ہے وہ کہے کہ سب سے پہلے ایک مادہ مطلقہ موجود تھا اور پھر تحریک سے اس میں حرارت پیدا ہوئی، اور شمس وغیرہ بنا اور اس کے بعد پھر نباتات بنے پھر حیوانات بنے، ان میں بندر بنا اور بندر یکا یک جست کر کے انسان بن گیا۔ اسی طور پر وہ تمام حیوانات و نباتات میں اسی کا قائل ہے کہ ایک دوسرے سے نکلتے چلے آئے ہیں۔ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر شبہ کیا جاتا ہے اور ڈارون کے کہنے پر یقین کر لیا جاتا ہے۔ یہی ایمان ہے۔ ڈارون تو صانع کا قائل نہیں تھا اس لئے ایسی بعید اور بیہودہ تاویلیں کرتا تھا۔ مگر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ صانع کو مانتے ہیں اور پھر ایسی مہمل تاویلوں سے قرآن پر شبہ کرتے ہیں۔ شاید کوئی یہاں یہ کہے کہ ہم کو تحقیقات جدیدہ سے قرآن پر شبہ اس سے ہوتا ہے کہ حکماء کا مشاہدہ ہے اور اسی بنا پر ہم کو قرآن پر شبہ ہے کہ مشاہدہ کے خلاف کیوں ہے۔ یہ پہلے سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات ہے۔

یہ مشاہدہ نہیں ہے میں کہتا ہوں کہ آپ تو مشاہدہ کی حقیقت کو ہی نہیں جانتے، میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ مادہ خود بخود متحرک ہو کر اس سے ایک صورت پیدا ہو گئی۔ پھر شمس و کوکب ہوئے۔ نباتات ہو گئی، اور نباتات سے حیوانات، اور حیوانات میں ایک خاص نوع بند بھی تھی، پھر بندر یکا یک جست کر کے انسان ہو گیا۔ یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ خود ان مقرین بالقرویۃ کو بھی بند نہ بنے دیں آدمی ہی بنائیں۔ یہی مشاہدات ان ہی ڈھکوسلوں اور مہمل اور وہی باتوں کو مشاہدات قرار دے کر خدا اور رسول پر شبہات اور رائے کو مسلمان کہتے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کیا یہ مشاہدات ہے کہ آفتاب کو سکون ہے زمین کو حرکت ہے۔ خیر ہمیں اس سے

بحث نہیں کہ کس سکون ہے اور کس کو حرکت، کیونکہ یہ قرآن کے مخالف نہیں۔ مگر سوچ لو کہ اتنا بڑا دعویٰ کس بنا پر ہے دلیل کچھ بھی نہیں۔ مگر ہم کہیں گے کہ الشمس متجری چونکہ قرآن میں وارد ہوا ہے۔ اس لئے آفتاب کو ساکن محض ماننے سے گنہ گار ہوں گے زمین کو چاہے آپ ساکن نہ مانے متحرک محض مانے مگر آفتاب کو بھی متحرک ماننا پڑے گا۔

زمین کی حرکت کا مسئلہ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ دَاقِصِيٍّ لِّمَنْ سَعَىٰ لَمْ يَكُنْ لَهَا سَكُونٌ ثَابِتٌ

ہے پھر یہ کہتے ہو کہ حرکت ارض کا ماننا قرآن کے خلاف نہیں۔ جواب یہ ہے کہ اس سے نفی حرکت اضطراریہ مراد ہے۔ غیر اضطراریہ کی نفی مراد نہیں۔ غرض اس کی آپ کو اجازت ہے کہ زمین کو اگر جی چاہے متحرک مانیں، کچھ حرج نہیں۔ اسی طرح اس کی خبر دی گئی ہے کہ آسمان موجود ہے۔ یہ کون سے مشاہدہ کے خلاف ہے گو اس نظام طلوع و غروب کے لئے سموات کی ضرورت نہ ہو۔ لیکن نظام خاص میں ضرورت نہ ہونا نفی کی تو دلیل نہیں ہو سکتی۔ آسمان دوسری مستقلہ دلیل سے ثابت ہے اس کی نفی کرنا جائز نہیں۔ کیس مشاہدہ سے ثابت ہے کہ آسمان نہیں ہے بلکہ ہم آپ کے ممنون ہیں کہ آپ نے اس نیلگوں صورت کو حد نظر مان کر آسمان کی نفی کا ہمیں جواب سکھا دیا کیونکہ قرآن مجید میں کہیں یہ نہیں آیا کہ یہ نیلا نیلا جو نظر آتا ہے یہی آسمان ہے پس اگر آپ کہیں گے کہ اگر آسمان کوئی چیز ہے تو نظر کیوں نہیں آتا ہم یہ کہیں گے کہ نظر اس لئے نہیں آتا کہ آپ نے اسی سقف نیلی کو حد نظر مان لیا ہے۔ پس جب یہ حد نظر ہے تو آسمان اس کے آگے ہے اور چونکہ نظر کی یہاں تک انتہا ہو جاتی ہے اس لئے آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ اب آپ کو آسمان کے نفی کرنے کی بالکل گنجائش نہیں رہی کہ ہم حکماء کے قول پر قرآن کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ مشاہدہ کی بنا پر۔

جس کی مثال میں یہ پیش کیا کرتے ہیں آفتاب کا طلوع و غروب ہونا کہ مشاہدہ سے ثابت ہوا ہے کہ غروب کے وقت آفتاب زمین کے اندر نہیں جاتا۔ اور قرآن مجید میں سکند فوالقرین

کے قصہ میں مذکور ہے کہ آفتاب کو کچھ اور دلدل میں غروب ہوتے پایا۔ بھلا دیکھو کتنا مشاہدہ کے خلاف ہے۔ آفتاب ایک جرم عظیم ہے زمین سے کتنا ہی حصہ بڑا ہے کہیں زمین کی دلدل اور کچھ میں غروب ہو سکتا ہے لیکن اگر عقل ہوگی تو اس میں جواب نظر آئے گا، یعنی قرآن مجید میں وَجَدَ بَا اِخْرَادًا دَارِدًا ہوا ہے۔ یعنی اس کو بادی النظر میں ایسا پایا یعنی اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ میں دھنس رہا ہے یہ نہیں فرمایا، غَرَبَتْ فِي حِمَاةٍ جہاز پر سوار ہو کر دیکھتے تو معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب سمندر میں سے نکلتا ہے اور اسی میں ڈوب رہا ہے اسی طور پر ہم روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں آفتاب کے طلوع و غروب کا یہی معلوم ہوتا ہے کہ زمین ہی سے نکلا زمین ہی میں گھس گیا۔ پھر مشاہدہ کے خلاف کیا ہوا۔ اب فرمائیے مشاہدے سے کہاں تعرض ہے کہیں بھی نہیں۔ پھر افسوس ہے کہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور قرآن اگر فیثا غورث کے قول کے مخالف ہو تو قرآن پر خلاف مشاہدہ کا شبہہ کرتے ہیں۔ فیثا غورث کے قول پر خلاف واقعہ ہونے کا شبہہ نہیں ہوتا۔ اسلام کی عظمت قلوب سے جاتی رہی۔ غرض یہ ہے کہ نئے مذاق میں یہ خرابی پیدا ہو گئی ہے کہ سائنس والے جو کہیں اس پر تو آمنا و صدقنا اور قرآن پر شبہات۔ (الوقت ص ۱۲)

(۲) آدمی علم دین پڑھ کر کم عقل نہیں ہوتا ہے

فرمایا میں اکثر وعظ میں بیان کیا کرتا ہوں کہ فی زمانہ جو اہل علم کم عقل مشہور ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر علم دین پڑھانے میں یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ عربی پڑھ کر آدمی بیوقوف ہو جاتا ہے۔ یہ عذر کہہ کر نیوالے ذرا غور تو کریں کہ یہ بیوقوفی انہیں کی ناقول تجویز کا ثمرہ ہے۔ کسی چیز کے پڑھنے سے عقل نہیں بڑھا کرتی ہے۔ ہاں علم بڑھتا ہے عقل ایک فطری شئی ہے۔ اب اہل علم کے بیوقوف ہونے کی وجہ ذرا ملاحظہ فرمائیے عادت یوں ہو گئی ہے کہ سب اولاد میں جو بیوقوف گنجا اندھا لجا بیسنی جس میں سب عیب ہوں اور جو کسی طرح انگریزی میں کام نہ دے سکے جس کو انگریزی والے درجہ میں بھی نہ گھسنے دیں اس کے واسطے عربی تجویز کی جاتی ہے۔

کہ اس کو ملا بنائیں گے اب وہ احمق نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ اور جو اولاد تیز ذہن ذکی ہے، وہ انگریزی کے واسطے چھانٹی جاتی ہے۔ آپ ہی تو احمقوں اور بیوقوفوں کے لئے عربی تجویز کرتے ہیں اور آپ ہی کہتے ہیں کہ عربی پڑھ کر بیوقوف ہو گیا یہ بیوقوفی انہیں نامعقول تجویزوں کا ثمرہ ہے اور اگر ایسا شخص مقتدا سے دین ہو گیا تو طرح طرح کی خرابیوں کا اندیشہ اس سے ہے۔ اور اگر کہیں ایسا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے کسی نے اپنے تیز ذہن لڑکے کے واسطے ہی عربی تجویز کی اور پھر بھی اس سے کوئی فساد ظاہر ہوا تو اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ اول درجہ کے طماع ہیں تو وہ بھی بیوقوفی میں داخل ہے کیونکہ طمع بھی تو حماقت ہے بلکہ طمع رأس الحماقت ہے۔ پس عربی پڑھنے کے واسطے دو چیزیں اگر ہوں تو اس کا مزہ معلوم ہو۔ اول ذہن ذکاوت، عقل کی تیزی۔ دوم چشمی، استغناء پھر دیکھو اہل علم کیسے عقل مند ہوتے ہیں۔ انہیں بیوقوف کہنا اپنی حماقت کا اظہار ہے۔

(مقالات حکمت حصہ ہشتم، دعوات عبدیت ملفوظات)

(۳) قرآن پڑھنے سے فائدہ ہے اگر چہ معنی نہ سمجھتا ہو

بات یہ ہے کہ قرآن کے پڑھنے میں جو فائدہ ہے اس سے یہ لوگ واقف نہیں اگر فائدے سے واقف ہو جاتے تو اسکے لئے کوشش کرتے جیسا کہ تجارت کر نیوالے ایک مقام سے دوسرے مقام پر جا کر مال تجارت لاتے ہیں، اور اس میں بڑی بڑی مشقتیں برداشت کرتے ہیں، کیونکہ اس کے نفع سے واقف ہیں کہ ایک روپے کے دو ہو جائیں گے۔ دنیا کے کاموں میں تو لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جب کسی تجربہ کار سے معلوم کر لیا کہ فلاں چیز کی تجارت میں بہت نفع ہے تو اس کے قول پر اعتماد کر کے وہ تجارت شروع کر دیتے ہیں اور اگر ایک دو بار نقصان بھی ہو جائے تو ہمت نہیں ہارتے۔ بلکہ وہی کام کرتے ہیں۔ چنانچہ آم والوں کو بعض دفعہ خسارہ بھی ہوتا ہے مگر خسارہ والا پھر بھی کام کرتا ہے اور اگر خسارہ نہ بھی ہو بلکہ برابر معاملہ رہتا ہو کہ نہ نفع ہے نہ نقصان، جب تو اس تجارت کو

چھوڑ کر ہی نہیں سکتے اور یوں کہتے ہیں کہ تجارت میں یہ بھی ایک قسم کی کامیابی ہے کہ نقصان نہ ہو۔ دوسرے اب نفع نہیں ہوا تو آئندہ امید ہے۔ بلکہ خسارہ ہوتا ہے۔ ایک امید نفع کو نفع سمجھا جاتا ہے۔ مگر افسوس دین میں معلوم نہیں یہ اصول کہاں گئے۔ صاحبو! کیا حیرت نہیں کہ دنیا کے کاروبار میں تو نقصان ہونے کو بھی کامیابی سمجھا جاتا ہے اور دین کے کام میں نفع کی تاخیر کو بھی کامیابی نہیں سمجھا جاتا۔ زراعت تجارت، ملازمت سب میں بھی نفع ہوتا ہے کبھی نہیں۔ اور بعض دفعہ نقصان بھی ہو جاتا ہے مگر ان کو کیونکر چھوڑ دیں وہاں تو تجربہ کاروں کا قول ہے کہ ان کاموں میں فائدہ ہے گو ہمیشہ اکثر ہی ہو، اور گو عاجل نہ ہو مگر آخر ہی ہو۔ مگر افسوس کیا خدا اور رسول کا قول ان تجربہ کاروں کے قول سے بھی کم ہو گیا جو صاف صاف قرآن کے منافع بیان کر چکے ہیں پھر وہ بھی ہر حالت میں خواہ سمجھ کر پڑھو یا بدو سمجھ کر پڑھو۔

اور میں دانشور کہتا ہوں کہ جو لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ ہم سمجھتے نہیں تو قرآن کے پڑھنے سے کیا فائدہ، یہ محض حفظ نفس کے بندے ہیں۔ ان کو عقل سے ذرا مس نہیں گو دعویٰ بہت کرتے ہیں اگر یہ عقل کے بندے ہوتے تو ایسی بے عقلی کی بات نہ کہتے کیونکہ عقلی قواعد میں یہ نہیں ہوتا کہ ایک دلیل سے ضدی اور عین شئی دونوں پر استدلال ہو سکے۔ اگر شبہ عقلی ہوتا کہ جب معانی نہ سمجھے تو الفاظ سے کیا فائدہ، تو بتلاتے اس قاعدہ عقلیہ سے کیا ثابت ہوتا آیا کہ الفاظ کو چھوڑ دیا کہ محض الفاظ پر اکتفا نہ کر دو بلکہ معانی بھی حاصل کرو۔ ظاہر ہے کہ اس کی الفاظ کے چھوڑنے پر دلالت نہیں۔ کیونکہ جب معانی کی ضرورت اس قاعدہ میں مسلم ہے اور معانی الفاظ کے تابع ہیں۔ اور ضروری کاموں قوف علیہ ضروری ہوتا ہے تو اس سے تو خود علم الفاظ کی ضرورت پر دلالت ہو رہی ہے۔ اگر وہ کہیں کہ ہاں ہم الفاظ کی ضرورت تسلیم کرتے ہیں مگر ان کو اس وقت حاصل کرنا چاہیے جب کہ معانی کی فہم بھی ساتھ ساتھ حاصل ہو سکے۔ تو ہم کہتے ہیں کہ آپ کی یہ تاویل اس وقت چل سکتی تھی جب کہ ہم دیکھتے کہ تم اپنے بچوں کو بچپن میں تو قرآن نہ پڑھاتے کیونکہ اس وقت سمجھیں گے نہیں بلکہ بڑے ہو کر بڑھاپے کے وقت سمجھیں گے۔ مگر تمہاری حالت تو یہ ہے کہ تم نہ بچپن میں

پڑھاتے ہو نہ جوانی میں، تو معلوم ہوا کہ تم اس قاعدہ سے علی الاطلاق خود عدم ضرورت الفاظ پر بھی استدلال کرنا چاہتے ہو اور یہ وہی بات ہے کہ دلیل سے ضدی پر استدلال کیا گیا ہے حالانکہ وہ عین شئی کو بھی مثبت ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ قاعدہ عقلیہ نہیں ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اس کا منشا محض نفس پرستی ہے ان لوگوں نے اس قضیہ کو عرض نفس کا ایک بہانہ بنالیا ہے اور دل میں ان کے یہ ہے کہ نہ قرآن کے الفاظ کی ضرورت ہے نہ معانی کی، گویا زبان سے معانی کی ضرورت ظاہر کرتے ہیں مگر ان کا عمل بتلاتا ہے کہ وہ کسی کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے ورنہ کسی وقت تو قرآن کو معانی ہی کے ساتھ حاصل کرتے، اور اپنے بچوں کو اس کی تعلیم دلاتے۔ جب عمل یہ ہے تو اب زبان سے معانی کی اہمیت ظاہر کرنا مخلوق کو دھوکہ دینا ہے مگر وہ راہ کو کس طرح دھوکہ دے لو گے جو علیم بذات الصدور ہے، وہ تو تمہارے دل کی حالت خوب جانتا ہے کہ تم خود قرآن کی تعلیم ہی کو مطلقاً بے فائدہ سمجھتے ہو خواہ محض الفاظ ہوں یا معانی کے ساتھ ہوں۔

خلق را گرم کہ بقری بی تمام
در غلط اندازی تا ہر خاص و عام
کار با با خلق آری جملہ راست
با خدا تزویر و جملہ کے رواست
کار با اور راست باید داشتن
رایت اخلاص و صدق افزاشتن
خدا کے ساتھ دھوکہ نہیں چل سکتا، عارف شیرازی فرماتے ہیں کہ
ترسم کہ صرف نہ برد روز باز خواست
نان حلال شیخ زاب حرام ما
یعنی مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ہمارا آب حرام شیخ کے ناں حلال سے قیامت میں
بڑھ نہ جائے، کیونکہ وہ مخلوق دھوکہ دینے کے لئے تقویٰ اور بزرگی کی صورت بناتا
ہے اور ہم اپنے کو قصور وار سمجھ کر گناہ میں مبتلا ہیں اور خدا کے یہاں دھوکہ چل نہیں
سکتا۔ اس لئے اندیشہ ہے کہ کہیں ریاکار مشائخ کا تقویٰ ہماری زندگی سے گھٹ
نہ جائے۔

اسی طرح میں کہتا ہوں کہ فاسق مسلمان جو اپنے کو
عام مسلمان بہتر ہیں گنہگار سمجھتا ہے ان مہذب لوگوں سے اچھے پڑے
ریں گے جو عقائد اسلام میں شبہات نکالتے ہیں اور عقل سے شریعت کا

مقابلہ کرتے ہیں چونکہ یہ لوگ ظاہر میں مسلمان ہیں اس لئے زبان سے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن پڑھنے کو مطلقاً ہمارا جی نہیں چاہتا ورنہ کفر کا فتویٰ لگ جائے گا اس لئے یہ قاعدہ غرض نفس کے موافق گھڑ لیا کہ جب معانی نہیں سمجھتے تو الفاظ سے کیا نفع اس کا جواب بس یہی ہے کہ بہت اچھا آپ اپنے بچوں کو معانی ہی کے ساتھ قرآن پڑھائیے اور ان کو ابتدا ہی سے عربی کی تعلیم صرف و نحو کی تعلیم دیجئے مگر اس سے تو اور بھی خون خشک ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ تو الفاظ کو طال کر معانی سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے یہ ایسی الٹی پڑ گئی کہ صرف و نحو بھی گلے پڑ گئی مگر جو شخص الفاظ کو بدون معنی کے بے فائدہ کہے، اور صرف معانی ہی کی ضرورت کا قائل ہو اس کو یقیناً ضروری کی تحصیل پر مجبور کیا جائے گا۔ صاحبو! ظاہر میں یہ قضیہ کہ بدون سمجھے الفاظ سے کیا فائدہ پر منفر معلوم ہوتا ہے۔ مگر دراصل ان لوگوں نے مغز اسلام نکال دیا ہے ان میں سے بعض نے تحصیل معانی کی بھی کوشش کی مگر وہ اس کا مصداق تھی۔

اگر غلط سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی انہوں نے معانی حاصل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ترجمہ قرآن کا مطالعہ کر لیا، مگر یہ ایسا ہے کہ جسے کوئی خوان نعمت سے گلے گلے پکانا سیکھے کیونکہ اس میں سب کھانوں کی ترکیب لٹھری ہے مگر اس سے آٹا گوندھنے کا طریقہ اور پانی کھپانے کی ترکیب اور آج کا انداز کیسے معلوم ہوگا۔ نیز اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک صاحب نے ضاد کے بارہ میں مجھ سے تحریراً سوال کیا تھا کہ ضاد کا مخرج کہاں سے ہے اور اس میں اور ظاہر میں فرق کیونکر ہوتا ہے میں نے لکھ دیا کہ یہ بات خط سے نہیں معلوم ہو سکتی۔ کیونکہ

گر مصور صورت آں داستاں خواہد کشید

لیک جیرا نم کہ نازش را چپاں خواہد کشید

اس کو کسی ماہر تجوید سے زبانی سن کر سمجھ سکتے ہو تو حضرت بعض باتیں ایسی ہیں جو مطالعہ سے حاصل نہیں ہو سکتیں بلکہ ان کے لئے استاد کی ضرورت ہے کیونکہ بعض باتیں سینہ بسینہ ہوتی ہیں اور اس میں کچھ تصوف اور سلوک ہی

کی خصوصیت نہیں بلکہ ہر علم میں ایک بات ایسی ہوتی ہے جو سینہ بسینہ ہے کہ صرف استاد سے حاصل ہوتی ہے،

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست

بسیار شیوہ ہاست تباں را کہ نام نیست

پھر قرآن ہی اتنا سستا کیوں ہو گیا کہ اس کا مطلب بدون استاد کے سمجھ میں آجائے گا۔ آج کل تفریبات ہند کا ترجمہ اردو میں ہو گیا ہے ذرا کوئی اس ترجمہ کو دیکھ کر مطلب صحیح تو بیان کر دے یقیناً بہت جگہ غلطی کرے گا۔ اسی طرح کیمیا کی کتابیں اردو میں ہو گئی ہیں کوئی ان کو دیکھ کر کیمیا تو بنالے، کبھی نہیں بنا سکتا۔ پس معانی قرآن کے حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ ترجمہ دیکھ لیا جائے۔ ترجمہ قرآن اگر دیکھو تو صرف و نحو اور قدرے فقہ کے بعد دیکھو اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اردو ترجمہ کسی عالم سے تو سبقاً سبقاً پڑھلو۔ سوا ایک جماعت تو یہ تھی کہ جس کے عقائد تعلیم جدید کی وجہ سے خراب ہو گئے ہیں اور ایک جماعت عوام کی ہے۔ ان کا عقیدہ یہ تو نہیں کہ بدون معانی کے قرآن پڑھنے سے کیا فائدہ مگر اس کا اثر لئے ہوئے ہے کہ قرآن کے پڑھنے میں کوشش نہیں کرتے۔ سو یہ لوگ دوسرے رنگ میں اس غلطی میں مبتلا ہیں اس لئے اس وقت میں اس غلطی کو رفع کرنا چاہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اول ”الکر“ فرمایا ہے یہ تو حروف مقطعات ہیں، جن کے معنی ہم کو معلوم نہیں گو بقول محققین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھے۔ لیکن امت نہیں بتلائے گئے مگر میں ان سے بھی اپنے مقصود میں کام لوں گا۔ سامعین کو تعجب ہوگا کہ جب معنی ہی معلوم نہیں تو اس سے مضمون کو کس طرح ثابت کیا جائے گا لیکن تعجب میری تقریر کے بعد مرتفع ہو جائے گا۔ ابھی میں آیت کا ترجمہ بیان کر دوں اس کے بعد ان حروف سے ثابت کر دوں گا تو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَرُتَانٌ مُّبِينٌ، یہ آیات کتاب اور قرآن مبین کی ہیں۔ یہی ترجمہ دوسری آیات کا ہے صرف کتاب قرآن کا تقدیم و تاخیر میں فرق ہے تو اس جگہ آیات کے دو لقب بیان کئے گئے ہیں، ایک قرآن دوسرا کتاب قرآن کے معنی میں مایقلاً یعنی پڑھنے کی چیز، اور کتاب کے معنی میں مایکتب یعنی لکھنے کی چیز اور نظام ہے کہ پڑھنے اور لکھنے کی چیز کیا ہے؟ الفاظ ہی تو ہیں۔ معانی کو کون پڑھ سکتا ہے

یا کون لکھ سکتا ہے۔ اور ایک مضمون ابھی ذہن میں آیا ہے جو شروع میں نہ آیا تھا۔ اب تک تو ذہن میں یہ بات تھی کہ الفاظ ہی پڑھنے لکھنے کی چیز ہیں، معانی کچھ پڑھ لکھ نہیں سکتے اس پر ایک لطیف یاد آیا کہ بخوبی نہ کہاہے کہ ضرب میں ہو مستتر ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ظاہر میں ضمیر مذکور نہیں سمجھنے میں آتی ہے۔ مگر ایک طالب علم یہ سمجھے کہ ضرب کے اندر ضمیر ہو چھپی ہوئی بیٹھی ہے تو آپ نے ضرب کو چھیلنا شروع کیا یہاں تک کہ کاغذ پھٹ گیا اور اتفاق سے دوسرے ورق میں اس جگہ ہو لکھا ہوا تھا یہ بڑے خوش ہوئے کہ واقعی استاد نے ٹھیک کہا تھا کہ اس کے اندر ہو پوشیدہ ہے دیکھو چھیلنے سے نکل آیا پھر دوڑے استاد کے پاس آئے کہ دیکھتے ہیں نے ضرب کو چھیلنا تھا یہ ہو نکل آیا جو اس میں چھپا ہوا تھا اور اس کا مطلب دوبارہ سمجھایا۔ غرض یہ طالب علم یوں سمجھا تھا کہ معانی بھی کتابت میں آسکتے ہیں مگر یہ اس کی غلطی ہے۔ معانی قرأت و کتابت میں نہیں آسکتے ان کا محل صرف ذہن ہے۔ لوگ بے تار کی خبر پر تعجب کرتے ہیں۔ مگر خدا نے تعالیٰ نے اس کو پہلے سے پیدا کر رکھا ہے کیونکہ الفاظ سے معانی کا سمجھنا بے تار کی ہی خبر ہے کیونکہ معانی کا مرکز قلب ہے اور جہاں الفاظ کسی کی زبان سے نکلے۔ معاد وہاں معانی سمجھے گئے غرض ان آیتوں میں اشارہ کیا بلکہ صراحت ہے کہ قرآن کے ساتھ پڑھنے کا تعلق رکھو کیونکہ لفظ قرآن کے معنی یہی ہیں اور ظاہر ہے کہ قرأت الفاظ ہی کی ہوتی ہے نہ کہ معانی کی۔ دوسری صفت اس جگہ کتابت ہے جس کے معنی لکھنے کی چیز ہے، اس سے معلوم ہوا کہ الفاظ قرآن کے ساتھ قرأت کے علاوہ ضبط و کتابت کا بھی تعلق رکھنا چاہیے سو اب تک تو صرف یہی بات ذہن میں تھی اور دوسری بات جو اسی وقت ذہن میں آئی وہ یہ ہے کہ کتابت کا مصداق حقیقتاً الفاظ ہیں نہ معانی کیونکہ الفاظ تو زبان سے ادا ہوتے ہیں ان کا محل زبان ہے لفظ کے معنی لغت میں پھینکنے کے ہیں چونکہ الفاظ زبان سے پھینکے جاتے ہیں یعنی نکلے جاتے ہیں اس لئے ان کو الفاظ کہا جاتا ہے۔ اور معانی کا محل صرف ذہن ہے وہ تو کتابت کا مصداق کسی طرح ہے ہی نہیں بلکہ اس کا مصداق دوسری چیز ہے یعنی نقوش جن کو عوام کرم کاٹے کہتے ہیں کیونکہ ان پڑھ آدمی لکھا ہوا پڑھ نہیں سکتا نہ سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے وہ ان کو کرم کاٹے کہتے ہیں مگر کتاب کا مصداق مطلق نقوش نہیں بلکہ

وضعی نقوش ہیں جیسا کہ الفاظ کی دلالت معانی پر وضعی ہے اس لئے پڑھے ہوئے آدمی ان کو سمجھتے ہیں ان پڑھ نہیں سمجھتے۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ کتاب کا حقیقی مصداق نقوش ہیں تو آپ تو الفاظ ہی کو غیر مقصود بتلاتے تھے اور قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوا کہ نقوش قرآن بھی قابل حفاظت و مستحق تنظیم ہیں یہ تو الٹی پڑی کہہ گئے تھے، نماز بخشنا نے روز بھی گلے پڑ گئے۔ مگر صاحبو! یہ گلے نہیں پڑے، کیونکہ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی بادشاہ کسی شخص کو اشرفیاں اور جواہرات دے کر اس سے کہے کہ اس کو حفاظت سے رکھو، قفل اور تالا لگاؤ اگر اس شخص کو روپیے اور جواہرات کی قدر معلوم ہے تو اس حکم کی قدر کرے گا اور کہے گا کہ

جزاک اللہ کہ چشم باز کردی

مرا با جان جاں ہمسرا ز کردی

اذا جس کو روپیے کی قدر نہ ہوگی وہ کہے گا کہ یہ اچھی بلا میرے سر پڑی کہ خطا کر دو اور قفل لگاؤ اسی طرح جو لوگ معانی کی قدر کرتے ہیں، وہ ان الفاظ و نقوش کی بھی قدر کریں گے کیونکہ یہ ان ہی کی حفاظت کا سامان ہے اور جو قدر نہیں کرتے وہ اس کو سر پڑی بلا سمجھیں گے پس معلوم ہوا کہ تو تعلیم یافتہ الفاظ قرآن کے پڑھنے کو بے فائدہ سمجھتے ہیں درحقیقت وہ معنی قرآن کی قدر نہیں کرتے ورنہ اس کی حفاظت کے ہر سامان کی ان کو قدر ہوتی۔

صاحبو! الفاظ قرآن کو اس کی حفاظت میں بڑا دخل ہے **قرآن کا معجزہ** کیونکہ الفاظ قرآن کا یہ معجزہ ہے کہ وہ نہایت سہولت سے حفظ ہو جاتے ہیں کہ اگر خدا نہ خواستہ خدا خواستہ یہ لکھے ہوئے مصاحف گم ہو جائیں تو ایک بچہ حافظ قرآن اپنی یاد سے اس کو دوبارہ لکھوا سکتا ہے۔ بڑوں کا تو ذکر ہی کیا۔ منظر نگار کا واقعہ ہے کہ وہاں ایک داعظ نے قرآن کے اس معجزہ کو ظاہر کرنا چاہا تو درمیان وعظ میں ایک آیت پڑھ کر اٹک گئے اور مجمع کو خطاب کر کے کہا کہ اس مجمع میں جس قدر حافظ موجود ہوں چھوٹے بڑے سب کھڑے ہو جائیں مجھے ایک آیت میں شبہ ہو گیا ہے۔ اس کو حل کرنا چاہتا ہوں تو چاروں طرف سے بہت آدمی کھڑے ہو گئے جس میں بچے بھی تھے جو ان بھی اور بوڑھے بھی تھے اور ادھیڑ

بھی۔ یہ دیکھ کر واعظ نے کہا، (الحمد للہ)، صاحبو! مجھ کو آیت میں شبہ نہیں رہتا۔ مجھے صرف یہ دکھلانا تھا کہ اس مجمع میں جس کے اندر حفاظ کو بالقصد جمع نہیں کیا گیا۔ یوں ہی کیف و اتفاق یہ سب مجمع آگیا ہے اس قدر حفاظ قرآن موجود ہیں۔ اب قیاس کرو کہ سارے شہر میں کتنے حفاظ ہوں گے پھر یہ اندازہ کرو کہ پورے ضلع میں کتنے ہوں گے پھر سوچو سارے ہندوستان میں کتنے ہوں گے اور دنیا بھر میں کتنے ہوں گے صاحبو! یہ قرآن کا معجزہ نہیں تو اور کیا ہے کہ اس زمانے میں جب کہ قرآن کی طرف رغبت کا کوئی سامان نہیں نہ اس کے حفظ کرنے والوں کو کوئی بڑا عہدہ ملتا ہے بلکہ زیادہ تر امرار کی توجہ انگریزی پڑھنے کی طرف ہے اور کفار قرآن مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس قدر حفاظ موجود ہیں کہ بچے بھی حافظ ہیں اور مرد بھی، اور بعض قصبات میں عورتیں بھی حافظ ہیں۔ چنانچہ قصبہ پانی پت میں بہت عورتیں حافظ ہیں۔ اور بعض تو سب سے قرأت کی حافظ ہیں۔

قرآن کے یاد کرنے کو بیکار کہنے والے

صاحبو! میں نہایت آزادی سے صاف صاف کہوں گا کہ جو لوگ بدوں معانی سمجھے الفاظ قرآن کے پڑھنے کو بیکار کہتے ہیں وہ حضرات حق تعالیٰ کا مقابلہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو قرآن کے حافظ پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ محفوظ رہے، اور یہ لوگ دنیا سے حفظ قرآن کو مٹانا چاہتے ہیں، کیونکہ تجربہ شائد ہے کہ حفظ قرآن بچپن ہی میں اچھا ہوتا ہے بڑے ہو کر ویسا حفظ نہیں ہوتا تو اب اگر ان لوگوں کے مشورہ پر بچوں کو قرآن نہ پڑھایا جائے تو اس کا انجام یہی ہے کہ حفظ کا دروازہ بند ہو جائے مگر یُرِيدُونَ لَيُطْفِقُوا قَوْلَ اللَّهِ بَاطِلًا ۖ أَهْلَهُمْ وَيَأْتِي اللَّهُ إِلَهُ الْآنَ يُسَبِّحُ قَوْلَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ یہ خدا کے نور کو مٹانا چاہتے ہیں بخدا یہ خود ہی مٹ جائیں گے، اور خدا کا نور ان کے مٹانے سے ہرگز نہ مٹے گا یہ لوگ اپنے ایمان کی خیر منائیں یہ کس ہو اس خدا کی قسم ان کا نام و نشان تک نہ رہے گا۔ یہ بالکل تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

چراغ را کہ ایزد بر سر روز
ہر آنکوتف زندر شیش بسوزد۔

اور

اگر گیتی سر اسر باد گیسو چراغ مقبلاں ہرگز نہیں
اس عارف نے یہ بات اہل اللہ کے انوار کے متعلق فرمائی ہے توجیب اہل اللہ کے انوار کسی کے مٹانے سے نہیں مٹ سکتے تو خود اللہ کا نور کس طرح مٹ سکتا ہے بعض اہل اللہ بظالموں نے ستم کیا اور ان کو ذلیل کرنا چاہا ان کی قبر پر گوہ ڈلوایا مگر ان کا نام اور ان کے انوار اب تک تاباں و درخشاں ہیں اور وہ ظالم گنہگار اور ناپید ہو گئے، کوئی ان کے نام سے بھی واقف نہیں نہ ان کی قبر کا نشان باقی ہے اور اہل اللہ کے مزارات اس وقت تک مرجع اخلاقی بنے ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ مشاہد ہے کہ اہل اللہ اپنے کو خود مٹانا ناپسند کرنا گنہگار نہ چاہتے ہیں، اور اہل ظاہر اپنے کو ظاہر کرنا مشہور کرنا چاہتے ہیں مگر اہل اللہ یعنی اہل باطن ہی چمکتے ہیں اور اہل ظاہر کی شہرت چند روزہ ہو کر خاک میں مل جاتی ہے۔ بعض مصنفین نے اپنے کتابوں کے نام تک ظاہر نہیں کیا مگر کتابیں ان کی مقبول و متداول ہیں اور اہل ظاہر بڑے اہتمام سے اپنا نام ظاہر کرتے ہیں مگر ان کی کتابوں کو کوئی بھی نہیں پوچھتا۔

اللہ کا نور مٹ نہیں سکتا ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب اہل اللہ کے انوار کسی کے مٹانے سے نہیں مٹ سکتے تو خود اللہ تعالیٰ کا نور کیوں کر مٹ سکتا ہے بس یہ خدا کی حفاظت ہے کہ قرآن کے اس قدر حفاظ ہر زمانے میں ہوتے رہے ہیں کہ ان کا شمار و احصار دشوار ہے اس پر بعض لوگ یوں کہہ دیا کرتے ہیں کہ خدا قرآن کا حافظ نگہباں ہے تو ہمیں اس کے اہتمام کی کیا ضرورت ہے۔ اے صاحبو! یہ بات ایسے دل سے نکلی ہے جس میں خدا سے ذرا بھی علاقت اور لگاؤ نہیں کیا؟ اگر جارج پنچم آپ کو کوئی تحفہ دیں آپ اس کی بے قدری کر سکتے ہیں اور خصوصاً ان کی نگاہ کے سامنے ہرگز نہیں، بلکہ اس کو سر اور آنکھوں پر رکھا جائے گا اور اس کی جان سے زیادہ حفاظت کی جائے گی، اور اگر وہ کوئی تحفہ کھانے کی واسطے آپ کو دیں اور ان کے سامنے آپ اسے کھائیں تو کیا زمین پر آپ اس کا کوئی ریزہ گرنے دیں گے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ اس طرح شوق سے کھائیں گے کہ گویا کبھی بیعت آپ کو ملی ہی نہیں تھی، اور اگر اس میں سے

ذرا سا بھی زمین پر گر گیا تو فوراً اٹھا کر سر پر رکھیں گے۔

یہیں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی حقیقت
قرآن کی حفاظت سمجھ لو کہ اگر کھانا کھاتے ہوئے لقمہ زمین پر گر جائے تو اسکو
اٹھا کر صاف کر کے کھا لو کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ ہم کو دیکھ رہے ہیں تو انکی
نعمت کی ان کے سامنے بے قدری کرنا بڑی بے حیائی ہے، تو صاحبو! خدا تعالیٰ
نے آپ کے ہاتھوں میں قرآن دیدیا ہے تو اب تو یہ آپ کا ہو گیا تو کیا اپنی ایسی
قیمتی چیز کی جو سلطان السلاطین کے دربار سے ملی ہے آپ کو حفاظت نہ کرنا چاہیے
یقیناً کرنا چاہیے خصوصاً صاحب کہ خدا کی مرضی اس کی حفاظت میں ہے اور وہ اس کو
محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو بھی مرضی حق پر چلنا چاہیے اس کی حقیقت اولیاء اللہ
سے پوچھو۔

صاحبو! محبت کا سبب کمال و جمال و نوال ہے اور یہ سب
اسباب محبت باتیں حق تعالیٰ شانہ کے اندر کامل طور پر موجود ہیں ان سے بھی
اگر محبت نہ ہو تو پھر کس سے ہوگی۔ خبر بھی ہے حق تعالیٰ کون ہیں تمام حسن و جمال کا مبداء
و منتهی ہیں تو جب خدا تعالیٰ اسے محبوب ہیں تو ہم کو انکی مرضی کی رعایت کرنا چاہیے
اور خدا تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ قرآن محفوظ رہے تو آپ کو اس کی طرف جھکنا چاہیے
اور اس کے الفاظ کا پورا اہتمام کرنا چاہیے، کیونکہ الفاظ و معانی دونوں قابل اہتمام
ہیں مگر الفاظ میں اتنی بات زیادہ ہے کہ معانی کی حفاظت الفاظ کی حفاظت پر موقوف
ہے کیونکہ معانی کا ضبط بدون الفاظ کے نہیں ہو سکتا۔

دیکھتے سب سے پہلے معانی کا نزول
دیکھتے سب سے پہلے معانی کا نزول
الفاظ قرآن کی حفاظت کا اہتمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب
مبارک پر ہوا ہے مگر وہاں بھی بواسطہ الفاظ کے ہوا ہے اور حضور کو الفاظ کا اس
قدر اہتمام تھا کہ جب وحی نازل ہوتی تو آپ جبریل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ پڑھتے
جاتے تھے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حافظہ بہت قوی تھا بلکہ سارے ہی قوی
منضبط تھے کہ تریسٹھ سال کی عمر میں بھی آپ کے بال کچھ ہی سفید ہوئے تھے۔
اور حضور کی قوت کا کیا پوچھنا۔ آج کل سے تو اس زمانے کے سب ہی لوگ قوی

تھے حضرات صحابہ کا حافظہ بھی ہم لوگوں سے زیادہ قوی تھا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تو سب
ہی سے زیادہ قوی تھا، لیکن بایں ہمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو الفاظ قرآن کا اس درجہ اہتمام
تھا کہ فرشتہ کے ساتھ قرآن پڑھتے جاتے تھے۔ کیونکہ

سہ با سایہ ترا نمی پندم عشق است دہزار بدگمانی
آپ کو ان محبوب الفاظ کے نکلنے کا اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی لفظ میری یاد سے نکل
نہ جائے اس لئے ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے تھے۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کو ان الفاظ قرآن سے کس درجہ عشق تھا یہاں تک کہ حق تعالیٰ کے منع کرنے کی
نوبت آئی کہ آپ ساتھ ساتھ پڑھنے کی مشقت برداشت نہ کیا کریں، لا تحزن
یہ لسانک لیتعجل بہ ہم ذمہ لیتے ہیں کہ قرآن کو آپ کے دل پر جمادیں گے، اس
تسلی کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرشتے کے ساتھ نہیں پڑھتے تھے۔ جب حضور کو
الفاظ قرآن کا اس درجہ اہتمام تھا تو ہم کو بھی ان کا اہتمام کرنا چاہیے کیونکہ بدون الفاظ
کے معانی کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ لہذا معانی کی نگہبانی یہی ہے کہ الفاظ کو یاد کیا جائے
حضرات سلف صالحین نے تو قرآن کے نقوش اور رسم خط کی بھی یہاں تک حفاظت
کی ہے کہ رسم خط قرآن میں سب سے سبب رسائل تصنیف کے اور اس کو علیحدہ فن قرار دیا ہے
اور اس میں تغیر و تبدل کو ناجائز فرمایا ہے۔

صاحبو! آج کل تو یادگار قدیم کی اس
قد حافظت کی جاتی ہے کہ اس کے
تغیر کے بعد بھی اس کا فوٹو لیا جاتا ہے تو خدا انخواستہ اگر رسم خط قدیم متغیر بھی ہوتا جب
بھی یادگار قدیم ہونے کی وجہ سے اس کی حفاظت ضروری تھی چہ جائیکہ وہ بالکل محفوظ
صحیح ہے بلکہ اس میں نکات ہیں چنانچہ ایک جگہ بقادریں الف نہیں لکھا گیا کیونکہ
وہاں دوسری قرأت بقدر ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس جگہ بقادریں الف نہیں لکھا تاکہ
دوسری قرأت پر بھی رسم خط دال رہے۔ اسی طرح سورہ فاتحہ میں مالک یوم الدین
میں الف نہیں لکھا کیونکہ ایک قرأت میں ملک ہے پس رسم خط قرآن میں اس کا
بجائے لفظ لکھا گیا ہے کہ سب قراتوں کو جامع رہے اس لئے اس کا بدلنا حرام ہے۔
صاحبو! جب قرآن کی ہر چیز کی حفاظت کی گئی ہے اور یہ مسلمانوں کے لئے بڑا فخر ہے

ہے کہ ان کے برابر کسی قوم اور کسی امت نے آسمانی کتاب کی حفاظت نہیں کی۔ تو آپ کو بھی اس کی ہر چیز کی ویسی ہی حفاظت کرنا چاہیے جیسا کہ اب تک امت نے کی ہے اور یہ امت کہو کہ خدا تو اس کا خود نگہبان ہے پھر ہم کو کیا ضرورت ہے کیونکہ اس کی محافظت کی یہ بھی ایک صورت ہے کہ اس نے یہ خدمت ہم سے لے لی اگر تم یہ کام نہ کر دے گے تو اللہ تعالیٰ کسی سے اور انعام ہے کہ اس نے یہ خدمت ہم سے لے لی اگر تم یہ کام نہ کر دے گے تو اللہ تعالیٰ کسی دوسری قوم سے یہ کام لے لیں گے چلے چھوڑ کر دیکھ لو، تمہاری تان گاڑی نہیں چل رہی ہے اللہ تعالیٰ کو تو ہمارے پیدا کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی یہ بھی ان کا انعام محض ہے کہ ہم کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا اور پیدا کرنے سے پہلے ملائکہ سے فرمایا اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَکَ کہ زمین کے اندر اپنا خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں، کس قدر عنایت ہے کہ

ما نبودیم و تقاضائے ما نبود لطف تو ناگفتہ نامی شنود

ہمارا پیدا ہونے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے ہم کو خلیفۃ اللہ کا خطاب دیا تو کیا خلافت کا یہی حق ہے جو ہم ادا کر رہے ہیں کہ زبان پر یہ بات آ رہی ہے کہ خدا قرآن کا خود نگہبان ہے ہم کو کیا ضرورت ہے۔ خدا تعالیٰ کی عنایت تو دیکھئے کہ ہم کو ایسی حالت میں خلیفہ بنایا کہ دوسرے لوگ اس منصب سے طالب موجود تھے ملائکہ نے اسی وقت جب کہ اللہ تعالیٰ نے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَکَ فرمایا یہ عرض کیا تھا کہ ہمارے ہوتے ہوئے انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ قرآن میں ملائکہ کا یہ سوال اور اس کا جواب مفصل مذکور ہے میں اس وقت اس کی تفصیل بیان کرنا نہیں چاہتا صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حق تعالیٰ کو ہماری ضرورت نہ تھی بلکہ جس کام کے لئے ہم کو پیدا کیا گیا ہے اس کے انجام دینے کے لئے اللہ تعالیٰ کی دوسری مخلوق اپنی خدمات کو پیش کرنے موجود تھی مگر اللہ تعالیٰ کا یہ ہمارے حال پر غایت کرم ہے کہ دوسری جماعت کے ہوتے ہوئے پھر بھی ہم کو منصب خلافت عطا کیا اور ہم کو اس خدمت کے لئے پیدا کیا اسی طرح خدمت قرآن کے لئے بھی خدا تعالیٰ کی ہماری کیا ضرورت ہو سکتی ہے اگر ہم خدمت دین میں کوتاہی کریں گے تو دوسری

قوم کو اس کی خدمت کے لئے پیدا کر دیں گے۔

چنانچہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اس خیال کا بھی جواب صاف ارشاد خداوندی صاف دیا ہے وَإِنْ تَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یُکُونُوا آمِنًا لَّکُمْ اگر تم دین سے اعراض کر دے گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے عوض تمہاری جگہ دوسری قوم کو کر دیگا پھر تمہاری طرح سست و کاہل اور دین سے جان چرانے والے نہ ہوں گے، صاحبو! تمہاری تان گاڑی نہیں چل رہی تم آج چھوڑ کر دیکھ لو گاڑی ویسی ہی چلتی رہے گی ہاں تم خود ہی گر پڑو گے اللہ تعالیٰ اس دین کی خدمت اور قرآن کی حفاظت کے لئے ایسی قومیں پیدا کر دیں گے جو تمہاری جیسی نہ ہوں گی۔ صاحبو! میں آپ کو خبردار و بیدار کرنا چاہتا ہوں کہ جلدی سنھلو

..... بیدار ہو جاؤ

کہیں اس وعید کا ظہور نہ ہو جائے کیونکہ مجھے اس کے آثار نظر آ رہے ہیں اس وقت میں ایک خوفناک منظر دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کی تحریروں تو کفر آمیز شائع ہوتی ہیں اور اہل یورپ کی تحریروں اسلام کی مدح میں شائع ہو رہی ہیں گویا بعض مسلمان کفر کی طرف بڑھ رہے ہیں اور بعض کفار اسلام کی طرف، تو اس حالت کو دیکھ کر مجھ کو سخت اندیشہ ہوتا ہے کہ جب دونوں جماعتیں سرحد پر پہنچ چکی ہوں گی تو ایسا نہ ہو کہ وہ تو کفر سے نکل کر مسلمان ہو جائیں اور یہ اسلام سے نکل کر کافر ہو جائیں۔ صاحبو! دوسری قوموں کو اسلام کی مدح و ثنا کی طرف مائل کر کے ہم کو متنبہ فرما رہے ہیں کہ یہ امت سمجھنا کہ خدا کو یا اسلام کو تمہاری ضرورت ہے بلکہ تم ہی کو اسلام کی ضرورت ہے وَإِنْ تَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یُکُونُوا آمِنًا لَّکُمْ اگر تم اعراض کر دے گے تو ہم تمہاری جگہ دوسری قوم کو کر دیں گے جو اس وقت باوجود کفر کے اسلام کی مدح کر رہی ہے اور تم ان کی جگہ ہو جاؤ گے کہ باوجود کفر ہونے کے اسلام کی توہین کرتے ہو اور اگر تم اعراض نہ کر دے بلکہ بدستور اسلام کی خدمت انجام دیتے رہو اس صورت میں تم بھی مسلمان رہو گے اور شاید دوسری قومیں بھی مسلمان ہو جائیں اور اسلام کی خدمت یا قرآن کی حفاظت جو کچھ آپ کرتے ہیں یہ محض برائے نام ہے جس سے صرف آپ کا نام ہو جاتا ہے ورنہ اب بھی قرآن کے محافظ و راصل حق تعالیٰ ہی ہیں۔

قرآن بعد حفظ ہوتا ہے تم اپنے حفظ پر کیا ناز کرتے ہو ذرا کافیہ یا کوئی اور نظم و نثر کی کتاب تو حفظ کر لو آپ کو اسی وقت

اپنے حفظ کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ یہ خدا تعالیٰ ہی کی تو حفاظت ہے کہ قرآن جیسی ضخیم کتاب کا حفظ کرنا ایسا آسان کر دیا ہے کہ بچے تک حفظ کر لیتے ہیں، حالانکہ قرآن میں تشابہات بھی کثرت سے ہیں۔ اس بات پر بھی کہنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارا محض نام کرنا مقصود ہے کہ وہ ہم کو حافظان قرآن کی فہرست میں داخل کر کے انعام دیتے ہیں ورنہ اصل حافظ وہی ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے

کار زلف تسیت مشک افشانی اما عاشقاں -

مصاحبت را تہمت بر آہوے چین بستہ اند -

واللہ اس انعام پر جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر فرمایا ہے، یوں کہنا

چاہیے

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل -

نسیم صبح تیری مہر بانی ! -

اور عارفین کی نظر تو اس سے

تلاوت قرآن کی برکت بھی آگے بڑھتی ہے، عارفین

تو جب قرآن کی تلاوت کرتے ہیں تو ان کو یہ بات مشکوف ہوتی ہے کہ ہم خود نہیں پڑھ رہے بلکہ اکھن بابہ کی طرح بول رہے جس میں کسی اور کا کلام بند کر دیا گیا ہے اور بانجے سے وہی نکلتا ہے جو اس میں بند کیا گیا ہے مگر ظاہر میں یہ سمجھتا ہے کہ باجہ بول رہا ہے یا اس وقت وہ مثل شجرہ طور کے ہوتے ہیں کہ ظاہر میں یہ

درخت کہہ رہا تھا یا موصیٰ اِنِّیْ اَنَا اِلٰہُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ مگر درخت کی کیا مجال تھی کہ وہ اس طرح خود بولتا بلکہ کوئی دوسرا بول رہا تھا اور

درخت محض اس کا ناقل و حاکی تھا

چرخ کو کب یہ سلیقہ سے شمشگاری میں کوئی معشوق ہے اس پر وہ رنگاری میں

اے موسیٰ میں ہی اللہ ہوں جو سارے جہاں کا پالنے والا ہے -

ایک عارف اس کو فرماتے ہیں

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند -

آنچه استاد ازل گفت بگوئی گویم -

عارفین کو جب اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے تو کچھ نہ پوچھتے کہ تلاوت قرآن کے وقت ان کی کیا حالت ہوتی ہے

اور تلاوت قرآن میں تو اس حالت کا غلبہ ایک خاص وجہ سے زائد ہوتا ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ

صاف صاف اپنی شوکت و عظمت و جلال کو ظاہر فرماتے ہیں۔ کہیں عتاب سے کہیں

شکایت سے کہیں تسلی سے کہیں بشارت سے کہیں تکلم ہے، کہیں خطاب ہے، ورنہ

ایک تلاوت قرآن ہی کیا انسان کے تو سارے ہی افعال ایسے ہیں کہ ان میں انسان محض

برائے نام فاعل ہے ورنہ اصل کو کئے والے وہی ہیں، یہ کیا ناز کرتا ہے اپنے علم و کمال پر

کہ میں نے یہ کام کیا ہے میں نے فلاں مسئلہ حل کیا ہے واللہ اس مثال بالکل ایسی ہی

ہے جیسے کوئی شخص دوسرے کے کھیت پر دعویٰ کرے کہ یہ کھیتی میری ہے مگر ساکھ

میں یہ بھی اقرار کرتا ہے کہ زمین بھی دوسرے کی اور بیج اور بیل بھی دوسرے کا اس نے

اس کو پانی دیا کھا ڈالا، اور کھیت کو پرورش کیا ہے ظاہر ہے کہ ہر شخص اس مدعی کو

اتحق بنائے گا کہ جب ساری چیز دوسرے کی ہیں تو کھیتی تیری کدھر سے ہوتی -

صاحبو! مگر اس حماقت میں ہم سب مبتلا ہیں

قوت و اعضا انسانی کا اقرار کیونکہ جس دماغ اور جن ہاتھ پیروں سے ہم

کرتے ہیں ہر ایک کو اقرار ہے کہ یہ سب سامان خدا کا عطا کیا ہوا ہے۔ عقل و فہم اور قوت

ارادہ اور قوت عمل بھی انہی کی دی ہوئی ہے۔ اب فرمائیے کہ ان سب قویٰ اور جوارح

سے جو افعال و کمالات ظاہر ہوں گے وہ ہمارے کدھر سے ہوں گے

بیاد و رم از خانہ چیزے نخست

تو دادی ہمہ چیز من چیز تست

حیرت ہے اگر ہم اب بھی یہ دعویٰ کریں کہ ہم خود قرآن کی حفاظت کرتے ہیں جب ہمارا پڑھنا اور یاد کرنا ہمارے قبضہ کا نہیں تو ہم حفاظت کر نیوالے کون ہیں بلکہ وہی

حفاظت ہیں جنہوں نے ہم سے یہ کام لیا اور اس کے اسباب عطا کئے اور حفاظت کا ادھر

سے ہونا بہت ہی ظاہر ہے حقیقت میں تو ہمارا پڑھنا اور تلاوت کرنا بھی ادھر ہی سے ہے اگر ادھر سے توفیق نہ ہو تو کسی کی مجال نہیں کہ ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکے۔

ایک واقعہ کا پور کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے جمائی لی تھی اس کے بعد منہ بند کرنے کا، پھر بڑی دقت سے کئی دن میں منہ بند ہوا۔ شاید کوئی کہے کہ دوا دارو سے منہ بند تو ہو گیا، یہ کام تو انسان کی تدبیر سے ہوا، میں کہتا ہوں کہ اس میں بھی تدبیر کا محض نام ہی ہے خدا کو منظور نہ ہوتا تو قیامت تک منہ بند نہ ہو سکتا آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض دفعہ تمام اطباء اور ڈاکٹر عاجز ہو جاتے ہیں اور بیمار کو شفا نہیں ہوتی بلکہ جوں جوں دوا کرتے ہیں مرض کو ترقی ہی ہوتی ہے اور یہ حال ہوتا ہے کہ

از قضا کنگبیں صفرافزود
روغن بادام خشکی می نمود۔

ہر تدبیر لٹا کام کرتی ہے جس دوا کو تریاق سمجھا جاتا ہے وہی زہر کا اثر کرتی ہے اگر شفا طبیبوں، ڈاکٹروں کے قبضہ میں ہے تو ان کی بیوی بچے تو ہمیشہ مرض کے بعد ضرور صحت یاب ہو جاتا کریں کیونکہ اس موقع پر طبیب ڈاکٹر کبھی تدبیر میں کمی نہیں کر سکتا مگر مشاہدہ اس کے خلاف ہے پس مجبوراً ماننا پڑے گا کہ

درد از بار است و دریاں نیز ہم
ہر چہ می گویند آن بہتر ز حسن

اب تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ قرآن پڑھنا بھی مستقلاً ہمارا کام نہیں، اس کے محافظ تو ہم کیا ہوتے، تو اب یہ شخص حق تعالیٰ کا انعام ہے کہ وہ ہمارا نام ہی کرنا چاہتے ہیں ورنہ دراصل سب تفرقات وہ خود کرتے ہیں اگر اب بھی اس انعام کی طرف رغبت نہ ہو تو سخت مجرمی کی علامت ہے، یہ مضمون درمیان میں استطراداً ہو گیا اس امر پر تنبیہ کرنے کے لئے کہ قرآن کی حفاظت جو آپ کے سپرد کی گئی ہے تو آپ اس پر ناز نہ کریں خدا کو آپ کی ضرورت نہیں بلکہ آپ ہی کو خدا کی ضرورت ہے۔

بے معنی سمجھ قرآن کا فائدہ اب میں پھر مقصود کی طرف عود کرتا ہوں کہ قرآن پڑھنے کی فائدہ، کیونکہ ایک فائدہ تو یہی ہے کہ معانی کی حفاظت بدو لحاظ

الفاظ کے نہیں ہو سکتی، اور حفظ معانی کی ضرورت آپ کو بھی مسلم ہے۔ یہ جواب تو سائنس و عقل کے موافق ہے اور آجکل عقل و سائنس کی پرستش زیادہ ہے اس لئے یہ جواب تو تعلیم یافتہ جماعت پر زیادہ جوت ہے اور ایک جواب نقلی ہے جو دینداروں پر جوت ہے، جو نقل کے سامنے عقل کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قرآن کے ہر لفظ پر دس نیکیاں ملتی ہیں جس نے ایک بار زبان سے الحمد کہا اس کے نامہ اعمال میں اسی وقت پچاس نیکیاں لکھی گئیں۔ شاید عقل پرستوں کو یہ جواب پھیکا معلوم ہو، مگر صاحبو حقیقت میں بڑا قیمتی نفع ہے جس کی قدر کرنے کے بعد معلوم ہوگی جبکہ نیکیوں ہی کی پوچھ ہوگی اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کے پاس مکہ کے ہلالے اور نجدیاں بہت سی جمع ہوں اور سندوستان والے اس کا مضحکہ اڑائیں کہ اس کے کو جمع کرنے سے بچھے کیا نفع؟ وہ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ ہاں ابھی تو کچھ نفع معلوم ہوتا لیکن ایک خاص دن معلوم ہو جائیگا پھر یہ شخص اور اس کا مضحکہ اڑانے والے دونوں حج کو جائیں تو وہاں پہونچ کر منامہ برعکس ہوگا کہ اب وہ شخص جس کے پاس ہلالے اور نجدیاں جمع تھیں ان لوگوں کا مضحکہ اڑائے گا جن کے پاس سندوستانی تانبے کے پیسے بہت ہیں مگر مکہ کا سکھ کچھ نہیں تھا اور اب یہ لوگ اس کے سامنے شرمندہ ہوں گے۔

ایک دوسرا عالم بھی ہے صاحبو! اسی طرح ایک اور عالم آنے والا ہے جس کے بازار میں آپ کے ان سکوں کی کچھ قدر نہیں جو آپ آجکل جمع کر رہے ہیں نہ وہاں روپے کی قدر ہے نہ اشرفی کی نہ انٹرنس کی قدر ہے نہ بی، اے کی نہ ایل، ایل بی کی نہ سی، ایس، آئی کی، وہاں کا سکھ ہی نیکیاں ہیں جن کی آپ اس وقت قدر کر رہے ہیں، پس قرآن کے الفاظ کا دوسرا نفع یہ ہے کہ یہ آخرت کا سکھ ہے جس کی ایک سورت سے آخرت کے بشمار خزانے جمع ہو جائیں گے ہیں۔ جب آپ وہاں جا کر دیکھیں گے کہ ایک سورہ فاتحہ اور قل ہو اللہ سے اتنا بے شمار ثواب مل گیا تو بے ساختہ یوں کہیں گے کہ خود کہ باید این چنین بازار را کہ بیک گل می خری گلزار را مگر ابھی اس واسطے قدر نہیں کہ یہ بازار اس سکھ کا نہیں ہے یہاں یہ سکھ راج

نہیں لیکن آخر آپ مسلمان ہیں اور آخرت و قیامت کے آنے کا اعتقاد رکھتے ہیں پھر اس نفع کی بے قدری کس لئے ہے واللہ وہاں جا کر آپ افسوس کریں گے کہ ہائے ہم نے رات دن قرآن کی تلاوت کیوں نہ کی جو آج مالامال ہو جاتے اور اس وقت اپنے ان عذروں اور بہانوں پر افسوس ہو گا جو آج کل تحصیل قرآن میں کئے جاتے ہیں۔

مجھے دیندار طبقے کی بھی شکایت ہے کہ یہ طبقہ بھی تلاوت قرآن کا پوری طرح اہتمام نہیں کرتا۔ بعض یہ عذر کرتے ہیں کہ ہم کو فرصت نہیں ملتی طلبہ اور مدرسین کو زیادہ تر یہی عذر ہے مگر یہ محض لغو ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ دوستوں سے باتیں کرنے میں بہت وقت ضائع کر دیتے ہیں اس وقت ان کو کہاں سے فرصت مل جاتی ہے پھر افسوس ہے تلاوت قرآن کے لئے محوِ طر اس وقت نہیں دیا جاتا کہ

سہ قلق از سوزش پردانہ داری دے از سوز ما پردانہ داری۔

دوستوں کے راضی کرنے کا تو اتنا اہتمام اور خدا کے راضی کرنے کا مطلق اہتمام نہیں بتلائیے اگر خدا تعالیٰ آخرت میں یہ سوال فرمائیں کہ تم نے فلاں دن فلاں دوست سے ایک گھنٹہ تک باتیں بنائیں مجھ سے آدھ گھنٹہ بھی باتیں نہ کیں تو اس کا جواب کیا دو گے، بس سچا جواب تو یہ ہو گا کہ یوں کہہ دو کہ ہم کو (معاذ اللہ) خدا سے محبت نہیں اگر یہ کہہ دو تو پھر ہم آپ سے خطاب ہی نہ کریں گے لیکن آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے۔

کیونکہ آپ کو خدا تعالیٰ سے محبت ہے اس لئے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی محبت مومن ہیں اور مومن کی شان یہ ہے وَالَّذِينَ آمَنُوا اشْدَّ حُبًّا لِلَّهِ کہ جو لوگ ایماندار ہیں ان کو اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت ہے پس آپ کو اللہ تعالیٰ سے ضرور محبت ہے، اور ایسی محبت ہے کہ کسی سے بھی اتنی محبت نہیں بعض لوگوں کو شاید اس میں خلیان ہو کہ ہم کو تو بظاہر اپنی اولاد اور بیوی کے ساتھ محبت زیادہ معلوم ہوتی ہے، مگر یہ خیال صحیح نہیں اولاد اور بیوی کے ساتھ طبعی محبت ہے عقلی محبت نہیں اور طبعی محبت تو جانوروں کو بھی اپنی اولاد وغیرہ سے ہوتی ہے یہ کچھ کمال نہیں اور نہ خدا رسول کے ساتھ ایسی محبت مامور بہا ہے بلکہ محبت عقلیہ مامور بہا ہے جس کا منشا محبوب کا کمال ہوتا ہے، سو یہ محبت اللہ و رسول کیسا تھا

زیادہ ہے اور کسی کے ساتھ ان کے برابر نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے برابر صاحب کمال کوئی نہیں اور خدا تعالیٰ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کوئی صاحب کمال نہیں اس لئے آپ کے ساتھ بھی یقیناً بہ نسبت سب کے زیادہ محبت ہے مگر عقلی اور غور کر کے دیکھا جائے تو طبعی بھی مسلمانوں کو اللہ و رسول ہی سے زیادہ ہے، اور کسی کے ساتھ اتنی محبت نہیں مگر اس کا ظہور کسی محرک کے وقت پر ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک قصہ سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی ہمارے اطراف ایک واقعہ میں ایک بزرگ مولانا مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ گذرے ہیں جو تقویٰ کے اندر ہمارے اکابر میں مسلم و ممتاز تھے وہ ایک بار موضع گوتھی بجنہ میں تشریف لے گئے وہاں کے رئیس نے مولانا سے سوال کیا کہ حدیث میں آیا ہے

لَا يَوْمَ مِنْ أَحَدٍ كَحَقِّي يَكُونُ أَحَدًا وَرَسُولًا أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ نَفْسِهِ مَالَهُ وَلِلَّهِ أَجْعِلِينَ کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہ ہو گا جب اللہ و رسول اس کی جان و مال وغیرہ سب سے زیادہ اس کو محبوب نہ ہو جائیں مگر میں۔

دیکھتا ہوں کہ مجھے اپنے والد صاحب سے محبت زیادہ ہے۔ مولانا نے اس وقت تو اس کا ایک مناسب جواب دیدیا۔ پھر یہ چاہا کہ ان کے اس شبہ کو علمی طور پر دفع کر دیا جائے تو زیادہ اطمینان کا باعث ہو گا۔ چنانچہ آپ نے علمی طور پر اس کا جواب اس طرح دیا کہ تھوڑی دیر میں باتوں باتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ شروع کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ایسا ہے جس میں ہر مسلمان کو لطف آتا ہے،

سب لوگ شوق سے سننے لگے، اور وہ رئیس بھی بہت مزے لے لے کر سن رہے تھے جب مولانا نے دیکھا کہ رئیس صاحب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں بہت مزہ آرہا ہے تو درمیان میں حضور کا ذکر قطع کر کے فرمانے لگے کہ اچھا

خانصاحب اس ذکر کو تو رہے دیکھتے اب میں کچھ آپ کے والد ماجد کے کمالات و مناقب بیان کرتا ہوں کہ وہ بھی بڑے اچھے آدمی تھے وہ رئیس بولے، حضرت

توبہ تو یہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں میرے والد صاحب کا تذکرہ کہاں سے ٹھونس دیا۔ نہیں نہیں آپ حضور ہی کا تذکرہ کیجئے۔ میرے والد صاحب کے کمالات کو حضور ص سے کیا نسبت جو آپ درمیان میں خواہ مخواہ

ان کا ذکر کرنے لگے۔ میرے قلب کو اس سے بہت گرانی ہوئی۔ مولانا نے ہنس کر فرمایا کیوں خانصاحب، تم تو یہ کہتے تھے کہ مجھے اپنے والد کے ساتھ محبت زیادہ معلوم ہوتی ہے پھر حضور کے تذکرہ میں والد صاحب کا تذکرہ گراں کیوں ہوا خانصاحب سمجھ گئے کہ مولانا میرے شبہ کا علمی جواب دیا ہے۔ کہنے لگے۔ مولانا جزاک اللہ اب میرا شبہ جاتا رہا اور معلوم ہو گیا کہ الحمد للہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسی محبت ہے کہ والد کی محبت کو اس سے کچھ بھی محبت نہیں ہے۔

سہ جزاک اللہ کہ چشم باز کر دی مرا با جان جاں ہماز کر دی۔
تو صاحبو! موازنہ کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ واقعی اللہ و رسول کے برابر مسلمان کو کسی سے بھی محبت نہیں اور موازنہ ہوتا ہے کسی محرک کے پاس جانے پر، مثلاً فرض کرو کہ ایک شخص تمہارے ماں باپ کو گالی دے اور ایک شخص اللہ و رسول کی شان میں رمعاذ اللہ گستاخی کرے تو بتلاؤ کہ تم کو کس پر غصہ زیادہ آئیگا۔ یقیناً جس نے اللہ تعالیٰ اور رسول علیہ السلام کی شان میں گستاخی کی ہے اس پر زیادہ غصہ آئے گا اور تم آپ سے باہر ہو کر اس کی زبان نکالنے پر آمادہ ہو جاؤ۔ جب ہر مسلمان کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنی ذلت اور ماں باپ کی ذلت گوارا کر سکتا ہے مگر اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ذرا سی گستاخی کا تحمل نہیں کر سکتا تو اب مطمئن رہو کہ بحمد اللہ تم کو طبعی محبت بھی اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے زیادہ ہے۔ مگر اس کا ظہور کسی محرک کے پاس جانے پر ہوتا ہے۔ اور جب آپ کو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبت ہے تو اب اس کے کیا معنی کہ بدون سمجھے قرآن پڑھنے سے کیا فائدہ؟ صاحبو! اگر کوئی محبوب ایک مہل زبان تصنیف کر کے عاشق سے اس میں باتیں کرے تو عاشق اگر سچا عاشق ہے تو یقیناً اس کی قدر کرے گا اور وہ مہل زبان ہی اس نظر میں فصیح زبان سے زیادہ پیاری ہوگی۔ کیونکہ محبوب کی زبان ہے۔ اور قرآن تو مہل بھی نہیں بلکہ نہایت فصیح و بلیغ و عجیب شیریں زبان ہے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں وہ تو اس کی فصاحت اور بلاغت اور شیرینی کو سمجھتے ہیں۔

تراں ہیں مزہ مگر جو کہ نہیں سمجھتے ان کو بھی اس میں بہت مزہ آتا ہے

تجربہ کر کے دیکھ لو۔ اور جو لوگ تلاوت قرآن کے عادی ہیں وہ اس کا خوب تجربہ کئے ہوئے ہیں اور اگر کسی وقت کوئی خوش الحان قاری مل جائے تو ذرا اس سے قرآن سن کر دیکھ لو کہ بدون معنی سمجھ تم کو مزہ آتا ہے یا نہیں۔ واللہ بعض دفعہ نہ سمجھنے والوں کو بھی ایسا مزہ آتا ہے کہ دل پھٹ جاتا ہے۔ بس قرآن کی یہ حالت ہے سہ بہار عالم حنش دل و جاں تازہ می دارد۔

برنگ اصحاب صورت را بہار باب معنی را۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن پڑھنا گویا اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنا ہے پھر حیرت ہے کہ آپ عاشق ہو کر اپنے محبوب سے باتیں کرنا نہیں چاہتے حالانکہ محبت وہ چیز ہے کہ عاشق طرح طرح اس کے بہانے ڈھونڈا کرتا ہے کہ محبوب سے باتیں کرنے کا موقع ملے۔

حضرت سیدنا موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال ہوا تھا۔ وَمَا تِلْكَ بِمِیْنَتِكَ يَا مُوسٰی

اے موسیٰ تمہارے دلہنے ہاتھ میں کیل ہے اس کے جواب میں صرف اتنا کافی تھا کہ عصا کہدیے تم کو نہیں چونکہ ان کو محبت تھی تو اس وقت کو غنیمت سمجھا کہ محبوب سے باتیں کرنے کا موقع ملا ہے انہوں نے تفصیل کے ساتھ جواب دیا ہی عَصَايَ اَتَقِيكَ عَلَیْهَا وَاَهْشَأْ بِهَا عَلٰی غَنَمٰی۔ یہ میری لاکھی ہے میں اس پر سہارا لگا لیتا ہوں اور اس سے بکریوں کے لئے پے تھارتا ہوں کتنی طویل بات کی کہ ہی بڑھایا اول میں اور یا تم تکلم کا اضافہ کیا آخر میں۔ پھر اس لاکھی کے منافع و دجملوں میں بیان کئے اور اس کے بعد فرمایا وَلٰی فِیْہَا مَادِبٌ اُخْرِیْ کہ اس میں میرے اور بھی مقاصد ہیں یہ اس واسطے بڑھایا تاکہ آئندہ بھی کلام کی گنجائش رہے کہ شاید حضرت حق در یافت فرمادیں کہ ہاں صاحب وہ اور مقاصد کیا ہیں ذرا وہ بھی بیان کیجئے تو پھر اور باتیں کیونگا یا خود ہی عرض کریں کہ حضور اس وقت اس کی شرح نہ ہوتی تھی میں اب عرض کرنا چاہتا ہوں۔ عرض آئندہ باتیں کرنے کی گنجائش رکھ لی، یہ بات ابھی ذہن میں آئی۔ عرض عاشق کو محبوب سے باتیں کرنے میں عجیب مزہ آتا ہے اور یہ دولت مسلمانوں کو گھر بیٹھ ہر وقت نصیب ہے کہ وہ جب چاہیں اللہ تعالیٰ سے باتیں کر لیں یعنی

قرآن کی تلاوت کرنے لگیں۔

کلام اللہ پڑھنا پھر حیرت ہے کہ قرآن کے بدون سمجھ پڑھنے کو بے فائدہ بتلایا جائے کیا یہ فائدہ کچھ کم ہے۔ صاحبو!

یہ بڑی دولت ہے مگر اس کی قدر محبت والے جانتے ہیں پس محبت کی ضرورت ہے عشاق کی تو یہ حالت ہے کہ محبوب کا نام سننے میں بھی ان کو مزہ آتا ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے

الا فاسقنی خمرا و قتل لی ہی الخمر

ولا تسقنی سرامتی امکن الجمر

کچھ کو شراب پلا اور زبان سے یہ بھی کہتا رہ کہ شراب ہے شراب ہے آخر شراب منہ سے لگ جانے کے بعد اس کی کیا ضرورت ہے کہ نام لیا جائے اس کا یہی راز ہے کہ محبوب کا نام سننے میں مزہ آتا ہے۔ پھر غضب ہے کہ مسلمانوں کو خدا تعالیٰ کا نام سننے میں مزہ نہ آئے اور قرآن سے زیادہ خدا کا نام کس کتاب میں ہوگا ہر آیت میں قریب قریب بار بار خدا کا نام آتا ہے اور جا بجا خدا کی حمد و ثنا اس طرح کی گئی ہے کہ اس سے زیادہ کوئی کر نہیں سکتا اور گو ذکر اللہ کے اور طریقے بھی ہیں مگر نماز اور تلاوت سے زیادہ کوئی طریقہ بہتر نہیں۔ حدیث سے یہ بات تصریح کے ساتھ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے الفاظ کا اس قدر عشق تھا کہ آپ خود تلاوت کرتے ہی تھے ایک دفعہ آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ قرآن سناؤ انہوں نے عرض کیا اعلیک اقرأ علیک انزل او کما قال، کیا حضور کو میں سناؤں حالانکہ آپ ہی پڑھتا رہے فرمایا ہاں میں دوسرے کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی رضی اللہ عنہ سے یہ درخواست کیوں کی۔ حالانکہ سارا قرآن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حفظ تھا اور اس کے معنی بھی آپ کے ذہن میں حاضر تھے صرف اسی لئے کہ قرآن کے الفاظ سے آپ کو عشق تھا اور دوسرے کی زبان سے سننے میں بوجہ یکسوئی کے مزہ زیادہ آتا ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ صرف الفاظ قرآن بھی بدون لحاظ معنی کے مطلوب و مقصود ہیں صاحبو! اس سے بڑھ کر الفاظ قرآن کا نفع اور کیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ قرآن پڑھنے والے کی

قرأت کی طرف بہت توجہ فرماتے اور نہایت توجہ سے سنتے ہیں۔ اب غور کیجئے کہ اگر عاشق کو کسی مخبر سے یہ معلوم ہو جائے کہ محبوب تیرا گانا سن رہی ہے تو بتلائیے وہ کیسے مزے لے لیکر گائیگا اور کس طرح بنا سنوار کر پڑھے گا پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل اور اصدق کون مخبر ہوگا سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خبر دی ہے کہ حق تعالیٰ قرآن پڑھنے والے پر بہت متوجہ ہوتے ہیں اور نہایت توجہ سے اس کی قرأت سنتے ہیں اس سے بھی الفاظ کا مشہور ہونا ظاہر ہے کیونکہ قرأت اور استماع الفاظ ہی کے متعلق ہے نہ کہ معانی کے۔ اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہم کو قرآن پڑھتے ہوئے اس امر کا استحضار کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ ہماری قرأت کو سن رہے ہیں۔ اس مراقبہ کا یہ اثر ہوگا کہ نہایت احتیاط اور اہتمام کے ساتھ صحت کا لحاظ کر کے قرأت کی جائے گی اور بے پروائی کے ساتھ نہ پڑھا جائے گا۔

الفاظ بھی مقصود ہیں

دوسرے اچھا میں نے مانا کہ معنی ہی اصل مقصود ہیں مگر یہ کبھی نہ مانو نگا کہ معانی ہر وقت مقصود ہوتے ہیں بلکہ ایک وقت ایسا بھی ضرور ہونا چاہیے جس میں صرف الفاظ ہی مد نظر ہوں اور معانی پر التفات نہ ہو جیسا کہ ریاضی میں پہاڑے یاد کئے جاتے ہیں اس وقت مقصود پر اصل نظر نہیں ہو بلکہ صرف الفاظ ہی کو دیکھا جاتا ہے اور جیسے کھانا کھانے سے مقصود قوت ہے مگر کھانے کے وقت لذت پر بھی نظر ہوتی ہے صورت پر بھی نظر ہوتی ہے کہ روٹی چلی سوئی سیاہ نہ ہو، سالن میں منک مرچ بہت تیز یا کم نہ ہو اس وقت کوئی یہ نہیں کہتا کہ مقصود تو قوت ہے صورت اور لذت پر نظر کرنا بے فائدہ ہے۔ افسوس دنیا کی چیزوں میں تو صورت اور لذت پر نظر ہو اور قرآن میں یہ امور بے فائدہ ہو جائیں حیرت ہے اور تلاوت قرآن میں لذت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب کہ تلاوت کے وقت معانی کی طرف توجہ نہ ہو صرف الفاظ ہی پر توجہ ہو کیوں کہ وہ مراقبہ جو ابھی بیان ہوا کہ تلاوت کے وقت اپنے کو پڑھنے والا سمجھے اور حق تعالیٰ کو مکمل سمجھے اور اپنے کو مثل شجرہ طور کے حاکی اور ناقل سمجھے یہ مراقبہ صرف الفاظ ہی پر توجہ کرنے میں حاصل ہو سکتا ہے معانی پر توجہ کے ساتھ یہ مراقبہ نہیں ہو سکتا چاہے تجربہ کر کے دیکھ لو، اسی طرح یہ مراقبہ بھی کہ اللہ تعالیٰ ہماری تلاوت کو سن رہے

ہیں صرف توجہ علی الالفاظ سے حاصل ہوتا ہے۔ بدون اس کے نہیں ہو سکتا پھر الفاظ بدون فہم معانی کے بیکار کیوں ہوئے۔

دریا کی سیر صاحبو! دریا کی سطح کی سیر میں جولت ہے وہ سیر عمیق میں نہیں ہے گو سیر عمیق سے موتی ہاتھ لگتے ہیں جو سطح کی سیر سے حاصل نہیں ہوتے مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ سطح دریا کی سیر بیکار ہے۔ ہرگز نہیں اظہار سے پوچھو وہ سطح دریا کی سیر کو فرحت بخش بتلاتے اور کہتے ہیں کہ اس سے دل و دماغ کو سرور اور نگاہ کو تازگی و نور حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ مدقوق کے لئے سیر دریا اسی واسطے تجویز کی جاتی ہے کہ اس کو فرحت ہو اور فرحت سے طبیعت کو قوت حاصل ہو جس سے مرض کو وہ از خود دفع کر دے تو کیا سطح دریا کی سیر کو تو بیکار نہ کہا جائے اور سطح قرآن کی سیر کو بیکار کہا جاوے، کتنا بڑا ظلم ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ اصل مقصود تمام طاعات سے قرب حق ہے۔ حق تعالیٰ کے یہاں سے اولاً الفاظ آئے ہیں۔ اور معانی ان کے تابع ہو کر آتے ہیں۔

الفاظ قرآن پس الفاظ کو اللہ تعالیٰ سے قرب زیادہ ہوا اگر یہ الفاظ قرآن بے معنی بھی ہوتے تو عاشق کے لئے یہی کافی تھے کیونکہ محبوب اگر عاشق کو کوئی چیز دے تو وہاں دو لذتیں ہیں ایک لذت محبوب کے ہاتھ سے ملنے کی دوسری لذت اس چیز کے کھانے کی، اور ظاہر ہے کہ عاشق کے رقص کے لئے تو یہی لذت کافی ہے کہ اس کو محبوب کے ہاتھ سے یہ چیز ملی ہے چنانچہ بعض دفع اس چیز کو صرف بھی نہیں کیا جاتا بلکہ محبوب کی یاد گار سمجھ کر بطور تبرک کے رکھ لیا جاتا ہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو ایک قیرا دیا تھا انہوں نے اس کو خرچ نہیں کیا بلکہ اس کو ہمیشہ اپنے پاس ہی رکھا۔ پس عاشق کے لئے تو الفاظ قرآن ہی رقص کے واسطے کافی تھے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اولاً بالذات ہم کو ملے ہیں گواں میں معنی بھی نہ ہوتے۔ مگر معنی کے دو لذتیں جمع ہو گئیں تو اب کیونکر ہو سکتا ہے کہ لذت معانی سے لذت الفاظ کو چھوڑ دیا جائے بلکہ دونوں لذتیں قابل لحاظ ہیں اور الفاظ کی لذت اس جہت سے زیادہ قابل لحاظ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اولاً آئے ہیں گو باعتبار قصد کے معانی اصل ہیں۔ اور الفاظ ان کے تابع و غرض

بعض جہات سے ان الفاظ کو زیادہ قرب ہے اور بعض جہات سے معانی کو زیادہ قرب ہے اور کوئی ایک دوسرے سے معنی نہیں یہ میں نے اس لئے کہ دیا کہ ہمیں حفاظ خوش نہ ہوں کہ ہم سب سے افضل ہو گئے کیونکہ الفاظ کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ قرب ہے تو وہ ایک طرف فیصلہ کر کے خوش نہ ہوں میں ایک طرف فیصلہ کر کے ڈگری نہیں دیتا بلکہ دونوں جماعتوں کے لئے فیصلہ کرتا ہوں کہ بعض جہات سے اہل الفاظ افضل ہیں اور بعض جہات سے اہل معنی اور قرآن کی دونوں چیزیں قابل اہتمام ہیں صورت بھی اور معنی بھی کیونکہ ہر چیز کی طرف صورت و معنی دونوں ہی کی وجہ سے رغبت ہوتی ہے۔

سیر کے ساتھ صورت و نظر کا پلہ صورت کو کوئی بیکار نہیں کہہ سکتا دیکھتے بھری کے برابر ہے مگر صورت اور صفائی کی وجہ سے لوگ منگاتے ہیں کیونکہ صورت خوش دیکھ کر کسی چیز کا کھانا عجیب لطف دیتا ہے، اسی طرح کپڑوں میں ایک صورت ہے ایک معنی مقصود تو ستر عورت ہے اور گرمی و سردی سے بچنا اس میں ہر قسم کا کپڑا یکساں ہے، اور ایک صورت ہے یعنی کپڑے کی باریکی، نزاکت اور نقش و نگار وغیرہ، ظاہر ہے کہ صورت محض بیکار نہیں بلکہ اس کے لئے بھی بڑی کوشش کی جاتی ہے۔ اور دیکھئے عورت کی ایک صورت ہے اور ایک معنی، معنی تو ہمبستری اور خانہ داری کا کام لینا ہے اس مقصود کے لئے ہر عاقل بالغ عورت کافی ہے۔ اور ایک صورت ہے کہ رنگ بھی اجلا ہونا کہ نقشہ بھی خوبصورت ہونا ان کی بڑی ہوا اگر صورت بیکار ہے تو یہاں صورت پر کیوں مرتے ہو اور کیوں اس کے لئے خاک چھانی جاتی ہے اور اسی طرح ادویہ میں بہت چیزیں ایسی ہیں جو باہم یکساں خاصیت رکھتی ہیں مگر بعض دفعہ ادویہ کو صورت نوعیہ کی وجہ سے اختیار کیا جاتا ہے کیونکہ دوائیں بعض مؤثر بالخاصہ بھی ہوتی ہیں جیسے تعلیق کہہ رہے خفقاں کو نافع ہے تو ایسی ادویہ صورت نوعیہ کی وجہ سے مؤثر ہوتی ہیں یہاں صورت کا لحاظ کیوں کیا جاتا ہے۔ اسی طرح بہت سے الفاظ باہم متحد المعانی ہوتے ہیں مگر صورت کی وجہ سے ان میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ اس لئے بعض الفاظ انقباض و آداب

میں اپنی صورت کی وجہ سے مطلوب ہوتے ہیں اگر انکی جگہ دوسرے الفاظ ان ہی کے ہم معنی بولے جائیں تو سخت حماقت قرار دی جاتی ہے مثلاً کوئی باپ کو بر خوردار نور چشم لکھ تو پاگل شمار ہوگا حالانکہ اس کے معنی کچھ بھی برے نہیں بر خوردار بمعنی دام ظلم کے ہے۔ کہ ہمیشہ دنیا سے پھل کھاتے رہیں یا صاحب نصیب ہوں۔ اور نور چشم کے معنی ہیں آنکھ کی روشنی۔ تو باپ آنکھ اور کان سب ہی کا وسیلہ ہے یہ آنکھ کی روشنی بھی اولاد کو باپ ہی سے ملی ہے تو معنی تو برے نہیں مگر الفاظ کی صورت کی وجہ سے کاتب کو اخراج اور پاگل بنایا جاتا ہے معلوم ہوا کہ یہ دعویٰ غلط ہے کہ معنی ہی ہمیشہ مطلوب ہوتے ہیں اور الفاظ مطلوب نہیں ہوتے۔

اس سے بڑھ کر اور سینے۔ انسان کی ایک صورت صورت کی اہمیت ہے اور ایک معنی۔ چنانچہ معنی انسان روح انسانی ہے۔ جس کی بدولت آدمی گدھے کتوں سے ممتاز ہے تو اگر یہ دعویٰ مان بھی لیا جائے کہ صورت محض بیکار ہے تو ان مدعیوں کو چاہیے کہ اپنی اولاد کا گلا گھونٹ دبا کریں کیونکہ یہ تو محض صورت ہے اس کی کیا ضرورت ہے بلکہ مقصود تو معنی ہیں یعنی روح اور وہ گلا گھونٹنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے کیونکہ موت سے ارواح فنا نہیں ہوتیں تو کیا اس کو کوئی عاقل گوارہ کر سکتا ہے ہرگز نہیں، معلوم ہوا کہ معنی کی طرح صورت بھی مطلوب ہے پھر قرآن ہی میں اس کے خلاف یہ نیا قاعدہ کیوں جاری کیا جاتا ہے کہ اس کی صورت یعنی الفاظ بدون معنی کے بیکار ہے۔

﴿الحمد لله﴾ میں نے مختلف وجوہ سے مسئلہ کو ثابت کر دیا کہ الفاظ قرآن بدون فہم معنی کے بھی مطلوب ہیں اور ان کا پڑھنا ہرگز بیکار نہیں۔ اب یہ دعویٰ بالکل باطل ہو گیا کہ بدون معنی کے الفاظ پڑھنے سے کیا فائدہ۔

(الفاظ قرآن ص ۲۴ تا ص ۲۷ ملخصاً)

اب میں حروف مقطعات کا نکتہ بیان کرتا ہوں جو ان آیات کے شروع میں وارد ہیں ان سے بھی اپنا مدعی ثابت کروں گا جیسا کہ میں نے شروع میں وعدہ کیا تھا۔

حروف مقطعات میں بہت سے نکات ہیں۔ ایک نکتہ یہ ہے کہ یہ اسرار ہیں درمیان اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے معانی سے واقف تھے مگر دوسروں پر آپ نے ان کے معانی ظاہر نہیں فرمائے کیونکہ ان کا تعلق مجھے شریعہ عالیہ سے نہیں بلکہ دوسرے محکمہ سے ہے۔ ان اسرار کو اسی محکمہ کے آدمیوں پر ظاہر کیا جاتا ہے تو ممکن ہے کہ ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کو ان سے واقف کیا گیا ہو چونکہ امت کو اس محکمہ سے تعلق نہیں اس لئے ہم لوگوں کو ان اسرار پر مطلع نہیں کیا گیا۔ اینکرتہ میں نے درس میں ہی تقریر کی تھی اور اس وقت ایک کورٹ انسپکٹر موجود تھے وہ کہنے لگے آپ سچ کہتے ہیں واقعی ہر محکمہ کے خاص اسرار ہوتے ہیں جن سے دوسرے محکمہ والوں کو مطلع نہیں کیا جاتا۔ میں نے کہا آپ تو ایسی تصدیق کر رہے ہیں جیسے آپ پر بات گذری ہو کہنے لگے جی ہاں مجھے آجکل ہی یہ بات پیش آئی ہے، میں ایک دن سیرٹنڈنٹ کی کوٹھی پر گیا ہوا تھا ان کی میز پر ایک کتاب رکھی تھی میں اس کو دیکھنے لگا تو صاحب نے وہ کتاب میرے ہاتھ سے لے لی اور کہا یہ آپ کے دیکھنے کی نہیں ہے اس میں محکمہ خفیہ پولیس کے اسرار ہیں جن سے دوسرے محکمہ والوں کو مطلع نہیں کیا جاتا اور وہ اسرار کچھ اصطلاحات ہیں کہ سی، آئی، ڈی والے ان اصطلاحات میں ایک دوسرے کو تار کے ذریعے سے خبریں دیتے ہیں اور دوسرے لوگ ان اخبار پر مطلع نہیں ہوتے اس سے میرا بڑا جی خوش ہوا کہ حسیات میں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔

قرآن سے معنی کے ساتھ الفاظ بھی مقصود ہیں دوسرا نکتہ اس میں ابھی میرے ذہن میں آیا ہے وہ یہ کہ ممکن ہے کہ اس میں اس مضمون پر تنبیہ مقصود ہو کہ قرآن سے محض معانی مقصود نہیں بلکہ الفاظ بھی مقصود ہیں کیونکہ بعض الفاظ قرآن میں غیر معلوم المعنی ہیں اگر صرف معانی مقصود ہوتے تو قرآن میں ایسے الفاظ۔۔۔ کیوں ہوتے حالانکہ وہ جزو قرآن ہیں جن کی قرآنیت کا انکار کفر ہے۔

ایک نکتہ اس میں یہ ہے کہ حروف مقطعات میں احاد و عشرات و مآت کو جمع کیا گیا جس سے بعض اہل کشف نے بعض حوادث پر پیشین گوئی کے استدلال کئے ہیں جو ایک مستقل علم ہے اس کے علاوہ اور بہت سے نکات ہیں خلاصہ بیان

ہے کہ محض الفاظ مقصود سمجھو اور معانی کو بیکار نہ محض معنی کو مقصود سمجھو اور الفاظ کو بیکار بلکہ قرآن کے الفاظ و معانی دونوں مقصود ہیں۔ (ديضام۲)

(۴) فرشتوں سے سوال کہ میرے بندے کیا کر رہے ہیں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں نے ایک دفعہ ہمارے متعلق ایک بات کہی تھی جس سے اب تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑا سوان سے پوچھ کر یہ جتلاتے ہیں کہ دیکھو یہ وہی تو ہیں جن کے بارے میں تم نے ایسا کہا تھا فرشتوں کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا فرشتوں نے کہا تھا اَتَجْعَلُ فِيْهِمَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا کہ آپ زمین میں ایسے کو خلیفہ بناتے ہیں جو اس میں فساد کرے ”مَنْ“ سے مراد عام تھا کہ وہ سب ایسے ہی ہوں گے سو وہ موجبہ کلیہ کے مدعی تھے۔ پس سالبہ جزئیہ ان کے مقابلے میں کافی ہو گیا یعنی ایک ایسے شخص کا پیش کر دینا جو مطیع کامل ہو ان کے موجبہ کلیہ توڑنے کے لئے کافی ہے۔ یہ نہیں کہ سارے مطیع کا ہوں تب ہی ان کا جواب ہو سکے سو فرشتے ایک دفعہ ہم پر اعتراض کرنے سے پکڑے گئے آج تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑا جب کوئی موقع ہوتا ہے تو حق تعالیٰ جتلا دیتے ہیں اسی طرح فرشتوں کی بدلتی ہوتی ہے عصر اور صبح میں، جو فرشتے عصر کے وقت آئے تھے وہ صبح کے وقت رخصت ہوتے ہیں اور ان بجائے دوسرے فرشتے آتے ہیں پھر وہ عصر کے وقت چلے جاتے ہیں اور دوسرے آجاتے ہیں جب واپس ہو کر جاتے ہیں تو ان سے پوچھا جاتا ہے کہ ہمارے بندے کیا کر رہے تھے وہ عرض کرتے ہیں یا اہل جہنم گئے تھے جب بھی نماز پڑھ رہے تھے اور واپسی کے وقت بھی نماز پڑھتے چھوڑا۔ اللہ میاں دونوں وقت فرشتوں کو جتلا دیتے ہیں اور بدلتی بھی خاص اس وقت کرتے ہیں جو ہرگز کا وقت ہے اور اسی وقت کی حالت پوچھتے ہیں کہ میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑ کر آئے ہو حالانکہ فرشتے دیکھتے سب ہیں جو کچھ بندے کرتے ہیں کیونکہ ان کی شان ہے یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ مگر ان سے صرف اسی وقت کی حالت پوچھتے ہیں اور بلا پوچھے خود وہ کہہ نہیں سکتے۔ (الصَّلٰوة ۵۴)

(۵) لوح محفوظ کی وسعت پر شبہ کا جواب

ایک دفعہ ایک منکر غیبیات مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ لوح محفوظ کتنی بڑی مان لیجئے مگر کتنی تو ختم ہو جائے گی۔ ہزاروں لاکھوں برس ہو چکے بشمار چربیں پیدا ہوئیں اور فنا ہوئیں کہاں تک لوح محفوظ میں لکھا گیا ہوگا۔ مولانا نے فرمایا کہ تمہارا ذہن ہے یہ کبھی ختم نہیں ہوتا اس میں تم نے کتنی چیزیں بھری ہونگی مگر وہ ابھی تک خالی ہے تو لوح محفوظ تو ذہن سے بہت بڑی ہے۔ ہاں واقعی اتنے سے ذہن میں کس قدر گنجائش ہے کہ دلی، کلکتہ، زمین و آسمان سب کچھ سمایا ہوا ہے اگر حصول الاشیاء بانفسہا نہ مانئے تو باشباہہا کے قائل ہو جئے۔ تب بھی شبہ دلی کی دلی کے برابر تو ہوگی جیسا سوچنے سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ اسی ذہن پھٹا نہ سہی کہ اشیا یا اشباہ لطیف ہیں تب بھی اتنا بڑا آسمان اتنی بڑی زمین اتنی بڑی دلی، ذہن اتنا بڑا کہاں سے ہو گیا۔ تو لوح محفوظ میں تمام چیزوں کا سما جانا کیا مشکل ہے تو ذہن محض اس وسعت میں تو سب کا مشابہ لوح محفوظ کے ہے مگر علم صحیح سے خاص باعتبار علوم عالیہ کے بھی بالکل سچا نمونہ لوح محفوظ کا ہو جاتا ہے۔ (روح البحار ص ۹)

(۶) مرجانی کے بعد عذاب قبر روح پر ہوتا ہے یا جسم پر

بات یہ ہے کہ وہ روح ہے جس کے ساتھ یہ معاملہ کیا جاتا ہے رہا یہ کہ روح مجرد ہے یا مادی ہے بعض اہل کشف کا قول ہے کہ مجرد ہے اور بعض متکلمین اس طرف گئے ہیں کہ مادی ہے اور دلیل یہ بیان کی ہے کہ مجرد و خواص واجب سے ہے لیکن یہ دعویٰ خود بلا دلیل ہے بلکہ خواص واجب سے قدم اور وجوب ہے سو جو حکم مجردات کے قائل ہوئے ہیں وہ مجردات میں قدم بھی مانتے ہیں۔ یہ بیشک باطل ہے باقی اگر روح کو مجرد کہا جائے اور حادث بالذات و بالزمان بھی مانا جاوے تو کون سی دلیل عقلی کے خلاف ہے غرض بعض متکلمین تو سوائے واجب کسی چیز کے مجرد ہونے کے قائل نہیں۔ اور صوفیہ کرام کئی چیزوں کے مجرد کے قائل ہوئے ان کو لفظ کہتے ہیں۔ جیسے روح، قلب، سیر، خفی، وافی۔ اور کہتے ہیں کہ انسان جس طرح

عنصر مرکب ہے اسی طرح ان اجزاء مجرودہ سے بھی ہے اور اس پر یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ ہم نے خلوات اور مراقبات میں مجردات کا مشاہدہ کیا ہے سو جب تک قرآن و حدیث کے خلاف نہ ہو کیونکر اس کا انکار کر سکتے ہیں تو اگر روح مجرد ہے تو اس پر البتہ بیٹھنا صادق نہیں آتا۔ مگر صوفیہ اس کے قائل ہوئے ہیں کہ دوسرا بدن جو مشابہ اسی بدن عنصری کے ہوتا ہے عالم برزخ میں دیا جاتا ہے تو جس طرح یہ حی تھا وہ بھی حی ہے سب عذاب و ثواب اس پر ہوتا ہے اور اس بدن کی طرح اسے بھی حس ہوتی ہے کیونکہ اس کا مادہ لطیف ہوتا ہے۔ (روح النج والنجۃ ص ۱۳)

(۷) بارہ روح کا ثبوت قرآن مجید سے دینا صحیح نہیں

فرمایا منجمین یا حکما نہیں کسی شخص نے ان کو زمرہ محکما میں نہیں شمار کیا، حکماء وہ لوگ ہیں جنہیں حقائق و اصول اشیاء معلوم کر کے دلائل عقلی و براہین قطعی سے ثبوت دیا اور اہل نجوم محض تخمینات و توہمات و خرافات سے کام لیتے ہیں کسی دعویٰ پر دلیل قائم نہیں کر سکتے، محض واهیات و خرافات سے کام لیتے ہیں۔ دلائل تو دلائل دہائی بھی نور علی نور ہیں اور ہمارے بعض مفسر نے غضب ہی کیا ہے کہ بعض آیات کی تفسیر ان کے اقوال پر مبنی کر دی بعض اصطلاحات ایسے مشہور و معروف ہو جاتے ہیں کہ ان سے اصاغروا کا بر کوئی نہیں بچتا۔ الا ماشاء اللہ چنانچہ بعض مفسرین نے تو قرآن شریف میں بروح سے بارہ روح اہل ریاضی کے مراد لئے ہیں۔ حالانکہ وہ خود اجزاء تخنیلیہ ہیں موجود حقیقی نہیں۔ اور متبادر قرآن سے ان کا وجود حقیقی ہے پس بحیثیت تفسیر صحیح نہیں سیدھی تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے فرماتے ہیں کہ بروح سے مراد کواکب عظام ہیں۔ نہ معلوم کیا وجہ ہوئی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال کو چھوڑ کر اہل ریاضی کی تقلید قرآن مجید میں کی خود قرآن مجید میں دو کے مقام پر ہے ولو کنتم فی سبر ورج مشیدۃ اس سے عزیمت تا نید ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہوتی ہے۔ اور بعض نے ہیئات و نجوم دونوں کو مخلوط کر دیا یعنی ان بروح کے ساتھ خاص خاص کواکب کو نقص بھی کر دیا ہے جس کی بنا محض خرافات نجومیہ ہیں ورنہ اہل ہیئت بعض کواکب کو بعض بروح سے مختص نہیں سمجھتے۔ بلکہ ہر کواکب ہر برج

میں گردش کرتا ہے البتہ نجوم کہتے ہیں کہ بعض کواکب بعض بروح کے ساتھ مختص ہیں اور دلیل وہ پھر پوچھ کہ ناگفتہ بہ، کہتے ہیں کہ مثلاً ایک برج ہے جس میں کچھ کواکب ثابت جمع ہو کر بشکل اسد مہوم ہو گئے۔ اس طور سے اپنے خیال میں سوچا اس کا نام اصطلاحاً اسد رکھ دیا تھا۔ ان عقل کے دشمنوں نے یہ گھڑ لیا کہ اسد حار المزاج ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کواکب حار کو شمس سے مناسبت ہے۔ بھلا کیا محض نام سے اس برج میں حرارت آگئی، ان کی عقل کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ اس دلیل سے اسد کے ساتھ شمس کو مختص کر دیا۔ (از ملفوظات ہفت اختر ملفوظ نمبر ۱۲)

(۸) آیات کی تفسیر قواعد ہیئت پر ہے۔

فرمایا علماء اسلام کے کلام جو بعض نصوص متعلقہ کو ان کے قواعد ہیئت پر تطبیق پائی جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے بعضے۔۔۔ اقوال مشہورہ ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور ان الفاظ کے سنتے ہی تبادر ذہن کا ان معانی مصطلحہ کی جانب ہو جائے گو وہ لغتہً مراد نہ ہوں اس سے عام قلوب میں ان امور غیر ثابت بالدلیل کی وقعت ہو جاتی ہے پس نصوص کو بھی ان پر منطبق کرنے لگتے ہیں حالانکہ ان کے دعادی کی خود ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ چنانچہ کتب ہیئت میں مصرح ہے کہ شمس کو سہار ربع پر مانا جاتا ہے لیکن خود ہمارے پاس اس کی کوئی حجت نہیں۔ اسی طرح بعض نے ثوابت کو ہر ایک کو ہر ایک آسمان میں مانا ہے۔ ان احتمالات کے ہوتے ہوئے ان پر تفسیر قرآن کو مبنی کرنا محض غیر موجد ہے بلکہ ان سب کے خلاف ان نصوص کی تفسیر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سب کواکب و ثوابت و سیارہ و شمس و قمر سہار دنیا میں ہیں اور سب متحرک بالذات ہیں اور ہر ایک کی حرکت علیحدہ ہے اور ثوابت کی حرکت خواہ ذاتیہ اور متشابہ ہو یا آسمان دنیا کے اندر کوئی جزو ایسا ہو جو ان سب کو لے کر حرکت کرتا ہو اور سہار خواہ متحرک ہو یا نہ ہو۔ البتہ جن کواکب کی چند حرکتیں محسوس ہوتی ہیں ان میں سے کسی ایک حرکت کو بالعرض کہیں۔

قرآن شریف سے ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کواکب سہار پر دنیا پر ہیں اور یہ متحرک بالذات نہیں وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحٍ وَفَوَّارٍ مَّعَالٍ وَهُوَ

خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ط۔ اور کل فی فلک سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ہر کوکب جدا آسمان میں ہے کیونکہ فلک اور سماوات اور نہیں ہیں۔ فلک کہتے ہیں دائرہ کو اور بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوکب کی حرکت سے دائرہ ضرور پیدا ہوتا ہے خواہ حقیقی یا تقریبی اور شریعت سے حرکت سماوات ثابت نہیں بلکہ آسمان میں کوکب کی حرکت مثل چھلیوں کی حرکت کے پانی میں ہے اور جو حکما نے جو فلک کو بہت سخت صعب مان کر امتناع خرق والتیام کا حکم کیا ہے محض اپنے خیال سے گھڑ گھڑا کر باوجود عدم ثبوت مقدمات کے پھر حکم جازم کر دیا۔ چنانچہ متکلمین نے کتب کلامیہ میں ان مقدمات کا جواب دیا ہے۔ (ایضاً ملفوظ بہر ۱۰)

(۹) قرآن و حدیث کا جو مطلب کے علماء بیان کرتے ہیں

وہی درست ہے

اس شبہ کے اٹھانے کے لئے دوسری نظیر دیتا ہوں کہ قانون وہ ہے جو کہ پارلیمنٹ نے تجویز کیا ہے اور اس کے معنی وہ ہیں جو کہ جج سمجھتے ہیں کیونکہ آپ سے براہ راست تو خط و کتابت ہی نہیں جو وہ خود آپ سے اس کے معنی بیان کرتے بس جن لوگوں کو انہوں نے قانون فہمی کا اہل سمجھ کر عہدہ دیا ہے وہ جو معنی قانون کے بیان کریں اس کو ماننا پڑے گا کہ قانون کے درحقیقت یہی معنی ہیں۔

دیکھئے جب ایک ہائی کورٹ کا جج ایک فیصلہ دیتا ہے تو کیا اس وقت آپکا یہ کہنا قابل سماعت ہوگا کہ قانون کے یہ معنی نہیں جو تم نے سمجھے۔ ہرگز نہیں۔ اور اگر کوئی ایسا کرے کہ اس کے ساتھ گلنچ ہو اور حکم نہ مانے تو اس کو قانون کی مخالفت قرار دیا جائے گا اور اس کے لئے سزائے جیل تجویز ہوگی اگر اس وقت آپ یہ کہیں کہ صاحب آپ حکم ہی نہیں سمجھے قانون کے یہی معنی ہیں جو میں سمجھتا ہوں تو کیا آپ کے اس کہنے کی سماعت ہوگی؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ جواب ملے گا کہ تم اپیل کرو ماسود دیکھئے کہ ہائی کورٹ کے جج قانون سمجھنے والے تسلیم کر لئے گئے ہیں اور جو یہ قانون کے معنی بیان کریں اس کی مخالفت قانون ہی کی مخالفت قرار دی گئی ہے کیونکہ پارلیمنٹ

کے حکام ہر مقدمہ کا فیصلہ خود تو کرتے نہیں بلکہ وہ اصول کلیہ بنا دیتے ہیں اس لئے قانون کے سمجھنے والے ہائی کورٹ کے جج قرار دیے گئے ہیں تو ہر چند کہ ہائی کورٹ کی مخالفت کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ میں پارلیمنٹ کا خلاف نہیں کرتا۔ بلکہ جو یہ اس قانون کا معنی بیان کرتے ہیں اس کا خلاف کرتا ہوں۔ مگر اس کا یہ عذر نہ سنا جائے گا اور اس کو پارلیمنٹ ہی کا مخالف سمجھا جائے گا بس ایسے ہی حضرات ائمہ مجتہدین چونکہ قرآن و حدیث کے سمجھنے والے مان لئے گئے ہیں اس لئے ان کی مخالفت خدا اور رسول کی مخالفت ہے گو حدیثیں کسی شخص کو ان سے زیادہ معلوم ہوں مگر کثرت معلومات سے مجتہد نہیں ہو سکتا۔

شاہد آن نیست کہ موئے و میا نے دارد

بندہ طلعت آں باش کہ آنے دارد

مجتہدین کو حق تعالیٰ نے ایک خاص شان عطا فرمائی ہے۔ اب کوئی اللہ میاں سے لڑے کہ ان کے اندر یہ قابلیت کیوں رکھی اور ہمارے اندر کیوں نہیں رکھی تو یہ بات ہم سے پوچھنے کی نہیں خدا سے تعالیٰ سے پوچھئے، پھر یہ بھی پوچھ لینا کہ انبیاء کو نبوت دی گئی کیوں نہیں تھی ایک وہ نظم ہے کہ فلاں کو دی پیغمبری:۔

”میری باریکیوں دیر اتنی کری“

اول نظم سے آخر تک خدا کی شکایت ہے تو اگر ایسی ترقی ہے تو خدا خیر کرے ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ

آ نکس کہ تو نگرمت نمی گرداند اومصلحت تو از تو بہتر داند۔

غرض یہ کہ خدا تعالیٰ نے مجتہدین میں ایک کمال پیدا کیا ہے، جو ہم لوگوں میں نہیں ہے اور اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اس وقت قرآن سے تم چند ایسی جہتات استنباط کرو جن کا حکم فقہاء کے کلام میں نہ دیکھا ہو پھر اول معاملات میں فقہاء کا قول دیکھو اور اپنے استنباط کو ان کے استنباط کے ساتھ موازنہ کر دو تب معلوم ہوگا کہ فقہاء اور مجتہدین کی شان کیا ہے مگر اس کے لئے بھی ضرورت ہے کہ سوایسا کرنے پر بہت آسانی سے فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ ہم میں اور ائمہ مجتہدین میں کتنا بڑا فرق ہے پس اس تفاوت کی وجہ سے عوام کی تو ایسی مثال ہے جیسے عام رعیت اور علماء

کی ایسی مثال ہے جیسے وکلاء اور ائمہ مجتہدین، جیسے ہائی کورٹ کے جج پس جب ایک رعیت کو ہائی کورٹ کے جج بلکہ ایک معمولی جج کی مخالفت جائز نہیں تو عوام کو علماء کی مخالفت کب جائز ہوگی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مولویوں سے غلطی نہیں ہوتی بلکہ ہو جاتی ہے مگر اس کا پکڑنا عوام کا کام نہیں ہے بلکہ علماء ہی کا کام ہے اور جب تک کہ ایک متدین عالم کا فتویٰ بلا تعارض موجود ہے۔ عامی کے ذمہ واجب ہے کہ اس کا اتباع کرے تو اب اس کے کہنے کی کہاں گنجائش رہی کہ میں تو علماء کی مخالفت کرتا ہوں خدا اور رسول کی مخالفت نہیں کرتا۔ پس معلوم ہوا کہ علماء کی مخالفت کسی طرح جائز نہیں حتیٰ کہ اگر آپ کے سامنے ترجمہ حدیث کا موجود ہو جب بھی آپ کو علماء کی مخالفت جائز نہیں کیونکہ ترجمہ سمجھنے کے لئے بھی علم کی ضرورت ہے جسے کہ قانون کا ترجمہ ہو گیا ہے مگر پھر بھی کوئی شخص جج کی مخالفت میں اپنی رائے نہیں پیش کر سکتا گو وہ کسی کتاب کے پیش کرنے کے ساتھ ہو اور اگر کرے تو اب بھی اس کا وہی حال ہوگا جو قانون کے ترجمہ ہونے کی حالت میں ہوتا یعنی قانون کا مخالفت قرار دیا جائے گا۔ تو اسی طرح اگرچہ حدیث کا ترجمہ ہو گیا ہے مگر پھر بھی آپ کو اجتہاد کرنا اور علماء سے مزاحمت جائز نہیں اور جس طرح حکام کی مخالفت کرنا اور واقع میں گورنمنٹ کی مخالفت کرنا ہوتا ہے اسی طرح علماء کی مخالفت کرنا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے مخالفت کرنا ہے اور علماء کی مخالفت کر کے یہ عذر کرنا کہ ہم خدا اور رسول کے خلاف نہیں کرتے، نہایت نازیبا اور پھر عذر ہے۔

الحمد للہ امر بہت خوبی کے ساتھ طے ہو گیا اور آپ کو معلوم ہو گیا **علامہ کی پیروی** کہ آپ کو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ علماء کا اتباع کریں میں کہتا ہوں کہ آپ کو علم دین سے اتنی بھی مناسبت نہیں جتنی کہ ہر شخص کو طب کے ساتھ ہوتی ہے۔ چونکہ طب سے تو ہر ایک شخص کو کم و بیش مناسبت ہوتی ہے اور تجربہ بھی ہوتا ہے۔ برخلاف علم دین کے کہ وہاں کسی تجربہ کام نہیں دیتا تو جتنی طب کے ساتھ مناسبت ہے اتنی بھی دینیات کے ساتھ نہیں مگر باوجود اس کے کہ کتنا بڑا کوئی شخص ہو۔ مگر جب بیمار ہوگا طبیب ہی سے رائے لے گا۔ کبھی طب کی کتابیں دیکھ کر سہل نہ لے گا اگر یہ بھی معلوم ہو جائے کہ صفر کا فساد ہے جب بھی اپنی

رائے سے علاج نہیں کرے گا۔ لیکن کسی نے ایسا کیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس کی ہمت نہیں ہوتی اگر کوئی یہ رائے دے بھی کہ طبیب کی کیا ضرورت ہے تو نہ کہیں گے کہ بغیر طبیب کے علاج نہیں ہونا چاہیے۔ اپنی عقل اور رائے سے خدا جانے کیا خرابی پیدا ہو۔ اس کے راز سے طبیب ہی واقف ہیں۔ پس طب میں تو باوجود مناسبت ہونے کے اپنی رائے کا اعتبار نہیں ہوتا۔ مگر علم دین میں باوجود مناسبت نہ ہونے کے ہر شخص اجتہاد کرنے لگتا ہے تو گویا شریعت کوئی راز ہی نہیں ہے اور وہ ایسی یا مال اور معمولی شئی ہے کہ اس کے لئے علم کی ضرورت ہی نہیں کہ ہر شخص خود اس کو سمجھ سکتا ہے حالانکہ جیسے وہاں کوئی کیسا ہی عاقل سے عاقل ہو۔ مگر بدو و اتباع طبیب کے چارہ نہیں اسی طرح امور شریعت میں سوائے اتباع علماء دین کے چارہ نہیں۔ خلاصہ یہ کہ غیر ماہر کو ماہر کا اتباع کرنا ضروری ہے پس عقلی طور پر ثابت ہو گیا کہ علماء کا اتباع آپ کو ضروری ہے اور وہ جو احکام بتلاتے ہیں۔ وہ درحقیقت خدا اور رسول کے احکام ہیں پس جب یہ خدا اور رسول کے احکام ہیں تو ہر مسلمان کو ان کا اتباع کرنا چاہیے۔ کیونکہ مسلمانوں کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے خدا اور رسول کا اتباع کرنا ضروری ہے۔ (اتباع المنیب ص ۱۴)

طاعون میں اعمال کی خرابی

آج کل تو اس مذاق ہی کے لوگ کم ہیں جو ان مصائب کو اعمال کی خرابی کی منسوب کریں، بلکہ بہت لوگ ان کو اسباب مادیہ کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ ہوا بگڑ گئی اس سے طاعون ہو گیا۔ میں اس کا انکار نہیں کرتا کہ طاعون میں ہوا بگڑنے کو دخل نہیں ممکن ہے کہ اس کو بھی دخل ہو مگر میں یہ کہتا ہوں کہ آپ شریعت کے بتلائے ہوئے سبب کا کیوں انکار کرتے ہیں کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک چیز کے متعدد اسباب ہوں۔ ایک سبب قریب ہو ایک سبب بعید۔ ایک سبب ظاہری ہو ایک سبب حقیقی ہو آپ کہتے ہیں ہوا بگڑنے سے طاعون ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ ظاہری سبب ہے۔ حقیقی سبب اس کا یہ ہے کہ آپ نے گناہوں کی کثرت کی اس کا انکار آپ کس دلیل سے کرتے ہیں۔ میں اس مقصود کے واضح کرنے کے لئے ایک مثال بیان کرتا ہوں اس سے آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ ظاہری سبب اور حقیقی سبب میں کیا فرق ہے۔

مثلاً ایک شخص کو پھانسی ہوگئی اور وہ مر گیا اب دو شخصوں میں گفتگو ہوتی کہ اس کی پھانسی کا سبب کیا ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ صرف اس کا سبب یہ ہے کہ وہ کسی طرح سے تختہ کے اوپر پہنچ گیا اور رشتہ بھی پھندا اس کے گلے میں پڑ گیا پھر کسی طرح تختہ اس کے نیچے سے الگ ہو گیا تو اس کا گلا گھٹ گیا اور مر گیا۔ ایک دوسرے شخص نے کہا کہ اس پھانسی کا سبب یہ ہے کہ اس نے ایک جرم کیا تھا۔ اس وجہ سے اس پر حاکم نے ناراض ہو کر پھانسی دلوادی۔ تو کیا اس پر وہ پہلا شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ تم سائنس کے منکر ہو کہ اس کی موت کا سبب تو اخلاق (یعنی گلا گھٹ جانا) اور تم جرم کو اس کا سبب بتلاتے ہو کیا اس جرم نے اگر اس کا گلا گھونٹ دیا۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ اعتراض کبھی نہیں کر سکتا اور اگر کوئی احمق یہ اعتراض کرے بھی تو تمام مخلوق اس کو پاگل بنائے گی اور یہ کہے گی کہ تیرا یہ کہنا صحیح ہے کہ موت کا سبب اخلاق ہے مگر اس کا اصلی سبب تو حاکم کا حکم ہے اور اس حکم کا سبب اس کا جرم ہے۔

غرض اس اختلاف میں ہر عاقل یہی کہے گا کہ وہ شخص سچا حق پر ہے جو یہ کہتا ہے کہ اس سبب طبعی کا سبب خود اس کا فعل ہے ورنہ پھانسی تو پہلے سے بھی موجود تھی۔ پہلے سے وہ کیوں نہ مر گیا۔ اور اب بھی موجود ہے پھر اس سے روزانہ موتیں کیوں نہیں ہوتیں۔ تو صاحبو! غضب کی بات ہے کہ اس شخص کو تو محقق سمجھا جاوے کہ علماء کو جو کہ طاعون کا سبب آپ کے گناہوں اور افعال کی خرابی کو بتلاتے ہیں۔ غیر محقق کہا جاوے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ جس کو کوتاہ نظر کہا جاتا ہے اسی کی نظر کو دوسری جگہ عالی نظر کہا جاتا ہے۔ غضب ہے کہ دین ہی کے موقع پر سب لوگ بیہوش ہو جاتے ہیں۔

اس پر مجھے ایک دوست کی بیان کی ہوئی حکایت یاد آئی۔

ایک حکایت

ہے کہ انہوں نے لاہور کے پاگل خانے میں ایک مجنون کو دیکھا کہ وہ سبب باتیں ٹھکانے کی کرتا تھا جس سے کسی کو بھی نہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ پاگل ہے مگر جہاں اس کا نام اس کے سامنے لیا گیا اسپر جنون سوار ہوا۔ یہی حالت آجکل ہمارے بھائیوں کی ہے کہ جب تک ان کے سامنے دین کا نام نہ لو تو عاقل بھی سمجھا رہے ہیں مگر جہاں دین کا نام کسی نے لیا اور وہ کوتاہ نظر ہوا۔ صاحبو!

آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جو شخص پھانسی کا سبب ڈیکتی بتلاتا ہے اس کو تو تم عاقل کہتے ہو اور اسی کی نظر وہ عالم شریعت ہے جو طاعون کا سبب آپ کی بد عملی کو بتاتا ہے یہ شخص عالی نظریوں نہیں جو نیکہ دین کا معاملہ ہے اس لئے اس میں علماء کو کوتاہ نظر سمجھا جاتا ہے اور اس شخص کو عالی نظر سمجھا جاتا ہے جو جراثیم و طاعون کا سبب بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اچھا ہم نے مانا کہ طاعون کا سبب آب و ہوا کا خراب ہونا ہی سہی لیکن یہ تو بتاؤ کہ آب و ہوا کے خراب ہونے کا سبب کیا ہے اگر اس کا کوئی بھی سبب ہے تو پھر اس کا کیا سبب ہے کیونکہ ہر حادثہ کی انتہا ایک قدم پر ضروری ہے تو اس کی انتہا بھی قدیم ہوگی اور قدیم پر انتہا نہ مانو تو تسلسل لازم آئے گا کیونکہ ہر حادثہ علت اور سبب کا محتاج ہوتا ہے اور تسلسل محال ہے تو منتہا ہونا ضروری ہے اور منتہا ہونے کے قابل سوائے مشیت الہی کے اور کوئی چیز نہیں تو جس طرح حاکم نے پھانسی کا حکم دیا تھا جس سے مجرم ہلاک ہوا اسی طرح حق تعالیٰ نے کارکنانِ قصار و قدر کو حکم دیا کہ آب و ہوا کو خراب کر دو۔ انہوں نے آب و ہوا کو خراب کر دی جس سے جو ہے مرنے لگے اور طاعون پھیل گیا۔ اب جیسا کہ وہاں ایک سچے مخبر کی ضرورت ہے جو یہ بتلا دے کہ چونکہ اس شخص نے جرم کیا تھا۔ اس وجہ سے حاکم نے پھانسی کا حکم دیا اسی طرح یہاں بھی ایک سچے مخبر کی ضرورت ہے جو یہ بتلا دے کہ گناہوں کی وجہ سے یہ بلائیں نازل ہوئی ہیں۔ تو سنو! وہ سچا صوفی قرآن ہے جس میں حق تعالیٰ کا ارشاد موجود ہے۔ وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِيمَا كَسَبَتْ وَيعْفُو عَنْ كَثِيرٍ کہ تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تمہارے ہاتھوں کی گرفت سے پہنچتی ہے اور حق تعالیٰ بہت سے گناہوں سے درگزر بھی کرتا ہے پس یہ کیوں نہ کہا جاوے کہ سبب اس طاعون کا ہماری بد عملی اور سیہ کاری ہے (الاسراف ص ۷)

(۱۱) مصیبت اگر گناہوں کی وجہ سے آتی ہے تو کفار پر آنی چاہیے

مصائب کا سبب جیسا کہ گناہ ہے اسی طرح رفع درجات بھی اس کا سبب ہے بعض دفعہ امتحان اور آزمائش کے لئے اور درجات بلند کرنے کے لئے بھی بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ سنئے! حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اَمْحَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمْ يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِي خَلَقَ مِنْ قَبْلِكُمْ مَمْسُكِي الْبِاسَاءِ وَالضَّرَاءِ وَرَزَقْنَاهُنَّ حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصُرُ اللهَ اَلَا اَنْ نَصُرَ اللهَ قَرِيبٌ ط (۱۱۱)

ترجمہ :- کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ جنت میں دیسے ہی داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک وہ حالت پیش نہیں آئی ہے جو پہلے لوگوں کو پیش آچکی ہے کہ ان کو لڑائی اور تکلیف پہنچی اور وہ یہاں تک جھڑ جھڑائے گئے کہ رسول اور ان کے ساتھ والے مسلمان کہنے لگے کہ دیکھئے اللہ کی مدد کب آتی ہے تو سن لو اللہ کی مدد قریب ہی ہے۔

ایک جگہ فرماتے ہیں۔ حَتَّى اِذَا اسْتَيْسَسَ الرَّسُولُ وَظَنُوا اَنْهُمْ قَدْ كَذَبُوا جَاءَهُمْ نَصْرٌ اَنْفَجَى مِنْ فِئَةٍ وَاَلَا يَرُدُّ بَأْسَهُنَّ الْقَوْمُ الْمَجْرِمِينَ۔

ترجمہ :- یہاں تک کہ جب رسول ناامید ہو گئے اور کفار نے گمان کیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا اس وقت ہماری مدد آئی تو جن کو ہم نے جن کو چاہا ان کو نجات دی گئی اور باقی لوگ ہلاک کئے گئے اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے ٹل نہیں سکتا۔

ان آیتوں سے حاصل مشترک اتنا ثابت ہوا کہ پہلے زمانے میں حضرات مقبولین پر اور ان سے بڑھ کر رسولوں کا طبقہ ہے جن میں مصیبت کا احتمال ہی نہیں ان پر ایسے ایسے مصائب آئے کہ رسول گھبرا کر کہنے لگے مَتَى نَصُرُ اللهَ کہ خدا کی مدد کب آئے گی حتیٰ اِذَا اسْتَيْسَسَ الرَّسُولُ اِی من ایمان قوم مہم۔ یہاں تک کہ رسول اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو گئے اور انبیاء علیہم السلام کی یہ حالت نہ تھی کہ ایک وعظ کہہ کر جو دیکھا کہ لوگ جنید بغدادی نہیں ہوتے تو ان کی اصلاح سے ناامید ہو جائیں بلکہ حالت یہ تھی کہ ایک مدت مدید تک وعظ کہہ کر بھی ناامید نہ ہوتے تھے۔ نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کو نصیحت کی اور ناامید نہ ہوئے۔ جب اتنی مدت میں بھی ان پر

کچھ اثر نہ ہوا تب ان کے ایمان سے مایوس ہوئے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کتنی مدت دراز تک اپنی قوم سے مایوس نہ ہوتے تھے تو اتنی طویل مدت کے بعد نصرت خداوندی نازل ہوتی تھی اور اس وقت تک انبیاء اور مومنین مصیبتیں ہی جھیلتے تھے وظنوا انہم قَدْ كَذَبُوا کی تفسیر میں بہت اقوال ہیں اور بعض سخت اور مشکل ہیں مگر سہل یہ ہے کہ ظنوا کی ضمیمہ کفار کی طرف راجع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار نے یہ کہا کہ ہم مکذوب ہیں یعنی رسولوں نے جو ہم کو عذاب کی دھمکی دی ہے وہ جھوٹ بات ہے اگر سچی ہوتی تو اس مدت دراز میں عذاب کے کچھ تو آثار معلوم ہوتے۔

غرض ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور پہلے انبیاء پر مصائب مقبولین ایک مدت تک ”مستم الباساء والضراء“ کی حالت میں اور ایسی ایسی بڑی مصیبتوں میں رہے کہ ایسی مصیبتیں ہم لوگوں کو کبھی پیش بھی نہیں آتیں مگر آج ترکوں کی ذرا سی حالت میں لوگوں کو خدا تعالیٰ سے بدگمانی ہونے لگی۔ یاد رکھو! خدا تعالیٰ پر کبھی کسی کو بدگمانی کا حق نہیں۔ ان کی حکمتوں کے راز کسی کو کیا معلوم۔ آپ اپنے خاندان کی معاملات کے راز اپنے نوکروں کو نہیں بتلاتے تھے حالانکہ آپ میں اور ان میں بہت تقارب ہے مگر اس کے باوجود بھی اپنا بھید آپ نوکروں کو نہیں بتلاتے تو خدا کیوں آپ کو اپنے معاملات کے راز بتلا دیں آپ میں اور خدا میں تو کچھ بھی مناسبت نہیں ہے چہ نسبت خاک را با عالم پاک، اسی کو حافظ فرماتے ہیں۔

حدیث مطرب دی گو در راز دہر مکتومی جو کہ کس نکشود نکشاید حکمت اس معمار

بہر حال حق تعالیٰ کی حکمتیں ہیں جن کی وجہ سے مقبولین پر بھی وہ مصائب نازل کرتے ہیں۔

جان صدیق! ازیں حسرت یحیت کا سماں برفرق ایشاں خاک بخت
زاں بلا ہا کا نبیاء برداشتند سرچرخ ہفتیں افراشتند۔

یہ جس زمانے میں یہ وعظ ہوا تھا اس زمانے میں ترکی جنگ کفار سے جاری تھی۔ بعض دفعہ بہت متوحش خبریں آتی تھیں کہ ترک مغلوب ہو گئے۔ ۱۲ محمد علی

درجات کی بلندی یہ گویا رفع درجات ہے ان بلاؤں سے مقبولین کے درجے بلند ہوتے ہیں، نیز اس میں مجاہدہ اضطرابیہ بھی ہے کہ مصائب سے اخلاق درست ہو جاتے ہیں نفس کی اصلاح بہت کچھ ہو جاتی ہے۔ جب ہم لوگوں کو اپنے نفس کی اصلاح اور درستگی اخلاق کی خود فکر نہیں ہوتی تو حق تعالیٰ مجاہدہ اضطرابیہ سے ہماری اصلاح فرماتے ہیں۔ آپ ان شکستوں کی خبروں سے یہ سمجھتے ہیں کہ ترک مغلوب ہو گئے مگر آپ کو کیا معلوم ہے کہ اس سے جو ان کی نفس کی اصلاح ہوتی ہوگی وہ کتنی فتوحات کا پیش خیمہ ہوگی ہی حال طاعون میں سمجھنا چاہیے کہ مسلمانوں میں طاعون کا زیادہ پھیلنا اس کی دلیل نہیں ہو سکتا ہے کہ معاذ اللہ مسلمان خدا تعالیٰ کے نزدیک ان کافروں سے بھی زیادہ ذلیل ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ کبھی مسلمانوں کے درجے بلند کرنے اور ان کو شہادت کے مرتبے دینے منظور ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں طاعون زیادہ پھیلتا ہے۔ حدیث میں صاف تصریح ہے المطعون شہید یعنی طاعون میں مرنے والا شہید ہے اسی لئے جو لوگ اس راز کو سمجھتے ہیں وہ ہر بلا سے خوش ہوتے ہیں نہ وہ شکست دہزیمت سے گھبراتے ہیں نہ طاعون سے پریشان ہوتے ہیں اور یوں کہتے ہیں۔

ناخوش تو خوش بود بجان من۔

دل فدائے یار دل رنجان من۔

اور دوسروں کو بھی اسی کی وصیت کرتے ہیں کہ محبوب حقیقی سے راحت میں اور رنج میں غرض ہر حال میں خوش رہنا چاہیے۔

سے بس زبون و سوسرہ باشی ولا : گر طر رہا بازوانی از بلا۔

یعنی دونوں حالتوں میں کچھ فرق نہ ہونا چاہیے یہ سمجھ کر کہ ہر حالت محبوب ہی کی طرف سے ہے دونوں پر راضی رہنا چاہیے تو خواہ کلفت ظاہری ہو یا باطنی وہ ہر ایک پر راضی رہتے ہیں اور باطنی کلفت پر راضی رہنا بہت بڑا صبر ہے کیونکہ ظاہری کلفت میں صرف جسم کو تکلیف ہوتی ہے روح کو بشارت رہتی ہے اور باطنی کلفت میں یہ دم ہو جاتا ہے کہ میں مردود ہو گیا جیسا کہ حالت قبض میں ایسا ہوتا ہے اور یہ خیال سالک کے لئے سخت سوبان روح ہے مگر وہ اس پر بھی راضی رہتے ہیں۔

باغبان گر پنج روزے سجت گل بایش برجائے خار ہر جا صبر بلبل بایش

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال مرع ز یک چوں بدم افتد تحمل بایش
آکے اسی کی تیمم کے لئے کہتے ہیں

تکیہ بر تقویٰ و دانش در طریقت کافرست

راہروگر صد ہنزدار د، توکل بایش

یہ اسی لئے کہا ہے کہ کبھی ذکر کو یہ خیال ہو جاتا ہے کہ میں اتنا کام کرتا ہوں اتنا مجاہد کرتا ہوں پھر یہ پریشانی کیوں ہے تو کہتے ہیں۔

راہروگر صد ہنزدار د توکل بایش، (الاسراف ص ۱۴۱)

خلاصہ یہ ہے کہ مقبولین پر بھی کلفتیں آتی ہیں ظاہر پرستوں کو اس سے شبہ ہو جاتا ہے کہ اگر گناہوں کی وجہ سے مصیبتیں آتی ہیں تو انہوں نے کیا گناہ تھا بلکہ دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ نیک بندے اور مقبولین کو فقر و فاقہ وغیرہ کی تکلیف زیادہ رہتی ہے اور زندہ بازاری لوگ ہر طرح عیش اور مزے میں زندگی گزارتے ہیں یعنی ظاہری عیش ان کو زیادہ ہوتا ہے کھانے پینے میں تنگی نہیں ہوتی مگر یہ شبہ لغو ہے کیونکہ دنیا میں عادی اللہ یہ ہے کہ سب نعمتیں ایک شخص کو نہیں دی جاتی کسی کو ظاہری عیش نصیب ہوتا ہے کسی کو باطنی عیش عطا فرماتے ہیں ایسے بندے بہت کم ہیں جن کو دونوں عیش نصیب ہوں اسی کو ایک محقق کہتے ہیں۔

سے کم عاقل عاقل اعیت مذاہب : و جاہل جاہل تلقاہ من وقتا

هذا الذی تترك الا وهام حائرة : و صیر العالم الخیر زندیقنا

خوشحالی و بدحالی یعنی دنیا میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض عاقل کامل تنگی میں ہیں کہ ان کو کوئی ذریعہ معاش میسر نہیں، اور جاہل کامل صاحب نصیب اور وسعت رزق سے مالا مال ہے۔ اس بات نے عقلوں کو حیران کر دیا۔ اور بعض متبحر عالم اس سے زندق ہو گئے۔ نعوذ باللہ من ذلک،

ایک واقعہ سو یہ مسئلہ ایسا باریک ہے کہ اس سے ہزاروں عالم بدین ہو گئے مگر جس کو خدا چاہے وہ بچ سکتا ہے۔ اس بچنے پر مجھے ایک حکایت یاد آگئی کہ ایک درویش تھے جو چلے جا رہے تھے ایک شہر میں پہنچے تو وہاں پھاٹک بند دیکھا۔ پوچھا کہ بھائی پھاٹک بند کیوں ہے۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ کا

باز چھوٹ گیا ہے۔ اس نے حکم دیا کہ شہر بپاہ کے دروازے بند کر دیے جائیں تاکہ باز باہر نہ چلا جائے۔ درویش کو بادشاہ کی حماقت پر بہت تعجب ہوا۔ یہ ناز میں آکر کہنے لگے کہ واہ اللہ میاں نے اچھے کو بادشاہی دے رکھی ہے۔ ایک ہم ہیں کہ پاؤں میں جھتیاں تک الم نہیں۔ بعض اہل اللہ پر ناز کی شان غالب ہوتی ہے۔ وہاں سے ارشاد ہوا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ اس کی سلطنت مع اس کی حماقت کے تم کو دیں، اور تمہاری صلاحیت اور عقل مع تمہارے فقر و فاقہ کے اس کو دیدیں۔ درویش ڈر گیا اور کانپ گیا کہ کہیں..... ساری عمر کی کمائی سلب نہ ہو جائے۔ اللہ میں اس پر راضی نہیں ہوں میں اپنی حماقت سے توبہ کرتا ہوں۔

سو واقعی عقل وہ دولت ہے جس کے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت گر دے اگر ایک عاقل تنگ دست ہو اور ایک بیوقوف مالدار ہو تو عاقل کو غور کرنا چاہیے کہ میرے پاس عقل کی کتنی بڑی دولت ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۹۷)

عقل کا تبادلہ دولت سے الغرض ان درویش کو یہ کہا گیا تھا کہ کیا تم راضی ہو کہ تمہارا فقر و فاقہ اور صلاحیت اور علم بادشاہ کو دیدیا جائے اور اس کی سلطنت اور حماقت تم کو دیدی جائے اسی طرح جو لوگ کفار کی ثروت اور عیش کو دیکھ کر اور اپنی مصیبت و تکلیف پر نظر کر کے لپکا لپکا اور خدا تعالیٰ کی شکایتیں کرتے ہیں ان کو سمجھنا چاہیے کہ اگر حق تعالیٰ کفار کا کفر اور ثروت و عیش ان کو دیدیں اور ان کا فقر و فاقہ و ایمان ان کو دیدیں تو کیا تو اس پر راضی ہوں گے، اگر اس پر راضی نہیں ہو سکتے اور یقیناً کوئی مسلمان اس پر راضی نہ ہوگا تو ان کو خدا تعالیٰ کی شکایت کرتے ہوئے ڈرنا چاہیے۔ اور اپنے ایمان کی دولت پر خدا کا شکریہ کرنا چاہیے۔

علامہ عزیزی لکھتے ہیں کہ جس عالم کو یہ تمنا ہوتی ہے
ام غزالی کا قول کہ مجھے مال کیوں نہیں ملا تو گویا وہ یہ کہتا ہے کہ بادشاہ نے مجھے گھوڑا تو دیدیا گدھ کیوں نہیں دیا۔ گدھا بھی مجھے دو۔ تو اس کا یہ کہنا غلط ہے بلکہ جب تمہیں گھوڑا مل گیا تو گدھ کسی دوسرے کو دیدیا جائے گا۔ اسی طرح یہ استدلال ہے کہ ہمیں علم ملا تبیر ملی تو مال بھی ملنا چاہیے سو اس کو جاننا چاہیے کہ یہ اس کی غلطی ہے

جب تم کو علم دیا گیا ہے تو مال کسی دوسرے کو ملے گا پس جو لوگ اس راز کو سمجھ گئے وہ ایسی تمنائے بچ گئے ورنہ زندیق ہونے میں کوئی تعجب ہی نہیں۔

مصیبت کیوں آتی ہے غرض یہ شبہ اس لئے واقع ہوا تھا کہ آپ نے سمجھ لیا تھا کہ مصیبت ہمیشہ گناہ ہی سے آتی ہے حالانکہ کبھی رفع درجا کے لئے بھی آتی ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کو کوئی تاویل سمجھے۔ تو بات یہ ہے کہ محبت میں سب باتیں ظاہر ہے ورنہ کچھ بھی نہیں اگر خدا تعالیٰ سے تعلق اور لگاؤ ہو تو ہر مسئلہ میں انسان کی تسلی ہو سکتی ہے طبیعت خود بخود راہ نکال لیتی ہے اور اگر تعلق نہ ہو تو کبھی بات بھی تاویل معلوم ہوتی ہے۔ اگر اس تقریر سے کسی کی تسلی نہ ہوئی ہو تو وہ یوں سمجھے کہ حق تعالیٰ حکیم ہیں اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں اور حکمت کا مقتضی یہ ہے کہ اس عالم میں ہر چیز کسی سبب اور علت کے ساتھ وابستہ ہے پس لامحالہ مصائب اور تکالیف کا بھی کوئی سبب ہونا چاہیے۔ مگر کبھی تو ایسا ہوتا ہے..... کہ ایک مسبب کے لئے ایک ہی سبب ہوتا ہے اور کبھی ایک مسبب کے لئے کئی سبب ہوتے ہیں جسے چلنا کہ اس کے کئی سبب ہوتے ہیں کبھی ناز کیلئے چلتے ہیں کبھی قضا حاجت کے لئے کبھی کسی بظلم کرنے کے لئے اور جسے غصہ کہ کبھی دشمن پر آتا ہے جس کا سبب عداوت ہے اور کبھی کسی وجہ سے دوست پر بھی آتا ہے غرض ایک مسبب کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں اب بعض دفعہ ان اسباب میں سے ایک سبب ظاہر ہوتا ہے اور بقیہ اسباب ذرا خفی ہوتے ہیں تو کوتاہ نظر آدمی اسی ظاہری سبب کو سمجھ لیتا ہے اور باطنی اسباب پر اس کی نظر نہیں ہوتی تو اس لئے وہاں ضرورت ہوتی ہے جمیع اسباب کے احاطہ کی۔ لیجئے میں اس کی ایک اور مثال بیان کرتا ہوں کہ مسبب واحد کے لئے کئی اسباب بھی ہوتے ہیں۔

ایک مثال مثلاً آپ کو ایک شخص نے بڑے زور سے دبایا اور ایسا دبایا کہ آپ کی ہڈی پسلی ٹوٹنے لگی، تو دیکھئے دبانے کے اسباب جدا ہیں ایک تو یہ کہ راستہ میں آپ کا کوئی دشمن ملا اس نے آپ کو کوئی تکلیف پہنچانے کے لئے دبایا۔ اور ایک تو صورت یہ ہے کہ آپ کوئی ایسا شخص ملا جس کے دیکھنے کو آپ ترستے تھے اور یہ امید بھی نہ تھی کہ آپ کو وہ ہاتھ بھی لگائے گا۔ دفعہ

وہ شخص سنجری میں آپ کو دبا لے اور بہت زور سے دبوچے ممکن ہے کہ جب تک آپ کو یہ علم نہیں کہ دبانے والا کون ہے اس وقت آپ کو تکلیف اور پریشانی رہے مگر جب یہ معلوم ہو جائے کہ دبانے والا کون ہے اس وقت آپ کیا کہیں گے۔

ۛ استیر خواہد رہائی نہ بند ۛ شکارت نہ جوید خلاص از کمند
اگر تھوڑی دیر کے بعد آپ کی جان پر ترس کھا کر خود چھوڑنا بھی چاہے کہ مبادا
کہیں آپ مر نہ جائیں تو آپ یہ کہیں گے ۛ

نه شود نصیب دشمن که شود هلاک تیغ

سردستان سلامت کہ تو خیر آزمائی

اور یہ کہیں گے۔

۷۔ نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے

..بھی دلق کی حشر بھی آرزو ہے

تو دیکھئے مسبب واحد ہے اور سبب مختلف ہے مگر ہر ایک کا اثر جدا ہے جو بداد و عداوت کی وجہ سے اس کا دوسرا اثر ہے اور جو محبت کی وجہ سے ہے اس کا دوسرا اثر ہے جب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ ایک مسبب کے لئے مختلف اسباب بھی ہو کر تے ہیں تو اب سنئے کہ آپ نے اب تک صرف ایک سبب کو سنا ہے مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ کہ جو مصیبت آتی ہے وہ انسان کی بد اعمالی کی وجہ سے آتی ہے۔

انبیاء کرام پر مصائب دوسرا سبب بھی تو سنئے! حدیث میں ہے اشد الناس بلائاً الانبياء ثم الامثل فالامثل کہ سب سے زیادہ

درجات کے لئے بھی آتی ہے اور ظاہر ہے کہ حدیث و قرآن میں تعارض کے وقت قرآن ہی کو ترجیح ہوگی پس یہی ثابت ہوا کہ گناہ کی وجہ سے مصیبت آتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ تعارض کچھ نہیں اور اس شبہ تعارض کا جواب خود اس آیت میں موجود ہے چنانچہ ارشاد ہے مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ يَتَكَلَّمُ بِهَا كَمَا كَلَّمَتْكُمْ فِي الْأَمْرِ الَّيْسَ لَكُمْ مِنْ اللَّهِ بِشَيْءٍ وَلَا يُغْنِي عَنْكُمْ كُفْرًا ۚ إِنَّكُمْ تَعِيشُونَ فِي عِلَاجٍ ۚ (سورہ ابراہیم: ۲۲)۔ یہاں بلا کا لفظ ہے اور حدیث میں مصیبت کا لفظ نہیں ہے وہاں بلا کا لفظ ہے پس آیت کا حصر بالکل صحیح ہے کیونکہ مصیبت مذہب ہی کو آتی ہے اور اہل مصیبت گناہی لوگ ہیں ان پر جب مصیبت آتی ہے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے اور مقبولین اہل مصیبت نہیں ہیں، وہ اہل بلا ہیں ان پر جب بلا آتی ہے رفع درجات اور از دیا و محبت کے لئے آتی ہے اور مصیبت اور بلا میں صورتاً فرق کم ہوتا ہے۔ ظاہر میں دونوں ایک ہی معلوم ہوتے ہیں مگر آثار میں دونوں کے بڑا فرق ہوتا ہے جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں کی حقیقت بھی الگ الگ ہے پس مصیبت کی حقیقت ہے سزا اور انتقام اور بلا کی حقیقت ہے محبوبانہ چھپر چھاڑ اور امتحان، محبوب کے دبانے اور بھیجنے کو مصیبت کوئی نہیں کہا کرتا پس انبیاء اور مقبولین پر بلا آیا کرتی ہے مصیبت نہیں آیا کرتی اور بلا کے معنی لغت عربی میں آزمائش اور امتحان کے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے دو شخصوں کے برابر بخار آنا ہے آخر اس کی کیا وجہ ہے۔ کیا نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گناہ صادر ہوتے تھے ہرگز نہیں آپ گناہوں سے بالکل معصوم تھے اور اگر کوئی لغزش اسے درجہ کے مناسب ہو بھی گئی تو پہلے ہی سے اگلی پھلی سب خطائیں معاف ہو جانے کی خوشخبری آچکی تھی۔ اس لئے آپ میں تو یہ احتمال کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا پس وجہ وہی ہے کہ بیماری میں ذرا انسان پر عجز و انکسار اور آہ کرنا، کراہنا غالب ہوتا ہے اور یہ ادا حق تعالیٰ کو پسند ہے اس ادا کے دیکھنے کے لئے مقبولین پر بلا بھیجتے ہیں اور کبھی صبر کا امتحان کرنا مقصود ہوتا ہے۔ تو جب یہ بات ہے کہ کلفت کے اسباب مختلف ہوں۔ تو لازمی طور پر آثار بھی مختلف ہونگے اہل مصیبت یعنی اہل مصیبت ذرا سنی تکلیف سے بہت زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں چنانچہ ایسے ہی لوگ طاعون سے بھاگتے ہیں اور کوئی شخص طاعون کی جگہ سے آیا ہو اس سے بھی بھاگتے ہیں کہ یہ طاعون کی جگہ سے آیا ہے شاید اس کو طاعون لپیٹ رہا ہو اور اس کے پاس جانے سے ہمارے اوپر بھی اثر نہ ہو جائے۔ بھلا اس وہم کا کچھ

ٹھکانا ہے بات یہ ہے کہ معاصی کا یہ خلاصہ ہے کہ اس سے دل کمزور ہو جاتا ہے اس لئے اہل مصیبت کا دل بہت کمزور ہو جاتا ہے۔

ایک شخص طاعون سے بھاگ کر ایک گاؤں ایک شخص طاعون سے بھاگنے والا کے مکان پر بٹھا اور تھا نمازی مسجد میں نماز کے لئے جاتا تو اس مسجد میں بعض پرانے نمازیوں نے نماز کے لئے آنا چھوڑ دیا۔ اس شخص کی کتنی بڑی ذلت ہے تو بات یہ ہے کہ طاعون سے بھاگنے والا کی کسی جگہ جا کر عزت نہیں ہوتی جس میں راز یہ ہے کہ یہ شخص خدا تعالیٰ سے بھاگتا ہے اس پر مجھے یہ شعر یاد آیا کرتا ہے

عزیزے کہ از در ہمیش سر بنافت

بہر در کہ شد پیچ عزت نیافت

اور جو لوگ کہ اپنے گھر میں پڑے رہتے ہیں ان کی آخرت میں تو عزت ہوتی ہی ہے کہ طاعون کی جگہ ایمان اور ثواب کی نیت سے جھے رہنے پر شہادت کا ثواب ملتا ہے چنانچہ احادیث میں اس کی تصریح ہے مگر اس کے علاوہ ان لوگوں کی دنیا میں بھی عزت ہوتی ہے کہ لوگ ان کو قوی القلب اور مستقل المزاج سمجھتے ہیں بہر حال اہل ذنوب کو پریشانی ہوتی ہے اور جہاں کلفت کا سبب رفع درجات ہوتا ہے وہاں آثار بھی دوسرے ہوتے ہیں کہ نہ وہ پریشان ہوتے ہیں نہ گھبراتے ہیں چاہے ان کے جسم میں تکلیف ہو مگر روح خوش رہتی ہے۔ روح کے لئے ایک عید ہوتی ہے کیونکہ وہ از محبت تلخیا شیریں شود، اور اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ اس مسرت کو بیساختہ ظاہر کر دیتے ہیں اور روح کو تکلیف دینے کی حالت میں مست کرب ظاہر ہوتی ہے۔ پھر سب سے بڑی مصیبت جس کو ام المصائب کہنا چاہیے۔ موت ہے کہ اس پر کوئی راضی نہیں ہوتا چنانچہ اگر کسی سے یہ کہا جاوے کہ تمہارے لئے دو صورتیں ہیں یا تو اسی وقت مر جاؤ یا ایک برس تک بیمار رہو۔ ان دونوں میں سے جس کو چاہا ہو اختیار کر لو تو غالباً ہر شخص اتنی مدت مدید تک مریض رہے پر راضی ہو جائے گا۔ مگر موت پر ہرگز راضی نہ ہوگا مگر اہل اللہ کی یہ حالت ہے کہ وہ خود موت کے مشتاق رہتے ہیں وہ حضرات یوں کہتے ہیں

خرم آل روزگزیں منزل ویراں بروم۔

راحت جاں طلبم در پلے جاناں بروم۔

نذر کردم گر آید بسرا میں ہم روزے تادریکدہ شاداں وغزل خوان بروم وہ تو موت کے وقت کے لئے نذریں مانتے ہیں۔ اس پر خوشی بوقت موت شاید کوئی یہ شبہ کرے کہ حجرہ میں بیٹھ کر ایسا کہدیا ہوگا مگر جب نزع کا وقت آیا ہوگا۔ اس وقت ساری حقیقت معلوم ہوگئی ہوگی۔ اس وقت یہ سب باتیں بھول گئے ہوں گے۔ تو حضرت یہ بات نہیں واقعات سے ان حضرات کی حالت سچی معلوم ہوتی ہے۔ اور یقیناً وہ موت کے وقت بھی ایسے ہی خوش تھے۔ وہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اسی کی تعلیم کرتے آئے ہیں کہ زندگی ایسی اختیار کر دو کہ مرنے کے وقت سب لوگ تمہاری فرقت میں رو رہے ہوں اور تم دصال خداوندی کے سرور میں ہنس رہے ہو چنانچہ ایک قطعہ اس مضمون کا مجھے یاد آیا۔ فرماتے ہیں

یاد داری کہ وقت زادن تو ہمہ خنداں بند تو گریاں۔

یعنی پیدائش کے۔۔۔۔۔ وقت تم روتے ہوئے آئے تھے اور اعزاز و اقارب ہنس رہے تھے خوشیاں منا رہے تھے۔

آپجناں زری کہ وقت مردن تو ہمہ گریاں شونند تو خندان

زندگی ایسی ہی اختیار کر دو کہ مرتے وقت اور سب تو روئیں اور تم ہنستے ہوئے جاؤ چنانچہ ایسے واقعات بھی ہوتے ہیں کہ بعض اہل اللہ مرنے کے وقت بالکل شاد و خرم نظر آتے ہیں۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ ان کے نزع کے وقت سب تو رو رہے تھے اور ان کی یہ حالت تھی کہ وہ بیساختہ یہ اشعار پڑھ رہے تھے

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم جسم بگذارم سرا سر جان شوم۔

اب وہ وقت آگیا کہ میں قید جسم سے آزاد ہو جاؤنگا۔ بدن کو چھوڑ کر سراپا روح بن کر دصال حق سے سرفراز ہو جاؤں گا۔ تو صاحبو! نزع کے یہ سستی بناوٹ سے نہیں ہو سکتی اور اگر ہو سکتی ہے تو کوئی کر کے دکھلاوے اور فرماتے ہیں

چہیست تو جید آنکہ از غیر خدا فسر دآئی در خلا و در بلا۔

یہ تو آپ نے موت کے وقت کا حال سنا اور اس سے بعد موت کا حال بھی زیادہ سخت وقت موت کے بعد کا ہے کہ وہی وقت

ہے مصیبت کا جو کچھ ثواب و عذاب ہوگا موت کے بعد ہی تو ہوگا۔ مگر اہل اللہ کی حالت اس وقت بھی عجیب ہوتی ہے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں وہ اور بھی زیادہ خوش رہتے ہیں۔

حضرت سلطان الاولیاء کی حکایت ہے کہ جب ان کا جنازہ چلا تو ان کے ایک مرید بحالت طاری تھی۔ کیونکہ شیخ کے انتقال کا صد مہریدوں سے زیادہ کس کو ہو سکتا ہے غرض جنازہ جا رہا تھا کہ اس مرید نے جنازہ کو مخاطب کہ یہ شعر پڑھا

سرو سمینا ربصر اے می روی

سخت بے مہری کہ بے مایروی

اے تماشگاہ عالم روئے تو

تو کجا بہر تماشای روی

تاریخ میں لکھا ہے کہ کفن میں سے آپ کا ہاتھ اوجھا ہو گیا لوگوں نے کہا کہ کیا غضب کرتے ہو چپ رہو۔ اس واقعہ سے کچھ تعجب نہ کرنا چاہیے کیونکہ مرنے کے بعد انسان کو دوسری حیات عطا ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ سب کچھ احساس کر سکتا ہے اور یہ حیات اولیاء میں عوام سے زیادہ ہوتی ہے تو کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ اس حیات کا اثر بطور کرامت کے جسم پر بھی ظاہر ہو جاوے مگر یہ کبھی بھی ہوتا ہے۔

غرض خدا نے ظاہر کر دیا کہ اب یہ لوگ اس قدر مطمئن ہیں کہ ان کو مرنے کے بعد بھی وجد آتا ہے چنانچہ ارشاد ہے **الْأَنَّا أَوْلِيَاءُ اللَّهِ لَأَخْوَفٌ عَلَيْهِمْ** وَلَا تَهُمُ بِمِخْرَجٍ مِّنْهُ تَوَصَّيُوا لَآنَاصِحًا تَعْلَمُونَ ان حضرات کو مصیبت کہاں ہوتی جن باتوں کو آپ مصیبت سمجھتے ہیں ان میں تو ان کو لذت آتی ہے۔ (ایضاً ص ۲۳)

لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں آج کل اخلاص ہے اس لئے ان کی بددینی کا اثر حالت خراب ہے۔ میں کہتا ہوں کہ صاحبو! فلاں کا ڈر نہیں۔ اصل میں

اس خرابی کا سبب بددینی ہے۔ آپ یورپ کو دولت مند سمجھتے ہیں مگر کیا اس میں سب ہی دولت مند ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ان میں بھی کتنے آدمی سردی سے مر جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کسی قوم کی حالت اچھی ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ان میں ہر شخص دولت مند ہو بلکہ حالت درست ہوتی ہے افعال حسنہ اور اخلاق حمیدہ سے جس قوم میں یہ باتیں ہونگی اس کی حالت درست ہوگی چاہے وہ کسی ہی مفلس قوم ہو شاید آپ یہ کہیں کہ اہل یورپ تو کافر ہیں وہ تو دیندار نہیں ہیں پھر ان کی حالت ترقی پر کیوں ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ

چونکہ وہ کافر ہیں خدا کے دشمن ہیں اس لئے اگر وہ تھوڑے سے کام بھی اچھے کریں گے تو ان کی حالت دنیوی درست ہو جائے گی۔ ان میں اتفاق اور اتحاد اور قومی ہمدردی بہت زیادہ ہے۔ دوسرے ان میں ہر کام کا ایک انتظام اور قاعدہ ہے اور یہ باتیں فی نفسہ اصلاح حال میں مؤثر ہیں جو اصل میں مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہیے تھیں کیونکہ ان کو مذہباً اس کی بہت تاکید کے ساتھ تعلیم کی گئی ہے مگر مسلمانوں نے ان باتوں کو چھوڑ دیا دوسری قوموں نے ان سے فائدہ اٹھا یا مگر یہ یاد رہے کہ مسلمانوں کی حالت صرف اتفاق و اتحاد سے درست نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ان کو پوری طرح احکام اسلام کی پابندی اور وقعت کرنا لازم ہے کیونکہ حق تعالیٰ کے خاص بندے ہیں اگر یہ تھوڑی سی بھی نافرمانی کریں گے تو ان پر عرصہ زیادہ ہوگا تو صاحبو! اگر اپنی بھلائی چاہتے ہو تو دینداری اختیار کرو۔ ابھی تک مسلمانوں میں اتنی فلاکت کسی میں نہیں ہوئی کہ تباہ ہو جاوے اور اگر ان میں اتفاق ہو تو ایک کی امارت سے دس آدمی کھا سکتے ہیں مگر آج ہمدردی تو کیا ہوتی مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ غریبی کو جرم قرار دیتے ہیں حالانکہ غریبی اور امیری کسی کے اختیار میں نہیں آج ایک شخص امیر ہے کل کو غریب ہو جاتا ہے۔ آج ایک آدمی غریب ہے چند روز میں حق تعالیٰ اس کو غنی کر دیتے ہیں۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا ہے کہ وہ چھ پیسے روز کی مالدار کا شاہد کاندھے اٹھانے کی مزدوری کما لے تھے پھر وہ لاکھوں روپے کے آدمی ہو گئے اب بھلا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ تدبیر سے اس وجہ کو پہنچ گئے ہرگز نہیں بلکہ یہ محض مشیت الہی کی وجہ سے ہوا۔ میں کہا کرتا ہوں، جو لوگ تدبیر پر مہرتے ہیں وہ ایک آدمی کو بجائے چھ پیسے روز کے تین آنے دیں اور وہ تمام تدبیریں بتلا دیں جن سے بظاہر پہلے شخص کو ترقی ہوتی پھر ہم دیکھیں کہ دوسرا شخص بددینوں سے کتنی ترقی کرتا ہے اگر اس طرح ترقی ہو کر ترقی تو ہر شخص دوسروں کی تدبیروں کو دیکھ کر امیر ہو جایا کر تاد حقیقت فراخی اور تنگی کا مدار ان اسباب پر نہیں ہے مشیت الہی پر ہے دوسرے کسی قوم میں افلاس اتنا عام نہیں ہوتا کہ سبھی مفلس ہوں بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ ہر قوم میں کچھ غنی ہوتے ہیں کچھ مفلس ہوتے ہیں۔ جب یہ بات ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں ہی کی حالت خراب ہے سو بات یہ ہے کہ ان میں فعال

اور اخلاق حمیدہ کی کمی ہے پس اصل شکایت ان کی بددینی کی ہے۔ (ایضاً ملاحظہ)
تو ان حضرات پر اگر مصیبت آوے گی تو یہ کوئی مصیبت
صورت و حقیقت ہے ہرگز نہیں۔ ہاں مصیبت کی صورت ہے حقیقت میں
وہ ہرگز مصیبت نہیں میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص میٹھائی کا کرہ بناوے اور اس کے
متعلق دو شخصوں میں اختلاف ہو ایک تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ کرہ ملا ہے اور دوسرا سمجھتا ہے
کہ یہ میٹھائی ہے اب دوسرے نے اس کو توڑ کر کھانا شروع کیا تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ
یہ کرہ ملا ہے۔ ہرگز نہیں درحقیقت وہ میٹھائی کھا رہا ہے ہاں صورت کرہ ملا کی
ہے جس سے نادان کو شبہ ہوتا ہے کہ اس کا منہ کڑوا ہو گیا ہوگا۔ مگر اس کھانے والے
سے کوئی اس کے مزے کو پوچھے۔ بس یہی مثال اہل اللہ کی مصیبت اور عوام کی
مصیبت کی ہے اہل اللہ جو مصیبت آتی ہے وہ کرہ ملا کی صورت میں میٹھائی ہے
جس سے ان کو لذت حاصل ہوتی ہے اور عوام کی مصیبت حقیقت میں کرہ ملا ہے
جس سے ان کو تلخی اور پریشانی حاصل ہوتی ہے۔

میں نے اس مثال میں ایک بار ایک مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا۔ آپ رات دن
دیکھتے ہیں کہ میٹھائی کے کھلونے اور مختلف پھل بنائے جاتے ہیں۔ مگر وہ محض
صورت ہی صورت ہوتی ہے حقیقت میں وہ خاص شکریہ ہے۔ میں نے سنا ہے کہ
محمود آباد میں ایک باورچی نے میٹھائی کا انار بنایا تھا جو ڈیڑھ سو روپے میں تیار
ہوا تھا اس کے اندر زرد چھلی اور دانوں میں سرخ شربت تک تھا۔ اور یہ تو میرے سامنے
کا واقعہ ہے کہ ایک دعوت میں باورچیوں نے میٹھائی کا پان بنایا تھا۔ تو کسی نے اگر
ایسا ہی کرہ بنا دیا ہو اور ایک شخص اس کو کھانے لگے اور دوسرا اس پر رحم کرنے
لگے تو یہ اس کی حماقت ہے یا نہیں۔ یقیناً حماقت ہے تو جس طرح کرہ ملا کی
دو قسمیں ہیں۔

مصیبت کی قسمیں اسی طرح مصیبت کی بھی دو قسمیں ہیں ایک صورتاً
ایک حقیقتاً۔ اور نعمت کی بھی دو قسمیں ہیں ایک صورتاً اور ایک حقیقتاً۔ کفار کو جو لذت
دنوی اور عیش و آرام دیا گیا ہے یہ ظاہری نعمت ہے حقیقت میں یہ سب وبال
جان ہے اور مسلمانوں کو جو مصیبت پیش آتی ہے وہ ظاہری مصیبت ہے۔

حقیقت میں وہ بڑی نعمت ہے۔ صاحبو! اس کو وہ سمجھے گا جو اس مزہ کو پہلے چکھ چکا ہو
اور جس نے باطنی دولت کا مزہ نہیں چکھا وہ اس کو نہیں سمجھ سکتا ہے
سہ پر سیدیکے کہ عاشقی چیست گفتم کہ چوما شوی بدانی !
بچہ کے ختنہ کی مثال کیا آپ نے ختنہ کے وقت یا فصد کراتے وقت
بچوں کو رو دتے ہوئے نہیں دیکھا۔ سوئیچ کے
دل سے پوچھئے وہ اس کو کیا سمجھتا ہے وہ تو اس کو سخت مصیبت کہے گا مگر آپ کے
نزدیک وہ مصیبت نہیں راحت ہے۔

طفل می لرزد ز نیش احتجام مادر مشفق ازاں غم نشاد کام
کیا آپ نے کبھی اپنے یا اپنے کسی عزیز کے نشتر نہیں لگوایا اور کیا پھر نشتر
دینے والے کو انعام نہیں دیا۔ ضرور دیا ہے تو کیا نشتر دینے کے وقت کی تکلیف
دیکھ کر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے انعام کا کام نہیں کیا؟ ہرگز نہیں آپ کا دل جانتا ہے
کہ اس نے بڑا احسان کیا اور بہت راحت پہنچائی کہ آئندہ کی تکلیف سے نجات
دیدہ کہ نشتر دینے کے وقت آپ کے آنسو بھی نکلے ہوں گے تب بھی دل
اندر سے راضی ہوگا۔

معلوم ہوا کہ بعض مصائب ایسے بھی ہیں جو صورت میں مصیبت ہیں اور
حقیقت میں راحت معلوم ہوتے ہیں پس اہل اللہ کے مصائب کو بھی ایسا ہی سمجھتے
وہ خوب جانتے ہیں کہ ان تکالیف کی وجہ سے ہماری آخرت درست ہو رہی
ہے جتنی ہم کو یہاں کلفت ہوتی ہے اسی قدر عذاب جہنم سے ہم کو نجات نصیب
ہوتی ہے تو وہ ان تکالیف کو بالکل ویسا ہی سمجھتے ہیں جیسا کہ آپ نشتر کی تکلیف
سمجھتے ہیں آپ نشتر کی تکلیف پر دل سے راضی ہیں وہ فقر و فاقہ اور طاعون و غیرہ کی
تکلیف سے دل سے راضی ہیں۔ اب یہ شبہ زائل ہو گیا کہ انبیاء و اولیاء تو گناہوں سے
معصوم و محفوظ ہوتے ہیں ان پر مصیبتیں کیوں آتی ہیں معلوم ہو گیا کہ ان حضرات پر
واقع میں مصیبت ہی نہیں اور جو واقع میں مصیبت ہے وہ بد اعمالیوں ہی سے
آتی ہے۔

۱۲۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں کوتاہی

جو طبائع زمانے کے جدید رنگ میں رنگے ہوئے ہیں ان میں تو یہ کوتاہی شاید ہے کہ وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قدر کج چلی رہتے ہیں کہ دوسرے اقوام یا مذاہب سے مقابلہ کی گفتگو کے موقع پر آپ کی سوانح عمری میں سے یا آپ کے بعض اقوال یا افعال کی حکمتوں میں سے (خواہ ان کی حقیقت تک ان کے ذہن کی رسائی ہوئی ہو یا نہ ہو) صرف وہ حصہ جس کو تمدن سے تعلق ہے محض اس غرض سے بیان کر دیتے ہیں کہ آپ کی عظمت اور آپ کے قانون کی عزت ظاہر ہو جائے اور اسی کو اسلام کی خدمت اور آپ کے اداء حقوق کے لئے کافی سمجھتے ہیں باقی نہ اتباع کو ضروری سمجھتے ہیں نہ محبت کا کوئی اثر پایا جاتا ہے بلکہ اتباع کو تعصب اور محبت کو وحشت سمجھتے ہیں۔ اور سبب یہی اس کا یہ ہے کہ اس زمانے میں سب سے بڑا مقصد جاہ و عزت کو قرار دیا گیا ہے جس کے مطلوب ہونے کا ہم کو بھی انکار نہیں مگر کلام اس میں ہے کہ آیا وہ مطلوب بالضرر ہے یا خود مطلوب بالذات ہے بہر حال چونکہ اس کو کمال بالذات سمجھا جاتا ہے اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لاتعداد و لا محضی کمالات حقیقت عظیم الشان میں سے ان کی نظر اسی کا انتخاب کرتی ہے اور دوسرے کمالات کا مثل محبت الہی و خشیت الہی و زہد و صبر و تربیت روحانی و مجاہدہ و شغل حق و دیگر فضائل علمیہ و عملیہ کا کبھی انکی زبان پر نام بھی نہیں آتا جس کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ گویا آپ خاص اسی غرض کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے کہ ایک جماعت کو قوم بنا کر اس کو دنیوی ترقی کے وسائل کی تعلیم فرمادیں تاکہ وہ دوسری قوموں پر سابق و فائق رہ کر دنیا میں شوکت کے ساتھ زندگی بسر کریں کیا قرآن مجید و حدیث شریف میں گہری نظر کرنے والا آپ کی تعلیم کا یہ خلاصہ نکال سکتا ہے ان صاحبوں کو اپنی اصلاح کرنے کے لئے اس کی سخت ضرورت ہے کہ علماء محققین و عرفاء محققین کی طول صحبت و ملازمت کا التزام کریں اور انکی خدمت میں کچھ عرصہ تک بالکل سکوت اختیار کر کے رہیں خود ان کے اقوال متفرقہ و ارشادات مختلفہ سے انشاء اللہ تعالیٰ ایک بڑی فہرست خیالات کی درست ہو جائے گی اس کے بعد جو شبہات رہ جائیں ان کو ادب کے ساتھ ان کے حضور میں پیش کریں۔ اور توجہ و انصاف کے ساتھ

جواب میں۔ ان کو اس زمانہ سکوت میں جو اصول و قواعد سننے اور ذہن نشین کرنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اصول ان جوابوں کے سمجھنے میں نہایت معین ہوں گے اور اطمینان و شفا رکلی میسر ہوگی۔ اس طریق اصلاح کو جو تجربہ ہے سرسری خیال نہ فرمائیں۔ اور نیز حدیث میں کتاب الرقاق و کتاب الزہد کا بار بار مطالعہ فرمائیں۔

(الشذوذ فی حقوق بدر البدور ص ۳ تا ۴)

ایسے لوگ درحقیقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے تینوں حقوق میں تقصیر کئے ہوئے ہیں متابعت و محبت کا موجود نہ ہونا تو ظاہر ہے اور آپ اس کو صراحت سے بیان کر دیا گیا ہے البتہ ان کے اس عمل سے کہ ان کی زبان یا قلم سے بعض ایسے مضامین صادر ہوتے ہیں کہ ان سے آپ کی عظمت ظاہر ہوتی ہے پر شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید وہ آپ کا حق عظمت ادا کرتے ہیں لیکن اگر ذرا نظر کو عمیق کیا جاوے تو ثابت ہوگا کہ یہ اجمال بھی واقعت نہیں رکھتا حقیقت یہ ہے کہ آپ کی جس عظمت میں گفتگو ہو رہی ہے وہ وہ عظمت ہے جس کے ساتھ آپ حامل وحی ہونے کی حیثیت سے متصف ہیں اور ان لوگوں کی تحریر و تقریر میں نظر کرنے سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قلوب میں جو آپ کی عظمت ہے وہ اس حیثیت سے نہیں بلکہ ایک حکیم تمدن ہونے کی حیثیت سے ہے کیونکہ ان دونوں عظمتوں کے آثار کا موجود نہ ہونا ہمارے دعویٰ کی دلیل ہے چنانچہ اعتقاد عظمت نبوی کے آثار یہ ہیں کہ آپ کے احکام سنتے ہی یہ معلوم ہو کہ گویا حق تعالیٰ نے ہم سے خود فرمادیا ہے اور یہ کہ اس حکم کے قبول کرنے میں حکمت و مصلحت سمجھنے کا ہرگز انتظار نہ ہو بلکہ اگر بادی النظر میں کسی حکمت کے خلاف بھی معلوم ہو تب بھی اسی خوشی سے قبول کرے جیسا حکمت معلوم ہونے کے وقت کرتا اور نہ..... بدون حکمت سمجھے ہی اس حکم کی وقعت میں کچھ کمی ہو بلکہ جس طرح ادنیٰ خدمتگار شاہی حکم سن کر مغلوب و دال ہو کر دیوانہ وار اس کی بجا آوری کے لئے دوڑتا ہے اسی طرح اس کی کیفیت ہو جاوے اور یہ کہ اس کے خلاف کا مستحسن ہونا خیال میں بھی نہ آوے بلکہ اجمالاً یوں سمجھے کہ بس تمام خیر و برکت اور حکمت و مصلحت اور فلاح و صلاح اسی میں منحصر ہے خواہ ہمارا ذہن کوتاہ اس کی تفصیل تک پہنچے یا نہ پہنچے۔ بقول حضرت عارف گنجوی رحمۃ اللہ علیہ دل تازہ کردن با فترار تو بیخیالین علت از کار تو!

اور صرف حکم تمدن ہونے کے لحاظ سے جو اعتقاد و عظمت ہوتا ہے اس کے آثار یہ ہیں کہ حکم سن کر اتنا ہی اثر ہو جو ایک مخلوق ذی رائے کی رائے کو سن کر ہوتا ہے۔ اور یہ اسلئے قبول کرنے میں یا اس کو بنظر وقعت دیکھنے میں اس کا بھی انتظار ہو کر اس میں عقلی (اور عقلی بھی دنیوی) مصلحت کیا ہے۔ جب تک مصلحت معلوم نہ ہو اس میں سخت تردد و خلبان رہے اور ہرگز اس پر عمل کرنے میں شرح صدر نہ ہو خود بھی ایک قسم کی تنگی اور جبر و تحکم کا سا اثر رہے اور دوسروں کے سامنے بھی اس کا دعویٰ کرتے ہوئے ایک گونہ تجلست اور بے وقعتی کی سی کیفیت رہے اور بار بار اس حکم کی جانب مخالفت کی ترجیح کا ہجوم اور اس کی تمنا کا قلب پر غلبہ رہے اور ہرگز اس کے صحیح ہونے کا دل کھول کر حکم نہ کر سکے بلکہ اس فکر میں رہے کہ کسی طرح اس کا شرعی ہونا ثابت نہ ہو اور جب ادب کچھ نہ ہو سکے تو بعض تاویلات سے اس حکم کے شرعی ہونے کا انکار کر دے کبھی اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے میں شبہات پیدا کرے بلکہ اس کو راویوں کی نقل کی غلطی یا ان کی رائے کی آمیزش کا اثر بتلا دے اور کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے کو تسلیم کر کے خود آپ کی نسبت کسی ضرورت و مصلحت کے وقت کے اتباع کا دعویٰ کرے اور چونکہ وہ مصلحت باقی نہیں رہی لہذا اس حکم کو بھی موجود نہ سمجھے۔ غرض ہزاروں جملے نکالے مگر اس حکم کو نہ مانے (اور یہ ان میں سب سے زیادہ سلیم و صراحطباع کا حال ہے) اور یہ وہ مراتب ہیں جو کم و بیش کفر سے سب لے ہوئے ہیں کوئی صریح کفر کوئی خفی کفر ہے۔ کوئی کفر سننے کو ہے کمالاً حتمی علی المتفطن السلیم جب دونوں اعتقادوں کے آثار مجد اجد معلوم ہو گئے۔ آگے ہر شخص کو مشاہدہ سے اپنے اندر بھی اور غیر کے اندر بھی ان کے آثار کا وجود و عدم معلوم ہو سکتا ہے اور اس سے ہمارے دعویٰ سابقہ کا صدق بخوبی واضح ہو جاوے گا اس مضمون کی شرح زیادہ تحقیق کے ساتھ مطلوب ہو تو مضمون عظمت وحی رقمزدہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دامت فیوضہم جو (الحق اسم کے نمونہ میں شائع ہوا ہے ملاحظہ فرمایا جاوے) ہماری اس تقریر کے یہ معنی نہ سمجھے جائیں کہ احکام

احکام شرعیہ کی حکمت شرعیہ حکمت سے خالی اور عاری ہیں۔ حاشا وکلا بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان کا اتباع اور ان کی خاص عظمت کا اعتقاد فہم حکمت پر موقوف

نہ ہونا چاہیے۔ ہاں وہ خود ایک مستقل علم ہے کہ اس کو امر اور ثنویت کا لقب دیا جاتا ہے مگر اس کے اہل خواص عارفین ہیں عوام الناس کو اس سے بجائے نفع کے ضرر کا احتمال غالب ہے کسی وجہ سے ایک اس لئے کہ ان میں سب تو منصوص ہیں نہیں۔ اجتہادی بکثرت ہیں جن میں احتمال بھی ہے۔ سو اگر کبھی اس کا غیر صحیح ہونا ظاہر ہو گیا اور عامی کے خیال میں اس حکم کی وہی حکمت یقینی تھی تو اسکے صحیح نہ ہونے سے اس حکم کو غیر صحیح سمجھ بیٹھے گا۔ (خلا خواص کے کہ وہ اس کو یقینی علت اور بنی حکم کا نہ سمجھیں گے اسلئے حکم میں ان کو کبھی کوئی خدشہ نہ ہوگا)۔

دوئم اسلئے کہ کبھی کوئی بنی اور حکمت صحیح معلوم ہوگی لیکن بعض اوقات وہ وجہ اور حکمت اس عامی کی نظر میں با وقعت نہ ہوگی تو اس حکم کو بھی بے وقعت سمجھنے لگے گا۔

سوم اسلئے کہ ہر حکمت علت نہیں ہوتی۔ بعض اوقات عامی اس کو علت اور اصلی سبب سمجھ کر کسی موقع میں اس کے موجود نہ ہونے سے حکم ہی کے غیر موجود ہونے کا حکم لگا دے۔

چہارم یہ کہ ہر حکمت مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ بعض اوقات عامی اس کو مقصود بالذات سمجھ کر کسی موقع و محل میں حکمت کے حاصل ہو جانے کو کافی سمجھ کر تحصیل حکم ضرورت نہ سمجھے گا اور ان دونوں صورتوں (سوم و چہارم) میں اجتہاد باطل کا باب وسیع ہو جائیگا مثلاً سفر میں مشقت پر نظر کر کے قصر کا حکم لگا دیا گیا ہے۔ لیکن یہ علت نہیں حتیٰ کہ اگر سفر میں مشقت بھی نہ ہو تب بھی قصر ہے اور اسی طرح وضو مشروع ہوا ہے حکمت نظافت و طہارت سے لیکن اگر طہارت و نظافت حاصل ہو تب بھی وضو سے استغفار نہ ہوگا۔

پنجم یہ کہ عامی مخالفت دین کے مناظرہ میں اس کو بیان کرے گا اور اگر وہ یقینی نہیں تو اس میں مخالفت نے اگر خدشہ نکال دیا۔ تو یہ سلوب ہو جائے گا اور اس میں اسلام کو اور حق کو صدمہ پہونچے گا۔ مثلاً کسی نے کتابا لے کر مانعت کی یہ حکمت بیان کی کہ اس میں صفت سبعیت کی ہوتی ہے۔ تو اگر کسی نے اس میں یہ خدشہ پیدا کیا کہ تعلیم کے بعد سبعیت نہیں رہتی پھر کیوں ممنوع ہے تو یہ شخص بزبان حال اس حاکم کو بے بنیاد

کہے گا۔ بخلاف راسخ فی العلم کے کہ وہ بجائے حکمت کے یہ کہے گا کہ ہمارے آقاؐ عظیم الشان کا یہ حکم ہے کہ ہم نہیں جانتے کیا مصلحت ہے۔ تو اس شخص پر کوئی خدشہ ہی نہیں ہو سکتا۔
(ایضاً ص ۸۵)

۱۳۔ ترقی مطلوبہ کی شریعت نے تعلیم نہیں فرمائی۔

ترقی نہایت خوبصورت لفظ ہے لیکن اس وقت اس کا حاصل محض طول اہل حریص ہے جسکی شریعت مطہرہ نے جڑ کاٹ دی ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے نمونے تھے انہوں نے اس کو اپنے خیال میں کبھی جگہ نہیں دی۔ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس کی تعلیم نہیں فرمائی حضورؐ کی سیرت جس کا ایک ایک واقعہ احادیث میں مدون ہے اس کو دیکھ جاتے ابتداء سے انتہا تک کہیں بھی آپ کو یہ تعلیم نہ ملے گی۔ رہے تاریخی واقعات سوان کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ احادیث کے مطابق ہوں تو قابل اخذ ہیں ورنہ بیچ محض۔ (تجارت آخرت ص ۷)

غرض حدیث کو دیکھتے تو اس سے معلوم ہو گا کہ آپ کا طرز زندگی کیا تھا اور وہی طرز صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تھا۔ تو صحابہ کے یہاں طول حرص اور طول اہل کا انسان بھی تھا ان کی ترقی ترقی دین تھی اگرچہ اس کے تابع ہو کر ان حضرات کو دنیا کی بھی وہ ترقی حاصل ہوئی کہ آج لوگوں کو خواب میں نصیب نہیں لیکن مطمح نظر صرف ترقی دین تھی چنانچہ ان حضرات کی اسی شان کو خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ الَّذِينَ اِنْ مَلَکَتْهُمْ نِیُّ الْاَرْضِ اَتَمُّوا الصَّلٰوةَ وَآتَوْا الزَّکٰوةَ وَابَالِ الْمَعْرُوفِ وَهُمْ عَنِ الْمُنٰکِرِ کہ اگر ہم ان کو زمین پر قبضہ دے دیں تو یہ لوگ اس وقت بھی نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اچھی باتوں کی ترغیب دیں اور بری باتوں سے روکیں۔ یہ ہے ان کے خیالات کا نقشہ جس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اب ان کو یاد رکھئے اور پھر ان کے ساتھ اپنے خیالات کو دیکھئے اور انطباق کیجئے۔ واللہ اس بار دشوار انطباق ہے جیسے

خط مستقیم پر خط منحنی کو منطبق کرنے لگے کہ جب تک اس میں استقامت اور اغیار باقی رہے گا۔ کبھی انطباق ممکن ہی نہیں تو ہمارے خیالات خط منحنی کی طرح ہیں۔ اور ان حضرات کے خیالات کی مثال خط مستقیم ہے۔ بحمد اللہ یہ مثال ایک خاص اعتبار سے بھی بہت ہی اچھی خیال میں آئی گی کیونکہ خط منحنی کے انطباق علی المستقیم کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کے بعض اجزاء تو خط مستقیم پر سے گزرے ہوئے ہوتے ہیں اور بعض اجزاء اس سے ہٹے ہوئے ہوتے ہیں یہی حالت ان خیالات فخرتہ کی ہے کہ ان میں اگر ایک قدم تو شریعت پر ہے تو دوسرے اس سے بالکل الگ جس کا کسی تاویل سے بھی جادہ شریعت پر ہے انطباق نہیں ہو سکتا۔ بس ایسے حالات و خیالات کس طرح قابل مدح ہو سکتے ہیں۔ (انطباق ص ۴۷)

۱۴۔ محدثین پر اعتراض کا جواب

بعض خود رو مصنفین پر افسوس ہے کہ وہ محدثین پر اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے واقعات میں اپنی رائے کو شامل کیا ہے۔ لیکن جو شخص محدثین کے حالات سے واقف ہے وہ خوب جانتا ہے کہ محدثین علیہم الرحمۃ نے کس تہ میں سے کام لیا ہے البتہ یہ اعتراض مطابق واقع کے مؤرخین پر ضرور ہو سکتا ہے۔ صاحبو! محدثین کا تہین اس سے زیادہ اور کیا ہو گا کہ ایک باب کی حدیث سے ایک بات کو ثابت کرتے ہیں تو اس کے بعد ہی دوسرا باب اس کا معارضہ صوری بیان کرتے ہیں اور اس میں بھی حدیث پیش کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ان حضرات کا مقصود محض بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا جمع کرنا ہے نہ کہ اپنی رائے کو ثابت کرنا، یا اس پر زور دینا۔ کیونکہ جب ایک حدیث کے ساتھ دوسری حدیث جو اس پہلی سے معارضہ ہے موجود ہے اور ظاہر ہے کہ اس محدث کی رائے کسی ایک جانب ہوگی تو بصورت ابراد معارضہ کوئی خاص رائے کیونکہ مقصود ثابت ہو سکتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ ان کو اپنی اغراض کی تائید مقصود نہیں ہے بلکہ ان کا مقصود تمام احادیث کا لوگوں کے سامنے پیش کر دینا ہے کہ دیکھیں اور خوب سمجھ لیں۔ ہاں تاریخ میں اس قسم کے واقعات پائے جاتے ہیں کہ ایک مؤرخ نے اپنے خیال کے مؤید واقعات کو لیا اور دوسرے نے اپنے خیالات کے مؤیدات کو، پس جب حدیث و تاریخ میں یہ تفاوت ہے تو حدیث قابل وثوق ہو اور اس کے مقابل تاریخ قابل وثوق نہ ہوتی۔ تو جو واقعات

تاریخ میں حدیث کے خلاف ہوں گے اور حدیث ان کو باطل کرتی ہوگی تو وہ محض بیچ ہیں ہرگز قابل قبول نہیں۔ (ایضاً ص ۲)

۱۵۔ محتاج اصلاح دوسروں کی اصلاح کیا کرتے؟

آج دیکھ لیجئے کہ ان مدعیان طبابت اخلاق کا کیا برتاؤ قوم کے ساتھ ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ اپنے ساتھ بھی ان کو ہمدردی نہیں اور اپنے امراض کے علاج پر بھی توجہ نہیں۔ اور یہی سبب ہے قوم سے ہمدردی نہ کرنے کا کیونکہ طبعاً اپنا خیر خواہ انسان زیادہ ہوتا ہے بلکہ دوسروں کی جو خیر خواہی کرتا ہے اس میں اپنی خیر خواہی مضمر ہوتی ہے پس جو شخص اپنا ہمدرد نہ ہو گا وہ دوسروں کا کیسے ہمدرد ہو گا۔ یہ لوگ اول تو اپنی اصلاح کر لیں پھر دوسروں کی اصلاح حقیقی کی فکر کریں آج یہ حالت ہے کہ انہما ہمدردی اسلام میں بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں انجمنیں قائم ہوتی ہیں مگر نہ نماز کی فکر ہے نہ روزے کا خیال ہے۔ مال کی اتنی افراط ہے کہ دس آدمیوں کو اور بھی لے جا سکیں لیکن محبت اسلام کا یہ عالم ہے کہ خود بھی حج کر نیکی توفیق نہیں ہوتی۔ وضع کو دیکھئے سر سے پاؤں تک اسلام کے بالکل خلاف گفتگو کو دیکھئے وہ مذہب سے بالکل جدا تو جب ان کو اپنے امراض کے ازالہ کی فکر نہیں تو پھر دوسروں کے امراض کے ساتھ ان کو کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر زمانے کی ایک رسم ہوتی ہے کہ اہل زمانہ اسی پر چلنے لگتے ہیں۔ آجکل یہ رسم ہے کہ ہر مشہور یا غیر مشہور تحصیل شہرت یا تکمیل شہرت کی کوشش کرتا ہے اور اس کے ذرائع بہم پہنچاتا ہے۔ منجملہ ان ذرائع کے ایک یہ بھی ہے کہ انجمنیں قائم کی جائیں اور جلسے کئے جائیں کوئی ان انجمنوں کا گورنر ہو جائے کوئی سکریٹری۔ کوئی کچھ کوئی کچھ اور اس سے عام و خاص میں ان کو امتیاز ہو جائے پھر رسم بھی اگر شریعت پر منطبق ہوتی تو بھی نفع سے خالی نہ ہوتی کیونکہ وہ انطباق کی برکت سے ایک دن مبدل حقیقت ہو سکتی تھی اور جب ظاہری انطباق علی الشریعت بھی نہ ہو تو سر امر مضمر اور رسم قاتل ہے اور یہی وجہ ہے کہ حکماء امت نے عوام الناس سے اسی قدر کو کافی سمجھا ہے کہ وہ اپنی صورت ظاہری شریعت کے موافق بنالیں اور صورت عبادت کے پابند ہو جائیں کیونکہ وہ حضرات جانتے ہیں کہ یہ صورت ہی انشاء اللہ

ایک دن مبدل حقیقت ہو جائے گی تجارت آخرت ص ۲۵۹

آجکل کے جلسے | خلاہ یہ ہوا کہ آجکل کے جلسے اور انجمنیں بالکل رسم بلا معنی ہیں اور صورت بھی ٹھیک نہیں اور لوگوں نے ان کو محض رسم سمجھ کر اختیار کیا ہے

نفع پہنچانا ہرگز مقصود نہیں ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ یہ جب اپنا ہی دین برباد کر رہے ہیں تو دوسروں کو دینی نفع پہنچانے کا کب قصد کر سکتے ہیں۔ اور اگر کہیں کہ یہ ایثار ہے کہ اپنے دین سے دوسروں کے دین کو مقدم کر رکھا ہے اس لئے باوجود اپنے دین کے قائم نہ کرنے کے دوسروں کے دین کی درستی کرتے ہیں تو سمجھو کہ ایثار کی اجازت دنیاوی منافع میں ہے دینی منافع میں نہیں یعنی اگر ہمارا کوئی دنیاوی نفع فوت ہو کر دوسرے کا نفع ہو جائے تو اس کو ایثار کہیں گے اور اگر دین تنباہ ہو کر دوسروں کو نفع پہنچے تو یہ ایثار نہیں کہلائے گا۔ ورنہ اگر دین کو تنباہ کر کے بھی ایثار ہوتا تو باغی سب سے زیادہ صاحب ایثار ہونے چاہئیں اور ان کو سب سے زیادہ خیر خواہ سرکار کہنا چاہیے کیونکہ ان میں اتنی بڑی ہمدردی و ایثار ہے کہ انہوں نے اپنی جان بھی دیدی اور تمام منافع جو اطاعت سے ان کو پہنچتے وہ دوسری رعایا کے لئے چھوڑ دیئے صاحبو! یہ وہی ایثار ہے جو فرعون میں تھا دین چھوڑ کر دنیا پر قناعت کی۔ (ایضاً ص ۲۵۹)

غرض جیسے فرعون کی ہمت تھی ویسی ہی آج کل کے ایثار والوں کی ہمت بھی ہے اور فرعون کی وہ ہمت ہمت کہلانے کے قابل نہیں۔ تو ہمارا یہ ایثار بھی ایثار نہیں ہے بس معلوم ہوا کہ جو اپنا خیر خواہ نہیں، وہ دوسروں کا بھی خیر خواہ نہیں۔ تو ہم جو کچھ کر رہے ہیں محض رسم کے لئے کر رہے ہیں۔ (ایضاً ص ۲۵۹)

۱۶۔ علماء کا استیصال اسلام

کا استیصال ہے،

آجکل ایک جماعت علماء کے استیصال کی فکر میں ہے اور طرح طرح کی تدبیروں سے ان کے اثر کے مٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے برا بھلا بھی ان کو کہا جا رہا ہے مگر علماء اس بارے میں خاموش ہیں وہ بہت احتیاط کرتے ہیں۔ وہ کسی کو بلا ضرورت برا نہیں

کہتے۔ مگر اب ضرورت ہے کہ ان لوگوں کی رعایت نہ کی جائے جبکہ وہ ہماری رعایت نہیں کرتے اور وہ ضرورت یہ ہے کہ عوام ان کی باتوں سے گمراہ ہو رہے ہیں یہ لیڈر دین کے دخل دیتے اور اپنی رائے سے جس طرح چاہتے ہیں، احکام میں تحریف کر دیتے ہیں اور عوام الناس میں صاف کہتا ہوں کہ یہ لوگ گمراہ ہیں مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ کیونکہ دین کا مدار اعتقاد پر ہے کہ مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتقاد ہو اور رسول اعتقاد جمعی ہو گا جبکہ حاملان شریعت سے اعتقاد ہو کیونکہ عوام کو رسول کی معرفت علماء ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے جس نے علماء کو نہیں پہچایا وہ رسول کو نہیں پہچان سکتا۔ پس جو لوگ علم علماء کے استیصال کی فکر میں ہیں وہ خود مسلمانوں کی بلکہ عالم کے استیصال کی فکر میں ہیں۔

(المراۃ ص ۱۳، ۱۴)

بعض لوگ ان حجر نشینوں سے کہتے ہیں کہ تم بھی حجر نشینوں کا جواب میدان میں نکلو حجرہ میں کیوں بیٹھے ہو۔ مگر ان سے کوئی پوچھے کہ حجرہ والوں کو میدان میں آنے کون دیتا ہے ان سے کام کون لیتا ہے اگر یہ میدان میں نکلیں گے تو شریعت کے اتباع کا حکم کریں جو آجکل لوگوں کے نزدیک تعصب اور تنگی خالی ہے پھر تم خود ہی یہ کہو گے کہ یہ مولوی ہمارے کام میں روڑے اٹکاتے ہیں ان کو حلال و حرام جائز و ناجائز ہی کی پڑی رہتی ہے اب میدان میں نکل کر نہ ان سے میدان کا کام ہو گا نہ خلوت کا دونوں سے گئے گزرے ہوئے۔ اس سے تو ان کا خلوت ہی میں رہنا اچھا اور تم کو بھی خبر ہے جو لوگ میدان میں نکلے ہوئے ہیں وہ بھی ان حجر نشینوں ہی کی برکت سے کام کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ حجرہ والے ہر وقت مسلمانوں کی کامیابی اور صلاح و فلاح کی دعا کرتے رہتے ہیں مولانا فرماتے ہیں :-

ہر کہ تنہا نادرایں راہ را برید : ہم بون ہمت مرداں رسید

صاحبو! دین کا سمجھنا ان لیڈروں کا کام نہیں ہے بلکہ یہ انہیں لوگوں کا کام ہے جنہوں نے حجرہ میں بیٹھ کر چراغوں کا دھواں پھانکتا ہے۔ اور پانی کی جگہ تیل پی لیا ہے۔ بعض طلباء کو ایسا واقعہ پیش آیا ہے کہ مذاق میں ان کو کھسی نے پانی کی جگہ تیل دیدیا۔ اور وہ مطالعہ میں اسے مصروف رکھتے کہ ان کو اصلاً اس کی خبر نہ ہوتی۔ (ایضاً ص ۲۲)

تذقیق اور تحقیق احکام ان علماء کا کام ہے لیڈروں کا کام نہیں غضب یہ کہ لیڈر علماء کا

کلام بھی تو نقل نہیں کرتے بلکہ اپنا کلام بیان کرتے ہیں اور اپنے کلام سے علماء کے کلام کو رد کرتے ہیں حالانکہ وہ اس بات کی بھی لیاقت نہیں رکھتے کہ علماء کے کلام کو سمجھ سکیں اس پر ان کا وعیلہ یہ ہے کہ علماء کو میدان میں نکلنے کی تاکید کرتے اور ان کو اپنی تقلید پر مجبور کرنا چاہتے ہیں صاحبو! میرے نزدیک اس وقت میدان میں نکلنے کا نہیں کیونکہ حدیث میں ہے ان راایت شحام مطاعا و دینا موثرۃ وہی متبعوا و احباب کل ذی رای برأیہ مغلیہ و نجامتہ نفسک و اہل العامة۔

اور میرے نزدیک آجکل یہ سب علامات موجود ہیں اس لئے آجکل گوشت نشینی لازم ہے مگر میں اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتا اگر کسی عالی ہمت کے نزدیک ابھی ان علامات کے ظہور کا وقت نہ ہو تو بسم اللہ وہ میدان میں نکلے مگر اپنا ہجوں کو کیوں اپنے ساتھ کھینچتے ہیں آخر ایک کام یہ بھی تو ہے کہ خدا سے دعا کریں۔ تو ان کو اس کام کے واسطے رہنے دیں ایک جماعت اس کے واسطے بھی رہنا چاہیے۔ یہ تقسیم عمل اچھی ہے مگر افسوس آجکل دعا کو لوگ عمل ہی نہیں سمجھتے۔ (ایضاً ص ۲۳ تا ۲۴)

۱۰۔ لیڈر ان قوم کے طریقے

شریعت کی نظر میں

آج لیڈروں نے فلاح دنیا کے طریقے کچھ اور سوچے ہیں۔ یہ وہ صورت اختیار کرتے ہیں جو یورپ نے اور غیر اقوام نے اختیار کی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ وہ تدبیریں فلاح دنیا میں موثر نہیں مگر یہ ضرور کہوں گا کہ مسلمانوں کے واسطے مفید نہیں کیونکہ مسلمانوں میں ان تدبیر کی تاثیر سے ایک مائع موجود ہے وہ کیا؟ معصیت، خدا کی نافرمانی، اور یہ مائع کفار میں نہیں ہے کیونکہ وہ مکلف بالفروع نہیں وہ تو صرف ایمان کے مکلف ہیں ان کو کفر ہی کا عذاب ایسا سخت ہو گا کہ جس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں۔ بقیہ اعمال کی بابت نہ ان کے باز پرس ہے نہ ان پر کوئی سزا ہے۔ اور مسلمانوں سے کفر کا عذاب تو ہٹا ہوا ہے کیونکہ وہ بھلا اللہ دولت ایمان سے مشرف ہیں اس لئے ان کے اعمال پر باز پرس و گرفت ہوتی ہے جب یہ ایسے طریقے فلاح دنیا کے لئے اختیار کرتے ہیں جو خدا کے حکم کے خلاف ہیں تو ان کو کامیابی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ان تدبیر کے اثر کو زائل کر دیتے ہیں تاکہ

دنیا میں مخالفت کی سزا بھگت لیں پس ان کی اور کفار کی ایسی مثال ہے جیسے ٹوٹی اور جوتا کہ ٹوٹی میں بنجاست لگ جائے تو فوراً پھینک دی جاتی ہے اور اچھی طرح پاک کرنے کے بعد اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اور جوتے میں ناپاکی لگ جائے تو اس کو پھینکتے نہیں ہیں بلکہ رگڑ کر کام میں لے آتے ہیں۔ تو جس طرح ہر چیز کے پاک کرنے کا طریقہ مختلف ہے اسی طرح ہر قوم کی فلاح و ترقی کا طریقہ الگ ہے یہ ضروری نہیں کہ جو طریقہ ایک قوم کو نافع ہو وہ سب ہی کو نافع ہو۔ اور اگر ہم ان بھی لیں کہ یہ تدابیر ہم کو بھی نافع ہیں تب بھی ہم کو احکام الہیہ کا اتباع لازم ہے اور ان تدابیر غیر مشروعہ کا اختیار کرنا جائز نہیں۔ کیا شراب اور قمار و سود میں نفع نہیں، ضرور ہے خود نص میں ارشاد ہے۔ قتل فیہما اثم کبیر ومنافع للناس (۱) مگر اس نفع کو لے کر کیا کریں جس کے ساتھ خدا کا غضب بھی ملا ہو اسے اسلئے مسلمانوں کو وہی تدابیر اختیار کرنا چاہئیں جو شریعت کے موافق ہوں اس کی یہی صورت ہے کہ عمل کا اہتمام کیا جاوے۔ اب لیڈر تدابیر تو خلاف شرع کرتے ہیں اور علماء کی شکایت کرتے ہیں کہ یہ ہمارے ساتھ مل کر کام نہیں کرتے میں کہتا ہوں کہ اعمال غی مشرورہ میں تو شرکت کر ہی نہیں سکتے اگر یہ اعمال مشرورہ بھی ہوں تب بھی یہ شکایت صحیح نہیں تھی کیونکہ مل کر کام کرنے کے معنی نہیں ہیں کہ سب کے سب ایک ہی کام کو پلٹ جائیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ کام کر دیے جائیں جیسے لوہار، بڑھئی، معمار، مزدور سب مل کر مکان بناتے ہیں اس کے یہ معنی تھوڑا ہی ہیں کہ ہر اینٹ کو لوہار بھی ہاتھ لگائے بڑھئی بھی ہاتھ لگائے۔ بلکہ اپنے اپنے کام ہر ایک الگ کر رہا ہے پھر نتیجہ مجموعہ پر مرتب ہوتا ہے۔ اسی طرح لیڈر اگر شریعت کے موافق بھی تدبیر کریں تب بھی علماء کا یہ کام نہیں کہ وہ ان تدابیر میں عملی حصہ لیں بلکہ یہ کام عوام کا ہے یا لیڈروں کا علماء کا کام یہ ہے کہ جو تدبیر کرنا چاہو اول علماء سے استفتاء کر لو کہ جائز بھی ہے یا نہیں اور وہ اس کے متعلق حکم شرعی بتلا دیں گے تم اس پر عمل کرو۔ تمام متقدم اقوام کا یہی طریقہ ہے کہ ان کے یہاں عملی محکمہ الگ ہوتا ہے یہ نہیں کیا جاتا کہ ایک کام کے لئے طلباء اور اساتذہ بھی اپنے پڑھنے میں بدستور لگے رہتے ہیں کام کرنے والی جماعت دوسری ہوتی ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ہر قسم کی فلاح اطاعت و عمل ہی سے حاصل ہوگی دنیا میں بھی آخرت میں بھی۔ اب چونکہ مسلمانوں نے عمل صراح ترک کر رکھا ہے تو دیکھ لیجئے کیسی فلاح ہو رہی ہے ہر روز پہلے سے بدتر ہے (المربطہ ص ۱۵ تا ۱۷)۔

۱۸۔ غیر قوموں کی ترقی کا راز کیا ہے؟

اچکل ترقی کی پکار بہت ہے ہر شخص ترقی کا طالب ہے اور دوسری قوموں کی ترقی دیکھ کر مسلمانوں کے منہ میں پانی بھر بھرتا ہے اور ان کے لیڈر بار بار اس میں غور کرتے ہیں کہ دوسری قوموں کی ترقی کا راز کیا ہے مگر اب تک حقیقت تک کوئی نہیں پہنچا۔ کسی نے کہا کہ یہ لوگ سودیستے ہیں اس وجہ سے ترقی ہو رہی ہے مگر یہ بالکل غلط ہے کیونکہ اگر اس میں یہ خاصیت ہوتی تو چاہئے کہ جو مسلمانوں لیتے ہیں ان کو بھی ترقی ہوتی حالانکہ دوسری قوموں کے مقابلہ وہ بھی کچھ ترقی یافتہ نہیں ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ شریعت میں چونکہ تجارت کی بعض صورتوں کو ناجائز قرار دیا ہے اسلئے مسلمان ترقی نہیں کر سکتے مگر یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ معاملات میں حدود شرعیہ کے پابند کتنے تاجر ہیں ذرا مجھے تو بتلاؤ ان شاء اللہ دو چار کے سوا کوئی نہ ملے گا۔ پھر ان مسلمان تاجروں کو ترقی کیوں نہیں ہوتی یہ کون سے ناجائز معاملات کو چھوڑ دیتے ہیں غرض سب کی مشق اسلام پر ہے کہ مذہب ہی ترقی سے مانع ہے۔ (العبرۃ بذکر البقرة ص ۴۷)

غیر قوموں کی جو باتیں ترقی میں ذخیل ہیں وہ دوسری ہیں وہ ان کی خاص صفات ہیں جو انہوں نے آپ ہی کے گھر سے ہیں۔ مثلاً منظم ہونا مستقل مزاج ہونا۔ پابند وقت ہونا۔ منتقل ہونا، انجام کو سوچ کر کام کرنا صرف خوش سے نہ کام کرنا، ہوش سے کام لینا۔ آپس میں اتفاق و اتحاد کرنا۔ ایک دوسرے کے راز کو چھپانا۔ یہ سب باتیں وہ ہیں جن کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔ اور ان احکام میں یہ خاصیت ہے کہ ان کے اختیار کرنے سے ترقی ہوتی ہے خواہ کوئی بھی اختیار کرے اب مسلمانوں نے تو ان احکام پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔ نہ ان میں تفاف و اتحاد ہے نہ رازداری کا مادہ ہے نہ انتظام ہے نہ وقت کی پابندی ہے نہ انجام دہی ہے جو کام کرتے ہیں جو شش سے کرتے ہیں ہوش سے نہیں کرتے، اسلئے ان کو تنزل ہے اور غیر قوموں کے ان کے گھر سے چرا کر ان باتوں پر عمل شروع کر دیا تو ان احکام کی خاصیت ظاہر ہوئی کہ ان کو ترقی ہونے لگی۔ پھر یہ سترہ ناقص ہے کیونکہ چور کو گھر کے اندر کی سب چیزیں معلوم نہیں ہوا کرتیں۔ اس کو وہی چیزیں ہاتھ لگتی ہیں جو ظاہر ہوں (یا تالے کھنچے میں ہوں) دبے ہوئے خزانے کی اطلاع اسے نہیں ہوا کرتی۔ اسلئے وہ پارس کی پتھری

جو آپ کے گھر میں تھی اس کی انہیں خبر نہیں ہوئی مگر انہوں نے بیکار سمجھ کر اس کو چھوڑ دیا کیونکہ پارس کی پتھری دیکھنے میں تو پتھری ہی ہوتی ہے۔ اس کی خاصیت جسے معلوم ہو وہی اس کی قدر جان سکتا ہے نا واقف کے نزدیک کالج کا ٹکڑا اور بلور کا پتھر برابر ہے وہ پارس کی پتھری آپ کے گھر میں کیا ہے؟ ایمان و توحید و اعتقاد و رسالت نماز و روزہ وغیرہ۔ انوس آپ کو اپنے گھر کی قدر نہیں اگر آپ میں وہ صفات ہوتیں جو دوسری قومیں آپ سے لے لی ہیں تو پارس کی پتھری کیسا تھ مل کر آپ کو وہ ترقی ہوتی جو غیر قوموں کے خواب میں بھی نہ آتی ہوگی۔ آپ کو وہ عروج حاصل ہوتا جو آپ کے اسلاف کو حاصل تھا کوئی ان کے ساتھ آنکھ نہ ملا سکتا تھا۔ مگر آج کل مسلمانوں کو اس ارشاد الہی پر نظر نہیں۔ وعد اللہ الذین امنوا و عملوا الصالحات لیستخلفنہم فی الارض ولیکن لہم دینہم الذی ارتضیٰ لہم ولیبدلنہم من بعد خوفہم امنًا طیعبدونی ولا یشرکون بی شیئاً (لکھیتا) اور یہ سمجھتے ہی نہیں کہ ان کاموں کو بھی ترقی میں کچھ دخل ہے حالانکہ اس آیت میں ایمان و عمل صالح پر صاف صاف وعدہ ہے استخلاف فی الارض اور تمکین کا۔ مگر مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ نماز روزہ اور ایمان میں بھی کچھ قوت ہے اور اس سے بھی ترقی ہوتی ہے۔ انوس جس خزانے کو چور نے ناواقف ہو کر یا بیکار سمجھ کر چھوڑا تھا اس کی قیمت و قوت سے خود گھر والے بھی آج ناواقف ہیں یا بعض اعتبار سے یوں کہتے کہ بیکار ہی سمجھتے ہیں۔

مگر ایسوں کو تو مسلمان بھی نہ کہنا چاہیے۔ یہ کاہنہ کے مسلمان جو روزہ کو بیکار سمجھیں مگر ایسے تو دو چار ہی نکلیں گے زیادہ وہی ہیں

مسلمانوں کی حالت

جو اپنے خزانے کی قیمت سے ناواقف اور اس کی طاقت سے بیخبر ہیں اسلئے ان اعمال کی بقدری کرتے ہیں۔ کوئی مسلمانوں کی حالت کا متبغ کرے تو ان میں ہزاروں ایسے نکلیں گے جن کو کلمہ بھی نہیں آتا۔ اور لاکھوں ایسے ملیں گے جو نماز کو جانتے بھی نہیں کہ کس چیز کا نام ہے اور بہت سے ملیں گے جو کبھی سال میں ایک دو دفعہ پڑھ لیتے ہیں کبھی جی چاہا جمعہ کو بھی مسجد میں آجاتے ہیں اور جو تھوڑے سے اللہ کے بندے پانچوں وقت کی نمازوں کے پابند ہیں ان میں بھی قاعدے کے ساتھ صحیح طور پر ادا کرنے والے بہت کم ہیں کسی کار کو غلط ہے کسی کا مسجد کسی کا قوم فقود ہے کسی کا جلسہ، ایک گڑ بڑ کر رکھی ہے۔ تو اب آخر یہ کیا ہے؟ بقدری ہے یا نہیں۔ اور بخدا یہ بقدری اسی واسطے ہے کہ نماز کو صرف ثواب کا

کام سمجھ رکھا ہے اس کے دنیوی منافع کی ان کو خبر نہیں۔ بلکہ بعض جاہل تو نماز روزہ کو دنیوی ترقی سے مانع سمجھتے ہیں اور اگر ان کو حقیقت معلوم ہو جاتی اور یہ خبر ہو جاتی کہ ان اعمال کو ترقی اور تمکین فی الارض میں بھی دخل ہے تو پھر دیکھئے کہ مسلمان کس شوق سے ان اعمال کو بجالاتے ہیں گو اس نیت سے عمل کرنا اچھا نہیں خلوص کے خلاف طاعات سے ثمرات دنیا کا قصد نہ ہونا چاہیے۔ وہ تو تابع ہیں خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں الغرض ترقی کے اسباب تو آپ کے گھر میں موجود ہیں۔ اور آپ ہی کے گھر سے لوگوں نے چرا لے ہیں اور آپ کی یہ حالت ہے کہ دوسروں سے لیتے اور در بدر گدائی کرتے پھرتے ہیں پس وہ حال ہے

یکسید پر نان ترا بر فرق سر تو ہمیں جونی لب ناں در بدر
تا بز انوی میمان قمر آب وز عطش و ز جوع کشی تخراب

مجلس کے احباب

ردیوں کا ٹوکرا تو سر پر رکھا ہوا ہے اور در بدر بھیک مانگتے پھرتے ہیں دریا کے اندر کھڑے ہوئے ہیں اور پیاس کے مارے برا حال ہے اب دیکھئے اسلام میں ایک تقسیم یہ ہے کہ جو شخص خاص مجلس میں ہو، مجلس عام میں نہ ہو تو اس کے پاس بدون اجازت کے نہ جاؤ۔ اور یہیں زنا نہ مکان ہی کی تخصیص نہیں بلکہ مردانہ مکان میں بھی اگر کوئی پردے چھوڑ کر بیٹھا ہے اس کے پاس بھی بدون اجازت کے نہ جانا چاہیے اور زنا نہ مکان میں جس طرح دوسروں کو استیذان کا حکم ہے خود گھر والے کو بھی حکم ہے کہ اپنے گھر میں بدون اطلاع کے نہ جائے ممکن ہے کہ کوئی پردہ دار عورت آئی ہو اگر تم بلا اطلاع چلے جاؤ اس کا سامنا ہو جائے گا۔ یاں ممکن ہے تمہاری ماں بہن ہی کسی وجہ سے ننگی بیٹھی ہو اپنے گھر میں کئی دفعہ عورتوں کو ایسا اتفاق پیش آتا ہے۔ اسلئے مردوں کو حکم ہے کہ اپنے گھر میں بھی بدون اطلاع کے نہ جائیں پھر اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ جب تم کسی کے پاس جانا چاہو اور وہ اجازت نہ دے بلکہ یہ کہہ دے کہ میں اس وقت نہیں مل سکتا پھر کسی وقت ملوں گا تو اس بات کو برا نہ مانو، بلکہ لوٹ آؤ وان قیل لکم ارجعوا فان رجعوا ہوا ذلک لکم اور اس میں حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ برتاؤ تمہارے دلوں کو زیادہ صاف رکھنے والا ہے کیونکہ ایسے وقت میں شرما شرمائے گے کسی نے بلا بھی لیا تو انشراح و انبساط کے ساتھ وہ تم سے نہ ملے گا اسلئے کہ دل تو ملنے کو چاہتا ہی نہ تھا۔ تو یقیناً اس کے قلب پر تمہاری ملاقات سے گرانی ہوگی پھر ممکن ہے کہ اس گرانی کا احساس تم کو بھی ہو جائے تو اس سے

تم کو بھی دل میں شکایت ہوگی کہ کیسا روکھا آدمی ہے کیسا بدخلق ہے جس پر میرا اتنا نرا گراں ہوا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ جب کوئی کہدے کہ اس وقت نہیں مل سکتا۔ فوراً لوٹ آؤ۔ اب اس مسئلہ میں ہم لوگ کتنی کوتاہی کرتے ہیں استیذان کا سبق ہم لوگوں نے بالکل ہی بھلا دیا۔ مگر دوسری قومیں اس پر عامل ہیں کوئی شخص کے کمرے میں بدون اجازت کے نہیں جا سکتا سو دیکھ لیجئے جو قومیں اس پر عمل کر رہی ہیں ان میں باہم کیسا اتفاق ہے۔ آگے یہ ان کے تکلفات ہیں کہ استیذان کے لئے اپنے پیٹ کا کارڈ بھیجتے ہیں ہم کو ان تکلفات کی ضرورت نہیں بس زبانی اجازت لینا کافی ہے مگر ہماری تو یہ حالت ہے کوئی پردے چھوڑ کر بیٹھا ہو چاہے کوئی سو ہی رہا ہو مگر ان کا سلام اور مصافحہ قصائد ہو حالانکہ شریعت میں سونے والے کی اس قدر رعایت ہے کہ حدیث میں آتا ہے۔

انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور

حضرت مقداد راوی ہیں کہ ایک بار یہ اور چند شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے یہاں یہاں تھے۔ آپ جب رات کو ذرا دیر سے گھر میں تشریف لاتے اور یہاں لیٹے ہوئے تو آپ بہت اہستہ اہستہ تشریف لاتے اور ایسی آواز سے سلام فرماتے کہ جانگنے والا تو سن لے، اور سونے والے کی نیند خراب نہ ہو، حالانکہ یہ وہ ذات ہے کہ اگر آپ قتل بھی کر دے تو صحابہ کرام کو انکار نہ ہوتا۔ بلکہ آپ کے ہاتھ سے خوشی خوشی جان دینا ان کے نزدیک فخر تھا مگر پھر بھی آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کی نیند کی اتنی رعایت فرماتے تھے مگر یہاں یہ حالت ہے کہ ہر وقت سلام اور ہر وقت مصافحہ ہے چاہے کسی کو تکلیف ہوتی ہو چنانچہ میرے یہاں اس قسم کی باتوں پر روک ٹوک اور انتظام بہت ہے جس پر عنایت فرمادیں اس نے مجھے بہت کچھ خطاب دے رکھے ہیں ایک صاحب نے تو میرے منہ پر کہا کہ ہم کو یہ طریقہ پسند نہیں۔ انگریزوں کا سا قانون، ہر بات میں انتظام ہر بات میں انتظام۔ افسوس گویا اسلام میں انتظام ہی نہیں۔ بس اسلام تو ان کے نزدیک بے انتظامی کا نام ہے۔ حالانکہ اسلام سے زیادہ انتظام کسی نے بھی نہیں کیا۔ ہر کام کا وقت مقرر ہے۔ نماز کا بھی روزہ کا بھی حج کا بھی، اور اتنا بڑا انتظام ہے ذرا ایک تایخ سے حج مؤخر ہو جائے تو پھر سال بھر سے ورے نہیں ہو سکتا تو کیا اس کو بھی انگریزی قانون کہو گے عبادت اور بیمار پرسی کے لئے یہ قانون ہے واذا عاد احدکم المریض فليخفف الجلوس۔ حدیث میں ہے کہ جب بیمار کی عیادت

کیا کرو تو اس کے پاس تھوڑی دیر بیٹھا کرو۔ کیونکہ بیمار کو زیادہ ہجوم سے تکلیف ہوتی ہے حضرات فقہاء نے اس حکم کی حقیقت کو سمجھا دہ فرماتے ہیں کہ جس چیز سے توحش ہو وہ کام نہ کرو جس میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ مثلاً کسی کو بدھ کے دن عیادت کرنے سے اعتقاد شرک ہو گا تو اس دن عیادت کر کے اس عقیدہ کی اصلاح کر دو۔ کوئی زاہد خشک ہوتا تو یوں کہتا کہ نہیں ایسے شخص کی عیادت بدھ ہی کے دن کرنا چاہیے تاکہ اس عقیدہ باطلہ کی مخالفت ہو تو اسے صاحب پھر وہ عیادت ہی کیا ہوتی مناظرہ ہو گیا عیادت سے مقصود تو مریض کی دیکھوئی ہے آپ کی اس مخالفت سے یہ مقصود کہاں حاصل ہوا بلکہ اس کو تو آپ کی صورت دیکھ کر دہشت ہوگی کہ کجبت بدھ کے دن کہاں آؤ۔ دیکھئے اس کا کیا منحوس اثر ہوتا ہے تو وہ اس سے گھبرائیگا بات چیت کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتظام فرمایا ہے۔ لایتناہی اثنان دون الشالٹ حتی یاتی رابع (دو محققان) یعنی جہاں تین آدمی بیٹھے ہوں وہاں دو شخص اہستہ اہستہ باتیں نہ کریں اس سے تیسرے کی دشمنی ہوگی کہ مجھ کو غیر سمجھا یہاں تک کہ چوتھا آجائے تو اب دو شخص باتیں کر سکتے ہیں کیونکہ تیسرے کو باتوں کا شوق ہو گا تو وہ چوتھے سے کرنے لگے گا۔ پھر اس کو وہ بدگمانی نہ ہوگی۔ احتمال ہو گا کہ شاید اس چوتھے سے اخفا مقصود ہو اور کو اس تیسرے پر بھی احتمال ہو گا۔ سبحان اللہ نے کیسی ذرا ذرا سی باتوں کی رعایت فرمائی ہے اور یہ معجزہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ باوجود اتنے مشاغل کثیرہ کے پھر بھی آپ نے معاشرت کے دقیق سے دقیق امور کو بھی نظر انداز نہیں فرمایا۔ کیا بدون نبوت کے ایسا ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔

کفار کا قول

اسی جامعیت کی تعلیم کو دیکھ کر تو کفار کہا کرتے تھے حضرات صحابہؓ سے کہ تمہارے بنی نے تم کو ہر بات سکھلائی تھی کہ گناہ موتنا بھی سکھلا دیا کفار نے تو یہ بات طعن سے کہی تھی مگر صحابہؓ نے فرمایا کہ ہاں بیشک ہم کو حضور نے سکھلایا ہے کہ بول و براز کے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پشت نہ کریں اور داہنے ہاتھ سے اپنے عضو کو نہ چھوئیں اور تین ڈھیلوں سے کم استنجے کے واسطے نہ لئے جائیں اور ہڈی اور کوتلہ سے استنجہ نہ کریں تعلیم سن کر کفار کی آنکھیں کھل گئیں کہ واقعی بول و براز کے یہ آداب تو بدون تعلیم کے معلوم ہو ہی نہیں سکتے۔ بھلا کچھ ٹھکانا ہے انتظام کا کہ پیشاب پانچا نہ کے لئے بھی آداب مقرر ہیں پاکی اور صفائی کا یہ قانون ہے کہ آپ فرماتے ہیں اذا استيقظ احدکم من منامہ

فلا یغسین یدہ فی اناثہ لانہ لایدری این باتت یدہ - جب کوئی سوکر اٹھے تو برتن میں ہاتھ نہ ڈالے کیا خبر اس کا ہاتھ کہاں کہاں پہونچا ہوگا بھلا یہ انتظام ہی نہیں تو اور کیا ہے نیز ارشاد ہے - نَظُّفُوا اَفْنِیتَکُمْ وَ لَا تَشْبٰہُوْا بِالْیَہُوْدِ - اپنے گھر کے سامنے کا میدان صاف رکھا کرو یہود کی طرح نہ بنو۔ وہ صفائی کا اہتمام نہیں کرتے۔ سبحان اللہ! جب فنا و دار کا اتنا اہتمام ہے تو خود گھر کی صفائی کا اہتمام کیا ہوگا اور جب گھر کا اتنا اہتمام ہے تو لباس کی صفائی کا کیا کچھ اہتمام نہ ہوگا۔ پھر بدن اور روح کی نظافت کا امر تو کیا کچھ ہوگا۔

ع "قیاس کن زگلستان من بہار مرا"

اسی سے عاقل سمجھ سکتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہر کی نظافت کا قول نظر آتا تھا تو نظافت باطنی کا تو کس درجہ اہتمام ہوگا مگر آجکل مسلمانوں اپنے گھر کے اس سبق کو ایسا بھولے ہیں کہ اگر کوئی اس زمانے میں نظافت مکان و نظافت لباس و بدن کا اہتمام کرنے لگے تو اس کو عیسائی اور انگریز کہنے لگیں چنانچہ مدراس میں ایک انگریز اسلام لایا ایک روز وہ جامع مسجد میں تو گیا حوض کی نالی میں اس قدر ریٹ جما ہوا تھا جسے دیکھ کر گھن آتی تھی اس سے نہ رہا گیا اس نے ایک دو بوٹے پانی سے سب دھویا اور لوگوں سے کہا کہ صاحبو ذرا نالی میں سے کچھ بھی ریٹ تو صاف کر دیا کرو۔ دیکھو کیسا برا معلوم ہوتا ہے تو لوگ کیا کہتے ہیں، معلوم ہوتا ہے تجھ میں ابھی عیسائیت کا اثر باقی ہے (انا للہ وانا الیہ راجعون) بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ نظافت اسلامی کو کوئی دوسری قوم اختیار کر لے تو وہ اسلام سے نکل جائے اور انگریزوں کا کام ہو جائے۔ میں کہاں تک گناؤں، شریعت کے انتظام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انتظام فرمایا ہے کہ ارشاد فرماتے ہیں - لا یقولن احدکم خبیثت نفسی و

لیقولن قلست نفسی (او کما قال) یعنی اگر جی متلائے تو خبیثت نفسی نہ ہو کیونکہ مسلمان کا نفس خبیثت نہیں ہوا کرتا بلکہ یوں کہو میرا جی مالش کرتا ہے۔ متلائے ہے۔ سبحان اللہ آپ نے تو ہم کو بات کرنے کے بھی طریقے بتلائے ہیں۔ تو صاحب دوسری قوموں کی ترقی کا راز یہ ہے کہ انہوں نے آپ کے گھر سے یہ چند باتیں چرائی ہیں۔ انتظام، پابندی وقت رازداری، اتحاد و اتفاق وغیرہ، اور ان اعمال کی خاصیت یہ ہے کہ جو ان کو اختیار کرتا ہے اسے ترقی ہو جاتی ہے اسلئے دوسری قوموں کو ترقی ہو رہی ہے۔ اور آپ نے ان اعمال

کو ترک کر دیا ہے اسلئے آپ تنزل میں ہیں۔ پھر دوسری قوموں نے جو ان اعمال کو اختیار کیا ہے وہ اختیار ناقص ہے اگر اختیار کامل ہوتا تو وہ نتیجہ ہوتا جو آپ کے اسلاف کو حاصل تھا۔ جرعة خاک آمیز چوں مجنوں کند صاف گر باشد ز نام چوں کند ایک خاک آمیز گھونٹ نے تو نچا دیا ہے اگر خالص جام پیتے تو نہ معلوم کہاں پہونچتے۔ (العبرة بذکر البقرة ص ۵۹ ملخصاً)

۱۹۔ ہندو مسلم اتحاد کی خرابی

آجکل اتحاد و اتفاق کا بہت شوق ہے اسی جوش میں ایسے عالی مضامین اور باریک نکات سو جھتے ہیں کہ (کیا کہنے) چنانچہ منظرِ رنگ میں ایک ہندو نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ جب تک ہم میں اتفاق نہ ہو کا میابی نہیں ہو سکتی پھر کہا، جانتے بھی ہو کہ ہم کے کیا معنی ہیں، ہم کے معنی ہیں ہندو اور مسلمان "ہا" سے مراد ہندو اور "میم" سے مراد مسلمان۔ پھر کہا کہ ہمارے ہندو بھائی ناخوش نہ ہوں کہ "ہا" ذرا سی ہے اور "میم" لمبا ہے بات یہ ہے کہ ہندو تو ہندوستان ہی کے اندر اندر ہیں یہ کہیں باہر سے نہیں آئے اور مسلمان عرب و ایران وغیرہ بہت دور سے آئے ہیں تو ان کی مسافت بہت لمبی ہے اس لئے ان کے واسطے "میم" اختیار کیا گیا۔ اور اس کو لمبا لکھا گیا ہے مگر اس شخص نے مسلمانوں کی بابت یہ خیال نہ کیا کہ شاید وہ یہ شبہ کرنے لگیں کہ "ہا" پہلے لکھا گیا اور "میم" کو پیچھے اور "ہا" کو میم کے سر پر سوار کیا گیا اس کی کیا وجہ شاید اس کا جواب یہ دیا جائے کہ ہندو یہاں پہلے سے رہتے ہیں اور مسلمان بعد میں آئے ہیں اسلئے "ہا" کو پہلے اور میم کو پیچھے لایا گیا۔ مگر یہ شبہ پھر بھی باقی رہا کہ "ہا" کو "میم" کے سر پر سوار کیوں کیا گیا۔ اس کو پہلے ہی لکھا ہوتا۔ مگر "میم" سے "ہا" الگ لکھا ہوتا۔ مگر شاید اتفاق و اتحاد ظاہر کرنے کے لئے خلط کی ضرورت پڑی ہو اسلئے ایسا کیا گیا۔

واہیات خرافات یہ آجکل کے نکات ہیں جن کے سر نہ پاؤں غیروں کی تعریف مگر لوگ ہیں کہ ان مضامین پر لٹو ہیں اور ستم یہ کہ مسلمان بھی اس تقریر کے مدارج تھے۔ جن کے یہاں نکات و معارف ایسے ایسے عالی ہیں کہ دوسری قوموں کو ان کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اسلامی علوم و نکات کے ہوتے ہوئے یہ واہیات باتیں

اس قابل ہیں کہ مسلمان ان کی تعریف کریں؟ مگر ہماری قوم میں ایک خاص مرض یہ بھی ہے کہ دوسری قوموں کے افعال کی مدح کرتے ہیں اور اپنے گھر کی چیزوں پر ان کو ترجیح دیتے ہیں چنانچہ ایک زمانہ انگریزوں کی پرستش کا تھا۔ اس وقت تک ان کے افعال اور معاشرت کی مدح سرائی ہوتی تھی اور مسلمانوں کے طرز معاشرت پر ان کے طرز معاشرت کو ترجیح دی جاتی تھی اب ہندوؤں کی پرستش کا دور ہے اب ان کی باتوں کی مدح و ثنا ہوتی ہے غرض یہ ہمیشہ دوسروں ہی کی پرستش میں رہیں گے ان میں یہ حوصلہ نہیں رہا کہ اپنی دولت کے سامنے کسی کی چیز کو بھی منہ نہ لگائیں بلکہ سب کو اسی کے سامنے جھکانے کی کوشش کریں۔ افسوس ایسے مسلمان اب زمین کے اندر پہنچ گئے اب تو ایسے مسلمان رہ گئے ہیں کہ ایک صاحب کا مقولہ اخبار میں شائع ہوا تھا کہ اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی تو فلاں شخص (یعنی گاندھی) نبوت کا مستحق تھا۔ افسوس اس شخص کو مسلمانوں میں کوئی اس قابل نہ ملا تھا ایک ہندو ہی اس قابل ملا تھا اے صاحبو! میں پوچھتا ہوں کہ آخر یہ کون سا اسلام ہے جس میں بھی ہونے کے لئے ایمان کی بھی شرط نہیں۔ پھر لوگ کہتے ہیں کہ ہندو مسلم اتحاد کی مخالفت نہ کرو۔ جس اتحاد کا یہ نتیجہ ہو کہ مسلمان اس سے اتحاد کی طرف جائیں اس اتحاد پر صد نفریں ہے۔

پھر کوئی ان لیڈر صاحب سے پوچھے کہ جب تمہارے نزدیک ہندو بھی قابل نبوت ہو سکتا ہے تو تم نے اس قضیہ بشرطیہ کو کیوں... تکلیف دی کہ اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی کیونکہ ایسی نبوت تو ختم نہیں ہوتی اس لئے کہ ختم تو وہ چیز ہوتی ہے جو پہلے شروع بھی ہو چکی ہو اور ایسی نبوت تو آج تک شروع ہی نہیں ہوتی جس میں اسلام و ایمان کی قید نہ ہو جب وہ شروع نہیں ہوتی تو ختم بھی نہیں ہوتی بلکہ یہ تو تم نے نبوت کی قسم نکالی ہے اس کے لئے یہ شرط بڑھانا کہ اگر نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی محض حماقت ہے تم کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ نبوت اسلام تو ختم ہو چکی اب میں نبوت کی ایک دوسری قسم ایجاد کرتا ہوں جس میں ایمان و اسلام کی بھی قید نہیں اور اس قسم کا پہلا نبی فلاں شخص ہے۔ غرض عیب کرنے کے لئے بھی ہنر چاہیے کفر یہ کلمہ بھی زبان سے نکالا اور وہ بھی بے تکا۔ جس کے سر نہ پاؤں اور کمال یہ کہ ایسے کلمات کو پہنچا بھی نہ کر سکے یہ لوگ لیڈر اور مسلمانوں کے مقتدا بنے ہوئے ہیں کوئی عالم یا جاہل اس شخص کو مستنبہ نہیں کرتا کہ ان کلمات ناشائستہ سے ایمان میں فرق آگیا تو اپنے ایمان کی سلائی

کی فکر کر۔ اگر وہ اس سے توبہ نہ کرے تب تو ظاہر ہے اور اگر توبہ کر لے جب بھی یہ لوگ لیڈر اور مقتدا بننے کے قابل نہیں کیونکہ ایسے کلمات سے معلوم ہو گیا کہ یہ اسلام کی تعلیم سے بالکل کورے اور نرے جاہل ہیں۔ سو توبہ کر کے گناہ تو معاف ہو جائے گا مگر ایک منٹ کی توبہ سے علم تو حاصل نہ ہوگا۔

غرض مسلمانوں کے اندر یہ بڑا مرض پیدا ہو گیا ہے کہ ان کو دوسری قوموں کی باتیں زیادہ وقیع معلوم ہوتی ہیں اور اپنے علماء کو چھوڑ کر یہ دوسری قوموں کے افراد کی عظمت کرنے لگتے ہیں اور پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم قومیت اسلامی کے حامی و محافظ ہیں ڈلے پھر کیا قومیت اسلامی کی یہی حمایت ہے کہ تم اسلامی تعلیم کو دوسرے مذاہب کی تعلیم کے آگے اسلامی علماء اور دوسری قوموں کے افراد کے سامنے ذلیل و پست کر دو و اللہ یہی لوگ اسلام اور مسلمانوں کو ذلیل کرتے ہیں اور یہی قومیت اسلامی کو برباد کرتے ہیں۔ ان تحریکات سے خدا توان کو مطلوب ہے ہی نہیں مگر جس قومیت کا یہ رات دن رونار دتے ہیں اس کی بھی جسطیں اکھاڑ رہے ہیں۔

قومیت کی حفاظت کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی قوم کو دوسروں قومیت کی حفاظت سے مستغنی ثابت کرو۔ خود محتاج نہ بنو دوسروں کو اپنا محتاج بناؤ۔ اپنی تعلیم کے مقابلے میں کسی کی تعلیم کو ترجیح نہ دو۔ اور ثابت کر دکھاؤ کہ اسلامی تعلیم سے بہتر کوئی تعلیم نہیں۔ نیز اپنے علماء کے سامنے دنیا بھر کے عقلا کو پست اور نیچا دکھا دو اور اس کے لئے تم کو کچھ کرنا نہیں پڑے گا۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ الحمد للہ اسلام میں وہ لوگ موجود ہیں جن کے سامنے دنیا بھر کے سیاستدان طفل مکتب ہیں قرآن و حدیث کے برابر سیاسی اور تمدنی تعلیم کون سی کتاب میں ہے ذرا کوئی لاکر تو دکھائے پھر جو لوگ قرآن و حدیث کے حقیقی طور پر سمجھنے والے ہیں ان کے برابر کوئی بھی عاقل یا سیاستدان ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، بخدا ہرگز نہیں۔ مگر یہ ساری خبرانی ان علماء کی ہے جو ہر بات میں ان لیڈروں کے ساتھ ہو جیتے ہیں۔ اور لیڈروں کی طرح خود بھی کافروں کی سیاستی کے معتقد ہیں ان کی علانیہ مدح کرتے اور مبر پر بیٹھ کر وعظوں میں تو ظلم سے ان کا نام لیتے ہیں اور یہ وہ علماء ہیں جنہوں نے کسی صاحب دل کی جوتیاں سیدھی نہیں کیں۔ محض کتاب پر مٹھ کر عالم ہو گئے ہیں۔ مگر یہ

نہ کہہ کر چہرہ برفروخت رہبری داند
ہزار نکتہ باریک تر ز موایجاست
نہ ہر کہ آئینہ دار دسکندری داند
نہ ہر کہ سر بتر اشد قلندری داند

(محاسن اسلام ص ۳۲ تا ۳۷)

چنانچہ بعض نام نہاد علماء ہندوؤں کے ساتھ ان تحریکات
غیر مسلموں کی حمایت میں شریک ہوئے ہیں اور یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اپنی روش
پر چلنے سے تو کچھ زیادہ قدر نہیں ہوتی نہ زیادہ دولت ملتی ہے لاؤ وہی طریقہ اختیار کریں، جو
ہندوؤں نے اختیار کیا ہے شاید اس طرح کچھ زیادہ وقعت مل جائے۔ اور اگر انہوں نے
سوراج لے لیا تو اس میں ہمارا بھی حصہ رہے گا۔ اگر ہم الگ رہے تو بالکل محروم رہیں گے،
افسوس مسلمان ہو کر غیر بریظ، بڑی شرم کی بات ہے۔ ان لوگوں نے یہ خیال نہ کیا
کہ جو طریقہ کفار کے لئے حصول عزت کا ہے مسلمان کے لئے وہ طریقہ نہیں ہے۔ مسلمان
کبھی دوسری قوموں کی اتباع کر کے ترقی نہیں کر سکتا اگر وہ مسلمان ہے۔ مسلمان کی ساری
عزت اسی میں ہے کہ وہ اپنے طریقے پر قائم رہے اور کسی حال میں احکام شریعت سے
تجاوز نہ کرے اسی سے فلاح ہوتی ہے گو سامان کم ہو اور اس کے خلاف میں فلاح نہیں
گو سامان زیادہ ہو۔

دیکھئے اس کی تائید میں ایک باریک نکتہ بتلاتا ہوں۔ وہ
قتال کی اجازت یہ کہ مسلمانوں کو مکہ میں رہتے ہوئے قتال کی اجازت نہیں
ہوتی۔ مدینے میں پہنچ کر اجازت ہوتی اس کی کیا وجہ ہے۔ ظاہر میں یہ سمجھتے ہیں کہ قلت
جماعت و قلت اسباب اس کا سبب تھا یہ خلاف تحقیق ہے کیونکہ مدینہ ہی پہنچ کر کیا
جماعت بڑھ گئی تھی کفار کا پھر بھی غلبہ تھا۔ مدینہ کی جماعت تمام عرب کے مقابلہ میں کیا چیز
تھی بلکہ اگر یہ دیکھا جائے کہ تمام کفار عالم کے مقابلہ میں یہ اجازت ہوتی تھی۔ تب تو مدینہ
کیا سارا عرب بھی قلیل تھا۔ اسی طرح مدینہ پہنچ کر سامان میں کیا زیادتی ہو گئی تھی۔ کفار
ہمیشہ نہایت سارو سامان سے مقابلہ کرتے تھے اور مسلمانان مدینہ کی یہ حالت تھی کہ
بعض مواقع میں ایک ایک سواری میں سات آٹھ آدمی شریک ہوتے تھے بعض دفعہ
چند آدمیوں میں ایک ہتھیار مشترک ہوتا تھا پس یہ کہنا بالکل واقع کے خلاف ہے
کہ مدینہ میں جا کر جماعت و سامان کی زیادت اس اجازت کا سبب ہوئی انصوص سے خود

معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کفار کے مقابلہ میں اکثر مواقع میں اس قدر کم ہوتی تھی کہ
ملائکہ کا جوڑ لگایا جاتا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وانزل جنود الم تر وھا۔ اور ارشاد ہے۔
بلی ان تصبروا و اتقوا و یا تو کم من فورہم ہذا ایمد دکم دیکم بخمستہ آلاف
من الملائکۃ مسومین ط۔

اور یہ صورت نزول ملائکہ کی مکہ میں رہتے ہوئے بھی ممکن تھی، مگر
اخلاق کا رسوخ پھر بھی اس صورت کو اختیار کر کے وہاں۔۔۔ اجازت نہ دی
گئی تو اس کی کوئی وجہ بتلانی چاہیے اہل ظاہر اس کی شافی وجہ نہیں بتلا سکتے محققین نے فرمایا
ہے کہ اصل بات یہ تھی کہ مکہ میں مسلمانوں کے اندر اخلاق حمیدہ اخلاص و صبر و تقویٰ وغیرہ
کامل طور پر راسخ نہ ہوئے تھے اس وقت اگر اجازت قتل کی ہو جاتی تو سارا مقابلہ جو شش
غضب و انتقام للنفس کے لئے ہوتا محض اخلاص و اعلا کلمۃ اللہ کے لئے نہ ہوتا اور اس
حالت میں وہ اس قابل نہ ہوتے کہ ملائکہ کی جماعت سے ان کی امداد کی جائے اور حمایت الہی
ان کے شامل حال ہو۔ چنانچہ آیت مذکورہ میں بلی ان تصبروا و اتقوا۔ کی شرط بتلا رہی
ہے کہ حمایت الہی اس وقت متوجہ ہوتی ہے جبکہ مسلمان صبر و تقویٰ میں راسخ ہوں اور تقویٰ
کے معنی ہیں۔ احتراز عما نہی اللہ عنہ و امثال ما امر بہ
جس میں اخلاص اور احتراز عن الریاء و عن شائبۃ النفس بھی داخل ہے اور مدینہ میں پہنچ کر
یہ اخلاق راسخ ہو گئے تھے مہاجرین کو مکہ میں رہنے کی حالت میں کفار کی ایذا پر صبر کرنے
سے نفس کی مقاومت سہل ہو گئی نیز قوت غضب نفسانی ضعیف بلکہ زائل ہو گئی تھی۔ پھر
ہجرت کے وقت جب انہوں نے اپنے وطن و اہل و عیال و مال و دولت سب پر خاک
ڈال دی، تو ان کی محبت الہی کامل ہو گئی اور محبت دنیا ان کے قلب سے بالکل نکل گئی
انصار مدینہ نے مہاجرین کے ساتھ جو سلوک کیا اس سے ان
انصار مدینہ کے قلوب بھی محبت الہی سے لبریز اور محبت دنیا سے پاک
ہو گئے تھے چنانچہ انصار نے خوش خوش ان حضرات کو اپنے مکانات و اموال میں شریک
کرنا چاہا۔ بلکہ بعض صحابہ نے تو یہاں تک کیا کہ ایک مہاجر صحابی سے کہا کہ تم میرے بھائی
ہو گئے ہو اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اپنا تمام مال آدھوں آدھ تقسیم کر کے نصف خود
لوں اور نصف تم کو دیدوں اور میرے پاس دو بیبیاں ہیں ان میں سے جوں سی تم کو پسند ہو

میں اسے طلاق دیکر ابھی الگ کر دوں عدت گزرنے کے بعد تم اس سے نکاح کر لینا۔ مہاجر نے انکو دعادی کہ خدا تمہارے مال و عیال میں برکت دے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں تم مجھے بازار کا راستہ بتا دو۔ میں تجارت کر کے اپنا گذر کر دینگا۔

واقعہ ہجرت سے امتحان غرض واقعہ ہجرت سے مہاجرین و انصار دونوں کا امتحان ہو گیا جس میں وہ کامل اترے اس کے بعد ان کو اجازت قتال دی گئی کہ اب جو کچھ کریں گے محض خدا کے لئے کریں گے اس وقت یہ اس قابل ہوں گے کہ حمایت الہی ان کا ساتھ دے اور ملائکہ رحمت ان کی مدد کریں۔ چنانچہ حضرات صحابہؓ کے واقعات اس پر شاہد ہیں کہ وہ جو کچھ کرتے تھے خدا کے لئے کرتے تھے۔ حتیٰ کہ شہنوی میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی کو معرکہ قتال میں پچھاڑا اور ذبح کا ارادہ کیا۔ مرنے لگا کہ نہ کرنا۔ اس کبخت نے آپ کے چہرہ مبارک پر ہتھوڑا۔ اب چاہیے تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کو فوراً ہی ذبح کر ڈالتے۔ مگر مٹھونکے آپ فوراً اس کے سینہ پر سے کھڑے ہو گئے اور فوراً اسے چھوڑ دیا وہ یہودی بڑا متعجب ہوا کہ میری اس ترکیب کے بعد تو ان کو چاہیے تھا کہ مجھے کسی طرح جیتنا چھوڑتے۔ مگر انہوں نے برعکس معاملہ کیا آخر اس سے نہ رہا گیا۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اس کی وجہ پوچھی کہ آپ نے اگر مجھ کو کافر سمجھ کر قتل کرنا چاہا تھا تو ہتھوڑے کے بعد کیوں رہا کر دیا۔ اس فعل سے نہ میرا کفر زائل ہوا نہ عداوت سابقہ ختم ہوئی بلکہ اور زیادہ ہو گئی تھی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ واقعی اس فعل کے بعد میرا رہا کر دینا بظاہر عجیب ہے مگر بات یہ ہے کہ اول جب میں نے تجھ پر حملہ کیا تو اس وقت بجز رضائے حق کے مجھے کچھ مطلوب نہ تھا۔ اور جب تو نے میرے اوپر ہتھوڑا تو مجھے غصہ اور جوش انتقام پیدا ہوا میں نے دیکھا کہ اب میرا تجھے قتل کرنا محض خدا کے لئے نہ ہو گا بلکہ اس میں نفس کی بھی آمیزش ہوگی اور میں نے نہ چاہا کہ نفس کے لئے کام کر کے اپنے عمل کو ضائع کر دوں اسلئے تجھے رہا کر دیا۔ یہودی یہ سن کر فوراً مسلمان ہو گیا، اور سمجھ گیا کہ واقعی یہی مذہب حق ہے جس میں شرک ہے اس درجہ نفرت و لائی کمی ہے کہ کوئی کام نفس کے لئے نہ کرے بلکہ محض خدا کے لئے ہر کام کر دے دوستی اور دشمنی میں بھی نفس کی آمیزش سے روکا گیا ہے اب ہماری حالت یہ ہے کہ جو لوگ خدمت اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جو نفس کے واسطے کام کرتے ہیں اپنے ذرا ذرا سے کارناموں کو اچھالتے اور اخباروں میں شائع کرتے ہیں احکام الہی کی پروا نہیں کرتے بس ان کا مقصود یہ ہے کہ کام ہونا چاہیے

خواہ شریعت کے موافق ہو۔ یا مخالف۔ چندہ میں جائز و ناجائز کی پروا نہیں۔ صرف میں حلال و حرام کا خیال نہیں پھر حمایت الہی ان کے ساتھ کیونکر ہو۔

مسائل سے اجتناب بلکہ اب تو یہ کہا جاتا ہے کہ مسئلے مسائل کو ابھی رہنے دو، اس وقت تو کام کرنا چاہیے۔ بعد کو مسئلے مسائل دیکھے جاویں گے۔ (افلاک) وانا الیہ راجعون۔ ان صاحبوں کو یہ خبر نہیں کہ مسئلے مسائل کے بغیر تو مسلمان کو نہ دنیوی فلاح ہو سکتی ہے نہ اخروی اور سب سے زیادہ اخلاص نیت کی ضرورت ہے جس کا یہاں صفر ہے ہمارے بزرگان دین جو محمد اللہ اب بھی موجود ہیں وہ محض خدا کے واسطے کام کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ کسی کام میں شریعت سے ایک انچ بھی بڑھنا نہیں چاہتے اسی طرح جو ان حضرات کے صحبت یافتہ ہیں وہ بھی نفس کے کام نہیں کرتے۔ (ایضاً صفحہ ۳ تا ۴)

اور جن کو خدا کے ساتھ یہ تعلق حاصل نہیں ان کی یہ حالت ہے کہ آج ان کے کچھ فتویٰ ہیں اور کل کو جہاں اغراض بدلیں ساتھ کے ساتھ ان کے فتویٰ بھی بدل گئے۔ ارے یہ کیا قصہ ہے یہ کیسا اسلام ہے جو اغراض کے تابع ہے۔ مسلمان کو تو ایسا ہونا چاہیے۔ ع۔

”یکے خوان دیکے دان دیکے گو“

مسلمان کو تو ایسا ہونا چاہیے کہ اس ذات کے ساتھ علاقہ رکھے جو ہمیشہ باقی رہے والی ہے اور اغراض فانیہ کی نفی کرنی چاہیے اور ان کے متعلق کا لایحب الا فلین کہہ دینا چاہیے۔

خلیل آسادر ملک یقین زن صدائے لایحب الا فلین زن

پہلے سب علماء کا فتویٰ تھا کہ ریل میں بدو نہ ٹکٹ سفر کرنا حرام ہے مگر اب حالت یہ ہے کہ اس کو جائز کر دیا ہے۔ بہت لوگ جو علماء و طلباء کہلاتے ہیں بے ٹکٹ سفر کرنے لگے۔

میرے پاس ایک طالب علم کا خط آیا کہ بدو نہ ٹکٹ کے ریل میں سفر کرنے کو جائز سمجھتا ہوں اور میرے باپ اس سے منع کرتے ہیں ان کے باپ انگریزی خواں دنیا دار تھے اللہ اکبر۔ کبھی وہ زمانہ تھا کہ عربی خواں اس سے منع کرتے تھے اور انگریزی خواں اس کو جائز کہتے، اب یہ حالت ہے کہ عربی خواں جائز کہتا ہے اور انگریزی خواں منع کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ انگریزی دان کسی دانا یعنی (عارف) کا ذبح کیا ہوا تھا۔ (ایضاً صفحہ ۴)

اسی طرح اللہ کا ہو رہے تب اسلام کامل ہوتا ہے ورنہ وقت پر سب لکھا پڑھا

غائب ہو جاتا ہے۔ صاحبو! بدون صحبت اہل اللہ کے توحید بھی کامل نہیں ہوتی۔ کیونکہ توحید کی حقیقت یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی سے خوف و طمع نہ ہو۔

موجود چہ برپائے ریزی رزش چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش بنا شد و کس ہمیں ست بنیاد توحید بس

مگر ہماری یہ حالت ہے کہ ہم اسلام کے درجہ ناقص پر کفایت اسلام میں قناعت کرتے ہیں اس کی تکمیل کی فکر نہیں کرتے۔ نہ نماز کی فکر ہے نہ روزہ کی، بس ہم کو تکمیل اسلام کی فکر کرنا چاہیے۔ اسلام کامل یہ ہے کہ انسان پورا اللہ والا ہو جائے جب اس کا ایک شعبہ یہ ہے کہ دین کو دنیا اور اغراض کے تابع نہ بنایا جائے۔ اس وقت دین کی فہم حاصل ہوگی۔ اور جس کے اوپر اغراض نفسانی کا غلبہ ہوگا اسے دین کی سمجھ حاصل نہ ہوگی۔ ایسے ہی علماء کا یہ خیال ہے کہ ذبیحہ گاوٹ شعار اسلام نہیں۔ (ایضاً ص ۴۵)

تبلیغ دین کی ممانعت آجکل ایسے بھی مسلمان ہیں جو تبلیغ کے کام میں روٹے اٹکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کام چھوڑ دو۔ اس سے ہندو مسلم اتحاد میں فرق آتا ہے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) ان کے یہاں ابھی ہندوؤں سے اتحاد ہی چلا آرہا ہے۔ مگر مزہ یہ ہے کہ اتحاد تو جانبین سے ہوا کرتا ہے مگر ان کا اتحاد ایک طرف ہے کہ ہندو تو ان کی ذرا سی بھی رعایت نہیں کرتے۔ جہاں ان کو موقع ملتا ہے مسلمانوں کو مرتد کر لیتے ہیں۔ آبروریزی یا جان و مال کے درپے ہو جاتے ہیں مگر ان حضرات کا اتحاد اب بھی باقی ہے۔ بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ جب مسلمانوں کو ہندو مرتد بنا رہے ہیں تو کیسا مسلمانوں کو مرتد ہونے دیا جائے، ان کو سنبھالنے کی کوشش نہ کی جائے اگر ان کی یہی رائے ہے تو اس کا یہ مطلب ہو کہ چاہے ایمان جاتا رہے مگر اتحاد نہ جائے تو ایسے اتحاد پر لعنت ہے جس کے واسطے ایمان و اسلام کی بھی پروا نہ رہے۔ جن صاحبوں کی یہ رائے ہو وہ خود تبلیغ نہ کریں مگر جو لوگ یہ کام کرنا چاہتے ہیں ان کو کیس لئے روکتے ہیں۔ (ایضاً ص ۵۵)

اور تماشایہ ہے کہ آجکل جو یہ تحریک اسنادِ فتنہ ارتداد چل رہی ہے اس کے متعلق ایسے بعض علماء نے ایک اشتہار میں شائع کیا ہے کہ یہ تحریک چونکہ خالص مذہبی تحریک ہے اسلئے اس میں ہر طبقہ کو شریک ہونا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہلی تحریکات خالص مذہبی نہ تھیں اس میں غیر مذہب کا بھی دخل تھا۔ دل میں تو ان تحریکات کی حقیقت کو سمجھ ہی رہے تھے۔

مگر احمدیہ برسوں کے بعد اب زبان سے بھی اقرار کر لیا کہ پہلی تحریکات خالص مذہبی نہ تھیں۔ پھر معلوم ان میں شرکت نہ کرنے والوں کو کافر و فاسق کیوں بنایا گیا۔ یقیناً جو امر مذہب و غیر مذہب سے مرکب ہو گا وہ فرض واجب کبھی نہیں ہو سکتا، مگر ستم یہ ہے کہ ان لوگوں نے تحریکات سابقہ کی شرکت کو فرض واجب بنا رکھا ہے۔

صاحبو! مذہب میں بھی سیاسیات کا بہت بڑا حصہ ہے مگر وہ سب مذہب کے تابع ہے اور وہ سیاسیات خالص مذہبی سیاسیات ہیں ان میں غیر مذہب کا دخل ہرگز نہیں ہو سکتا، اگر ان حضرات کے نزدیک پہلی تحریکات مذہبی سیاسیات میں داخل نہیں تو ان کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ تحریک اسنادِ ارتداد خالص مذہبی تحریک ہے اس میں سب کو شریک ہونا چاہیے اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلی تحریکات خالص مذہبی نہ تھیں تو پھر وہ مذہبی سیاسیات میں داخل نہ تھیں۔ (ایضاً ص ۶۲)

۲۰۔ مقصود بالذات رضا حق ہے نہ کہ سلطنت

آجکل جو عوام حکومت کے مقابلہ میں بہادر بنے ہوئے ہیں، اس کا راز یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ ہم کو پوچھتا کون ہے ہاں جو لوگ مشہور ہیں۔ ان کا حکومت سے مقابلہ کرنا بیشک بہادری ہے کیونکہ ان کو ہر وقت اپنے اوپر خطرہ ہے گو اس سے بحث نہیں کہ یہ بہادری جائز ہے یا حرام، اور یہ دینی شجاعت ہے یا نفسانی ہتور، اس کو علماء سے پوچھو، مگر صاف بات یہ ہے کہ علماء بھی سب نہیں ہیں بلکہ علماء بھی حقیقت میں وہ ہیں جو لیڈروں کے تابع نہ ہوں حکم شرعی کے تابع ہوں۔ اور جو علماء لیڈروں کے تابع ہوں ان کی حالت یہ ہے کہ واللہ اگر لیڈر آج اپنی رائے کو بدل دیں تو یہ علماء بھی ادھر ہی ہو جائیں مگر ہیں عقلمند کہ فوراً فتویٰ نہ بدلیں گے کیونکہ اس سے عوام کو صاف معلوم ہو جائیگا کہ ان کے فتوے لیڈروں کی رائے کے تابع ہیں بلکہ آہستہ آہستہ اپنی رائے کو بدلیں گے۔

آجکل علماء لیڈروں کے ساتھ دو وجہ سے ہیں یا تو اس لئے کہ ان سے علیحدگی میں زوال جاہ کا اندیشہ ہے چنانچہ مشاہد ہے کہ جو علماء ان کے ساتھ ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے ان تحریکات

میں شرکت نہ کی تو مد رسہ کا چندہ بند ہو جائے گا کوئی مد رسہ کی اعانت نہ کرے گا ایک عالم نے مجھے لکھا تھا کہ ان تحریکات سے علیحدگی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اکیلے رہ جاؤ گے کوئی تمہارے ساتھ نہ ہوگا۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے خدا کا ساتھ کافی ہے اور کسی کے ساتھ ہونے کی ضرورت نہیں لعنت ہے ایسے جاہ و مال پر جس سے مخلوق کی رضا مقصود ہو۔

مسلمانوں کی شان تو یہ ہونا چاہیے کہ رضائے الہی کے سامنے اس کو کسی پروا نہ ہو۔ اگر مخلوق اس کو پاگل بنا کر چھوڑ دے مگر خدا راضی ہو تو وہی اس کے لئے سلطنت ہے اگر وہ پاگل بھی ہے تو کس کا پاگل ہے

ما اگر نکلاش دگر دیوانہ ایم

مست آل ساقی و آل پیمانہ ایم

اس کے نزدیک جو خدا کا دیوانہ نہ ہو وہ خود دیوانہ ہے

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد

مگر ان کی دیوانی عقل کی دیوانگی نہیں بلکہ مستی عقل سے ان پر ایک نشہ سوار ہے۔ یہ وہ

دیوانگی ہے جس پر ہزار عقلیں تریبان ہیں

سے ادکل سرخ ست تو از خوش میخوای

مست عقل است او تو بخوش میخوای

کوئی تو اسلئے نیند میں پڑا سو رہا ہے کہ روٹی نہیں ملی، فاقہ گذر رہا ہے اور یہ اسلئے نیند میں ہے کہ کھا بہت گیلے۔ بہت کھانے سے بھی نیند آیا کرتی ہے۔ اسی طرح کوئی تو اسلئے مجنون ہے کہ اس کے پاس عقل نہیں اور کوئی اس لئے مجنون ہے کہ غلبہ عقل سے مست ہو گیا ہے یہ لوگ مصالح کو مصالح کی طرح پیس ڈالتے ہیں۔ ان کی بڑی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ ایک کو راضی کر لیں

مصلحت دیدن آنست کہ یاران ہمہ کار

بگذارند خسم طرہ یاری گیرند

یاد رکھو سلطنت مقصود بالذات نہیں بلکہ اصل مقصود رضائے حق ہے

رضائے حق اگر ہم سے خدا راضی نہ ہو تو ہم سلطنت کی حالت میں فرعون ہیں۔ اور لعنت

ہے ایسی سلطنت پر جس سے ہم فرعون کے مشابہ ہوں اگر سلطنت مقصود بالذات ہوتی تو فرعون

و ہامان و فرود و شداد بڑے مقرب ہونے چاہتے حالانکہ وہ مژدہ ہیں معلوم ہوا کہ سلطنت وہی

مطلوب ہے جس میں رضائے حق بھی ساتھ ساتھ ہو اور جس سلطنت میں رضائے حق نہ ہو وہ

دباں جان ہے اگر ہم سے خدا راضی ہو تو ہم پاخانہ اٹھانے پر بھی راضی ہیں اور اسی حالت میں ہم بادشاہ ہیں۔ آخر حضرت ابراہیم بن ادہم کیا تمہارے نزدیک پاگل تھے۔ ان کو تو سلطنت ملی ہوئی تھی۔ پھر کیوں چھوڑی محض اس لئے کہ مقصود میں خلل واقع ہوتا تھا۔ معلوم ہوا کہ سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ مقصود دوسری چیز ہے کہ اگر اس میں خلل واقع ہونے لگے تو اس وقت ترک سلطنت ہی سلطنت ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم ہر فن کے امام ہیں۔ حدیث میں ثقہ اور محدث ہیں اور فقہار میں فقیہ اور صوفیہ میں تو امام ہیں۔ ان کو کوئی پاگل نہیں کہہ سکتا جو ان کو پاگل کہے وہ خود پاگل ہے۔ پھر دیکھو تو انہوں نے کیا کیا۔ جب رضائے حق میں سلطنت کو مزاحم دیکھا تو بادشاہت پر لات مار کر الگ ہو گئے۔

حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو سلطنت مضر مقصود نہ تھی، تو ان کو اجازت دی

گئی کہ منصب خلافت کو قبول کریں اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے لئے مضر مقصود تھی

تو ان کے لئے حکم ہے لا تلین مال یتیم ولا تقضین بین اثنیین۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ مقصود رضائے حق ہے اگر

سلطنت سے مقصود میں خلل واقع ہو تو اس وقت اس سے منع کیا جائے گا، حضرت ابوذر

تو اتباع احکام کا ارادہ بھی کرتے تھے ان کو جب بھی قضاء و حکومت کی اجازت نہ دی گئی اور

تم تو اتباع احکام کا بھی قصد نہیں کرتے۔ اس حالت کی تم کو کیونکر اجازت دی جاسکتی ہے چنانچہ

دیکھ لو کہ جو لوگ ابھی تھوڑا زمانہ ہوا پچائیت میں مقدسات کا فیصلہ کرتے تھے۔ ان کے کتنے

فیصلے شریعت کے موافق ہوتے تھے اور وہ خود اتباع احکام کتنے کرتے تھے حالت

یہ تھی کہ وہ خود لوگوں کے دبائے ہوئے ہیں اور پچائیت میں فیصلہ کر رہے ہیں جن میں اکثر

فیصلے خلاف شریعت ہوتے تھے اگر ان لوگوں کو سلطنت مل جاتی تو مخلوق کو کچا کھا جاتے تو

کیا تم یہ چاہتے ہو کہ خدا تعالیٰ اس ظلم کی حالت میں تم کو سلطنت دیدیں۔ ارے اگر تم بادشاہ بن

جاتے تو نہ معلوم مخلوق کا کیا حال ہوتا۔ بڑی خیر ہوئی کہ خدا نے گنہ گوناخن ہی نہ دیئے اتنا

ہی فرق دیکھ لو اپنے میں اور ان لوگوں میں جن کو خدا نے سلطنت دے رکھی ہے کہ تم نے

اپنے مخالفوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا، اور اہل سلطنت نے تمہارے ساتھ باوجود تمہاری

اس مخالفت کے کیا برتاؤ کیا اگر تم بادشاہ ہوتے اور اس وقت تمہاری ساتھ کوئی اس طرح

مقابلہ سے پیش آتا۔ جیسا تم اس وقت سلطنت کے ساتھ برتاؤ کر رہے ہو تو نہ

مقابلہ سے پیش آتا۔ جیسا تم اس وقت سلطنت کے ساتھ برتاؤ کر رہے ہو تو نہ

کنتوں کو پھانسی پر لٹکاتے اور ساری خرابی اس کی ہے کہ تم صرف سلطنت کو مقصود سمجھتے ہو رضائے حق کو مقصود نہیں سمجھتے ہو اسلئے تم کو خلاف شرع اقوال و افعال سے درباک نہیں (تقلیل الاختلاط مع الانام ص ۶۳ تا ۶۴)

۲۱۔ تشبہ بالکفار مذہبی کاموں میں حرام ہے۔

میں ایجادات یورپ سے انتفاع کو منع نہیں کرتا۔ ہاں تشبہ اور کورانہ تقلید سے منع کرتا ہوں۔ اور تشبہ بالکفار جو شریعت میں حرام ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ تشبہ بالکفار امور مذہبی میں تو حرام ہے اور شعار قومی میں مکر وہ تحریمی ہے باقی ایجادات و انتظامات میں جائز ہے وہ درحقیقت تشبہ ہی نہیں۔ بعض لوگ ان احکام کو شریعت سے خارج سمجھتے ہیں اسلئے میں نے اس مضمون کو بیان کر دیا کہ شعار قومی میں بھی تشبہ حرام ہے گو قسم اول کے درجے میں نہ ہو مگر پیشاب و پاخانہ میں فرق ہونے سے پیشاب پینا گوارا کر لے گا؟ ہرگز نہیں! بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے کوٹ پتلون پہن کر ٹوپی تو اسلامی پہن لی ہے اب تشبہ کہاں رہا میں کہتا ہوں تشبہ کامل نہ سہی ناقص تو ہوا اگر آپ ایسا کر سکیں کہ سارا لباس زنانہ پہن کر اوپر سے مردانہ ٹوپی پہن لیں اور اسی حلیہ سے محفل میں جاسکیں تو ہم آپ کو اسلامی ٹوپی اور کفری پانجامہ کی بھی اجازت دیدیں گے۔

صاحبو! مشتبہ صورت بھی ممنوع ہے۔ ہمارے یہاں ایک

مشتبہ صورت۔ عرب علم کنویں کے پاس پانجامہ دھو رہے تھے میں نے پوچھا یہ پانجامہ پاک ہے یا ناپاک۔ کہا مشتبہ ہے۔ میں نے کہا پھر تم اس کو کنویں کے پاس دھوئے ہو اور یہی ہاتھ ڈول رسی کو لگاتے ہو جس سے سارا کنواں مشتبہ ہو جائے گا تم خانقاہ سے نکلو ہدایہ پڑھ کر بھی پاکی ناپاکی کا خیال نہیں۔ کہنے لگے مجھے عقل نہیں۔ میں نے کہا۔ اس جواب سے جرم کی تو نفی ہو گئی مگر ضرورت اخراج کی نفی نہیں ہوئی۔ کیونکہ اخراج کے لئے یہ ضرور نہیں کہ جرم ہی پر اخراج ہو بلکہ کم عقلی بھی موجب اخراج ہے۔ غرض ان کو خانقاہ سے نکال دیا گیا۔ تو آپ نے دیکھا کہ مشتبہ پانجامہ کو ناپاک ہی کا حکم دیا گیا۔ جیسے ناپاک کپڑوں کا دھونا کنویں کے پاس جرم ہے ایسے ہی مشتبہ کپڑے کا دھونا بھی جرم ہے اسی طرح آپ اس کو بھی سمجھ لیجئے

کہ اسلامی ٹوپی اور کفری پانجامہ پہننے سے گو آپ بالکل ناپاک نہ ہوں گے مگر مشتبہ تو ہو جائیں گے اور اسلام نے مشتبہ صورت سے بھی منع کیا ہے۔

صاحبو! کیا حیرت نہیں ہے کہ ایک برطانوی جرنیل کو تو یہ حق ہو کہ وہ جرمنی و ردی کو جرم قرار دیدے کیونکہ وہ برطانویہ کا دشمن ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق نہ ہو کہ آپ دشمنان خدا کی وضع کو جرم قرار دیں مگر اسلام میں تعصب نہیں۔ چنانچہ تشبہ بالکفار کے مسئلہ میں شریعت نے تفصیل کی ہے کہ جو چیز کفار ہی کے پاس ہو اور مسلمانوں کے یہاں اس کا بدل نہ ہو اور وہ شئی کفار کی شعار قومی یا امر مذہبی نہ ہو تو اس کا اختیار کرنا جائز ہے جیسے بندوق طوپ، ہوائی جہاز، موٹر وغیرہ چنانچہ ایک بزرگ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ کے دست مبارک میں بندوق ہے اور آپ اس کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں نعم السلاح کہ یہ بہت اچھا ہتھیار ہے۔ میں اس خواب سے استدلال نہیں کرتا صرف تائیداً بیان کر دیا ورنہ اصل استدلال قواعد فقہیہ ہے۔ اس قاعدہ کی بناء پر نہ ہم ایجادات سے منع کرتے ہیں اور نہ ایجادات یورپ کے استعمال سے منع کرتے ہیں۔ گو اسلام میں ایجادات کی تعلیم بھی نہیں ہے اور یہ اسلام کا کمال ہے کہ اس میں صرف مقاصد کی تعلیم ہے غیر مقاصد کی تعلیم نہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے بی، اے، کے اسکول میں جو تہ بنانے کی تعلیم نہیں ہوتی۔ اور یہ اس کے لئے نقص نہیں بلکہ کمال ہے اور اگر اسکول میں بی، اے کے ساتھ جو تہ سینے اور پاخانہ کمانے کی بھی تعلیم دی جاتی ہو تو یہ اس کے لئے نقص ہوگا۔ کمال نہ ہوگا۔

اسلام کی تعلیم

حکیم محمود خاں کا یہ کمال تھا کہ وہ جو تہ بنانے کی ترکیب نہیں سکھلاتے تھے ہاں یہ بتلاتے تھے کہ جو تہ اس طرح مت سلواؤ کہ اس کی مینیں ابھری ہوتی ہوں جس سے پر زخمی ہو جاوے۔ اسی طرح اسلام ایجادات نہیں سکھلاتا ہاں یہ سکھلاتا ہے کہ کسی ایجاد کو اس طرح نہ اختیار کرو جس سے دین میں خلل ہو یا جان کا خطرہ ہو اسی طرح یہ بتلاتا ہے کہ بے ضرورت ایجادات کے درپے ہو کر ضروری کاموں کو ضائع نہ کرو اور ضروری ایجادات میں بھی اس کا لحاظ رکھو کہ موہوم منفعت کے لئے قطرہ توبہ کا تحمل نہ کرو۔ غرض اصول تو ہر ایجاد کے متعلق بتلا دیئے ہیں مگر ان کی ترتیب نہیں بتائی کیونکہ یہ مقصود اسلام سے الگ ہیں اور کمال اسی کا نام ہے کہ مقصود سے تجاوز نہ کیا جائے۔ یہ تو ان ایجادات کا حکم تھا جن کا بدل مسلمانوں کے یہاں نہیں ہے اور جو ایجاد ایسی ہو جس کا بدل

مسلمانوں کے یہاں بھی موجود ہے اس میں تشبیہ مکروہ ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاسی کمان کے استعمال سے منع فرمایا ہے کہ اس کا بدل مسلمانوں کے پاس عربی کمان موجود تھی اور دونوں کی منفعت برابر تھی صرف ساخت کا فرق تھا۔

غرض اسلام میں تعصب نہیں جیسا کہ اس تفصیل سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ ہاں اسلام میں عزت ہے کہ جو چیز مسلمانوں کے پاس بھی ہے۔ اور کفار کے پاس بھی ہے صرف وضع قطع کا فرق ہے اس میں اسلام نے تشبیہ بالکفار سے منع کیا ہے کہ اس میں علاوہ گناہ کے ایک بے عزتی بھی تو ہے کہ بلا وجہ اپنے کو دوسری قوموں کا محتاج ظاہر کیا جاوے۔ مگر آجکل مسلمانوں میں غیرت نہیں رہی کہ یہ اپنے گھر سے بے خبر ہو کر بلکہ یوں کہتے کہ اپنے گھر کو آگ لگا دو دوسروں کی عادات و معاشرت کا اتباع کرنے لگے، بس ان کی مثال ایسی ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں

یک سید پر نان تر از فرق سر توہمی جوئی لب ناں در بدر
تا بز انوی میان قعر آب وز عطش و ز جوع کشستی خراب

چنانچہ آجکل بے پردگی میں بھی مسلمان یورپ کی تقلید کرنے لگے ہیں حالانکہ یورپ بے پردگی والے عورتوں کی آزادی سے بہت گھبرائے ہیں، اسی طرح بعض لوگ عورتوں کو مردوں کے ساتھ مساوات دینا چاہتے ہیں یہ سبق بھی یورپ ہی سے سیکھا ہے اور یورپ والے اس سے گھبرا گئے ہیں کیونکہ عورتوں نے ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ اخبارات کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اہل یورپ کو عورتوں نے کیا ریشان کر رکھا ہے۔

صاحبو! اسلام کی تعلیم کی قدر کرو۔ اسلام کی تعلیم کی قدر کرو!! اسلام کی تعلیم یہ ہے۔ ولہن مثل الذی علیہن بالمعروف وللرجال علیہن در جنت یعنی حقوق میں تو عورتیں مردوں کے مساوی ہیں۔ مگر درجہ میں مرد بڑھے ہوئے ہیں جس کو دوسرے مقام پر صاف طور سے بیان فرمایا ہے۔ الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضہن علی بعض بما انفقوا من اموالہم کہ مرد عورتوں پر سردار ہیں کیونکہ خدا نے ان کو فضیلت دی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عورتیں مردوں کی امام نہیں بن سکتیں نہ ان پر حکومت کر سکتی ہیں۔ وللرجال علیہن در جنت کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔ واللہ عزیز حکیم کہ اللہ زبردست ہیں اگر وہ چاہتے تو مرد و عورت دونوں کو برابر کر دیتے۔ مگر وہ حکیم بھی ہیں۔ حکمت کا تقاضہ یہی ہے کہ برابر نہ ہوں اگر عورتوں کو آزادی دے دی جائے تو پھر

ان کی آزادی کی روک تھام بہت دشوار ہوگی جیسا کہ اہل یورپ کو دشواریاں پیش آرہی ہیں کیونکہ اول تو آزادی کی روک تھام عقل سے ہوتی ہے اور عورتوں سے عقل نہیں ان کا ناقص العقل ہونا مشاہد ہے۔ دوسرے طبعی قاعدہ ہے کہ جو قوت ایک زمانہ تک بند رہی ہو جب اس کو آزادی ملتی ہے تو ایک دم سے ابل پڑتی ہے، جیسے امریکہ والے ایک عرصہ تک جاہل رہے جب ان کو تعلیم حاصل ہوئی تو ایک دم سے ایسے ابل پڑے کہ اپنے استاد سے بھی آگے بڑھ گئے اس قاعدے کی بناء پر ہندوستان کی عورتوں کو بلکہ مسلمانوں کی عورتیں کو تو ہرگز آزادی دینا مناسب نہیں کیونکہ اب تک تو وہ قید میں رہیں اگر ان کو آزادی مل گئی تو یقیناً ایک دم ابل پڑیں گے۔ غرض اسلام میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ مساوات تو نہیں ہے مگر حقوق کی اس قدر رعایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ مسابقت کی ہے۔

(الحمد و الذیور ص ۱۹ تا ۲۳)

۲۲۔ آجکل کے مسلمانوں کا حال۔

آجکل مسلمانوں کی رال ٹپکتی ہے دوسری قوموں کے سامان عیش و کیکر کر گروہ یہ نہیں جانتے کہ خیر اور سلامتی اس میں ہے کہ ان کو دنیا زیادہ نہ ملے اگر کم کو زیادہ مال دیا جاتا تو رات دن دنیا ہی کی فکر میں رہتے، آخرت سے بالکل غافل ہو جاتے۔

کانپور میں دو شخص شب قدر میں ایک بڑا سا ڈھیلا رومال سے ڈھک کر بیٹھے اور رات بھر دعا کرتے رہے کہ اے اللہ اس کو سونا بنادے و عظیم کسی مولوی سے سن گئے تھے کہ شب قدر میں دعا قبول ہوتی ہے، وہ ظالم یہ دعا کرنے بیٹھے صبح کو خوشی خوشی جو رومال کھولا تو وہ ڈھیلا کا ڈھیلا ہی تھا۔ بڑے حیران ہوئے کہ شب قدر میں دعا کیوں نہ قبول ہوئی ایک درزی نے کہا کہ اللہ میاں حکیم ہیں، وہی دعا قبول فرماتے ہیں جو بندے کے لئے مصلحت ہو، خدا کا شکر کہ وہ یہ سونا نہ بنا دے نہ تم آپس میں ہی مرکٹ جاتے۔ واقعی سچ کہا۔ بعض لوگوں کیلئے یہی حکمت ہے کہ ان کو سامان عیش زیادہ نہ دیا جائے۔

اس پر شاید ان کو یہ شبہ ہو کہ ہماری نیت تو یہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ ہم کو سامان زیادہ دیں تو خوب نیک کام کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں خوب خرچ کریں۔ تو وہ یاد رکھیں کہ

اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ تم کو کیا خبر ہے کہ اس وقت جو ارادے اور نیتیں ہیں زیادہ مال ملنے کے بعد باقی رہیں گے یا نہیں۔ اس کو تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے بڑھ کر خوش نیت کون ہوگا۔ مگر حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار صحابہ سے فرمایا کہ تمہاری کیا حالت ہوگی۔ جبکہ میرے بعد ممالک و بلاد مفتوح ہوں گے۔ اور تمہارے پاس کثرت سے مال و متاع اور غلام خادم ہوں گے۔ صحابہ نے کہا کہ یا رسول اللہ! اس وقت ہم اللہ کی عبادت کے واسطے فارغ ہو جائیں گے۔ نتفرغ للعبادة وكفى المشؤمة حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں، تمہاری یہی حالت اچھی ہے جو آجکل ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے لئے زیادہ مال کو پسند نہیں کیا حالانکہ ان حضرات نے واقعی زیادہ سامان ہونے پر عبادات میں پہلے سے زیادہ ترقی کی۔ اور دنیا میں تنہا نہیں ہوئے پھر ہمارے لئے کثرت مال کیونکر مفید ہو سکتی ہے۔

بس مسلمانوں کو دوسری قوموں کی حالت دیکھ کر ال نہ ٹپکانا چاہیے۔ اولئک عجلت لہم طغیانہم فی حیاتہم الدنیا۔ ان کو سب راحت نہیں دی گئی اور مسلمانوں کے واسطے راحت جنت میں ہے پس مسلمان کو اتنی دنیا حاصل کرنی چاہئے کہ پیٹ بھر کے روٹی مل جائے اور ستر عورت کے لئے کپڑا اور رہنے کو مختصر مکان۔ اور اتنا بچہ اللہ اکثر مسلمانوں کو آجکل حاصل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو صحابہ رضی اللہ عنہم اتنا بھی سامان میسر نہ تھا ہم لوگ تو اس زمانے کے اعتبار سے آجکل بادشاہ ہیں کیونکہ حدیث میں ہے من اصابہ معافی فی جسدہ اصابہ سربہ وعندہ فتوت یومہ۔ فکانما حیزت لہ الدنیا بحد احیوہا۔ کہ جو شخص اس حالت میں صبح کرے کہ بدن میں صحت ہو اور نفس میں بے فکری ہو، ایک دن کا کھانا پاس ہو اس کو تمام دنیا مل گئی۔ جب صحت اور اطمینان کے ساتھ ایک دن کا کھانا گھر میں موجود ہو تو یوں سمجھو کہ تمام دنیا گھر میں آگئی اگلے دن کی فکر نہ کرو۔ ع۔

”و متر کس از بلائے کہ شب در میانست“

جس مصیبت کے درمیان رات حائل ہو اس سے اندیشہ نہ کرو، جب کل ہوگی دیکھا جائیگا کیا خبر کل کو تم بھی ہو گے یا نہیں۔ ایک بزرگ اسی کو فرماتے ہیں ع۔
چوں ترانلے در خرقانے بود۔ ہرین موئے تو سبکانے بود۔

غرض حق تعالیٰ کی محنت ہے کہ بعض لوگوں کو عزیز رکھتے ہیں اس کو کیا خبر کہ امیر ہونے کے بعد وہ کیسا ہوتا۔ ایسے شخص کو ثواب دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نیت صالحہ عطا فرمادیتے ہیں۔ اس کیلئے یہ نیت ہی درجات عالیہ حاصل کرنے کے لئے کافی ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو یوں خرچ کرتا۔ حق تعالیٰ کے یہاں عجیب دربار ہے وہاں کچھ انفاق ہی پر دار و مدار نہیں۔ عزیز کے حق میں نیت انفاق بھی بمنزلہ انفاق کے ہے خود نص میں ارشاد ہے قول معروف ومغفرة خیر من صدقة یتبعھا اذی واحد غنی۔ حمید پس جس کے پاس مال نہ ہو وہ حال اور قال سے ثواب حاصل کرے ع۔

لا خیل عندک تہدیہا ولہ مال

فلیسعد النطق الم یسعد الحال۔

اور جس کو خدا نے مال دیا ہو وہ اپنی وسعت و ہمت کے موافق خرچ کر کے خدا کو راضی کرے (مطالعہ الاموال ص ۱۷)

۲۳۔ جدید تعلیم یافتہ کا غلط استدلال

صحابہ ایسے جاں نثار تھے انہوں نے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ ترک تابیر کی طرف دیکھا اسی وقت سب نے تابیر چھوڑ دیا جس کا یہ اثر ہوا کہ اس سے پہلے کم آیات نبی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ یہ کوئی ٹوٹکا نہیں بلکہ اس فعل میں طبعی خاصیت ہے اور یہ طبی تدبیر ہے اس لئے آئندہ کے لئے آپ نے اجازت دیدی اور فرمایا انتم اعلم بامور دنیا کم کہ اپنے دنیاوی کاموں کو تم ہی زیادہ جانتے ہو اس سے نو تعلیم یافتہ نے یہ مضمون نکالا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دنیاوی امور میں بالکل دخل نہیں دیا۔ بلکہ ان کو ہماری رائے پر چھوڑ دیا ہے کہ جو طریقہ مناسب سمجھیں اختیار کریں یہ مولویوں کی زیادتی ہے کہ دنیاوی معاملات میں بھی دخل دیتے ہیں کہ فلاں تجارت حرام ہے فلاں جائز ہے اور اس طرح بیع کرنا جائز نہیں۔ اس طرح اجارہ کرنا فاسد ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں کہتا ہوں کہ اگر انتم اعلم بامور دنیا کم کا یہ مطلب ہے تو کیا قرآن کی ان آیتوں کو جن میں ربا، سود اور اکل اموال بالباطل اور رشوت وغیرہ کو حرام کیا گیا ہے، قرآن سے نکال دو گے؟ اور ہزار ہا حدیثیں بھی جن میں بیوع و اجارات و نکاح و طلاق و ہبہ و میراث کے احکام مذکور ہیں۔ حدیث کی کتابوں سے نکال

باہر کر دے؛ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو یہ دعویٰ کیونکر صحیح ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیاوی معاملات میں دخل نہیں دیا۔ معلوم ہوا کہ تم نے اس حدیث کا مطلب غلط سمجھا۔ بلکہ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ امور دنیا جو تجربہ کے متعلق ہیں، ان کو تم زیادہ جانتے ہو باقی ان امور کے۔۔۔ متعلق جو احکام ہیں ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی زیادہ جانتے ہیں۔ مگر چونکہ واقعہ تائیر سے کسی کو شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ نبی کیسے ہیں جن کو حقائق اشیاء کا صحیح علم حاصل نہیں ہو اس شبہ کو رفع کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا انتم اعلم بامور دنیا کم جس کا حاصل یہ ہے کہ تجربات کا جاننا نبی کے لئے ضروری نہیں بلکہ ضروری حقائق کا علم ضروری ہے۔ (البسر بالصبر ص ۷)

۲۲۔ ہر اتفاق نہ محمود ہے اور نہ ہر اختلاف مذموم ہے

خوب سمجھ لو کہ اتفاق صرف اسی وقت مطلوب و محمود ہے جبکہ دین کو مفید ہو، اور نا اتفاقی جب ہی مذموم ہے کہ دین کو مضر ہو اور اگر اتفاق دین کو مضر اور نا اتفاقی دین کو مفید ہو تو اس وقت وہ نا اتفاقی مطلوب ہوگی۔ اہل دنیا تک اپنے معاملات میں اس کو خوب سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب کسی مقدمہ میں مدعی اور مدعی علیہ عدالت سے مرافعہ کرتے ہیں تو اس وقت دونوں کے کبھی نہیں کہا جاتا کہ تم دونوں اپنے اپنے دعوے سے دست بردار ہو جاؤ کیونکہ اس دعوے سے تمہارے اندر نا اتفاقی پیدا ہو گئی ہے اور نا اتفاقی مذموم ہے۔ بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص خلاف حق پر ہے اس سے کہا جاتا ہے کہ تم حق کی طرف رجوع کرو اور ناحق پر اصرار کو چھوڑ دو۔ بلکہ بعض معاملات میں اگر کبھی صاحب حق دعوے سے دست بردار بھی ہو جاوے تو گورنمنٹ مدعی ہو جاتی ہے اور وہ حق کی حمایت کرتی ہے۔ صاحبو! اگر نا اتفاقی مطلقاً مذموم ہے تو چاہیے کہ کوئی عدالت میں دائر ہو تو نزاع مدعی اور مدعی علیہ دونوں کو سزا دیا کرے کیونکہ نا اتفاقی کے مجرم دونوں ہیں۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا اور عقلاً کبھی ایسی رائے دے سکتے ہیں۔ مگر یہاں سب یہ کہتے ہیں کہ گونا گونا اتفاقی دونوں طرف سے ہے مگر ایک طرف سے حمایت حق کے لئے ہے اور دوسری طرف سے حمایت باطل کے لئے۔ پس تفتیش و تحقیق کے بعد جو شخص حق پر ہو اس کی ڈگری ہونا چاہیے اور عدالت کو اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ یہاں تو سب کا اتفاق ہے کہ نا اتفاقی مطلقاً مذموم نہیں مگر ان سوس دین کے معاملے میں اس قاعدہ سے کام نہیں لیا جاتا۔ بلکہ یہاں دونوں سے کہتے ہیں کہ نا اتفاقی چھوڑ دو۔ اور اتفاق پیدا کر دو۔

صاحبو! آخر یہاں پر کیوں نہیں دیکھا جاتا کہ ان دونوں میں سے حق کا ساتھ دینا چاہیے کس کی نا اتفاقی حمایت حق کے لئے ہے۔ اور کس کی حمایت باطل کے لئے پھر جو حق پر ہو اس کا ساتھ دیا جاوے اور جو باطل پر ہو صرف اسی کو دیا جاوے اور آپ جو دونوں کو اتفاق کا امر کرتے ہیں۔ تو بتلائیے صاحب حق صاحب باطل کے ساتھ کیونکر اتفاق کرے۔ دونوں طرف سے اگر اتفاق ہو گا تو عقلاً اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ صاحب حق کو چھوڑ دے اور دونوں باطل پر ہو جائیں۔ یعنی دین دار کو چھوڑ کر بد دین ہو جائے ایک یہ کہ دین دار تو دین پر قائم رہے اور بد دینی چھوڑ دے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کچھ تو دین دار دین کو چھوڑ دے۔ اور کچھ بد دین بد دینی کو چھوڑ دے اس طرح دونوں طرف سے اتفاق ہو سکتا ہے اب عقلاً خود فیصلہ کر لیں کہ ان میں سے کون سی صورت عقل کے مطابق ہے۔ یقیناً صرف دوسری ہی صورت کو عقل کے مطابق کہا جاوے گا کہ دین دار تو دین پر قائم رہے اور بد دین بد دینی کو چھوڑ دے۔ اور اس کا حاصل یہی ہے کہ دین دار کو تو بد دین سے نا اتفاقی کا حق ہے مگر بد دین دین دار سے نا اتفاقی کا حق نہیں بلکہ اس کو دین دار کے ساتھ اتفاقی کرنا چاہیے۔

افتراق کی مثال

صاحبو! یہ وہ افتراق ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں پیدا کیا ہے۔ کیونکہ آپ کی نبوت سے پہلے سب لوگ کفر پر متفق تھے آپ نے اگر اس نا اتفاقی کو توڑ دیا۔ اور باپ بیٹوں کو باہم جدا کر دیا اور یہ وہ افتراق ہے جس کو حق تعالیٰ بشارت کے طور پر بیان فرماتے ہیں۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ تَقْتُلُوا اللَّهَ لَكُمْ فَتَقَاتُوا وَيكْفِرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ** ط اس آیت میں حق تعالیٰ نے فرقان کو مایہ بشارت بتلایا ہے جس کو تقویٰ پر مرتب فرمایا ہے اور اسلئے قرآن کا ایک لقب فرقان بھی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ قرآن ہمیشہ جوڑتا ہی نہیں بلکہ کہیں جوڑتا ہے اور کہیں توڑتا ہے۔ جو لوگ حق پر ہوں ان کے ساتھ وصل کا حکم ہے اور جو باطل پر ہوں ان کیساتھ فصل کا حکم ہے۔

پس یہ سخت غلطی ہے جس میں لوگ آجکل مبتلا ہیں کہ جہاں دو جماعتوں میں اختلاف دیکھتے ہیں دونوں کو مورد ملامت بناتے ہیں کہ تم کیسے مسلمان ہو کہ آپس میں اختلاف کرتے ہو، اور دونوں کو باہم اتفاق پر مجبور کرتے ہو جس کا مطلب سوا اس کے اور کیا ہے کہ دیندار کو دین چھوڑ کر بد دین ہونا چاہیے۔ اور صاحب حق حق کو چھوڑ کر باطل طریقہ اختیار کرے

اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے بلکہ مقتضائے عقل یہ ہے کہ جب دو جماعتوں یا شخصوں میں اختلاف ہو تو اول معلوم کیا جاوے کہ حق پر کون ہے، اور ناحق پر کون؟ حق متعین ہو جاوے تو صاحب حق سے کچھ نہ کہا جاوے بلکہ اس کا ساتھ دیا جاوے اور صاحب باطل کو اس کی مخالفت سے روکا جائے۔ قرآن میں اس پر ایک جگہ نص ہے۔ **فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبَغَىٰ حَتَّىٰ تَفِيَّ الْإِلَٰهَ** اور اگر آپ کو تحقیق حق کی فرصت مایاقت نہیں تو آپ سے دخل دینے کو کس نے کہا ہے اپنے گھر بیٹھے اور تحقیق سے پہلے کسی کو برا نہ کہئے۔ (الانسداد للفساد ص ۳)

۲۵۔ حقیقت شریعت اعتدال کا نام ہے۔

اعتدال اوروں کے لئے تو فرضی ہے مگر شریعت کے لئے حقیقی ہے کہ اس کی ہر بات افراط و تفریط کے درمیان وسط ہے۔ اور وسط بھی بحرکت سین، یعنی وسط حقیقی کیونکہ ایک تو ہے وسط سکون السین، یعنی وسط مطلق اور ایک وسط ہے بفتح السین، یہ ہے وسط حقیقی، اسی واسطے مشہور ہے کہ الوسط متحرک یعنی متعین نہیں کہ ادھر ادھر ہو سکتا ہے۔ الوسط ساکن یعنی متعین ہے۔ میں نے اس سے بھی زیادہ لطیف کر دیا کہ الساکن متحرک والمتحرک ساکن اور وسط سکون السین پر چلنا آسان ہے اور جب اسے بدل دو یعنی سین کا فتح کر دو تو پھر مشکل ہوتا ہے کیونکہ وسط حقیقی ایک غیر منقسم شے ہے کیونکہ اگر اس کی تقسیم ہوگی تو پھر اس میں بھی طرفین اور وسط نکالے گا حالانکہ اس کو وسط حقیقی فرض کیا تھا۔ لہذا خلف، اور ظاہر ہے کہ غیر منقسم پر چلنا جیسا دشوار ہے۔ چنانچہ اگر کوئی کہے کہ بڑک پر اس طرح چلو کہ وہ جو بیچوں بیچ کا سیدھا خط ہے۔ اس سے ادھر ادھر نہ ہو تو بہت مشکل ہے۔ ہاں اگر کسی نے وسط حقیقی میں ایک ڈورا کھینچ دیا تو اب اس کی سیدھ پر چلنا آسان ہے اور شریعت کی حقیقت ہے وسط حقیقی چنانچہ شریعت نے ہر چیز میں ایک وسط نکالا۔ جین و تہور میں شجاعت، نمود و فجور میں عنف و سط نکالا۔ اسی طرح جزیرہ و بلاہت میں حکمت و سط نکالا ہے۔ یعنی جزیرہ تو یہ ہے جیسا کہ کسی طالب علم نے تیلی سے پوچھا کہ بیل کے گلے میں گھنٹی کیوں باندھی۔ اس نے کہا جب تک گھنٹی کی آواز آتی رہے یہ معلوم رہے کہ چل رہا ہے اس نے کہا کہ کھڑا ہو کر خالی گردن ہلایا کرے اور جیسے کسی طالب علم نے اپنے باپ سے کہا کہ میں دو انڈوں کے سوانڈے بنا سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا اچھا بناؤ، آپ نے کہا، ایک یہ ایک یہ، اور ان کا ایک مجموعہ، یہ تین ہوئے

پھر تین وہ اور ایک ان تینوں کا مجموعہ ہوا۔ دھلم جڑالی مالیتنا ہی، باپ نے ان کی معقول کو ماکول کر دیا کہ ان دونوں میں سے ایک تو خود کھالیا۔ ایک دوسرے کو دیدیا اور ان سے کہا وہ اٹھاؤ۔ آپ نوش فرمائیں وہ انڈے کیسے تھے کہ ان سے سوانڈے ہو گئے کہ اب انہیں نظر نہ آئے۔ جیسے کسی استاذ نے ایک بھنگے شاگرد سے کہا کہ ذرا فلاں بوتل تو اٹھا لاؤ اس نے کہا وہاں تو دو ہیں، کون سی اٹھاؤں۔ بھنگے کو ایک کے دو نظر آیا کرتے ہیں۔ استاد نے کہا نہیں ایک ہی ہے۔ اس نے کہا دو ہیں۔ استاد نے کہا اچھا دوسری بوتل توڑ ڈالو۔ اس نے ایک توڑی وہ دونوں ٹوٹ گئیں، اسی طرح ان کو بہت سے انڈے نظر آتے تھے کہ دو غائب ہوئے تو سب ہی غائب ہو گئے۔ یہ جزیرہ کہلاتا ہے۔ یہ عقل کا ہیضہ ہے ایک اکل کا ہیضہ ہوتا ہے اس کے مقابلہ میں ایک بہت ہے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ بہت سے بزرگ ایسے ہوتے ہیں مگر یہ کمال نہیں۔ چنانچہ کوئی نبی بھولا نہیں ہوا۔ نہایت دانشمند اور بیدار مغز ہوئے ہیں۔

میرے ایک دوست نہایت بھولے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ تمہاری بیوی عورت ہے یا مرد۔ کہنے لگے بظاہر عورت معلوم ہوتی ہے میں نے کہا کہ کیسے معلوم ہوا کہ عورت ہے کہ وہ ننھے پہنے ہوئی تھی۔ اگر وہ ننھے نہ پہنے ہوئے ہوتی تو شاید اسے مرد سمجھتے، یا ان کو کوئی ننھے پہنا دیتا تو یہ بھی اپنے کو عورت سمجھنے لگتے۔ تو بعض ایسے بھولے ہوتے ہیں مگر کمال یہ ہے کہ نہ جزیرہ ہونہ بلاہت ہو۔ دونوں میں وسط ہو جس کا نام حکمت ہے۔ خیر الامور اوسطا طہا اسی طرح باقی امور کو لے لو۔ غرض شریعت نام ہے اعتدال حقیقی کا اور اس کا مقتضی جیسا کہ مذکور ہوا یہ تھا کہ اس پر چلنا نہایت دشوار ہو۔ مگر خدا نے آسان کرنے کے لئے اس وسط پر ایک ڈوری ڈال دی ہے جس کو وہ ڈوری نظر آرہی ہے اس کو چلنا نہایت آسان ہے اور وہ ڈوری کیا ہے۔ علم صحیح۔ صحبت صالحہ یہ وہ چیز ہے کہ اس سے وسط حقیقی نظر آجاتا ہے۔ **الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيَانِ**

بحر تلخ بحر شیریں ہمعنان در میان شاخ برزخ لایبغیان

تو شریعت بھی افراط و تفریط کے برزخ کا نام ہے میں علم صحیح کی ایک مثال دیتا ہوں۔

ایک صفت ہے غضب للنفس اور ایک ہے غضب للشر ان دونوں میں خلط ہے یہاں پر امتیاز کی ضرورت ہے مثلاً ہم نے ایک مسئلہ لکھا اسے کسی نے رد کر دیا ہمیں غصہ آیا اور فی نفس ہم نے وہ مسئلہ صحیح لکھا ہے اس غصہ میں خلط ہے کہ آیا اللہ ہے کہ اس نے حق کو رد کیا یا للنفس

ہے کہ اس نے ہم پر دیکھا۔ سوائے طریقت بڑے حاذق طبیب تھے وہ اس کا فیصلہ کرتے ہیں کہ اے عزیز غور کر کے دیکھ، اگر اسی امر میں تیرے کسی معاصر مولوی پر بھی رد کیا جاتا اور خاص کر وہ معاملہ جس کی ذلت سے تمہارا نفس خوش ہو اگر ایسے شخص پر بھی رد ہوتا تو آیا اس وقت بھی تم کو ایسا ہی غصہ آتا یا نہ آتا۔ اگر سوچنے پر معلوم ہو کہ اتنا تب تو یہ غضب للہ ہے اور اگر غصہ کم آیا تو امیر شش ہے اور اگر بالکل نہ آیا تو اس وقت کا غصہ محض للنفس ہے، نفس کی شرارت اور بد معاشی ہے اسی طرح دوسرے اخلاق ذیلہ اور اخلاق حمیدہ میں امتیاز کے واسطے علم صحیح کی ضرورت ہے اور چونکہ شریعت نام ہے وسط حقیقی کا اسی لئے یہی صراط مستقیم بھی ہے کیونکہ خط مستقیم کیلئے اقصر خطوط واصلہ بین النقطتین اور اوسط خطوط واصلہ ہونا ضروری ہے۔ یعنی دونوں نقطوں کے درمیان میں بھی ہوگا اور یہی صراط مستقیم شریعت ہے جو قیامت میں بشکل صراط قائم ہوگا پس وہ شریعت کی صورت مثالیہ ہے اور یہی معنی ہیں اسکے بال سے باریک ہونے کے کیونکہ بال تو پھر متجری ہے۔ اور شریعت وسط حقیقی ہونے کی وجہ سے غیر متجری ہے۔ کیونکہ شریعت اتنا وسط ہے کہ اس میں پھر وسط نہیں، اسی واسطے قیامت میں بال سے باریک نظر آدے گی۔ باقی تلوار سے تیز ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ چونکہ شریعت نام ہے وسط حقیقی کا۔ اور وسط حقیقی پر چلنا اس سے بھی زیادہ دشوار ہے جیسا کہ تلوار کی دھار پر چلنا۔ اس لئے وہ صراط دھار سے زیادہ تیز نظر آدے گا۔

ابنہ جن کو یہاں وہ ڈوری امتیاز کی عطا ہونے سے چلنا آسان ہو گیا تھا چونکہ صراط وہی چیز ہوگی جس پر چلنے کے ہو گئے تھے اس لئے وہاں بھی اسی درجہ میں اس صراط پر چلنا آسان ہوگا یعنی اگر یہاں برق کی طرح ہے تو وہاں بھی ہے اگر یہاں چلنے میں اٹکا تھا تو وہاں بھی اٹکے گا اور جہنم میں گرے گا۔ (روح البجا ص ۲۲)

۲۶۔ شریعت سے ناگواری کی وجہ۔

شریعت سے ناگواری کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کی خوبیاں دیکھنے کے لئے آنکھ نہیں ہے اگر آنکھ ہو تو معلوم ہو جائے کہ شریعت میں کہیں حق تعالیٰ نے اپنی غرض پوری نہیں کی ہے من نہ کر دم خلق تا سودے کنم بلکہ تابربند گاں جو دے کنم۔ آپ کے مصالح کی ایسی رعایت کی ہے کہ شاید آپ خود بھی نہ کر سکتے۔ مثلاً شریعت

نے یہ بتایا کہ پھل آنے سے پہلے باغ کی فصل بیجا حرام ہے گویہ فیصلہ مالک باغ کو ناگوار ہے کہ پھل آنے سے پہلے تو باغ پانچ سو کا جتنا تھا اور اب پھل آئے اور کم آئے تو اڑھائی سو کا بیجا پڑا لیکن خریدنے والے سے پوچھو کہ وہ شریعت سے کتنا خوش ہے کہ پانچ سو جس باغ کے دیتا تھا اڑھائی سو میں مل گیا۔ اسی طرح ایک شخص نے ایک بیٹی اور ایک دودھ کا عصبہ چھوڑا ادھی میراث بیٹی کو ملے گی اور ادھی عصبہ کو۔ اس میں بیٹی کو ناگوار ہو کہ میں خاص بیٹی اور میرے باپ کا مال یہ دودھ کا رشتہ دار اسے خواہ مخواہ دیدیا مگر اس عصبہ سے پوچھو تو وہ کہے گا۔ سبحان اللہ! شریعت میں حقوق کی کیا رعایت ہے۔ دور دور کی قرابت کو بھی اس قدر مانا ہے۔ تو اب ایک ہی حکم ہے مگر دو آدمیوں میں سے اپنے اپنے اغراض کی وجہ سے ایک کو ناگوار ہے۔ اور ایک دوسرے کو گوارا۔ اب ہم کس کے فیصلہ کو ان دونوں میں سے مانیں گے۔

ترك اللات والعنای جميعا كذا لك يفعل الرجل البصير
یعنی لات اور عنای دونوں کو چھوڑ دیا ہم دونوں میں سے کسی کا فیصلہ نہیں مانیں گے کیونکہ یہ دونوں خود غرض ہیں ہم تو وحی کا فیصلہ مانیں گے کیونکہ وہاں شائبہ بھی غرض کا نہیں ہے اسی لئے وہی قابل اعتبار ہے وحی کا فیصلہ یہ ہے کہ شریعت کا قانون نام ہے جو مصالح عامہ کی رعایت کرتا ہے۔ جیسے سرکاری قانون۔ مثلاً سڑک پر پیشاب کرنا حرام ہے۔ اب ایک شخص کو زور کا پیشاب لگا۔ وہ کہاں تو یہ حکم ہے کہ پیشاب مت کرو اور یہاں موت بھلا جا رہا ہے تو وہ شخص کیا کہے گا کہ بڑی سختی کا قانون ہے کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ پیشاب کی تو اجازت ہوتی مگر اس کی بدلہ سے بچنے کے لئے کوئی ایسی دوا ڈال دی جاتی کہ دماغ بے حس ہو جاتے، اسلئے کسی کو بدلہ نہ معلوم ہوتی بھلا کون اسے پسند کریگا۔ اس گدھے کو موتنے کے واسطے سب کو بے حس بنا دے اسی طرح شریعت نے بھی مصالح عامہ کی رعایت سے قانون بنایا ہے تم اس میں مصالح خاصہ اور وہ نفسانیہ ڈھونڈتے ہو اور شریعت کا اچھا معلوم ہونا مصالح عامہ کی رعایت سے۔

یہ تو حکماء و عقلاء کی نظر میں ہے اور ایک نظر ہے عیش و محبت ملے
قانون میں حکمت کی۔ اس کو اس وجہ سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ دوست کا قانون ہے یہ حکما کی نظر سے بڑھ کر ہے۔ جیسے کوئی طوائف اپنے کسی خاص عارض سے یہ کہدے کہ تم تنگوٹی باندھ کے رام نرائن کے بازار میں پھرو یہ اس سے نہیں پوچھے گا کہ اس میں تمہارا کیا فائدہ بلکہ فوراً ادھر ادھر دوڑنے لگے گا۔ اگر کوئی کہے بھی گدھے یہ کیا ہے تو وہ کہے گا۔

قال الجدار اللوتد لم تشقنى قال اللوتد اخطرت الى ما يدقنى
ایک شخص دیوار میں کیل ٹھونک رہا تھا تو دیوار نے کیل سے شکایت کہ میں نے کیا کیا جو
میرے جگر کو شکافہ کر رہی ہے۔ کیل نے جواب دیا کہ اس سے پوچھو جو مجھے ٹھونک رہا ہے
تو حکماء و عقلاء احکام کے لم کے درپے ہونگے اور جو عاشق ہو گا وہ یہ کہے گا کہ حکمت
اس سے پوچھو جس نے یہ قانون مقرر کیا ہے مجھ کو کچھ بحث نہیں۔ بس مولوی صاحب کو یہی جواب
اختیار کر لینا چاہیے۔

در پس آئینہ طوطی معصوم داشتہ اند
آنچه استاد ازل گفت بگوئی گویم۔
غرض یہی علماء کو بھی مناسب ہے میں ان کو وصیت کرتا ہوں کہ اگر حکم و اسرار معلوم بھی ہوں
تو پوچھنے پر ہرگز مت بتاؤ۔ چاہے یہی گمان کریں کہ انہیں نہیں آیا۔ اور پوچھنے والے بھی خوب سمجھیں
کہ جاننے والے بھی بہت ہیں مگر تمہارے غلام نہیں ہیں کہ تمہیں سب بتا دیا کریں جیسے طبیب کہ
جانتا سب ہے کہ تین ماشہ گل بنفشہ کیوں لکھا ہے اور چھ ماشہ گل گاؤں زبان کیوں لکھا ہے
مگر کوئی مریض پوچھنے لگے تو وہ نہیں بتائے گا اگر وہ کہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں طب نہیں آتی
ہاں صاحب نہیں آتی۔ تمہیں پسند ہو پیو ورنہ مت پیو۔ عارف بشری ازی کہتے ہیں کہ
مصلحت نیست کی از پردہ بردن افتد راز۔

ورنہ در مجلس رندان خبرے نیست کہ نیست۔

یعنی کوئی خبر ایسی نہیں ہے کہ ہمیں معلوم نہ ہو مگر ہم تمہارے کہنے سے نہیں بتاتے اور
حقیقت میں مصلحت اور حکمت پوچھنے کی ضرورت ہی کیا؟ محبوب سمجھ کر اس کے حکم کی علت
دریافت کرنا عشق کے بانگل ہی اختلاف ہے۔ اگر کوئی کہے کہ جاؤ ہم عاشق ہی نہیں پھر
وظائف عشق بھی واجب نہیں، تو صاحب تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے عشق تو لازم
ایمان سے ہے۔ جب تم نے آمنا کہا، تو عشقنا کا التزام بھی کر لیا۔ جیسے کوئی شخص کہے مجھ پر
نان و نفقہ بی بی کا کیسے واجب ہو گیا۔ میں نے تو اس کا التزام نہیں کیا تھا۔ صرف قبلت
النکاح کہا جب ہی شوہر کے حقوق ملتزم ہو گئے۔ پس اسی طرح جب لا الہ الا اللہ محمد
رسول اللہ کہا پس عاشق ہو گئے۔ کیونکہ اس کلمہ سے مومن ہو گئے۔ مومن کے بارے میں
ارشاد ہے۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدَّ حُبًّا إِلَيَّ۔ جو لوگ خدا پر ایمان لائے وہ خدا کیساتھ
سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔ تو تصدیق ایمانی کے ساتھ ہی سارے کے سارے

عاشق ہو گئے۔ اب آپ عشق سے انکار کریں تو کیا ہوتا ہے جب عاشق ہونا ثابت ہو گیا تو عشق
کے حقوق ادا کرو۔ پس کان مت ہلاؤ اور سیدھے محبوب کے حکم پر چلتے رہو اگر کوئی اس
انقیاد کا قصد کرے تو اول اول تو تکلف ہوتا ہے پھر اس کی عادت ہو جاتی ہے تو اس کے ترک
میں تکلف ہوتا ہے تو جس طرح دو عادت پڑنے سے غذا ہو جاتی ہے اگر کوئی کہے کہ دو کیونکر غذا
ہو جاتی ہے تو میرے پاس اسکی لاجواب مثال موجود ہے۔ دیکھئے۔ حضرت تمباکو سلمہ اللہ تعالیٰ کہ کوئی
اس سے مشکل ہے یا ہو گا۔ کہیں اگلا کہیں شراب اس کا استعمال ہوا کرتا ہے۔ شروع کرتے وقت
کیسی تلی ہوتی ہے کیسی ابلکتیاں آتی ہیں۔ چکر آتا ہے مگر جب عادت پڑ جاتی ہے تو پھر یہ غذا سے
زیادہ مرغوب ہو جاتا ہے۔ روزے میں سب کو تو پانی اور شربت کی نکر ہوتی ہے مگر انہیں نہ
پھلکیوں کی پرواہ نہ شربت کی پرواہ نہ افطاری سے مطلب۔ ارے بھی حقہ دیدو۔۔۔۔۔
ایک پان دیدو۔ ایسی مکروہ چیز کیسی محبوب ہوئی۔ اے اللہ تمباکو کی تو اتنی محبت اور
شریعت کی اتنی بھی نہیں۔ ارے بھائی تمباکو ہی سمجھ لیا ہوتا۔ تمباکو تو کیا ہوتا۔ آخر کسی طرح بھدے
لوگوں کو۔۔۔۔۔ سمجھاؤں بھی۔ اگر خیرہ گاؤں زبان نہیں سمجھتے تو خیرہ تمباکو ہی سمجھو،
بہر حال اب یہ سمجھنا آسان ہو گیا کہ عادت ڈال لو تو دو ابھی غذا ہو جاتی ہے۔

بعض بزرگوں کو کسی تکلیف کے وقت ناک منہ چڑھاتے دیکھ کر اگر پرشبہ
ایک مثال ہو کہ عادت پڑ جانے کے بعد ان پر اثر کیوں ہے۔ بات یہ ہے کہ ان کے دل
پر اثر نہیں ہے صرف جسم پر ضعف کی وجہ سے اثر ہے اور دل میں نہایت خوش ہیں۔ اس کی
مثال بھی میرے پاس موجود ہے اور وہ نظیر حضرت تمباکو کے دوست مرچ ہیں کہ ناک بہہ ہی
ہے آنسو جاری ہیں۔ سی سی کر رہے ہیں۔ مگر کھائے چلے جاتے ہیں کیوں صاحب اگر تکلیف
ہے تو کیوں کھاتے ہو؟ بات یہ ہے کہ تکلیف منہ کو ہے مگر زبان اور حلق کو مزہ آتا ہے۔ اسلئے
منہ کی تکلیف گوارہ ہے۔ تو اب سمجھ میں آ گیا کہ لذت و الم دونوں ایک ہی وقت میں جمع
ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح امتثال امر محبوب میں گو بدن کو تکلیف ہو۔ مگر دل اور روح شاداں ہیں۔ اور
اس عادت کا یہ اثر ہے کہ اگر ایک نماز بھی قضا ہو جائے گو بدن کو آرام ملا کہ پڑے سوتے رہے
مگر قلب کو جو تکلیف ہے اس کے آگے یہ آرام کچھ بھی نہیں۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ
بر دل سالک ہزاراں غم بود۔ مگر زباغ دل خلائے کم بود۔

یعنی اگر باغ دل سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے اس وقت دیکھو ان کے غم کو۔ پھر اس میں بھی دو درجے ہیں۔ زائد کو تو غم ہوتا ہے مطلقاً عمل فوت ہو جانے کا۔ اور عارف کو غم ہوتا ہے باختیار خود فوت ہو جانے کا۔ اور بلا اختیار فوت ہونے کا کچھ غم نہیں ہوتا۔ کیونکہ دوست نے اس میں یوں ہی تصرف کیا۔ مگر یہ بات عام لوگوں کے سننے کی نہیں کیونکہ اگر یہ قصداً بھی سو گئے اور ناز قضا کر دی۔ تو حیلہ نکال لیں گے کہ محبوب کی یوں ہی مرض تھی تو یہ مرضی مرضی والوں کے لئے نہیں۔ کیونکہ وہ خود مرضی بفتح الراء ہیں۔ یعنی مرض والے۔ بہر حال تکلیف طبعی سے جسم کو پریشانی ہوتی ہے مگر روح کو نہیں ہوتی بلکہ ان اعمال سے ایسی مناسبت ہو جاتی ہے کہ وہ غذا سے روح بن جاتے ہیں کہ اگر وہ نہ ملیں تو پریشانی ہوتی ہے صرف شروع کسی قدر تکلیف ہوتی ہے جیسے مشاہدہ سے پہلے مجاہدہ کی ضرورت ہے یا غذا سے پہلے دوا کی حاجت ہوتی ہے پھر تودوا بھی غذا ہو جاتی ہے۔

تو حضرت ایسی چیز ہے شریعت جس سے ڈرتے ہیں لوگ حالانکہ اس میں ہمارے کل مصالح دینیہ و دنیویہ کی بے حد رعایت کی ہے اور ساری مصلحتوں سے بڑھ کر تو چین ہے جو بدوین اتباع احکام شریعت نصیب ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ چین تو بقول تمہارے تعلق مع اللہ سے حاصل ہوتا ہے۔ پس اگر ہم ہر وقت خدا کو یاد کریں اور اتباع شریعت نہ کریں تو تعلق با اللہ تو حاصل ہو گیا پس چین سے رہیں گے تو خوب سمجھ لو کہ مطلق تعلق سے یہ تناعدہ حاصل نہیں ہو سکتا، ایسے تعلق میں چین کا گمان ہے جیسی ہے فی الواقع اس میں بے چینی مضمر ہے جو مرنے کے بعد کھل جائے گی۔

غیر ملکی کی ایک حکایت
جیسے ایک سجدی گنوار ہندوستان میں آیا ایک حلوائی کی دکان پر جا کر حلوا لیا۔ اس نے دام مانگے یہ وہاں سے بھاگا وہ حلوائی بھی پیچھے بھاگا جب وہ اتنا بھاگا کہ قریب تھا کہ پکڑ لے۔ آپ نے وہ حلوا جھپٹ منہ میں رکھ لیا کہ جاؤ اب نہ ہمارا نہ تمہارا۔ وہ پکڑ کر پولیس لے آیا۔ تھا نیدار تو رحم دل تھے انہوں نے بجائے چالان کے یہ سزا دی کہ گدھے پر سوار کر کے اور اعلان کے لئے ڈھول کے ساتھ شہر سے باہر نکال دیئے کی سزا دی تو لونڈوں نے اسے گدھے پر سوار دیکھا تو وہ بھی تماشہ کے طور پر ساتھ ہوئے یہ ہندوستان کی سیر فارغ ہو کر اپنے ملک میں پہونچے، وہاں لوگوں نے پوچھا کہ ”آغا ہندوستان رفتہ بودی چہ طور ملک است“ ہندوستان کیسا ملک ہے؟

آپ نے کہا ”خوب ملک است“ بڑا اچھا ملک ہے، پوچھا گیا ”بچہ طور“ تو آپ فرماتے ہیں ”در ہندوستان حلوا خود دن مفت است“ حلوا مفت کھانے میں آتا ہے۔ ”سواری خرمفت است“ گدھے کی سواری مفت ملتی ہے ”وہ دم دم مفت است“ باجا مفت ملتا ہے ”فوج طفلان مفت ست“ لڑکوں کی فوج مفت ملتی ہے ”ہندوستان خوب ملک است“۔ تو جیسے ان حضرات کو یہ نہ معلوم ہوا کہ یہ چشم و خدم عزت کا سامان تھا یا یہ نہایت ذلت کی سزا تھی اسی طرح ان کو نہیں معلوم کہ یہ چین ہے یا بے چینی لیکن کہاں تک سہ

خسوف تری اذا انكشف الغبار افسر تحت رجلك امحمد

جب حقیقت منکشف ہوگی اس وقت معلوم ہوگا کہ چین تھا یا بے چینی، جیسے اس آغا کو جب ان سب باتوں کی حقیقت معلوم ہوئی ہوگی تو کس قدر شرمندہ ہوا ہوگا۔ اسی طرح انہیں بھی مرتے وقت معلوم ہو جائے گا کہ وہ لذت تھی یا بے لذتی۔

شرعیۃ کا اتباع
غرض جو تعلق و نسبت مطلوب اور سرمایہ راحت ہے تو وہ جانین سے ہے۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہم وہ نسبت ہی نہیں جو ایک طرف سے ہو۔ جیسے کسی شہر میں ایک پر ویسی طالب علم تھے۔ ان کے دیس کے کوئی آدمی ان سے ملنے گئے۔ انہوں نے پوچھا، میاں طالب علم کس رنگ میں ہو۔ کہنے لگے شہزادی سے نکاح کی فکر میں ہوں، پوچھا کیا سامان ہوا۔ کہنے لگے وہاں آدھا کام تو ہو گیا۔ آدھا باقی ہے۔ پوچھا کس طرح؟ کہنے لگے میں تو راضی ہوں مگر وہ راضی نہیں۔ خوب آدھا ہو گیا۔ تو یہ تو اوپن ہے۔ اسی طرح بہت سے لوگ بزم غم خود صاحب نسبت ہیں۔ جو بلکہ یادداشت ہم ہو چکا کہ اپنے کو مقبول سمجھتے ہیں مگر اتباع شرع نہ ہونے کے سبب ان کے زعم کا حاصل یہ ہے کہ ہم تو راضی ہیں مگر اللہ میاں راضی نہیں، خوب سمجھ لو کہ ان کے راضی ہونے کا معیار صرف اتباع احکام ہے اگر اس حال میں موت آگئی تو سب کھل جائے گا کہ یہ تعلق ان کو پسند نہ ہونے کے سبب تمہاری نظر میں کس قدر ہوگا۔ بقول سعدی علیہ الرحمۃ سہ

چوں در چشم شاہد نیاید زرت زرو خاک یکساں نماید برت

آپ نے ہزار روپیہ محبوب کو بھیجے کہ وہ خوش ہو، مگر معلوم ہوا کہ وہ خوش نہیں ہوا اور اس نے نہیں لئے اور انہیں واپس کر دیئے کسی نے کہا کہ گھر میں بھیج دے تو یہی کہو گے کہ پھینکو لے عنقریب غبار چھٹے کے بعد معلوم ہوگا کہ ترے پاؤں کے نیچے گھوڑا تھا یا گدا۔

بھی کیا کر دے گا ایسے منحوس روپے کو اسی طرح جب معلوم ہوگا کہ حق اس تعلق سے راضی نہیں ہوئے تو اس تعلق کو کیا سمجھو گے۔ تعلق وہی ہے جو کہ دونوں جانب سے ہو اور یہ تعلق بدوین اتباع شریعت کے نہیں ہو سکتا تو دیکھئے! شریعت کتنی بڑی چیز ہوئی۔ حق تعالیٰ اسی کو فرماتے ہیں ثم جعلناک علی شریعت من الامر فانبعھا۔ ثم لانے کی وجہ یہ ہے کہ اوپر فرماتے ہیں ولقد اتینا بنی اسرائیل الکتب والحکم والنبوة "تا" فیما کانوا فیہ یختلفون فرماتے ہیں۔ یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکمت اور نبوت دی تھی اور ہم نے ان کو نفیس نفیس چیزیں کھانے کو دی تھیں، اور ہم نے ان کو دنیا والوں پر فوقیت دی تھی اور ہم نے ان کو دین کے بارے میں کھلی کھلی دلیل دیں۔ سوا انہوں نے علم ہی کے آنے کے بعد باہم اختلاف کیا بوجہ آپس کی صدا مندی کے آپ کا رب ان کے آپس میں قیامت کے روز ان امور میں فیصلہ کر دیگا جن میں یہ باہم اختلاف کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں "ثم جعلناک" آپ سے پہلے بنی اسرائیل کو کتاب وغیرہ عنایت کی تھی۔ اس کے بعد ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا۔ "من الامر" میں من بیانہ ہے کہ وہ شریعت یا طریقہ خاص کیا ہے وہ امر دین ہے پس اس کا اتباع کیجئے لقب کتنا لطیف ہے۔ شریعت یعنی جس عنوان سے علماء اتباع دین کا امر کرتے ہیں وہی عنوان آیت میں وارد ہو گیا جس سے صریحاً مدعا علماء کا ثابت ہو گیا۔

اب یہ سمجھنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا اتباع شریعت کا تو اور کسی کا کیا منہ ہے جو اپنے کو اس سے آزاد سمجھے وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ النَّفْسِ لَا یَعْلَمُونَ ط اور ان جاہلوں کی خواہش کا اتباع نہ کیجئے۔ سبحان اللہ کیا پاکیزہ طرز بیان ہے یہ نہیں فرمایا۔ وَلَا تَتَّبِعْ عَیْوَہَا کہ غیر شریعت کا اتباع نہ کیجئے۔ بلکہ یوں فرمایا کہ جہلا کی خواہش کا اتباع نہ کیجئے۔ اس میں بتا دیا کہ جو شریعت کے مقابلہ میں ہوں وہ خواہشیں ہیں اور ہوائے نفسانی ہیں۔ اس لئے وہ عمل کے قابل نہیں "اَلَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُونَ" سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ قید احترازی ہے یعنی اَلَّذِیْنَ یَعْلَمُونَ کی ہوا کا اتباع جائز ہے۔ بلکہ یہ قید واقعی ہے مطلب یہ ہے کہ وہ واقع میں علماء ہی نہیں ہیں جو شریعت کے مقابلہ میں اپنی خواہشیں پیش کرتے ہیں بلکہ وہ تو جہلا ہیں جیسے یوں کہتے ہیں کہ مفسدوں کے بہکانے میں آجانا نہیں بلکہ مطلب یہی ہے کہ بہکانے والے سب کے سب مفسد ہوتے ہیں ان سے بچتے رہنا۔ اسی طرح یہاں بھی سمجھ لو اور "الذین لا یعلمون" کا مفہول

جو یہاں ذکر نہیں فرمایا۔ سبحان اللہ! اس میں عجیب رعایت ہے، اگر مفہول ذکر فرماتے تو وہ امر الدین ہوتا تو ایک گونہ مصادرہ ہو جاتا کیونکہ امر دین ہی میں تو کلام ہو رہا ہے تو اس صورت میں یہ حاصل ہوتا کہ غیر دین اس لئے مذموم ہے کہ وہ دین نہ جاننے والوں کا فعل ہے اس لئے یہاں مطلق علم کی نفی کر دی کہ امر اس لئے مذموم ہے کہ وہ ایسوں کا فعل ہے جو بالکل ہی جاہل ہیں یہ دعویٰ کہ جو شخص شریعت کا متبع نہ ہو وہ بالکل جاہل ہے، اتنا بڑا ہے کہ سارا عالم اس میں مقابل ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا یقین ہے کہ یہ ساری دنیا کو جاہل بنانا اتنی بچی بات ہے کہ اس میں ذرا احتمال خلاف کا نہیں، ورنہ آپ کو جھجک ضرور ہوتی کہ کوئی مطالبہ نہ کر بیٹھے۔ اور اس وقت کو ظاہر میں آپ نہیں تشریف رکھتے مگر آپ کا علم فیض تو ہے، جیسے آفتاب پرابرا کجا دے تو آفتاب نظر سے پوشیدہ ہے مگر اس کی روشنی تو ہے، بلکہ چونکہ ہوں کے لئے تو یہ ابر بھی رحمت ہے کہ براہ راست اس کا تحمل نہ کر سکتے اسی طرح بعض لوگ ایسے ہیں کہ اگر حضور کے زمانہ میں ہوتے تو یقیناً حضور کے اتباع سے عار کرتے۔ اور اس سے حد کفر میں پڑ جاتے تو اچھا ہو کہ ابرا گیا ورنہ ان چونکہ ہوں کی بڑی مشکل ہوتی۔

بہر حال اب وہ آفتاب کی روشنی ابر سے بھی چھن رہی ہے۔
اس موقع پر میں مولانا کا یہ شعر پڑھتے پڑھتے رک گیا۔

آفتاب کی مثال

وہ شریر ہے

چونکہ شد خورشید و بار اگر دواغ

چارہ نہ بنو درمقا کش از چراغ

یعنی آفتاب رخصت ہو گیا اور میں اسے اس لئے پسند نہیں کہ آفتاب رخصت نہیں ہوا۔ وہ تو اب بھی درخشاں ہے صرف ابر کے نیچے چھپ گیا ہے بلکہ یہ شعر اس موقع پر مناسب ہے

ہنوز آں ابر رحمت درخشاں است

خم خنجانہ بامہر و نشان است

اور مولانا نے وہ شعر کسی دوسرے موقع پر فرمایا ہے۔ غرض حضور کے غلام حضور فیض لینے والے اب بھی موجود ہیں جواب بھی اس دعویٰ کو ثابت کرنے کو تیار ہے کہ جو متبع شریعت نہ ہو وہ جاہل ہے اور میں خود تو دعویٰ نہیں کرتا۔ مگر دین کے محاسن پر نظر کر کے

کہہ سکتا ہوں کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا عاقل ہو۔ مگر عالم نہ ہو اور نہ کسی عالم محقق کی صحبت میں رہا ہو۔ اس کو کسی محقق کی صحبت میں رہا ہو مہینے کے لئے بھیج دو۔ خدا کی قسم اس چھ مہینے میں وہ محقق یہ ثابت کر دیگا کہ اس عاقل کی زبان سے اقرار کرائے گا کہ میں احمق ہوں۔ اور اس وقت قسم سے زیادہ اور کسی ذریعہ سے یقین نہیں دلا سکتا۔ اگر اس سے زیادہ دلیل کو جی چاہے تو تجربہ کر لو کہ چھ مہینے کی رخصت ہو۔ پھر محقق کا پتہ ہم سے پوچھو۔ اس وقت دیکھ لو گے کہ یہ شخص آئے گا تو اپنے کو عاقل کہتا ہوا مگر جائے گا یہ کہتا ہوا کہ میں احمق ہوں۔ نہیں بلکہ پہلے احمق تھا کیونکہ اب تو اس محقق کی برکت سے عقل آجاوے گی تب معلوم ہو گا کہ ”اھو اھو الذین لا یعلمون“ کا مدلول کیسا یقینی ہے کہ جو چیز شریعت کے مقابلہ میں ہے وہ جہل ہے، میں حالانکہ کچھ بھی نہیں مگر جو پورے ایک شاعر صاحب میرے یہاں آئے، جو عرفی تہذیب سے آراستہ تھے میں تو ادنیٰ سے ادنیٰ، ادنیٰ سے ادنیٰ ہوں، اس طرح دس بیس دفعہ ادنیٰ کی اصناف ادنیٰ کی طرف کی جائے بہر حال میں کچھ بھی نہیں ہوں مگر چند روز رہنے کے بعد وہ واپس گئے تو وہاں جا کر انہوں نے ایک رسالہ لکھا۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ عمر بھر جسے ہم تہذیب سمجھا کئے وہاں جا کر یہ معلوم ہوا کہ وہ تہذیب ہی نہیں تھی۔ خیر وہ تو مر گئے ایک اور دہلی کے طبیب آئے چند روز یہاں رہنے سے وہ بھی یہ کہنے لگے کہ جن کو ہم لوگ اب تک کمالات سمجھتے تھے سارے نقائص نکلے اور جنہیں ہنر سمجھتے تھے وہ سب عیوب تھے۔ تو اس وقت اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ اگر شبہ ہو تو تجربہ کر لیجئے۔ اس لئے فرمایا۔ ”اھو الذین لا یعلمون“ جاہلوں کا اتباع نہ کیجئے۔

یہاں اتباع شریعت کے متعلق ایک نکتہ ہے جسے امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ انسان کی سلامتی مقید رہنے میں ہے اور اطلاق مضر ہے۔ کیونکہ اطمینان اور چین بدون تقلید کے نہیں ہوتا مثلاً ہم نے یہ ارادہ کر لیا کہ جب بیمار ہوں گے ہم فلا نے طبیب کا علاج کریں گے تو اطمینان ہے کہ طبیب موجود ہے بیماری کا خوف نہیں ہو گا۔ اور بیماری کے وقت سوچنا پڑے گا کہ کس کا علاج کریں۔ اور اگر تقلید نہیں ہے مثلاً ہم کسی خاص طبیب کے پابند نہیں۔ اگر آج ذرا سا تفریش آیا ایک طبیب سے رجوع کیا۔ دوسرا تفریش آیا دوسرے سے رجوع کر لیا تیسرا تفریش آیا تیسرے سے رجوع کر لیا تو اس میں دل کو چین نہیں ہو گا اور ہر وقت یہ فکر رہے گی کہ اب کے تفریش کس طبیب سے رجوع کریں گے۔ عرض تقلید سے اطمینان حاصل ہوتا ہے چاہے وہ طبیب دانشمند بھی نہ ہو۔ مگر تمہارے نفس کو تو اطمینان ہو جائے گا۔ اور اگر وہ تقلید حقائق کے موافق ہو تو سبحان اللہ! کیا کہنا ہے۔ اگر شریعت علم و حکمت کے

موافق ہونے کا بھی دعویٰ نہ ہوتا۔ جیسا کہ مدلول ہے ولا تفتح اھواء الذین لا یعلمون کا، تب بھی اتباع شریعت کا امر حکیمانہ ہوتا اور اب تو جبکہ شریعت کا علم و حکمت کے موافق ہونا ثابت کر دیا گیا تو اس اتباع کا ضروری و مصلحت و موجب اطمینان ہونا اور بھی ثابت ہو گیا، آگے وعید ہے انھم لن یغنوا عنک من اللہ شیئاً طایفہ لوگ خدا کے مقابلہ میں آپ کے ذرا کام نہیں آ سکتے۔ یعنی گو یہ آج مددگار بنے گا دعویٰ کرتے ہیں۔ مگر خدا کے یہاں ذرا کام نہیں آ سکتے۔ اس پر اہل حق کو تردد ہو سکتا تھا کہ اتباع کر کے ہم تو اکیلے رہ گئے۔ اس لئے فرماتے ہیں وان الظالمین بعضهم اولیاء بعض والذین ولی المتقین اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں۔ اور اللہ دوست ہے اہل تقویٰ کا۔ اس سے تردد دفع ہو گیا کہ اہل اہوا اگر ہم سے الگ ہو گئے تو کچھ پروا نہیں کیونکہ خدا تو ہمارے ساتھ ہے۔ آگے مقصود کی طرف رجوع کرتے ہیں اور شریعت میں جو صفات ہیں انہیں بتاتے ہیں۔ ہذا بصائر للناس وھدی ورحمت لغوم یوقنون۔ قرآن یا شریعت لوگوں کے لئے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور یقین لانے والوں کے لئے بڑی رحمت ہے۔ ”ہذا بصائر“ بصائر جمع بصیرت کی ہے۔ بصیرت کہتے ہیں باطنی روشنی کو۔ جیسے بصر کہتے ہیں نگاہ یعنی ظاہری روشنی کو تو شریعت بصائر ہے، یعنی باطن کو روشن کر نیوالی ہے ”وھدی“ اور سرِ پادہایت ہے کہ اس سے راستہ نظر آتا ہے اور مقصود تک پہنچا دیتی ہے ”ورحمت“ اور رحمت ہے جو کہ مقصود ہے۔ گویا شریعت تین چیزوں کا مجموعہ ہے۔

یہاں پر ایک نکتہ ہے جو چند سال پہلے ذہن میں آیا تھا مگر اسے بھول گیا تھا اس راستے طے کر نیوالوں کی ضرورت وقت پھر یاد آ گیا۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ ہر کوئی انہیں تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ جب آدمی مقصود تک جانا چاہتا ہے تو اس کے لئے ایک مقصود ہوتا ہے اور ایک طریق ہوتا ہے جس کے ذریعہ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں اور ایک بصیرت بھی ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے راستہ نظر آدے۔ حق تعالیٰ کے قربان جانے کہ شریعت بتلاتے ہیں کہ ایسا قانون ہے جو تینوں کو جمع کئے ہوئے ہے۔ لہذا بصائر یہ آنکھیں بھی ہیں۔ وھدی اور راستہ بھی اسی کے ذریعہ سے طے ہوتا ہے۔ ورحمت، اور رحمت بھی ہے یعنی مقصود بھی اسی سے حاصل ہوتا ہے۔ سبحان اللہ! بصیرت، طریق، مقصود، تینوں اسی ایک شریعت میں ہیں۔ اب رہا یہ کہ بصائر کو جمع کیوں لائے اور وھدی ورحمت کو مفرد کیوں لائے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ راستہ چلنے والے تو بہت ہوتے ہیں اور سب کی آنکھیں الگ

الگ ہوتی ہیں، اس لئے اس کو جمع لائے۔ اور راستہ ایک ہی ہوتا ہے اور مقصود بھی سب کا ایک ہی ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں مفرد لائے۔ پھر آگے فرماتے ہیں کہ یہ رحمت تو ہے مگر شخص کے لئے نہیں بلکہ ”لقوم یوقنون“۔ یعنی یقین کرنے والوں کے لئے۔ یقین کے دو درجے ہیں ایک تقلیدی اور ایک تحقیقی تقلیدی تو یہ ہے کہ احکام کو بلا دلیل مان لو، پھر ان احکام کی برکت سے تحقیقی یقین ہو جاوے گا۔ جیسے شروع میں الف، بے کہ محض استاد کی تقلید سے مان لیتے ہو۔ اس کے بعد اسی تقلید کی بدولت بڑے علوم کے محقق بن جاتے ہو۔ اگر شروع ہی میں یہ پوچھا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ الف ہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیشہ جاہل رہو گے۔ اس لئے پہلے کسی محقق کی تقلید کرو۔ پہلے ہی محقق بننے کی کوشش مت کرو۔

اے بے خبر بخوش کہ صاحب خبر شوی تاراہ میں نہ باشی کے راہبر شوی

اور طریقہ محقق بننے کا یہی ہے کہ پہلے تقلید کرو۔

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق ہاں اے پسر بخوش کہ روزے بدر شوی

(الشریعت ص ۳ تا ۴۲)

۲۲۔ عذاب قبر پر اعتراض کا جواب

احادیث میں جو عذاب و ثواب قبر کا ذکر ہے یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ ہم نے انسان کے مرجانے کے بعد اس کے جسم عنصری کا مہینوں

مثالی ہے عذاب و ثواب

اسی کو ہوتا ہے لہذا جسد عنصری پر عذاب و ثواب محسوس نہ ہونے سے اس کی مطلقاً نفی نہیں ہو سکتی۔ پھر بعض دفعہ حق تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ظاہر کرنے کے لئے اس جسم عنصری پر بھی عذاب و ثواب کو ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ اس قسم کے واقعات مذکور ہیں کہ بعض لوگوں نے کسی مرد کی قبر میں آگ جلتی ہوتی دیکھی۔ بعض لوگوں کو کسی قبر سے نہایت پاکیزہ خوشبو محسوس ہوئی، لہذا اس حدیث پر کوئی اشکال نہیں، خوب سمجھ لو۔

(ترجیح الآخرۃ ص ۳۶)

۲۸۔ اسلام در حقیقت اللہ کا راستہ ہے۔

بعض جگہ حضورؐ کی طرف اس صراط کو اس لئے مضاف کر دیا گیا تاکہ سامعین کو اس پر عمل کرینی ہمت ہو اور وہ سمجھ لیں کہ ہم اس راستہ کو طے کر سکتے ہیں۔ اگر پہلے ہی یہ فرما دیا جاتا کہ یہ خدا کا راستہ ہے اس پر چلو تو لوگ یہ سن کر گھبرا جاتے کیونکہ خدا تعالیٰ کی ذات تک ذہن کی رسائی اولاد شوار ہے۔ ان کی توشان یہ ہے۔

اے برتر از خیال قیاس و گمان و دہم در ہر کیفیت اندیشیدہ ایم و خواندہ ایم

خدا تعالیٰ کی ذات تک وہم بھی نہیں پہنچ سکتا جو کچھ اس کے متعلق ہمارے ذہن میں آتا ہے خدا تعالیٰ اس سے بھی درار اور ارشم و درار اور ارہیں۔ اسی کو مولا نا فرماتے ہیں کہ در تصور ذات اور رنج کو تا در آید در تصور مثل اد۔

یہ لفظ سارے نسخوں میں کج ہے۔ مثنوی کو جس گنج (اور جس گوشہ) سے نکالو گے سب میں یہی نکلے گا۔ کسی کے پاس اسکی کجی نہ تھی صرف حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کے پاس اسکی کجی تھی۔ حضرت ہی نے اس کا قفل کھولا۔ حضرت نے مکہ میں ایک دفعہ ایک شخص کو کج پڑھاتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کے معنی بتانے میں وہ بہت تاویلیں کر رہے تھے مگر کوئی بات بتی نہ تھی حضرت نے اصلاح دی کہ یہ لفظ گنج ہے۔ بمعنی گنجائش۔ پس اس کو سن کر وہ شخص پھر طک ہی تو گئے، اب شعر کے معنی بے تکلف ظاہر ہو گئے۔

مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات کی کسی کے تصور میں گنجائش نہیں یعنی تصور بالکنہ کی گنجائش نہیں۔ حق تعالیٰ کا بالکنہ ذہن میں آنا محال ہے، جس کی تفصیل کتب معقول میں مذکور ہے حق تعالیٰ کی ذات تک رسائی نہیں تو اگر ابتداء ہی اسلام کو صراط اللہ کہہ دیا جاتا۔ یعنی حق کی طرف اس کی نسبت کی جاتی تو لوگ گھبرا جاتے اور سوچ میں پڑ جاتے کہ حق تعالیٰ تو ذہن سے بہت دور ہیں۔ پس اسی طرح ان کا راستہ بھی نہ معلوم کتنا دور و دراز ہوگا۔ اس لئے پہلے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مضاف کیا گیا کہ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ یہ تو میرا راستہ ہے اس پر چلو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک سب کی رسائی ممکن ہے۔ آپ عیاناً سب کے سامنے ہیں پھر بشریت میں سب کے شریک ہیں اس لئے سن کر ہمت بندھی کہ یہ تو رسول اللہ کا راستہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذہن سے دور نہیں ہیں تو آپ کا راستہ بھی دور نہ ہوگا بلکہ نزدیک ہوگا۔

یہ فائدہ ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرنے سے کہ راستہ کا سہل و نزدیک ہونا معلوم ہوگا پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی ہوگئی اور اس راستہ پر چلنا شروع کیا۔ اور حقیقت منکشف ہوئی کہ یہ تو حقیقت میں خدا کا راستہ ہے اور حضور صرف داعی ہیں آپ خود بھی اسی راستہ پر چل رہے ہیں یہ دیکھ کر ڈھارس بندھ گئی کہ حق تعالیٰ اس کے طے کرنے میں بندوں کی امداد فرماتے ہیں چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راستہ کو طے کر لیا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کا طے کرنا انسان کی قدرت سے خارج نہیں تو ہم بھی اس کو طے کر سکتے ہیں۔ خصوصاً جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو واقف طریق ہیں ہمارے معین و رفیق ہیں۔

واقعی اگر حق تعالیٰ کی امداد نہ ہو تو پھر اس راہ کا طے کرنا بہت دشوار ہے کیونکہ خدائی راستہ ہے جس کو وہی طے کر سکتا ہے جس کو حق تعالیٰ طے کرنا چاہیں۔ اس لئے سالک کی جب اس پر نظر ہوتی ہے کہ یہ راستہ خدا تعالیٰ کا راستہ ہے اس وقت وہ بڑا پریشان ہوتا ہے وہ اس کے طول و لامتناہی کے خیال سے گھبراتا ہے اور یوں کہتا ہے کہ

بحر یست بحر عشق کہ سچش کنارہ می ست

آبنا جز اینکہ جاں بپارند چارہ نیست

اور جب اس پر نظر کرتا ہے کہ یہ راستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ جس پر آپ چل رہے ہیں تو اسکی ہمت بندھتی ہے اور یوں کہتا ہے کہ

تو دست گیر شوائے خضر ہے خستہ کہ من

پیادہ می روم و ہر ماں سورانند

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت و رفاقت اس راستہ میں چلنے کا ارادہ کر لیتا ہے یہ تو ان لوگوں کے لئے ہے جن کی رسائی حضور تک ہو چکی ہے اور جو حضور تک بھی وصول نہ رکھتے ہوں انہیں اسکی ضرورت ہے کہ ان مشائخ کا دامن پکڑیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی کر چکے ہیں۔ جیسے بادشاہ تک پہنچنے کے لئے وزیر کا واسطہ ضروری ہے۔ مگر جو وزیر تک نہ پہنچا ہو اس کو چاہیے کہ ان لوگوں کی خوشامد کرے جو وزیر تک رسائی رکھتے ہیں۔

(الاسعاد والابعاد ص ۴۹)

۲۹۔ بعض عامی کی مغفرت بدو ن عذاب کے بھی ہوگی۔

بعض گنہ گار بدو ن عذاب کے ہی بخش دیے جائیں گے معزلہ کے سوا کسی کا اس میں اختلاف نہیں۔ ان کے نزدیک گنہ گار کو عذاب ہونا لازم ہے۔ تاہم شاہ نے نہ معلوم ان لوگوں کی عقلیں کہاں گئیں۔ وہ خدا کے ذمہ عقاب و ثواب کو واجب کہتے ہیں۔ گویا خدا کو نعوذ باللہ قانون کا تابع کرتے ہیں حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ قانون بنانے والا قانون کا تابع نہیں ہوتا بلکہ قانون خود اس کے تابع ہوتا کرتا۔ اگر ان کے نزدیک عذاب و ثواب کا وجوب عقلی ہے اس سے واجب کا مضطر ہونا لازم آتا ہے۔ اور اضطرار امارات حدوت سے ہے۔ اور واجب اضطرار سے منزہ ہوتا ہے۔ اور اگر یہ وجوب شرعی ہے تو اس کے لئے وجوب شرعی کی ضرورت ہے۔ اگر وہ دلیل میں آیات و عید پیش کریں تو ہم آیات عفو و مغفرت و شفاعت کو پیش کریں گے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ بہت سے گناہوں کو بدو ن عذاب کے بھی معاف کر دیے ہیں اِنَّ اِلٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہِ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔ ہاں جن آیات میں افعال کبیرہ کا عقاب مذکور ہے وہاں استحقاق مراد ہے لزوم و وقوع مراد نہیں۔ یعنی کبار سے وہ شخص عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ وقوع عذاب لازم نہیں، ممکن ہے حق تعالیٰ ویسے ہی بخش دیں۔ باقی وقوع کے متعلق آیت اِنَّ اِلٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ اِکْفَرَ عَنْ اِلٰہِ سے صاف معلوم ہو گیا کہ سب گناہوں پر عذاب لازم نہیں بجز شرک و کفر کے ان پر عذاب لازم ہے یعنی شرعاً۔

غرض گناہ کبیرہ تو بدو ن عقاب کے معاف ہو سکتا ہے۔ مگر کفر و شرک کا ارتکاب بدو ن عذاب کے نہیں رہ سکتا۔ اس پر عذاب لازم ہے اور وہ بھی ابدال آباد کے لئے جس کا انقطاع کبھی نہ ہوگا۔ یہ جرم کسی طرح معاف نہ ہوگا۔ نہ عذاب سے۔ نہ بغیر عذاب کے۔

(محاسن الاسلام ص ۹)

۳۔ مرتد بغاوت میں کافر اصلی سے بڑھا ہوا ہے۔

تو این سلطنت میں باغی کی سزا ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جو پہلے ہی سے اس سلطنت کی رعایا نہیں ہیں بلکہ کسی مخالف سلطنت کی رعایا ہیں۔ ایسے لوگوں پر اگر کبھی غلبہ ہو جائے تو ان کو غلام بنالیتے ہیں۔ یا احسان کر کے رہا کر دیتے ہیں۔ یا عزت کے ساتھ نظر بند کر دیتے ہیں۔ مگر باغی کے لئے بجز قتل یا عبور دریا و شور کے کچھ سزا ہی نہیں اور اسکی وجہ یہ ہے کہ رعایا بزرگ باغی ہو جانے میں سلطنت کی زیادہ توہین ہے اسی طرح اسلام لاکر مرتد ہو جانے میں اسلام کی سخت توہین ہے اور اسکی تعلیم کو دوسروں کی نظروں میں حقیر کرنا ہے۔

دیکھئے ایک وہ شخص ہے جس سے کبھی آپ کی دوستی نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ سے مخالف ہے اسکی مخالفت سے آپ کا اتنا ضرر نہیں ہوتا اور اگر کبھی وہ آپ کی مذمت و بھوکہ کرے تو لوگوں کی نظروں میں اس کی کچھ وقعت نہیں ہوتی۔ سب کہہ دیتے ہیں کہ میاں اس کو تو ہمیشہ سے اس کے ساتھ عداوت ہے۔ دشمنی میں ایسی باتیں کرتا ہے اور ایک وہ شخص ہے جو سالہا سال سے آپ کا دوست رہا۔ پھر کسی وقت مخالف بن گیا اسکی مخالفت سے بہت ضرر پہنچتا ہے۔ اور وہ جو کچھ برائیاں کرتا ہے لوگ ان پر توجہ کرتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ وہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے اس کا منشا محض عداوت نہیں ہے اگر دشمن ہوتا تو سالہا سال تک دوست کیوں بننا معلوم ہوتا ہے کہ دوستی کے بعد فلاں شخص کے اترے پترے معلوم ہو گئے ہیں اس لئے مخالفت ہو گیا۔ حالانکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو شخص دوستی کے بعد دشمن بنا ہو، وہ اترے پترے معلوم کر نیچے بعد ہی دشمن بنا ہو۔ متحین نے اس شخص نے دوستی ہی میں اس نیت سے کی ہو کہ لوگ دوستی کے زمانے میں مجھے اس کا راز دار سمجھ لیں گے تو مخالفت کی حالت میں جو کچھ کہوں گا اس کو یہ سمجھ کر قبول کر لیں گے کہ یہ شخص راز دار ہے چکلا ہے۔ اس کو ضرور کچھ راز دار باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے مخالفت ہو گیا۔ چنانچہ بعض یہود نے اسلام کے ساتھ ایسا بڑا ڈکرنے کا ارادہ کیا تھا۔ پس ہر چند دوست کی مخالفت میں یہ احتمال بھی ہے مگر عادتہ لوگ دوستوں کی مخالفت سے عموماً جلد متاثر ہو جاتے ہیں اور اس احتمال پر نظر نہیں کرتے۔ اس لئے عقلاً و شرعاً قانوناً وہ شخص بہت بڑا مجرم شمار ہوتا ہے جو موافقت کے بعد مخالفت کرے۔

اس لئے شریعت میں مرتد کے لئے دنیوی سزا بھی سخت ہے اور عذاب آخرت بھی اشد ہے۔ (محاسن الاسلام ص ۱۹)

۳۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غنائے قلب کا حال۔

سمجھ لینا چاہیے کہ اول تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غنائے ظاہری کی ضرورت نہ تھی اور جو اصل غنا ہے یعنی غنائے قلب، تو وہ آپ کے پاس فطرت سے موجود تھی اور نبوت کے بعد اس میں اس قدر ترقی ہوئی کہ کسی کو بھی آپ کے برابر غنائے قلب حاصل نہ ہو گا۔ کیونکہ اس کا مدار توکل اور تعلق مع اللہ پر ہے اور ان صفات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی کامل نہیں اس لئے آپ کے غنائے قلب کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ بلکہ ظاہری غنائے قلب کو پریشانی ہوتی ہے اور اس کے حقوق کا خیال کر کے یہ پریشانی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اسی کے ازالہ کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام کو فرمایا ہے۔ هَذَا عَطَاؤُنَا خَامُنُّ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ اس کی دوسری تفسیریں کی گئی ہیں ایک یہ کہ ”لہذا“ مبتدا ”عطاؤنا“ خبر اول ”بغیر حساب“ خبر ثانی، یہ ہماری عطا ہے اور بے حساب یعنی بے شمار ”بغیر حساب“ سے کثرت کا بتلانا مقصود ہے۔ اور ایک تفسیر یہ ہے کہ ”بغیر حساب“ معول ہے ”فامنن او امسک“ کا۔ یعنی یہ ہماری عطا ہے خواہ دو یا نہ دو۔ آپ سے اس کے حقوق کے متعلق کوئی سوال اور باز پرس نہ ہوگی، جس طرح چاہو تصرف کرو کلی اختیار ہے۔ دوسری تفسیر مجھے زیادہ پسند ہے اور واقعی علیہ السلام کے لئے اتنی بڑی سلطنت اور اس کا ساز و سامان خارجاں ہو جاتا، اگر انکی تسلی اس طرح نہ کی جاتی۔ جب ”بغیر حساب“ فرما کر بارغم ہلکا کر دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے بے فکری سے سلطنت کی۔ اس سے ظاہراً سامان کی کثرت کا موجب پریشانی ہونا ثابت ہو گیا تب ہی تو ان کا ازالہ کیا گیا۔ اسی واسطے جب حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا کہ چاہے ملک ہونا اختیار کر لیں یا بنی ہونا اختیار کر لیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ سے نبی عہد ہونا اختیار کیا۔ اگر آپ بھی بنی ملک ہونا چاہتے ہیں تو آپ سے بھی یہی ارشاد ہوتا هَذَا عَطَاؤُنَا خَامُنُّ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ اور اس سے آپ کی بھی تسلی کر دی جاتی۔ مگر آپ نے سلطنت پر عبدیت کو ترجیح دی اور غنا ظاہری اختیار نہیں فرمایا دوسرے اگر غنائے ظاہری ہی مراد لی جائے۔ جیسا مفسرین میں یہی مشہور ہے تو گو آپ کے پاس

مال جمع نہ رہتا تھا اور اسی سے شبہ عدم غنائے ظاہری کا ہو سکتا ہے مگر جو مقصود ہے مقصود ظاہری سے کہ کوئی مصلحت انکی نہ رہے وہ مقصود اس طرح حاصل کہ وقتاً فوقتاً اس قدر مال آتا تھا کہ سلاطین و امراء کی طرح آپ خرچ فرماتے تھے جنہیں یہ بھی حکمت تھی کہ آپ مقتدا تھے اور مقتدا کے لئے وقت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ عرفاتوں سے ہوتی ہے بشرطیکہ متول پر متول بھی مسلط ہو (یعنی سخاوت بھی ہو کہ لوگوں کو دیتا دلاتا رہے جس سے مال چلتا پھرتا چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری غنائے بھی یہ حالت تھی کہ آپ نے حج و دایع میں سو اونٹ قربان کئے جس میں تریسٹھ اپنے دست مبارک سے خر کئے جس کی تفصیل حدیث میں آتی ہے کلھن یزدلفن الیہ کہ اونٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اپنی گردن بڑھاتا تھا گویا ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ پہلے مجھے ذبح کیجئے۔ سبحان اللہ کیا شان محبوبیت تھی۔

ہم آہوان صحرا سر خود نہادہ برکھت بامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد
یہ شعر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شان میں زیادہ چسپاں ہے۔ واقعی آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایسے ہی تھے کہ جانور اپنی گردنیں خود آگے بڑھاتے تھے اور ہر ایک چاہتا تھا کہ کاش پہلے میں آپ کے ہاتھ میں ذبح ہو جاؤں تو اتنے اونٹوں کا ذبح ہونا بدون ظاہری غنائے کم ممکن ہے۔ اسی طرح آپ کی عطار اور سخاوت کی یہ حالت تھی کہ بعض دفعہ آپ نے سو سو دو سو اونٹ ایک ایک شخص کو عطا فرمائے۔ ایک اعرابوں کا بکریوں کا بھر اچنگل عنایت فرمادیا۔ بحرین سے جب مال آیا تو وہ اتنا تھا کہ مسجد میں سونے چاندی کا ڈھیر لگ گیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کا سب ایک دم سے بانٹ دیا اور بعض صحابہ کو اتنا دیا جتنا وہ اٹھا سکتے تھے۔ ایسی نظریں تو سلاطین کے یہاں بھی نہیں سی جاتیں۔ اور اس سے آپ کا غنائے ظاہری بھی ظاہر ہے کیونکہ عطاءے ظاہری کی حقیقت مال کا رکھنا نہیں ہے بلکہ مال کا خرچ کرنا ہے وہ بوجہ اکمل ثابت ہو گیا۔

(الوار الیتامی ص ۳۸)

۳۳۔ جنت میں شہد کی ارواح کا سبز پرند نہیں ہوتا۔

جنت میں وہ جسم طیر شہدار کے لئے مرکب ہوگا۔ ان کا حقیقی جسم وہ نہ ہوگا بلکہ ان کے لئے جسم انسانی دوسرا ہوگا۔ پس ارواح شہدار کا جو اصل طیور خضر میں ہونا ایسا ہے جیسا کہ دنیا میں اہم بہل اور گنجی یا ڈولی اور پالکی میں سوار ہوتے ہیں۔ اگر اور گنجی بند ہو تو دیکھنے والے کو بھی معلوم ہوگا کہ پالکی اور گنجی آرہی ہے ہمارا جسم ان کو نظر نہ آئے گا۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائیگا کہ گنجی اور پالکی ہمارا جسم ہے اور ہماری روح اس کے اندر جو آدمی بیٹھا ہے اس کا جسم گنجی اور پالکی کے جسم سے علیحدہ ہے اور یہ شخص اس کی سواری ہے اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جنت میں ارواح شہدار کے لئے سبز پرندوں کا جسم بمنزلہ پالکی کے ہوگا اور اس کے اندر روح انسانی اپنے جسم کے ساتھ سوار ہوگی پس اس سے انسان کا پرندہ بن جانا لازم نہیں آتا۔ یہ صورت جب لازم آتی کہ روح انسانی اپنے جسم سے علیحدہ ہو کر جسم میں حلول کرتی۔ اور وہاں یہ بات نہ ہوگی کہ اب یہ بات کہ وہ جسم انسانی کون سا ہے جس کے شہدار کی رو میں حلول کر کے جو اصل طیور خضر میں سوار ہونگی۔ آیا وہ وہی جسم عنصری ہے یا کوئی دوسرا جسم ہے اس کی تحقیق کے لئے کشف کی ضرورت ہے کیونکہ نفس اس سے ساکت ہے اہل کشف کو معلوم ہوا ہے کہ عالم برزخ میں انسان کو جسم مثالی عطا ہوتا ہے جو اسی جسم عنصری کے مشابہ ہے مگر اس سے زیادہ لطیف ہوتا ہے لیکن یہ جسم مثالی صرف برزخ ہی میں انسان کو عطا ہوگا۔ اور جنت و دوزخ میں یہی جسم عنصری پھر مل جائے گا گو برزخ میں جسد عنصری کا ہونا کچھ محال نہیں۔ مگر خلاف مشاہدہ ہے۔ اہل کشف کو معلوم ہوا ہے کہ برزخ میں عذاب و ثواب ارواح کو جسم مثالی کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ (تزیج الآخرة ص ۳۲)

۳۳۔ اہل دنیا کے آخرت کا نفع دنیا کے نفع سے

بڑھا ہوا ہے

اس کا جواب بھی سن لو ”وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَى“ اس میں جواب ہے

لے پرندہ۔

اس عذر کا جس سے اس کا غلط ہونا معلوم ہو گیا۔ حاصل جواب کا یہ ہے کہ کسی منفعت کا محض عاجل ہونا اسکی ترجیح کے لئے کافی نہیں بلکہ ترجیح کے اور اسباب بھی ہوتے ہیں۔ سودنیا میں ہر چند یہ صفت ہے کہ وہ عاجل ہے مگر آخرت میں اس کے مقابل دو صفتیں ہیں۔ ایک خیریت، دوسرے بقار یعنی دنیا سے آخرت عمدہ اور کثیر بھی ہے اور پائیدار رہنے والی بھی ہے، دنیا میں نہ وہ عمدگی اور زیادت ہے نہ پائیداری ہے اور ان دونوں میں سے ہر صفت ایسی ہے کہ اس کے مقابل وصف عاجل کو ہرگز کوئی ترجیح نہیں دنیا کیونکہ اگر عاجل ہونا ہمیشہ موجب ترجیح ہو تو پھر تجارت کبھی نہ ہو سکے کیونکہ اس سرمایہ عاجلہ کو اس وقت لگانا پڑتا ہے اور نفع زائد آجل ہے۔ لیکن تمام عقلاء اس وجہ سے تجارت کو موقوف نہیں کرتے کہ اس کا نفع بعد میں حاصل ہوتا ہے اور سرمایہ اس وقت موجود ہے بلکہ سب لوگ خوشی کے ساتھ موجودہ سرمایہ کو تجارت میں لگا دیتے ہیں محض اس امید پر کہ آئندہ نفع زائد ملے گا۔

معلوم ہوا کہ زیادہ و کثرت کے مقابلے میں وصف عاجل نظر انداز کر دیا جاتا ہے پھر تم آخرت پر دنیا کو اس وجہ سے کیوں مقدم کرتے ہو کہ وہ عاجل ہے اور نفع آخرت آجل ہے۔ تم نے یہ بھی سوچا کہ آخرت دنیا سے کتنی زیادہ اور کتنی عمدہ ہے۔

اسی طرح زراعت بھی دنیا میں نہ ہو سکتی کیونکہ اس میں بھی موجودہ غلہ کو آئندہ کی امید پر مٹی میں ملا دیا جاتا ہے۔ اگر تم منفعت عاجلہ کے ایسے ہی عاشق ہو، پس زراعت کو بھی جواب دیدو، مگر تم ایسا نہیں کرتے بلکہ ہر سال زراعت کرتے ہو، کیونکہ اس میں زیادہ ملنے کی امید ہے۔ پھر آخرت کے مقابلہ میں دنیا کے اس وصف کو کیوں دیکھتے ہو کہ وہ عاجل ہے (یعنی جلدی ملنے والی ہے) اور یہ آجل ہے (یعنی دیر سے ملنے والی ہے) ارے وہ آجل ایسی ہے کہ اس کے سامنے دنیا کسی قابل بھی نہیں اور دوسری صفت آخرت میں یہ ہے کہ وہ ”باقی“ ہے بہت پائیدار ہے۔ اور پائیداری بھی خود ایسا وصف ہے کہ اس کے مقابلے میں وصف مجتلت کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ دنیا میں اسکی صدا ہا نظیر ہیں۔ ایک شخص آب کو مکان دینا چاہتا ہے مگر اس کے پاس دو مکان ہیں ایک تو کچا بنا ہوا ہے، اور چھوٹا بھی ہے اور دوسرا پختہ اور عالیشان ہے اور وسیع بھی ہے۔ وہ آپ سے کہتا ہے کہ اگر تم پختہ مکان لینا چاہتے ہو تو میں یہ بھی دے سکتا ہوں مگر چار سال کے بعد یہ واپس لے لیا جائے گا اور اگر کچا مکان لینا ہو تو وہ ہمیشہ کے لئے تمہاری ملک کر دوں گا۔ آپ بتلائیے کیا کریں گے؟

یقیناً ہر عاقل یہی کہے گا کہ بھائی اس عالیشان محل سے جو عاریتہ ملتا ہے، وہ کچا مکان اچھا ہے جو دائم ملک ہو۔

مگر افسوس تم دنیا و آخرت کے معاملہ میں اس فیصلہ کو نظر انداز کرتے دنیا کی وجہ سے آخرت چھوڑنا ہو کہ آخرت کو جو دوامی ہے۔ دنیا کے لئے چھوڑتے ہو جو چند روزہ ہے۔ انسان کی حیات ہی کیا ہے۔ بعضے لوگ رات کو اچھے خاصے سوئے اور صبح کو مرے ہوئے پائے گئے۔ اس ناپائیدار مردار کے لئے تم اپنا اصلی وطن برباد کرتے ہو جو ہمیشہ کے لئے حق تعالیٰ تمہارے نام کرنا چاہتا ہے۔ پھر مزہ یہ ہے کہ یہاں معاملہ برعکس ہے کہ دنیا سے عاجل کوئی۔۔۔ عالی شان و خوب صورت بھی زیادہ نہیں ہے۔ آخرت اس سے کہیں اور کتنی ہی بڑی ہے اور نہایت خوب صورت و عالی شان ہے۔ تو یہاں تم ایک کچے اور ناپائیدار مکان کے لئے جو عاریتہ مل رہا ہے اور عاریت بھی سال دو سال کے لئے نہیں بلکہ ایک دو لمحہ کے لئے کیونکہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ شاید ہمیں نفس نفس ہو دایسے عمدہ و عالیشان محل کو چھوڑتے ہو جو دواماً تمہاری ملک کیا جاتا ہے۔ اب بتلاؤ تمہارا وہ عذر کہاں گیا کہ صاحب دنیا تو ابھی مل رہی ہے اور آخرت کا معاملہ ادھار پر ہے صاحبو! دنیا تو ایک دو لمحہ کے لئے مل رہی ہے جس میں کچھ راحت نہیں، کلفت ہی کلفت ہے اور آخرت ہمیشہ کو مل رہی ہے جہاں رنج و غم کا نام نہیں جس کو دیکھ کر بے ساختہ کہو گے۔ الحمد للہ الذی اذهب عن الحزن ان رینا لغفور شکور ط الذی احلنا دال المقامت من فضله لایمسن فیہا نصب ولا یمسن فیہا الخوب ط۔

رہا یہ شبہ کہ آخرت کا ادھار ایسا ہے کہ نہ معلوم کب ملے گا۔ اس کا آخرت کا نفع یقینی ہے جواب یہ ہے کہ تاخیر زائد کی وجہ سے عاجل کو ترجیح اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ موجد کے ملنے کا پورا یقین نہ ہو۔ اور اگر پورا یقین ہو کہ یہ موجد ضرور ملے گا تو وہاں تاخیر زائد کی بنا پر عاجل کو ترجیح نہیں ہو سکتی۔ اب یہ دیکھو کہ آخرت کا وقوع محتمل ہے یا یقینی، فرماتے ہیں، ان هذا المعنی الصحف الاولیٰ طصحف ابراہیم موسیٰ یعنی آخرت کا آنا ایسا یقینی ہے کہ خبر متواتر سے ثابت ہے، ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے وقت سے اس کی خبر ہر زمانے میں دی جا رہی ہے۔ لہذا یہ عذر بھی باطل ہوا۔ اور ایک جواب میں پہلے دے چکا ہوں کہ آخرت کے آنے میں صرف تمہاری موت کی دیر ہے۔ مرنے کے بعد ہی سے تم کو آخرت

کی نعمتوں کا مشاہدہ ہو جائے گا۔ اور مرنے میں دیر ہی کیا ہے۔ زندگی کا دو منٹ بھی بھروسہ نہیں لہذا تاخیر زائد کہنا ہی غلط ہے۔

اور تیسرے جواب کی طرف اس آیت میں ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام کا نام ذکر کر کے اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اعمال آخرت کا ثمرہ سب ادھار ہی نہیں بلکہ حیات دنیا میں بھی اس کے ثمرات حاصل ہوتے ہیں چنانچہ حضرات ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے واقعات دنیا کو معلوم ہیں کہ انہوں نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دی تھی تو خدا نے ان کو دنیا میں بھی کیسی کامیابی اور فلاح و عزت و راحت عطا فرمائی کہ ان کے دشمن مغلوب و مقہور ہوئے اور وہ غالب و قاهر ہوئے دشمنوں کے نام لینے والے بھی ناپید ہو گئے ہیں اور ان حضرات کے نام لینے والے اتباع و تعظیم کرنے والے ہر زمانہ میں موجود رہتے ہیں۔ تو خیریت و بقا کا نمونہ دنیا میں اللہ کے بندوں کو عطا ہوتا ہے۔

(ترجیح الآخرت ص ۴۴ تا ۴۷)

۳۴۔ حسن یوسف علیہ السلام و جمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیق۔

شاید کسی کو شبہ ہو کہ یوسف علیہ السلام کا حسن تو ایسا تھا کہ زنانِ مصر نے آپ کی صورت دیکھ کر بدحواسی میں ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ بات کہاں تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حسن کی انواع ہیں جن کی ایک نوع یہ ہے کہ وہ دیکھنے والے کو دفعۃً متحیر کر دے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی سہار ہوتی جائے۔ یوسف علیہ السلام کا حسن ایسا ہی تھا چنانچہ زلیخا کو آپ کے حسن کی سہار ہو گئی تھی۔ انہوں نے ایک دن بھی ہاتھ نہیں کاٹے۔ اور ایک نوع حسن کی یہ ہے کہ دفعۃً تو متحیر نہ کرے مگر جوں جوں اس کو دیکھا جائے تحمل سے باہر ہوتا جائے جس قدر غور کیا جائے اسی قدر دلیل میں گھستا جائے۔ اسی کو شاعر بیان کرتا ہے کہ

بیزیدک وجهہ حسنہ اذا ما ذر دست نظرنا !

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن ایسا ہی تھا کہ اس میں دفعۃً متحیر کر دینے کی شان ظاہر نہ تھی۔ کیونکہ آپ میں خداداد عظمت و جلال کی ایک شان ایسی تھی کہ دیکھنے والے پر سب سے پہلے اس کا اثر پڑتا تھا جس کی وجہ سے دیکھتے ہی نیا آدمی مرعوب ہو جاتا تھا۔ اس کو حسن صورت پر آنکھ بھر کر نگاہ ڈالنے کی مہلت ہی نہ ملتی تھی۔ تاکہ تحیر کی نوبت آئے۔ کما فی حدیث من رواہ ابداہما ہابہ۔ اخرجه الترمذی فی الشمائل (جامع) اس پر منکشف ہوتا تھا۔ اور دن

بدن دل میں گھر کر تا چلا جاتا تھا۔ کما فی حدیث علی المذکور من خابطہ بشاشتا حبثا یوسف علیہ السلام کے حسن پر عورتوں کا عاشق ہو جانا منقول ہے مگر فی نفسہ یہ زیادہ بعید نہیں۔ بلکہ ایک فطری امر ہے جو عادت کے مطابق ہے گو کسی درجہ خاص میں خارق عادت بھی ہے۔ اور حضور پر نور پر مرد عاشق تھے جن میں بچے بھی تھے بوڑھے بھی تھے، مردوں کا عاشق ہونا اور وہ بھی بچوں اور بوڑھوں کا فی نفسہ بھی بہت عجیب ہے۔ ایک عاشق صحابی فرماتے ہیں۔ رأیت صلی اللہ علیہ وسلم لیلتہ فی حلة حمراء والقمر طالع، وکت امری القمر مرة والی وجهہ صلی اللہ علیہ وسلم مرة فواضح کان وجهہ احسن منی۔ (ادکما قال)۔ یعنی ایک رات میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سرخ (دھاریدار) جوڑے میں دیکھا۔ اس وقت چاند نکلا ہوا تھا تو میں کبھی آپ کے چہرہ پر نظر کرتا۔ کبھی چاند کو دیکھتا۔ بخدا آپ کا چہرہ مبارک چاند سے زیادہ خوبصورت تھا۔ اسی کو کسی شاعر نے عجیب لطیف عنوان سے تعبیر کیا ہے کہ

گہے بسوئے تو گلے بسوئے مہ می نگرم کد مقابلہ چوں کس کتاب راتنہا۔

یعنی کتاب کے مقابلے کے لئے تو ادو آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے میں تنہا کیونکر مقابلہ کر دوں۔

ایک مرتبہ حضرت طلحہ صحابی رضی اللہ عنہ نے لڑائی میں اپنے ہاتھوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سپر بنایا تھا۔ کفار کے جتنے تیر آتے تھے وہ سب کو اپنے ہاتھ پر روکتے تھے۔ تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی تیر نہ لگنے پائے۔ یہ عشق نہ تھا تو اور کیا تھا۔ اس کے علاوہ صحابہ کی محبت کے واقعات کتابوں میں بکثرت سے موجود ہیں۔ بہت سے صحابہ نے آپ کی محبت میں گھر بار چھوڑا۔ بیوی بچے چھوڑے اپنے عزیزوں کو جب کہ وہ حضور کے مخالف ہوئے بے دریغ قتل کیا، حتیٰ کہ خود اپنی جانیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نثار کر دیں اور سرکٹوائے۔ اسی حسن کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ

لا حرج ذلیخا لورثین جبینہ لاشرون بالقطع القلوب علی الید

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن دل میں گھستا تھا اگر آپ کو زنانِ مصر دیکھ لیتی تو بچلے ہاتھ کے دلوں کو چیر بھاڑ دیتی۔

پس اجمالاً حضور کے حسن کے متعلق میں اپنی گفتگو پر کفایت کرتا ہوں اور حقیقت میں اتنا بھی میرے مذاق کے خلاف ہے۔ باقی اس بات میں تفصیلی گفتگو کرنا تو میرے مذاق کے

بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ اس میں ایہا تم تقیص کا ہوجاتا ہے۔ (الرفع والوضع صلا)

۳۵۔ علماء کرام میں غیر خدا سے طبعی خوف کی وجہ۔

بعض لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ علماء کو ایسا ہونا چاہیے۔ یخشونہ ولا یخشون احدًا الا اللہ کہ بس خدا ہی سے ڈریں اور کسی سے نہ ڈریں، ان کے نزدیک علماء کو نہ شیر سے ڈرنا چاہیے۔ نہ سانپ کچھو سے نہ توپ سے نہ بندوق سے نہ حکام سے نہ ڈاکوؤں سے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ موزی چیز سے انبیاء علیہم السلام کو بھی خوف طبعی ہوتا ہے، اگر یہ خوف طبعی توکل کے خلاف ہے تو کیا معاذ اللہ انبیاء کو غیر متوکل کہو گے؟ ہرگز نہیں، کس کا منہ ہے جو اپنے کو موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ متوکل بتائے۔ مگر وہاں یہ حالت تھی کہ نبوت کے بعد ان کے دل میں فرعون سے بھی خوف تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ قال ربنا انت اخفنا ان یضرب علینا اوان یطغیٰ قال لا تخافا انی معکم اسمع واری ۵ موسیٰ وہارون علیہما السلام نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو فرعون کی طرف سے یہ خوف ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرنے لگے یا حد سے بڑھ جائے یا وجود کے حق تعالیٰ کی طرف سے ان کو صریح اور صاف حکم ہو چکا تھا اذہبالی فرعون انه طغیٰ ۵ فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ کشتی پر کمر باندھ رہا ہے مگر بایں ہمہ موسیٰ علیہ السلام وہارون علیہ السلام نے آجکل کے بہادروں کی طرح اپنی بہادری ظاہر نہیں کی کہ ہم کو نہ قتل کا خوف ہے نہ قید خانے کا اندیشہ ہے ہم بلا خوف و خطر اس خدمت کو انجام دیں گے بلکہ انہوں نے اپنے طبعی خوف کو حق تعالیٰ سے عرض کر دیا کہ ہم کو اس کی زیادتی سے ڈر لگتا ہے۔ اور اس کا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں وہ ہم کو قتل نہ کر دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ طبعی خوف کا ہونا نبوت و ولایت کے بالکل منافی نہیں۔ ورنہ حق تعالیٰ اس خوف پر انکار فرماتے مگر حق تعالیٰ نے اس پر ان کو ذرا ملامت نہیں کی بلکہ تسلی دے کر فرمایا لا تخافا انی معکم ۵ تم ڈرو نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں اور دوسری جگہ ارشاد ہے یجعل لکم سلطانا فلا یصلون الیکم انتا ومن اتبعکم الخلبون ۵ ہم تم کو رعوب عطا کریں گے جس کی وجہ سے وہ تم تک نہ پہنچ سکیں گے اور تم کو اور متبعین ہی کو غلبہ حاصل ہوگا۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے طبعی خوف کے ازالے کا سامان کر لیا اس وقت فرعون کے پاس تشریف لے گئے اس سے معلوم ہوا کہ یخشون ولا یخشون احدًا الا اللہ میں خوف طبعی کی نفی نہیں۔ بلکہ خوف عقلی

کی نفی ہے۔

دوسری کہ یہ آیت تبلیغ احکام کے متعلق ہے، اور مقصود یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تبلیغ احکام میں سوا رب خدا کے کسی سے ایسا نہیں ڈرتے کہ وہ تبلیغ سے مانع ہو جاوے۔ چنانچہ پوری آیت اس طرح ہے الذین یبلغون رسالت اللہ یخشونہ ولا یخشون احدًا الا اللہ وکفی بالحدّ حسیبًا ۵ وہ انبیاء راہ سے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچایا کرتے تھے اور اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے تھے اور اللہ تعالیٰ حساب لینے کے لئے کافی ہے اس میں تبلیغ احکام کے وقت غیر اللہ کے خوف عقلی کی نفی کی گئی ہے۔ رہا یہ ان کو کسی سے خوف طبعی بھی نہیں ہوتا یہ اس آیت کا مفہوم نہیں۔ لوگ قرآن کو ادھورا پڑھتے ہیں اس لئے اشکال ہوتا ہے۔ پورے مضمون پر نظر کرنے کے بعد کچھ اشکال نہیں رہتا غرض تبلیغ احکام کے وقت بھی اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت خوف طبعی کسی درجہ کا لاحق نہیں ہوتا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ ان کو فرعون سے طبعی خوف تھا اسی لئے انہوں نے حق تعالیٰ سے اپنا خوف ظاہر کر کے اس کا علاج چاہا بلکہ مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تبلیغ احکام ضرور کرتے ہیں اور تبلیغ کے متعلق خوف عقلی تو ان کو صرف خدا سے ہوتا ہے مخلوق کا خوف عقلی انہیں ذرا نہیں ہوتا جس کے اثر سے خوف طبعی مخلوق کا ان پر ایسا غالب نہیں ہوتا جو تبلیغ سے روک دے۔ بلکہ اگر کسی وقت مخلوق سے ان کو خوف طبعی ہوتا بھی ہے تو وہ خشیت خداوندی سے مغلوب ہوجاتا ہے۔

پس مخلوق کے خوف عقلی کی تو مطلقاً نفی ہے اور خوف طبعی کی مطلقاً نفی نہیں۔ بلکہ اس کے غلبہ کی نفی ہے۔ اب یہ مضمون انشاء اللہ کسی نص سے متعارض نہ ہوگا۔ اس پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ پھر علماء کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے کہ مخلوق سے خوف ان کو ذرا نہ ہو اور خوف طبعی اگر ہو تو خوف خداوندی سے مغلوب ہو اس پر غالب نہ ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس جگہ علماء کے ذمے تبلیغ فرض ہوتی ہے وہاں بیشک ان پر خوف خداوندی ہی غالب ہوتا ہے۔ مخلوق کا خوف طبعی غالب نہیں ہوتا مگر جہاں ان پر تبلیغ فرض ہی نہ ہو۔ محض مستحب ہو۔ وہاں اگر ان کو مخلوق سے خوف طبعی ہو تو اس میں کیا حرج ہے۔ بخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ ان پر تبلیغ ہر حالت میں فرض ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جن علماء کو تم خائف کہتے ہو وہ اس خوف کی وجہ سے کسی فرض و واجب کو ترک کر دیتے ہیں یا سب احکام مستحب کو۔ اگر تم کو انصاف سے دلائل میں غور کرو گے تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ مخلوق کے خوف سے کسی فرض و واجب کو ہرگز ترک نہیں کرتے۔ بلکہ محض بعض مباحات۔ یا بہت سے بعض مستحبات

کو ترک کر رہے ہیں۔ سو ایسی حالت میں وہ بخشنے والا احسان کے خلاف کیونکر ہو سکے۔ بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جن مسائل کی تبلیغ آجکل کے بہادر لوگ کر رہے ہیں علماء بھی ان سب کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ صرف عنوان کا فرق ہے۔ بہادران قوم مقابلہ اور سب شتم کے ساتھ تبلیغ کرتے اور جن کو تم خائف کہتے ہو وہ تہذیب اور نرمی کے ساتھ ان مسائل کو بیان کرتے ہیں۔ اب صرف اس بات کا فیصلہ باقی رہا کہ مخالفین اسلام کے سامنے آیا ہم کو مقابلہ اور سب شتم کے ساتھ احکام کو ظاہر کرنا چاہیے یا نرمی اور تہذیب کے ساتھ سو اس کا فیصلہ خود قرآن نے کر دیا ہے۔

حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا فرما کر جب فرعون کے پاس تبلیغ احکام کے لئے جانیکا حکم فرمایا تو اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا وقتولا لبنا العلم یتدن کرنا دینشہ اور فرعون سے نرمی کے ساتھ بات چیت کرنا۔ شاید ان کو نصیحت ہو جائے یا خدا کا خوف اس کے دل میں آجائے۔ دیکھ لیجئے، موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ کون متوکل ہو گا اور فرعون سے زیادہ ظالم و کشر کون، مگر بایں ہمہ یہ حکم ہو رہا ہے کہ اس سے نرمی کے ساتھ گفتگو کیجئے گا۔

صاحبو! قاعدہ یہی ہے کہ جب کسی مخالف پر اپنا زور اور دباؤ نہ ہو وہاں مقابلہ اور سختی نافع نہیں ہوتی۔ بلکہ اکثر مضر ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع میں اکثر نرمی ہی سے کچھ نفع ہوتا ہے (جامع حرمان الحدود ص ۳)

۳۶۔ جنٹلمینوں کا انگریزی کو علم میں شمار کرنا غلطی ہے۔

جتنے فضائل احادیث میں علم کے لئے وارد ہیں۔ انگریزی تعلیم پر بھی ان کو جاری کرتے ہیں اور اس کے متعلق یہ حضرات ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں۔ اطلبوا العلم ولو بالصین ترجمہ: علم کو طلب کرو اگرچہ چین میں بھی ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چین سے طلب علم کی ترغیب دی ہے۔ حالانکہ اس وقت چین میں دین کا علم بالکل نہ تھا، بلکہ محض دنیاوی علم تھا۔ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مطلق علم کی ترغیب دے رہے ہیں۔

خواہ دنیا کا علم ہو یا دین کا۔ پس انگریزی بھی علم ہے اور اس حدیث کے تحت میں داخل ہے۔ ان لوگوں کو اول تو اس حدیث کا ثبوت دینا چاہیے۔ ان الفاظ سے یہ حدیث محدثین کے نزدیک ثابت ہی نہیں۔

قلت ذکر له في المقاصد طريقين وقال هو ضعيف من الوجهين وقال ابن حبان انه باطل لا اصل له واخرج ابن الجوزي في الموضوعات قال واخرج البيهقي في الشعب قلت قد التزم ان يخرج موضوعا فلا شبه الحكم عليه بالضعيف والضعيف لا يحتج به فالاحكام جامع

اور اگر ثابت بھی ہو تب بھی ان لوگوں کا مدعا اس سے حاصل نہیں ہوتا کیونکہ انہوں نے لفظ ”ولو“ پر نظر نہیں کیا۔ یہ لفظ فرض کے لئے آتا ہے مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض چین میں بھی علم ہو تو وہاں سے بھی کوشش کر کے حاصل کرنا چاہیے اور فرض اسی چیز کو کیا جاتا ہے جو معدوم و مستبعد ہو۔ موجود کو فرض نہیں کیا جاسکتا۔ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اس حدیث سے وہی ہے جو چین میں اس وقت موجود نہ تھا۔ اس لئے بطور فرض کے فرما رہے ہیں کہ اگر وہاں بھی ہو تو حاصل کرو اور علم دین ہی ہے ورنہ اگر علم کو ایسا عام کیا گیا کہ دنیوی علم بھی اس میں داخل ہو گیا تو ایک بھنگی اور چار کو بھی عالم کہنا چاہیے کیونکہ اس کو بھی دنیا کا ایک علم حاصل ہے جو کام دہ کرتا ہے اس کو وہ خوب جانتا ہے اور اگر آپ ان کاموں کو بھی علم میں داخل کر لیں گے تو پھر آپ کی خاطر سے ہم انگریزی کو بھی اس میں داخل کر لیں اور خیر جانے دیجئے۔ ہم لفظ ولو سے بھی استدلال نہیں کرتے مگر ہم کہتے ہیں اطلبوا العلم ولو بالصین میں تو تصریح نہیں کہ اس سے کون سا علم مراد ہے۔ اب شریعت کی دوسری نصوص سے اس کو دریافت کیا جائے۔ بس علم وہ جس کو شریعت علم کہتی ہے۔ جس کے جاننے والوں میں ایک شیخ سعدی بھی ہیں۔ ع۔

”علمی کہ رہے بحق تنماید جہالت است“

اور حدیث میں ہے الدنيا ملعونة وما فيها ملعون الا ذكرا ملأها وصا والاہ الحدیث، معلوم ہوا کہ جو چیز خدا کی طرف قریب نہ کرے وہ دنیا سے ملعون ہے۔ اس میں ایسے علوم بھی داخل ہیں اب میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ کیا سائنس اور جغرافیہ اور انگریزی زبان سے خدا کی طرف قریب ہوتا ہے۔ وصل ہوتا ہے یا فصل؟ قرب ہوتا ہے یا بعد؟ مشاہدہ ہے کہ ان سے بعد ہی پڑھتا ہے۔ گوچاہیے تو یہ تھا کہ سائنس سے اور خدا کی طرف قرب پڑھتا کیونکہ

اس سے قدرت صانع کا انکشاف زیادہ ہوتا ہے اور اپنا عجز زیادہ مشاہد ہوتا ہے کیونکہ اہل سائنس رات دن ترقی کی فکر میں رہتے ہیں اسلئے ان کے مقاصد بہت وسیع ہیں جن میں کثرت سے ایسے مقاصد بھی ہیں جو عرصہ تک پورے نہیں ہوتے۔ زمانہ دراز تک ان میں ناکامی رہتی ہے بخلاف ہمارے مقاصد کے کہ وہ معدودے چند ہیں۔ جو اکثر پورے ہو جاتے ہیں مگر ہم پھر بھی اپنے عجز کے معترف ہیں اور ان لوگوں کے زیادہ مقاصد ناکام رہتے ہیں جو کھلی دلیل ہے عجز کی۔ مگر یہ لوگ باوجود مشاہدہ عجز زائد کے پھر بھی اپنے کو قادر سمجھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے عجز پر نظر نہیں کرتے۔ بس عرصہ کے بعد کسی مقصود میں کامیابی ہو گئی۔ اس پر نازاں ہوتے ہیں کہ ہم نے یہ ایجاد کر لی۔ ڈلے پتھر ایجاد کر لی۔ اگر ایجاد تمہارے ہاتھ میں تھی تو پہلے ہی دن کیوں نہ ایجاد کر لی تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ سوچو اور غور کرو۔ باقی ذہن میں ایجاد کا صحیح طریقہ آجانیو تمہارے اختیار سے بالکل خارج ہے۔ یہ محض حق تعالیٰ کے قبضے میں ہے۔ مگر عادت الہیہ ہے کہ جب کسی بات کے لئے انسان غور و فکر کرتا ہے تو وہ اکثر راستے کھول دیتے ہیں۔ اور بعض دفعہ اپنی قدرت ظاہر کرنے کے لئے ہزاروں غور و فکر کے بعد بھی حقیقت ظاہر نہیں کرتے۔ چنانچہ اب تک کسی کو یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ مقناطیس لوہے کو کیوں جذب کرتا ہے اور ایسی نظام بکثرت موجود ہیں اگر غور و فکر کے بعد حقیقت تک پہنچ جانا تمہارے اختیار میں ہے تو ان چیزوں کی حقیقت کا انکشاف کیوں نہ کریا۔ غرض تجربے سے یہ بات مشاہد ہے کہ کچھ عوارض کہ منزلہ لوازم کے ہیں۔ آپ سے جمع ہو رہے ہیں چونکہ سائنس اور جغرافیہ سے قرب خداوندی نہیں بڑھتا۔ بلکہ بعد ہی ہوتا ہے تو یہ علم شرعی میں داخل نہیں ہو سکتے اور نہ ان کے جاننے سے دین کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ ہاں ایسے لوگوں کو ایسا علم دین البتہ حاصل ہو جاتا ہے۔

جیسے ایک لیڈر کا قصہ ہے جو آج کل مسلمانوں کے مقتدا بنے ہوئے ہیں کہ کسی جگہ نماز کا وقت آگیا اور پانی نہ تھا۔ تیمم کی ضرورت ہوئی تو لیڈر صاحب نے اس طرح تیمم کیا کہ اول تو مٹی کو ہاتھوں پر بہایا۔ جیسا پانی کو بہایا کرتے ہیں۔ پھر کلی کرنے کی واسطے منہ میں ڈالتے اور مسح کے لئے سر پر بھی ڈالتے اور پیروں پر بھی مٹی بہاتے۔ مگر منہ میں دیتے ہوئے بعض لوگ منہ پرٹے اس لئے وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ بس انگریزی پڑھ کر ایسا علم ہوتا ہے کہ عقل خاک میں مل جاتی ہے بھلا اگر وہ کسی سے پوچھ ہی لیتے کہ تیمم کا طریقہ کیسا ہے تو اس میں کچھ حرج تھا؟ مگر پوچھتے کس طرح؟ لیڈر ہو کر اپنے جہل کو کیوں ظاہر کریں۔ گومٹی سے کلی کر کے اس سے زیادہ جہل ظاہر کر دیا۔ اور

مزہ یہ کہ ظہور جہل کے بعد بھی وہ قوم کے لیڈر ہی رہے۔ یہ حالت قوم کی ہے کہ اس جہل پر بھی ان کو مقتدا ہی بنائے رکھا انھیں حضرت کا یہ واقعہ بھی ہے کہ ایک دفعہ موٹریں سوار تھے۔ نماز کا وقت آگیا۔ موٹر بھڑا گیا اور اسی میں بیٹھے بیٹھے نماز پڑھ لی۔ حالانکہ سامنے سڑک پر ایک طرف کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتے تھے۔ مگر انہوں نے موٹر کے اندر بیٹھ کر ہی پڑھی۔ بھلا موٹر میں ترک قیام کس طرح جائز ہو گیا جبکہ موٹر کھڑا ہوا تھا چلتی ریل میں تو اگر گرنے کا اندیشہ ہو تو بیٹھ کر نماز کی گنجائش بھی ہے۔ مگر موٹر میں چلتے ہوئے بھی ترک قیام کی گنجائش نہیں کیونکہ اس کا بیٹھنا ہر وقت ہمارے اختیار میں ہے اور ریل گاڑی کا بیٹھنا ہمارے اختیار میں نہیں۔ اور اگر موٹر بھڑا ہوا ہو تب تو کسی طرح ترک قیام کی گنجائش نہیں۔ مگر ان لوگوں نے تو محض لیڈر بننے کے لئے نماز شروع کی ہے اس لئے نماز بھی لیڈری میں ہوتی ہے۔ شرعی نماز کی ان کو کیا ضرورت ہے گواہی غلطیاں دیہاتیوں کے بھی ہوتی ہیں اور ان کو مسائل کا علم نہیں۔ مگر وہ اپنے کو تعلیم یافتہ تو نہیں کہتے نہ علم کا دعویٰ کرتے ہیں۔ بلکہ بیچارے اپنے جہل کا اقرار کرتے ہیں تو گوان سے بھی علم دین سے غفلت کرنے پر کچھ مواخذہ ہو۔ مگر شاید ان کے عجز و نیاز کی وجہ سے ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ ہو جائے چاہے بھوٹری سی سزا کے بعد ہی سہی، حق تعالیٰ کو عاجز پر رحم آتا ہے۔ اس لئے بعض دفعہ گناہگاروں کو انکی عاجزی پر بخش دیا جاتا ہے۔ اور دعوے کے ساتھ سارا علم اور تصوف اور تقویٰ دھوا رہ جاتا ہے۔

(الہدیٰ والمغفرۃ ص ۱۳)

۳۷۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا سے طلب کرنا محبت

الہی کا نتیجہ ہے

اللهم انی استغثک الجنۃ وساقرب الیہا من قول او عمل۔

ترجمہ :- اے اللہ میں آپ سے جنت مانگتا ہوں اور پھر وہ چیز مانگتا ہوں جو جنت سے نزدیک کرنے والی ہو، قول ہو یا عمل، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی رغبت سے عمل کرنا سب سے ارفع حالت ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی۔ تو سمجھ لیجئے کہ ارفع تو وہی حالت ہے کہ محض رضائے محبوب کے لئے عمل کیا جائے۔ رہا حضور کا جنت مانگنا، سو اس کے متعلق وہ بات یاد کر لیجئے جو میں نے پہلے بیان کی ہے کہ عاشق کو محبوب کی چیزوں سے

بھی محبت ہو کرتی ہے۔ پس آپ کا جنت مانگنا ویسا نہیں ہے جیسا ہمارا مانگنا ہے۔ ہم تو جنت اس لئے مانگتے ہیں کہ وہاں ہم کو آرام ملے گا حوریں ملیں گی۔ خوب مزے اڑائیں گے۔ غرض ہم کو حفظ نفس مطلوب ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا اس بنا پر تھا کہ وہ خدا کی چیز ہے، اور خدا تعالیٰ آپ کو مانگنے کا امر فرمایا ہے جب محبوب خود چاہے کہ مجھ سے میری چیزیں بھی مانگو تو اس وقت مانگنا ہی موجب رضا ہے۔ اس وقت استغفار مناسب نہیں ہے۔

چوں طمع خواہد ز من سلطان دیں خاک بفرق قناعت بعد ازین۔
اس لئے آپ نے جنت مانگی۔ اور اس سے استغفار نہیں برتا، عارف کامل خدا کی ادنیٰ نعمت سے بھی استغنا ظاہر نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ جنت سے جو کہ اصل النعم ہے وہاں کوئی ابن الفارض جیسا صاحب حال ہو تو وہ بلا سے استغنا ظاہر کر دے۔ اور ایسے لوگ غلبہ حال سے معذور ہوں گے۔ در نہ معرفت کا مقتضایہ یہی ہے کہ جیسے محبوب سے رضائے محبوب طلب کی جاتی ہے اسی طرح جس چیز کا اسے مانگنا پسند ہو، وہ بھی مانگے اور یہ بھی درحقیقت طلب رضا ہی ہے۔ کسی دوسری چیز کی طلب نہیں۔ دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنت کا سوال اس بنا پر بھی کرتے تھے کہ وہ محل دیدار ہے۔ تو درحقیقت یہ جنت کا سوال نہ تھا بلکہ دیدار محبوب کا سوال تھا۔ اسی کو کہتے ہیں ع۔

در عاشقان جنت برائے دوست نمی دارند دوست

اور ایک بات اس سے بھی باریک ہے وہ یہ کہ بعض دفعہ جنت کی طلب اس نیت سے بھی نہیں ہوتی کہ وہاں محبوب کا دیدار ہوگا۔ بلکہ محض اس خیال سے تمنا کی جاتی ہے کہ ہماری شان تو کہاں جو دیدار کی منتا کریں ہم تو اگر جائے دیدار ہی کو دیکھ لیں تو بڑی قسمت ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ بڑے حوصلے کے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کی تمنا کرتے ہیں۔ ہم تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ قبہ خضرار ہی نظر آئے۔

مرا نہ لطف تو موئے پسند است ہوس را رہ مدہ یوئے پست است

تو بعض دفعہ غلبہ تواضع طلب جنت کا منشا ہوتا ہے کہ عاشق اپنے کو دصال محبوب کے قابل نہیں سمجھتا۔ اس لئے تمنا کرتا ہے کہ میں اس کو دیکھنے کے تولا لائق نہیں۔ کاش اس کے شہر ہی میں جا رہا ہوں۔ اور کبھی اپنی احتیاج و افتقار ظاہر کرنے کے لئے جنت کی طلب

کی جاتی ہے کہ اے اللہ میں آپ کی رضا کا محتاج کیوں نہ ہوگا میں تو جنت تک کا بھی محتاج ہوں۔ اس لئے بطور اظہار احتیاج کے دعا کی جاتی ہے کہ اے اللہ جنت دیدے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حال پیش نظر ہوتا تو آپ کھانا کھا کر فرمایا کرتے تھے۔ الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین غیر مودع ولا مکفور ولا مستغنی عن ربنا۔ یعنی اے اللہ اس وقت پیٹ بھر گیا ہے۔ اس لئے کھانے کو اٹھا دیا ہے ہم اس کو ہمیشہ کے لئے وداع نہیں کرتے نہ اس کی ناقدری کرتے ہیں۔ اور نہ اے اللہ ہمیں اس سے استغنا ہے حقیقت میں آپ کی اداؤں کی یہ حالت ہے کہ

ع زندق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم

کر شمتہ دامن دل می کشند کہ جایجا است

آپ کی جس ادا کو دیکھو اس میں غضب کی دلربائی ہے پھر کمال یہ ہے کہ اس میں نہ تصنع نہ تکلف، بلکہ ایک بسیا ختہ حال ہے

ع دل دریاں نیاتی ہمہ زیور بستند

دبر راست کہ با حسن خدا داد آمد

مخالفین نے بھی ان باتوں کو دیکھ کر آپ کی سچائی کی شہادت دی اور ان کو ماننا پڑا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں جس قدر کمالات تھے وہ اصلی تھے تصنع اور بناوٹ کا وہاں نام نہ تھا۔ غرض ایک مبنی طلب جنت کا یہ بھی ہوتا ہے یعنی اظہار احتیاج۔ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا اور ہمارا مانگنا برابر نہیں اور آپ کے سوال کا یہ مطلب نہیں کہ عمل جنت کے واسطے کرنا چاہیے بلکہ اس کا منشا آپ کی شان کے مناسب بخاواہ اپنے علم کے موافق عرض کر دیا۔ لیکن اگر کوئی شخص جنت ملنے ہی کی نیت سے عمل کرے تو وہ بھی راہ صواب پر ہے غلط راہ پر نہیں، خدا تعالیٰ سے محبت ہونی چاہیے خواہ بلا واسطہ براہ راست ہو یا جنت کے واسطے ہو سب ٹھیک ہے

ع بخت اگر مدد کند دامنش آرم بکف

گر بکشد زہے شرن در بختم زہے طرب

یعنی مقصود قرب ہے بس قرب ہونا چاہیے خواہ میں انہیں کھینچ لوں یا وہ مجھے کھینچ لیں۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ مقصود تو کام چلنا ہے کہ بندے کو خدا کی اطاعت و ذکر کی

توفیق ہو جاوے۔ اب وہ خدا کی براہ راست محبت سے ہوا تو کیا، اور جنت کی رغبت سے ہوا تو کیا دونوں راستے ٹھیک ہیں اور دونوں بڑھیاں ہیں۔ گو ایک رفیع ہے اور ایک ارفع۔
(رزم البیان ص ۴۸)

۳۸۔ اَنْبِیَاءٌ عَلَیْہِمُ السَّلَامُ پر نزع کی کیفیت کیوں ہوتی ہے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نزع میں بہت شدت ہوتی تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شدت نزع دیکھ کر میں کسی کی سہولت نزع دیکھ کر اس کی تمنا نہیں کرتی اسی طرح بعض اولیاء کو بھی نزع شدید ہوتا ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ تو بات یہ ہے کہ شدت نزع کا سبب تو تعلقات ہی ہیں۔ جس قدر روح کو ناسوت سے تعلق ہوگا اسی قدر نزع میں شدت ہوگی۔ مگر تعلقات دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ جو مانع عن الآخرت ہیں۔ جیسے جائداد اور مال وغیرہ کی محبت۔ ان سے جو نزع میں شدت ہوتی ہے اس سے تکلیف سے سخت ہوتی ہے دوسرے وہ تعلقات ہیں جو آخرت سے مانع نہیں ہیں بلکہ معین آخرت ہیں، اور یہ وہی تعلقات ہیں جو اسکے مصداق داخل ہیں۔

”اسیرش نخواہد خلاصی ز بند“

اس کی تعین عنقریب آتی ہے۔ اس سے بھی نزع میں شدت ہوتی ہے مگر اس سے بڑھتی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ وہ شدت لذیذ ہوتی ہے کیونکہ اس کا منشاء قید لذیذ ہے۔ تفصیل اسکی یہ ہے کہ اہل اللہ کو حقیقی تعلق تو بجز ذات حق کے کسی سے نہیں ہوتا اور اس کا مقتضا سہولت نزع ہے مگر بعض حضرات کو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد خلق و تربیت طابین کی خدمت سپرد ہوتی ہے اور یہ بدون الی الخلق کے نہیں ہو سکتی اس لئے ان کو امر حق سے مخلوق کی طرف توجہ کرنا پڑتی ہے اور اصلاح و ارشاد کے لئے ان سے ایک گونہ تعلق ہو جاتا ہے اور یہ تعلق چونکہ بامر حق ہے اس لئے آخرت سے مانع نہیں ہوتا۔ بلکہ موجب امر اور سبب ترقی ہے جس سے جس قدر اصلاح و ارشاد کا فیض ہوگا اسی قدر اس کے درجات میں اضافہ ہوگا۔ چونکہ یہ خدمت سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کے سپرد کی گئی ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام کو مخلوق کیساتھ یہ تعلق زیادہ ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام میں بھی ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد

سب سے زیادہ یہ خدمت تھی، کیونکہ قیامت تک آنے والی مخلوق کے لئے آپ ہی رسول ہیں آپ کے بعد کوئی دوسرا رسول آنے والا نہیں۔ تو آپ کو سب سے زیادہ ارشاد و اصلاح کا فکر و اہتمام تھا۔ اس لئے آپ کو نزع میں شدت زیادہ ہو گئی کیونکہ روح کو امت کے ساتھ تعلق تھا اور وصال کے وقت بھی آپ کو ان کا اہتمام تھا، مگر یہ تعلق لذیذ اور یہ فکر خوشگوار تھا آپ کے لئے اس میں اجر اور ترقی درجات تھی اس لئے شدت نزع سے جسم کو تو تکلیف ہوتی مگر روح کو کچھ تکلیف نہیں ہوتی انبیاء کے بعد بعض اولیاء ایسے ہوتے ہیں جن کے سپرد خدمت ارشاد و تبلیغ ہوتی ہے ان کو بھی نزع میں بوجہ طابین کی فکر کے شدت ہوتی ہے مگر ان کو انبیاء کے برابر شدت نہیں ہوتی کیونکہ ان کی ذمہ داری انبیاء کے برابر نہیں ہے اس لئے ان کو مخلوق کے ساتھ اصلاح و ارشاد کا تعلق بھی ان سے کم ہوتا ہے۔ اور جن بعض اولیاء کے سپرد یہ خدمت نہیں ہوتی وہ بالکل آزاد ہوتے ہیں ان کو نہ کسی کا فکر ہے نہ کسی سے تعلق ہے ان کا نزع بہت سہل ہوتا ہے۔ ایسے لوگ مرتے ہوئے بڑے شاداں و فرحاں ہوتے ہیں۔ بعضے غزل پڑھتے ہوئے جاتے ہیں۔ بعضے ہنستے ہوئے جاتے ہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں سہ

خرم آں روز کزین منزل ویراں بردم

راحت جاں طلبم وز پے جاناں بردم

نذر کردم کہ گر آید بسرا میں عنم روزے

تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بردم

ایک بزرگ مرتے ہوئے فرماتے ہیں سہ

وقت آں آمد کہ من عسریاں شوم جسم بگذارم سرسریاں شوم۔

ان کی یہ حالت دیکھ کر بعض لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ یہ لوگ ان اولیاء سے افضل

ہیں جن کے سپرد خدمت ارشاد ہے۔ کیونکہ وہ موت کے وقت ان کے برابر بے فکر نہیں ہوتے ان کو اپنی ذمہ داری کی بھی فکر ہوتی ہے اپنے متعلقین کا بھی خیال ہوتا ہے اسی وجہ سے ان کے نزع میں شدت بھی واقع ہوتی ہے مگر یہ اعتقاد افضلیت صحیح نہیں بلکہ اکثر وہی اولیاء افضل ہوتے ہیں جو صاحب ارشاد ہیں کیونکہ ان کی حالت انبیاء علیہم السلام کے مشابہ ہیں اور جو جتنا انبیاء کے مشابہ ہو گا وہ دوسروں سے افضل ہوگا۔ لیکن تم کو اس تجویز کا حق نہیں ہے کہ اپنے صاحب ارشاد ہونے کی تمنا کرو۔ بس بادشاہ کو اختیار ہے کہ

تمہارا امتحان لیکر جو عہدہ جس کو چاہے دے۔ (العبرة بذكر البقرة ص ۱۲)

۳۹۔ تفاضل تفصیلی بین الانبیاء ممنوع ہے۔

آجکل ایک سیر نبویہ شائع ہوئی ہے جس کو تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت مقبولیت حاصل ہے لوگ شوق سے اس کو خریدتے ہیں، کیونکہ کاغذ چمکا اور لکھائی عمدہ ہے ظاہری ٹیپ ٹاپ بہت ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کا باطن ایسا ہی ہوگا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ کیسی نبی کی سیر ہے۔ کیونکہ کمالات نبوت سے اس میں بحث ہی نہیں۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مدبر بادشاہ کی سوانح عمری ہے۔ زیادہ تر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تدبیر سے انتظام کا ہی پہلو دکھلایا گیا ہے اور اگر کسی جگہ اتفاق سے آپ کے کمالات نبوت کا ذکر بھی ہے۔ تو غضب یہ کیا ہے کہ دوسرے انبیاء میں نقص نکالا گیا ہے۔ چنانچہ شروع ہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام کمالات کے جامع تھے۔ اور دیگر انبیاء علیہم السلام تمام کمالات کے جامع نہ تھے۔ کسی میں کوئی صفت تھی کوئی نہ تھی۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی بابت دعویٰ کیا ہے کہ وہ رحم خالی تھے۔ اور دلیل میں یہ واقعہ پیش کیا ہے۔ رَبِّ لَا تَذَرْنِي مَعَ الْكَافِرِينَ دَسَّارًا۔ اے رب اب زمین پر کسی بسنے والے کو نہ چھوڑیے سب کو تباہ کر دیجئے (جامع) یہ کتنی بڑی گستاخی ہے کہ نبی کو رحم سے خالی کہا جائے (انا للہ وانا الیہ راجعون) یہی دلیل تو اس کا جواب خود نص میں موجود ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی بددعا کی وجہ

نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کو سمجھایا غور کیجئے کہ سمجھانے کی بھی کوئی حد ہے۔ اتنی مدت تک ان اذیتوں پر صبر کرنا تھوڑی بات ہے ذرا کوئی کر کے تو دکھلائے۔ نو سو برس تو کیا نو ہی برس میں حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ تو نوح علیہ السلام کا یہ تھوڑا رحم ہے کہ اتنی مدت تک قوم کی بدحالی اور ایذا رسانی پر صبر کرتے رہے اور بددعا نہ فرمائی اس مدت کے بعد اگر وہ از خود بھی بددعا فرماتے تو اس کو بے رحمی نہیں کہہ سکتے تھے۔ چہ جائیکہ انہوں نے خود بددعا نہیں فرمائی۔ بلکہ جب ان کو وحی سے معلوم ہو گیا کہ اب ان میں کوئی ایمان نہ لائے گا اور ان کی تقدیر میں کفر ہی پر خاتمہ لکھا ہے۔ اس وقت بددعا فرمائی۔ بتلائیے جب ایک قوم کی اصلاح سے مایوسی ہو جائے

یہ سیر نبویہ نبلی نہانی نے سیر النبی کے نام سے تصنیف کی ہے ۱۲۔

تو اس وقت ان کا باقی رہنا بہتر ہے یا ہلاک ہو جانا؟ ظاہر ہے کہ ایسی قوم کی بقا میں کچھ فائدہ نہیں بلکہ اندیشہ فساد ہے کہ یہ دوسروں کو بھی غارت کریں گے۔ اس وقت ان پر بددعا کرنا بے رحمی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے حق میں رحم ہے چنانچہ نوح علیہ السلام نے اپنی بددعا میں اس بات کو ظاہر فرما دیا۔ إِنَّكَ أَنْ تَذَرَهُمْ يَصْلُوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا هُ خادند اگر آپ ان کو زندہ چھوڑ دیں تو یہ آپ کے دوسرے بندوں کو بھی گمراہ کر دیں گے اور کافر و فاجر کے سوا کسی کو بھی نہ جنیں گے۔ اور یہ بات نوح علیہ السلام نے اپنے قیاس سے نہیں فرمائی، بلکہ وحی سے ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ اب ان میں یا ان کی اولاد میں کوئی بھی ایماندار نہ ہوگا

وَارْحَمِ الْإِنْسَانَ إِنَّهُ يَخْلُقُ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ قَدَامِنْ فَلَا تَقْبَلُ لَهُمْ كَافِرًا يُفْعَلُ تَوْبَتَائِي اس حالت میں اگر نوح علیہ السلام ان کے لئے نہ فرماتے تو اس کا انجام کیا ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تمام دنیا کافروں سے بھری ہوئی تھی مسلمان بہت ہی معدودے چند تھے۔ اور کفار کے متعلق معلوم ہو چکا تھا کہ یہ نہ خود ایمان لائیں گے نہ ان کی اولاد میں کوئی مومن ہوگا اور مسلمانوں کی اولاد کے متعلق یہ یقین نہ تھا کہ یہ سب ایمان دار ہی ہوں گے بلکہ ان میں ایماندار اور کافر دونوں قسم کے لوگ ہونے والے تھے بلکہ مسلمانوں کی اولاد میں بھی غلبہ کفار ہی کو ہونی والا تھا۔ اب اگر اس زمانہ کے کافر غرق نہ کئے جاتے اور ان کی اولاد بھی اس وقت موجود ہوتی۔ تو مسلمان کو دنیا میں زندہ رہنا دشوار ہو جاتا (احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جتنے لوگ موجود ہیں وہ نوح علیہ السلام کے صرف تین بیٹوں کی اولاد ہیں۔ جب تین آدمیوں کی اولاد میں کفار کا اس قدر غلبہ ہے جو مشاہدہ میں آ رہا ہے تو دنیا بھر کے آدمیوں کی اولاد میں کفار کا کیا کچھ غلبہ نہ ہوتا۔ سب کافر ہی ہوتے۔ اس مقدمہ کے ملانے کے بعد تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی نوح علیہ السلام نے مسلمانوں کے حال پر بہت ہی رحم فرمایا جو اپنے زمانہ کے کافروں پر بددعا کی۔ ورنہ آج کفار کا وہ غلبہ ہوتا کہ مسلمانوں کو حقیقت نظر آجاتی اور ان کا جینا محال ہو جاتا غرض اس سیر کے مصنف نے صرف ایک پہلو کو دیکھا کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے واسطے ایسی سخت بددعا کی جو بے رحمی معلوم ہوتی ہے مگر اس نے دوسرے پہلو کو نہ دیکھا کہ ان کی یہ بددعا مسلمانوں کے حق میں خود جن میں یہ مصنف بھی داخل ہے۔ سراسر رحم تھی ورنہ میاں کو آج دنیا میں رہنا اور کفار سے جان بچانا دو بھر ہو جاتا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اعتراض۔ یہ اعتراض تو نوح علیہ السلام پر تھا

اس کے بعد لکھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن و سیاست کا مادہ نہ تھا۔ نہ معلوم اس کے پاس کونسی وحی آگئی تھی۔ یا اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا چہرہ دیکھ کر قیافہ سے پہچان لیا تھا کہ ان میں یہ مادہ ہے اور وہ مادہ نہیں۔ کچھ نہیں اس اعتراض کا منشاء صرف یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی میں سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں نہیں لیا تھا۔ اس سے ان حضرت نے یہ استنباط کر لیا کہ ان میں یہ مادہ ہی نہ تھا۔ حالانکہ عدم ظہور شئی ظہور عدم کو مستلزم نہیں بھلا اگر کسی شخص کو زندگی بھر روپیہ تقسیم کر نیکام موقع نہ ملے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں سخاوت کا مادہ نہیں ذرا اس کے ہاتھ میں روپیہ دیکر دیکھو اگر پھر بھی وہ سخاوت نہ کرے اس وقت تم کو اس بات کا حق ہے ورنہ دعویٰ بلا دلیل ہے اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اگر سلطنت کا موقع ہی نہ ملا تو اس سے ان کا تمدن و سیاست سے خالی ہونا کیسے لازم آگیا اور تم نے کیونکر سمجھ لیا کہ ان میں انتظامی قابلیت نہیں تھی یہ بات جب چل سکتی ہے کہ ان کو سلطنت کا موقع ملتا اور پھر انتظام نہ کر سکتے۔ پس اس شخص کا اعتراض تو نفو ہو گیا اب میں ثابت کرتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن و سیاست اور انتظامی قابلیت بدرجہ کمال موجود ہے گو اس جوہر سے ابھی تک کام نہیں لیا گیا اور اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کیف انتم اذا نزل فیکم عیسیٰ بن مریم عدلا لا مقتیادا و کما قالہ تمہارا کیا حال ہو گا اس وقت جبکہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام تمہارے اندر (آسمان سے) نازل ہو کر آویں گے عادل منصف ہو کر حکومت کریں گے تو حضور نے اس وقت سے مرتے فرمائی جبکہ عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں میں حکومت کریں گے اور آپ ان کے متعلق عدل و انصاف کی خبر دے رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ عدل و انصاف بدون قابلیت انتظام کے نہیں ہو سکتا۔ عدل وہی کر سکتا ہے جس میں سیاست کا مادہ بدرجہ کمال موجود ہو، نیز احادیث میں بھی یہی مذکور ہے کہ اس وقت بہت امن و امان اور خیر و برکت ہوگی جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نہایت عمدگی اور خوبی کے ساتھ سلطنت کا انتظام کریں گے اگر ان میں فی نفسہ یہ مادہ موجود نہیں تو اس وقت کیونکر سلطنت کا انتظام کر لیں گے پس معلوم ہوا کہ اس شخص نے نوح علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جامعیت پر جو اعتراض کیا ہے وہ نہایت لغو ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات ثابت کر نیکایہ کون سا طریقہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائیوں میں نقص نکالاجائے۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خوش ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یاد رکھو! انبیاء علیہم السلام کامل ہیں۔ ان میں ناقص کوئی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکمل ہیں۔ تفاضل

بین الانبیاء سے اسی واسطے منع کیا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بھائیوں کی تنقیص گوارا نہیں۔ الغرض انبیاء علیہم السلام کے مذاق باہم مختلف ہیں مگر کامل سب ہیں، اور ہر ایک کا مذاق خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے۔ (العبرة بذخ البقرة ص ۲۴)

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال بیان کرنے میں عتدال

سید نے غضب کیا ہے کہ عرب کی مذمت لکھتے ہوئے آپ کہتے ہیں کہ اس قوم میں کینہ بہت ہے حتیٰ کہ وہاں کے جانوروں میں بھی اس صفت کا غلبہ ہے۔ چنانچہ شتر کا کینہ مشہور ہے مولوی محمد علی صاحب نے سید کے تفسیر کے رد میں ایک کتاب ”البرہان“ بہت ہی عمدہ لکھی ہے بڑی قابلیت سے جواب دیا ہے۔ انہوں نے اعتراض کا بھی بڑا عمدہ جواب دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سبحان اللہ! اول تو جانوروں کے اخلاق سے انسانوں کے اخلاق پر استدلال کرنا عجیب طریقہ استدلال ہے۔ پھر ہم سید صاحب سے پوچھتے ہیں کہ شتر کینہ جو مشہور ہے یہ عرب کا محاورہ ہے یا فارس کا۔ ظاہر ہے کہ یہ عرب کا محاورہ نہیں فارس کا ہے تو اس سے بہت سے بہت یہ لازم آیا کہ فارس کے اونٹوں میں کینہ ہوتا ہوگا۔ عرب کے اونٹوں میں اس صفت کا ہونا کیسے لازم آیا۔ اور اگر مان لیا جاوے کہ عرب کے اونٹوں میں بھی یہ صفت ہے تو آپ نے اس کے ایک عیب کو تو دیکھ لیا۔ اس کی دوسری خوبیوں کو بھی تو بیان کیا ہوتا۔ ع

”عیب آن جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو“

اونٹ میں اگر ایک عیب کینہ کا ہے تو ہزار باتیں مدح کی ہیں۔ اس میں تحمل و جفا کشی بہت ہے۔ قناعت کا مادہ بہت ہے۔ عرب کے اونٹ مٹع و منقاد بہت ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے خود دیکھا ہے کہ جہاں کسی نے اونٹ پر سوار ہونے کے لئے اس کی گردن کو جھکایا وہ فوراً زمین پر رکھ دیتا ہے پھر سوار کے پاؤں رکھنے کے بعد آہستہ آہستہ اس طرح اٹھاتا ہے کہ سوار نہایت سہولت سے پشت تک پہنچ جاتا ہے۔ لوگ کثرت سے اس طرح چڑھتے اترتے ہیں، اونٹ کی لمبی گردن میرٹھی کا کام دیتی ہے تو اگر اس کے ایک عیب سے عرب کے ایک عیب پر استدلال کیا گیا ہے تو اس کی خوبیوں سے تو اس کی ان خوبیوں سے بھی تو اہل عرب

کی خوبیوں پر استدلال کیا ہوتا۔

عربی گھوڑے | پھر عرب میں جہاں اونٹ ہیں وہاں گھوڑے بھی تو ہیں۔ جن کی اصالت و نجابت و شرافت ضرب المثل ہے کہ وہاں کے گھوڑے مالک کیساتھ ایسے وفادار ہوتے ہیں جن کو سب جانتے ہیں دلڑائی میں جہاں عربی گھوڑا دیکھتا ہے کہ میرا مالک زخمی ہو کر گرا چاہتا ہے تو اس وقت دشمن پر حملہ کر کے اور مالک کے پاس سے لوگوں کو ہٹا کر میدان سے اس کو لے بھاگتا ہے) اگر یہی طریقہ استدلال ہے تو گھوڑوں کی ان صفات حمیدہ سے بھی تو اہل عرب کے کمالات پر استدلال کرنا چاہیے تھا۔ مگر کچھ نہیں۔ انجکل لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا ہے کہ اہل عرب کی جہالت و وحشت کو بہت ہی غلط اور بدناما بھدے عنوانوں سے بیان کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال ثابت کرتے ہیں کہ آپ نے ایسے جاہلوں کی اصلاح کی۔ ایسے وحشیوں کو متمدن بنایا۔ ان لوگوں کی نیت تو بہت اچھی ہے مگر نہایت بُرائے اول تو بات اتنی کہنی چاہیے جتنی اصلیت ہو۔ اہل عرب میں حضور ص کی اہل عرب کا حال | بعثت سے پہلے جہالت و وحشت ضرور تھی، مگر نہ اتنی جتنی یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔ پھر جتنی جہالت تھی اس کے ساتھ ان کے کمالات و صفات حمیدہ کو بھی تو بیان کرنا چاہیے جو ان میں زمانہ جہالت میں تھیں۔ اہل عرب میں ہمیشہ سے شجاعت کا جو ہر موجود تھا۔ زبان کے بڑے پکے تھے۔ جھوٹ بولنا جانتے ہی نہ تھے۔ مہمان نوازی اور سخی نمبر اول تھے۔ اور ایک بات تو ان میں ایسی تھی کہ جو دنیا کی کسی قوم میں بھی نہ تھی وہ یہ کہ جب دشمنوں کے ساتھ اپنے مقابلہ اور لڑائی کا ذکر کرتے ہیں تو دشمن کی شجاعت و بہادری کا دل کھول کر تذکرہ کرتے ہیں کہ وہ ایسے بہادر ایسے کریم دلیر تھے حتیٰ کہ کبھی مقابلہ میں پسپا ہوتا بھی ذکر کر دیتے ہیں غرض دشمنوں کی تعریف کرنا یہ اہل عرب کی خاص صفت ہے اس پہلو کو بھی بیان کرنا چاہیے تاکہ ناظرین و سامعین کو اہل عرب سے نفرت نہ پیدا ہو۔ ان کی نظروں میں یہ قوم ذلیل نہ ہو مسلمان کا دل اس بات کو کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اپنے نبی کی قوم کو لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار کرے اور اس طرح ان کا ذکر کرے جس سے قلوب میں ان سے نفرت پیدا ہو۔ جیسا سرسید نے کیا۔ اس لئے مولانا محمد علی کو غصہ آیا اور اس کا خوب جواب دیا۔ خدا ان کو جزا بخیر دے

(البسرة بذبح البقرة ص ۶۹)

۴۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج فرمانے کی حکمت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج مصالح کیوں نہ ہوتیں۔ عارفین نے بھی عجیب عجیب مصالح مزاج میں اختیار کی ہیں۔ حضور کے مزاج میں علاوہ اور مصالح کے ایک ادنیٰ مصلحت کم از کم یہ تو ضرور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود تبلیغ و اصلاح ہے جس میں ایک کام تو آپ کا ہے یعنی پہنچا دینا۔ اور ایک کام قابل کا ہے کہ وہ فیض لے، جس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے وہ ہیبت عطا فرمائی تھی، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے وہ ہیبت عطا فرمائی تھی۔ جس کی وجہ سے بڑے بڑے سلاطین دور دراز کی مسافت پر آپ کے رعب سے کانپتے تھے اور جو آپ کے سامنے آتا تھا اس کو از خود گفتگو کی ہمت نہ ہوتی تھی اور فیض لینے کے لئے مستفید کے دل کھلنے کی ضرورت ہے جب تک اس کا دل نہ کھل جائے اس وقت تک وہ فیض نہیں لے سکتا۔ پس یہ حال ہو جاتا ہے کہ سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجائے ہے۔ تھامتا ہوں دل کو پرہاتھوں سے نکلا جائے ہے۔ عاشق پر جب محبوب کی ہیبت کا غلبہ ہوتا ہے تو جو کچھ وہ سوچ رہتا ہے کہ یوں کہوں گا یہ پوچھوں گا۔ صورت دیکھتے ہی سب ذہن سے نکل جاتا ہے اور وقت پر کچھ بھی نہیں کہا جاتا۔

ہمارے ایک عزیز ناخواندہ کہتے ہیں کہ

یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آجاتا سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا۔

اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے گاہے گاہے مزاج فرمایا کرتے تھے تاکہ ان کا دل کھل جائے اور بے تکلف ہو کر استفادہ کر سکیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیبت تو بھلا کیسی کچھ ہوگی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلامان غلام کی یہ حالت تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ ایک جماعت کے ساتھ چلے جا رہے تھے کہ دفعہ پیچھے مڑ کر دیکھا تو سب مارے ہیبت کے گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ حالانکہ یہ وہ حضرات تھے جو حضرت عمر کے مرید نہ تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پیر تھے، جن میں گونہ سادات ہوا کرتی ہے مگر ان پر بھی آپ کا اس قدر رعب تھا۔

مگر شاید اس میں کوئی یہ شبہ نکالے کہ وہ حضرات تو معتقد تھے تو سننے کے غیر معتقدین پر۔ آپ کے رعب کی یہ شان تھی کہ ایک مرتبہ سفیر روم بڑی شان و شوکت کے ساتھ مدینہ میں آپ کی خدمت میں آیا اور شہر میں داخل ہو کر لوگوں سے دریافت کیا کہ خلیفہ کا قصر کہاں ہے۔

تامن اسپ درخت را آنجا کشم

گفت کو قصر خلیفہ اے چشم

قوم گفتند شش کہ اور اقصر نیست مگر اقصر جاں روش نیست۔

۱) اس واقعہ پر حضرت مولانا پر گریہ طاری ہو گیا مگر بہت ضبط سے کام لیا (لوگوں نے کہا کہ عمر کے لئے نہ قصر ہے نہ ایوان ہے بس اس کا دل ہی قصر ایوان ہے۔ قاصد کو بڑی حیرت ہوئی کہ وہ خلیفہ جس کے نام سے سلاطین کا بیٹے ہیں۔ اسکے نہ محل نہ قصر کیا معاملہ ہے پھر اس نے پوچھا کہ آخر وہ کہاں بیٹھا کرتے ہیں لوگوں نے کہا کہ مسجد میں اکثر بیٹھا کرتے ہیں اور کبھی بازاروں میں گلی کوچوں میں اور کبھی جنگل میدانوں میں گھومتے پھرتے ہیں تلاش کر لو کہیں مل جائیں گے۔ اب وہ آپ کی تلاش میں نکلا معلوم ہوا کہ ابھی جنگل کی طرف تشریف لے گئے۔ سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ عجیب بادشاہ ہے جو تنہا بازاروں جنگلوں میں پھرتا ہے نہ ساتھ میں پہرہ دار ہیں نہ پولیس۔ آخر وہ جنگل کی طرف چلا۔ جس وقت اس باغ کی حد میں قدم رکھا جہاں حضرت عمر پڑے سو رہے تھے قدم رکھتے ہی اسکے دل پر ہیبت و رعب نے غلبہ کیا کیونکہ جنگل میں ایک خدا کا شیر پڑا ہوا تھا اور قاعدہ ہے جہاں شیر پڑا ہوتا ہے اس جنگل میں قدم رکھتے ہی بڑے بڑے بہادروں کے دل کانپ جاتے ہیں۔ اب اس سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس شخص کے پاس نہ کوئی پہرہ چوکی ہے نہ جاہ و چشم ہے نہ ساز و سامان ہے پھر یہ کیا بات ہے کہ صورت دیکھنے سے پہلے ہی میرا دل ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے یہاں تک کہ جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک خدا کا شیر جنگل میں تنہا پڑا سو رہا ہے نہ اسے کسی دشمن کا خوف ہے نہ جاسوس کا ڈر۔ سر کے نیچے ایک اینٹ نیکہ کی بجائے رکھی ہے نہ کوئی فرش ہے نہ بستر، بس گلے میں ایک تلوار پڑی ہوئی ہے اور بے فکر سو رہے ہیں۔ اس حالت کا مقتضایہ تھا کہ سفیر کے دل میں خلیفہ کی بے وقعتی ہوئی۔ مگر یہاں بالکس معاملہ یہ ہوا کہ صورت دیکھتے ہی سفیر دم لرزے لگا۔ جو نہی نظر پڑی ہے پیراٹھانے کی ہمت نہ رہی۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اس وقت وہ سفیر اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ تو بڑے بڑے سلاطین کے دربار دیکھے ہیں جن کے دربار میں رعب و داب کے ہزار سامان ہوتے تھے۔ مگر مجھ پر کسی کا رعب طاری نہ ہوا۔ آج کیا بات ہے کہ اس بے سروسامان شخص کے رعب سے میرا پتہ پانی ہوا جاتا ہے۔ آخر اس شخص کے اندر کیا چیز ہے کہ میری رگ رگ میں اس کے دیکھنے سے لرزہ پیدا ہو گیا؟ بیشک ہے

ہیبت حق است این از خلق نیست ہیبت آن مرد صاحب دلق نیست

یہ خدا کی رعب و جلال تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چہرہ سے ظاہر ہو رہا تھا بالآخر سفیر روم کی ہمت نہ ہوئی کہ حضرت عمر کو خود جنگل سے وہ تو اپنی جگہ پر دیر تک کھڑا کا پتہ رہا۔ کچھ دیر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود ہی بیدار ہوئے تو دیکھا کہ اجنبی آدمی کھڑا کانپ رہا ہے آپ نے اس کو اپنے پاس بلایا اور تسلی دی، جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سفیروں کو مرعوب دیکھ کر فرمایا تھا کہ تم مجھ سے اتنا کیوں ڈرتے ہو میں تو اس غریب عورت کا بچہ ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی حضرت عمر کی باتیں سننے کے بعد ہیبت تبدیل بہ محبت ہو گئی۔ اور سفیر کو آگے بڑھنے اور بات چیت کرنے کی ہمت ہوئی جس کے بعد وہ سمجھ گیا کہ واقعی مذہب اسلام حق ہے۔ پھر وہ اسلام سے مشرف ہو گیا۔

یہ تو حضرات صحابہ کی حالت تھی۔ ہم نے اپنے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان کو ایسا رعب عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے لوگوں کو ان سے بات کرنا ہی ہمت نہ ہوتی تھی۔

حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کے رعب حضرت گنگوہی رضی اللہ عنہ کا دیدار و ہیبت کی یہ شان تھی کہ بڑے بڑے نواب مولانا سب سے تکلف باتیں نہ کر سکتے تھے۔ حضرت کا ان پر ایسا رعب پڑتا تھا کہ باتیں کرتے ہوئے رکتے اور جھجکتے اور ڈرتے تھے۔ اور خیر بعض بزرگوں سے تو لوگ اس لئے ڈرتے ہیں کہ وہ غصیا رہے ہوتے ہیں بات بات میں ان کو غصہ آجاتا ہے اسی لئے ان کے پاس جاتے ہوئے کانپتے ہیں۔ جیسے مولانا فضل الرحمن تھے۔ یا آجکل بھی ایک بدنام ہے (ہائے ہزار نام فدا سے تو بدنامی تو) (جسار)

مگر مولانا گنگوہیؒ میں تو غصہ کا نام بھی نہ تھا۔ میں نے کبھی مولانا کو غصہ فرماتے ہوئے نہیں دیکھا، مگر اس پر بھی مولانا کا اتنا رعب محض ہیبت حق کا اثر تھا۔ اور یہ ہیبت بعض اوقات طالبین کے لئے مانع فیض ہو جاتی ہے اس لئے حضرات انبیاء علیہم السلام و اولیائے کرام اپنے اصحاب سے گاہے مزاح کر لیتے ہیں تاکہ ان کا دل کھل جائے اور ہیبت و محبت کے مل جانے سے اعتدال پیدا ہو جائے۔

(الاسعاد والابعاد ص ۳)

۴۲۔ اس شبہ کا جواب کہ تقدیر کس طرح بدل سکتی ہے

حضرت مجدد صاحب قدس سرہ کا واقعہ ہے کہ آپ کے زمانے میں ایک بزرگ صاحب سلسلہ تھے جن سے بہت فیض جاری تھا مگر حضرت صاحب کو ان کی بابت مشکوف ہوا کہ اس کا خاتمہ شفاعت پر ہوگا۔ بس حضرت مجدد صاحب دیکھ کر تڑپ ہی تو گئے۔ آپ کے دل کے گوارانہ کیا کہ میرے رسول کی امت کا ایک شخص شفیق ہو کر مرے اور وہ شخص بھی کیسا جس سے ہزاروں کو دین کا فیض ہو رہا ہے۔ آپ نے اس لئے دعا کرنا چاہی۔ مگر ڈرے کہ اس میں حضرت حق کی مزاحمت نہ ہو کہ تقدیر مشکوف ہونے کے بعد اسکے خلاف کی دعا کرتا ہے مگر پھر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ یاد آیا کہ میں وہ شخص ہوں کہ حق تعالیٰ سے کہہ کر شفیق کو سید کر سکتا ہوں۔ اس پر مجدد صاحب کی بھی ہمت ہوئی۔ معلوم ہو گیا کہ ایسی دعا کرنا خلاف ادب نہیں۔ چنانچہ پھر تو آپ نے اس کے لئے بہت دعائیں کیں اور پوری کوشش کی کہ کسی طرح اس شخص کی شقاوت کو تبدیل بہ سعادت کر دیا جائے۔ حتیٰ کہ آپ کو مشکوف ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے اس کو سید کر دیا تب آپ کو چین آیا۔

تو دیکھئے! مجدد صاحب نے اس شخص کے حق میں درپردہ کتنا بڑا احسان فرمایا۔ مگر اس شخص کو خبر بھی نہ تھی۔ اسے کچھ معلوم بھی نہ تھا کہ میرے واسطے کسی شخص کے دل پر کیا گزر رہی ہے راتوں کی نیند اس کی اڑ گئی ہے۔

خیر واقعہ تو ہو گیا مگر اس پر شبہ ہوتا ہے کہ تقدیر کس طرح بدل گئی۔ جس کے متعلق ارشاد ہے مَا يَبْدُلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ حضرت مجدد نے اس کا جواب بھی خود ہی دیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض امور کے متعلق لوح محفوظ میں اطلاق ہوتا ہے اور واقعہ میں وہ کسی قید کے ساتھ مقید ہوتے ہیں مگر وہ قید لوح محفوظ میں مذکور نہیں ہوتی بلکہ وہ علم الہی میں ہوتی ہے تو اس شخص کے متعلق لوح محفوظ میں تو صرف اتنا ہی تھا کہ اس کا خاتمہ شقاوت پر ہوگا مگر علم الہی میں اس کے ساتھ ایک قید بھی یعنی بشرطیکہ کوئی مقبول بندہ اس کے لئے دعا نہ کرے۔ سو یہ واقعہ تقدیر کے خلاف نہیں ہوا کیونکہ اصل میں تقدیر علم الہی کا نام ہے۔ اسی لئے یہ حضرات ام الکتاب کی تفسیر علم الہی سے کرتے ہیں کیونکہ اس میں تغیر و تبدل کبھی نہیں ہو سکتا۔ پس دراصل ام الکتاب وہی ہے جو لوح محفوظ بھی کتاب المحو والاثبات کے اعتبار سے ام الکتاب ہے، کیونکہ لوح محفوظ

میں اتنا تغیر و تبدل نہیں ہوتا جتنا کتاب المحو والاثبات میں ہوتا ہے مگر فی الجملہ تغیر اس میں ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے اور جو تقدیر علم الہی کے درجے میں ہے اس میں اس کا اصلاً احتمال نہیں۔ پس حقیقت کے اعتبار سے ام الکتاب وہی ہے اور اس تفسیر کے اعتبار سے کلام نفسی کے درجے میں قرآن کے قدیم ہونے کی دلیل نص سے نکل سکتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَانْ فِيْ اَمْرِ الْكِتَابِ لَدَيْنَ الْعَلِيِّ حَكِيْمٍ۔ یعنی قرآن ہم سے غایت قرب کے درجہ میں علی حکیم ہے۔ یہ غایت قرب لدی کا مدلول ہے اور غایت ذات حق سے مرتبہ صفات کو ہے تو حاصل یہ ہوا کہ قرآن مجید درجہ صفت میں علی ہے حکیم ہے اور قرآن جو درجہ صفت ہے وہی کلام نفسی ہے اور اس لئے اس کو علی حکیم کہا گیا اور علی حکیم کا اطلاق قرآن مجید میں کسی حادث پر نہیں آیا تو لدینا اور علی دونوں کو دلالت اسکے صفت ہونے اور قدیم ہونے پر ہوتی۔ اور اس سے قبل جو ارشاد ہوا ہے۔ اِنَّا جَعَلْنَا قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا اِسْ مِیْن اِسْ کے فعل کا مفعول ہونا اور عربیت کے ساتھ موصوف ہونا قرینہ ہے کہ اس سے کلام لفظی کا درجہ مراد ہے تو دونوں آیتوں میں دونوں درجہ کا بیان نہایت وضاحت سے ہو گیا۔

(الاسعاد والابعاد)

۴۳۔ فلسفہ اور تعلیم انبیاء علیہم السلام میں فرق

ہمارا فلسفہ ایسا ہے کہ پڑھتے پڑھتے دماغ خراب کر لیا اور اخیر میں نتیجہ کیا؟ کچھ بھی نہیں۔ سوائے اس کے کہ اشرافین کی یہ رائے ہے۔

اور مشائین کی یہ رائے ہے۔ معلوم نہیں کون غلط ہے اور کون صحیح ہے۔ اور ہمارے علم یہ ہے کہ اول ہی دن ہم نے پڑھا کہ وضو میں اتنے فرض ہیں اور وضو کرنا شروع کر دیا۔ اسی وقت سے حاصل نکلنے لگا اور عمل پر ثواب کی امید ہوئی۔ اور ہمیں کیا ملا۔ کون سا ثواب مشائین اور اشرافین کی رائے پر ملنے کی امید ہے۔ بس یہی فرق ہے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں اور حکماء کی تعلیم میں فلسفہ تو آگے ہے منطق ہی میں دیکھئے کس قدر مباحثات اور مناظرات ہیں۔ ایک ذرا سی بات ہے وہ طے ہی نہیں ہوتی۔ خواہ مخواہ فضول جھگڑے بھر دیتے۔ اور اس پر نازاں ہیں کہ ہمارے علوم بڑے دقیق ہیں دقیق بیشک ہیں۔ مگر اس وقت کا حاصل کیا ہے؟ اگر کوئی بات مشکل سے حاصل ہو لیکن یہ امید ہو کہ اس کو حاصل کر کے کوئی نتیجہ معتمد بہ حاصل ہوگا تب بھی مضائقہ نہیں۔ لیکن یہاں حاصل کے نام صفر ہے۔ تمام عمر اس لوٹ پوٹ میں رہے کہ یہ ٹھیک ہے یا وہ ٹھیک ہے اور طے جب بھی نہ ہوا کہ کیا

ٹھیک ہے۔ اور اگر طے بھی ہو جائے کہ امر حق یہ ہے تب بھی اس کا حاصل کچھ نہیں صرف ایک بات کا علم ہو گیا۔ اس سے کام کون سا نکلا۔

دیکھئے معقول میں پہلے علم ہی کی بحث ہے اور اس میں اس قدر مناقشات ہیں کہ انکی

بحث ہے کہ علم کون سے مقولہ سے ہے یہ ذرا سی بات ہے مگر لوگوں نے اس میں کتابیں کی کتابیں سیاہ کر دی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ مقولہ انفعال سے ہے اور کوئی کہتا ہے اضافت سے ہے، کوئی مقولہ

کیف سے بتلاتا ہے۔ پھر سب طرف وہ جھتیں اور دلیلیں پیش کی گئی ہیں کہ الہی توبہ، دماغ پریشان ہو جاتا ہے، اور نتیجہ اس بحث کا کچھ بھی نہیں۔ اگر تحقیق ہو گیا، اور امر واقعی معلوم ہو گیا کہ علم فلاں مقولہ

سے ہے تو مگر علم کا تونہ بدلا۔ یعنی جو نتیجہ اس علم سے حاصل ہونے والا ہے وہ تو ہر حال میں ایک ہی ہے چاہے علم کسی مقولہ سے ہو۔ اور اگر تحقیق نہ ہو اور امر حق معلوم نہ ہو تب بھی مگر نہ بدلا۔ یعنی جو

نتیجہ اس علم سے ہونے والا ہے وہ اب بھی مرتب ہوگا بہت ظاہر بات ہے کہ ہم پلاؤ کھا دیں یا کوئی مچون کھا دیں تو اس کی لذت یا منفعت علم ترکیب پر موقوف نہیں اس ترکیب کا ہم کو علم ہو یا نہ ہو منفعت

پھر بھی حاصل ہوگی۔ لوگ ساری ساری عمر پلاؤ کھاتے ہیں باورچی پکاتا ہے اور کھاتے ہیں اس کی لذت اور منفعت جو اس پر مرتب ہے براہِ حاصل ہوتی ہے حالانکہ ترکیب کسی کو نہیں آتی بلکہ واقعہ

توبہ ہے کہ جس کو ترکیب آتی ہے یعنی باورچی وہ پلاؤ کے نتیجہ سے اکثر محروم رہتا ہے کیونکہ اسے پلاؤ کھانیکو نہیں ملتا۔ نتیجہ صاحب خانہ کو حاصل ہوتا ہے اور پکاتا وہ ہے جس کو دو کھانوں میں یوں کہنا

چاہیے کہ علم باورچی ہے اور مگر علم کا صاحب خانہ کو حاصل ہے عالم صاحب مگر سے محروم ہیں۔ اب فرمائیے کہ علم اچھا، یا مگر؟ یہی حال علوم حکماء کا اور علوم شرعی کا ہے کہ ان کے پاس صرف علوم ہی

میں اور انہوں نے ان کو منہائے نظر قرار دے رکھا ہے اور مگر حاصل ہے۔ شرعیات جاننے والوں کو انبیاء علیہم السلام نے تو غذا کی پکائی دی ہے اور حکماء نے پکانا سکھایا ہے مگر انہوں نے جس چیز کا پکانا سکھا ہے وہ کھانے کی ہے بھی نہیں محض سونگھنے کی ہے۔ دن بھر تو سر مارا جب چیز

تیار ہوتی تو معلوم ہوا کہ یہ تو کھانے کی نہیں ہے۔ سہ

اور یہ میں بالکل غلط نہیں کہتا ہوں کہ ان کی بتلائی ہوئی چیز کھانے کی نہیں ہے بلکہ یہ بالکل سچ بات ہے جن باتوں کو انہوں نے تمام عمر سر مار کے طے کیا وہ اخیر میں غلط ثابت ہوئیں۔

اب دیکھ لیجئے کہ وہ کارآمد ہیں یا نہیں۔ جب غلط ہیں تو کارآمد کیسی؟ تو یہ بات صحیح

۲۲۔ نو تعلیم یافتہ کو ظاہری اصلاح کے ساتھ باطن کی صفائی بھی ضروری ہے

آجکل دین کی طرف سے ایسی لاپرواہی ہے کہ خود تو دین کیا حاصل کرتے۔ اٹھان لوگوں پر ہنستے ہیں جو دین کا نام لیتے ہیں اور کس قدر دین سے بعد کی دلیل ہے۔ اور اگر کسی خیال دین کی طرف ہے

بھی تو ظاہری اصلاح کا نام دین رکھ لیتا ہے۔ نفلیں ذرا زیادہ پڑھ لیں۔ وضع قطع مسلمانوں کی سی بنائی۔ بس اس کا نام دین ہے ان کی نظر بھی اس سے آگے نہیں بڑھتی۔ جب اس سے آگے نظر

ہی نہیں پہنچتی تو ان امراض کا علاج اور اصلاح کیسے ہو جو ظاہر کے علاوہ ہیں اور خطرناک بھی ہیں تو اس خفا کی وجہ سے ان میں اور دشواری پیدا ہوگئی تو اب سمجھئے کہ یہ امر کس قدر

قابل توجہ ہوئے پس اس حدیث قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لا یتعجب الدعاء عن قلب میں انکی طرف توجہ دلائی گئی ہے ان تمام امراض کی

ایک اصل اور جڑ بیان کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل سے معلوم ہوگا کہ کس قدر قیمتی بات بیان فرمائی گئی ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ دین کے درجہ ہیں۔ ظاہری، باطنی۔ اب توجہ حالت ہے کہ باطن کے

نام سے بھی لوگ آشنا نہیں رہے۔ باطن کی جگہ بطن لے لیا ہے۔ بس پیٹ بھر لیا جائے جس طرح بھی ہو۔ حلال سے ہو یا حرام سے دھوکہ سے ہو یا اثرات نفس کے ساتھ ہو، بلا طبع خاطر ہو یا حیر سے ہو۔ جس طرح سے بھی مل جائے لقمہ حاصل کر لیا جاوے ہاں بیشک ظاہر کو بعض

نے درخواست کر لیا ہے اور بس۔

اور اس میں بھی دو فرق ہیں۔ ایک تسلیم یافتہ، اور ایک عوام، عوام تو اس بارے میں اقراری مجرم ہیں خود اپنے منہ سے کہتے ہیں کہ جی ہمارا کیا دین، الٹی سیدھی ٹکڑیاں مار لیتے ہیں۔ دل دنیا میں لگا ہوا ہے کسی وقت خدا کی یاد دل میں آتی ہی نہیں۔ خیر یہ بچارے اقرار تو کرتے ہیں اپنے قصور کا۔

دوسرا گروہ جو تعلیم یافتہ ہے ان پر زیادہ افسوس ہے کہ اپنے قصور کے بھی مقرر نہیں۔ انکو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ دین کا کوئی باطنی جزو بھی ہے۔ عوام کو اتنا خیال تو ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ دین رکھتے ہیں وہ محض ظاہری ہے اور باطن سے ہم محروم ہیں۔ اور تسلیم یافتہ لوگ محروم ہونے کا نام بھی اپنے اوپر آنے نہیں دیتے کیونکہ شان میں فرق آجائے گا انہوں نے باطنی جزو کو دین سے اڑا ہی دیا۔ بس ظاہر پر کفایت کر لی اور اسپر ناز کر بیٹھے اور سمجھ گئے کہ ہم پورے دیندار ہیں۔ اور پھر ظاہر میں سے بھی چھانٹ لیا ہے بعض اجزاء کو، گویا دین میں سے انتخاب در انتخاب کیا ہے اور اپنے نزدیک ضروری اجزاء نکال دیتے ہیں۔ اسکے یہ معنی ہیں کہ دوسرا جزو ان کو فوذا باشد فضول اور زائد ہیں اور وہ انتخاب کن اجزاء کا کیا ہے جن میں سہولت ہے یا جنگی عادت ہو گئی ہے جیسے نام مسلمانوں کا سار رکھ لینا۔ صورت مسلمانوں کی سی بنالینا۔ بس انہیں اجزاء کا نام دین سمجھ لیا ہے۔

صاحبو! دین کے اجزاء تو ہیں عقائد، اعمال، معاشرت

دین کے اجزاء | معاملات، اخلاق۔ ان سب کی تکمیل سے دین کی تکمیل ہوتی ہے اب یہ حالت ہے کہ ان اجزاء میں سے بعضوں کا تو نام سن کر بھی چونکتے ہیں۔ اور تعجب کرتے ہیں۔ بعض وقت زبان سے بھی کہتے ہیں کہ ان کو دین سے کیا تعلق۔ معاشرت بھی دین سکھلانے کی چیزیں ہیں۔ یہ تو آپس کے برتاؤ ہیں جو ملنے جلنے سے آدمی خود سیکھ جاتا ہے۔ اس میں بھی مولویوں نے پابندیاں لگا دی ہیں۔ علیٰ ہذا معاملات میں بھی ایسی باتیں کہی جاتی ہیں۔

عصر بعض اجزاء کو دین کا جزو ہی نہیں سمجھا جاتا۔ برے اعمال دیانات تک رہ گئے ہیں اور وہ اعمال بھی سب نہیں۔ ان میں سے بھی وہی لئے ہیں جن کی ایک رسم جلی آتی ہے اور جن کی بچپن سے عادت پڑ گئی ہے۔ چنانچہ بڑی دیانتداری ہے کہ نماز پڑھ لی، ڈاڑھی رکھ لی شرعی پاجامہ پہن لیا، گوشت کھالیا۔ صورت، شکل، وضع مسلمانوں کی سی بنالی، یہ ان لوگوں کا انتہائی کمال ہے جو اپنے آپ کو دیندار کہتے ہیں۔ اور جو اپنے آپ کو دیندار بھی نہیں کہتے ان کا تو

یہاں ذکر ہی نہیں۔

غرض دین کے اجزاء میں ایسا انتخاب کیا ہے کہ اب خلاصہ کا بھی گویا جو ہر نکل آیا اور دین نام رہ گیا گنتی کے صرف چند اعمال کا اور وہ بھی اس سے زیادہ نہیں کہ ظاہر کے چند شعبوں کو درست کر لیا۔ غرض اس انتخاب میں بھی جو راہ وہ ظاہر ہی رہ گیا اسکے سوار دوسری چیز یعنی باطن کا نام بھی نہیں آتا۔ بس اس ناتمام ظاہر کو بنا کر خوش ہیں کہ ہم دیندار ہیں۔ اس بیان ظاہر کو بگاڑنے والے خوش نہ ہوں کہ ہم تو دیکھتے باطن پرست ہیں۔ مسلمانوں میں اس خیال کے لوگ بھی بہت ہیں جو سمجھتے ہیں باطن کا درست ہونا کافی ہے ظاہر کے درست کر نیکی ضرورت نہیں۔ بلکہ ان کے نزدیک ظاہر کا درست کرنا باطن کے درست کرنے میں مغل ہے۔ لہذا ظاہر کو ایسا بگاڑتے ہیں کہ یہ بھی نہیں پہچان سکتا کہ یہ بھی مسلمان ہیں۔ وضع قطع بھی مسلمانوں کی سی نہیں رکھتے بلکہ نماز بھی نہیں پڑھتے۔ یوں کہتے ہیں کہ کسی کے سامنے نماز پڑھیں گے تو وہ ہمارا معتقد ہو جائے گا۔ اس سے ہمارے نفس کو خوشی ہوگی تو یہ نفس پروری ہوئی۔ اس قسم کی بہت سی خرافات من سمجھوتہ کرنے کے لئے گھڑی ہیں کہ ہمارا باطن درست ہے پھر ظاہر کی کیا ضرورت ہے۔ میرے ظاہر آرائی کی مذمت سے احتمال تھا کہ یہ تو گ خوش ہوتے۔ اس لئے کہتا ہوں کہ ان کو خوش نہیں ہونا چاہیے کیونکہ میں ظاہر کی درستی کی مذمت نہیں کرتا بلکہ اسپر اکتفا کرنے کی مذمت کرتا ہوں تاکہ وہ اصلاح باطن کی فکر کریں۔ محض اصلاح ظاہر پر قناعت نہ کریں باقی ظاہر کی درستی بھی فرض ہے اس لئے کسی کو یہ گنجائش نہیں کہ اصلاح ظاہر کو ترک کر دے گو با فرض باطن بھی درست ہو۔ اور ان بد دینوں کا تو باطن بھی درست نہیں بلکہ انہوں نے باطن اور ظاہر دونوں کو بگاڑ رکھا ہے، ظاہر کو تو بگاڑا ہی ہے باطن کو بھی بگاڑا ہے اور یہ اس دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہمارا باطن درست ہے۔ اس سے بہتر تھا کہ ظاہر تو درست ہوتا ایک ہی فرض ادا ہوتا اگر ان لوگوں کی طرف سے کہا جادے کہ ہم اس کو نہیں مانتے کہ

باطن کی اصلاح

ہمارا باطن بگڑا ہوا ہے، باطن ہمارا بالکل اچھا ہے ہم نے ظاہر کو باطن ہی کے درست کرنے کے لئے بگاڑا ہے اس سے باطن ہمارا بالکل اچھا ہے۔ پھر یہ کہنا کہاں صحیح ہو کہ انہوں نے باطن اور ظاہر کو دونوں کو بگاڑ رکھا ہے۔ میں بطور الزامی جواب کے کہتا ہوں کہ ایک شخص بادشاہ سے باغی ہے اور ہر حکم مخالفت کرتا ہے اور کسی بات میں اطاعت نہیں کرتا لیکن جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو کیوں کرتا ہے تو کہتا ہے کہ وہ میں دل سے بادشاہ کا بڑا خیر خواہ ہوں یہ جو کچھ مخالفت میں نے کر رکھی ہے صرف بغضب سے نہ کہنے کے لئے کر رکھی ہے تاکہ

میرے خلوص میں فرق نہ آوے۔ بتائیے آپ اس کو کیا کہیں گے۔ یہی کہیں جھوٹا بد معاش غلط کہتا ہے فرمائیے اس کی کیا وجہ ہے۔ جب ایک شخص اپنے ذمہ سے کہہ رہا ہے کہ میں دل سے مطیع ہوں اور خیر خواہ ہوں تو آپ اس کو جھوٹا کیوں کہتے ہیں اور اس کو باطنی کیوں سمجھتے ہو۔

اب میں تحقیقی جواب کے طور پر کہتا ہوں کہ اس کی وجہ سوا اسکے کیا ہے کہ ظاہر عنوان ہوتا ہے باطن کا۔ جب افعال افعال اسکے مخالف نہ ہیں تو اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا کہ باطن اس کا موافق اور مطیع ہے اور یہی کہا جائے گا کہ وہ واقع میں بھی مخالف اور باطنی ہے۔ اسی طرح سمجھ لیجئے کہ جب ایک شخص کا ظاہر خراب ہے تو یہ کیسے مانا جاسکتا ہے کہ اس کا باطن درست ہو اور ظاہر میں اس کا اثر نہ پیدا ہو۔ سمجھ لیجئے کہ یہ ناممکن ہے کہ قلب میں کسی کی اطاعت ہو اور بدو و اضطراب کے ظاہر اس کا مخالف ہو۔

یہ تقریر تو بطور جملہ معترضہ کے درمیان میں آگئی۔ اصل بیان یہ تھا کہ آجکل بہت سے دیندار ایسے ہیں۔ جنہوں نے صرف چند اعمال کی درستی کو دین سمجھ رکھا ہے۔ پھر اعمال سے مراد اعمال ظاہری لئے گئے ہیں وہ بھی بہت نہیں بلکہ معدودے چند، جیسے ڈاڑھی بڑھانی نماز پڑھ لی۔ وضع قطع درست کر لی اور سمجھ لیا کہ ہم لوہے دیندار ہو گئے۔

اس تقریر سے چونکہ یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ ظاہر کو بنانا کچھ اچھی چیز نہیں اور اس سے وہ لوگ خوش ہوتے جو ظاہر کو بگاڑتے ہیں۔ اس لئے انکی غلطی کو بیخ میں رفع کر دیا گیا۔ باقی اصل خطاب انہیں لوگوں کو ہے جو صرف ظاہر کے بنانے کو دین سمجھتے ہیں۔ اور جن کو اپنے مرض کی خبر نہیں۔ اور وہ مرض ہے بھی ایسا جس کی خبر ہونا دشوار بھی ہے اور جب خبر ہونا دشوار ہے تو اس کی اصلاح بھی دشوار ہے۔ خبر کے دشوار ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ظاہر کا بگاڑ تو محسوس ہوتا ہے لہذا خبر بھی آسانی سے ہوگی اور اصلاح بھی اس کی آسان۔ ذرا توجہ اور ارادہ کی ضرورت ہے بخلاف مرض باطن کے کہ اس کے مریض کو اس کی اطلاع تک بھی نہیں ہوتی پھر اصلاح کیسے ہو اور جب اس مرض کی مریض کو بھی خبر نہیں ہوتی تو دوسروں کو تو کیسے خبر ہوتی۔ کیونکہ وہ دوسروں کو نظر تو نہیں آتا۔ اور بدگمانی کی کسی کو تو اجازت تو اس حالت میں دوسرا اس مرض کو سمجھے تو کیسے سمجھے۔ لہذا یہ مرض نہایت دشوار ہوا۔ پس مریض خود علاج کرے تو کیسے کرے اور دوسرا آدمی علاج کرے تو کیسے کرے کیونکہ اطلاع مفقود اور وہی شرط علاج اور اگر کسی مریض کو اپنے اس مرض کی اطلاع ہوتی بھی ہے تو اس کے ساتھ ایک مرض اور بھی لگا ہوا ہے توجہ اور تاویل کا کہ اس کو کھینچ کھپاؤ مرض کی حد سے نکال لیں گے اور ناجائز کو

جائز بنالیں گے حالانکہ اگر ذرا بھی دین کا احساس قلب میں ہے تو اس تاویل سے ہرگز بشارت نہیں ہوگی۔ بلکہ قلب میں اسی کا اقرار رہے گا کہ یہ گناہ ہے پھر جرب خود ہی کو گناہ ہونیکا علم ہے تو اللہ تعالیٰ کو کیسے علم نہ ہوگا تو پھر اس توجہ اور تاویل سے کیا کام چلا، خدا کے سامنے تو گنہ گار ہی رہے ظاہر بنوں کی نظر میں سرخ رو ہو گئے تو کیا سہ

کہ گئے اللہ دروغی زنی
خلق را گیرم کہ بفریبی تمام
کار با خلق آری جملہ راست
کار با اور است باید داشتن

از برائے مسکہ دو غمی زنی
در غلط اندازی تاہم خاص و عام
با خدا تزدیر و حیلہ کے رواست
راست اخلاص و صدق افزاشتن

ظاہر کے بنانے سے دنیا تو دھوکہ میں اس واسطے آگئی کہ ان کی نظر صرف ظاہر تک ہے مگر باطن کو بگاڑ کر دھوکہ کیسے دے سکتے ہیں جبکہ ان کی نظر باطن تک بھی پہنچتی ہے۔ دنیا کی نظروں کے سامنے تاویل کر کے سرخ رو ہو گئے تو کیا ہوا، تاویل سے اصل واقعہ تھوڑا ہی بدل جاتا ہے۔ حق تعالیٰ کو تو اصل واقعہ کا علم ہے۔

اور تاویل میں ایک بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اس چیز کی برائی پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ اصل گناہ تو مرض تھا ہی، یہ تاویل کا مرض اس سے بھی سخت ہے کیونکہ یہ نہ ہو تو گناہ ایسی چیز ہے کہ اس سے طبائع سلیمہ نفرت ہی کرتی ہیں تو امید ہو سکتی ہے کہ کبھی اس سے تنہ ضرور ہو جائے گا اور جب تاویل درمیان میں آگئی تو گناہ کی برائی پر پردہ پڑ گیا اب تنہ ہو تو کیونکر ہو۔ اس حالت میں دوسرا آدمی تو اس وجہ سے تنبیہ نہیں کر سکتا کہ وہ ظاہر کو درست پالتا ہے کوئی برائی اسکی نظر میں نہیں آتی اور خود تنبیہ اس واسطے نہیں رہا کہ مرض پر تاویل کا پردہ پڑ گیا۔ تنبیہ اور تنبیہ سب اڑ گئے اب اصلاح کی کیا امید ہو۔ دیکھئے کس قدر دشواری ہے باطن کی اصلاح میں۔

بعض وقت یہ ظاہر کو بنانے والے ایک اور طرح فیصلہ کرتے ہیں کہ اسمیں تاویل کی ضرورت نہیں۔ اور نفس کا مطلب حاصل رہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے عیوب کو بھی جانتے ہیں اور ان میں کچھ تاویل بھی نہیں کرتے۔ اس لئے اس بات کو مانتے ہیں کہ ہمارے اندر یہ عیب ہیں لیکن ساتھ ساتھ اپنے کمالات کو بھی یاد کرتے ہیں کہ فلاں فلاں کمال بھی تو ہم میں موجود ہیں۔ علم ہے عمل ہے۔ نماز ہے۔ روزہ ہے۔ جب اتنے کمال موجود ہیں تو وہ عیوب بھی صحیح، فیصلہ غلبہ

سے ہوتا ہے اور بھلائی زیادہ ہے اور برائی کم تو بھلائی ہی حکم ہوگا۔ اس صورت میں کسی تاویل کی ضرورت بھی نہیں رہی اور اچھے بن گئے اور سب بات قاعدہ کے اندر رہی، یہ فیصلہ ذہن کا سب سے بڑا کمال رہا اس سے بات بھی وہی رہی اور دل کو اچھی طرح سمجھالیا کہ ہم اچھے ہیں یہ ایسی مدلل تقریر ہے کہ اس کا جواب دینا بھی مشکل ہے۔

اے صاحبو! دل کو سمجھانا جب کافی ہے کہ ہمارا دل قیامت کے روز فیصلہ کنندہ قرار پاوے مگر قیامت میں تو فیصلہ دوسرے کے ساتھ میں ہوگا۔ اور وہ حقائق کے موافق فیصلہ کرے گا اور اس روز دل کو سمجھالینے سے کچھ کام نہ چلے گا اور حقائق کے ظہور کے وقت ممکن ہے کہ آپ کا غالب تو مغلوب ہو اور مغلوب غالب ہو۔

دوسرے میں کہتا ہوں کہ آدمی کو ضرورت تو اصلاح کی ہے اور عیبوں کے دور کرنے کی جو اس کے اندر ہے۔

تو کیا اس دل کو سمجھالینے سے ان عیبوں کی اصلاح ہوگئی؟ ہرگز نہیں بلکہ جیسے تاویل سے ان عیبوں پر پردہ پڑ گیا تھا اسی طرح اس فیصلے سے بھی پردہ پڑ گیا، تاویل بھی ایک مرض تھا یہ بھی ایک مرض ہے۔ وہ ایک قسم کا پردہ وہ دوسری قسم کا پردہ ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ بھی ایک قسم کی تاویل ہے۔ اس میں اور اس میں اتنا فرق ہے کہ اس میں تاویل کا حاصل یہ تھا کہ گناہ کو گناہ تسلیم نہ کیا تھا اس وجہ سے نفس پر دھبہ نہ آیا۔ اس تاویل میں اس سے بھی بڑھ کر کمال ہے کہ گناہ کو گناہ رکھا اور نفس پر دھبہ اب بھی نہ آیا۔ خیال کیجئے کہ یہ کس قدر گہری تاویل ہے بہر حال اتنی لمبی تقریر سے یہ بات ذہن میں آگئی ہوگی

باطنی بیماری کا علاج

اتنے موانع موجود ہیں۔ اور پردوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں، جب اس کی اطلاع دشوار ہے تو ظاہر ہے کہ علاج بھی دشوار ہے کیونکہ مرض کا علاج تو جب ہی ہو سکتا ہے جب مرض کی خبر ہو، اور جب خبر ہی نہیں تو علاج کیسا۔ اس دشواری کو دیکھ کر بعض لوگوں نے ہمت ہار دی کہ کون علاج کرے اگر ہمارے اندر امراض ہیں تو بلا سے۔ اشرمیاں بڑے کریم ہیں ہم گنہ گار سہی اشرمیاں معاف کر نیوالے ہیں۔ پھر کمبختی میں پڑے کہ اصلاح کرنے والے کو تلاش کرو۔ اس کے خزانے اٹھاؤ ہر وقت اسی ادھیر بن میں رہو۔ اچھی خاصی مصیبت ہے۔ جب اشرمیاں جیم و کریم ہیں تو کیا ضرورت ہے اس مصیبت کو اٹھانے کی، وہ اپنی رحمت سے خود

ہی سب کام بنادیں گے۔

یہ ان لوگوں کے خیالات ہیں جو دیندار بننا چاہتے ہیں۔ اور کوئی کام خلاف شرع کرنا نہیں چاہتے۔ ان کے ذہن میں نماز کی بھی ضرورت ہے، روزے کی بھی ضرورت ہے ڈاڑھی کی بھی ضرورت ہے۔ مگر قلب کی طرف کبھی ان کو توجہ نہیں ہوتی کہ اس کے بھی کسی مرض کے اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں۔

پس سن لیجئے کہ قلب میں بھی کچھ امراض ہیں اور ان کے دور کرنے کی بھی ویسی ہی ضرورت ہے جیسے ظاہر کے سنوارنے کی ضرورت ہے جیسا کہ میں نے طویل تقریر سے ثابت کر دیا۔ (جہاں ص ۲۲ تا ۳۱)

۴۵۔ ظاہر و باطن دونوں کی صلاح ضروری ہے۔

ان نے تعلیم یافتہ اصحاب کے خیالات بھی نہ کیے ہیں۔ انہوں نے دین کا خلاصہ ایک نئے طریقے سے کیا ہے۔ یہ دعویٰ تو ان میں اور فقرا میں دونوں میں مشترک ہے کہ دین کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ اور مقصود اعظم باطن ہے۔ ظاہر کی چنداں ضرورت نہیں اور آگے اس بات میں دونوں متماثل ہیں کہ وہ باطن کیا ہے کہ فقرائے توہم عمل کا باطن الگ نکالا ہے۔ نماز کا الگ روزہ کا الگ اور حج و زکوٰۃ کا الگ جیسا کہ بیان کیا گیا۔ اور ان امرائے اس سے بھی زیادہ اختصار کیا ہے۔ گویا اس کی صنعت بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ انہوں نے ست کا بھی ست نکالا۔ یہ مولویوں اور فقرا کو سب کو فضول سمجھتے ہیں۔ انہوں نے کل دین کا خلاصہ ایک ہی چیز کو نکالی ہے وہ کیا ہے؟ تہذیب، اخلاق، بس تمام اعمال تو دین کے لئے ظاہر ہیں اور باطن دین کا اور حقیقت اس کی تہذیب، اخلاق ہے۔ اور کھلے الفاظ میں کہتے ہیں کہ اٹھک بیٹھک اور مال کا خرچ کرنا اور پیٹ کا ٹٹا جس جس عمل کو عبادت کہا جاتا ہے وہ سب بانی اسلام علیہ السلام نے صرف اس واسطے تجویز فرمائی تھیں کہ تہذیب اخلاق حاصل ہو بلکہ عرب و قسطنطنیہ اور وہاں بہمیت بہت زیادہ تھی ان کی

اصلاح بلا اس سخت گیری کے ہو نہیں سکتی تھی اس واسطے یہ احکام تجویز کئے گئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ریفارمر تھے۔ انکی اصلاح کے لئے ایسی صحیح تدبیریں تجویز فرمائیں کہ ان سے بہتر ہو ہی نہیں سکتی تھیں اور ہم کو وہ بات بدون نماز روزہ کے حاصل ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اصلی تھا یعنی تہذیب اخلاق۔ کیونکہ ہم تعلیم یافتہ ہیں اور بہمت عرب کی سی ہم میں نہیں ہے تو واسطے اس سخت گیری کی کیا ضرورت ہے اور یہ بڑی نادانی ہے کہ تشکیم کی اصل غرض کو نہ سمجھا جاوے اور صرف الفاظ پر رہا جاوے۔ جیسا کہ خشک مولوی کر رہے ہیں۔ کیوں صاحب کیا دلیل ہے اس بات کی کہ تمام احکام سے مقصود اصلی خطرہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا صرف تہذیب اخلاق ہے۔ کوئی دلیل اس پر ہونی چاہئے۔ اور میں دور کی بات کہے دیتا ہوں کہ اول تو دلائل عقلیہ سے اس کا احتمال بھی منہی ہے لیکن بفرق محال اگر اس کا احتمال بھی ہو کہ شاید یہی مقصود ہو تو صرف احتمال پر اس دعوے کی بناء ہوئی دلیل پر تو بناء نہ ہوئی تو کیوں صاحب ایک دین ہی آپ کے نزدیک ایک ایسی چیز ہے کہ جس میں اپنے مطلب کے لئے احتمال ہی پر بناء کر کے اس سے تسلی کر لی جاتی ہے کبھی دنیا کے کبھی کسی کام کی بناء آپ کوئی عقلمند صرف احتمال پر کیا کرتا ہے۔ مثلاً ایک بہت بڑا مہاجن ہو۔ جس کے یہاں بہت دولت ہو وہ مر جاوے تو آپ اسکے یہاں جا کر کہیں کہ اسمیں سے مجھے بھی حصہ ملنا چاہیے کیونکہ میں اس کا بیٹا ہوں اور کوئی کہے تم یہ کیسے ہو تو جواب دیجئے کہ احتمال تو ہے کہ میں اس کا بیٹا ہوں اور جب میں دعویٰ کرتا ہوں کہ میں بیٹا ہوں، لہذا میراث ملنی چاہیے۔ کیوں صاحب جو ایسا یہ بات چل جاوے گی اور کیا اس کو سن کر کوئی پاگل نہ کہے گا؟ یا مثلاً جو آپ کا بیٹا ہے اس کو آپ میراث سے محروم کرنا چاہتے ہیں اس طرح کہ گو اس کا بیٹا کہا جاتا ہے مگر احتمال تو ہے کہ بیٹا نہ ہو لہذا اسی شق کو ترجیح دی جاتی ہے کہ بیٹا نہیں ہے اور میراث سے محروم ہونا چاہیے تو کیا یہ بات مان لی جاوے گی؟

حین سے بے عذبتی | صاحبو! تعجب ہے کہ دنیا کے تو کسی معمولی کام کی بناء بھی جرات کرتے ہیں۔ اور تغیر کر ڈالتے ہیں۔ دنیا میں تو یہ حالت ہے کہ احتمال کے موقع پر ہمیشہ احتیاط کا پہلو اختیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی دوا میں شک ہو جائے کہ یہ دوا فلاحی ہے یا کوئی تیزاب ہے تو اس کو کوئی بھی نہیں لے گا۔ بلکہ اسی کو پسند کریں گے کہ اس کو تلف کر دیا جائے گو کتنی ہی لاگت اس میں ضائع ہوتی ہو اور اس کو مکان میں رکھنا گوارا نہ کریں گے

اسی احتمال کی وجہ سے کہ کوئی پی نہ جاوے اور نقصان ہو جائے۔ یا اللہ! دین ہی کیا ایسی سستی اور بیکار چیز ہے کہ اسے بالکل سر پر اسے اڑا دینے کے لئے صرف احتمال کافی ہے۔ تمام ارکان دین بدل ڈالا صرف اس احتمال پر کہ شاید مقصود ان سب سے تہذیب اخلاق ہو اور لطف یہ ہے کہ یہ احتمال بھی مروج بلکہ غلط اور اپنا تراشا ہوا اور زبردستی کا احتمال ہے کیونکہ احتمال تو وہاں ہو سکتا ہے جہاں تشکیم کی طرف سے کوئی بیان نہ ہو۔ یہاں تو صاحب شرع کی طرف سے صاف صاف بیان موجود ہیں۔ ہر عبادت کی کیفیت اور اس کے کرنے کی ضرورت اور اس پر ثواب اور ترک پر وعیدیں بیان فرمائی ہیں۔ پھر یہ احتمال بھی کہاں رہا کہ شاید مقصود تہذیب اخلاق ہی ہو، یہ تو کھلی ہوئی توجیہ القول بالایضیٰ بقائلہ ہے اور یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے ایک نوکر سے کہیں کہ انکو لے آؤ اور وہ آٹا لے آوے اور کہے کہ مقصود تو کھانے سے تغذیہ بدن ہوتا ہے اور وہ انکو میں اتنا نہیں ہے جتنا آٹے میں ہے۔ کیا یہ حرکت اسکی نافرمانی نہیں ہے۔ حالانکہ وہ ایک معقول دجہ بیان کرتا ہے مگر جواب یہ اس کے یہی کہا جاوے گا کہ تو اپنی طرف سے غرض اور مقصود کو تراشنے والا کون ہے۔ کیا دلیل ہے اس بات کی کہ اس وقت ہم کو مقصود تغذیہ بدن ہے ممکن ہے کہ تفکہ مقصود ہو جس کے لئے انکو موصوع ہے نہ آٹا خصوصاً جب یہ صورت ہو کہ تغذیہ مقصود نہیں۔ مثلاً کھانے کا وقت نہ ہو یا ابھی کھانا کھا چکے ہوں یا گھر میں کوئی بیمار موجود ہو جس کو طبیعتے انکو کھانے کے لئے کہا ہو تو اس کا آٹا لے آنا اور زیادہ سخت بیوقوفی اور بدتمیزی۔ بلکہ گستاخی اور لعنت سمجھا جاوے گا۔ حالانکہ اس قرینے کے ہوتے ہوئے وہ احتمال باقی ضرور رہتا ہے۔ لیکن ایسے نوکر کو کان پکڑ کر نکال دیا جاوے گا۔

بس یہی قصہ دین کا سمجھو کہ جب دین میں قرآن اس بات کے موجود ہیں کہ خود اعمال بھی مقصود ہیں تو اپنی طرف سے ایک احتمال نکال کر ان کو بدلنا کیسے جائز ہوگا۔ اور یہ قرآن اگر معمولی بھی ہوتے تب بھی اس اختراع کی گنجائش نہ تھی یہ جائے کہ تصریحات قوی موجود ہیں اس وقت میں تو اس اختراع کی مثال بالکل یہ ہوگی کہ نوکر سے کہیں انکو لے آ، اور جواب میں کہے۔ جی ہاں میں سمجھ گیا۔ آپ کا یہ مطلب ہے کہ انکو لانا بلکہ آٹا لانا۔

دین کی اہمیت | اے اللہ! عقلیں کہاں چلی گئیں یا عقل اس واسطے ہے کہ دنیا کے کام بنائے جائیں۔ اور دین کا نام آتے ہی اس کو بالائے طاق رکھ دیا جائے اور دین کے کاموں کو جان جان کر بگاڑا جاوے دنیا کے کاموں میں تو ذرا سا احتمال جو غیر ناسی عن دلیل بھی ہو پیدا ہو جاوے تو احتیاط کا پہلو اختیار کیا جاوے۔ اور دین کے

کاموں میں ایک غلط احتمال اپنی طرف سے تراش کر اس پر عمل کر لیا جاوے اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ دین کو صرف ایک غیر مزدوری چیز سمجھ لے جس کا مقتضایہ ہے کہ یوں کر لیا تو کیا اور یوں کر لیا تو کیا۔ اگر ذرا بھی وقعت دین کی قلب میں نہ ہوتی اور اسکی کچھ بھی ضرورت سمجھی جاتی اور درجہ دوم میں بھی یہ بات ہوتی کہ قیامت آنے والی ہے اور باز پرس ہوگی اور وہاں ایسی ایسی ہولناک تکلیفیں اور عذاب ہیں تو اول تو یہ احتمال پیدا ہی نہ ہوتا اور پیدا بھی ہوتا تو پہلو احتیاط ہی کا اختیار کیا جاتا اور یوں کرتے کہ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ اعمال کا یہ خاص باطن (یعنی تہذیب الاخلاق) مقصود ہو (گویہ ان کا خود تراشیدہ ہے) مگر بہتر یہی ہے کہ احتیاط کا پہلو اختیار کیا جاوے اور ظاہر کو بھی ترک نہ کیا جاوے۔ کیونکہ اگر وہ احتمال غلط نکلا تو قیامت میں کیا جواب ہوگا (دیکھئے مال گذاری داخل کرنے کو تحصیل میں جاتے ہیں اور فرض کیجئے کہ بیس روپے مال گذاری کے داخل کرنے میں لیکن اگر شک پڑ گیا کہ کچھ نہ پائی۔ اس رقم کے اوپر اور ابھی ہیں تو اس صورت میں چپ میں پچیس روپے ہی ڈال کر چلیں گے اس خیال سے کہ کچھ تو کسر مال گذاری میں ہے جس کی مقدار معلوم نہیں شاید کوئی روپیہ ٹھوٹا بتا دیا جائے یا غلہ دان کی کوئی حق پڑ جائے تو احتیاط یہی ہے کہ پانچ روپے زائد لے چلیں۔ اگر خرچ نہ ہوئے تو واپس آجا دیں گے۔ اور اگر نہ لے چلے اور وہاں کی پڑ گئی تو ذرا سی بات کے لئے آبرو پر بن جاوے گی۔ ایسے موقعوں پر دنیا میں بیوقوف سے بیوقوف بھی احتیاط ہی کا پہلو اختیار کرتا ہے پھر تعجب ہے کہ دین میں وہ لوگ جو اہل عقل ہونے کے اور تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے کے مدعی ہیں احتیاط کا پہلو اختیار نہیں کرتے بلکہ ایک من گھڑت احتمال قطعی حکم کر دیتے ہیں اور ایسے بے فکر ہو جاتے ہیں کہ دوسری جانب کا (جو درحقیقت راجح اور یقینی ہے اور اس کے مقابلہ میں یہ محتمل بجانب مرجوح بلکہ غلط ہے) ان کو احتمال ہی نہ ہوتا۔ اسکی وجہ صرف دین کا غیر مزدوری سمجھنا ہے۔ بس اس کا آخری جواب ہمارے پاس یہی ہے کہ آنکھیں محض پر معلوم ہو جاوے گا کہ کس دھوکہ میں رہے اور اس وقت کا تدارک کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔

غرض اس امر کے فرق نے بھی دین کا ایک ست نکالا اور یہ امر **امراء کاحال** است اس ست سے بڑھا ہوا ہے جو فقار نے نکالا تھا۔ کیونکہ فقار نے جو ست نکالا ہے وہ ایک دین کی چیز تو ہے اور انہوں نے ست بھی دنیا ہی کی ایک منفعت نکالی ہے پس رہ ست نکالا اور یہ روح ہے آجکل ہر چیز کی روح نکالی گئی ہے۔ گلاب کی روح الگ ہے چیلی کی روح الگ ہے۔ انہوں نے یہ روح نکالی ہے۔ (روح کیا نکالی کہ دین کی روح ہی نکال دی) تمام دین کی روح ایک ذرا سی نکالی جس کا نام تہذیب اخلاق رکھا ہے۔ اس کو

اور وہ بھی اپنے ہی نزدیک حاصل کر لیا ہے۔ بس کسی عمل کی ضرورت نہیں اگر کوئی کیا بھی تو دنیا کے فائدے کے لئے۔ مثلاً نماز پڑھی تو اس فائدے کی بنا پر کہ ان حرکات سے جسم کی ریاضت ہو جاتی ہے اس واسطے کبھی اٹھک بٹھک کر لیتے ہیں اور کبھی اور طرح کی ریاضت ہو گئی مثلاً گھوڑے کی سواری کر لی یا کرکٹ اور فٹ بال کھیل لیا تو اب ریاضت کی ضرورت نہیں رہی، بس نماز خذت، یا ایک نماز کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے واسطے وضو کیا جاتا ہے جس سے صفائی ستھرائی ہو جاتی ہے اور صفائی اچھی چیز ہے اور تہذیب میں داخل ہے۔ اور اگر صبح اٹھ کر غسل کیا یا صابن سے منہ ہاتھ دھو لیا ہے اور بنجلہ اور کوٹھیلوں میں رہتے ہیں گرد و غبار کا وہاں داخل نہیں، تو اس صورت میں نماز کے واسطے وضو کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ ایک صاحب ایسا ہی کرتے تھے کہ بے وضو نماز پڑھ لیتے تھے اور اگر کسی نے کہا کہ بے وضو نماز نہیں ہوتی تو کہتے یہ دقیانوسی مولویوں کے خیالات ہیں لوگ غور نہیں کرتے اور دین کی تہمت تک نہیں پہنچتے۔ عرب میں جب اسلام شروع ہوا تو افلاس بہت تھا۔ لوگ محنت مزدوری سے پیٹ بھرتے تھے۔ اور میلے کچیلے رہتے تھے اس واسطے اس وقت کے لئے بانی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ قید لگادی تھی کہ جب نماز پڑھو تو منہ ہاتھ دھو لیا کرو۔ اب وہ زمانہ رہ نہیں گیا ہے اب مال کی افراط ہے۔ محنت مزدوری کی ضرورت نہیں۔ ہم آئینہ اور بنگلوں میں رہتے ہیں۔ روز صبح کو صابن مل کر غسل کرتے ہیں۔ گرد و غبار کا یہاں تک گذر نہیں۔ بتاؤ ہمارے بدن پر کیا لگ رہا ہے۔ جس کے واسطے بار بار دھوئیں (کوئی پوچھے کہ ہر روز صبح کو کیا لگ جاتا ہے جس کے واسطے روز روز نہلتے ہو، مگر یہ کام تو اس استاد نے بتایا ہے جس کے حکم میں چون و چرا کی گنجائش نہیں یعنی فیشن نے) خود یہ بات بھی نہایت تعجب خیز ہے کہ عرب عموماً میلے کچیلے رہتے تھے یہ تاریخی بات ہے کہ ان کے یہاں تاریخ کو بڑا دخل ہے اور اسپر بڑی ایمان لاتے ہیں۔ تاریخ میں یہ مل گیا کہ عرب میں افلاس تھا۔ آگے عموماً اپنی رائے سے تجویز کر لیا کیا تاریخ میں کہیں یہ بھی ہے کہ اہل عرب سب ایسے ہی غریب اور مفلس تھے۔ کیا ان میں متعمر اور صاحب ثروت نہ تھے۔ عرب میں وہ لوگ بھی تھے جن کے یہاں سو سو غلام تھے تو اگر وضو کی بنا غریب اور مفلسی پر تھی تو ان لوگوں کو مستثنیٰ کر دیا جاتا اور صرف غریبوں کے لئے وضو کا حکم ہوتا۔

نیز صحابہ کے حالات ابتداء میں بے شک ایسے تھے مگر پھر حق تعالیٰ نے فتوحات دیئے اور والی ملک ہوئے اور یہ حالت تھی کہ بدن پر بجائے عطر کے مشک ملا کرتے تھے۔ مگر کیا تاریخ میں کہیں ہے کہ انہوں نے وضو کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بس زمانہ آزادی کا ہے جو چاہو کہو۔ جو چاہو کہو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ چنانچہ وہ صاحب پانچوں وقت نماز بے وضو اڑاتے تھے ایک صاحب نے اور زیادہ ترقی کی کہ نماز بھی نادر کر دی۔ کیونکہ مقصود بدون اسکے حاصل تھا۔ یعنی ریاضت جیسے

گھوڑے کی سواری وغیرہ۔

ایک اور صاحب کا قصہ ہے کہ وہ ایک جگہ مدعو تھے اور بڑے معزز شخص تھے۔ ان کے ساتھ اور بہت سے اشخاص بھی مدعو تھے گویا تمام جہات انھیں کی وجہ سے مدعو تھا اور سالار قافلہ بھی یہی تھے نماز کا وقت ہوا تو سب لوگ اٹھے مگر یہ نہ اٹھے۔ کسی نے کہا آپ بھی نماز کو چلیں تو کہیں نماز کو نوسمجھتا ہوں۔ لوگوں نے کہا نماز تو اسلام کی چیز ہے۔ آپ ایسا کیوں کہتے ہیں تو آپ جواب میں (توبہ توبہ) کیا کہتے ہیں کہ میں اسلام ہی کو نوسمجھتا ہوں۔

صاحبو! یہ نوبت ہے ان لوگوں کی جو سربراہ اور وہ کہلاتے ہیں اور جن کی عزت کو لوگ اسلام کی عزت سمجھتے ہیں۔ اس پر اگر کوئی مولوی کچھ کہے تو کہا جاتا ہے کہ مولویوں کو تو بس فتویٰ لگانا آتا ہے مسلمانوں کے کسی ایک فرد کو تو مشکل سے ترقی ہوتی ہے اس کے یہ لوگ پیچھے پڑ جاتے ہیں بس ترقی قوی دیکھ ہی نہیں سکتے۔

صاحبو! یہ کیا اسلامی ترقی ہے۔ اب سنئے کہ اس شخص کے لئے اہل جلسہ میں سے بعض لوگوں نے تجویز کیا کہ اس شخص نے ایسا یہودہ کلمہ بجا ہے اس واسطے اسے بائیکاٹ کرنا چاہیے اور اس سے قطع تعلق کر دینا چاہیے۔ تو دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ ہم کیوں اختلاف ڈالیں۔ اس نے انبیاء کی شان میں گستاخی کی ہے۔ انبیاء اپنٹ لیں گے۔ سبحان اللہ! یہ صاحب صلح کل ہونگے مگر کیا یہ صلح کل ہے۔ دارالسلطنت کے باغی سے دوستی کر کے تو دیکھو۔ دیکھیں صلح کل کے مذاق کو کیسا بننا ہے ہیں مگر یہاں اہل جلسہ کو بھی تامل ہے کہ ایسے یہودہ سے بائیکاٹ بھی کرنا چاہیے یا نہیں افسوس! رٹ کی میں ایک کمیٹی ہوتی تھی جس میں اسپرٹ بحث کی تھی کہ نکاح کی پچھریوں لگائی گئی ہے۔ نکاح کی روح اور حقیقت تو تراضی ہے جہاں تراضی پائی جاوے۔ نکاح ہی کا حکم ہونا چاہیے عورت اور مرد کا ایک کے ساتھ مقید ہو جانا سمجھ میں نہیں آتا۔ ہاں جبر نہیں چاہیے۔ رضامندی سے کسی مرد اور عورت کے مل جانے میں کیا حرج ہے مگر یہ کیا ضروری ہے۔ ایک بیوی ایک میاں ہو۔ یہ مسلمانوں میں کمیٹی ہوتی تھی۔

اس سے بڑھ کر ایک اور لطیفہ ہے (لطیفہ کیا ہے کشف ہے)

دیکھ دھیفہ

لکھنؤ میں ایک محلہ ہے خیالی گنج۔ وہاں کے ایک صاحب مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے۔ ایک روز درادیر میں آئے تو پوچھنے پر بیان کیا کہ آج وہاں ایک کمیٹی ہوئی تھی جس میں اسپرٹ بحث ہوئی کہ مسلمانوں کے تزل کی اصل وجہ کیا ہے۔ بہت گفتگو کے بعد

جو اخیر بات طے ہوئی وہ یہ کہ ان کا اصلی اور سبب تزل کا اسلام ہے جب تک اس کو نہیں چھوڑا جاوے گا ترقی نہیں ہوگی اور یہ بات پاس ہوگئی۔ لعنت ہے اس پاس ہونے پر۔

اے صاحبو! خیال تو فرمائیے۔ کہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے بے غیبتی کی انتہا۔

پھر اپنے کو کہتے ہیں۔ ٹھیک مسلمان ہیں۔ ٹھیک نہیں بلکہ تمہارے اسلام کی آنکھ ٹینٹ نکل آئی ہے جس نے بالکل بیکار کر دیا۔ اور جس کا علاج سوائے نشتر کے کچھ بھی نہیں اور نشتر بھی کون سا؟ نائی کا پھر وہ نشتر نہیں جس سے آنکھ بن جائے بلکہ وہ جس سے اور پھوٹ جائے اور کاٹ کر نکال دی جاوے کیونکہ اس میں قابلیت ہی بننے کی نہیں یہ تو نوبت ہے۔ اگر اسپرٹ کوئی حکم شرعی سنایا جاوے تو کہتے ہیں کہ بس مولویوں کو فتویٰ لگانا آتا ہے اور غصہ ان کی ناک پر رکھا رہتا ہے اور ذرا سی دیر میں برا مان جاتے ہیں۔ اگر انکی ماں کو کوئی گالی دے تب دیکھیں یہ برا نہیں مانتے اور اس شخص سے دوستی قائم رہتی ہے یا نہیں اس وقت تو یہ بھی ایسا خشک برتاؤ کریں کہ مولوی بھی مخالف کے ساتھ نہ کریں۔

بات یہ ہے کہ جس سے جس کا تعلق ہوتا ہے اس کو برا کہنے سے غصہ آتا ہے۔ سو آپ کو اپنی ماں سے تعلق ہے اس واسطے ماں کو گالی دینے سے غصہ آگیا اور ایسا ہونا ہی چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو فطرت سلیمہ کے خلاف ہے۔ اور ہم کو اللہ و رسول سے تعلق ہے اس لئے جب ہمارے اللہ تعالیٰ اور ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دی جاویں گی تو ہم کو کیسے غصہ نہ آوے گا اور کیوں ہم برا نہ مانیں گے اور کس طرح سے ایسے یہودہ سے دوستی رکھیں گے۔

ایک اور ایل، ایل بی صاحب کا قصہ ہے (اتنا بڑا تو پاس کیا مگر بی ہی رہے کہ انہوں نے مجمع میں کہا کہ رسالت صرف

ایک صاحب کا حال

ایک مذہبی خیال ہے جو بضرورت مذہب مان لیا جاتا ہے ورنہ واقعہ میں اسکی کوئی اصل نہیں اور لطف یہ ہے کہ اس کے ساتھ یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کی توہین کرتا ہوں۔ ایسا نہیں بلکہ میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں۔ محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) تو بڑے ریفارمر تھے۔ اور آپ نے بڑی اصلاح کی۔ لیکن رسالت صرف ایک مذہبی خیال ہے۔ کیوں صاحبو! کیا ان پر بھی کوئی فتویٰ نہیں لگانا چاہیے۔ کیا یہ صریح کفر نہیں ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ان کے تحت ایک مسلمان دیوار لڑکی ہے اور جھڑا جھڑپے ہو رہے ہیں اگر لڑکی کے گھر والوں سے کہیں کہ یہ نکاح باقی نہیں اور لڑکی کو اس سے الگ کر لینا چاہیے تو ابھی ناصح پر تلوار کھینچ لی جاوے کہ ہم کو گالی

وجود عدم کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ دین کی ہر چیز کو توحذ کر ڈالا اور دین موجود اور مسلمان ہونے کے مدعی ہیں مامورات میں سے کوئی چیز مامور نہیں مانتے۔ نماز کی ضرورت نہیں۔ اس کی حقیقت جسمانی ریاضت ہے وہ اور طریقہ سے کر لی جاتی ہے۔ روزہ بہیمیت توڑنے کے لئے تھا وہ اس زمانے میں رہی نہیں کیونکہ تعلیم کا زمانہ ہے۔ اسی طرح حج زکوٰۃ وغیرہ سب کتر بیونت کر کے ندارد کر دیا اور محرمات میں سے کسی چیز کو ممنوع نہیں سمجھتے۔ سود کی حرمت اڑادی۔ اس کا تو آج کل اتنا زور و شور ہے اور اس مسئلہ میں ایسی تاہلتیں دکھائی گئی ہیں کہ حلال ہی کر کے چھوڑا ہے۔

عصر من اجزائے دین کو سب کو الگ کر دیا ہے اور منافیات دین کو دین میں داخل کر لیا ہے اور خوش ہیں کہ ہم دیندار ہیں اور پکے مسلمان ہیں یہ تو ایسا ہوا جیسے کوئی اپنے کنبہ والوں اور دوستوں کو اپنے گھر سے نکال کر باہر کرے اور عزیزوں کو اور جانی دشمنوں کو گھر میں داخل کرے اور دیکھ کر خوش ہو رہا ہو اور خوشی خوشی لوگوں کو دکھا رہا ہو کہ دیکھو ہمارا گھر کیسا آباد ہے۔ ابھی بھوڑی دیر میں معلوم ہو جائے گا کہ کیسا آباد ہے جبکہ وہ تیری تکابونی مگر میں گے۔

آجکل لیڈران قوم نے دین میں وہ تصرفات کئے ہیں اور ایسی خیر خواہی ایک بڑھیا اور شاہی باز اس کے ساتھ کی ہے جیسے کسی بڑھیا نے ایک شاہی باز کے ساتھ کی تھی۔ حکایت اس کی اس طرح ہے کہ ایک شاہی باز اگر ایک بڑھیا کے یہاں جا بیٹھا۔ بڑھیا نے اس کو پکڑ لیا اور اس کی چوچ اور پنچوں کو دیکھ کر بڑا رحم آیا۔ دیکھا چوچ ٹیڑھی ہے ناخن کس قدر بڑھے ہوئے ہیں اور ٹیڑھے بھی ہیں اور اس کو گود میں لیکر رونا شروع کیا کہ ہائے بچے تو کیسے زمین پر بیٹھتا ہو گا تیری انگلیاں ٹیڑھی ہیں ناخن اتنے بڑھ گئے ہیں اور کھاتا کیسے ہو گا کیونکہ چوچ بھی ٹیڑھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ توبے ماں باپ کا ہے کوئی تیری غور کرنے والا نہیں ہے جو ناخن کاٹا اور چوچ کو درست کرتا۔ اور رحم و شفقت نے ایسا زور کیا کہ قینچی کے کرسب ناخن کاٹ دیئے اور چوچ بھی تراش دی۔

اپنے نزدیک تو بڑھیا نے بڑی خیر خواہی اور ہمدردی کی۔ مگر خدا بچا دے ایسی ہمدردی سے کہ اس کو برباد ہی کر دیا۔ زورہ شکار پکڑنے کے کام کار ہا اور نہ کھانی کے۔ یہی خیر خواہی اسلام کے ساتھ آجکل کے ہمدردان اسلام کرتے ہیں کہ یہ بھی فضول اور وہ بھی فضول۔ نماز بھی زائد اور روزہ بھی زائد۔ زکوٰۃ کی حاجت نہیں، حج بھی فضول ہے۔ اور پھر مسلمان ہونے کے مدعی۔ معلوم نہیں اسلام کس چیز کا کام ہے۔ کوٹ کا نام ہے یا پتلون

کا نام ہے۔ جب اسلام کا ہر جزو فضول ہے تو کل بھی فضول ہے اس کا نام ہی کیوں لگا رکھا ہے۔ ہم تو جانیں تم بھی فضول ہو جو ایسی فضول باتیں کرتے ہو۔ سچ یہی ہے کہ درحقیقت یہی لوگ فضول ہیں ایک پیسہ کا سکھیا کھا کر مر جاتے تو دنیا ایسے ناپاک وجود سے پاک ہو جاتی۔

عصر من اس گروہ نے (یعنی امرار نے) عجیب گت بنائی ہے دین کی۔ درحقیقت یہ تو دین سے بالکل الگ ہے مگر نام نہاد کے لئے دین کا ایک خلاصہ نکال لیا ہے اور اس کو دین کا لب لباب سمجھ کر خوش ہیں کہ وہ ہمارے پاس موجود ہے۔ لہذا ہم دین دار ہیں۔ وہ خلاصہ تہذیب اخلاق ہے۔ اس کو دین کا باطن کہتے ہیں اور خیال ہے کہ باطن ہی مقصود اعظم ہے۔ ظاہر کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے اس طرح دین کا باطن نکالا۔ اور درویشوں نے اور طرح نکالا تھا جس کو میں بیان کر چکا ہوں۔

عصر من ان دونوں جماعتوں نے ظاہر کی ضرورت نہیں رکھی پس یہ حدیث اس پر رد کر رہی ہے اور بتا رہی ہے کہ ظاہر بھی مقصود اعظم ہے۔ کیونکہ حضور قلب کو شرط کیا دعا کے لئے چنانچہ فرماتے ہیں۔ ﴿وَاللَّهُ لَا يَسْتَجِيبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَّا يَهْتَدِ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ بلا حضور قلب کے دعا قبول نہیں کرتا۔ یہاں دعا عمل ہے اور اس کے لئے شرط ٹھہرایا ہے حضور قلب کو اور ظاہر ہے (جیسا کہ میں اوپر بھی کہ چکا ہوں کہ شرط میں حیث الشریعہ تابع ہوتی ہے) پس معلوم ہوا کہ اصل شرط دعا ہے اور حضور قلب اس کے تابع ہے۔ اس کو دو کے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اصل مقصود عمل ظاہر ہے اور باطن اس کے لئے شرط اور اس کا تابع ہے۔ اس سے ان دونوں جماعتوں کے اس خیال پر رد ہو گیا کہ اصل مقصود باطن ہے۔ یہ تحقیق تو نسبت بین الظاہر والباطن کی حیثیت سے ہوئی اب عقلی طور پر سمجھئے کہ اس میں فلسفیانہ راز ہے وہ یہ کہ ہر چیز کی ترقی عمل سے ہوتی ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس کو آجکل کے لوگ تہ دل سے مانتے ہیں۔ کیونکہ ترقی کا مدار اسی پر ہے اور ترقی ہی ترقی کا آجکل ہر چار طرف غل ہے۔ سو سب کو معلوم ہے کہ خیال باطن ہے اور عمل ظاہر اور ترقی صرف خیال سے نہیں ہوتی۔ چنانچہ لیکچروں میں برابر کہا جاتا ہے کہ ترقی کے لئے ہاتھ پیر ملاؤ۔ صرف خیال سے کچھ نہ ہوگا۔ عمل کر کے دکھاؤ عملی حالت کو بدلو۔ تب کو پستی سے نکل کر عمل کے میدان میں آؤ گے۔ اس کی بنا اسی بات پر تو ہوتی کہ ترقی عمل سے ہوتی ہے صرف خیال اس کے لئے کافی نہیں گو یہ ضرور ہے کہ عمل اس خیال ہی سے پیدا ہوتا ہے اور خیال کا وجود عمل سے پہلے ضروری ہے کیونکہ اعضاء تابع

ہوتے ہیں قلب کے، اور قلب میں ایک بات مرتبہ خیال میں پیدا ہوتی ہے تو اس کے بعد اس کا ظہور مرتبہ فعل میں اعضاء سے ہوتا ہے۔ کہاں ہیں مدعیان سائنس اور مدعیان تعلیم۔ ذرا اپنے سائنس ہی کے مسئلہ میں غور کریں کہ ہر فعل کے وجود کے لئے دونوں باتوں کی ضرورت ثابت ہوئی۔ خیال کی بھی جس کو دوسرے لفظ میں باطن کہہ سکتے ہیں۔ اور عمل کی بھی جس کو دوسرے لفظ میں ظاہر کہا جاسکتا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ ان دونوں میں سے کارآمد دراصل چیز جس سے نثرہ مرتبہ ہوتا ہے وہ عمل ہے۔ یعنی ظاہر نہ کہ خیال یعنی باطن۔ گو بلا باطن کے وجود ظاہر نہیں ہو سکتا ہو۔ اس کی مثال پھل اور گٹھلی کی ہے۔ مثلاً آم ہے۔ آم کا پھل ہے نہ کہ گٹھلی۔ گو وجود پھل کا موقوف ہے گٹھلی پر۔ تو جس کو آم کھانا ہو اس کی گٹھلی سے بھی گریز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اول کام گٹھلی ہی سے پڑے گا مگر مقصود بالذات اور کام کی چیز پھل ہی ہے جیسا کہ سب جانتے ہیں۔

تو ان لوگوں کی مثال جو محض باطن کو مقصود اعظم قرار دیتے ہیں اور ظاہر و باطن | ظاہر کو نہیں سمجھتے ایسی ہوگی کہ ایک شخص نے گٹھلیاں ٹوک کر بھر کر جمع کر لی ہوں اور خوش ہو کر ہمارے پاس آم ہیں اور ہم آم کھاتے ہیں اور جب کوئی اسپر اعتراض کرتا ہو تو جواب دیتا ہو کہ میاں اصلی چیز تو یہی ہے اس کے بغیر تو پھل کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ صاحبو! یہ دلیل تو ٹھیک ہے مگر کیا کوئی اس کو اس دلیل کی رو سے آم کھانے والا کہہ سکتا ہے۔ حاشا وکلا۔ آم کی ان گتھو شبو بھی نہیں آئی۔ اور بوجھوں مرے مفت۔ تو اصل یہی بھڑی کہ بڑا مقصود ظاہر ہی ہو کہ وہ وجود میں موقوف ہو یا باطن پر۔ اور یہ بعینہ سائنس کا وہی مسئلہ ہے کہ ترقی کا مدار عمل پر ہے۔ زرا خیال کافی نہیں گو عمل کا وجود خیال ہی سے ہوتا ہے۔ ورنہ زرا خیال تو شیخ چلی نے بھی پکایا تھا۔ اگر خیال سے ترقی ہو سکتی ہے تو شیخ چلی کو بڑی ترقی ہوتی۔ اور اگر یہی ترقی ہے تو ایسی ترقی تو بہت سہل ہے۔ ہر شخص بے محنت و مشقت گھر میں بیٹھے حسب دلخواہ کر سکتا ہے۔ (الظاہر ص ۳ تا ۴)

صاحبو! خوب سمجھ لیجئے کہ کوئی مقصود بلا مشقت اور بلا ہاتھ پر بلائے عمل کی ضرورت حاصل نہیں ہو سکتا۔ نہ دنیا کا نہ آخرت۔ اس مشقت ہی کا نام عمل ہے اور اسی کا ظاہر اور باطن نام صرف خیال کا ہے۔ اگر ظاہر کو اڑا دیا تو رہا کیا۔ صرف خیال جو کچھ بھی کارآمد نہیں۔ جیسا کہ آپ کا سائنس بھی اس کو ثابت کرتا ہے اور آپ خود بھی مانتے ہیں کہ ترقی عمل سے ہوتی ہے نہ صرف ارادوں اور ڈھکوسلوں سے۔ پھر یہ بات کہاں تک صحیح ہے کہ زرا

باطن کا کافی ہے اور ظاہر کی ضرورت نہیں۔ یہ عقلی ثبوت بھی ہو گیا ظاہر کی ضرورت کا اور اس کے مقصود ہونے کا حدیث سے پہلے ثابت ہو چکا۔ اور اس حدیث کے علاوہ دوسرے نصوص بکثرت موجود ہیں جو اس باب میں بالکل صریح ہیں اور وہ نصوص اس قدر ہیں کہ دنیا بھر ان کو جانتی ہے اور ہمارے مخاطبین کو بھی معلوم ہیں کہ مگر انہوں نے ان میں ایک اور ترکیب چلی ہے وہ یہ کہ ان کے معنی بدلے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے معنی وہ نہیں جو مولوی لوگوں نے سمجھ رکھے ہیں اور اپنے مذاق کے موافق کھینچ کھارچ کر معنی بیان کرتے ہیں۔ اس وقت ان کی تفصیل کا موقع نہیں۔ اجمالاً یہ کہنا کافی ہے کہ آیا وہ معنی صحیح ہوں گے جو لاکھوں اور کروڑوں مسلمانوں اور اہل علم نے سمجھے ہیں یا وہ جو کسی ایک دو نے اختراع کر لئے۔ اب یہ دیکھ لیجئے کہ جب سے شریعت مقدسہ آئی اس وقت سے ان نصوص کے معنی کیا سمجھے گئے۔ اور تمام امت نے ظاہر کو ضروری سمجھایا نہیں۔ تمام کتابیں بھری پڑی ہیں اعمال کی ضرورت سے اور ایک ایک عمل کی کیفیت اور اس کے اجزاء ضروری اور غیر ضروری۔ اور سنمات و محذات اور اس کے مفسدات و مکروہات سب تفصیل کے ساتھ مدون ہیں پھر اس بکھرے کی کیا ضرورت تھی اگر عمل کی ضرورت نہیں تھی۔ کیا اس سب امت کی امت نے غلط معنی سمجھے۔ ظاہر ہے کہ ایک کے سمجھے ہوئے معنی غلط ہو سکتے ہیں۔ نہ کروڑوں کے سمجھے ہوئے خوب سمجھ لیجئے کہ یہ الحاد ہے اور دہریت ہے اور زندہ ہے اور شریعت کا انکار ہے جو اس کام کر رہے وہ بیشک باطل پر ہے خواہ اپنے زعم میں تعلیم یافتہ ہو۔ اور دیندار ہو اور مقتدا ہو اور عقلمند ہو۔ اور کچھ بھی ہو۔ اور یہ اعمال ترک تھل ہے اور نفس کا دھوکہ ہے اور انجام اس کا حسرت ہوگا۔ جس کے اعمال صحیح نہیں وہ کسی شمار میں بھی نہیں اور یقین کے ساتھ سمجھ لیجئے کہ نہ کفر کے ساتھ خدنگ رسانی ہو سکتی ہے نہ فسق کے ساتھ۔ خدا تک رسانی طاعت کے ساتھ ہوتی ہے اور طاعت نام ہے عمل کا جس میں باطن کے ظاہر بھی آگیا۔ جس میں عمل نہیں وہ خدا رسیدہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ (ایضاً ص ۴۶)

۴۶ - طبیعت بے شعور کو فاعل ماننا سراسر حماقت ہے

عقلاء میں اب تک اختلاف ہے کہ عقل جو ہر مجرد ہے یا جو ہر مادی ہے۔ اور نفس ناطقہ کے علاوہ کوئی چیز ہے یا خود نفس ہی کا نام عقل ہے، یہ عقل کا علم ہے پھر اس کو احکام خداوندی میں

مزاحمت کا کیا حق ہے، جو لوگ عقل کے بہت متبع ہیں وہ ہر وقت بڑے پریشان ہیں۔ ہر چیز کی لم دریافت کرنا چاہتے ہیں مگر بعض جگہ گاڑی اٹک جاتی ہے اور کوئی بات نہیں بنتی۔ اور جہاں کچھ اسباب و علل معلوم بھی ہو جاتے ہیں وہ بھی تخمیناً اور اٹکل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ پرسوں آندھی آئی تھی میں کہہ رہا تھا کہ عقلاء کے نزدیک اس کے بھی کچھ اسباب ہیں تو یہ لوگ ان اسباب میں تصرف کر کے ذرا اس کو روک تو دیں۔ آخر وہ بہت سے اسباب میں یہ تصرف کے مدعی ہیں۔ آندھی کے اسباب میں بھی ذرا تصرف کر کے رکھائیں دو حال سے خالی نہیں، یا تو اسباب اختیاری ہیں یا غیر اختیاری اگر اختیاری ہیں اور یہ قابل تصرف نہیں تو معلوم ہو کہ آندھی کا آنا اور اس کا روکنا کسی اختیار میں نہیں تو پھر خواہ مخواہ اسباب کا نام کیوں کرتے ہیں۔ سوحد کی طرح صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ حق تعالیٰ کے حکم سے آندھی آتی ہے۔ اسی طرح زلزلہ آتا ہے اس کے لئے بھی ان کے نزدیک کچھ اسباب ہیں تو ذرا ان اسباب میں تصرف کر کے زلزلہ کو روک لے دیں۔ زلزلہ کو تو کیا روکتے۔ جن چیزوں کا ان کو تجربے سے علم بھی ہو چکا ہے ان کی بھی لم معلوم نہیں مثلاً زلزلہ سے کچھ پہلے مقناطیسیت کی خاص جذبہ زائل ہو جاتی ہے ذرا اس کی لم مجھے کوئی بتلا دے کہ آخر زلزلہ میں اور مقناطیس کی قوت میں تعلق کیا ہے۔ زلزلہ سے اس کی قوت جذب کیوں زائل ہو جاتی ہے۔ کوئی شخص اس کی لم بیان نہیں کر سکتا بلقی اٹکل پچو بات گھڑ دینا تو ہر ایک کو آسان ہے۔ لم تو وہ ہے جس کو دل بھی قبول کر لے درمہ گھڑ گھڑ کر بیان کر دینا کیا مشکل ہے۔ مگر وہ ایسی ہی لم ہوگی جیسے بعض لوگوں نے چیتے کے بدن پر نشانات کی وجہ بتلائی ہے کہ وہ دھوپ میں سیاہی دار درخت کے نیچے بیٹھتا تھا اس لئے جہاں دھوپ پڑی وہاں سے سفید ہو گیا اور جہاں سایہ پڑا وہاں سے سیاہ ہو گیا۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ اس چیتے کے پاس کوئی پرکا رہتی کہ ہر روز ایک ہی جگہ میں ٹھیک بیٹھتا تھا اور آہستہ آہستہ دھوپ سے سایہ میں اور سایہ سے دھوپ میں اس طرح ہٹا تھا کہ بدن پر گول گول ہی نشانات پڑیں کوئی نشان مربع یا مستطیل یا مثلث یا مکعب نہ ہو۔ کیا کسی کے دل کو یہ بات لگ سکتی ہے جیتا کیا ہوا، بڑا ماہر الجینیر ہوا۔ مگر احمقانہ وجوہ پر یہ لوگ خوش ہیں کہ ہم نے تو وجہ بیان کر دی ہے چاہے وہ ایسی ہی وجہ ہو جیسے ایک شخص نے جاٹ سے کہا تھا کہ جاٹ رے جاٹ تیرے سر پر کھاٹ۔ اس نے کہا شیخ رے شیخ تیرے سر پر کھو۔ شیخ نے کہا داہ قافیہ تو ملا ہی نہیں۔ کہنے لگا قافیہ نہ ہی بوجھ میں تو مرے گا ہی۔ ان کی وجہ ہوتی ہے کہ چاہے جوڑ نہ ہو مگر وجہ ہونی چاہیے۔ یہ ساری خرابی ہے۔ طبیعت بے شعور کو فاعل ماننے کی وجہ کیونکہ یہ لوگ تو یہ کہہ نہیں سکتے

کہ یہ نشانات طبیعت نے بلا واسطہ بنا دیے ہیں کیونکہ طبیعت میں ارادہ اور شعور ہی نہیں وہ کس طرح افعال مختلفہ بتاتی۔ اس لئے اسباب کا واسطہ مانتے ہیں پھر اٹکل پچو اسباب گھڑ کر نکالتے ہیں۔ اور موجد کو کسی جگہ اٹکاؤ نہیں وہ بڑے نکر ہے۔ جس بات کی اس سے وجہ پوچھو وہ کہتا ہے خدا نے یونہی بنانا چاہا تھا بنادیا اور گو وہ واحد حقیقی ہے مگر ارادہ کے تعلق کی وجہ سے افعال میں اختلاف واقع ہو گیا۔ اس لئے الواحد لا یصدر عن الواحد کے بھی خلاف نہیں، کیونکہ حکم علت موجبہ میں ہے حق تعالیٰ ایجاب سے منزہ ہیں اور طبیعت میں ارادہ ہی نہیں وہ علت موجبہ ہی ہوگی اس لئے اس کی طرف ان افعال کی نسبت نہیں کر سکتے ہائے کیسے ذی شعور کو فاعل مانا اور جس جگہ ان سے کوئی تاویل نہیں بنتی۔ نہ الہی نہ سیدی۔ نہ کوئی سبب ظاہری سمجھ میں آتا ہے تو وہاں ہی ظالم خدا کو فاعل نہیں مانتے بلکہ ان مواقع کے لئے بخت اتفاق کو گھڑ لیا ہے۔ مگر یہ محض نام ہی نام ہے۔ (۱) لا اسماء سیمتہا لا نتم و لا بداء کم۔

کوئی ان سے پوچھے بخت و اتفاق ہے کیا بلا۔ اس میں فاعلیت کی قوت صفت عقل پر اعتماد کا انجام | کہاں سے آگئی اور یہ کیوں کر سبب بن گیا۔ بس اس کا کچھ جواب نہیں یہ ہے عقل محض کے اتباع کا نتیجہ جس سے ایسی بے عقلی کی باتیں ماننا پڑتی ہیں۔ موجد کیسے جین میں ہے کہ اس کو ایسی دور از کار باتیں سوچنے کی ضرورت نہیں وہ کہتا ہے کہ سب کا فاعل خدا ہے اس نے جس طرح پیدا کرنا چاہا کر دیا۔ اور اس کو طبیعت کی ضرورت ہے نہ بخت و اتفاق کی اور جہاں ظاہر میں کچھ اسباب کا دخل معلوم بھی ہوتا ہے وہاں وہ کہتا ہے کہ اسباب مؤثر بالذات نہیں ہیں بلکہ یا تو مؤثر باذن الخالق ہیں جیسا کہ ایک قول ہے اور یا مؤثر ہی نہیں بلکہ محض علامات ہیں جیسا کہ ایک قول ہے جیسے جھنڈی کا ہلنا ریل کے چلنے کی محض علامت ہے مؤثر بالذات حق تعالیٰ ہیں اگر وہ ارادہ کریں تو سارے اسباب بیکار پڑے رہیں جیسے ڈرائیور گاڑی کو روکنا نہ چاہے تو ہزاروں سرخ جھنڈیاں بیکار ہوتی ہیں۔ بتلائیے یہ شخص چین میں ہے یا وہ شخص جو کبھی اسباب کو فاعل مانتا ہے کبھی طبیعت کو کبھی بخت و اتفاق کو، موجد ان اسباب پرستوں کی پریشانی دیکھ کر یوں کہتا ہے

ذکرنا و دھدم الف رب۔ دین لا ذق سمیت لا مور۔

نرکت و لہات و لہغی جمیعاً کذ لا یفعل لا رجل و لہبیر

وہ ان سب لات اور غری پر لات مانتا ہے اور ایک خدا کو فاعل مانتا اور اسباب پرستوں سے کہتا ہے کہ تم ایک خدا کو چھوڑ کر کہاں مارے مارے پھرتے ہو چھوڑو ان خرافات کو اور یہ مذہب

اختیار کر دے

۱۔ مصاحت دیدن آنست کہ یاران ہمہ کار۔

بگذارند دشم طرہ یاری گیرند۔

اور مولانا جامی فرماتے ہیں ۲۔

خلیل آسا در ملک یقین زن

نوائے لاجب الانلین زن۔

کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اسباب اس کے قبضہ میں ہیں ۳۔

خاک و آب و آتش بندہ اند

باقی موحّد سے بڑھ کر کوئی چین میں نہیں۔ پھر مشرکین کے بعض مبعود ایسے کہ ان میں باہم رقابت

ہے۔ وہ ایک کی عبادت دوسرے سے چھپا کر کرتے ہیں۔ کہیں وہ یہ معلوم کر کے کہ دوسرے کے پاس بھی جاتا ہے کہ ناخوش نہ ہو جاوے۔ (تفہیل للاختلاف مع اللہ نام ص ۱۹ تا ۲۲)

آجکل کے حکماء تو ایسے بد تہذیب ہیں کہ ان کے بھی منکر ہیں۔ ان کی ایسی مثال ہے خدا کے منکر جسے ایک چراسی اپنے افسر سے تنخواہ لیتا ہو مگر تنخواہ لینے کے بعد کہتا ہے کہ میرا کوئی افسر نہیں۔ نہ مجھے کوئی تنخواہ دیتا ہے بلکہ زمین سے خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں اور ہوا سے اڑ کر میرے ہاتھ میں آ جاتے ہیں۔

رسالہ حمید میں موحّد اور دہری کی مثال ایک گفتگو کے پرائے میں خوب لکھی ہے کہ ایک موحّد اور ایک دہری کسی جزیرے میں گئے۔ وہاں ایک مکان نہایت خوبصورت مستحکم بنا ہوا دیکھا جس ایک طرف کھانے کا کمرہ ہے جو فرش فرش اور آئینوں سے سجا ہوا ہے۔ ایک طرف سونے کا کمرہ ہے جس میں عمدہ عمدہ سہریاں لگی ہوئی اور سقفی پنکھے لگے ہوئے ہیں ہر کمرہ میں ہوا کے لئے روشندان بے ہوئے ہیں۔ ایک طرف باغ لگا ہوا ہے جس کے درخت نہایت قرینہ سے لگائے گئے ہیں۔ ایک طرف حوض بنا ہوا ہے جس میں فوارہ سے ہر وقت پانی آتا ہے موحّد نے اس مکان کو دیکھ کر کہا کہ اس کا بنانے والا بڑا ہی صنّاع اور بہت ہی ماہر تھا جس نے نہایت عمدگی اور مضبوطی اور خوبصورتی کے ساتھ اس مکان کو تیار کیا۔ دہری نے کہا کہ اس کے بنانے والا کوئی نہیں۔ بلکہ عرصہ دراز سے بارش ہونے کی وجہ سے زمین کی مٹی جم گئی۔ پھر دھوپ سے پختہ اینٹیں بن گئیں۔ پھر ہوا سے اڑا کر وہ اینٹیں اس جگہ اکڑ جمع ہو گئیں۔ پھر ہوا چلی اور ان کو اوپر نیچے کر دیا اس طرح دیواریں بن گئیں۔ پھر پہاڑوں سے پتھر گرے اور ہوائے ان کو اڑا کر یہاں کھڑا کر دیا۔ اس سے

ستون بن گئے۔ پھر درختوں کی لکڑیاں ہوا سے ٹوٹ گئیں۔ وہ اڑ کر یہاں چھت کی صورت میں قائم ہو گئیں۔ اس طرح اس نے ساری مکان کو ہوا اور دھوپ سے تیار کر دیا۔ میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ بتائیے ان میں گدھا کون ہے آدمی آدمی کون ہے۔ یقیناً وہ شخص بالکل گدھا ہے جو ایسے مکان کی نسبت یوں کہتا ہے کہ خود بخود تیار ہو گیا۔

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ جو لوگ آسمان وزمین کی اتنی بڑی عجیب و غریب عمارتوں کو کسی صانع کی بنائی ہوئی نہیں مانتے۔ بلکہ از خود تیار مانتے ہیں وہ بیوقوف ہیں یا نہیں۔ تو یونان کی حکمت اس حکمت سے پھر بھی اچھی تھی۔ وہ لوگ خدا کے تو قائل تھے اور اہل سائنس تو غضب کرتے ہیں کہ خدا کے بھی منکر ہیں اور سائنس والوں میں سے جو مسلمان خدا کے قائل بھی ہیں یہ ان کی محض وضع داری ہے ورنہ ان کا خدا کو ماننا ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسی سے پوچھے کہ تو نے بادشاہ کو دیکھا ہے وہ کہے کہ ہاں دیکھا ہے اس کے ایک سونڈ تھی اور ذرا سا سر تھا اور آنکھیں نہیں تھیں۔ تو پہلا شخص یہ اوصاف سن کر کہے گا کہ کجمنت تو نے بادشاہ کو نہیں دیکھا۔ نہ معلوم کس بلا کو دیکھ لیا ہے بادشاہ تو ایسا بد صورت نہیں ہے۔

یہی حال ان سائنسدانوں مسلمانوں کا ہے جو خدا کے قائل ہیں مگر اس کے کمالات سائنسدانوں کا حال کے منکر ہیں۔ جن میں سے ایک بڑا کمال یہ ہے یفعل ما شاء و یعمکم ما یرید مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ بس خدا نے عالم کو پیدا کر کے طبیعت اگر مادہ کے سپرد سارا کام کر دیا ہے اب جو ہوتا ہے وہ اسباب طبیعیہ سے ہوتا ہے خدا تعالیٰ کے ارادہ کو کچھ دخل نہیں گویا خدا نے گھڑی میں کوک بھردی ہے۔ اب اس کے چلنے میں فراخاں اور بال کمائی کی طاقت کو دخل ہے۔ خدا کو کچھ دخل نہیں۔ اسی لئے یہ لوگ ابراہیم علیہ السلام کی نار کے گلزار ہونے کا انکار کرتے ہیں کہ آگ بھلا کیونکر ٹھنڈی ہو گئی۔ یہ تو قانون طبیعت کے خلاف ہے بھلا بنی اسرائیل پر پہاڑ کیونکر معلق ہو گیا اور ایک ذرا سے پتھر میں سے بارہ چشمے کیونکر بہنے لگے۔ یہ قانون فطرت کے خلاف ہے۔ ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کو قانون فطرت کے تابع بنا دیا۔

موحّد کہتا ہے کہ نہ معلوم تم کس عاجز کو خدا سمجھتے ہو۔ خدا تو ایسا عاجز نہیں۔ اس کی تو شان یہ ہے کہ ایک پتہ بھی اس کے حکم و ارادہ کے خلاف نہیں ہل سکتا۔ اور اگر وہ چاہے تو تمام عناصر کی خاصیت کو دم بھریں بدل دے۔

پھر ان اوصاف کے ساتھ ان کا یہ کہنا کہ ہم خدا کے قائل ہیں ویسا ہی ہے جیسا کہ اس شخص نے

کہا تھا کہ میں نے بادشاہ کو دیکھا ہے اس کے ایک سو ٹہتی اور آنکھیں ندارد تھیں۔ مگر بایں ہمہ ان کو کافر نہ کہیں گے کیونکہ ان کے اقوال سے صرف خدا کا انکار لازم آیا ہے۔ التزام نہیں پایا گیا ہے اور لہذا کفر نہیں التزام کفر ہے اس لئے ہم ایسے مسلمان کو کافر نہیں کہتے۔

ایک اور رمزے کی بات سنئے۔ جب اہل سائنس نے خدا کا انکار کیا اور طبیعت کو فاعل مانا تو ان کو اس کی بھی فکر ہوئی کہ اسباب طبیعیہ کے موافق انسان کی اصل دریافت کی جائے۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کا خدا کے ہاتھ سے پیدا ہونا تو ان کو مسلم نہیں یہ تو انسان کی عقل سے بعید ہے تو ڈراؤن کو یہ کہنا پڑا کہ انسان کی اصل بندہ ہے۔ بندہ ترقی کر کے انسان بن گیا۔ اس کا نام مسئلہ ارتقاء ہے اس بیچارے کو اپنے مناسب تمام حیوانات میں بندہ ہی نظر آیا۔ جب کوئی اس قول کی تردید کے درپے ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس قول کے انکار کی ضرورت نہیں۔ اس کو اپنے نسب کا حال ہم سے زیادہ معلوم ہے اس لئے وہ اپنا نسب بیان کرتا ہے وہ بندہ ہی کی نسل سے ہوگا۔ اور ہم کو اپنے نسب کا حال اس سے زیادہ معلوم ہوگا کہ آدم علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ تو تم اس بات کا انکار کیوں کرتے ہو۔ وہ بیچارہ تو اپنا نسب بتلا رہا ہے۔ تمہارا نسب محفوظ رہی بتلا رہا ہے اور جس دن وہ ہمارا بتلا دے گا ہم کہیں گے کہ ”صاحب البیت ادنیٰ بمانیہ“ گھر والوں کو اپنے گھر کی خبر دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہمارے نسب کی خبر کچھ کو ہم سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ ہمارے پاس شجرۂ نسب آدم علیہ السلام تک محفوظ ہے۔ تجھے ہمارے نسب میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ ہاں تیرے پاس اپنا شجرۂ نسب محفوظ نہ ہوگا تو تجھے اختیار ہے جس سے چاہے اپنا نسب ملا لے (مجمول النسب یہ نہ کرے تو ادر کیا کرے) (جامع)

یساری خرابی طبیعت کو فاعل ماننے سے لازم آئی۔ خدا کو مان لیتے تو اس جھگڑے میں نہ پھنستے۔ یہ تو ان سائنس والوں کا حال تھا جو خدا کے منکر ہیں۔ اب ان سائنس والوں کا حال سنئے جو برائے نام خدا کے قائل ہیں۔

ان میں سے ایک صاحب علم کا قصہ ہے کہ جب انہوں نے دیکھا کہ ایک صاحب علم کا قصہ | قرآن میں آدم علیہ السلام کا قصہ ڈراؤن کی تحقیق سے مصادم ہے تو وہ بولے شاید وہ پہلا بندہ جس نے انسان کی طرف سب سے پہلے ترقی کی ہے۔ (نوذ با اللہ) آدم علیہ السلام ہی ہو۔ استغفر اللہ۔ استغفر اللہ۔ میرے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اس بات کی نقل سے بھی۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور خدا کا قائل بتلاتے

ہیں۔ یہ محض وضع داری ہے ورنہ حقیقت میں یہ خدا کے قائل نہیں۔ بھلا ڈراؤن کو تو اس قول پر اس بات نے مجبور کیا تھا کہ وہ خدا کو فاعل نہیں مانتا۔ طبیعت کو فاعل مانتا ہے۔ اور طبیعت دفعۃً ترقی نہیں کر سکتی۔ تدریجاً ترقی کرتی ہے کہ پہلے اجسام بسیط یعنی عناصر کی صورت اختیار کی۔ پھر اس سے ترقی کر کے جمادات مرکبہ کی صورت اختیار کی پھر اس سے ترقی کر کے حیوانات کی صورت اختیار کی۔ پھر حیوانات میں سے کسی نے ترقی کر کے انسان کی صورت اختیار کر لی۔ مگر جو شخص خدا کو فاعل شمار مانتا ہو۔ اس کو اس قول کی طرف کس چیز نے مضطر کیا۔ اس کے نزدیک اس میں کیا استیلا ہے کہ خدا تعالیٰ آدم علیہ السلام کے پتلے کو مٹی اور پانی سے بنا کر دفعۃً اس کو انسان بنادیں۔ اس ظالم کو ڈراؤن کی تقلید پر کس بات نے مجبور کیا کہ وہ خواہ مخواہ ایک بنی کی توہین پر آمادہ ہوتا ہے۔

پھر اس میں علاوہ توہین بنی کے یہ بھی خرابی ہے کہ یہ تاویل ڈراؤن کے قول پر بھی غلط ہے کیونکہ ڈراؤن اس کا قائل نہیں ہے کہ دنیا میں بس ایک بندہ ترقی کر کے انسان ہوا ہو جس کی نسل میں یہ سب انسان ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جس وقت بندہ کی طبیعت نے ترقی کی ہے تو ایک خاص وقت میں ہر جگہ ہزاروں لاکھوں بندہ آدمی بن گئے۔ اور یہ سب ایک کی نسل سے نہیں تو اس شخص نے ڈراؤن کی تقلید میں قرآن کے اندر تقلید کی اور وہ تحریف بھی ڈراؤن کے یہاں قبول نہیں تو ادھر سے بھی گئے۔ ادھر سے بھی گئے۔

خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے رہے
ہائے یہ لوگ ایک خدا کو چھوڑ کر کدھر مارے مارے پھرتے ہیں موجد کو ایک خدا سے
تعلق ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا واسطہ علاقہ ہے
اسلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں غلطی نہیں ہو سکتی۔ آپ کی شان یہ ہے کہ
گفتہ ادگفتہ اللہ بود گرچہ از مخلوق عبداً لہ بود۔

اس موجد کو اپنے علوم پر اطمینان ہوتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو وہ علوم ہی اطمینان بخش ہیں۔ موجد کہتا ہے کہ ہر چیز کا فاعل خدا ہے۔ خدا نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کر کے انسان بنادیا۔ اس کو کچھ ضرورت نہیں کہ اپنا نسب بندہ یا سور سے ملائے۔

تو خدا کو فاعل بنانے میں کیسی راحت ہے کہ سب جھگڑوں سے نجات ہو گئی۔
یہ تو علمی راحت ہے اور دینیوی حسی راحت یہ ہے کہ حوادث و مصائب میں موجد مستقل

وَمَنْ هُوَ تَابَ وَهُوَ كَتَابَ . قُلْ لَنْ يَصِيَّبُنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ کہ غم وہی پیش آئے گا جو خدا نے مقدر کر دیا ہے اس کے خلاف ہرگز پیش نہیں آسکتا اور حق تعالیٰ ہمارے آقا اور مولیٰ ہیں ان کی طرف سے جو کچھ پیش آدینگا اس میں رحمت و حکمت ہی ہوگی اسلئے خدا تعالیٰ ہی پر بھروسہ مسلمان کو کرنا چاہیے ۔

بتلائے جس کا یہ اعتقاد ہو وہ مصائب میں کب پریشان ہو سکتا ہے ۔ اور ملحد پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کی پریشانی کی کوئی حد ہی نہیں رہتی ۔ کیونکہ اس کو اسباب پر اعتماد تھا اور اسباب اس کے مخالف ۔ تو اب اس کے پاس کوئی سہارا نہیں اور موجد کو خدا پر اعتماد ہے اور خدا کو وہ اپنا مخالف نہیں سمجھتا ۔ بلکہ مولیٰ اور آقا سمجھتا ہے ۔ اس کو اسباب کے مخالف ہو جانے پر بھی یہ امید ہے کہ شاید حق تعالیٰ اسباب مخالف کو موافق بنادیں ۔ اور اگر اسباب مخالف ہی رہے اور اس کو نا کامیابی بھی ہو جاوے تب بھی وہ راضی ہے ۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو بات بھی آتی ہے اس میں خیر ہی ہوتی ہے پس اس صورت میں اگر دنیا کا ضرر ہو تو میری آخرت کی ترقی ہوگی قُلْ لَنْ يَصِيَّبُنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا عَدَى الْحَسَنِينَ ۔ موجد کے لئے مصائب میں بھی فائدہ ہی ہے اور تکلیف سے بھی خوش ہوتا ہے ۔ جیسے بچہ دودھ چھوٹنے کے وقت گوبریشان ہوتا ہے اور اس وقت اس کو بہت تکلیف ہوتی ہے مگر بعد میں ماں کو دعا دیتا ہے ۔

جزاک اللہ کہ چشم باز کر دی مرا با جاں جاں ہر از کر دی وہ کہتا ہے کہ اس ماں کا خدا بھلا کرے جس نے دودھ چھڑا کر مجھے اس قابل کر دیا کہ آج میں پلاؤ زردہ ، قورمہ اور کباب کھا رہا ہوں اگر دودھ ہی پیتا رہتا تو یہ نفیس و لذیذ غذا میں کیونکر کھاتا ۔

اسی طرح موجد کو مصیبت کے وقت گویا ہر تکلیف ہوتی ہے مگر تکلیف کے بعد جب اپنی ترقی کا احساس ہوتا ہے تو وہ خوش ہو کر یوں کہتا ہے ۔ ناخوش تو خوش بود بر جان من ! دل فدائے یار دل کہ بخان من !

اور موجد عارف کو تو عین مصیبت کے وقت اس کی حکمتیں اور اپنی ترقی محسوس ہوتی ہے اسلئے وہ تکلیف بھی لذیذ ہو جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر مصیبت لوگوں کی نظر میں ہوت ہے ۔ یہ منتہی المصائب ہے کہ وہ تمام مصائب کا انتہائی درجہ ہے اور اسی کے اندیشہ سے آدمی

تمام مصائب سے گھبراتا ہے مگر عارف موجد کے نزدیک یہ زہر کا میاں بھی شیریں ہے وہ کہتا ہے خرم آن روز کزین منزل دیراں بروم راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم

نزد کردم کہ گر آید بسر این غم روزے تا در میکہ شاداں و غزل خواں بروم (ایضاً ص ۲۴ تا ۳۰ محضاً)

۴۷ - مولوی لوگوں کو کافر بتاتے ہیں -

یہ لوگ ہم پر اعتراض کرتے ہیں کہ مولوی لوگوں کو کافر بتاتے ہیں میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ مولوی بناتے نہیں بلکہ کافر بتاتے ہیں ۔ یعنی جو شخص حرکتوں سے کافر بن جاتا ہے مولوی اس کے کفر کو ظاہر کر دیتے ہیں ۔ جیسے کسی کے کپڑے میں پانخانہ لگا ہوا ہو اور دوسرا شخص اس سے کہدے کہ آپ کے کپڑے میں پانخانہ لگ رہا ہے اس کو دھوی لیجئے ۔ تو کہئے ! اس نے پانخانہ لگایا یا پانخانہ لگا ہوا بتایا ۔ پس آپ کا مولویوں پر جھلانا ایسا ہی ہے جیسا وہ شخص جس کے کپڑے میں پانخانہ لگ رہا ہے ۔ بتلانے والے کو دھمکانے لگے کہ وہ صاحب تم ہمارے لباس میں پانخانہ لگاتے ہو ۔ وہ کہے گا بیوقوف میں نے لگایا نہیں نہ میرے پاس پانخانہ موجود ہے جو میں لگاتا ۔ تو نے خود اپنی بے احتیاطی سے کہیں سے لگایا ہے میں نے تو کچھ اطلاع کر دی ہے ۔ کہئے ان دونوں میں کون حق پر ہے ۔ دیکھو کافر بنانا تو یہ ہے کہ کسی کو کفر کی تلقین کی جائے ۔ جیسے مسلمان بنانا یہ ہے کہ کسی کو اسلام کی تلقین کی جائے ۔ تو جس طرح ہم کافروں کو اسلام کی تلقین کر کے مسلمان بناتے ہیں کیا اسی طرح کسی مسلمان کو تلقین کفر کرتے ہوئے آپ نے کسی مولوی کو دیکھا ہے ۔ کبھی نہ دیکھا ہوگا پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ مولوی کافر بناتے ہیں ۔ بلکہ یوں کہو کہ وہ کافر بتاتے ہیں ۔

(تقلیل الاختلاط مع اللہ نام ص ۲۶)

۴۸۔ عقل ہماری اتنی خیر خواہ نہیں ہے جتنی شریعت

خیر خواہ ہے۔

اجکل ہر بات میں عقل پرستی کا دور ہے ہر معاملہ میں اسی کو فیصلہ کے لئے حکم بنایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ شریعات میں بھی اور شرعیات میں سے معادیں بھی اور پھر عقل کو نسی وہ جو دنیا کے معاملات میں ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے۔ تعجب ہے اس کو حکم بنایا گیا ایسے عظیم فیصلہ کے لئے۔ اور تمنا کی جاتی ہے کہ اگر عقل کے موافق احکام ہوتے تو خوب ہوتا لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں کہ بڑی مصیبت ہوتی کیونکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو عقل ہماری اتنی خیر خواہ نہیں جتنی شریعت خیر خواہ ہے۔ دیکھئے اسی مقام پر عقل کا فتویٰ تو یہ ہے کہ استحضار تصدیق دوائے ضروری ہو ایک ساعت بھی غفلت جائز نہ ہو جیسا کہ ایک بزرگ غلبہ میں فرماتے ہیں۔

ہر آنکہ غافل از حق یک زمان است

در آں دم کافر است اما نہاں است

یہاں کافر سے کافر اصطلاحی مراد ہے۔ یعنی مومن کامل کے مقابل۔ اور کامل بھی کیسا ہو جو اکمالت کے درجے سے پہونچا ہوا ہو کیونکہ کمال کے بھی درجات مختلف ہیں اور ایک درجہ کامل کا ہے اور ایک کمال کا۔ اور پھر اکمالت کے بھی مختلف درجے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جو حق تعالیٰ کو ہر وقت یاد رکھے وہ مومن اکمل ہے۔ اس کے مقابلہ میں جو شخص یاد حق میں غفلت کرے اسے اضافۃً کافر کہہ دیا ہے۔ اس سے حقیقی اور نقی کافر مراد نہیں جو غرض غلبہ حال جو اقتضا ہے کہ استحضار دوائے عقل کا بھی وہی اقتضا ہے تو اگر شریعت مقدسہ نہ ہوتی اور محض عقل ہی حاکم ہوتی تو وہ سب کو عاصی قرار دیتی۔ شریعت مقدسہ نے یہ رحمت فرمائی کہ آپ کے ذہول کی اجازت دیدی اور عدم تصدیق کو بھی جبکہ تکذیب نہ ہو تصدیق کا قائم مقام کر دیا۔ اب بتائیے عقل زیادہ خیر خواہ ہوتی یا شریعت مقدسہ۔ یہ ان عقل پرستوں کو خطاب تھا جن پر سائنس کا غلبہ ہے اور عقل کو شرع پر ترجیح دیتے ہیں۔

(انوار الباعۃ ص ۶)

۴۹۔ کفار کا مال دبا لینا حلال نہیں ہے

اجکل اجتہاد کا زور ہے حتیٰ کہ کافر بھی مجتہد ہونے لگے ہیں خواہ وہ یورپ کا ہو یا ہندوستان کا۔ تو شاید کوئی ایسا ہی مجتہد یوں کہے لگے کہ حدیث میں تو مسلم کی قید ہے تو مسلمان کا مال تو بدو و طیب قلب کے حلال نہیں ہوگا لیکن کافر کا تو ضرور حلال ہے۔ اور پھر شاید اس استدلال سے منتفع ہو کر ریل میں بے ٹکٹ سفر کرتے ہوں کہ وہ مسلمان کی نہیں ہے غیر مسلم اس کے مالک ہیں خواہ اس کے پاس ٹھیکہ ہے اور بعض لوگ اسے سرکاری سمجھ کر یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہم گورنمنٹ سے اپنا حق وصول کرتے ہیں۔

یہ مسئلہ بھی بجائے خود قابل بحث ہے کہ غیر جنس سے حق وصول کرنا جائز ہے یا نہیں مگر بہت بہت لوگ اس جگہ مسلم کی قید دیکھ کر یوں سمجھے ہوں گے کہ کافروں کا مال لینے میں مطلقاً کچھ حرم نہیں خواہ اس پر ہمارا حق ہو یا نہ ہو کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم کا مال حیرا لینے کو منع فرمایا ہے۔

اس کا جواب ظاہر ہے کہ یہ قید اتفاقی ہے کہ عادتاً مسلمانوں کو سابقہ مسلمان ہی سے پڑتا ہے ورنہ نصوص عامہ کی وجہ سے اس طرح کسی کا بھی حلال نہیں۔ چنانچہ بعض احادیث و عیدیں درج ذیل یقظ مال (درجل آیا ہے۔ (رداۃ فی الترغیب عن الحاکم و قال صحیح علی شرطہما)

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ کافر فرامی اور کافر مسلم حقوق ظاہرہ اور معاملات میں شرعاً مثل مسلمان کے ہے۔ لھذا مالنا وعلیہم ما علیہم البتہ کافر محارب کا مال مبارک ہے مگر وہاں بھی فریب اور غدر جائز نہیں اور مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق ایک عجیب بات فرمائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے چنانچہ مولانا نے فرمایا کہ بھی اگر کسی کا حق ہی رکھنا ہو تو مسلمان کا رکھ لے کافر کا نہ رکھ کیونکہ قیامت میں ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دی جا دیں گی۔ تو اگر کسی مسلمان پر ظلم کیا تو نماز روزہ ظالم کا اس کے بھائی ہی کو ملے گا۔ خیر اگر ظاہر میں ظلم کیا تو باطن میں قومی ہمدردی بھی تو کی کہ اپنی نیکیاں اسے دے دیں۔ اور اگر کافر کا حق رکھا تو ایک تو اپنی نیکیاں پر اسے گھر۔ پھر اس صورت میں نہ تمہارا بھلا نہ اس کا بھلا۔ کیونکہ وہ تو پھر بھی جہنم ہی میں گیا۔ اگر کوئی کہے کہ پھر اسے کیا نفع ہو جب نیکیاں اس کے کار آمد

نہ ہوتیں۔ جواب یہ ہے کہ نفع تو ہوگا مگر اتنا کم ہوگا کہ اسے محسوس نہ ہوگا جیسے کسی کے پاس من بھر سونے کا ایک ڈھیر ہے اور اس میں سے کسی نے ایک رتی بھر سونا چرایا تو واقع میں تو کمی ہوئی مگر محسوس نہ ہوگی۔ لیکن اس سے کوئی عاقل اور عادل اس کی اجازت نہ دے گا کہ اتنا سا چرایا کر دے مثلاً کسی سلطنت میں دودھ کے اندر پانی ملائے کی اجازت نہ ہو اور اگر کوئی یہ کہہ کر ملا دے کہ ایک من میں ایک ٹوٹا کیا معلوم ہوگا۔ تو کیا یہ جرم نہیں۔ یقیناً جرم ہے اگر اطلاع ہو جاوے تو ضرور سزا ہوگی۔ مگر اگر اطلاع نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کا احساس کم ہوتا ہے۔ مگر عدم احساس سے بطلان شئی تو لازم نہیں آتا۔ اسی طرح اگر کسی کو اپنے نفع کا احساس نہ ہو مگر سزائیں کچھ تخفیف ہو گئی ہو تو اس سے نفع کا بطلان لازم نہیں آتا۔ اسی طرح کافر کے عذاب میں بھی تخفیف ہوگی تو اسے خفت کا احساس نہ ہو۔

اگر کوئی کہے کہ قرآن میں تو ہے۔ لایخفف عنهم العذاب کہ ان کے عذاب میں تخفیف نہ کی جاوے گی اور تم کہتے ہو کہ نیکیاں ملنے سے عذاب میں خفت ہوگی، یہ متعارض ہوا۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ایسی تخفیف نہ ہوگی جس سے راحت محسوس ہو۔ باقی مطلب ان پر آیت کا نہیں کہ سب کفار کو برابر عذاب ہوگا اور کسی کا عذاب کسی سے کم نہ ہوگا۔ کیونکہ جس طرح معذبین کے اعمال مراتب میں متفاوت ہیں کہ بعضے کافر کفر میں اشد اور اخلاق میں سخت ہیں۔ اور بعضے ایسے نہیں۔ اسی طرح عذاب کے بھی درجات مختلف ہیں۔ یہ نہیں کہ فرعون اور شداد اور فرود کے برابر اس کافر کو بھی عذاب ہوگا۔ جو عزیز مسکین مظلوم تھا تو جیسے کفر کے مراتب اور کفار کے درجات ہیں۔ اسی فرق مراتب کے اعتبار سے عذاب میں بھی فرق ہوگا کہ ایک کو جتنا عذاب ہوگا کسی کو اس کا نصف ہوگا اور کسی کو نصفین، اور یہ سب فرق قرآن میں آیا ہے۔ البتہ جس کے لئے جتنا عذاب دخول جہنم کے وقت تجویز ہو جائے گا پھر اس میں کمی نہ ہوگی اور یہ دوسرا جواب ہے پس مطلق خفت کی نفی نہیں ہے بلکہ عذاب مجوز میں خفت کی نفی ہے۔

بہر حال مولانا کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے۔

اب تیسرا جواب سنئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی عادل امت سے یہ احتمال ہی نہ تھا کہ کوئی مسلمان کسی کافر کو نقصان پہنچائے گا اگر کرے گا تو اپنے بھائی ہی کی گلو تراشی کرے گا۔ کیونکہ عام طور پر اس وقت لوگوں کا خیال یہ تھا۔ ع۔

ع۔ خانہ دوستان بردب در دشمنان مکوب۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اس سے بھی روک دیا۔ جس سے اب خانہ دوستان بردب کی بھی گنجائش نہ رہی۔ اس کی اس لئے تشریح کر دی کہ شاید اس قول سے ظاہر بر عمل کرنے لگے۔ اب ایسے شخص کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اگر وہ دوست بھی اس پر عمل کرے اور جو کچھ آپ اس کے گھر سے لائے ہیں وہ بھی اور جو آپ کے گھر کا ہے وہ بھی سب لیجائے تو کیا آپ کو گوارا کرنا پڑے گا اگر گوارا نہیں تو ایسا ہی دوسرے کو بھی سمجھ لیجئے۔ (اسرار العبادۃ ص ۱۶)

۵۰۔ تقدیر پر اعتقاد رکھنے سے دنیا میں راحت رہتی

ہے اور انکار سے پریشانی بڑھتی ہے!

اعتقاد تقدیر کی تعلیم سے فلاح آخرت کے ساتھ یہ بھی مقصود ہے کہ مسلمانوں کو دنیا میں راحت رہے کہ کسی چیز کے فوت ہونے سے ان کو زیادہ رنج نہ ہو کرے۔ بلکہ سمجھ کر کہ تقدیر میں یوں ہی تھا۔ صبر و شکر سے کام لیا کریں۔ اب آپ دیکھ لیں کہ اعتقاد تقدیر کا یہ اثر ہمارے اندر کتنا ہے۔ سو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہم مصائب و حوادث میں صغیر قلب اور قلت اعتقاد کی وجہ سے ایسے ہی پریشان ہو جاتے ہیں جیسا ایک دہری یا منکر تقدیر پریشان ہوتا ہے۔

صاحبو! اگر تقدیر پر کامل اعتقاد ہے تو اس کا اثر ظاہر میں بھی تو کچھ ہونا چاہیے۔ یاد رکھو محض زبان سے اتنا کہہ دینا تو آسان ہے کہ ہم کو تقدیر پر اعتقاد ہے۔ مگر امتحان کے وقت ہر شخص کی قلمی کھل جاتی ہے اور امتحان کا وقت یہی ہے جب کہ مصائب و حوادث کا نزول ہو رہا ہو اور کسی کی قلمی بھی نہ کھلے۔ تب بھی حق تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہے وہاں تو کوئی حیلہ نہیں چل سکتا ہے

خلق را گیرم کہ بفریے تمام	در غلط اندازی تا ہر خاص و عام
کار با با خلق آری جملہ راست	با خدا تو دیر جیلہ کے رواست
کار با اور راست باید داشتن	راست اخلاص و صدق افزاشتن

صاحبو! جو شخص سچ مح تقدیر کا معتقد ہے اس کو رنج و غم کبھی نہیں ہوتا اور جو کبھی کبھی آپ ان کو مصائب میں دیکھتے ہیں یہ نظر بد سے بچانے کے لئے صورت رنج و غم ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں سے۔

دل ہی گوید از در بخندہ ام
وز نفاق سست افندہ ام
ان کو ان مصائب سے ایسی کلفت ہوتی ہے جیسے مرجوں کو کھانے والوں کو کلفت ہوتی ہے کہ ظاہر میں آنسو جاری ہیں مگر دل میں ہنس رہا ہے اور مرے لے کر کھا رہا ہے ان کو اس میں ایسی لذت آتی ہے کہ سلطنت کے بدلے میں بھی اپنی تنگ نظری اور فقر و فاقہ وغیرہ کو دینا نہیں چاہیے۔

ایک بزرگ کی حکایت چنانچہ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ ایک شہر کے دروازے پر پہنچے۔ دیکھا کہ شہر بپاہ کا دروازہ بند ہے۔ لوگوں سے پوچھا کہ دن میں دروازہ کیوں بند کیا گیا۔ کیا کسی دشمن کا خطرہ ہے؟ لوگوں نے کہا کہ نہیں۔ بلکہ بادشاہ کا باز آگیا ہے۔ اس لئے دروازہ بند کر دیا کہیں دروازہ سے نکل نہ جائے۔ یہ سنکر آپ بہت ہنسے اور سمجھ گئے کہ بادشاہ محض احمق ہے بھلا باز کو دروازہ سے نکلنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو اوپر سے بھی جاسکتا ہے اس کے بعد آپ نے بطور ناز کے حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ سبحان اللہ یہ تو اتنا احمق اور اس کو بادشاہ بنا دیا۔ اور ہم ایسے عاقل اور عارف اور ہماری یہ حالت ہے کہ پیر میں جوتی بھی سالم نہیں، بدن پر کپڑے بھی درست نہیں۔ ان بزرگ کا مقام ادلال کا تھا۔ مگر نازہر وقت نہیں چلتا۔ کیونکہ کبھی وہ بھی ناز کرنے لگتے ہیں، یہ کیا کہ تم ناز کرو۔ اور وہ کبھی نہ کریں۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔ بہت اچھا کیا تم اسی پر راضی ہو کہ اس بادشاہ کی حماقت و جہالت مع سلطنت کے تم کو دے دی جاوے اور تمہاری معرفت و محبت و فقر و تنگدستی و خستہ حالی اس کو دے دی جاوے۔ یہ جواب سن کر وہ بزرگ کانپ اٹھے۔ اور فوراً سجدہ میں گر پڑے کہ میں اس گستاخی سے توبہ کرتا ہوں اور اس تبادل پر ہرگز راضی نہیں۔

تو حضرت وہ ایسا درد ہے کہ اگر کوئی ان کی ظاہری تکلیف کو دیکھ کر ان پر ترس کھائے اور اس سے نجات اور سکون کی دعا کرے کہ خدام کو اس عزم سے نجات دے تو وہ یوں کہتے ہیں کہ مصلحت نیست مرا سیری ازاں آجیات ضاعت اللہ بہ کل زبان عطشی اور کیوں نہ ہو یہ تو محبوب حقیقی کے عاشق ہیں۔ مجنون نے تو ایک ادنیٰ مخلوق کی محبت کے عزم سے بھی نجات نہیں چاہی۔ جب اس کا عشق تشہر ہوا اور سوز و گداز سے کھانا پینا متروک ہو گیا اور دیوانوں کی طرح جنگلوں میں پھرنے لگا۔ تو اس کا باپ اس کو مکہ معظمہ میں لایا اور کہا بیت اللہ کا پردہ بچھ کر خدا سے دعا کر کہ لیلیٰ کی محبت میرے دل سے نکال دے تو اس نے رو کر کہا سہ

یَا رَبِّ لَا تَسْلُبْنِي جَهَنَّمَ أَبَدًا
وَبِرَحْمَةِ اللَّهِ عُبْدًا قَالِ آمِينَ
اور کہا سہ

الْمُهَيَّئْتُ مِنْ كُلِّ الْمَعَاصِي وَلَكِنْ حُبَّ لَيْلَى لَا أُوتِي
تو جب ایک ادنیٰ مخلوق کی محبت میں غم لذیذ ہو جاتا ہے۔ تو حق تعالیٰ کے عشاق کو اگر مصائب میں راحت ہو تو کیا عجب ہے۔ اب اس کو غم کہنا ہی غلط ہے وہ واقع میں غم نہیں محض صورت غم ہے اس کا شریعت مقدسہ پر عمل کرنے والے پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بیمار نہیں ہوتا۔ یا اس کا کوئی عزیز نہیں مرتا۔ یا اس کا دنیاوی نقصان نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ اسے پیش آتا ہے اور اس سے کلفت بھی اس کو ہوتی ہے مگر پریشانی اور حقیقی غم نہیں ہوتا۔ کیونکہ غم کہتے ہیں دل کی گھٹن کو۔ اور کلفت کہتے ہیں الم دکھن کو۔ اہل اللہ کو مصائب میں الم ہوتا ہے مگر گھٹن نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ڈاکٹر تمہارے زخم میں نشتر لگائے۔ اس وقت تم کو الم تو ہوگا مگر رنج و غم نہ ہوگا گو ظاہر میں ہائے بھی کر دے مگر دل اندر سے خوش ہوگا اور اس الم پر راضی ہوگا کیونکہ تم اس نشتر کو حکمت سے موافق سمجھتے اور اپنے لئے نافع و مفید خیال کرتے ہو۔

یہی حال اہل اللہ کا ہے۔ زمانے کی مصائب و حوادث کے ساتھ کہ وہ ان کو عین حکمت اور سرتاپا مصلحت سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہر حال میں خوش ہیں اور یوں کہتے ہیں سہ

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے
عرض جو لوگ شریعت مقدسہ کی تعلیم پر عمل کرنے والے ہیں ان کو غم حقیقی ہوتا ہی نہیں پس
لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝
اس میں تاویل کی ضرورت نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو حقیقی خوف و حزن نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ تقدیر پر پورا ایمان رکھتے ہیں جس کا اثر یہی ہے کہ رنج و غم اور تجویز کی جڑ کٹ جاتی ہے جیسا کہ میں نے ابھی اس سے ثابت کیا تھا۔ لہٰذا لا تأسوا على ما فاتكم ولا تفرحوا بما آتاكم پس قائل تقدیر کو آخرت میں تو خوف و حزن ہو ہی گا نہیں۔ دنیا میں بھی اس کو غم نہیں ہوتا۔ اس لئے لا خوف علیہم ولا هم يحزنون ہر حال میں اپنی حقیقت پر ہے اور جو شخص تقدیر کے اعتقاد سے خالی ہے اس کو دنیا میں غم ہے اور آخرت میں بھی۔ اور جس کا اعتقاد ضعیف ہے وہ آخرت میں تو پٹ چھٹ کر جنت میں پہنچ جائے گا مگر دنیا میں عمر بھر ضرور بے چین رہے گا۔ تو کیا اچھا ہو کہ یہاں بھی راحت ہی ہو اس کا طریقہ یہی ہے کہ اپنے عمل و اعتقاد کو کامل کرو۔ پھر تمہارے لئے دنیا میں بھی چین ہوگی۔

لحم البشري والحيوة والرياء والافخرة۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ہم اس چین کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں ہم کو بے چینی ہی منظور ہے تو یہ شخص قابل خطاب نہیں پھر ہم توجہ جانے کہ یہ لوگ دنیا کی چیزوں سے بھی صبر کر لیتے مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ چار پیسوں سے بھی صبر نہیں اور آخرت کے بارے میں ایسی ہمت ہے کہ وہاں کی راحت اور دنیا کی حیا طیبہ سے صبر ہے اس کا نام صوفیہ کے محاورات میں صبر فرعون ہے۔ مولانا اس کی شکایت فرماتے ہیں

ایک صبت نیست از فرزندوزن صبر چوں داری زرب ذوالمن

اے کہ صبت نیست از دنیا کے صبر چوں داری زخم الما ہدون

(خیر الحیوة و خیر المات ص ۱۱۱)

۵۱۔ روح کو موت نہیں آتی جسم عنصری کو آتی ہے

یاد رکھو موت صرف جسم عنصری کو آتی ہے روح کو موت نہیں آتی بلکہ موت سے صرف اس کا تعلق جسم عنصری سے منقطع ہو جاتا ہے۔ اب اس کے بعد یہ سمجھو کہ لذات سے منقطع ہونے والا کون ہے کیا آپ کے نزدیک یہ بدن ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ روح منتفع و متلذذ ہوتی ہے اور جسم اس کے لئے بمنزلہ آلہ و مرکب کے ہے اور یہ روح موت کے بعد بھی علیٰ حالہ باقی رہتا ہے۔ بلکہ اب اس کی قوت پہلے سے زیادہ ہو جاتی ہے تو موت کے بعد وہ اس عالم کے لذات سے متلذذ ہوتی ہے۔ اور اگر تم یہ سمجھو کہ میری حقیقت تو محض جسم کی ہے۔ تو اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے کوئی گدھا پر سوار ہو کر یوں سمجھے کہ میں گدھا ہوں۔ سو اس کا تو کوئی علاج نہیں صاحب آپ کی حقیقت وہ ہے جس کو آپ ”میں“ تعبیر کرتے ہیں کہ میں نے یہ کیا میں نے وہ کیا۔ اب آپ غور کیجئے کہ اس ”میں“ کا مصداق کیا چیز ہے؟ کیا آنکھ، نازک یا منہ اور ہاتھ پیر کو ”میں“ کا مصداق کہہ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ورنہ چاہیے کہ ان اعضاء کے جاتے رہنے سے انسان ہی جاتا رہے اور غلط ہے۔ رہے اور اعضاء شریفہ اور قوائے شریفہ جیسے قلب اور عقل وغیرہ ممکن ہے کہ آپ ان کو ”میں“ کا مصداق کہیں، مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اس کا مصداق نہیں ہے۔ کیونکہ آپ ان کو اپنی طرف مصاف کرتے ہیں کہ میرا دل کمزور ہو گیا یا میری عقل میں یوں آتا

ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور اضافت علامت مغایرت ہے تو معلوم ہوا کہ یہ بھی آپ کی حقیقت نہیں بلکہ حقیقت آپ کی روح ہے اور گودہاں بھی اضافت ہوتی ہے کہ میری روح مگر چونکہ مستقل دلائل سے ثابت ہے کہ یہ حقیقت ہے اس لئے یہ اضافت مجاز ہے۔ اور دوسرے اعضاء و قویٰ میں کوئی ایسی دلیل نہیں بلکہ خلاف پر دلیل قائم ہے۔ چنانچہ ایک زمانہ میں بچپن میں عقل نہیں ہوتی اور آپ ہوتے ہیں۔ ایک وقت میں یعنی بعد مدت قلب نہ رہے گا اور آپ ہوں گے صاف دلیل ہے کہ آپ کی حقیقت یہ سب چیزیں نہیں۔ اس لئے یہ اضافت حقیقیہ ہے۔

بہر حال آپ کی حقیقت روح ہے اور اس پر موت نہیں آتی بلکہ وہ بجنہ موت کے بعد اپنے حال رہتی ہے اور اب بجائے اس جسم کے جو موت کے بعد فنا اور شکستہ ہو جاتا ہے۔ روح کا مرکب دوسرا جسم بنتا ہے جس کو جسم مثالی کہتے ہیں۔ اب روح اس جسم کے ذریعے سے سارے انتفاعات و تلذذات حاصل کرتی ہے اور یہ جسم مثالی وہ جسم ہے جس کو متکلمین اہل ظاہر روح کہتے ہیں یعنی موت کے وقت جو چیز جسم عنصری سے الگ ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے وہ جسم ہے اور یہ بھی مادی چیز ہے مگر اس کا مادہ لطیف ہے۔ اور اس کو اس جسم عنصری کے ساتھ ایسا حلولی تعلق ہے جیسا جسم تعلیمی کا تعلق جسم طبعی کے ساتھ حکما نے بیان کیا ہے یعنی وہ جسم مقدار اور ہیئت و شکل میں بالکل جسم عنصری کے برابر ہے۔ اور وہ تشبیہ یہی ہے ورنہ جسم تعلیمی تو عرض ہے اور نہ جوہر۔ اور یہ جسم اس وقت یعنی زندگی میں اس کے اندر سرایت کئے ہوئے ہے اور موت کے وقت وہ الگ ہو جاتا ہے یہی جسم مثالی ہے جو موت کے بعد روح حقیقی کا مرکب بنتا ہے اور یہ جسم مثالی گو مادی ہے مگر اس جسم سے زیادہ لطیف و قویٰ ہے اور روح حقیقی جو حقیقت میں انسان ہے وہ مادہ سے بالکل مجرد ہے۔ وہ نہ اس وقت جسم کے اندر ہے نہ موت کے وقت اس سے الگ ہو بلکہ وہ تو محض جسم کی مدبر ہے جواب بھی بدن سے الگ ہی ہے اور اس کی تدبیر کر رہی ہے اور متکلمین نے روح کے مجرد کا انکار کیا ہے مگر اس بارے میں فلاسفہ کا قول راجح ہے دلائل سے قوت انہی کے قول کو ہے اور صوفیہ کا کشف بھی اسی کے موافق ہے کہ روح حقیقی مادہ سے مجرد ہے۔ البتہ فلاسفہ کا اس کو قدیم کہنا جیسا قدماء کا قول ہے یا حادث بعد حدوث البدن کہنا جیسا مشائیین کا قول ہے یہ بالکل غلط اور خلاف نصوص ہے اور متکلمین نے جس چیز کو روح سمجھ کر مادی کہلے وہ دراصل روح حقیقی نہیں بلکہ جسم ہے جو مرکب روح ہے۔ غرض یہ ثابت ثابت ہو گئی کہ انسان میں جو اصل چیز ہے۔ وہ حقیقت میں وہی انسان ہے موت کے بعد وہ اپنے حال پر رہتا ہے اس کی قوت

وصفات میں کچھ کمی نہیں آتی بلکہ پہلے سے کچھ ترقی ہو جاتی ہے۔ اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ گو روح کو موت نہیں آتی مگر جسم سے تو تعلق منقطع ہو جاتا ہے تو جو انتفاعات روح سے تنہا نہیں ہو سکتے تو اب وہ نہ ہو سکیں گے۔ اس کا جواب بھی معلوم ہو گیا کہ موت کے بعد جسم مثالی مرکب بنتا ہے جو اس جسم عضوی سے لطیف اور قوی تر ہے وہ سب لذات سے منتفع ہوتا ہے جس کے مقابلہ میں یہاں کی لذات بیخ ہیں اور روح ان سے متلذذ ہے۔ کھانا بھی۔ پینا بھی، سیر و تماشا بھی، ملاقات احباب بھی، مکانات اور باغات بھی وغیرہ وغیرہ، اس حقیقت کا مراقبہ کر کے موت کا دھیان کرو، تو انشاء اللہ موت سے وحشت نہ ہوگی بلکہ اس کا شوق پیدا ہوگا۔ اور یوں کہو گے۔

خوم آں روز کزین منزل دیراں بردم راحت جاں طلبم وز پے جان بردم
نذر کردم کہ گر آید بسراں غم روزے تادرمیکده شاداں دغزل خواں بردم
(خیر الحیات و خیر المات ص ۳۲ تا ۳۶)

۵۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت آخرت میں کفار کے لئے

ایک رحمت عامہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ اس امت کے اوپر سے سخت عذاب مل گئے ہیں جو پہلی امتوں پر آئے تھے کہ بعض قومیں سور بندر بنادی گئیں۔ جس کا تختہ الٹ گیا۔ کسی پر آسمان سے پتھر برسے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تو برکت ہے کہ اس امت کے کفار پر ایسے عذاب نہیں آتے۔

اور اس رحمت کو عام اس لئے کہا گیا کہ کفار کو بھی شامل ہے جو کہ امت دعوت میں داخل ہیں اب یہاں یہ ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ دنیا میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب کے حق میں رحمت عامہ ہونا ثابت ہو گیا۔ مگر آخرت میں کفار کے لئے آپ کی رحمت کیا ہوگی کیونکہ وہ کفار ستو ابدال آباد کے لئے جہنم میں رہیں گے۔ ان کے حق میں آپ کی رحمت کا ظہور کس طرح ہوگا۔ اسی طرح جن مومنین کی بعد سزا کے مغفرت ہوگی ان کے حق میں آپ کی رحمت کیا ظاہر ہوئی۔

اس کے جواب کے لئے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے اس کے سمجھنے کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کا ظہور کفار کے حق میں آخرت میں بھی ہوگا۔ وہ مقدمہ یہ ہے کہ بھلا اگر کوئی شخص بڑا سخت جرم کرے جس کی سزا میں وہ بیس سال کی سزائے قید کا مستحق ہو اور اس میں سے کچھ تخفیف کر دی جائے تو یہ بھی رحمت ہوگی یا نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص بہت سخت سزا کا مستحق ہو اور اس میں سے کچھ تخفیف کر دی جائے تو یہ بھی رحمت ہوگی یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں میں رحمت میں داخل ہیں۔

اب سمجھئے کہ قیامت کے روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم جن گنہگار مسلمانوں کے لئے جو کہ جہنم میں جائیں سفارش فرمائیں گے۔ اگر یہ شفاعت نہ ہوئی تو ان کی میعاد اور زیادہ ہوئی۔ تو میعاد کی کمی یہ رحمت سے ہوئی۔ کوئی ہزار برس کے عتاب کا مستحق تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش سے اس میں کمی کر دی جاوے۔ مثلاً پانچ سو برس کے بعد وہ جہنم سے نکال دیا جاوے تو رحمت ہونا اس کا ظاہر ہے۔ اور کفار کے حق میں یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میعاد میں کمی کر دی جاوے۔ عذاب تو ان کو ابدال آباد تک ہوگا مگر بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی جو عنقریب آتا ہے عذاب میں تخفیف کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے حق میں بھی شفاعت فرمائیں گے چنانچہ بعض کفار کے لئے حضور کی برکت سے تخفیف عذاب کا ذکر تو صحاح میں بھی آتا ہے کہ صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ابوطالب کو کچھ آپ کی خدمت سے نفع ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں نہ ہوتا ابوطالب سر سے پاؤں تک آگ میں غرق ہوتے۔ مگر میری وجہ سے یہ ہوا کہ ان کو صرف دو جوتیاں آگ کی پہنائی جائیں گی جس سے ان کا بھیجا مثل ہانڈی کے پچے گا اور اسپر بھی یہ سمجھیں گے کہ مجھ سے زیادہ عذاب کسی کو نہیں۔ ابولہب کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ چونکہ انہوں نے حضور کی ولادت شریفہ کی خوشی میں بشارت لانے والی باندی کو آزار دیا تھا۔ ہر پیر کے دن ذرا سا ٹھنڈا پانی پیئے کو مل جاتا ہے۔

بانی عام کفار کے حق میں تخفیف کی شفاعت مجھے کسی کفار کے حق میں سفارش کی نوعیت حدیث سے تو معلوم نہیں ہوئی مگر شیخ عبدالحق محدث رحمۃ اللہ نے اپنی ایک کتاب اشعث اللعات میں لکھا ہے کہ قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت دس طرح کی ہوگی ان میں ایک شفاعت ایسی ہوگی کہ حضور عام کفار کے لئے شفاعت فرمائیں گے کہ یہ لوگ جس عذاب کے مستحق ہیں اس میں کچھ کمی کر دی جاوے۔ چنانچہ آپ کی

برکت سے ان کے عذاب میں کمی کر دی جاوے گی، گو کم ہونے لگے بعد بھی وہ اس قدر سخت ہوگا کہ وہ اس کو بھی بہت سمجھیں گے۔ خدا محفوظ رکھے۔ وہاں تو ذرا سا عذاب بھی ایسا ہوگا کہ ہر شخص یہی سمجھے گا کہ مجھ سے زیادہ عذاب کسی کو نہیں۔ چنانچہ ابوطالب کو حالانکہ بہت ہی کم عذاب ہوگا۔ مگر وہ یہی سمجھیں گے کہ مجھ سے زیادہ کسی کو بھی عذاب نہیں تو گو کفار کو اس کی کا احساس نہ ہو مگر حضور کی طرف سے تو رحمت ہونے میں شک نہیں رہا آپ کی رحمت تو ان کے ساتھ بھی پائی گئی۔ اور چونکہ شیخ حبیب الرحمن رحمہ اللہ بڑے محدث ہیں اس لئے انہوں نے جو یہ دس قسمیں شفاعت کی لکھی ہیں کسی حدیث سے معلوم کر کے لکھی ہوں گی گو ہم کو وہ حدیث نہیں ملی۔ مگر چونکہ شیخ کی نظر حدیث میں بہت وسیع ہے اسلئے ان کا یہ قول قابل تسلیم ہے۔ اور شیخ کے اس قول پر یہ اشکال نہ کیا جاوے کہ یہ نص کے خلاف ہے قرآن میں تو کفار کے بارے میں ارشاد ہے لَا يَخْفَعُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يَنْظُرُونَ کہ کفار سے عذاب کم نہ کیا جاوے گا۔ اور شیخ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے حق میں تخفیف عذاب کی شفاعت فرمائیں گے، دونوں میں تضاد ہی ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ آیت کا یہ مطلب کہ جس قدر عذاب آخرت میں ان کے لئے ہوگا پھر اس سے کمی نہ کی جاوے گی اور یہ اسلئے ارشاد فرمایا گیا تاکہ کوئی آخرت کے عذاب کو دنیا کے عذاب پر قیاس نہ کرے کہ جس طرح دنیا کی آگ کا قاعدہ ہے کہ پہلی پہلی بہت تیزی کے ساتھ بھڑکتی ہے پھر کم ہوتے ہوتے ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ ایسی جہنم کی آگ ہوگی کہ رفتہ رفتہ ہزار ہزار سال کے بعد اس کی تیزی کم ہو جائیگی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہاں کی آگ ایسی نہیں جیسی اول دن میں تیز ہوگی ہمیشہ ایسی ہی رہیگی اور یہ مطلب نہیں ہے کہ جس عذاب کے وہ قانوناً مستحق ہوں گے اسی میں بھی کسی کی شفاعت سے بھی کمی نہ ہوگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس قدر ان کے لئے عذاب طے ہو کر قرار پائے گا۔ وہ ہمیشہ ایک حال پر رہے گا۔ زمانہ دراز گزرنے سے اس میں کمی واقع نہ ہوگی۔ واللہ اعلم

(شکر النعمۃ بذکر رحمۃ الرحمن ص ۵۴ تا ۵۵ ملخصاً)

۵۳۔ مطیع اور غیر مطیع پر مصائب آنے میں

فرق ہے

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ باتیں بیماری مقدمہ وغیرہ نمازیوں کو پیش نہیں آتیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نہ بیماری میں تخصیص نمازی اور غیر نمازی کی ہے نہ مقدمہ میں، نہ اور کسی مصیبت میں میں کہتا ہوں کہ مصائب بیشک پیش آتے ہیں ان کو بھی، اور ان کو بھی، مگر فرق ہے دونوں میں ان کے واسطے مصائب ہر اہل اور ان کے لئے باعث رفعت مراتب اور موجب قرب ہیں۔

اسپر شاید کہا جائے کہ یہ تو دل کے سمجھانے کی بات ہے۔ اور من گھڑت ہے اس کا عکس بھی تو ممکن ہے۔ جب صورتہ دونوں جگہ یکساں ہیں تو وہ بھی اپنا دل اس طرح خوش کر سکتے ہیں کہ مصیبت جو آتی ہے تو کچھ برا نہیں۔ ہمارے درجے بلند ہوں گے۔ جیسے نمازیوں نے اسی طرح دل کو سمجھایا تھا، میں کہتا ہوں واقعیت کسی چیز کی من سمجھوتہ کرنے سے نہیں بدلتی۔ دعویٰ دونوں فریق اس کا کر سکتے ہیں کہ مصیبت ہمارے لئے رحمت ہے لیکن کسی علامت سے امر واقعی کا پتہ چل جائے تو بات طے ہو سکتی ہے کہ حق کس طرح ہے۔ وہ علامت یہ ہے کہ خاصہ ہے کہ مطیع پر جب مصیبت آتی ہے تو اس کو پریشانی نہیں ہوتی اور رحمت کی حقیقت یہی ہے۔ اور مصیبت کی حقیقت پریشانی ہے۔ اس کو کان میں رکھو اور دونوں منظور دیکھ لو۔ ایک یہی واقعہ کہ جس کو مصیبت کہا جاوے نمازی پر یعنی مطیع پر آوے تو اس کا اس کے قلب پر کیا اثر ہوتا ہے اور وہی واقعہ عارضی پر آوے تو کیا ہوتا ہے زمین آسمان کا فرق ملے گا دونوں میں۔ اور ذرا سے غور سے نزاع رفع ہو جاوے گا عامی کا دل ٹوٹ جاتا ہے مصیبت میں اور مطیع کو ڈھارس رہتی ہے۔ کیونکہ اس کے دل کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہے۔ اور عامی کے دل کو خدا تعالیٰ سے تعلق حاصل نہیں۔ تعلق خدا مقوی قلب ہے اور خدا سے تعلق میں یہ اثر کیوں نہ ہو۔ ایک کلکٹر سے جس کو تعلق ہوتا ہے وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ پھر جس کو تعلق خدا سے ہو وہ کیسے ڈرے گا اور اس کا دل کیوں ٹوٹے گا اور عامی کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کا کوئی سہارا ہوتا۔ ڈرتا ڈرتا رہتا ہے۔ یہی تو فرق ہے پولیس اور ڈاکوؤں میں۔ مقابلہ کے وہ میدان میں دونوں موجود ہیں اور مارنے میں دونوں شریک ہیں۔ ظاہری نظر دیکھنے والا کہہ سکتا ہے کہ دونوں فریق ایک مصیبت میں گرفتار ہیں

یہ بھی مر رہے ہیں اور وہ بھی مر رہے ہیں تو کسی کو حق پر اور کسی کو ناحق پر کیسے کہیں گے لیکن ذرا غور کیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پولیس مر ضرور رہی ہے مگر دل ان کے مضبوط ہیں اور ان کو ڈھاکس بندھی ہوئی ہے۔ اور ڈاکو ہمت پولیس سے بھی زیادہ کر رہے ہیں مگر دل اندر سے ٹوٹے ہوئے ہیں اور پاؤں نہیں جمتے۔ اور موقع دیکھتے ہیں کہ اندر سے ٹوٹے ہوئے ہیں یہ اثر اسی کا ہے کہ پولیس مطیع ہے اور حاکم سے تعلق ہے اور ڈاکو عاصی ہے۔ اس کے دل کو کسی کا سہارا نہیں۔ اس مثال سے عاصی اور مطیع کی حالتوں کا فرق بہت وضوح کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے۔ غازی اور مطیع پر جب مصیبت آتی ہے تو وہ صبر سکون کے ساتھ رہتا ہے اور کوئی بیہودہ کلمہ تک اس کے منہ سے نہیں نکلتا۔ اور عاصی پر جب مصیبت آتی ہے تو پوری قیامت ہوتی ہے چیخ پکار اور ردنا پیٹنا چ جاتا ہے زبان سے بیہودہ کلمات بجاتا ہے اور دل میں شکایت ہوتی ہے یہ مصیبت جس کو مصیبت کہنا چاہیے یہ کھلی ہوئی علامت ہے اس بات کی کہ تعلق مع اللہ باقی نہیں۔ اور مطیع کا تعلق باقی ہے جو جسمانی تکلیف ہے۔ اور باق قنار طبعی اس کا احساس کرتا ہے اور رنج پاتا ہے مگر دل اندر سے تازہ ہے۔

ایک پادری نے لکھا ہے کہ مسلمان اپنے خدا سے شرمندہ نہیں ہیں اس واسطے شگفتہ رہتے ہیں۔

عاصی اور مطیع کی حالت میں فرق ضرور ہوتا ہے بلکہ ادنیٰ مسلمان کی حالت میں بھی کافر سے فرق ہوتا ہے کیونکہ تعلق مع اللہ کچھ نہ کچھ ہر مسلمان کو حاصل ہے جس کی وجہ سے اس کی حالت سے ضرور فرق ہوتا ہے کیونکہ تعلق مع اللہ کچھ نہ کچھ ہر مسلمان کو حاصل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی حالت کو اس شخص کی حالت سے ضرور فرق ہوتا ہے جس کو بالکل تعلق نہیں یعنی کافر۔ آپ کو نسبت حق سے ضرور حاصل ہے کو آپ کو خبر نہیں ہے

یک سبد پر ناں ترابر فرق سر توہی جوئی لب ناں در بدر

تا باز افروغ ہستی اندر آب دز عیش و زجوع گشتی خراب

ہماری وہ حالت ہے کہ ساری دولتیں حاصل ہیں۔ مگر عادت ہو گئی ہے بھیک مانگنے کی ان کی طرف توجہ نہیں اور ادھر ادھر ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ عیڑوں کی تقلید کرتے ہیں۔ عقائد میں خیالات میں، معاشرت میں، صاحبو! ہمارے پاس تو اتنی دولتیں ہیں کہ دوسرے ہمیں سے لے گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم ان سے مستمع نہیں ہوتے اور ان سب دولتوں کی اصل تعلق مع اللہ

ہے۔ اگر ہم اس سے کام لیں تو کبھی پریشانی نہ ہو اللہ والا کبھی پریشان نہیں ہوتا۔ دیکھئے سب سے بڑھ کر حادثہ موت کا ہے اور دیگر مصائب جو خوف غم ہیں تو اس وجہ سے ہیں کہ مقدمہ موت ہیں مگر اہل اللہ کی حالت خود موت کے متعلق یہ ہے کہ بجائے پریشانی کے الٹی راحت ہوتی ہے۔ انہوں نے اس کو بھی ایک کھیل سمجھ رکھا ہے جس کے نام سے دنیا بھاگتی پھرتی ہے۔ ایک صاحب موت کی آرزو میں کہتے ہیں کہ

خرم آن روز گزین منزل ویراں بروم راحت جاں طلبم وز پیئے جانا بروم
نذر کردم کہ گر آید بسرا این غم روزے تادریکدہ شاداں دغز لخواں بروم
(الظاہر ص ۲)

۵۴۔ قرآن کریم میں ہر پہلو کی رعایت ہے

قرآن کریم میں ہر پہلو کی ایسی رعایت ہے کہ کسی کلام میں ایسی رعایت نہیں ہے قرآن میں صرف ضابطہ کو پورا نہیں کیا گیا۔ اس مضمون کو آپ سہولت سے یوں سمجھیں گے کہ حکام دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو ضابطہ کے پابند ہیں۔ ضابطہ کی رو سے جو کام ان پر واجب ہے وہ کر دیا اور قانون کے موافق رعایا پر احکام لازم کر دیے ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ دشوار احکام کو قانون سے خارج کریں یا ان کے سہل داسان کرنے کی تدبیر بتائیں۔ دوسرے وہ حکام ہیں جن کو رعایا سے محبت ہوتی ہے اور مخلوق کو راحت پہنچانا چاہتے ہیں اور حتیٰ الامکان قانون میں کوئی دشوار حکم داخل نہیں کرتے اور اگر کسی مصلحت سے کوئی دشوار حکم رکھتے بھی ہیں تو رعایا کو اس کے سہل کرنے کی تدبیر بھی بتلاتے ہیں اور اس بخوبی ان پر قہر ضرور ہوتا ہے۔ مگر یہ شفقت پر مبنی ہے۔ اتنی رعایتیں وہی حاکم کر سکتا ہے جس کو رعایا پر شفقت ہو۔ اسی طرح ایک اور مثال سمجھئے کہ نصیحت کرنے والا ایک تو استاذ ہوتا ہے اور ایک باپ ہوتا ہے باپ کی نصیحت میں عام لوگوں کی نصیحت سے فرق ہوتا ہے۔ استاذ تو ضابطہ پوری کر دیتا مگر باپ ضابطہ پوری نہیں کر سکتا۔ وہ نصیحت کرتے ہوئے اس کا خیال رکھتا ہے کہ بیٹے کو ایسے عنوان اور ایسے طرز سے نصیحت کر دوں جو اس کے دل میں گھر کرے۔ کیونکہ وہ دل سے یہ چاہتا ہے کہ بیٹے کی اصلاح ہو جائے اور اس میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اور اگر وہ کوئی مشکل کام بھی بتلاتا ہے تو اس کا طریقہ وہ

اختیار کرتا ہے جس سے بیٹے کو عمل آسان ہو جاوے۔ اور ان سب رعایتوں کا منشا وہی شفقت ہے۔ شفقت ہی کے ساتھ تمام پہلوؤں کی رعایت کی جا سکتی ہے اور اسی لئے باپ کا کلام نصیحت کے وقت کبھی بے ترتیب بھی ہو جاتا ہے مثلاً باپ بیٹے کو کھانا دیتے ہوئے نصیحت کرے کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس مضمون پر وہ مفصل گفتگو کر رہا ہو۔ اسی درمیان میں اس نے دیکھا کہ بیٹے نے ایک بڑا سالقہ کھانے کو یا ہے تو وہ فوراً نصیحت کو قطع کر کے کہے گا کہ یہ کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے اس کے بعد پھر پہلی باپ پر گفتگو شروع کر دے گا اب جس کو شفقت کی اطلاع نہ ہو وہ کہے گا کہ یہ کیسا بے ترتیب کلام ہے۔ بری صحبت سے منع کرنے میں لقمہ کا کیا ذکر۔ مگر جو شخص کبھی کسی کا باپ بنا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ بے ترتیب کلام مرتب و مرتبط کلام سے افضل ہے۔ شفقت کا مقتضایہ یہی ہے کہ ایک بات کرتے ہوئے اگر دوسری بات کی ضرورت ہو تو ربط کا لحاظ نہ کرے۔ دوسری بات کو بیچ میں رکھ کر پھر پہلی بات کو پورا کرے۔ یہی راز ہے اس کا کہ خدا تعالیٰ کا کلام ظاہر میں کہیں بے ربط بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس ظاہری بے ربطی کا منشا شفقت ہی ہے کہ حق تعالیٰ مصنفین کی طرح گفتگو نہیں کرتے کہ ایک مضمون پر کلام شروع ہو تو دوسرے باپ کا کوئی مضمون اس میں نہ آسکے بلکہ وہ ایک مضمون کو بیان فرماتے ہوئے اگر کسی دوسرے امر پر تنبیہ کی ضرورت دیکھتے ہیں تو شفقت کی وجہ سے درمیان میں فوراً اس پر بھی تنبیہ فرما دیتے ہیں اس کے بعد پھر پہلا مضمون سزاوارع ہو جاتا ہے چنانچہ ایک آیت مجھے یاد آتی ہے جس پر لوگوں نے غیر مرتبط ہونے کا اعتراض کیا ہے۔

قیامت کا حال | سورہ قیامہ میں حق تعالیٰ نے قیامت کا حال بیان فرمایا ہے کہ انسان اس وقت بڑا پریشان ہوگا اور بجھاگئے کا موقعہ ڈھونڈے گا۔ اپنے اعمال پر اُسے اطلاع ہوگی۔ اس روز اس کو سب اگلے پچھلے کئے ہوئے کام سب جتلا دیئے جائیں گے۔ پھر فرماتے ہیں۔ **بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بِصِيرَةٍ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَادٍ يُرَكَّةً** یعنی انسان کا اپنے اعمال سے آگاہ ہونا کچھ اس جتلانے پر موقوف نہ ہوگا۔ بلکہ اس دن انسان اپنے نفس (کے احوال و اعمال) سے خوب واقف ہے (کیونکہ اس وقت حقائق کا انکشاف ضروری ہو جائے گا) اگرچہ وہ (باتقفلے طبیعت) کہتے ہی بہانے بنائیے۔ جیسے کفار کہیں گے واللہ ہم تو مشرک نہ تھے مگر دل میں خود بھی جانیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں۔

عمرض انسان اس روز اپنے سب احوال کو جانتا ہوگا اسلئے یہ جتنا نامحض قطع

جواب اور اتمام حجت اور دھمکی کے لئے ہوگا نہ کہ یاد دہانی کے لئے۔ یہاں تک توقیامت ہی کے لئے متعلق مضمون ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔ لَا تَحْزَنْ بِمَا لِسَانُكَ لِيَتَعَجَّلَ بِهَا إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن نازل ہوتے ہوئے اس کے یاد کرنے کے خیال سے زبان نہ ہلایا کیجئے۔ ہمارے ذمہ ہے آپ کے دل میں قرآن کا جمادینا اور زبان سے پڑھوا لینا۔ تو جب ہم قرآن نازل کریں اس وقت فرشتے کی قرأت کا اتباع کیجئے۔ پھر یہ بھی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ کے قرآن کا مطلب بھی بیان کر دیں گے۔ اس کے بعد پھر قیامت کا مضمون ہے۔ كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَاتِ وَتَذُرُونَ الْآخِرَةَ کہ تم لوگ دنیا کے طالب ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو پھر فرماتے ہیں وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاضِرَةٌ بعضوں کے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے الخ تو لا تَحْزَنْ بِمَا لِسَانُكَ سے اور پھر قیامت کا ذکر ہے اور بعد کو بھی اس کا ذکر ہے اور درمیان میں یہ مضمون ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے جلدی یاد کرنے کے لئے زبان بیان نہ دیا کیجئے۔ لوگ اس مقام کے ربط میں تھک تھک گئے ہیں اور بہت سی توجہات بیان کی ہیں مگر سب میں تکلف ہے اور کسی نے خوب کہا ہے۔

”کلامیکہ محتاج یعنی باشد لا یعنی است“

تو جس کو حق تعالیٰ کے اس تعلق کا علم ہے جو حق تعالیٰ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اس کو آفتاب کی طرح نظر آتا ہے کہ اس کلام کا درمیان میں موقع ہے۔ صاحبو! اس کا دہری موقع ہے جیسے وہ باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس کے مفسد بیان کر رہا تھا کہ درمیان میں بیٹے کو بڑا سالقمہ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا۔ یہ کیا حرکت ہے، لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے تو ظاہر میں لقمہ کا ذکر ترتیب کلام سے بالکل بے ربط ہے۔ لیکن جو باپ ہوا ہو گا وہ جانے کہ نصیحت کرتے کرتے درمیان میں لقمہ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ لڑکے نے بڑا لقمہ لیا تھا باپ نے فرط شفقت سے درمیان کلام میں اس پر بھی تنبیہ کر دی۔

اسی طرح یہاں بھی حق تعالیٰ قیامت کا ذکر فرما رہا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس خیال سے کہ کہیں یہ آیتیں ذہن سے نہ نکل جائیں جلدی جلدی ساتھ پڑھ رہے تھے تو درمیان میں خدا تعالیٰ نے فرط شفقت سے اس کا بھی ذکر فرما دیا کہ آپ یاد کرنے کی فکر نہ کریں یہ کام ہم نے اپنے ذمہ لے

یہ ہے۔ آپ بے فکر ہو کر سنتے رہا کریں۔ قرآن آپ کے دل میں خود بخود محفوظ ہو جائے گا تو اس مضمون کو درمیان میں ذکر فرمانے کی وجہ فرط شفقت ہے اور اس کا مقتضایہ تھا کہ اگر یہاں بالکل بھی ربط نہ ہوتا تو یہ بے ربطی ہزار ربط سے افضل تھی مگر پھر بھی باوجود اس کے ایک مستقل ربط بھی ہے اور یہ خدا کے کلام کا اعجاز ہے کہ جہاں ربط کی ضرورت نہ ہو وہاں بھی کلام میں ربط موجود ہے۔
(سبیل النجاح ص ۱۸۱)

۵۵۔ قرآن پاک کی آیتوں میں باہم ربط ہے اور مفسرین کا بیان درست ہے۔

اسی کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں باوجود طرز تصنیف اختیار نہ کرنے اور شفقت کا طرز اختیار کرنے کے پھر بھی ربط کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اسلئے مفسرین کے بیان کردہ روابط مخرع نہیں ہیں اور اس ربط کو ملحوظ فرمانے کی دلیل یہ ہے کہ احادیث سے ثابت ہے کہ ترتیب نزول آیات اور ہے اور ترتیب تلاوت اور مصحف اور ہے۔ یعنی قرآن کا نزول تو واقعات کے موافق ہوا کہ ایک واقعہ پیش آیا اور اس کے متعلق ایک آیت نازل ہو گئی۔ پھر دوسرا واقعہ پیش آیا تو دوسری آیت نازل ہو گئی و علیٰ ہذا ترتیب نزول تو حسب واقعات ہے اگر تلاوت میں بھی یہی ترتیب رہتی تو واقعی ربط کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ترتیب تلاوت خود جناب باری تعالیٰ عزاسمہ نے بدل دی یعنی حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی آیت کسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئی تو جبریل علیہ السلام حکم خداوندی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہتے کہ آیت کو مثلاً سورہ بقرہ کی فلاں آیت کے بعد رکھا جاوے اور اس کو فلاں آیت کے بعد اور اس کو فلاں سورہ کے ساتھ وحلیٰ لہذا۔

تو مصحف میں ترتیب آیات ترتیب نزول پر نہیں بلکہ اس کی ترتیب حق تعالیٰ نے دوسری رکھی ہے اس سے معلوم ہوا کہ جس آیت کو بھی کسی آیت کے ساتھ ملایا گیا ہے دونوں میں کوئی مستقل ربط اور مناسبت اور تعلق ضرور ہے۔ کیونکہ اب اگر اب بھی دونوں میں کوئی ربط نہ ہوا تو ترتیب نزول کا بدلنا مفید نہ ہوگا۔

(سبیل النجاح ص ۱۸۱)

۵۶۔ تفسیر بالرائے تحریف معنوی ہے۔

آجکل ایک شخص نے سورہ بقرہ کی تفسیر لکھی ہے وہ مفسر اس قابل ہے کہ بقرہ ہی کی طرح ذبح کر دیا جائے۔ ظالم نے تمام عبادات کو سیاسیات پر محمول کیا ہے کہ نماز روزہ سیاسیات کے واسطے ہے نمازیں پریڈ کی تعلیم ہے تاکہ افسر کی اطاعت کرنا آجائے اگر وہ اٹھے تو کہے تو اٹھو بیٹھے تو کہے تو بیٹھو، جھکنے کو کہے تو جھک جاؤ، اسی واسطے نمازیں امام مقرر کیا جاتا ہے تاکہ سب اس کے افعال کی اطاعت و اتباع کریں جس سے پریڈ کے وقت افسر کی اطاعت سہل ہوگی۔ روزہ اس واسطے مشروع ہے تاکہ جنگ میں فاقہ کا تحمل ہو سکے کیونکہ جنگ میں بعض دفعہ کھانے کو نہیں ملتا حج بھی اسی واسطے ہے تاکہ مسلمان سفر کے عادی ہوں اور گھر چھوڑنا ان پر گراں نہ رہے اور احرام بھی اسی واسطے ہے تاکہ ترک زینت کی عادت ہو۔ ایک لنگی ایک چادر میں سردی گرمی کے تحمل کے عادی ہوں وغیرہ وغیرہ گویا کوئی عبادت خدا کی یاد اور عبادت و بندگی کے لئے مشروع نہیں ہوئی۔ بس ساری شریعت میں ملگ گیری و سیاست کی تعلیم ہے۔ یہ اس مقولہ کا مصداق ”کلامیکہ محتاج یعنی باشد لایسنی است۔“

کیونکہ نماز روزہ اور حج سے آج تک یہ مقصود کسی نے نہ سمجھا تھا یہ باتیں فرصت میں بیٹھ کر اس نے گھڑی ہیں۔ اور کھینچ تان کر نصوص کو ان پر منطبق کیا ہے جیسے بعض شعراء نے قرآن کی بعض آیتوں کو کھینچ تان کر اوزان شعر پر منطبق کیا ہے اور اس شخص نے یہ تفسیر لکھ کر گویا مخالفین اسلام کو یہ سبق پڑھایا ہے کہ وہ مسلمان کی نماز روزہ اور حج ذکوۃ کو بھی خطرہ کی نظر سے دیکھیں کیونکہ ان سب میں مقابلہ اعدا کا طریقہ سکھایا جاتا ہے۔ اور یہ نماز نہیں۔ بلکہ چاند ماری ہے مگر مسلمان ہیں کہ اس تفسیر پر پڑیں کیونکہ وہ چکنے کا غر پر چھپی ہوئی ہے اور جلد بھی خوبصورت ہے۔ اور آجکل کتاب کی خوبی اس میں رہ گئی ہے کہ عمدہ چھپی ہوئی ہو ٹائٹل خوبصورت ہو اس لئے بہت لوگ اس کو خریدتے ہیں۔ اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس کے اندر کیا بھرا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک صندوق نقش و نگار سے مزین ہو اور اس کے اندر سانپ بند ہو۔ خریدنے والا اوپر کے نقش و نگار سے فریفتہ ہو کر اسے خریدتا ہے مگر جب کھولے گا اس وقت حقیقت منکشف ہوگی اور میں سچ کہتا ہوں کہ اس مصنف کا دل بھی خود جانتا ہے کہ نماز روزہ حج ذکوۃ

کے جو مقاصد اس تفسیر میں لکھے ہیں وہ قرآن کا مفہوم ہرگز نہیں۔ یہ محض ایجاد بندہ ہے جس سے محض یہ مقصود ہے کہ اس تحریک کی تائید قرآن سے کی جائے جس میں یہ شخص اور اس کی ایک جماعت ایک زمانہ میں پیش پیش تھے۔ قرآن کی تفسیر ہرگز مقصود نہیں تھی بلکہ مخلوق کو دھوکہ دینے کے لئے اس کو قرآن میں ٹھونسا گیا۔ سو یاد رہے۔

خلق را گیرم کہ بضر بی تمام در غلط اندازی تا ہر خاص و عام
کار با با خلق آری جملہ راست با خدا تو دیر و حیلہ کے رواست
یہ ممکن ہے کہ تم ان تادیلوں سے مخلوق کو دھوکہ میں ڈالو۔ مگر خدا کے سامنے یہ تادیلیں نہ چلیں گی۔ اس لئے۔

کار با اور راست باید داشتن رایت اخلاص و صدق افراشتن
تادیل وہ کہ وجود خدا کے سامنے بھی بیان کر سکو۔

(ارضاء لفظی حصہ دوم ص ۳)

۵۷۔ قرآن کریم سے متعلق شبہات دور کر نیکاطریق

شبہات کا یہ علاج نہیں کہ تم اپنی رائے سے ہر شبہ کو دفع کر دو بلکہ اس کا اصل علاج یہ ہے کہ شبہات کے منشاء کا علاج کرو۔ ہر شبہ کو الگ الگ رفع کرنے میں درد سری بھی اور اس سے سلسلہ شبہات کا ختم نہیں ہو سکتا تم منشاء کا علاج کرو انشاء اللہ سب ایک دم سے زائل ہو جائیں گے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے رات کو اندھیرے میں گھر کے اندر چوہے چھپنوں کو دتے پھرتے تھے گھر والا ایک ایک کو پکڑ کر نکالتا تھا مگر وہ پھر سب کے سب اندر آ جاتے تھے۔ ایک عاقل نے کہا کہ میاں یہ سب اندھیرے کی وجہ سے کو دتے پھرتے ہیں۔ تم لیمپ روشن کر دو، یہ سب خود ہی بھاگ جائیں گے پھر کوئی پاس نہ پھٹکے گا۔ چنانچہ لیمپ روشن کیا گیا اور سب کے سب ادھر ادھر اپنے اپنے بل میں گھس گئے۔

اسی طرح یہاں بھی سمجھو کہ یہ دس ادس شبہات جو وحی اور قرآن میں آپ کو پیش آتے ہیں ان کا منشاء ظلمت قلب ہے جس کا علاج یہ ہے کہ قلب میں نور پیدا کر لو پھر ایک شبہ بھی پاس نہ آئے گا اور وہ نور کیلئے ہے نور محبت ہے۔ حضرت! محبت و عشق وہ چیز ہے کہ جب یہ دل میں گھس جاتی ہے

تو پھر محبوب کے کسی حکم اور کسی قول و فعل میں کوئی شبہ اور کوئی وسوسہ پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ایک فرد فیسر فلسفی کسی طوائف پر عاشق ہو جاوے اور وہ اس سے یوں کہے کہ سر بازار پر کڑے اتار کر ننگے آؤ تو میں تم سے بات کروں گی ورنہ نہیں تو فلسفی صاحب فوراً اس کے لئے تیار ہو جائیں گے اور یہ بھی نہ پوچھیں گے کہ بی، اس میں تیری کیا مصلحت ہے؟ اب کوئی اس سے پوچھے کہ آپ کی وہ عقل اور فلسفیت اس طوائف کے سامنے کہاں چلی گئی۔ افسوس قرآن و حدیث کے مقابلے میں تو ساری فلسفیت و عقل ختم کی جاتی ہے اور ایک ادنیٰ مردار کے احکام میں چون و چرا اور لم و کیف سب رخصت ہو گیا۔ آخر اس کی کیا وجہ؟ یقیناً آپ یہی کہیں گے کہ اس کی وجہ محبت و عشق ہے۔

پس معلوم ہو گیا کہ خدا اور رسول کے احکام میں شبہات پیدا ہونے کی وجہ عدم محبت یا قلت محبت ہے اگر آپ کے دل میں نور محبت روشن ہوتا تو یہ سارے چوہے اور چھپنوں کو خود بخود بھاگ جاتے شیخ سعدیؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

ترا عشق ہمچو خودی ز آب و گل رباید ہم صبر و آرام دل۔
اور جب ایک مخلوق عشق کا یہ اثر ہے تو خالق کے عشق کا اثر کیا کچھ ہونا چاہیے۔
عجب داری از سالکان طریق کہ باشند در بحر معنی عزیزی۔
دما دم شراب الم در کشند دگر تلخ بیند دم در کشند۔

مولانا فرماتے ہیں۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود گوئے گشتن بہر ادا دلیٰ بود۔

اور میں علماء کو بھی متنبہ کرتا ہوں کہ علماء کے عرفی اخلاق ہی نے عوام کو خراب کیا ہے کہ جہاں ان کے سامنے کسی نے شبہات بیان کئے اور یہ ہر شبہ کے مفصل جواب کو تیار ہو گئے۔ ارے اصلی جواب یہ ہے کہ مرض کو تشخیص کرو اور جڑ کو اکھاڑو تم شانوں چھانٹتے ہو اس سے کیا ہوگا ہے جب جڑ موجود ہے تو چند روز میں ہزاروں نئے نئے پتے اور نکل آئیں گے۔ محقق تشخیص کر کے اصل مرض کا علاج کرتا ہے اور غیر محقق آثار کا علاج کرتا ہے میں نہایت پختگی سے دعوے کیساتھ کہتا ہوں کہ جن مسلمانوں کو آجکل مذہب میں شکوک و ادھام پیدا ہوتے ہیں ان کے اس مرض کا منشاء قلت محبت مع اللہ ہے ان کو اللہ رسول کے ساتھ محبت نہیں ہے اور محض برائے نام تعلق کو تعلق کہا جاتا ہے۔ اور تعلق مع اللہ کے حاصل ہونے کا واحد طریق صرف یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت حاصل کی جائے۔ اہل محبت کی صحبت میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے بہت جلد محبت پیدا ہو جاتی ہے

جیسا کہ اہل غفلت کی صحبت سے غفلت جلدی پیدا ہوتی ہے پھر جب محبت اور تعلق مع اللہ حاصل ہو جائے گا۔ یہ لم دکیف باطل اور وسوسہ و شبہات سب جاتے رہیں گے۔
میں علماء سے خیر خواہی کے ساتھ کہتا ہوں کہ تم ان شبہات کے جواب میں کیوں اپنا دماغ ٹھکانے ہو۔ بس تم صرف ایک کام کرو کہ ان لوگوں کو اہل اللہ کی صحبت و محبت کا پتہ دو۔
(غایۃ البیاض ص ۵)

۵۸۔ وجود صانع کی عقلی دلیل۔

فلسفی طریقہ پر وجود صانع کی دلیل یہ ہے کہ تمام عالم حادث ہے۔ کیونکہ بہت سی چیزوں کا حادث تو ہم کو مشاہد ہے اور جن کا حادث مشاہد نہیں ہوا ان کے احوال کا تغیر و انقلاب بتلا رہا ہے کہ یہ حادث ہیں۔ کیونکہ محل حادث کا حادث ہوتا ہے۔
ابھی میں نے اخبار میں ایک امریکن ڈاکٹر ماہر سائنس کا قول پڑھا ہے کہ وہ لکھتا ہے کہ آفتاب کی روشنی میں بہت کمی آگئی ہے اور عنقریب اس کی روشنی نہ اٹل ہو کر یہ چراغ گل ہو جائے گا اور اس وقت دنیا میں اس قدر سردی پڑے گی کہ مخلوق کا زندہ رہنا محال رہے گا تمام عالم فنا ہو جائے گا۔
دہم اس خبر سے خوش ہوئے کہ اہل سائنس کو قرآن سے قیامت کی خبر کا یقین نہ ہوا تھا تو اب آلات رصد سے یقین آنے لگا۔

غرض اشیاء عالم کا تغیر و انقلاب پتہ دے رہا ہے کہ یہ سب حادث ہیں۔ قدیم نہیں۔ یعنی ان کا وجود دائمی اور ضروری نہیں۔ اور حادث کے لئے ممکن ہونا لازم ہے اور ممکن کے لئے کسی مرجح کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ممکن وہ ہے جس کا وجود و عدم سادی ہو۔ یعنی نہ اس کے لئے موجود ہونا ضروری ہے نہ معدوم ہونا ضروری ہے اور جس کا وجود، عدم وجود برابر ہو تو اس کے وجود کے لئے کوئی مرجح ہونا چاہیے۔ ورنہ ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی اور ترجیح بلا مرجح باطل ہے۔

پھر اس مرجح میں گفتگو کی جائے گی کہ وہ ممکن ہے یا کچھ اور ہے اگر مرجح ممکن ہو تو اس کے لئے دوسرے مرجح کی ضرورت ہوگی اور چونکہ تسلسل محال ہے اس لئے کہیں نہ کہیں سلسلہ ختم کرنا پڑے گا۔ اور یہ ماننا پڑے گا کہ مرجح ایسی ذات ہے جو ممکن نہیں بلکہ واجب الوجود ہے اسی واجب الوجود کو ہم صانع اور خلاق عالم کہتے ہیں اس ایک سوال یہ ہوگا کہ صانع کے ماننے کے بعد بھی ترجیح

بلا مرجح لازم آتی ہے کیونکہ صانع نے تمام مخلوقات کو ایک دم سے پیدا نہیں کیا۔ کسی کو آج سے ہزار برس پہلے سو برس پہلے پیدا کیا۔ اور کسی کو بعد میں پیدا کرے گا اور کسی کو حسین بنایا کسی کو بد شکل۔ کسی کو مرد کسی کو عورت۔ کسی کو امیر کسی کو غریب، کسی کو عاقل کسی کو احمق۔ تو یہاں مرجح کون ہے؟ زید کو آج کیوں پیدا کیا۔ کل کیوں نہیں کیا تھا؟ اور اس کو امیر کیوں بنایا عمر کی طرح غریب کیوں نہ بنایا۔ زید کو عمرو پر کیا ترجیح تھی؟ مثلاً اس سوال کا جواب حکماء اسلام کے سوا کوئی نہ دے سکا۔ فلاسفہ کی عقلیں یہاں اگر چکر کھانے لگیں۔ حکماء اسلام نے اس کا جواب دیا ہے کہ ان امور میں ارادہ واجب مرجح ہے اور ارادہ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنی ذات سے مرجح ہے اس کے لئے کسی دوسرے مرجح کی ضرورت نہیں۔ اس پر حکماء یونان کی طرف سے ان کے معتمدوں نے یہ اشکال دار کیا ہے کہ بیشک یہ تو ہم نے مان لیا ہے کہ ارادہ کے لئے کسی مرجح کی ضرورت نہیں وہ خود اپنی ذات سے مرجح ہے۔ مگر یقیناً خدا تعالیٰ کا ارادہ قدیم ہے پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ارادہ تو قدیم اور مراد حادث ہو۔ اس صورت میں تخلف مراد کا ارادہ سے لازم آتا ہے اور یہ محال ہے۔

اس کا جواب حکماء اسلام نے ایسا دیا ہے کہ حکماء یونان کے ایک اعتراض کا جواب | دانت کھٹے ہو گئے۔ فرمایا کہ صفات واجب اپنی ذات میں قدیم ہیں مگر ان کا تعلق ممکنات کے حادث ہے اور تخلف مراد کا تعلق ارادہ کے بعد محال ہے اس سے پہلے محال نہیں۔ پس ہم یہی کہیں گے کہ ارادہ کا تعلق مختلف طور سے ہوتا ہے۔ اس لئے مراد کا وجود بھی مختلف ازمینہ اور مختلف حالات کے ساتھ ہوتا ہے۔

یہ عقلی دلیل ہے وجود صانع کی۔ (غایت البیاض ص ۲۱، ۲۲)

۵۹۔ عہد میثاق پر شبہ کا جواب۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کو اس عہد کی کیفیت بیشک یاد نہیں رہی لیکن اس کا مقصد سب کو یاد ہے اور مطلوب مقصود ہی کا یاد ہونا ہے۔ کیفیت تعلیم و تعلم کا یاد رہنا ضروری نہیں۔ دیکھو جن لوگوں نے کبھی فارسی پڑھی ہے ان کو یہ محفوظ ہے کہ آمدن کے معنی آنا ہیں کیونکہ آمدنی کا سبق آج کل ہر شخص کو یاد ہے لیکن آپ ان سے یہ پوچھیں کہ آمدن کے معنی آپ کو کس دن اور کس جگہ پڑھائے گئے اور آمد نامہ آپ نے کون سے استاد سے پڑھا ہے۔ تو ان سوالات کا جواب

شاید ہزار میں ایک ہی آدمی دے سکے گا۔ کیونکہ باتیں کسی کو محفوظ نہیں رہتی تو کیا ان کے زیادہ سے یہ کہا جائے گا کہ آمدنا پڑھنا فضول اور بیکار کیا۔ ہرگز نہیں بلکہ ہر شخص یہ کہے گا کہ آمدنا مہر پڑھنے سے صرف مقصود یہ تھا کہ اس کا مضمون یاد رہے۔ کیفیت تعلیم و تعلیم کا یاد رہنا مقصود نہ تھا۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ میثاق الست سے مقصود یہ تھا کہ وجود صانع اور توحید صانع کا مضمون طبائع میں مرکوز ہو جائے کیفیت تعلیم کا محفوظ ہونا مقصود نہ تھا۔ سو بھلا اللہ وجود اور توحید صانع فطرۃ ہر شخص کے دل میں مرکوز ہے اسی کا یہ اثر ہے کہ مصنوعات کو دیکھ کر ایک جاہل بدوی بھی صانع کے وجود پر استدلال کرتا ہے۔ اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ آمدنا مہر کی جو تم نے مثال دی ہے تو وہاں ہزار میں ایک آدمی تو ایسا نکلے جس کو کیفیت تعلیم بھی یاد ہوتی ہے چنانچہ بعض قوی الکافظ اب بھی بتلا سکتے ہیں کہ ہم نے آمدنا مہر سے پڑھا تھا اور کس مکان میں پڑھایا تھا۔ مگر میثاق الست کی کیفیت یاد رکھنے والا تو کسی ہزار میں بھی ایک نہیں ملتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ اپنے اوپر قیاس نہ کیجئے یہاں بھی بعض قوی الکافظ ایسے موجود ہیں جن کو اس عہد کی کیفیت اب تک یاد ہے۔ چنانچہ شیخ سعدی اس طرف اشارہ بھی فرماتے ہیں

الست اذ ازل ہجناں شاں بگو شش
بفریاد قالا بلی در خسرو شش

اس میں تو اجمالاً بتلایا گیا ہے کہ اس عہد کے یاد رکھنے والے اب موجود ہیں۔ اور بعض بزرگوں کے کلام میں اس سے زیادہ تفصیل موجود ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ہم کو یاد ہے کہ اس وقت ہماری دائیں طرف اور بائیں طرف فلاں تھا۔ اور انھیں بزرگوں کے کشف سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس وقت صف بستہ نہ تھیں۔ بلکہ یوں ہی گڈ جمع تھیں جیسے میلے میں اجتماع ہوا کرتا ہے پھر اس وقت جو لوگ باہم رد و رد ہو گئے ان میں تو طرفین سے محبت ہوتی ہے اور جو لوگ رد و درپشت ہوئے کہ ایک کا منہ دوسرے کی پشت طرف تھا ان میں ایک طرف سے محبت اور ایک طرف سے اغراض ہوتا ہے اور جو پشت در پشت ہوئے ان میں طرفین سے انقباض و اغراض ہوتا ہے۔ اور ان بزرگ کے مذاق پر اس حدیث کا یہی محل ہے الادراج جنود مجتہدۃ فما تعرف منها مختلف وتناسک منها ماختلف ایک اور بزرگ ارشاد ہے کہ جس وقت ازل میں میثاق لیا گیا تو سب ارواح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ یکے لگیں جو آپ کہیں گے وہی سب کہیں گے چنانچہ سب سے پہلے حضور اقدس و سرور دو عالم (فداہ ابا نسا و امہاتنا) کی زبان مبارک سے بلی نکلا تو آپ کے

بعد سب نے بلی کہا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ کما یحب ویرضی) تو حضرت! آپ کو سب کو اپنے اوپر قیاس نہ کیجئے۔ اس امت میں ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جو جنت اور دوزخ کی پیمائش تک کر کے ہیں کہ جنت کتنی بڑی ہے اس کے کتنے درجے ہیں۔ اسی طرح دوزخ کی تفصیل سیر کی اور پیمائش بھی کر لی۔ اور یہ سیر روحانی طریقہ پر تھی۔ (غایۃ النجاح ص ۱۸ تا ۲۰)

۶۰۔ مال تدبیر سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ تقدیر سے حاصل ہوتا ہے

اگر کوئی یہ سمجھے کہ یہ تو میری تدبیر و سلیقہ سے حاصل ہوتا ہے جیسا کہ فارون نے کہا تھا قَالَ (مَتَّالًا وَتَوْتِیْتُ) حکلی اعلم عیندی تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان تدبیروں کو راست کس نے کیا کیونکہ بہت لوگ تم سے زیادہ تدبیریں کرتے ہیں مگر ان کو خاک بھی نہیں ملتا۔ دو طالع سلم بی، اے کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور بعض دفعہ اساتذہ اور سب طلبہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان دونوں میں زید زیادہ لائق ہے اور وہ نمبر اول میں پاس ہوتا ہے مگر نتیجہ امتحان اس کے خلاف ظاہر ہوتا ہے کہ زید فیصل ہو جاتا ہے اور عمرو جو اس سے کم درجہ میں ہے پاس ہو جاتا ہے۔ بتلائیے عمرو کی تدبیر کو کس نے راست کیا اور زید کو کس نے ناکام کیا اگر تدبیر ہی مدار تھا تو زید کو نمبر اول ہونا چاہیے تھا مگر مشاہدہ بارہا اس کے خلاف ہوتا ہے اسی طرح دو شخص تجارت کرتے ہیں جن میں ایک تسلیم یافتہ اور ہوشیار ہے۔ دوسرا بے قوت جاہل ہے تدبیر کا مقتضایہ تھا کہ تعلیم یافتہ کی تجارت بیوقوف سے زیادہ چلتی مگر مشاہدہ بارہا اس کے خلاف ہوتا ہے کہ جاہل کی تجارت بڑھ جاتی ہے اور ہوشیار تعلیم یافتہ کو نقصان بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ غور کریں گے تو زراعت اور ملازمت وغیرہ تمام امور میں ایسی صد ہا نظائر دیکھیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محض تدبیر کافی نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ تدبیر راست بھی ہو جائے اور یہ بات سوائے خدا کے کسی کے قبضہ میں نہیں ورنہ اپنی تدبیر کا راست ہونا کون نہیں چاہتا۔ پھر سب کے سب مقصود میں کامیاب ہی ہو کر تے ناکام کوئی نہ رہتا۔ حالانکہ مشاہدہ یہ ہے کہ سو تدبیر کرنے والوں میں میں میں کامیاب ہوتے ہیں اور زیادہ ناکام ہوتے ہیں اب اگر یہ کامیاب ہونے والے اپنی کامیابی کو تدبیر کا ثمرہ سمجھیں تو یہ محض ان کی حماقت ہے۔ ان کو سوچنا چاہیے کہ

تدبیر تو وہ لوگ بھی کر رہے تھے جو ناکام ہوئے پھر اس کی کیا وجہ کہ وہ ناکام ہوئے اور ہم کامیاب ہو گئے یہ سب گفتگو ان لوگوں کے واسطے ہے جو سائنس کے معتقد ہیں ورنہ مسلمان تو سب کے سب یہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ محض تدبیر موثر نہیں بلکہ تدبیر کے راست ہونے کے لئے تقدیر کی موافقت بھی شرط ہے اور تقدیر مشیت الہیہ کا نام ہے۔

اہل سائنس کی ایجاد اہل سائنس ناز کرتے ہیں کہ ہم نے ایسی ایسی چیزیں ایجاد کی ہیں جن کی پہلے لوگوں کو خبر بھی نہ تھی میں کہتا ہوں اگر حقیقت میں تم ہی موجد ہو تو بتلاؤ کہ جس ایجاد کو تم نے ایک سال کے غور و فکر کے بعد ظاہر کیا ہے اس میں ایک سال کیوں لگا اگر تمہارے قبضے میں سب کام تھا تو ایک ہی دن میں ایجاد کر لی ہوتی اور یہی ایک کیا بلکہ جو چیز ایجاد کرنا چاہو ایک دن بلکہ ایک ساعت بلکہ ایک منٹ میں ایجاد کر لیا کرو۔ کیونکہ سب کام تمہارے لئے ہیں پھر دیر کی کیا وجہ؟ مگر ظاہر ہے کہ یہ بات کسی کے قبضے میں نہیں کہ جب چاہے جو کچھ چاہے ایجاد کر لے مگر زمانہ دراز تک غور و فکر کرنے کے بعد ایجاد سمجھ میں آتی ہے اب بتلاؤ جس وقت بات سمجھ میں آتی ہے وہ تمہارے اختیار سے سمجھ میں آتی یا بلا اختیار خود بخود دل میں آگئی؟ اگر کو اختیار سے سمجھ میں آتی تو اختیار تو ایک سال پہلے بھی موجود تھا اس وقت کیوں نہ سمجھ لیا۔ یقیناً کہو گے کہ دفعۃً بلا اختیار سمجھ میں آئی ہے۔ بس یہی تقدیر ہے اور حق تعالیٰ ہی کے سمجھانے سے تمہارے ذہن میں یہ ایجاد آئی ہے کیونکہ ان کی عادت ہے کہ جب انسان کسی کام کے لئے کوشش کرتا ہے اور اپنی سی کوشش صرف کر دیتا ہے تو وہ امداد فرماتے ہیں۔

بہر حال پر کسی کام نہ نہیں کہ اپنے مال و متاع کو اپنی تدابیر کا نتیجہ اور عقل کا ثمرہ سمجھے۔ ہر شخص کو عاجز و لاچار ہو کر ماننا پڑے گا کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ دوسرے کا دیا ہوا ہے یعنی حق تعالیٰ کا۔ اب فرمائیے اگر آپ خدا کا دیا ہوا مال اللہ کے راستے میں تھوڑا سا صرف کر دیں اور اس کے بعد آپ کو ثواب اور نعمت عظمیٰ عطا کی جائے تو یہ نعمت مفت ملی یا نہیں؟ یقیناً مفت ملی۔

(مظاہر اللہ مولیٰ ص ۱۳)

۶۱۔ اسلام نے سادگی سکھائی ہے !!!

غیر قوموں کے طریقہ پر چلنے کی تم کو کچھ ضرورت نہیں۔ بلکہ اسی سادگی کے طریقہ پر چلو جو اسلام نے ہم کو سکھایا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس شام سے لشکر اسلام نے ایک عرضداشت بھیجی تھی کہ بیت المقدس فتح نہیں ہوتا۔ اور وہاں کا پادری یہ کہتا ہے کہ فاتح بیت المقدس کا حلیہ ہماری کتاب میں موجود ہے۔ تم اپنے خلیفہ کو بلا لو ہم دیکھ لیں گے اگر ان کا حلیہ ہوگا جو اس کتاب میں ہے تو ہم بدون لڑائی کے قلعہ کھول دیں گے ورنہ تم قیامت تک فتح نہیں کر سکتے۔ اسلئے ہم چاہتے ہیں کہ امیر المؤمنین یہاں تشریف لے آئیں شاید یہ قلعہ بدون لڑائی کے فتح ہا ہو جائے۔ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے اس درخواست پر سفر کا ارادہ فرمایا اب غور فرمائیے کہ ایک شخص کا دورہ تھا جس کے نام سے کسریٰ اور ہر قل بھی پھرتے تھے۔ مگر حالت یہ تھی کہ جس قیص میں آپ نے سفر کیا تھا اس میں چند در چند پوند تھے اور سواری کے لئے صرف ایک اونٹ تھا اس سے زیادہ کچھ نہ تھا جس پر کبھی آپ سوار ہوتے کبھی آپ کا غلام۔ آج کل ادنیٰ سے ادنیٰ ڈپٹی کے دورے پر بڑا سامان ہوتا ہے۔ یہاں خلیفہ اعظم کے دورے میں کچھ بھی سامان نہ تھا۔ پھر آج کل ادنیٰ حاکم کے دورے میں رعایا پریشان ہو جاتی ہے کیونکہ رعایا کو ان کے دورہ کیلئے رسد کا سامان کرنا پڑتا ہے۔ یہاں خلیفہ کے دورہ سے ایک متنفس کو بھی تکلیف نہ ہوتی۔ کیونکہ ہر شخص کے ساتھ ایک تھیلے میں ستوا اور ایک تھیلے میں چھوہارے بندھے ہوئے تھے منزل پر اتار کر ستو گھونٹ کر پی لیا اور چھوہارے کھائے۔ نہ رعایا سے مرغ لئے نہ انڈے نہ دودھ لیا نہ گھی۔ جب اس شان سے کبھی سوار کبھی پیدل چلتے ہوئے شام کے قریب پہنچے تو لشکر اسلام نے استقبال کرنا چاہا۔ اپنے مانفت کر دی۔ خاص خاص حضرات نے آپ کا استقبال کیا۔ اس وقت بعض صحابہ نے کہا کہ امیر المؤمنین اس وقت آپ دشمن کے ملک میں ہیں اور وہ لوگ آپ کو دیکھیں گے اسلئے مناسب ہے کہ اپنا یہ قیص اتار کر دوسرا قیص عمدہ سا پہن لیجئے اور اونٹ کی سواری چھوڑ کر گھوڑے پر سوار ہو جائیے تاکہ ان کی نظر میں عزت ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا نحن قوم لا نبالہ للسلام ہم وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے اسلام سے عزت دی ہے ہماری عزت قیمتی لباس سے نہیں ہے بلکہ خدا کی اطاعت سے عزت ہے مگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے اصرار سے ان کا دل خوش کرنے کے لئے درخت

منظور کر لی چنانچہ ایک عمدہ قمیص لایا گیا جس کو پہن کر آپ گھوڑے پر سوار ہوئے دو چار ہی قدم چلے تھے کہ فوراً گھوڑے سے اتر پڑے اور فرمایا۔ میرے دوستو! تم اپنے بھائی عمر کو ہلاک ہی کرنا چاہا تھا واللہ میں دیکھتا ہوں کہ اس لباس اور اس سواری سے میرا دل بگڑنے لگا ہے تم میرا وہی پیوند لگا قمیص اور اونٹ لے آؤ میں اسی لباس میں اپنے اونٹ پر سوار ہو کر چلوں گا۔

اے صاحبو! جب ایسے شخص کا دل قیمتی لباس سے بگڑ رہا ہے تو ہمارا دل اور ہمارا منہ نہ بگڑے گا۔ پھر ہم اپنے قلب کی نگہداشت سے اتنے غافل کیوں ہیں۔ اور ہم کو کس چیز نے مطمئن کر دیا ہے کہ ہمارے لئے کوئی لباس مضر نہیں۔ اور جو حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا۔ نحن قوم اخذوا قبی بات یہی ہے کہ اگر ہم خدا کے مطیع و فرمانبردار ہیں تو ہم سادہ لباس میں بھی محرز ہیں ورنہ قیمتی لباس سے بھی کچھ عزت نہیں ہو سکتی۔

سے زعشق ناتمام با جمال یار استغنی است !

باب درنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا

خوبصورت چہرہ کو زیب و زینت کی ضرورت نہیں وہ تو ہر لباس میں حسین ہے۔ بناوٹ کی احتیاج اس کو ہے جس کو قدرتی حسن نصیب نہ ہو۔ چنانچہ حضرت عمرؓ پناہی لباس پہن کر چلے اور اونٹ ہی پر سوار ہوئے اور اسی لباس اور سواری پر آپ کو دیکھ کر قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ کیونکہ جب آپ فصیل شہر کے قریب پہنچے اور نصاریٰ کو اطلاع ہوئی کہ خلیفہ اسلام تشریف لے آئے تو ان کا بڑا پادری فصیل پر آیا اور کتاب کھولی کہ حضرت عمرؓ رضی اللہ عنہ کے حلیہ کو ان اوصاف میں ملانے لگا جو کتاب میں لکھے ہوئے تھے اس میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ حضرت عمرؓ رضی اللہ عنہ ایسے لباس اور اسی سواری پر تشریف لادیں گے اس معمولی لباس ہی میں آپ کی عزت مخفی تھی۔

ع کہ آب چشمہ حیوان درون تاریکی است

اگر آپ قیمتی لباس میں آئے تو پیشین گوئی پوری نہ ہوتی۔ چنانچہ پادری نے جب سارے اوصاف کتاب کے موافق دیکھ لئے تو وہ چیخ مار کر گر پڑا اور کہا کہ جلدی سے قلعہ کا دروازہ کھلو۔ (بخدا یہی وہ شخص ہے جس کا لقب توراۃ میں حدید ہے) یہی فارح بیت المقدس ہے تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے بدون جنگ و جدال کے بیت المقدس کو فتح کر دیا۔

تو صاحبو! ہمیں تکلیف اور بناوٹ کی ضرورت نہیں۔ ہماری مولانا گنج مراد آبادیؒ عزت تو سادگی ہی میں ہے۔ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادیؒ اسی زمانہ میں ایک بزرگ ہوئے ہیں۔ آپ سے لفٹنٹ گورنر نے ملنے کی اجازت

چاہی۔ یہاں سے اجازت ہو گئی۔ اس وقت تو آپ یہ تذکرہ کر رہے تھے کہ لفٹنٹ گورنر کے واسطے سونے کی کرسی ہم کہاں سے لائیں گے۔ خدام نے عرض کیا کہ اس کی حاجت نہیں وہ چوبی کرسی پر بیٹھ سکتے ہیں چونکہ لفٹنٹ گورنر اس وقت یہاں ہو کر آرہے تھے اور یہاں کی مدارت اس کے مذاق کے موافق ہوتی ہے اسلئے یہ خیال ہوا مگر یہ سارے منصوبے پہلے ہی پہلے تھے۔ وقت پر کچھ بھی اہتمام نہیں کیا گیا بلکہ آپ کو یہ بھی یاد رہا کہ لفٹنٹ گورنر کس دن آئیں گے چنانچہ جب دن آیا اور لفٹنٹ گورنر حضرت کی خانقاہ میں پہنچے تو وہاں کوئی تکلف نہ تھا۔ سب معمولی سامان تھا۔ بعد ملاقات لفٹنٹ گورنر نے کہا کہ حضرت ہمیں کچھ نصیحت و وصیت فرمائیں۔ ارشاد فرمایا ظلم کبھی نہ کرنا۔ پھر اس نے درخواست کی کہ ہم کو کچھ تبرک عطا فرما دیا جاوے۔ فرمایا میرے پاس کیا رکھا ہے۔ پھر خادم سے فرمایا کہ ارے دیکھنا، مٹھائی کی ہنڈیا میں۔ کچھ ہو تو ان کو دے دو۔ یہ مانگ رہے ہیں چنانچہ ہنڈیا میں سے مٹھائی کا چورا تھوڑا تھوڑا سب کو دے دیا گیا جس کو سب نے نہایت ادب سے لیا اور بڑے خوش خوش واپس ہوئے۔

تو دیکھئے مولانا کو اول تو اس زمانہ کے لحاظ سے کچھ تکلف کا خیال ہوا بھی تھا۔ مگر آخر میں یہ سارے منصوبہ مٹ گئے۔ اور وہی اسلامی سادگی رہ گئی اور اسی میں ان کی عظمت و عزت ظاہر ہوئی۔

نہ کچھ شوخی چلی باد صبا کی !! بگڑنے میں بھی زلف ان کی بنا کی غرض ہم کو اسلامی سادگی پر رہنا چاہیے اگر کسی مسلمان کی خاطر سے کچھ تکلف بھی کیا جائے بے تکلفی تو اس میں بھی اعتدال اسلامی کا لحاظ ضروری ہے۔ مبالغہ نہ کیا جائے اس میں ہماری عزت ہے۔ مگر آج کل مسلمان تقلید یورپ میں اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ ان کا لباس اور ان کا طرز معاشرت ان کا طریقہ تمدن و تجارت اختیار کر کے ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ میں کس کچھ کہتا ہوں کہ اس میں مسلمان کی عزت نہیں۔

ایک واقعہ ایک باریں بریلی میں تھا۔ بھائی سے ایجنٹ نے کہا کہ ہم آپ کے بھائی سے ملنا چاہتے ہیں۔ بھائی نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا۔ ہم خود تو حکام سے نہیں ملتے لیکن جب وہ خود ملنا چاہتے ہیں تو اعراض کرنا برا ہے۔ آخر وہ حاکم ہیں۔ ہم کو حق حکومت کا لحاظ ضروری ہے میں چلوں گا۔ بھائی نے میرے واسطے قیمتی لباس کا اہتمام کرنا چاہا میں نے کہا ہرگز نہیں۔ جس لباس میں میں یہاں آیا ہوں۔ اسی میں جاؤں گا۔ چنانچہ میں اچکن اور کرت میں

ان سے ملنے گیا وہ شاید غسل کر رہے تھے۔ ہم کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے عصر کی نماز کا وقت آگیا۔ اور میں نے اور بھائی نے ان کے بنگلہ ہی میں نماز پڑھی۔ پھر وہ آکر ملے اور مجھ کو اپنی خاص کرسی پر بیٹھایا اور خود ایک معمولی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے اصرار بھی کیا مگر نہیں مانے۔ پھر نہایت احترام کے ساتھ باتیں کیں۔ اور حقوڑی دیر میں رخصت ہو کر آگئے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میں انگریزی لباس میں ملتا تو وہ عزت ہرگز نہ ہوتی جو اسلامی لباس میں ہوئی۔

کلکتہ میں مولوی عبد الجبار صاحب دائرہ سے عبا اور چوغہ پہن کر اور عمامہ باندھ کر ملے دوسرے روساء انگریزی لباس میں گئے تھے تو دائرہ کے ان سے کہا کہ مولوی صاحب آپ اس لباس میں شہزادے معلوم ہوتے ہیں یہ لباس بڑی راحت کا ہے۔ اور ہمارا لباس بہت تکلیف دہ ہے مگر ہم اپنی قومی وضع سے مجبور ہیں ہم کو آپ کے لباس پر بہت رشک آتا ہے۔

غرض ہم کو جو شریعت نے تعلیم دی ہے اس پر چلنا چاہیے۔

(مطالعہ الاموال ص ۷۷)

۶۲۔ علماء پر ایک اعتراض کا جواب

مجھے اس وقت اس سے تو بحث نہیں کہ مسلمانوں کی ترقی۔۔۔ انگریزی پڑھنے پر موقوف ہے یا نہیں۔ فرض کر لیجئے کہ اسپر موقوف ہے اور بدو ان اس کے مسلمانوں کو ترقی نہیں ہو سکتی۔ مگر اس پر متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے انگریزی نہ پڑھنے کا الزام آیا علماء پر لگانا صحیح ہے یا غلط ہے سوچو چھٹا ہوں کہ کیا علماء صرف انگریزی ہی سے منع کرتے ہیں۔ یا علم دین حاصل کرنے کا حکم بھی دیتے ہیں۔ اور بتلائیے کسی اور بات سے بھی منع کرتے ہیں؟ یقیناً وہ بہت سی باتوں سے منع کرتے ہیں مثلاً جھوٹ بولنے سے غیبت کرنے اور کسی کا حق دبانے سے اگر مسلمان انگریزی علماء کے منع کرنے سے نہیں پڑھتے تو ان کے کہنے سے علم دین کیوں نہیں پڑھتے۔ اگر یہ مولویوں کا اثر ہوتا تو دوسری باتوں میں بھی تو ہوتا صرف اسی ایک بات میں اثر کیوں ہوا۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمان انگریزی پڑھنے میں دوسری قوموں سے اپنی سستی کی وجہ سے پیچھے ہیں کہ ان سے محنت نہیں ہوتی۔ یا افلاس کی وجہ سے کہ ان کے پاس انگریزی تعلیم کے مصارف کے لئے رقم نہیں

علماء کے منع کرنے سے کوئی رکتا۔ الا ماشاء اللہ وہ نادروں کا معدوم۔ مگر آج کل تو الزام ملنے میں علماء کی وہی حالت ہے جیسے ایک بھٹیاری کی حکایت ہے گو حکایت تو فحش ہے مگر مولانا نے اس سے بھی زیادہ فحش حکایتیں مشنری میں لکھی ہیں اور ان سے علوم نکالتے ہیں اس لئے بیان کرتا ہوں۔

ایک بھٹیاری کا قصہ | قصہ یہ ہے کہ ایک سپاہی سرائے میں بھڑا اور بھٹیاری کو کھانا پکانے کیلئے جنس دی۔ بھٹیاریاں اکثر جنس چرایاں کرتی ہیں اس لئے سپاہی اس کے پاس مسلط ہو کر بیٹھ گیا اس نے بہت کوشش کی کہ آنکھ بچا کر چراؤں مگر سپاہی نے موقع ہی نہ دیا۔ اب اس نے یہ تدبیر کی کہ جب سپاہی کھانا کھانے بیٹھا تو ساتھ میں اپنے لڑکے کو بھی بٹھا دیا کہ تو بھی کھالے۔ شریف آدمی کا دسترخوان پر سے کسی کو اٹھانا گوارا نہیں ہوتا۔ اس لئے سپاہی خاموش ہو گیا۔ اتفاق سے بھٹیاری کی رنج زور سے صادر ہو گئی۔ اس کے خفت اتارنے کو اپنے بچے کے ایک دھب لگایا کہ دور موئے کھانا کھاتے ہوئے کیا کرتا ہے۔ سپاہی کو انتقام کا موقع ملا۔ اس نے قصداً رنج صادر کی اور زور سے ایک چپت لڑکے کو رسید کیا اور کہا یاد رکھ کرے گا کوئی مگر پیسے لگا تو ہی۔ اس سے بھٹیاری کو بھی بتا دیا کہ تیری حرکت کو میں سمجھ گیا ہوں بس یہی حال آج کل کے مسلمانوں نے علماء کا کر رکھا ہے کہ کسے کوئی مگر الزام انھیں پر ہوگا۔ انگریزی نہ پڑھنے کا الزام بھی مولویوں پر اور مسلمانوں کے تنزل و افلاس الزام بھی علماء پر اور جاہل اور مرتد ہونے کا الزام بھی ان ہی پر۔ مسلمانوں کی نا اتفاقی کا الزام بھی انھیں پر۔ (اصلاح ذات البین ص ۱۶)

۶۳۔ اس اعتراض کا جواب کہ شریعت قید محض ہے

ہمارے ترقی یافتہ بھائی آزادی کا بہت دم بھرتے ہیں۔ اور شریعت کو قید بتلاتے ہیں۔ ہم تو اس کا برعکس دیکھ رہے ہیں کہ لوگ مقید ہیں اور ہم آزاد ہیں۔ ایک صاحب کانپور میں کوٹ، پتلون، بوٹ، سوٹ سے کسے کسے میرے پاس آئے۔ وہ بیٹھنا چاہتے تھے۔ کرسی پر وہ سہولت سے بیٹھ جاتے لیکن ہم غریبوں کے پاس کرسی کہاں۔ ہمارے لئے تو چٹائی پر بیٹھنا فخر ہے۔ اب وہ کھڑے ہیں۔ لیکن کھڑے

کھڑے بات کیسے کریں۔ ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ چھڑی پر سہارا دے کر اور تاک لگا کر بھٹے گر پڑے۔ مجھے بڑی مہنی آئی۔ بتلائیے کہ تہذیب ہے یا تعذیب۔ یہ آزادی ہے یا قید ہے۔ بیٹھنا تو مصیبت تھا ہی اٹھنا اور بھی زیادہ مصیبت ہوا۔ اور اگر چلتے چلتے گر پڑیں تو بس وہاں ہی پڑے رہتے ہوں گے۔ اور لیجئے اگر جنگل میں کھانے کا وقت آجائے تو ہم دانے بھی چبا سکتے ہیں۔ اور روٹی ہو وہ بھی آدمیوں کی طرح بیٹھ کر کھا سکتے ہیں۔ اور ان کے لئے میز کرسی ہو کا نٹا ہو۔ چھری ہو۔ جب یہ کھانا تبادل فرمائیں۔ کپڑوں میں ہماری یہ حالت ہے کہ پا جامہ نہ ہو لنگی باندھ لیں گے۔ اپکن نہ ہو کرتہ کافی ہے عمامہ نہ ہو ٹوپی ہی سہی۔ پھر ٹوپی بھی خواہ کسی کپڑے کی ہو۔ پھر حدود و شرعیہ کی بھی قید نہیں کہ پا جامہ کشمیر کا ہو۔ لٹھے کا ہو گاڑھے کا ہو۔ گزی کا ہو، کسی شے کا ہو۔ نہ ہونگي بھی کفایت کرتی ہے۔ ان کو یہ مصیبت ہے کہ پتلون کسی خاص کپڑے کا ہو، تو کوٹ بھی اس کے مناسب ہو۔ قمیص بھی اس کے مناسب ہو۔ ورنہ فیشن کے خلاف ہے۔ کیوں صاحبو! یہ آزادی تو بڑی بھاری قید ہے۔ میں ان کی آزادی کی حقیقت عرض کرتا ہوں کہ یہ لوگ صرف خدا اور رسول سے آزاد ہیں۔ باقی نہ کھانے میں آزاد ہیں نہ پہننے میں آزاد۔ ہر بات میں مقید ہیں۔ اگر آزاد ہیں تو خدا اور رسول سے آزاد ہیں۔ تو خاک پڑے ایسی آزادی پر اور بھاڑ میں جائے ایسی مطلق العنانی اور مبارک رہے ہم کو یہ قید۔ اگر ہم مقید ہیں تو ہماری قید کی تو یہ حالت ہے۔

اسیرش نخواہد رہائی ز بند

اور یہ وہ قید ہے

گرد و صد زنجیر آری۔

غیر زلف آں نگار مقبلہ۔

اور ہماری ایسی قید ہے کہ مدتوں کے بعد محبوب کسی کو ملا ہو اور اپنے لطف و کرم سے اس کا ہاتھ زور سے پکڑ کر عاشق کو اپنے پاس بٹھالے اور اس کو نہ چھوڑے تو اس عاشق کی اس وقت کیا حالت ہوگی اس کی تو عینیت میں یہ حالت تھی کہ کہا کرتا تھا۔

اگرچہ دور افتادم بدیں امید خرسندم

کہ شاد دوست من بارد گر جاناں من گیسرد

بھلا اب کیا حال ہوگا۔ بلکہ اگر محبوب یہ کہے کہ اگر تم کو زور سے ہاتھ پکڑنے میں تکلیف ہو تو تمہارا ہاتھ چھوڑ دوں تو وہ عاشق یہ کہے گا کہ میرا ہاتھ کیا جان بھی نہ چھوڑو۔ اور کہے گا۔

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغ

سردوستاں سلامت کہ تو جگر آزمائی۔

پس جن کو خدا اور رسول کے ساتھ اس درجہ محبت ہے۔ کہا وہ اس قید کو ناگوار سمجھیں گے ہرگز نہیں۔ جس کسی کو محبت ہوئی ہوگی۔ وہی اس کا لطف جانتا ہے۔ ہاں جس قلب میں محبت کا مذاق ہی نہ ہو۔ وہ کیا جانے کہ اس میں کیا لطف ہے۔ نامرد اصلی کیا جانے کہ عورت میں کیا لطف ہوتا ہے۔ ورنہ اگر مذاق ہے تو خدا جانتا ہے کہ ساری قیدیں آسان ہیں۔ وہ چو لھے میں ڈالے گا ان قیدوں سے آزاد ہونے کو اور بھاڑ میں ڈالے گا ایسی عقل کو اور سر پر رکھے گا دیوانگی کو اسی دیوانگی کی نسبت مولانا فرماتے ہیں

مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

ما اگر قلاکش و گر دیوانہ ایم

ایسے شخص پر جو حالت بھی ہو، ناداری ہو بیماری ہو افلاس ہو اس کو سب گوارہ ہیں۔ اور ادل تو ایسے شخص کو کوئی بھی مصیبت نہیں ہوتی۔ اور بالفرض اگر ہو بھی تو اس کو اس حالت میں بھی چین ہے سکون ہے اطمینان ہے۔ اس کی زندگی لطف کی زندگی ہے خواہ کسی حالت میں ہو حق تعالیٰ اسی حیات کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں۔ من عمل صالحا من ذکر و لا نسی و لھو و لھو منی فلنحییہ حیاہ طیبہ۔ یعنی جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت، اس کو ہم پاکیزہ زندگی عطا فرماتے ہیں۔ ان کی ہر وقت تسلی کی جاتی ہے۔ ان کے قلب میں سکون اور چین کا اضافہ ہوتا رہتا ہے اور ان کو ہر حال میں یہ کہا جاتا ہے

سوئے نویدی مرد کامید با ست

سوئے تاریکی مرد غور شید با ست

پس اس قید میں اگر ان کو کچھ توب بھی ہو تو کچھ پردہ انہیں۔ اور ایسی قید کے مقابلے میں جو آزادی ہے وہ نری مہل ہے اور سرخسراں ہے۔ خرمات ہے۔ اور یہ آزادی بس خدا اور رسول سے آزادی ہے ورنہ یہ لوگ سراپا مقید ہیں۔

(الاتفاق ص ۲)

۶۴۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج جہانی پر شبہات کا جواب

ان منکرین معراج آسمانی کے پاس کچھ دلائل تو عقلی ہیں، کچھ نقلی، عقلی دلائل تو یہ ہیں کہ اس سے افلاک میں خرق و التیام لازم آتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفہ کے پاس خرق و التیام کے امتناع پر کوئی دلیل نہیں۔ اور جب وہ دلائل پیش کریں گے اس وقت انشاء اللہ ہم ان سب کا لغو ہونا ثابت کر دیں گے چنانچہ تکلمین اس سے فارغ ہو چکے ہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا قصہ احادیث میں آتا ہے کہ آپ اتنی جلد سیر ہوا کہ اس وقت تک کہ صبح بھی نہ ہونے پائی تھی یہ محالات سے ہے کہ مکہ سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے ساتویں آسمان تک آپ سیر کر آئیں اور یہ سارا قصہ ایک رات کے تھوڑے سے حصے میں ہو جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس میں استحالہ کی کیا بات ہے ہاں استبعاد ہو سکتا ہے سو وہ بھی بطور الزام کے اس طرح مدفوع ہے کہ تمہارے نزدیک زمانہ حرکت فلک الافلاک کا نام ہے۔ چنانچہ رات دن کا آنا، طلوع و غروب کا ہونا، یہ سب حرکت فلک سے مرتبط ہے۔ اگر حرکت فلک موقوف ہو جائے تو جو وقت موجود ہو گا وہی رہے گا اگر رات موجود ہوگی تو رات ہی رہے گی، دن موجود ہوگا تو دن ہی رہے گا۔ تو ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے اس رات حرکت فلک کو تھوڑی دیر کے لئے موقوف کر دیا ہو اور اس میں کچھ تعجب نہیں۔ مسر زہمان کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے دنیا میں بھی یہ قاعدہ ہے کہ جب بادشاہ کی سواری نکلتی ہے تو سڑک پر دوسروں کا چلنا بند کر دیا جاتا ہے۔

معراج کا واقعہ ہم جب حیدر آباد گئے تو ایک دن دیکھا کہ پولیس کے سپاہی سڑک پر سناٹا چھاپا ہوا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ نواب صاحب کی سواری نکلنے والی ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے اگر آسمان اور چاند سورج سب کی حرکت کو اس رات کچھ دیر کے لئے بند کر دیا ہو کہ جو جہاں ہے وہیں رہے۔ پس آفتاب جس جگہ تھا اسی جگہ رہا اور ستارے جہاں تھے وہیں رہے۔ کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلنے نہ پایا۔ اس میں کیا استبعاد

ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج سے فارغ ہو گئے۔ پھر فلک کو حرکت کی اجازت ہو گئی۔ تو اب ظاہر ہے کہ حرکت فلک جس جگہ سے موقوف ہوئی تھی وہیں سے شروع ہوئی۔ تو آپ کی سیر میں چاہے کتنا ہی وقت صرف ہوا ہو مگر دنیا والوں کے اعتبار سے سارا قصہ ایک ہی رات میں ہوا۔ کیونکہ حرکت اس وقت موقوف ہو چکی تھی۔ اب اگر کوئی دوام حرکت کا دعویٰ کرے تو وہ اس کے لزوم کو ثابت کرے انشاء اللہ ایک بھی دلیل قائم نہ کر سکے گا

دوسرا عاشقانہ جواب اس اشکال کا مولانا نظامیؒ نے دیا ہے

تن او کہ صافی تر از جان ماست اگر آمد و شد بیک دم رواست

یعنی یہ بات سب کو معلوم ہے کہ خیال انسانی ذرا سی دیر میں بہت دور پہنچ جاتا ہے چنانچہ آپ اسی وقت عرش کا تصور کیجئے تو ایک منٹ سے بھی کم میں عرش پر خیال پہنچ جائے گا خیال کی حرکت بہت سریع ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خیال رفع کی ایک قوت ہے اور روح نہایت لطیف چیز ہے، وہ مادیت کی طرح کثیف نہیں ہے اس لئے اس کی سیر میں کوئی حاجب و مانع نہیں ہوتے تو مولانا نظامی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک تو ہمارے خیال سے بھی پاکیزہ تر ہے۔ جب خیال ذرا سی دیر میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے تو آپ کا جسم اطہر زمین سے آسمان تک اور وہاں سے عرش تک ذرا سی دیر میں ہو آئے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ ایک دلیل عقلی فلاسفہ جدید پیش کیا کرتے ہیں کہ ہوا کے طبقے سے اوپر جو خلا ہے اس میں ہوانہ ہونے کے سبب کوئی متنفس زندہ نہیں رہ سکتا تو آپ اگر اس میں سے گذرتے زندہ کیسے رہتے۔ مگر انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ بعد تسلیم اس التزام کے۔ یہ اس وقت ہے جب متنفس کو اس کچھ مکث بھی چنانچہ آگ کے اندر اگر جلدی جلدی ہاتھ نکالا جاوے تو آگ کا اثر نہیں ہوتا۔ پس اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت سرعت اس خلا میں سے گذر جائیں تو وہ عدم تنفس میں مؤثر نہ ہوگا۔

اور دلیل نقلی ان منکرین کے پاس حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قول ہے۔
وَاللّٰهُمَّ إِنِّي فَتَحْتُ جَسَدِي لِرَسُولِكَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي لَيْلَةِ الْاِسْرَاءِ كَمَا بَدَأْتَ شَبَابَكَ
میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مفقود یعنی غائب نہیں ہوا۔ اس کا جواب بعض لوگوں نے تو یہ دیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس وقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کہاں تھیں نیز اس وقت ان کی عمر بہت کم تھی۔ شاید چار پانچ سال کی ہوں۔ اور اگر معراج سہ ہونے میں ہوئی جیسا کہ

زہری کا قول ہے تو وہ اس سال پیدا ہوئی ہوں گی) اس لئے اجلہ صحابہ کی روایت اس واقعہ میں ان کی روایت سے مقدم ہے۔ مگر اس کا حاصل بظاہر یہ ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بے تحقیق ایک بات فرمادی ہم حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا پر یہ گمان نہیں کریں گے کہ کسی صاحب ادب کو ایسی جرات ہو سکتی ہے۔ یہ ماننا کہ وہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں موجود نہ تھیں اور کس بھی تھیں۔ مگر جوابات وہ فرما رہی ہیں وہ تو عقل و بلوغ کے زمانہ میں ان سے صادر ہوئی اور ایسے وقت میں وہ بدون تحقیق کے کوئی بات نہیں فرما سکتیں۔ یقیناً تحقیق کے بعد فرما رہی ہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے واقعہ کی نسبت فرما رہی ہوں کیونکہ تعدد ہے۔ تو پھر کچھ بھی مضائقہ نہیں۔

میرے ذہن میں اس کا جواب آیات ہے وہ بہت لطیف ہے وہ یہ کہ فقدان کے دو معنی ہیں، ایک تو چیز کا اپنی جگہ سے گم ہو جانا ہٹ جانا۔ دوسرے تلاش کرنا۔ چنانچہ دوسرے معنی میں فقدان کا استعمال نص میں بھی آیا ہے۔ **تَالُوا وَاقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقَدُونَ** یعنی برادران یوسف علیہ السلام نے متوجہ ہو کر نہ اندا کرنے والوں سے کہا کہ تم لوگ کس چیز کو تلاش کرتے ہو۔ یہاں فقدان کے معنی طلب ہی کے ساتھ زیادہ ظاہر ہیں۔ پس حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنی دیر گھر سے غائب نہیں رہے کہ آپ کی تلاش کی جاتی۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ ساری رات میں اپنے گھر سے جدا ہی نہیں ہوئے وہیں رہے تاکہ اس سے مراجع منامی یا کشفی پر استدلال کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ گھر سے جدا تو ہوئے۔ مگر زیادہ دیر

عہ اور اگر فقدان کے دو ہی معنی لئے جائیں جو متبادر ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم شب مراجع میں گم نہیں ہوا تب بھی اس سے مراجع کا رد حافی یا منامی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے اس رات جدا ہی نہیں ہوئے کیونکہ فقدان فعل متعدی ہے نہ کہ لازم۔ اس کے معنی غیبت و انفصال کے نہیں بلکہ گم کرنے کے ہیں جس کے لئے اس کا ناسخ اور دوسرے کا مفقود ہونا ضروری ہے پس مطلب یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس رات کسی نے گھر سے غائب اور گم نہیں پایا۔ اور یہ روایت درست ہے کیونکہ آپ سب گھر والوں کے ساتھ گھر میں ہوئے تھے۔ اور مراجع ایسے وقت ہوئی جو کہ عادتاً لوگوں کے گہری نیند سونے کا وقت تھا۔ پھر جاگنے کے وقت سے پہلے آپ واپس تشریف لے آئے بلکہ خود آکر گھر والوں کو صبح کی نماز کے لئے جگایا تو ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے رات کو جاگ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر میں نہ دیکھا ہو۔ اور اتنی بات مفقود ہونے کے لئے ضروری ہے۔ قلت ولعل هذا هو مراد الشيخ فعبارة بالتفتيش والا فالفقدان غير التفقد، نعم

نہیں لگی۔ جس میں گھر والوں کو پریشانی ہوئی ہو اور تلاش کی نوبت آئی ہو۔ (الرفع والوضع ص ۳۲)

بقیہ گذشتہ :- وہو يستدعي فاقداً كما لا يخفى (جامع) احقر اشرف علی کے ذہن میں پہلا حاشیہ دیکھ کر ہی یہ تاویل آگئی تھی۔ مگر دوسرے عنوان سے پھر یہ اب اس تاویل کی اس دوسرے عنوان سے ذرا واضح تقریر کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ فقدان کے معنی تو گم ہی کر نیے ہیں مگر اس کے دو درجے ہیں، ایک مطلق گم کرنا اور ایک ایسا گم کرنا جس کے بعد اسکی تلاش میں لگ جاوے پس پہلا درجہ فقد مطلق ہوا اور دوسرا درجہ فقد مقید۔ پس اس حدیث میں دوسرا درجہ مراد ہے یعنی آپ کا جدا ایسا مفقود نہیں ہوا جس سے تلاش کی نوبت آئی ہو، کیونکہ زمانہ فقد کا اتنا قلیل تھا کہ کسی کو اس فقد کی اطلاع بھی نہیں ہوئی۔ پس متن میں میری عبارت میں ہٹ جانے کو پہلے درجہ پر تلاش کر نیو دوسرے درجہ پر محمول کیا جاوے تو اب معنی لغوی کے خلاف نہیں ہوا۔ اور بنا بر قواعد لغویہ یہ بھی ممکن ہے کہ جسم عنبری ملکوت میں پہنچا ہو اور جسم مثالی ناسوت میں رہا ہو۔ اسکے دیکھتے ہوئے کسی نے اسکو جسم عنبری سمجھ کر کافقد کا حکم کر دیا ہو۔ اور وہی بات ہے کہ اگر مراد جسم عنبری ہے ہوتی تو اتنا انکار اسپر نہ ہوتا اور اگر غلط فہمی سے ہوتا تو آپ بھی جواب دے دیتے کہ میں جس عنبری سے دعویٰ نہیں کرتا کہ اسپر اس قدر استبعاد کیا جاوے ۱۲ من۔

احقر ظفر احمد عرض کرتا ہے کہ بعد میں تفسیر تنویر المقیاس میں جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب ہے۔ **مَاذَا تَفْقَدُونَ** اور **تَفْقَدُ** کی تفسیر **مَاذَا تَطْلُبُونَ** اور **تَطْلُبُ** کے ساتھ میری نظر سے گذری۔ اور یہ تفسیر بالکل اسی معنی کے مطابق ہے جو حضرت حکیم الامت نے اس آیت کی تفسیر میں بیان فرمائے ہیں، کیونکہ طلب معنی تلاش کرنے اور ڈھونڈنے کے ہیں۔ اور بظاہر ابن عباس کی تفسیر باللائم ہے کیونکہ فقدان اکثر طلب کو مستلزم ہوتا ہے لہذا ملزم کی تفسیر لازم سے فرمادی لیکن اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ گاہے فقدان سے طلب تفتیش بھی مراد ہوا کرتی ہے۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول میں بھی اس معنی کا احتمال ہے جیسا کہ حضرت مولانا نے فرمایا واذ اجاء الاحتمال ابطال الاستدلال اور ہر چند کہ تفسیر تنویر المقیاس اکثر محدثین کے نزدیک معتبر نہیں کیونکہ اس کے راوی بکلی اور ان کے شاگرد محمد بن مردان صدی صغیر مجروری ہیں مگر سیوطی نے اتفاق میں ابن عدی کا یہ قول نقل کیا ہے۔ **لكن قال ابن عدی فی الکامل للکلبی احادیث صالحہ خاصۃ عن ابی صالح وهو معروفاً بالتفسیر ویسیر لا تفسیر المول مند ولا اشجع (ص ۱۶ ج ۲) جس سے فی الجملہ اسکی تقویت ہوتی ہے۔ دوسرے مسئلہ کوئی احکام کی قبیل سے نہیں جس میں راوی کا مجرد ہونا مضر ہو بلکہ از قبیل نقل لغت ہے جس میں بہت وسعت ہے۔ فافهم والله اعلم۔ وانما اهلنا الکلام فی هذا المقام لیظهر لك نعمته الله على جماعتنا ولله الحمد انها لا تقبل اقوال الكاذبها فی تفسیر معانی القرآن الا بعد ظهور مطابقتها لاقوال السلف وان اکابرهم لا تمکن من لا یبراد الاضاعر علیهم اذ اکان بالادب لاجل الطلب لیظهر لك حسن ذوق حضرت حکیم الامت فی التفسیر بحیث لا یتخطی عن البصواب ولو قال شیءاً بغير مطالعة الكتاب۔ (رقت الحاشیة)**

۶۵۔ تبلیغ کے لئے چندہ جمع کرنے کا کام علماء کے سپرد نہیں کرنا چاہیے

میں کہتا ہوں کہ علماء یہ کام ہرگز نہ کریں بلکہ روسا و عوام خود چندہ کریں اور مولویوں سے دین کا کام لیں۔ مگر آج کل تو علماء کی مثال ڈوم کے ہاتھی جیسی ہو رہی ہے کہ اکبر نے ایک ڈوم کو ہاتھی انعام میں دیدیا تھا وہ بڑا گھبراہٹ میں اس کا خرچ کہاں سے لاول گا آخر ایک دن اکبر کی سواری نکلنے والی تھی کہ گلے میں ڈھول ڈال کر راستہ میں چھوڑ دیا۔ اکبر نے دیکھا کہ شاہی ہاتھی گلے میں ڈھول ڈالے ہوئے پھر رہا ہے پوچھا یہ کیا قصہ ہے۔ ڈوم کو بلایا گیا کہ تم نے اس ہاتھی کے گلے میں ڈھول کیوں لٹکایا ہے۔ کہا حضور آپ نے مجھے ہاتھی تو دے دیا اب میں اسے کھلاتا کہاں سے میں نے اس سے کہا کہ بھائی میں تو گا بجا کر کھاتا ہوں تو ڈھول گلے میں ڈال کر گا کر بجا کر اپنا پیٹ بھرے۔ اکبر ہنس پڑا۔ اور ڈوم کو اس کی امداد کے لئے بھی عطا فرمایا۔

یہی حال آج کل مولویوں کا ہے کہ لوگوں نے ان کے گلے میں ڈال دیا ہے کہ جاؤ گاؤ بجاؤ اور روپیہ جمع کر کے خود ہی سب کام کرو۔ یاد رکھو ایک جماعت سے دو کام نہیں ہو سکتے کام کا طریقہ یہی ہے کہ روپیہ تم خود جمع کرو۔ اور مولویوں سے صرف دین کا کام لو بلکہ روپیہ جمع کر کے اپنے ہی پاس رکھو علماء کو روپیہ دو بھی نہیں۔ کیونکہ آج کل بہت لوگ ایسے بھی ہیں جو واقع میں مولوی نہیں۔ تھے مگر مولویوں میں جا گھسے۔ انہوں نے مسلمانوں کے چندوں میں بہت خیانتیں کی ہیں جس سے مولوی بدنام ہو گئے اسلئے میری رائے یہ ہے کہ روسا چندہ کر کے اپنے ہی پاس رکھیں مولویوں کو نہ دیں۔ کیونکہ اس سے علماء پر دھبہ آتا ہے تو کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ آپ کے علماء بدنام ہوں۔ ہرگز نہیں۔ آپ کو تو چاہیے کہ اگر علماء چندہ کرنا بھی چاہیں تو آپ ان کو خود روئیں کہ یہ کام آپ کے مناسب نہیں۔ یہ کام ہم خود کریں گے، بلکہ ایک صورت سب سے اچھی یہ ہے کہ ایک ایک رئیس ایک ایک مبلغ کی تنخواہ اپنے ذمہ کر لے اس میں کسی جھگڑے ہی کی ضرورت نہیں۔ اور اگر ایک آدمی ایک مبلغ کی تنخواہ نہ دے سکے تو دو چار مل کر ایک مبلغ رکھ لیں اور اس کا حساب خود اپنے پاس رکھیں۔ یہ صورت تو روپیہ کے انتظام کی ہے۔ رہا تبلیغ کا قاعدہ اور طریقہ۔ یہ علماء کی

رائے سے ہونا چاہیے۔ تم روپیہ جمع کر کے علماء سے طریقہ پوچھو اور مبلغ بھی ان کی رائے سے مقرر کرو، پھر جس طرح وہ بتلائیں اس کے موافق کام کرو۔ اس مشورہ کے لئے ایک کمیٹی بناؤ۔ علماء کو اس میں مشورہ اور رائے دینے سے انکار نہ ہوگا۔ اور میں علماء سے بھی کہتا ہوں کہ وہ اس سے انکار نہ کریں پھر اس طرح اللہ کا نام لے کر کام شروع کریں۔ انشاء اللہ بہت جلد کامیابی ہوگی۔ گو اول اول وقتیں بھی پیش آئیں گی مگر وقت سے نہ گھبرائیں۔ پیادہ سفر کر نیکی ضرورت نہیں سواری میں سفر کریں جہاں ریل ہو وہ ریل سے پہنچیں۔ ورنہ گاڑی پہلی سے جائیں باقی فٹن اور موٹر کی ضرورت نہیں نہ کیمینڈ اور برف کی ضرورت ہے۔ ان فضولیات میں پیسہ قوم کا برباد نہ کرنا چاہیے۔ آپ کا تو یہ رنگ ہونا چاہیے۔

اے دل اں بہ کہ خراب از مئے گلگون باشی

بے زرد گنج بصد حشمت قاروں باشی

در رہ منزل لیلی کہ خطر با ست بجاں

شرط اول قدم آنت کہ مجنوں باشی

(العلم والخشية ملأ)

۶۶۔ نسب نامے نہ تو محض بیکار ہیں، اور نہ ہی مدار

فخر ہیں۔

حق تعالیٰ نے مختلف خاندانوں اور قوموں کے بنانے میں یہ حکمت بتلائی ہے کہ اس سے تعارف اور شناخت ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے کا پتہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ قریشی ہے یہ انصاری ہے یہ صدیقی ہے یہ فاروقی ہے اگر یہ تفاوت نہ ہوتا تو امتیاز سخت دشوار ہوتا۔ کیونکہ ناموں میں اکثر توارہ ہوتا ہے ایک ہی نام کے بہت سے آدمی ہوتے ہیں۔ تو کسی قدر توجاہ سکونت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک دہلوی ہے ایک لکھنوی ہے۔ پھر ایک شہر میں بھی ایک نام کے بہت سے ہوتے ہیں تو محلوں کے نام سے امتیاز ہو جاتا ہے کہ ایک محلت کا رہنے والا ہے اور ایک محلہ خیل کا۔ پھر وہاں بھی ایک نام کے دو تین ہوتے ہیں تو قبائل کی طرف نسبت سے امتیاز ہو جاتا ہے۔ یہ حکمت ہے اختلاف قبائل کی۔

مگر آج کل ہمارے نبھائیوں نے اس کو مدار فخر بنالیا ہے۔ اب یہاں دو قسم کے لوگ

ہو گئے۔ بعض نے تو نسب و شرف کی جڑ ہی اکھاڑ دی۔ ان کو اس سے شبہ ہوا کہ اس آیت میں اختلاف قبائل کی حکمت صرف تعارف بتلائی گئی ہے اور حکمتوں سے سکوت کیا گیا ہے تو انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ بس اس میں اور کچھ حکمت نہیں ہے۔ لان اسکو فی موضع البیان بیان۔ اس پر نظر کر کے بعض نے تو شرافت نسب کا انکار ہی کر دیا کہ اس سے شرف کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ جس طرح دہلوی، نکھنوی، ہندوستانی، بنگالی، سب نسبتیں تعارف کے لئے ہیں اور ان سے کچھ شرف حاصل نہیں ہوتا اسی طرح قریشی، انصاری، سید، فاروقی، عثمانی وغیرہ نسبتیں بھی شناخت کے لئے ہیں ان سے بھی کچھ شرف حاصل نہیں ہوتا اور یہ وہ لوگ ہیں جو اس شرف عربی سے محروم ہیں۔ ان میں سے بعض نے تو اپنے کو شریف ثابت کرنا چاہا ہے۔ چنانچہ ایک قوم نے اپنا عرب ہونا ثابت کیا ہے اور کہا ہے کہ ہماری اصل راعی ہے چونکہ یہ لوگ جانور پالتے ہیں اسلئے ان کو راعی کہا گیا۔ پھر غلط عوام سے لفظی تغیر ہو گیا۔ اسی طرح بعضوں نے اپنے آپ کو خالد بن ولید کی اولاد میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی طرح وہ عرب بنا چاہتے ہیں مگر اس ترکیب میں تکلف تھا کیونکہ تاریخ سے تو اس کا کچھ ثبوت نہیں ملتا محض قیاسات بعیدہ سے کام لینا پڑتا ہے جس سے ہر شخص کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بات بنائی ہوئی ہے اسلئے بعض نے اپنے نقص کو یوں دور کرنا چاہا کہ اہل شرف ہی سے اس شرف نفی کر دی کہ شرافت، نسبت کوئی چیز نہیں۔ بعض نے اس نفی میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول سے استدلال کیا ہے کہ

الناس من جهة النساثل اكفاء ابوهم آدم والام حواء۔

وما الفخر الا لاهل العلم انهم على الهدى لمن استهدى ادلاء

ترجمہ: آدمی صورت کے اعتبار سے سب برابر ہیں کیونکہ سب کے باپ آدم علیہ السلام اور ماں حواء علیہا السلام ہیں۔ پس اہل علم کے سوا کسی کے لئے فخر نہیں ہے۔ کیونکہ وہی ہدایت پر بھی ہیں اور طالب ہدایت کی طرف رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ اس سے بعض وہ حضرات جو یسوی شرف نہیں رکھتے اور علم حاصل کر چکے ہیں اس پر استدلال کرتے ہیں کہ شرف نسب کوئی چیز نہیں۔ بس شرف اگر ہے تو علم سے ہے۔ سوا دل تو یہی معلوم نہیں کہ یہ حضرت علی کا قول ہے یا نہیں پھر جس کا بھی قول ہے مطلب نفی فخر ہے کہ نسب پر فخر نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ امر غیر اختیاری ہے اور اس پر فخر نہ کرنا چاہیے۔ مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ حسن صورت اور سوا نکھا ہونا نعمت بھی نہیں۔ یقیناً اعلیٰ درجہ کی نعمت ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ گو شرف نسب بوجہ امر غیر اختیاری ہونے کے سبب فخر نہیں مگر اس کے نعمت ہونے میں شبہ نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی فضیلت بیان فرمائی

ہے۔ انصار کے فضائل بیان فرمائے ہیں۔ اور ایک حدیث میں ہے۔ الناس معادن لمعادن الذہب والفضة خیارہم فی الجاہلیۃ خیارہم فی الاسلام اذا فقهوا کہ جیسے چاندی سونے کی کانیں ہیں اسی طرح آدمیوں کی بھی مختلف کانیں ہیں جن میں بعض سونے کے مشابہ ہیں۔ بعض چاندی کے، بعض دوسرے معادن کے مثل ہیں بعض دوسرے معادن کے مثل ہیں پھر آپ فرماتے ہیں کہ جو خاندان جاہلیت میں اچھے شمار ہوتے ہیں وہی اسلام کے بعد ابھی اچھے ہیں۔ جب کہ علم حاصل کر لیں۔ بعض نے یہ سمجھا ہے کہ اس میں قید اذا فقهوا اہل انساب کو مضر ہے کہ اس میں مدافعت فقہ کو فرمایا۔ مگر کچھ بھی مضر نہیں، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فقہ کے بعد خیار فی الجاہلیۃ کو خیار فی الاسلام فرما رہے ہیں۔ تو فقہ کے بعد مساوات نہ رہی بلکہ حاصل یہ ہوا کہ فقیہ غیر صاحب نسب فقیہ صاحب نسب کے برابر نہیں بلکہ فقیہ صاحب نسب افضل ہو گا تو کوئی تو بات ہے جس سے وہ خیار ہوتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ صاحب نسب جاہل سے غیر صاحب نسب عالم افضل ہے۔ اس کا ہم کو انکار نہیں۔ مگر حدیث سے اتنی بات معلوم ہو گئی کہ شرف نسب بھی کوئی چیز ضرور ہے جس کے ساتھ علم و فقہ مل جائے تو صاحب نسب غیر صاحب نسب سے بہتر ہو گا نیز حدیث میں ہے (اللہ عزوجل) میں قریشی کوئی توبہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امارت کو قریش کے ساتھ مخصوص فرمایا معلوم ہوا کہ اہل انساب میں شان متبوعیت دوسروں سے زیادہ ہے لانا لہنہ لاکذب لانا بنی عبد المطلب۔ جب جنگ حنین میں حضرات صحابہ کے پیر اکھر گئے۔ اور وہ پیچھے ہٹنے لگے تو آپ نے اپنے گھوڑے کو آگے بڑھایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ میں نبی ہوں، یہ جھوٹ بات نہیں (اسلئے میرا غلبہ یقینی ہے) اور میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔ یعنی میں خاندانی اور صاحب نسب ہوں۔ میں ہرگز پسپا نہ ہوں گا تو اس میں حضور نے اپنے صاحب نسب ہونے پر فخر کیا ہے۔ اور دشمن کو ڈرایا ہے کہ تو اپنے مقابل کو کم نہ سمجھنا، وہ بڑا خاندانی ہے جس کی بہادری سب کو معلوم ہے۔ اگر شرف نسب کوئی چیز نہیں ہے تو آپ نے لانا بنی عبد المطلب کیوں فرمایا نیز ایک حدیث میں ہے۔ ان اللہ اصطفیٰ من ولد ابراہیم اسمعیل واصطفیٰ من ولد اسمعیل بنی کنانہ واصطفیٰ قریشا من کنانہ واصطفیٰ من قریش بنی ہاشم واصطفانی من بنی ہاشم (درود اسلام والترمذی)۔

یعنی حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسمعیل علیہ السلام کو انتخاب فرمایا (اس سے عرب کی فضیلت عجم پر ثابت ہوئی، کیونکہ اسمعیل علیہ السلام ابوالعرب ہیں۔ اور ایک روایت میں اس کی تصریح بھی ہے۔ لاختارہم من بنی لہوۃ۔ اور اسمعیل علیہ السلام کی

اولاد میں سے کنازہ کو منتخب کیا اور کنازہ میں سے قریش کو منتخب کیا اور قریش سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھ کو منتخب کیا۔ اور ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ خَلَقَ دُخَانًا فَجَعَلَ فِيهِ خَيْرَهُ** (ای الانس) **ثُمَّ جَعَلَهُ فِئْتَيْنِ فَجَعَلَ فِي خَيْرِهِمْ قُرَيْشَ** (ای العرب) **ثُمَّ جَعَلَهُ قَبَائِلَ فَجَعَلَ فِي خَيْرِهِمْ قَبِيلَهُ** (ای قریش) **ثُمَّ جَعَلَهُ مِنْ خَيْرِ خَلْقِي فِي خَيْرِهِمْ بَيْتًا** (ای بنی ہاشم) **فَانَا خَيْرَهُمْ فَخَسَا وَخَيْرَهُمْ بَيْتًا** (رواہ الترمذی)۔

اس نص سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نسب مطلق کرم سے خالی نہیں۔ گو اگر ہونے کو مستلزم نہ ہو۔ کیونکہ اگر میت کا مدار تو تقویٰ ہے۔ **لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ وَأَلْهَمْنَا الْوَقْفَ لَكُمْ**۔ مگر اس کرم با نسب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سارے کام کو نسب ہی میں منحصر کر دیا جائے جیسا کہ اہل قصبات کی عادت ہے یہ دوسری جماعت ہے جس نے نسب کے بارے میں افراط و غلو کیا ہے۔ جیسا کہ پہلی جماعت نے تفریط کی تھی۔ اہل قصبات نے فخر بالانساب ہی پر قناعت کر لی ہے۔ **الْاَكْرَمِيَّةُ بِالْاَعْلَمِيَّةِ وَالْاَعْلَمِيَّةُ بِالْمُتَخَصِّصَاتِ** (مختصا)

۶۷۔ نماز کی برکتیں اور اس کے نہ پڑھنے پر ترہیب

اس وقت واقعی طور پر ان کو جی علی الفلاح کا ادراک ہوتا ہے کہ منازعہ عجیب راحت کی چیز ہے۔ یہ تو نماز میں فلاح عاجل باطنی ہے اور اس کے علاوہ نماز میں ظاہری فلاح عاجل بھی بہت کچھ ہے چنانچہ نماز میں ایک یہ ہے کہ اگر کوئی آپ کو فضول مخالفت فضول مظالم سے ایذا دینا چاہے تو نماز شروع کر دو۔ جب تک نماز پڑھتے رہو گے کوئی تمہیں کچھ نہ کہے گا۔ دوسرے اگر تم کسی آنے والے کی تعظیم نہ کرنا چاہو اور تعظیم نہ کرنے میں خطرہ کا اندیشہ ہو تو اس کو آتا ہوا دیکھ کر نماز شروع کر دو۔ اس طرح تعظیم سے بھی بچے رہو گے اور دوسرے کو اپنی بے تعظیمی کا خیال نہ ہو گا کیونکہ سب جانتے ہیں کہ نماز میں انسان دوسری طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ تیسرے اگر کوئی یہ چاہے کہ میں اس طرح خلوت اختیار کروں کہ گوشہ نشینی بھی مشہور نہ ہوں۔ کیونکہ اس شہرت کے بعد پھر خلوت نہیں رہ سکتی۔ لوگ تنگ کرتے اور ہجوم کرنے لگتے ہیں تو اس کی سہل صورت یہ ہے کہ ہر وقت نفل نماز پڑھا کرے۔ ہمارے ایک عزیز بزرگ نے جو مشرب سماع رکھتے تھے اسی طرح خلوت اختیار کی تھی کہ بیٹھ کر ہی میں عام منظر پر رہتے اور ہر وقت نماز پڑھتے تھے جب کوئی

ملنے آیا تو سلام کے بعد دو چار باتیں خیریت کی پوچھ لیتے اور پھر نماز شروع کر دیتے تھے۔ مجھے یہ طریقہ بہت پسند آیا کہ زندہ بد اخلاق مشہور ہوئے۔ کیونکہ جو کوئی بھی آتا تھا۔ اس سے ضرورت کی قدر مل بھی لیا کرتے تھے۔ اور نہ عزت گری میں فرق آیا۔ اور نہ خلوت نشین مشہور ہوئے۔ جو عوام کا ہجوم ہوتا ایک برکت نماز کی یہ ہے کہ اس میں بڑے بڑے سلاطین اور روسا کی برابری ہو جاتی ہے۔

نماز میں مساوات

ایک انگریز علی گڑھ کالج میں گیا تو وہاں دیکھا کہ رئیسوں کے لڑکے پڑھتے ہیں۔ مگر خدمت کے تودہ نوکر دور کھڑے رہتے ہیں آقا کے پاس بھی نہیں بیٹھ سکتے اور نماز کے وقت آقا کے برابر پاس مل کر کھڑے ہوتے ہیں اس نے ان رئیس زادوں سے دریافت کیا کہ نماز میں برابر کھڑے ہونے سے یہ ملازم گستاخ نہیں ہو جاتے انہوں نے کہا مجال ہے جو نماز کے بعد ہماری ذرا بھی برابری کر سکیں۔ اس وقت کا حق یہی ہے کہ سب برابر ہوں اور دوسرے وقت کا دوسرا حکم ہے۔ اس کو اس سے بڑی حیرت ہوئی اور اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ جو نوکر نماز پڑھتا ہے حالانکہ وہ نماز میں آقا کے برابر بھی ہو جاتا ہے مگر پھر بھی اس میں انقیاد کی صفت بڑھ جاتی ہے۔ یعنی وہ آقا کی خدمت اور اس کے حقوق کی بجا آوری بے نماز نوکر سے زیادہ کرتا ہے واقعی یہ بات مشاہدہ ہے کہ دیندار آدمی جیسے خدا تعالیٰ کے حقوق ادا کرتا ہے بندوں کے حقوق بھی خوب ادا کرتا ہے۔ نماز کی ایک برکت یہ ہے کہ اس سے صحت اچھی رہتی ہے۔ اطباء بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اخلاق حمیدہ و افعال حسنة کا اثر صحت پر بہت اچھا پڑتا ہے اور افعال بد سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ تجربہ کر کے دیکھ لیا جاوے کہ ایک آدمی نماز ہو اور ایک بے نمازی۔ تو نماز کی صحت بے نمازی سے ضرور اچھی ہوگی۔ (مگر دونوں یکساں قوی اور قریب قریب بدن کے لینے چاہئیں) بلکہ ایک حدیث سے تو جو ابن ماجہ میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ محمد شین نے اس کو ضعیف کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے ذریعہ سے بعض امراض کا علاج کیا ہے۔ ایک دفعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیٹ میں درد تھا۔ وہ آہ آہ کر رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کو تشریف لے گئے اور فارسی میں فرمایا شکمت درد۔ قال نعم۔ قال قسم فصل فزال وجع بطنی، کیا تمہارے پیٹ میں درد ہے۔ کہا۔ ہاں۔ فرمایا کھڑے ہو کر نماز پڑھو چنانچہ نماز پڑھتے ہی درد زائل ہو گیا۔ چونکہ یہ مسئلہ احکام میں سے نہیں اس لئے ضعیف حدیث اس میں مضر نہیں۔ میں یہ تو دعویٰ نہیں کرتا کہ نماز پڑھنے سے ہمیشہ درد زائل ہو جایا کرے گا ممکن ہے کسی عارض سے اس نفع کا ظہور نہ ہو مگر یہ تو ضرور ہے کہ نماز سے ایک خاص سرور و نشاط اور

قلب کو راحت حاصل ہوتی ہے جس کا اثر صحت پر بھی ضرور ظاہر ہوتا ہے اور ہم کو اس کی وجہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ نماز سے راحت و سرور کیوں ہوتا ہے کیونکہ ہر اثر کے لئے کسی علت کا ہونا ضروری نہیں ہے بعض چیزیں بالخاصہ مؤثر ہوتی ہیں۔ دیکھئے مقناطیس میں جو جذبِ معدنی کی خاصیت ہے اس کی وجہ کوئی نہیں بتلا سکتا۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ نماز میں یہ اثر بالخاصہ ہے جس کی علت بتلانیکی نہیں ضرورت نہیں۔

افسوس اتنی بڑی عبادت جس میں فلاح اخروی بھی ہے اور فلاح
جنت کی اہمیت | دنیوی بھی ہے اور ہم اس سے ایسے غافل ہیں کہ پانچ وقت خدا کی طرف سے ایک منادی ہم کو پکارتا ہے اور ہم جماعت میں نہیں آتے۔ حالانکہ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **وَلَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ لَا أُرِيَ الصَّلَاةَ إِلَّا فِي الْوَقْتِ** یعنی میں نے یہ ہمت کی تھی کہ میں نماز کو نہ دیکھوں کہ کون کون لوگ جماعت میں نہیں آئے۔ پھر جو جماعت سے پیچھے رہتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ ان کے گھر بھونک دوں اور گو آپ نے ان لوگوں کے گھروں کو بھونکا نہیں مگر چاہا تو تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ **لَئِنْ لَرَى رِبْلِحٍ يَسْلَمُ فِي هَوْدَجٍ** کہ میں حق تعالیٰ کو دیکھتی ہوں کہ آپ کی خواہش کو بہت جلد پورا کر دیتے ہیں اور مہلا حضور کی یہ شان کیوں نہ ہو جب ادنیٰ ادنیٰ مقبولین کی یہ شان ہے۔

تو چنیں خواہی خدا خواہ چنیں
 می دہیز داں مراد منتقین !
 تو معلوم ہوا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا چاہا ہے تو خدا تعالیٰ نے بھی ضرور چاہا ہے۔ اب بتاؤ جس کے گھر کو خدا اور رسول بھونکنا چاہیں وہ کیونکر بچ سکتا ہے تو جو لوگ جماعت میں نہیں آتے ان کے گھر میں ضرور آگ لگی ہے۔

شاید تم کہو کہ ہمارا گھر کہاں جلا وہ تو اچھا خاصا موجود ہے تو اس کے متعلق مولانا روم کا جواب سن لو، فرماتے ہیں۔

آتش گر نایدست ایں دو دھیت جاں یہ گشت دوراں مرد و دھیت
 یہ مھوڑی آگ لگی ہے جس کے دھوئیں نے دل کو سیاہ کر دیا ہے اور چہرہ پر وحشت و ظلمت برس رہی ہے۔ اس حکمتِ طلب سے بے نمازی کے چہرہ پر بھی ضرور ایک اثر ہوتا ہے جس سے اس کا بے نمازی ہونا لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے۔ نمازی کے چہرہ پر جو نور ہوتا ہے اس کا

چہرہ پر ظاہر ہوتا ہے۔ اور بے نمازی کے دل میں ظلمت ہے اس کا چہرہ بدر و منق سے ظاہر ہوتا ہے کہ آگ ضرور لگی ہے۔ اسی کا یہ دھواں ہے جس نے ظاہر و باطن دونوں کو سیاہ کر دیا ہے۔
 (الاکرمیہ ص ۲۱۹ تا ۲۲۱ ملخصاً)

۶۸۔ اتحاد و اتفاق میں حدود کی رعایت

اتحاد مطلوب کے دو درجے ہیں۔ ایک اس کا حدوث، دوسرے بقا، میں ان دونوں درجوں کے اسباب بیان کروں گا کہ حدوث اتحاد کی بنیاد کیا ہونی چاہیے اور اس کے بقا کا کیا طریقہ ہے اور وہ اسباب ایسے ہیں جو شرعی پہلو سے بھی ظاہر ہیں اور عقلی پہلو سے بھی، اور اسباب بقا کی تحقیق زیادہ اہم ہے۔ اس لئے کہ آج کل ہم لوگوں میں اتحاد و اتفاق تو پیدا ہوتا ہے مگر باقی نہیں رہتا۔ میں اس کا سبب شرعی پہلو سے بتلاؤں گا، جو عقل کے بھی مطابق ہے۔ گو مجھے عقل کا نام لیتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کیونکہ عقل بڑی ہے اور شریعت سلطان ہے پس عقل کی تائید سے شریعت کی بات کو ماننا ایسا ہے جیسے غلام کی جی ہاں جی ہاں کوسن کر بادشاہ کی بات کو مانا جائے اور اس کا حماقت ہونا ظاہر ہے۔ بادشاہ کی بات خود حجت ہے غلام کی تصدیق سے اس کو حجت سمجھنا سراسر حماقت ہے مگر کیا کیا جائے آج کل عقل پرستی کا غلبہ ہے لوگوں کی سمجھ میں وہی بات آتی ہے جو عقل کے مطابق ہو۔ اس سے تبرعاً عقلی پہلو سے بھی ان اسباب کو بیان کروں گا کہ میرا اصلی مذاق اس کے خلاف ہے۔

پس سنئے کہ آج کل دیکھا جاتا ہے کہ ہم لوگوں میں اتحاد باقی نہیں رہتا۔ بلکہ ایک اتحاد ہی کیا ہے مجھے تو ایسی بدگمانی ہے کہ جب میں سنتا ہوں کہ مسلمانوں نے کوئی کام شروع کیا ہے تو سب سے پہلے یہ خیال ہوتا ہے کہ دیکھئے استقلال کے ساتھ چلے گا بھی یا نہیں کیونکہ میں رات دن دیکھتا ہوں کہ نہ ہمارے کارخانے چلتے ہیں نہ انجینس، نہ مدرسے نہ اتحاد و اتفاق۔ ہاں ایک چیز ہمیشہ چلتی ہے وہ کیا جوتا اور لٹھیر ایک بار جہاں چلا عبھر چلتا رہتا ہے۔ چاہے اس کی بنیاد کیسی ہی کمزور ہو مگر شاخیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ جیسے عیسائی جاہلیت کے زمانہ میں ایک گھوڑ دوڑ ہوتی تھی جس میں ایک فرق کا گھوڑا آگے نکل گیا تھا تو اسی بات پر صدیوں لڑائی رہی۔ ہماری حالت آج کل اہل جاہلیت کی حالت کی مشابہ ہے کہ جہاں ذرا سی بات پر جوئے چلا پھر وہ برسوں تک چلتا رہتا ہے۔ باقی اتحاد و اتفاق۔ اس کی عمر ہمارے یہاں بہت مھوڑی ہے۔ گو پھر ار حدوث اتحاد کی بہت کوشش کرتے رہتے ہیں اور اس پر تقریریں

بہت ہی ہوتی ہیں۔ مگر آج کل کسی نے بقا را اتحاد کے اسباب بیان نہیں کئے۔ نہ عدم بقا کے اسباب کو مرتفع کیا۔ حالانکہ سب سے پہلے مسئلہ قابل غور تھا۔ اس لئے اس وقت میں اسی کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اور اسی کے ضمن میں اسباب صحیحہ حدوت کے بھی مذکور ہو جائیں گے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ خَاصَّةٌ بَيْنَ اَخَوِيكُمْ وَاتَّقُوا مَلَكًا
لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ۔ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں (پس اگر کبھی ان میں نزاع ہو تو) آپس میں دو بھائیوں میں
صلح کرادیا کرو۔ یہاں ”فاصلہ باین اَخَوِيكُمْ“ میں اس پر تنبیہ ہے کہ بچوں کو کسی ایک فریق کی اعانت
نہیں کرنا چاہیے بلکہ دونوں کو اپنا بھائی سمجھ کر اس طرح صلح کرنا چاہیے۔ جیسے حقیقی دو بھائیوں میں صلح
کرائی جاتی ہے کہ ان میں سے کسی کا نقصان گوارا نہیں ہوتا۔ اور صلح کا یہ طریقہ نہیں جو آج کل رائج ہے کہ
دونوں فریق کو کچھ کچھ دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جس کا حق ہوتا ہے اس کو بھی دیا جاتا ہے بلکہ صلح
کرانیکا طریقہ یہ ہے کہ جو حق پر ہو اس کو غلبہ دیا جائے اور جو حق پر نہ ہو اس کو دیا جائے، کیونکہ صاحب حق
کو دینا اضرار ہے۔ اور غیر صاحب حق کو دینا اضرار نہیں اس میں تو اسے اضرار سے روکنا ہے۔

مگر آج کل عجیب دستور ہے کہ صاحب حق وغیر صاحب حق دونوں کو
اصلاح کا طریقہ دیتے ہیں۔ سو یہاں اصلاح سے یہ مراد نہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ

اس سے پہلے ارشاد ہے۔ وَاِنْ كَانَتَيْنِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اُتَتْ لَوْ اَفَا صَلَّحُوا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَعَثَ
اِحَدَاهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوْا اَلَّتِي تَتَّبِعِيْ حَتّٰى تَفِيْءَ اِلٰى اَمْرِ الْمَلِكِ خَاِنٌ فَاَنْتَ فَاَصْلَحُوا
بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوا اِنَّ الْمَقْسُطِيْنَ۔

یعنی اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں باہم لڑنے لگیں تو دونوں میں (ادل) صلح کرادو۔ پھر اگر ان میں
سے ایک دوسرے پر ظلم کرے تو جو زیادتی اور ظلم کرے تو اس سے مل کر قتال کر دو۔ یہاں تک کہ وہ
حکم الہی کی طرف واپس آجائے اس سے صاف معلوم ہوا کہ اصلاح کے معنی یہ ہیں کہ حکم الہی کے موافق
فیصلہ کیا جاوے اور یقیناً صاحب حق کو دینا حکم الہی کے خلاف ہے پس اگر فریقین حکم الہی کی مطابقت
فیصلہ پر راضی ہو جائیں تو نہا۔ جو ظلم پر کمر بستہ ہو اور دوسرے کا حق مارنا چاہتا ہے سب کو اس
سے لڑنے کا حکم ہے یہ حکم نہیں ہے کہ بس جس طرح ہو صاحب حق کا گلا گھونٹ گھانٹ کر لڑائی موقوف
کرادو۔ آج کل لوگوں نے اصلاح اسی کو سمجھ رکھا ہے کہ بس لڑائی موقوف ہو جائے چاہے

صاحب حق کو ہی دیا جائے مگر شریعت نے اس کو اصلاح ہی نہیں سمجھا بلکہ شرعاً اصلاح یہ ہے
کہ حق بحقدار رسد۔ اور جو دوسرا طریق حق دار کے حق میں پس و پیش کرے تو پھر یہ حکم ہے کہ

سب مل کر اس کو دباؤ اور لڑائی کی ضرورت ہو تو اس سے لڑو اس سے معلوم ہوا کہ اصلاح میں بعض دفعہ
سختی اور قتال کرنا بھی مستحسن ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نا اتفاقی کی غرض سے اتفاق کرنا تو برا ہے اور اتفاق کی غرض سے نا اتفاقی کرنا
جائز بلکہ واجب ہے۔ مثلاً اس غرض سے اتفاق کریں کہ پانچویں سے نا اتفاقی کریں گے۔ یہ مذموم ہے اور
یہیں سے معلوم ہو گیا کہ اگر خدا تعالیٰ سے نا اتفاقی کرنے پر اتفاق ہو۔ یعنی معاصی پر اجتماع ہو تو وہ کیوں برا نہ
ہوگا۔ یقیناً یہ اتحاد سب سے بدتر ہے۔ مگر آج کل لوگوں نے اتفاق کا نام یاد کر لیا ہے اور اس کو مطلقاً
محمود سمجھتے ہیں حدود کی رعایت نہیں کرتے یہ بالکل غلط ہے شریعت میں نماز تک کے لئے
حدود ہیں کہ طلوع و غروب اور دوپہر کے وقت اور بغیر استقبال قبلہ کے نماز حرام ہے۔ اسی طرح
ذکر اللہ کے لئے حدود ہیں کہ ذکر میں نیند آجائے تو سونے کا حکم ہے اس وقت ذکر ممنوع ہے۔
شریعت کا مقصود ان حدود سے یہ ہے کہ بندہ کا غلام ہونا چاہیے۔ جس وقت جو حکم ہو اس کا امتثال
کرے، چاہے عبادت کا حکم ہو، یا ترک عبادت کا، بس وہ شان ہو

من چوں کلکم در میان اصبعین نیستم در صف طاعت بین بین
قلم کی خوبی یہ ہے کہ جب چلائیں تو پلے اور جب روکیں رک

امتحان کے لئے حلالتی جاتے کیونکہ قلم اگر روکے سے بھی نہ رے تو حرف بگڑ جاتے ہیں
اسی طرح عبادات حدود شرعیہ کے خلاف معاصی ہیں اس لئے حکم ہے کہ نیند کے وقت ذکر موقوف
کر کے سو رہو، تو اتنی بڑی چیز غیر مستحسن ہونے کا شبہ ہی نہیں ہو سکتا وہ بھی ایک وقت میں ترک
حدود کی وجہ سے مذموم ہو جاتی ہے۔ تو اتحاد کے لئے حدود کیوں نہ ہوگی اور ان حدود کے خلاف
جو اتحاد ہو وہ مذموم کیوں نہ ہوگا۔ پس اتحاد کی بھی ہر فرد مستحسن نہیں اس کو علی الاطلاق محمود کہنا اتحاد کا
ہیضہ ہے۔ انفس آج کل اتحاد کے فضائل بہت بیان کئے جاتے ہیں مگر اس کے حدود و اصول بیان
نہیں کئے جاتے۔

پس خوب سمجھ لو کہ خدا سے نا اتفاقی کرنے پر اتفاق کرنا مذموم اور نہایت مذموم ہے۔ پس
اس سے اس اتحاد کا حکم سمجھ لیا جاوے جس میں اتحاد کے لئے شریعت کے احکام کو
چھوڑا جاتا ہے۔

صاحبو! جیسے اتفاق مستحسن ہے ایسے ہی کبھی نا اتفاقی بھی مستحسن ہے۔ پس جو لوگ
خدا سے تعالیٰ کے احکام چھوڑنے پر اتفاق کریں ان کے ساتھ نا اتفاقی کرنا اور مقابلہ کرنا محمود ہے

دیکھو جیسے عمارت بنانا محمود ہے ایسے ہی بعض عمارات گرنا بھی محمود ہے۔ اگر آپ اپنی رعایا سے کوئی مکان خریدیں اور اس میں بجائے کچے کوٹھروں کے عمدہ کوٹھی بنانا چاہیں تو ایسی عمارت کو گرائیں گے یا نہیں؟ یقیناً گرائیں گے۔ اب بتائیے یہ انصاف محمود ہے یا مذموم اس کے محمود ہونے میں کسی عاقل کا کلام نہیں ہوتا، پھر کسی موقع پر نا اتفاقی کے محمود ہونے میں کیوں شبہ ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ جس طرح بھی ہو صلح کرادو۔ بلکہ یہ حکم دیا کہ صحیح بنیاد پر صلح کرادو، اور اگر لوگ اسپر راضی نہ ہوں تو سب مل کر غلط بنیاد کو ڈھادو۔ پھر قتال کے بعد طائفہ باغیہ حق کی طرف رجوع ہو جائے حکم یہ ہے فانی فہم فاضل فیہما بالعدل والفسطول یعنی اب پھر ان کے معاملہ کی انصاف کے ساتھ اصلاح کرو یہ نہیں کہ بس لڑائی موقوف ہوتے ہی ان کا مصالحت کرادو۔ اس میں بھی لوگ غلطی کرتے ہیں۔ بعض لوگ صلح کرانا اس کو سمجھتے ہیں کہ جہاں دو آدمیوں میں نزاع ہو فوراً دونوں کا مصالحت کر دیا جائے چاہے فریقین کے دل میں کچھ ہی بھرا ہو۔ میں بھی ایسا نہیں کرتا۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ پہلے معاملہ کی اصلاح کرو ورنہ بدون اصلاح معاملہ کے نزاع مصالحت بیکار ہے۔ اس سے فریقین کے دل کا غبار نہیں نکلتا تو مصالحت کے بعد پھر مکافہ مندرج ہو جاتا ہے یعنی مقابلہ، تو حق تعالیٰ نے "فارت" کے بعد یہ نہیں فرمایا۔ "فکفو" دیکھو کہ زیادتی کرنے والا حق کی طرف رجوع ہو۔ پس تم ہاتھ ردک لینے پر اکتفا کرلو، بلکہ فرماتے ہیں جب دوسرا فریق زیادتی چھوڑ دے تو اب پھر اصلاح معاملہ کی عدل کے ساتھ کوشش کرو۔ یہ قید یہاں ایسی بڑھائی گئی ہے جس پر ساری عقول قربان ہیں کیونکہ نزاع بدون اس کے ختم ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر اس نکتہ پر کسی کی عقل نہیں پہنچتی۔

اصلاح کا حاصل بہر حال اصلاح کے نہ یہ معنی ہیں کہ صاحب حق کو دیا جائے نہ یہ معنی ہیں کہ محض مصالحت کر دیا جائے بلکہ اصلاح کے معنی یہ ہیں کہ حق کو غالب اور باطل کو مغلوب کیا جائے۔ یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو آج کل علماء دیوبند اور جماعت رضائیہ میں اتفاق کرنا چاہتے ہیں اور دونوں جماعتوں پر باہمی نا اتفاقی کا الزام دھرتے ہیں کہ اسلام کو ضرر پہنچ رہا ہے۔ سبحان للہ! اس کے تو یہ معنی ہوتے کہ ایک شخص کے گھر پر چور ڈاکہ ڈالیں اور وہ ان پر دعویٰ کر دے تو دونوں فریق کو نا اتفاق کا مجرم قرار دے کہ دونوں کو اتفاق پر مجبور کیا جائے۔ بلکہ اس صورت میں ہر عاقل چوروں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ مالک کا مال واپس کر کے اس سے اتحاد کریں مالک کو اتحاد پر کوئی مجبور نہیں کرتا۔ نہ اس کو دعویٰ دائر کرنے سے مجرم قرار دیتا ہے۔

اسی طرح علماء دیوبند کو جس جماعت سے اختلاف ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ دین پر ڈاکہ وہ لوگ دین پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ اور احکام میں تحریف کرتے ہیں۔ ان دونوں میں اتفاق کرانے کی صورت یہی ہے کہ اول حق و نافع کو معلوم کیا جائے پھر جو نافع پر ہو اس کو دیا جائے یہ طریقہ نہایت غلط ہے کہ حق و باطل کی تعیین سے پہلے ہی دونوں فریق کو اتفاق پر مجبور کیا جاتا ہے اور ہر ایک کو دیا جاتا ہے۔ یہ اتفاق ہرگز قائم نہیں رہ سکتا۔ (جامع)

اسپر فریقین اتفاق کر لیں تو خیر، ورنہ اس اتفاق کی طرف لانے کے لئے فریق مبطل سے نا اتفاقی اور قتال کا حکم ہے، پس حق تعالیٰ فرماتے ہیں "لَا تُلَاحِظُوا الْعُتْرَاقَ" مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس میں حق تعالیٰ نے حکم اخوت کو صفت مومن پر مرتب فرمایا ہے اور اصول کا قاعدہ ہے کہ جہاں کسی صفت پر حکم مرتب ہوتا ہے وہاں وہ صفت حکم کی علت ہوتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ہم میں جو اخوت کا تعلق ہے اس کی علت ایمان ہے اور وہی اخوت مطلوب ہے جس کی بنیاد ایمان پر ہو۔ صاحبو! آج کل جو اتفاق و اتحاد کو بقاء نہیں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد ایمان پر نہیں ہوتی، بلکہ ہوائے نفسانی یا معاصی پر ہوتی ہے اس لئے وہ بہت جلد ہوا ہو جاتا ہے (یعنی فانی) اس لئے اگر اتفاق کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو اس کی بنیاد ایمان پر قائم کرو۔ مگر آج کل تو ایمان کو ایسی بے قدر چیز سمجھ رکھا ہے کہ اس کی کچھ وقعت ہی نہیں ہے۔ جس کی بنیاد ایمان پر رکھی جاتی ہے اس کے متعلق لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ملاؤں کا کام ہے۔ چنانچہ آج کل زبانوں پر یہ بات بہت کثرت سے کہہ کر یہ وقت نماز روزہ کا نہیں ہے اتحاد کا وقت ہے۔ اور جب کوئی اللہ کا بندہ اعتراض کرتا ہے کہ اتحاد کی وجہ سے احکام شرعیہ کا فوت کرنا جائز نہیں تو نہایت بے باکی سے جواب دیا جاتا ہے کہ یہ وقت جائز و ناجائز کا نہیں ہے۔ کام کا وقت ہے۔ اور غضب یہ ہے کہ اس متن پر بعض اہل علم نے حاشیہ چڑھا دیا ہے کہ اتفاق و اتحاد وہ چیز ہے کہ اس کے قائم کرنے کے لئے نماز قضا کر دی گئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عز وہ احزاب میں نمازیں قضا کر دی تھیں۔ سبحان للہ! کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ بھانٹی کا کنبہ جوڑا، اول تو یہی بتلائیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں کس سے اتحاد کر رہے تھے جو اتحاد کی وجہ سے نمازیں قضا ہوئیں، بلکہ وہاں تو عدم اتحاد اس کا سبب ہوا تھا۔ کفار سے مقابلہ اور لڑائی تھی۔ نہ کہ اتحاد کی گفتگو، اور اگر کوئی شخص اپنے اس اتحاد کو بھی مقابلہ میں داخل کرنا چاہے تو پھر وہ ثابت کرے کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود فرصت کے نمازیں قضا کر دی تھیں۔ یا کفار نے آپ کو نماز پڑھنے کی مہلت ہی نہ دی تھی۔ احادیث و واقعات

میں صاف مذکور ہے کہ وہاں نماز کے قضا کرنے کا سبب یہ تھا کہ کفار نے آپ کو نماز کی مہلت نہ دی تھی کیونکہ مقابلے کے وقت مہلت اپنے قبضہ میں نہیں رہتی، بلکہ دونوں پر موقوف ہوتی ہے۔ اگر ایک مہلت لینا چاہے اور دوسرا مقابلے سے باز نہ آئے تو اس مہلت کا لینا بیکار ہے۔ پھر ایسی حالت میں نماز کیسے پڑھی جائے۔ بہر حال اس وقت قتال درپیش تھا اور ایسی حالت تھی کہ صلوٰۃ الخوف بھی نہ پڑھ سکتے تھے اس لئے آپ نے نماز قضا کی مگر آج کل جو اتحادی جلسوں اور ترقی قوموں کے مشوروں میں نمازیں قضا کی جاتی ہیں ان پر کون سا حملہ ہوتا ہے جس سے ان کو نماز کی مہلت نہیں ملتی، انکس باتیں بنانے اور دور از کار ریز دیشنوں کے پاس کرنے میں تو نمازیں قضا ہوتی ہیں۔ اور ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات پر قیاس کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کو کچھ تو شرم کرنی چاہیے۔ پس خوب سمجھ لو کہ یہ مسائل اور یہ دلائل سب غلط تھے۔ اور نماز شایہ کیا

اتحاد غلط طور پر | گیا کہ ان لوگوں کو اتحاد کا ایسا ہیضہ ہوا کہ کفار کو بھی بھائی بنایا اور ان کی رعایت میں احکام شرعیہ کو چھوڑا گیا اور اس کی یہ مصلحت بیان کی جاتی ہے کہ اس سے اسلام کو کفار کی طرف انجذاب ہوگا۔ اور اگر ان کو بھائی نہ بنایا گیا تو اسلام سے بعید اور اجنبی رہیں گے۔

صاحبو! یہ خیال محض لغو تھا۔ اسلام تو ایسی حسین چیز ہے کہ کسی کی آنکھ میں کجی نہ ہو تو اس کا حسن ضرور اپنی طرف کھینچے گا۔ چاہے تم اس کو بھائی بھی نہ کہو بلکہ دشمن ہی کہو۔ ابو جہل کی آنکھ میں کجی تھی اس لئے اس کو ہدایت نہ ہوئی اور جس کی نگاہ میں کجی نہ تھی وہ کسی نہ کسی وقت اسلام کی طرف آئے اور پھر آئے حالانکہ عجمیہ اسلام سے عداوت ہی ظاہر کرتے رہتے تھے اور مسلمان بھی ہر موقع پر ان سے مقابلہ کرتے رہتے تھے۔ پس اسلام کو اپنی طرف مجذب کرنے کے لئے کسی کو بھائی بنانے کی ضرورت نہیں، وہ دشمن کو دشمن سمجھ کر بھی اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام نے دوسری قوموں کے حقوق کی بھی پوری رعایت کی ہے وہی حقوق اور وہی رعایت سب کے جذب کے لئے کافی ہے۔ پس میں یہ بھی نہ کہوں گا کہ کفار ہمارے بھائی ہیں۔ ہاں یہ کہوں گا کہ مسلمان بھائی بھائی ہیں اور وہ ہمارے پڑوسی ہیں اور اسلام میں ہمسایہ کے بھی حقوق ہیں گو وہ کافر ہی ہو اور اگر ان کو بھائی کہا جاوے تو یہ بات چل نہیں سکتی نہ اس کو اس بیجا خوشامد کا یقین آ سکتا ہے۔ اور یہ نگران کے بھی بالکل خلاف ہے۔

پس کفار سے ایسا اتحاد شرعاً جائز نہیں ہے جس میں احکام الہیہ کفار سے اتحاد کی بھی مخالفت کی جاوے۔ بھلا اگر ایسا اتحاد محمود ہوتا تو حضور

صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی عقل کامل پر تمام عالم کا اتفاق ہے، لا الہ الا اللہ کی تعلیم کیوں دی ہوتی جس سے تمام عالم میں تہلکہ مچ گیا اور کفار کہنے لگے اجعل الالہۃ الہنا واحداً ان ہذا نشیء عجائب۔ وانطلق الملأ منہم ان امشوا واصبروا علی الہیتکم ان ہذا النشیء یراد اس تعلیم سے پہلے سب کفار آپ کے ساتھ متحد تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اتفاق کی بنیاد کو اکھاڑ ڈالا۔ کیونکہ کفار کے اس موافقت کی بنیاد کفر پر تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے کفر سے ہم کو نہیں روکا گیا۔ اسلئے خوش تھے اور ظاہر ہے کہ یہ بنیاد نہایت کمزور اور بچر بنیاد تھی۔ آپ نے اس کی نیویں تکالیس پھر نئی بنیاد ڈال کر اس پر عالی شان عمارت بنانے لگے مگر ہماری حالت اس وقت یہ ہو رہی ہے کہ ترقی و اتحاد بھی کرتے ہیں تو اس طریقہ پر جس پر کفار نے ترقی کی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر نہ ہماری ترقی ہے نہ اتحاد ہے حالانکہ ہم کو کفار کی چیزوں کی طرف تو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی ممانعت ہے۔

حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہیں۔ وَلَا تَشْتَدَّ عَيْنُكَ إِلَى مَا مَتَّعْنَاهُمْ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ ذَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْثَتِهِمْ فِيهِمْ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَابْعَثْ ۵۔ (اور اپنی نگاہوں کو اس چیز کی طرف دراز نہ کیجئے جس کے ساتھ ہم نے کفار کی بعضوں جماعتوں کو تمتع دیا ہے جس میں زندگی دنیا کی رونق ہے تاکہ اس میں ہم ان کی آزمائش کریں اور آپ کے رب کی عطا بہتر ہے اور پائیدار ہے) اس میں تو کفار کے طریقہ ترقی کی طرف نگاہ اٹھانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ آگے اپنی طرف سے ترقی کا طریقہ بتلاتے ہیں وَأَمَّا أَهْلُكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا تَسْتَلْكَ رِزْقًا مِّنْ نُّزْرَتِكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ۔ (اور اپنے اہل کو نماز کا حکم کیجئے اور خود بھی) اسپر جمے رہیے۔ آپ سے ہم رزق نہیں مانگتے۔ رزق تو ہم خود ہی آپ کو دیں گے اور (اچھا) انجام تقویٰ ہی کا ہے) اس میں پابندی نماز اور تقویٰ کا حکم ہے اس کو کفار کی ترقی کے مقابلے میں بیان کرنا اس کی دلیل ہے کہ اسلامی ترقی کا طریقہ یہ ہے۔

لیجئے! انہوں نے بھی ملائوں ہی کے مذاق کی رعایت کی ہے۔ اب بتلاؤ! کیا اس قرآن کو مٹا دو گے؟ میرا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کے سارے کام چھوڑ دو۔ اور نماز روزہ ہی کے ہو رہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ دنیا کو اصل مقصود نہ سمجھو، باقی بضرورت دین دنیا میں مشغول ہونے کا مضائقہ نہیں اس کی ایسی مثال ہے، جیسی کھانے کی ضرورت سے کندھے جمع کئے جاتے ہیں۔ اور جب کوئی پوچھتا ہے کہ یہ کھانا کتنے میں تیار ہوا ہے تو اس کی فہرستیں کندھے اور ٹکڑیاں بھی شمار ہوتی ہیں۔ (الاخوة ص ۲۳۱)

۷۱۔ پردہ کا عقلی ثبوت

آج کل بعض ناعاقبت اندیش پردہ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ پردہ کے توڑنے میں قطع نظر خلاف شرع اور گناہ ہونے کے اتنی خرابیاں ہیں کہ آج جو عقلا پر پردہ کی مخالفت کرتے اور پردہ اٹھا دینے کی کوشش کرتے ہیں ان خرابیوں کو دیکھ کر بعد میں خود ہی یہ تجویز کریں گے کہ پردہ ضرور ہونا چاہیے مگر اس وقت بات قابو سے نکل چکی ہوگی اب تو بنی بنائی بات ہے اس کو ہمیں بگاڑنا چاہیے۔ پھر پتھائیں گے اور کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ آج کل ایسا مذاق بگڑ گیا ہے کہ کوئی پردہ کو خلاف فطرت کہتا ہے۔ کوئی قید اور حبس بیجا کہتا ہے۔

ایک مسلمان انجینیئر تھے۔ ان سے ایک پادری انجینیئر نے کہا کہ مسلمانوں کا مذہب بہت اچھا ہے اس میں سب خوبیاں ہیں مگر عورتوں کو قید میں رکھا جاتا ہے۔ مسلمان انجینیئر نے کہا کہاں ہم نے تو کسی مسلمان عورت کو قید میں نہیں دیکھا۔ کہا وہی قید ہے جس کا نام تم نے پردہ رکھا ہے۔ تو ان مسلمان انجینیئر صاحب نے پادری سے کہا کہ پہلے آپ یہ بتائیے کہ قید کس کو کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قید جس خلاف طبع کو کہتے ہیں۔ اور جو جس خلاف طبع نہ ہو اس کو قید ہرگز نہ کہیں گے ورنہ پاخانہ میں جو آدمی پردہ کر کے بیٹھتا ہے اس کو بھی قید کہنا چاہیے۔ کیونکہ پاخانہ میں آدمی تمام آدمیوں کی نگاہوں سے چھپ جاتا ہے۔ سب سے الگ ہو جاتا ہے مگر اس کو کوئی نہیں کہتا کہ آج ہم بھی اتنی دیر قید میں رہے۔ اور فرض کرو اگر اس پاخانہ میں کسی کو بلا ضرورت بند کر دیا جائے کہ باہر سے زنجیر لگا دیں اور ایک پہرہ دار کھڑا کر دیا جائے اور اس سے کہہ دیا جائے کہ خبردار یہ آدمی یہاں سے نکلنے نہ پاوے تو اس صورت میں بیشک یہ جس خلاف طبع ہو گا اور اس کو ضرور قید کہیں گے اور اس صورت میں بند کرنے والے پر جس بیجا کا مقدمہ قائم ہو سکتا ہے۔ بتلائیے ان دونوں صورتوں میں فرق کیا ہے؟ فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں جس خلاف طبع نہیں اور دوسری میں خلاف طبع ہے۔

پس ثابت ہو کہ مطلق حبس کو قید نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ جس خلاف طبع کو قید کہتے ہیں پس آپ کو پہلے یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہے کہ مسلمان عورتیں جو پردہ میں رہتی ہیں وہ انکی طبیعت کے موافق ہے یا خلاف اس کے بعد یہ کہنے کا حق تھا کہ پردہ قید ہے یا نہیں، میں آپکو مطلع کرتا ہوں کہ پردہ مسلمان عورتوں کے خلاف طبع نہیں ہے کیونکہ مسلمان عورتوں کیلئے حیا

امر طبعی ہے۔ لہذا پردہ جس موافق طبع ہو اور اس کو قید کہنا غلط ہے۔ ان کی حیا کا مقتضایہ ہی ہے کہ پردہ میں مستور رہیں بلکہ اگر ان کو باہر پھرنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ خلاف طبع ہو گا۔ اور اس کو قید کہنا چاہیے۔ (کسار النساء ص ۵۹)

۷۲۔ کیا وجہ ہے کہ اعمال آخرت میں رغبت

نہیں ہوتی۔

اعمال میں کوتاہی اور بے رغبتی کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اعمال میں اور ان کی اجزاء میں کچھ تعلق اور ارتباط نہیں۔ یوں سمجھتے ہیں کہ ان اعمال پر جو جزائیں ملتی ہیں ان میں اور اعمال میں باہم کوئی علاقہ نہیں، ایسا سمجھتے جیسے اس دنیا کے اسباب اور مسببات میں علاقہ ہے۔ مثلاً سہارنپور سے ریل میں سوار ہو کر نئی تال چلے تو اس لین میں اور نئی تال میں یہ علاقہ ہے کہ پہلے بریلی پہنچے پھر بریلی سے چل کر کانٹھ گودام کا اسٹیشن ملتا ہے وہاں کچھ دیر کے بعد اور سواری ملتی ہے ہر حال نئی تال اور ان اسباب میں ایک قوی علاقہ ہے تو معلوم ہوا کہ اس علاقہ کی وجہ سے کشش ہوتی ہے اور یہاں علاقہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور سمجھ میں اسلئے نہیں آتا کہ نظر نہیں آتا۔ اس لئے دل کی کشش نہیں ہوتی یعنی ابھرتی نہیں طبیعت جیسی کے لئے ابھرتی چاہیے۔ بعنوان دیگر، میری مراد یہ ہے کہ اس مقصود کے لئے طبیعت اس واسطے نہیں ابھرتی کہ خود اس مقصود کو اپنے اختیار میں نہیں سمجھتے اور خود اس واسطے نہیں سمجھتے کہ اسباب اور مقصود میں یعنی اعمال میں اور جزاؤں میں کچھ علاقہ نہیں سمجھتے ورنہ اگر علاقے سمجھتے تو چونکہ اسباب اختیاری ہیں اس لئے اس حیثیت سے مقصود کو بھی اختیاری سمجھتے۔ جب اختیاری نہیں سمجھتے تو طبیعت ابھرتی بھی نہیں کیونکہ طبیعت اسی کام میں ابھرتی ہے جس کو انسان اپنے اختیار میں سمجھتا ہے چنانچہ یہی بات ہے کہ عامی کو کبھی سلطنت کی ہوس بھی نہیں ہوتی اس کو کبھی اس کو دوسرے بھی نہیں آتا کہ میں بادشاہ ہوجاؤں، وہ کبھی اسپر عورت ہی نہیں کرتا کہ کسی ترکیب سے سلطنت حاصل کر دو، بادشاہ بنو، محل میں رہو، مثلاً ایک رئیس سے پوچھا کہ بادشاہ یوں محل میں رہا کرتے ہیں یوں ان ساز و سامان ہوتے ہیں یوں حشم و خدم ہوتے ہیں۔ خیر ان عجائب امور کو سن کر چاہے اس کا جی خوش ہونے لگے لیکن یہ ہرگز نہ ہو گا۔ اس کی طبیعت میں گدگدی اور دھڑ دھڑی پیدا ہو کہ کسی ترکیب سے سلطنت حاصل کرنی چاہیے لاؤ سلطنت حاصل کرنے کا طریق معلوم کریں،

یہ بھی سمجھتا ہے کہ اگر کسی سے پوچھو تو وہ بھی تو وہ ڈانٹ دے گا کہ اب تو پاگل ہو گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ جوتیاں کھا دے گا۔ سبحان اللہ! رہیں تھوڑی دیر میں خواب دیکھیں محلوں کا۔

غرض بادشاہوں کے قصے سن کر وہ سلطنت حاصل کرنے کا طریق معلوم نہ کرے گا۔ اور اگر معلوم بھی کر لے تو کیا ہے۔ وہ اتنے بعید ہیں کہ وہ بیچارہ کا طائر دم بھی وہاں نہیں پہنچ سکتا۔ اب سر رٹو کر رکھنے والا اور گواہ اٹھانے والا بھی بادشاہوں کے قصے سنتا ہے۔ لیکن کیا کبھی اس کے ذہن میں بھی یہ خیال آتا ہے کہ لادیں بھی بادشاہ بننے کی کوشش کر دوں۔ کس سے پوچھوں کہ سلطنت کیونکر حاصل ہوتی ہے۔ اگر معلوم ہو کہ لڑنے سے حاصل ہوتی ہے تو کیا مشکل ہے ہم بھی فوج اکٹھا کر لیں گے۔ ہم بھی لڑیں گے۔ میں پوچھتا ہوں کیا اس کے بھی ذہن میں کبھی یہ خیالات آتے ہیں؟ کبھی نہیں اس واسطے کہ وہ اسباب ہی اختیار میں نہیں تو پھر کتنا ہی بڑا مقصود کیوں نہ ہو۔ طبیعت ابھرتی ہی نہیں۔ بخلاف اس کے نیتی تال کا حال سنا تو طبیعت میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہے نکر ہوتی ہے کہ بس پچاس روپے پاس ہوں تو وہاں پہنچیں۔ اور اگر ہوں بھی پاس، بس پھر کیا ہے۔ پھر تو سمجھتا ہے کہ وہاں پہنچنا گویا ہر وقت اختیار میں ہے اور سوچتا ہے کہ جب اختیار میں ہے تو پھر کیوں نہ حاصل کیا جاوے اس مقصود کو۔ چنانچہ نہایت شوق کے ساتھ وہاں پہنچنے کا فوراً اہتمام کرنے لگتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک تو جس مقصود کے اسباب کو انسان اختیار ہی نہیں سمجھتا ہو لیکن اسباب اور مقصود میں تعلق معلوم نہ ہو تب بھی حرکت نہیں ہوتی۔ اس حالت میں اسباب کی طرف حرکت نہ ہوتی وجہ اسباب ہیں اور مقصود میں تعلق معلوم نہ ہونا ہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مقصود کی طرف حرکت نہ ہونے کی کہ ان اسباب اور مقصود میں چونکہ تعلق معلوم نہیں اس لئے ان اسباب پر اس مقصود کے ترتیب کا متفقہ نہیں اور اس متفقہ نہ ہونے سے باوجود اسباب کے اختیاری سمجھنے کے بھی اسباب کو اختیار نہیں کرتا اس واسطے کہ مقصود اگر اختیار میں ہے تو بواسطہ اسباب ہی کے تو اختیار میں ہے تو گویا اسباب اختیار میں ہیں لیکن چونکہ اسباب اور مقصود میں تعلق نہیں اس لئے اسباب کے اختیار کرنے کا حال طاری نہیں ہوا اس کو جس طرح اسباب کے اختیاری ہونے کا علم ہے۔ اسی طرح اگر یہ بھی معلوم ہوتا کہ اگر اسباب اور مقصود میں یہ تعلق ہے تب طبیعت ابھرتی اور شوق پیدا ہوتا۔ اب وہ تعلق تو چونکہ ذہن میں حاضر نہیں اس لئے اسباب اختیار کرنے میں جی لگتا نہیں ہے۔ یہ اطمینان نہیں ہے کہ اسباب اختیار کرنے سے مقصود ضرور حاصل ہو ہی جائے گا پھر جب مقصود ہی کو اختیاری نہیں سمجھتا تو اس کے اسباب اختیار کرنے کی طرف بھی حرکت نہیں ہوتی۔

جب یہ بات سمجھیں آگئی بطور مثال کے، تو اب یہ سمجھئے کہ نعمائے آخرت اور جنت کی طرف جو طبیعت نہیں ابھرتی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اعمال میں اور مقصود میں جو واقعی علاقہ ہے وہ نہیں سمجھتے یعنی ایسا علاقہ جیسا آگ جلانے اور کھانا پکھنے میں ایسا علاقہ جیسے پانی پینے اور پیاس کے بجھنے میں ایسا علاقہ جیسے ہمسر خاندان میں پیام دینے اور عورت کے گھر آجانے میں۔ غرض ایسا علاقہ نہیں سمجھتے اعمال صالحہ میں اور جنت کے حاصل ہونے میں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص قریب قریب یہ سمجھتا ہے کہ جنت میں داخل ہونا اختیاری نہیں۔ ہرگز ہرگز ذہن اس کی طرف نہیں جاتا کہ اعمال صالحہ پر جنت ضرور ہی مل جاوے گی۔ ایسا سمجھتے ہیں جنت کو کہ اعمال صالحہ پر بس محض اتفاقاً ہی مرتب ہو جاتی ہے جیسے کسی کو اتفاق سے سلطنت مل جائے مثلاً کہیں اتفاقاً ہمارا سر پر بیٹھ گیا اس لئے بادشاہت مل گئی۔ چنانچہ پرانے زمانہ کے ایسے ہی افسانے ہیں کہ کسی جگہ کا بادشاہ مر گیا اس کے کوئی اولاد بھی نہیں۔ اس لئے اس میں اختلاف ہوا کہ کس کو بادشاہ بنایا جاوے۔ اس کے متعلق پہلے یہ دستور تھا کہ ہمارا اڑتے تھے وہ جس کے سر پر بیٹھ جاتا اس کو بادشاہ بناتے تھے اور کوئی فقیر بھی اس وقت ہوتا اور اس کے سر پر ہما بیٹھ جاتا اسی کو بادشاہ بنا دیتے چنانچہ ہمارا اڑا یا گیا۔ جانور کو کیا عقل اتفاق سے ایک فقیر ہی کے سر پر جا بیٹھا۔ بس اسی کو تخت پر بیٹھا دیا گیا۔ اب اگر کوئی فقیر یہی حوصلہ کرنے لگے اور وہاں پہنچنے کا اہتمام کرے کہ شاید ہمارے ہی سر پر بیٹھ جائے اور میں بادشاہ ہو جاؤں تو سب اس کو احمق بنائیں گے کہ یہ کیا لغو حرکت ہے۔ یعنی محض ایک سوہوم امید پر کہ شاید ہمارے ہی سر پر آبیٹھے، اتنا لمبا سفر کرنا اور جو نہ بیٹھا پھر اتنا لمبا سفر بھی کیا۔ اور وہاں سفر کے بھی بوم ہوئے یعنی ہمارا تو کیا سر پر بیٹھا سب اتو بتاتے کہ بڑا لکڑھلے فلا نا فقیر۔ اسپر فقیر لگا دیں گے کہ بالکل الو ہی ہے بھلا تیرا ہی تو منتظر ہے ہمارا کہ کب وہ آئے اور کب میں اس کے سر پر بیٹھوں اتو کہیں کا۔ ارے کسی کا الو سیدھا کرنے کے لئے ہمارے کیوں ٹیڑھا ہونے لگا کیونکہ یہی ٹیڑھا ہونا ہے اس کا کہ نا اہل کے سر پر بیٹھے۔ پھر جب یہ حال ہے تو بھلا اسپر کوئی کیا سفر کرے۔ تو جیسے ہمارا سر پر بیٹھا غیر اختیاری سمجھا جاتا ہے اسی طرح جنت کا حاصل ہونا بھی لوگ غیر اختیاری سمجھتے ہیں۔ واقعی ٹٹول کر دیکھ لیجئے اپنے وجدان کو اکثر کا یہی قاعدہ ہے کہ جنت کا حاصل ہونا کسی کے اختیار ہی میں نہیں۔ حضرت میں کہتا ہوں اگر جنت اختیار میں نہیں تو حق تعالیٰ یہ کیوں ارشاد فرماتے ہیں۔ وسار عولانی مغفوة می ربک وجنتہ۔ دوڑ و منفرت اور جنت کی طرف، تو کیا اللہ میاں اندھی کو ٹھہری میں دوڑا کر سر پھڑواتے ہیں۔ پھر حکم بھی دوڑ کر چلنے کا فرمایا تو معلوم ہوا کہ مڑک بالکل

صاف ہے جو شخص اعمال صالحہ کرے گا۔ بشرطیکہ ایمان بھی ہو، واللہ العظیم ثمہ واللہ العظیم
ثمہ واللہ العظیم وہ مزدِ جنت میں داخل ہوگا۔ تو عجب ہے کہ یہ شخص گویا تکذیب کرتا ہے نصوص
کی۔ اور یہ خرابی کی ہے جاہل و اعظوں نے، انہوں نے بس یہ حدیث بیان کر دی کہ ایک شخص تھا جس
نے ساری عمر بیکار گزار دی اور جنت کے کام کئے لیکن اخیر میں دوزخی ہو گیا حالانکہ اس جاہل
واعظ نے حدیث کو سمجھا ہی نہیں۔ حدیث میں جو آیا ہے اس کا سبب بھی کسی عمل اختیاری ہی کا صدور
ہے۔ (آثار المربع ص ۱۲۹ تا ۱۳۰)

۷۳۔ عالم مثال اور عذاب و ثواب قبر کا اثبات

اور عالمِ مثال کا اثبات کرتا ہوں۔ سو سمجھ لیجئے کہ یہ ثابت ہے اشاراتِ نفوس سے۔ اور اشاراتِ قویں نے احتیاطاً کہہ دیا ہے ورنہ وہ اشارات بمنزلہ صراحت کے ہیں تو گویا بالتصریح یہ بات ثابت ہے کہ علاوہ شہادت یعنی دنیا کے اور عالمِ غیب یعنی آخرت کے ان دونوں کے درمیان میں ایک اور بھی عالم ہے جس کو عالمِ مثال کہتے ہیں جو من وجہ مشاہدہ عالمِ شہادت کے اور من وجہ مشاہدہ عالمِ غیب کے یعنی وہ برزخ ہے درمیان دنیا اور آخرت کے اور اس عالم کے ماننے سے ہزاروں اشکالات قرآن و حدیث کے حل ہو جاتے ہیں۔

مثلاً حدیث میں ہے اور یہ کام کی بات ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ قبر میں اس طرح سے عذاب ہو گا یا ثواب ہو گا مثلاً عذاب کی ایک صورت یہ بھی ہو گی کہ زمین مل جائے گی اور صاحب قبر کو دیلے گی۔ اس پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جتنا فصل لاش اور قبر کی دیواروں میں مردہ کو رکھتے دقت ہوتا ہے وہی باقی رہتا ہے لاش دہی دباتی کچھ بھی نہیں ویسی کی ویسی رکھی رہتی ہے۔ تو یہ صورت عذاب قبر کی جو حدیث میں آئی ہے ظاہر ہے کہ دنیا کے متعلق تو ہے نہیں کیونکہ مشاہدہ اس کی تکذیب کرتا ہے۔

یہ اشکال اس وجہ سے اور بھی قوی ہو گیا کہ لوگوں نے اس کو دنیا ہی کے متعلق سمجھ لیا ہے حالانکہ اگر دنیا کے متعلق ہوتا تو اس کے آثار کا نظر آنا بھی ضروری تھا۔ اور آخرت کے متعلق سمجھا جائے تو اول تو آخرت میں وہ زمین نہیں جو لفظ زمین سے متبادر ہے۔ دوسرے یہ کہ آخرت میں اگر وہ پہو یخ جاوے تو پھر وہاں وہی ٹھکانے ہیں جنت یا دوزخ۔ اور داخل ہونے کے

بعد جنت سے تو کسی کا نکلنا ممکن نہیں اور دوزخ سے بھی سب کا نکلنا ممکن نہیں۔ اور حشر ہوگا جنت اور دوزخ سے باہر تو معلوم ہوا کہ ابھی جنت یا دوزخ میں گیا ہی نہیں۔ پھر حدیث کے کیا معنی تو اول نظر میں تو کسی کو یہی شبہ ہو سکتا ہے کہ جو ملاحدہ اور اہل سائنس کہتے ہیں وہی ٹھیک ہے چنانچہ ملاحدہ اور بعض اہل سائنس جو ایمان لائے ان کا بھی مذہب یہی رہا کہ یہ سب مثالیں ہیں اور تشبیہیں ہیں۔ اور مطلب ان مثالوں کے دینے سے یہ ہے کہ ایسی حالت ہوتی ہے یعنی بعض مشابہ ان حالتوں کے ہوتی ہے۔ واقع میں یہ حالتیں پیش نہیں آتیں۔ تو اپنے نزدیک گویا بہت بڑی دوزخ دوزخ ہے۔

حاصل اس تقریر کا یہ ہوا کہ وہ لوگ محض روحانی عذاب و ثواب کے قابل ہو گئے اور جسمانی کے منکر ہو گئے۔

اسی طرح حدیث شریف میں جو ہے «القبوری و ضنی می ریاضی الجنة» دو حفرۃ میں حفرۃ میں
 «الغاری» یعنی قبر یا جنت کا ٹکڑا ہوتی ہے یا دوزخ کا گڑھا۔ تو وہ لوگ اس پر کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے
 ہیں قبر میں کہ یہاں نہ تو پھول ہیں جنت کے نہ آگ ہے دوزخ کی پھر اپنے ظاہری معنوں پر قبر و دوزخ
 کا گڑھا یا جنت کا ٹکڑا کیونکر ہو سکتی ہے۔ غرض یہاں قبر کی جنت و دوزخ میں تو یہ اشکال ہے، رہی
 آخرت سودوہاں کی دوزخ و جنت میں وہ اشکال ہے جو میں نے پہلے عرض کیا۔

بہر حال یہ اشکال حل نہیں ہو سکتا جب تک تیسرے عالم کے قائل نہ ہوں۔ یعنی عالمِ برزخ کے، جس کو عالمِ مثال بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ مشابہ اس عالم کے بھی ہے یعنی باعتبار آخرت ہے تو گویا کہ وہ دنیا ہے۔ اور باعتبار دنیا کے گویا وہ آخرت ہے تو وہ ایسا عالم ہے جیسا کہ باغ کا پھانک کہ بہ نسبت اندرونی حصہ باغ کے، تو گویا وہ باغ نہیں ہے۔ لیکن بہ نسبت خارج حصہ باغ کے گویا کہ وہ باغ ہے۔ یا جیسے حوالات کہ بہ نسبت گھر کے تو وہ جیل خانہ ہے مگر بہ نسبت جیل خانہ کے پھر گھر ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے عالمِ مثال کو دنیا کا بھی نمونہ بنایا ہے۔

تو جس وقت انسان مرتا ہے پہلے اس عالم مثال ہی میں جاتا ہے ۔ وہاں ایک آسمان بھی ہے مشابہ دنیا کے آسمان کے اور ایک زمین بھی ہے مشابہ دنیا کی زمین کے ۔ اور ایک جسم بھی ہے مشابہ اس جسم کے لیکن وہ بھی ہے جسم ہی ۔ تو مرنے کے بعد تو روح کے لئے ایک جسم مثال ہوگا اور آخرت میں جو جسم ہوگا وہی ہوگا جو دنیا میں ہے ۔

عصرِ یہ ایمان ہے ہمارا کہ حشر و دھاتی بھی ہے اور جسمانی بھی یعنی یہی جسم جو ہم اب

لئے بیٹھے ہیں اور جو گل سرخ خاک ہو جائے گا اسی کو حق تعالیٰ اپنی قدرت کا ملہ سے پھر تازہ بنا کر محشور فرمائیں گے۔ لیکن وہاں اس جسم کی خاصیت بدل جائے گی یعنی اب تو یہ خاصیت ہے کہ جو ہم کھاتے پیتے ہیں اس کا پیشاب پاخانہ بنتا ہے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں یہاں تک کہ ایک دن مر کر فنا ہو جانا ہے وہاں گویا ابدی اور خالد ہو جائے گا۔

عصرض ایک تو جسم یہاں ہے اور ایک جسم ہے عالم مثال میں اور وہ مشابہ ہے اس جسم کے یہ جسم بعینہ نہیں تو عالم مثال میں بدن بھی مثالی ہے وہاں کی جنت بھی مثالی ہے دوزخ بھی مثالی ہے۔ بس اس عالم مثال ہی کا نام قبر ہے۔ اب سب اشکال رفع ہو گئے۔ کیا معنی کہ قبر سے مراد یہ محسوس گڑھا نہیں ہے۔ کیونکہ کسی کو بھیڑ یا کھایا یا کوئی سمندر میں غرق ہو گیا تو اس صورت میں چونکہ وہ زمین میں دفن نہیں ہوا اسلئے اس کو چاہیے کہ قبر کا عذاب ہی نہ ہو۔ لیکن اب اشکال ہی نہ رہا کیونکہ وہ عالم مثال ہے وہیں اس کو عذاب قبر بھی ہو جائے گا۔ اشکال تو جب ہوتا جب قبر سے مراد یہ گڑھا ہوتا جس میں لاش دفن کی جاتی ہے حالانکہ اصطلاح شریعت میں قبر گڑھے کو کہتے ہی نہیں بلکہ عالم مثال کو کہتے ہیں قبر اور وہاں ہو پختا کسی حال میں منتفی نہیں، خواہ مردہ دفن ہو یا نہ ہو۔ اور اس عالم مثال کے نہ جانے ہی کی وجہ سے یہ بھی کہتے ہیں، عوام کی قبر زرا بڑی رکھنی چاہیے تاکہ مردہ کو بیٹھنے میں تکلیف نہ ہو، تو معلوم ہوتا ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسی قبر کے اندر مردہ کو بیٹھایا جاتا ہوگا۔ تو بس پھر کیا ہے اگر اپنے دشمن کو ستانا ہو تو اس کی قبر زرا تنگ بنا دی جاوے تاکہ ہرگز بھی اسے دشمن کے لئے تمنا کرتے ہیں کہ مر کر بھی مصیبت سے نہ بچے تو اچھا ہے حضرت یہ جو دسیع قبر شریعت نے تجویز کی ہے یہ اس بنا پر تھوڑا ہی ہے کہ اس کے اندر مردہ کو بیٹھایا جائے گا۔ جیسے آپ اس وقت بیٹھے ہیں بلکہ یہ تو محض اکرام اور عزت ہے مومن کی کہ اس کو مر کر بھی بیکار نہ سمجھے گیا۔ مرنے کے بعد بھی اس کے مرتبے کا لحاظ کیا اور ہر طرح اس کا اکرام کیا۔ یہ نہیں کہ دباں تھا ٹال دیا۔ بلکہ یہ حکم ہوا کہ اس کی اس وقت بھی خاطر و تواضع کرو۔ قبر ایسی بناؤ کہ اگر وہ زندہ ہوتا تو دسی ہی جگہ اس کے لئے تجویز کرتے کپڑا ایسا پہناؤ جیسا کہ وہ زندگی میں پہنتا۔ یعنی دیسا ہی صفائی ہو خوشبو میں بھی لگاؤ۔ مہلاؤ دھولاؤ بھی، غرض بنا سوار کر عزت کے ساتھ اس کو رخصت کر دو اور واقعی جیسا مسلمانوں میں مردہ کا اکرام ہوتا ہے کسی قوم میں نہیں ہوتا، اور عیسائیوں میں بھی بہت اکرام ہوتا ہے کسی قوم غلو بہت زیادہ ہے یہاں تک کہ بیٹی بھی کہتے ہیں۔ بوٹ بھی، پٹی بھی غرض پوری و ردی پہناتے ہیں۔ گویا وہاں جا کر بھی صاحب بہادر پہرہ ہی دیں گے۔

عصرض عیسائیوں کے یہاں تو اکرام میں غلو ہے اور ہندوؤں کے یہاں بالکل بھی اکرام نہیں بلکہ اور الٹی بے حرمتی ہے۔ یہاں تک کہ پیارے کا سر بھی پھوڑتے ہیں۔ خیر وہ بے چارہ تو نہیں ہے تو ذاتی سر پھوڑے جانے کا سخت۔ بہر حال اسلام میں اعتدال ہے تو وہ عالم مثال ہے جہاں مرنے کے بعد انسان اول پہنچتا ہے اور وہ مشابہ کچھ اس عالم کے ہے اور کچھ مشابہ عالم آخرت کے ہے وہیں اس کو فرشتے بٹھلاتے ہیں وہیں اس سے سوالات کرتے ہیں وہیں کی زمین اس کو دباتی ہے وہیں اس کو عذاب و ثواب ہوتا ہے وہ عالم یہی ہے جس کو حدیثوں میں قبر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور لو میں اب نہیں کچھ اس کا پتہ بھی بتائے دیتا ہوں جس سے یہی اس کی کچھ حقیقت سمجھ میں آجائے۔ اور وہ عالم کچھ کچھ خواب میں منکشف ہوتا ہے لیکن ایک تو خواب ہوتا ہے سچا اور ایک ہوتا ہے محض خیال، تو خواب سچا ہوتا ہے اس میں کچھ کچھ انکشاف اس عالم کا ہوتا ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ خواب میں حقیقت اس عالم کی مغلوب ہوتی ہے کیونکہ اس میں امیر بخش اس خیال کی بھی ہوتی ہے اور وہاں بالکل حقیقت ہی حقیقت ہوگی۔ وہ حقیقت اصل یہی عالم آخرت کی حقیقت اصل یہی ہے اعتبار سے تو بمنزلہ خواب ہی کے ہے بلکہ خواب میں جو حقیقت عالم مثال منکشف ہوتی ہے وہ بمقابلہ مثال کی حقیقت اصل یہی ہے اتنی ضعیف نہیں ہوتی ہے جتنی عالم مثال کی حقیقت اصل یہی مقام عالم آخرت کی حقیقت اصل یہی ہے ضعیف ہے وہ اس سے بھی ضعیف تر ہے۔ تو خواب میں اگر کوئی یہ دیکھے کہ مجھے سانپ نے کاٹا تو اب وہ خواب ہی میں بھاگتا ہے۔ چلتا بھی جیتا بھی ہے چلتا بھی ہے۔ اب کوئی اس سے کہے کہ ارے تو برابر بستر پر پڑا رہا ہے نہ تجھے کسی سانپ نے کاٹا تو بھاگا نہ چلایا، کیوں خواہ مخواہ جھوٹ بول رہا ہے تو کہہ سکتا ہے مگر چونکہ یہ امر خواب میں ہر شخص کو واقع ہوتا ہے اور عالم مثال منکشف ہوتا ہے اس لئے اس کی کوئی تکذیب نہیں کرتا اور شارع علیہ السلام اس کی خبر دیں تو وہاں تکذیب کرتا ہے۔ حیرت ہے تو عالم مثال میں ہر چیز کا نمونہ موجود ہے، یعنی جتنی چیزیں ہیں موجودات حقیقہ وہ سب وہاں موجود ہیں۔

ایسی مثال ہے جیسے آئینہ کہ اس میں بھی اپنی شبیہ نظر آتی ہے لیکن جس طرح آئینہ میں بھی ہمیشہ شکل بالکل مشابہ نظر نہیں آتی، یعنی آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی آئینہ میں تو بڑا لمبا چہرہ نظر آتا ہے کسی میں بہت چوڑا اور ایسا بڑا کہ خود ہی پتھر مارنے کو جی چاہے۔ اسی طرح سیاہ آئینہ میں سیاہ صورت نظر آتی ہے حالانکہ آپ نے چہرہ پر کالک نہیں لگا رکھی ہے اور سرخ آئینہ میں سرخ صورت نظر آتی ہے حالانکہ آپ نے چہرہ پر کوئی سرخ چیز نہیں ملی رکھی، تو جسطرح

یہاں جو چیزیں آئینہ میں نظر آتی ہیں وہ من کل الوجہ مشابہت نہیں رکھتیں اصل کے ساتھ، بلکہ جو آئینہ سجا ہوتا ہے وہ بالکل سجا نہیں ہوتا۔ اس واسطے کہ کم از کم اتنا فرق تو ضرور ہوگا کہ آپ تو مثلاً بیٹھے ہیں مغرب میں لیکن آئینہ میں آپ نظر آویں گے مشرق میں۔ تو دیکھئے کہاں رہی مشابہت من کل الوجہ۔

خرمٰنی یہ جو آئینہ میں عکس نظر آتا ہے یہ محض ایک مثال ہے۔ اصل صورت کی۔ یعنی اس کو ایک گونہ مناسبت ہے اصل صورت کے ساتھ تو جسے آئینہ میں سب چیزیں آتی ہیں اسی طرح عالم مثال میں اور اس عالم میں جو صورتیں مشابہ ہیں۔ ان میں سے بعض میں تو مماثلت نہ ہوتی ہے اور بعض میں مناسبت جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب یہ سمجھئے کہ وہ مناسبت بعض اوقات جلی ہوتی ہے اور بعض اوقات خفی۔ مثلاً ہم نے خواب میں دیکھا کہ فلاں شخص کے لڑکا پیدا ہوا ہے اور بعد میں سن بھی لیا کہ واقعی اس کے لڑکا پیدا ہو گیا تو یہاں تو باہم مناسبت قوی ہے اور جلی ہے جس کو مماثلت کہنا چاہئے اور کبھی یہ مناسبت قوی نہیں ہوتی بلکہ ضعیف اور خفی ہوتی ہے جیسے میں نے دیوبند میں خواب دیکھا کہ منشی سراج دلچ ایک پلنگ پر بیٹھے ہیں لیکن وہ دو ہیں یعنی سرانے بھی وہی بیٹھے ہیں اور پانی بھی وہی بیٹھے ہیں۔ غرض یہ دیکھا کہ دو سراج اکٹھے ہیں۔ حضرت مولینا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں نے یہ خواب بیان کیا تو مولانا نے فی البدیہ فرمایا کہ انشاء اللہ ان کے لڑکا پیدا ہوگا کیونکہ اولاد جو ہے وہ باپ کا وجود ثانی ہے چنانچہ ان کے گھر میں امید تھی لڑکا ہی پیدا ہوا۔ یہ مناسبت خفی تھی۔ یعنی بیٹے کو باپ کی شکل میں دیکھا یہ مماثلت کو نہیں کہی جاسکتی ہاں مناسبت ہے۔ اب جس کو اس عالم مثال کی وجہ مناسبت کا زیادہ علم ہے وہی معتبر ہوتا ہے اور جس کو جتنا زیادہ اس مناسبت کا علم ہوگا اتنا ہی وہ اعلیٰ درجہ کا معتبر ہوگا۔ کیونکہ تعبیر خواب کا حاصل یہ ہے کہ معبر صورت مرئیہ سے صورت مثالیہ کی عبور کرتا ہے تو یہ معبر صورت مناسبت کو سمجھ لیتا ہے کہ کیس حقیقت کی صورت ہے اور یہ کوئی بزرگی کی بات نہیں۔ بلکہ محض فراست ہے۔ چنانچہ بعض کفار بھی نہایت صحیح تعبیر دیے ہیں۔ یہاں تک کہ ابو جہل بھی بڑا معبر تھا تو اب کیا اس کو بھی بزرگ کہیں ہے۔

(آثار المربع ص ۳۸ تا ۴۳)

۷۴۔ اس اعتراض کا جواب کہ عالم آخرت محض

خیالی ہی ہے۔

یہ لوگ عالم مثال کے ایسے قائل ہوئے کہ سرے سے آخرت ہی کو اڑا دیا۔ یعنی آخرت کی حقیقت ہی یہ بیان کی کہ آخرت بھی مثلثات میں وہاں مادیات نہیں، یعنی جیسے دنیا عالم مادی ہے اور عالم آخرت ان کے نزدیک ایسا نہیں ہے وہ غیر مادی ہے حالانکہ اہل حق کے نزدیک آخرت بھی عالم مادی ہے اور وہ غلط کار لوگ کہتے ہیں کہ آخرت عالم مادی نہیں ہے بلکہ محض تخیل ہوگا۔ لیکن ایسا قوی تخیل ہوگا کہ یوں معلوم ہوگا جیسے مادیات ہوں۔ پس ایسا عالم ہوگا جیسے خواب میں ہوتا ہے کہ سانپ کے کاٹنے کی تکلیف بھی محسوس ہوتی ہے۔ انسان ڈرتا بھی ہے بھاگتا بھی ہے، چیتا بھی ہے، چلاتا بھی ہے لیکن واقع میں نہ کوئی سانپ ہوتا ہے نہ وہ کاٹتا ہے نہ کچھ ہوتا ہے وہ عذاب قبر کے بھی اسی طور پر قائل ہیں کہ مثلاً یہ جو آیا ہے کہ سانپ اور بچھو کاٹیں گے۔ انہوں نے کہا کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سچ سج سانپ اور بچھو کاٹیں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسی سانپ اور بچھوؤں کے کاٹنے کی تکلیف ہوتی ہے ایسی ہی تکلیف روح کو ہوگی اس تکلیف کو تعبیر کر دیا جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عنوان سے کہ سانپ بچھو کاٹیں گے۔

خرمٰنی وہ لوگ اس کے قائل ہو گئے کہ آخرت میں عذاب اور ثواب اس طور پر ہوگا جیسے بعض اوقات انسان پر خیال کا غلبہ ہوتا ہے۔ وہاں بھی اعمال کی صورتیں ایسے طور سے نمایاں ہوں گی کہ وہ یوں سمجھے گا کہ میں باغوں میں پھر رہا ہوں، حوروں میں مشغول ہوں اور واقع میں باغ نہ ہوں گے نہ حوریں ہوں گی۔ مگر تصوف متخیلہ کا ایسا ہوگا جیسے یہاں آدمی بیٹھ کر وہم کو اپنے اوپر غالب کر لیتا ہے۔ (آثار المربع ص ۴۴)

اگر کوئی آخرت کو بھی ایسا ہی سمجھنے لگے جیسے بعض فلاسفہ کا عقیدہ ہے تو یہ سرا سر گمراہی ہے اور بالکل غلط عقیدہ ہے سو بعض کا تو یہ عقیدہ ہے جو مذکور ہوا کہ عالم آخرت میں اعمال ہی بشکل درخت و غیرہ متخیل ہوں گے اور ان میں واقعیت کچھ نہ ہوگی۔

باقی جو نصوص کو مانتے ہیں ان کا یہ عقیدہ تو نہیں لیکن ان میں بعض مبتدعین جیسے معتزلہ جنت و نفاق جنت کو فی الحال موجود نہیں مانتے۔ ان کو سرسری نظر سے کچھ تاہید مل گئی اس حدیث سے

کہ جنت ایک چٹیل میدان ہے اور اس کے درخت سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ والکبر للہ ہیں۔ اس حدیث سے انہیں دھوکا ہوا اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ کسی شیخ سے پڑھنا چاہیے۔ وہ یوں سمجھے کہ جنت بھی خالی ہے اور دوزخ بھی خالی ہے ہم جیسے جیسے عمل کریں گے۔ یہ عمل ہی اس شکل سے ظہور کریں گے سو خوب سمجھ لیجئے یہ بھی غلطی ہے۔ واقع میں یہ سب چیزیں پہلے سے موجود ہیں مگر باوجود ہونے کے ہیں انہیں اعمال کے ثمرات، کیونکہ خدا تعالیٰ کو تو معلوم ہے کہ کون شخص کیا کیا عمل کرے گا۔ اسی کے مناسب سزا جزا کی صورت پہلے سے بنا کر اس کے وجود واقعی کی خبر دینے کے لئے یہ فرمایا اعدت للکافین اعدت للمتقین۔ جیسے میزان کو پہلے سے معلوم ہو کہ میرے مہمان کا مزاج علیل ہے اور وہ پہلے سے اس کے مزاج کے مناسب کھانا تیار کر کے رکھ دیوے تو وہ کھانا رکھا گیا مزاج کے مناسبت سے، یعنی سودار یا صفر یا بلغم کے لحاظ سے پلاؤ یا اور کوئی چیز اس کے لئے تیار کی گئی۔ ہاں یہ ادربات ہے کہ کسی میزان کو خبر ہی نہ ہو کہ میرے مہمان کا مزاج کیسا ہے۔ وہ کیا پرہیزی کھانا کھاتا ہے لیکن حق تعالیٰ جو میزان ہیں۔ انہیں تو اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے مہمانوں کے مزاج کی کیا کیفیت ہے انہیں تو پہلے ہی سے مفصل علم ہے کہ میرا فلاں فلاں بندہ فلاں فلاں عمل کرے گا۔ بس ان اعمال کے مناسب ہی جزا و جزا کو مہیا فرما رکھا ہے۔ پس ”قیعان“ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ واقع میں وہ موجود ہے کیونکہ جنت کا معنی نعمت ہے بال فعل موجود ہونا تو منصوص ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ درجہ حصول فی الحال میں قبل صدور اعمال بمنزلہ قیعان کے ہے اور درجہ ذات میں قیعان نہیں ہے۔

حاصل یہ ہے کہ فی نفسہ قیعان نہیں بلکہ جنتوں کے حق میں قیعان ہے جیسے ایک شخص نے دس ہزار روپے اپنے خادموں کے لئے خرچہ جمع کر دیئے اور فی کام دس پیسے پچاس روپے علی قدر مراتب نامزد کر دیئے۔ پھر وہ شخص سب کو خطاب کر کے یوں کہتا ہے کہ اتنا روپیہ خزانے میں رکھا گیا ہے اگر تم خدمتیں کر دو گے تو خزانہ میں سب کچھ ہے۔ درہ یوں سمجھو کہ بالکل خالی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ قبل خدمتیں کرنے کے متعارفے حق میں گویا خزانہ خالی ہے جب خدمتیں کرنا شروع کر دو گے تو اب سمجھو کہ وہ پر ہوگا واقع میں تو وہ اب بھی پر ہے لیکن متعارفے حق میں وہ جی پر سمجھا جاوے گا جیسا کہ خدمتیں کر دو گے تو معنی یہ ہیں حدیث کے کہ اعمال کے ثمرات تو پہلے سے مہیا کر دیئے گئے ہیں لیکن وہ ابھی کسی کی ملک نہیں بنائے گئے جیسے بندے عمل کرتے جاتے ہیں وہ ثمرات ان کے نامزد ہوتے جاتے ہیں۔

اب اس مقدمہ پر سب اشکالات رفع ہو گئے تو عالم مثال میں بھی حق تعالیٰ نے انہیں اعمال کو پہلے سے متحمل فرمایا ہے اور جنت و دوزخ میں بھی انہیں اعمال کی شکلیں پہلے سے پیدا فرمادی ہیں کیونکہ حق تعالیٰ کو تو معلوم تھا کہ میرے بندے کیا کیا اعمال کریں گے انہیں اعمال کی صورتوں کو جنت و دوزخ بنا دیا۔ (ایضاً ۵۶ تا ۵۷)

۷۵۔ حقیقت پل صراط

حقیقت پل صراط امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لکھی ہے کہ شریعت میں ہر چیز کا اعتدال مقصود ہے اور اعمال فروع ہیں اخلاق کی۔ تو اصل محل اعتدال کا اخلاق ہیں۔ ان کا بیان یہ ہے کہ اخلاق کے اصول تین ہیں۔ یعنی اصل میں تین قوتیں ہیں۔ جو جڑ ہیں تمام اخلاق کی۔ یعنی جن قوتوں سے اخلاق پیدا ہوتے ہیں وہ تین ہیں۔ قوت عقلیہ، قوت شہویہ، قوت غضبیہ۔ حاصل یہ کہ منافع کے حصول اور مفار کے رفع کے لئے خواہ وہ دنیویہ ہوں یا اخرویہ، دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک وہ قوت کہ جس سے منفعت و مصرت کو سمجھے کہ یہ مصرت یا منفعت ہے وہ قوت مدد کہ قوت عقلیہ ہے اور ایک یہ کہ مصرت کو سمجھے کہ اس کو حاصل کرے۔ یہ قوت شہویہ کا کام ہے۔ اور یہ کہ مصرت کو سمجھے کہ اس کو دفع کرے۔ یہ قوت دافہ قوت غضبیہ ہے پھر ان تینوں سے مختلف اعمال صادر ہوتے ہیں۔ پھر ان اعمال کے تین درجے ہیں۔ افراط و تفریط و اعتدال۔ چنانچہ قوت عقلیہ کا افراط یہ ہے کہ اتنی بڑھے کہ وحی کو بھی نہ ملنے جیسے یونانیوں نے کیا۔ تفریط یہ ہے کہ اتنی گھٹے کہ جہل و سفہ تک اتر آئے اسی طرح قوت شہویہ کا ایک درجہ افراط ہے کہ حرام و حلال کی بھی خبر نہ رہے۔ بیوی اجنبی سب برابر ہو جائیں۔ اور ایک درجہ ہے تفریط۔ یعنی ایسے پرہیزگار بنے کہ بیوی سے بھی پرہیز کرنے لگے۔ یا ایسا زاهد ایسے حریص ہوئے کہ اپنا پر یا اسب ہضم کرنے لگے۔ یا ایسے زاہد بنے کہ ضرورت کی چیزیں بھی چھوڑ دیں۔ اسی طرح قوت غضبیہ کا افراط یہ ہے کہ بالکل بھڑیا ہی بن جاویں۔ اور تفریط یہ کہ ایسے نرم ہوئے کہ کوئی جوتے سے بھی مارے دین کو برا بھلا بھی کہے تب بھی غم نہ آوے۔ یہ تو افراط و تفریط تھا۔ ایک ان تینوں قوتوں کا اعتدال۔ یعنی جہاں شریعت نے اجازت دی ہو وہاں تو ان قوتوں کو استعمال کرے۔ اور جہاں اجازت نہ دی ہو وہاں ان قوتوں سے کام نہ لے۔ یہ اعتدال ہے۔ تو ہر وقت میں تین درجے ہوتے۔ افراط، تفریط، اعتدال

ان سب درجوں کے الگ الگ نام ہیں۔ جو قوت عقلیہ کا درجہ انفرادی ہے اس کا نام ہے جزیرہ اور جو تفریط کا درجہ ہے اس کو سفاهت کہتے ہیں جو اعتدال کا درجہ ہے اس کا لقب حکمت ہے۔ اسی طرح قوت شہویہ کا انفرادی درجہ فحش ہے۔ تفریط کا درجہ خود ہے اعتدال کا درجہ عفت ہے۔ اور قوت غضبیہ کا بڑھا ہوا درجہ ہتھور ہے گھٹا ہوا درجہ جن ہے۔ اعتدال کا درجہ شجاعت ہے۔

تو یہ نو چیزیں ہوں۔ جو تمام اخلاق حسنہ و سیئہ کو جاویں اور مطلوب ان نو درجوں میں صرف تین درجے اعتدال کے ہیں۔ یعنی حکمت، عفت، شجاعت، باقی سب ردائل ہیں تو اصول اخلاق حسنہ کے یہ تین ہوتے۔ اور ان تینوں کے مجموعہ کا نام عدالت ہے اس لئے اس امت کا لقب وسط ہے، یعنی امت عادلہ، غرض انسان وہ ہے جس میں اعتدال ہو۔ اب آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں بزرگ تو بہت ہیں، انسان بہت کم ہیں۔ چنانچہ منشا و کتاب ہے۔

زادہ شدی و شیخ شدی و دانشمندی۔

ایں جملہ شدی و لیکن انسان نشدی۔

جب یہ بات سمجھیں اگلی تو اب یہ سمجھئے کہ اعتدال حقیقی سب میں زیادہ مشکل ہے کیونکہ اعتدال حقیقی کہتے ہیں وسط حقیقی کو کہ اس میں ذرہ برابر انفرادی ہو نہ تفریط ہو اور مشاہدہ سے اس کا دشوار ہونا ظاہر ہے۔ اور پل صراط اسی اعتدال کی صورت مثالیہ ہے اور اس کی دشواری تلوار کی تیزی کی صورت میں ظاہر ہوتی اور اس کا اعتدال حقیقی بال سے زیادہ باریک ہونے کی صورت میں ظاہر ہوا کیونکہ جب اعتدال وسط حقیقی ہوگا اور وسط حقیقی غیر منقسم ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ منقسم ہو تو پھر خود اس میں طرفین اور وسط نکلیں گے، تو وہ وسط حقیقی نہ رہا۔ بہر حال وسط حقیقی کا غیر منقسم ہونا لازم ہے۔ اور وہ بال منقسم ہے تو وہ بال سے زیادہ باریک ہوگا۔

بس اس طرح شریعت کا وسط حقیقی ہونا اس شکل سے ظاہر ہوگا کہ وہ پل صراط بال سے زیادہ باریک ہوگا۔ اس تشبیہ میں کوئی امر خلاف اصول عقلیہ لازم نہیں آتا۔ اور اس درجہ کے وسط ہونے سے اس کا مشکل ہونا بھی لازم آیا کہ نہ ادھر جاؤ نہ ادھر جاؤ۔ بیچوں بیچ میں رہو۔

بس یہ حقیقت پل صراط کی وہ شریعت کی صورت مثالیہ ہے جس کا بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہونا ثابت کر دیا گیا۔ تو شریعت پر چلنے والے اب بھی پل صراط پر چل رہے ہیں جب یہ ہے تو جو یہاں پل صراط پر یعنی شریعت پر چل چکا ہے وہ وہاں بھی باسانی چل سکے گا کیونکہ وہ یہی تو ہے۔ اب بتلائیے پل صراط پر چلنا کیا دشوار ہوا جو یہاں شریعت پر چل رہا ہے اسے وہاں بھی

چلنا آسان ہو جائے گا۔

سو پل صراط پر چلنے کا طریقہ بہت ہی آسان ہے اور وہ سنت کا طریقہ ہے۔ یہی سنت بیچ کا راستہ ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں شیخ سعدیؒ۔

میں دار سعدی کہ راہ صفا

تو اں رفت جز در پی مصطفیٰ۔

دریں راہ جز مرد راعی نرفت

گم آں شد کی دنیاں راعی نرفت

(آثار المربع ص ۵۹)

۷۶۔ عقل کے معنی اور تشریح

عقل کے معنی لغت میں روکنے والا ہیں۔ اسی سے عقل ہی کو کہتے ہیں کہ وہ جانور کو بھاگنے سے روکتی ہے۔ تو عقل کا حاصل یہ ہوا کہ وہ ایسی قوت مدر کہ ہے جو مضرت سے روکتی ہے۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ مضرت کیا چیز ہے اور منفعت کیا چیز ہے سو اصل میں مضرت کی بھی مختلف قسمیں ہیں اور منفعت کی بھی، کیونکہ ہر منفعت میں کچھ نہ کچھ مضرت بھی ہے اور ہر مضرت میں کچھ نہ کچھ منفعت بھی ہے۔ اب عقل کا یہ کام ہے کہ وہ یہ بتا دیتی ہے کہ کہاں منفعت کا پہلو غالب ہے اور کہاں مضرت مثلاً ایک شخص کو شدت کی پیاس لگی ہوئی ہے۔ حلق خشک ہو جاتا ہے۔ دم نکلا جاتا ہے اسے وقت میں اس کے پاس صرف دودھ ہے۔ مگر دودھ ایسا ہے جس میں سے کچھ مانپ بھی پی گیا ہے جس کی ذمہ سے زہر پلا ہو گیا ہے اب بعض دوست تو یہ کہتے ہیں میاں دودھ پی بھی لو۔ تمہارا حلق تو تر ہو جائے گا مگر پیاس تو بچھ جائے گی۔ اور بعض کہتے ہیں اسے ہرگز نہ پینا۔ کیونکہ اس میں زہر ہے۔ اس وقت حلق تر ہو جائے گا۔ مگر پھر حیات ہی منقطع ہو جائے گی۔ اس وقت عقل یہ فیصلہ کرے گی کہ گو دودھ پی لینے میں قدرے منفعت بھی ہے مگر یہ منفعت معتدبا نہیں۔ اس لئے نہیں پینا چاہیے۔

الغرض منفعت قابل اعتبار وہ ہے جو ضرر پر غالب ہو۔ اسی طرح ضرر وہ قابل اعتبار ہے جو نفع پر غالب ہو۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ اس کے اور ملایئے کہ دنیا کی منفعت سے آخرت کی منفعت بڑھی ہوئی ہے۔ اور دنیا کی مضرت سے آخرت کی مضرت بڑھی ہوئی ہے۔ دنیا کی منفعت و مضرت آخرت کی منفعت و مضرت کے آگے کوئی چیز نہیں۔

ان دونوں مقدموں کے ملانے کے بعد عقل بھی یہی فتویٰ دی گی کہ جس کام میں دنیا کی منفعت ہو مگر آخرت کی مضرت ہو۔ ایسی منفعت کو چھوڑ کر آخرت کی مضرت سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اسی طرح کسی کام میں دنیا کی مصرت ہو اور آخرت کی منفعت ہو تو عقل کہے گی کہ چھوٹی مصرت کو بڑی منفعت کے لئے گوارہ کرنا چاہیے۔

بس یہ ہے اصل عقل۔ مگر آج کل لوگوں نے دنیا کمانے کا نام عقل رکھ لیا ہے۔ اگر اسی کا نام عقل ہے تو فرعون سب سے بڑا عاقل ہو گا مگر اس کا جاہل اور احمق ہونا تمام مسلمان کو مسلم ہے۔
(اللاستحقاق ص ۲)

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج بتاریخ ۳ ربیع الاول ۱۴۵۳ھ بمقام موضع گنج متصل لاہور میں مواعظ کے انتخاب کا سلسلہ متعلقہ جوابات شبہات و اعتراضات اختتام کو پہنچا۔ واللہ الحمد۔

مکتبہ محمد تقی دہلوی دہلی

سہارن پور۔ یوپی۔ پن نمبر ۲۴۵۵۴۵

کتبہ منظور الحسن اعظمی